ترجمان السُّنّة

عربی - اردو

اوّل

اُستاذ المحدثین، زبدۃ الفقہاء، فخر العلماء

حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی قدس سرہ



مکتبہ رحمانیہ

اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

ترجمان السنّة

عربی - اردو

جدید دور کی ضرورت کے مطابق جدید عنوانات اور
مباحث کے ساتھ احادیثِ مبارکہ کا مستند، جامع اور خوبصورت مجموعہ

1

ترجمان السنة

عربی-اردو ۔ جلد اوّل

جدید دور کی ضرورت کے مطابق جدید عنوانات اور مباحث کے ساتھ احادیثِ مبارکہ کا مستند، جامع اور خوبصورت مجموعہ

اُستاذ المحدثین زبدۃ الفقہاء فخر العلماء

حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھی قدس سرہٗ

مکتبہ رحمانیہ ۞ اقرأ سنٹر غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

نام کتاب .... ترجمان السنة
مؤلف .... حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی
طابع .... مقبول الرحمٰن
ناشر .... مکتبہ رحمانیہ
مطبع .... لٹل سٹار

ملنے کے پتے

⇦ مکتبۃ العلم نمبر ۱۸ اُردو بازار لاہور
⇦ خزینہ علم وادب الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور
⇦ اسلامی کتب خانہ فضل الٰہی مارکیٹ اُردو بازار لاہور
⇦ مکتبہ سید احمد شہید الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور
⇦ کتب خانہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

عرضِ ناشر

اس دنیا میں آخری کتاب ہدایت قرآن مجید ہے اور اس کی عملی و زبانی تشریح ''حدیث'' کہلاتی ہے کیونکہ بروایت ام المؤمنین، زوجہ مطہرہ رسول سیدہ عائشہ صدیقہ کائنات سلام اللہ علیہا کے ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق قرآن ہی ہے''۔

تاریخ گواہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی آپ کے فرامین کو تحریر کیا جاتا رہا اور آپ کے وصال کے بعد وحی کے عینی شاہدین اور تربیت یافتگان دربارِ نبوت حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کو ہر طرح سے آنے والے لوگوں تک منتقل کرنے کا سلسلہ بالاہتمام شروع کر دیا اور یہ سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالی پر عمل کے باعث جاری ہے کہ ''جو کوئی مجھ سے ایک آیت بھی سنے اس کو دوسروں تک پہنچادے''۔

چنانچہ تیسری صدی ہجری تک فرامین نبویؐ مختلف واسطوں سے نقل در نقل ہوتے ہوئے کتابی صورت میں بھی جمع ہوتے رہے چنانچہ آج ہمارے سامنے جوامع وسنن، مسانید و معاجم، مستدرکات، اجزاءواطراف کی صورت میں موجود ہیں۔ جس کی وجہ سے تمام دینی مسائل کے لئے دلائل تلاش کرنے میں اب کوئی دقت نہیں۔

رفتار زمانہ اور گردو پیش کے حالات کے پیش نظر یہ ضرورت ہمیشہ رہی اور رہے گی کہ دورِ حاضر کے تقاضوں اور علم وعرفان کے دلدادہ لوگوں کی سہولت کے پیش نظر ان کتب اصول سے خوشہ چینی کر کے جدید انداز واسلوب میں پیش کیا جائے چنانچہ ماضی قریب کے محقق و محدث استاذ المحدثین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی قدس سرہٗ العزیز نے اپنے دور کے تقاضوں اور الجھنوں کے حل کے طور پر یہ خوبصورت مجموعہ مرتب کیا جس میں درج ذیل خصوصیت ہے۔

عنوان قائم کر کے احادیث کے اصل متن کو ذکر کر کے اس مجموعہ حدیث کا ذکر بھی آخر میں کیا جس سے آپ نے اس حدیث کے الفاظ اخذ کئے اور پھر ان کا آسان وسلیس ترجمہ کے بعد اس حدیث کی تشریح اس انداز سے کی اور قدیم معلومات کو جدید انداز میں پیش کیا نیز کوشش کی کہ مجادلہ ومناقشہ کی بجائے افہام وتفہیم کا رنگ غالب رہے۔ احقاق حق اور اصلاح المسلمین ان کے پیش نظر رہا۔ پھر اس خوبصورت کتاب کو برصغیر کے معروف ادارہ ندوۃ المصنفین نے نفع خلائق کے لئے پیش کیا۔

یہ کتاب اپنے انداز کی خوبصورت اور مضامین کے اعتبار سے ایک نادر مجموعہ ہے جو دورِ تصنیف سے آج تک مختلف ادارے اپنے انداز میں شائع کرتے رہے۔ مگر بعض مقامات پر قارئین نے سخت تشنگی محسوس کی کہ ان نسخوں کی کتابت کا انداز قدیم

تھا جو مطالعہ کے دوران مخل ہوتا - چنانچہ ''مکتبہ رحمانیہ'' لاہور نے محقق علماء کی خدمت میں گذارش کی اور اس تشنگی کا ازالہ کیا گیا چنانچہ جہاں کہیں تفصیل وتشریح میں آیات قرآنی یا دیگر کتب کی عبارات مذکور تھیں مگران کا حوالہ مندرج نہ تھا ان آیات وعبارات کی تخریج کرا کے جدید انداز کتابت (کمپوزنگ) سے اس میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے-

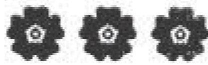
اس کتاب میں ایک احسن اقدام یہ کیا گیا کہ اگر ایک جیسے مفہوم والی احادیث آئیں تو باقی جلدوں سے ان کے صفحات کے نمبر درج کر دیئے تھے اس مشکل کام کو بھی (نئے نمبر لگا کر) بخوبی سرانجام دیا گیا ہے-

قارئین یقیناً اس خوشگوار تبدیلی کے بعد اس کی مزید بہتری کے لئے اپنی قیمتی اور مفید آراء سے ہمیں نوازیں گے تاکہ اس مجموعہ کو خوب تر انداز میں پیش کرنے کا خواب پورا ہو اور فرمان نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کے فرمان کے مطابق آخرت میں ہمیں بھی علم وعرفان کے چراغ روشن رکھنے کی سعادت حاصل ہو سکے- واللہ ولی التوفیق

آخر میں قارئین کرام سے گذارش ہے کہ اگر کتاب میں کچھ بشری فروگذاشت پائیں تو ہمیں مطلع فرمائیں اور خدام ومعاونین ادارہ کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں-

والسلام

مقبول الرحمٰن عفی عنہ



فہرست مضامین ترجمان السنہ جلد اوّل

کتاب التوحید ٢٥٣

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْم

پیش لفظ

احادیثِ نبویہ پہلی صدی کے آخر سے لے کر تیسری صدی تک مختلف مقاصد کے پیش نظر مختلف حیثیتوں اور ترتیبوں کے ساتھ باضابطہ جمع ہوتی رہیں اور محدثین کی مساعی جلیلہ و جمیلہ اس سلسلہ میں بلاشبہ اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ فنونِ حدیث کے لحاظ سے اب کسی نئی تالیف و ترتیب کا تخیل بھی دماغ میں لانا دشوار ہوگیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر زمانہ کے نئے نئے تقاضے اور نئی نئی ضرورتیں ہوتی ہیں اس لئے اس جمود کی اور جمود پر اصرار کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اب کسی تالیف و تصنیف کی جانب جدید اسلوب کے ساتھ قدم اٹھانا بھی جرم سمجھا جائے' اس اقدام کا مطلب کبھی بھی یہ نہیں ہوسکتا کہ ہمیں اس باب میں سلف کی بے مثال خدمات کا اعتراف کرنے میں تامل ہے یا ان کے کارناموں کو بے وزن کرنا چاہتے ہیں' بلکہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ارشاداتِ نبویہ کا بے شمار ذخیرہ جو مختلف ممالک اور مختلف بلاد کے لاکھوں انسانوں کے سینوں میں بکھرا پڑا ہوا تھا اس کو ایک جگہ بشکل سفینہ قلم بند کردینا پھر اس میں ہر ہر حدیث کی ایک ایک سند اور تمام مختلف اسنادوں کو یکجا کرنا اس پر بعض حضرات کا تو روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کی باریکیوں کو بھی نظر انداز نہ کرنا پھر اُن میں صحت و سقم' وقف و ارسال' انقطاع و ارسال' شذوذ و نکارت اور جروح و علل جیسے دقیق مباحث پر تنبیہ کرتے چلے جانا اور ان سے عہدہ برا ہونا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا اعتراف نہ کرنا علمی دنیا میں بہت بڑی ناسپاسی و حق ناشناسی ہے۔ الحمدللہ کہ ان کی خدمات کا یہ تمام ذخیرہ آج ہمارے سامنے جوامع و سنن' مسانید و معاجم' مستدرکات' اجزاء و اطراف اور علل وغیرہ کی شکل میں موجود ہے حتیٰ کہ اب دین کے اصول و فروع کے کسی باب میں امت کے لئے نیا میٹریل تلاش کرنا ممکن نہیں رہا ہے' کوئی قلم اگر کچھ لکھے گا' کوئی زبان اگر کوئی کلمہ کہے گی وہ سب ان ہی کی خوشہ چین کہلائے گی۔ گویا اب ہر تالیف میں اصل سرمایہ اُن کا رہے گا اور صرف نقش و نگار اور تصویر و تشکیل کی خدمت ہماری۔

بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک طبقہ جو فقہاء و محدثین کے ساتھ مرتبط تھا اپنے ضیق ماحول قصور فہم اور کوتاہیٔ نظر کی وجہ سے ان تصانیف میں وہی کچھ دیکھتا رہا جو اُس کے آئینہ قلب میں نظر آرہا تھا۔ اس لئے جب عبادات کا باب شروع ہوتا اس میں بھی خصوصیت سے وہ حصہ جو مختلف فیہ مسائل سے متعلق ہے تو اس طبقے کے علوم و معارف اور تدقیق و تحقیق کے سمندر میں تلاطم برپا ہو جاتا' تقریروں میں طول' طبیعت میں روانی اور مزاج میں جولانی پیدا ہوجاتی لیکن جب ان ہی کتب میں اجتماعیات و اخلاقیات سیاستِ مدنیہ اور تدبیر منزل وغیرہ کے باب آتے تو اس بحر متلاطم میں یک قلم جمود طاری ہوجاتا' لبوں پر مہر سکوت لگ جاتی' زبان پر خاموشی کے قفل چڑھ جاتے اور طبیعت کا وہ تمام جوش و خروش ایسا ٹھنڈا پڑ جاتا گویا اس میں حرارت کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔

اندریں حالات اس غلط فہمی کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ محدثین کی یہ گراں مایہ خدمات یا تو کتب صوفیاء کی طرح صرف ایک

''نظام خانقاہی'' کا مجموعہ ہیں یا کتب کلام کی طرح علماء کلام کی موشگافیوں کا ایک دفتر پراگندہ، اس اندازِ بحث ونظر کے خلاف اگر کبھی کسی نے کوئی قدم اٹھایا بھی تو اس کو بے دینی وزیغ، عدم تقلید، مخالفتِ سلف اور اس طرح کی عجیب وغریب تہمتوں سے متہم کر دیا گیا- ادھر مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جو مذہب کو روزِ ازل ہی سے سامانِ دردسری یا زیادہ سے زیادہ ایک آئین تہذیب خیال کئے ہوئے تھا اس کو خود تو مطالعہ کی توفیق نہ ہوئی، ہماری اس غلط روش سے وہ ایک اور غلط فہمی میں مبتلاء ہو گیا یعنی یہ کہ ان کتابوں میں عبادات ورسوم یا چند مسائل کلامیہ وفقہیہ کے علاوہ اجتماعیات ومعاشیات کا کوئی باب ہی نہیں ہے اور ہے تو بہت سطحی بلکہ غیر ضروری اور ان چند در چند وجوہ کی بناء پر وہ اپنی معاشیات واقتصادیات کے لئے کوئی دوسری راہ تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا-

ہم سمجھتے ہیں کہ دونوں جماعتیں افراط وتفریط کے راستوں پر جارہی ہیں- حقیقت یہ ہے کہ جمع احادیث کی جو خدمت محدثین کر گذرے ہیں اس کی اہمیت کو کسی وقت اور کسی حیثیت سے بھی کم کرنا یا صرف ان گنے چنے ابواب کی وجہ سے جنہیں ان کتب میں کسی وقتی ضرورت سے اہمیت دے دی گئی تھی، تمام ابواب وتراجم اور مباحث وبیانات کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا یا ان میں موجودہ جدید اصلاحی الفاظ نہ دیکھ کر اصل حقائق سے بھی ان کو خالی سمجھ لینا یا موضوعِ فن سے لاعلمی کی بنا پر خود اس فن کے اہم ابواب کو غیر اہم سمجھ کر معترض ہونا علمی دنیا میں ناقابلِ معافی جرائم ہیں-

دوسری طرف ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ان کتب میں جو ابواب وتراجم ایک خاص فضا اور خاص ماحول میں اہم سمجھ لیے گئے تھے آج بھی ان کو اسی نظر سے دیکھے چلے جانا، وہی جہمیت کی تردید، معتزلہ وخوارج کے ساتھ وہی جھگڑے صفات کے عین وغیر ہونے کے متعلق وہی فلسفیانہ کاوشیں، پھر قرآن کریم کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کی وہی قدیم بحثیں زیر تحقیق لائے چلے جانا اور ایک ایسی زمین پر مالکیت وشافعیت کے لیے صف آرائی کرنا جہاں نہ کوئی شافعی ہے نہ مالکی، علم وفکر کے ان مظاہروں کو ہرگز اقتضاء علم نہیں کہا جا سکتا نہ تو اس کا نام احساسِ ضرورت ہے اور نہ اس کو صحیح معنی میں اتباعِ سلف کا نام دیا جا سکتا ہے، اتباعِ سلف یہ ہے کہ جس طرح امام بخاریؒ نے اپنے وقت کے فنون کے مقابلہ کے لیے **کتاب الرد علی الجهمية، حجیت اخبار آحاد، صفاتِ باری اور شئون باری** پر مناسب مناسب عنوانات قائم کیے تھے- ان کے قدم بقدم چل کر ہم بھی وقتی مسائل کے لیے مناسب عنوانات قائم کریں- ہمیں اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ نہیں ہے کہ اگر امام بخاریؒ اس زمانے میں موجود ہوتے تو اپنی مجتہدانہ شان، دقت رسی، دقیقہ سنجی اور امت کی ضرورتوں کے متعلق صحیح نبض شناسی اور دردمندی کی وجہ سے اپنے بابوں، ترجموں اور عنوانوں کا رخ جہمیت واعتزال کی تردید کے بجائے یقیناً ان ہی مسائل کی طرف پھیر دیتے جو ہمارے وقت کے الجھے ہوئے مسائل کہلاتے ہیں-

یہی وجہ ہے کہ آج بھی بخاری میں اجتماعیات واقتصادیات اور دیگر ضروری مسائل کی جانب ایسی اہم تلمیحات موجود ہیں کہ اگر کوئی ذی علم ان سے استفادہ کرنا چاہے تو بہت کچھ استفادہ کر سکتا ہے اور انہیں جدید اخذ واستنباط کی بنیاد قرار دے سکتا ہے- آخر حضرت شاہ ولی اللہ محدثین ہند میں ایک محدث ہی تو تھے، جنہوں نے اسی قسم کے ضروریات کا احساس کر کے عام ومتعارف مباحث کے علاوہ اجتماعیات واقتصادیات کے غیر متعارف اور حد درجہ مفید مباحث اپنی تصانیف میں پھیلا دیئے- آج حجۃ اللہ کو

اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حنفی ہونے کے باوجود ان کی نگاہ میں مسائل فروعی کو کیا اہمیت حاصل ہے۔

بہر حال سلف کی خدمات کے پورے اعتراف کے ساتھ اگر صورتِ حال کو اس نظر سے دیکھا جائے تو خدمتِ حدیث کا یہ گوشہ مجموعی طور پر خالی نظر آتا ہے اور بلاشبہ وقت کی شدید ترین ضروریات میں یہ اہم ترین ضرورت باقی ہے کہ اس وقت احادیثِ نبویہ پر اس نقطۂ نظر سے دوبارہ نظر ڈالی جائے کہ بین الاقوامی اور اجتماعی مسائل میں دین کامل کی ہدایات کیا ہیں اور فرموداتِ نبوی میں وقت کے نئے نئے تقاضوں اور الجھنوں کا کیا حل پیش کیا گیا ہے۔ کسی زمانہ میں عدم اہمیت کی وجہ سے اگر ترتیب وتدوین احادیث کا یہ طریقہ بروئے کار نہیں لایا گیا تو اس دور کی ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے چھپے اور دبے ہوئے عنوانات ابھارے جائیں، ان کو اسلوبِ جدید کے سانچے میں ڈھالا جائے اور ایک ایسا جامع اور مرتب متن حدیث سامنے آجائے جو حسب ذیل خصوصیات پر مشتمل ہو۔

متن حدیث ✵ اب تک عام طور پر احادیث کا جو ذخیرہ عوام کے سامنے آیا ہے وہ بیشتر صحاح ستہ کی حدیثیں ہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث موجود ہیں جو مسندوں، معجموں اور دوسری غیر متداول، ضخیم کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ضرورت ان کو اس طرح جمع کرنے کی ہے کہ وہ بلوغ المرام یا آثار السنن کی طرح صرف شوافع اور احناف کی حدیثوں کا مجموعہ بن کر نہ رہ جائیں بلکہ صحیح معنی میں احادیثِ نبویہ کا مجموعہ کہلائیں، ان میں ہر صحیح یا حسن حدیث لے لی جائے، خواہ وہ فقہی مسلک کے لحاظ سے کسی مسلک یا کسی فرقہ سے متعلق ہو۔ گویا اصل مقصد جمع وترتیب احادیث ہو اور فقہی مسلک کی خدمت درجہ ثانوی پر ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ امت کے ہاتھوں میں احادیث صحیحہ کا بڑے سے بڑا مجموعہ پہنچ جائے گا اور وہ اس قابل ہو جائے گی کہ اپنی جدید ضروریات کے لیے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکے اور فروعی مسائل میں دلچسپی رکھنے والوں کو بھی اپنی اپنی رائے کے متعلق زیادہ روشنی میں فیصلہ کرنے کا موقعہ مل سکے گا۔

عنوانات ✵ یہی خدمت سب سے اہم خدمت ہے اس کام کے لیے ایک طرف زیادہ سے زیادہ احادیث زیر نظر رہنے کی ضرورت ہے، دوسری طرف وقتی مسائل کا پورا استحضار، پھر ان میں اہم اور غیر اہم کا صحیح انتخاب اور بہت سے حقائق کی تفہیم کے لیے موجودہ اصطلاحات سے واقفیت۔ اس کے لیے ضرورت نہیں ہے کہ ہم قدیم طرز کی پیروی کریں اور اپنی جانب سے کوئی نیا باب یا نیا عنوان قائم کرنا ایک بدعت تصور کرلیں۔ ہمارے لیے اس باب میں امام بخاریؒ کا اسوۂ حسنہ کافی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ احادیث نبویہ کے خفی اشارات وتلمیحات کو ابھار ابھار کر بشکل عنوانات روشن کرنے کے وہی موسس ہیں جو شخص آئندہ کسی نہج پر بھی اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھائے گا اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ کتاب بخاریؒ کو اپنے لیے مشعل راہ تصور کرے اور جس طرح اپنے دور کے مسائل پر انہوں نے مفید سے مفید تراجم قائم کیے ہیں اسی طرح وہ اپنے زمانہ کے مسائل پر نئے نئے عنوانات قائم کرتا چلا جائے۔

ترجمہ ✵ عام مسلمانوں اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت کے لیے حدیثوں کا اردو ترجمہ بھی ضروری تھا جو نہ تو اتنا بامحاورہ اور تشریحی ہو کہ مستقل تصنیف بن جائے اور نہ ایسا تحت اللفظ کہ مطلب خیز نہ رہے۔ موجودہ ماحول میں اس طرح کے ترجمہ کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔

2

تشریحی نوٹ ❋ احادیث کی تشریح اور عنوانات کی پوری تفصیل کے علاوہ دیگر امور متعلقہ کے بسط وشرح کے لیے ایسے تشریحی نوٹوں کی بھی ضرورت تھی جو نہ تو جدت میں اتنے ڈوبے ہوئے ہوں کہ اسلامی تعلیمات کے اصل مرکز ہی سے ہٹ جائیں اور نہ ان پر قدامت پرستی کا ایسا گہرا رنگ ہو کہ جدید اربابِ نظر ان کو دیکھنا ہی گوارا نہ کریں بلکہ قدیم معلومات جدید قالب میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کے ساتھ پیش کر دی جائیں۔ ہر بات نکھری ہوئی اور صاف صاف بلا خوف لومۃ لائم کہہ دی جائے لیکن مجادلہ و مناقشہ کا رنگ نہ آنے پائے' کسی کی ایذاء دہی یا دل آزاری یا افحام واسکات ہرگز مقصود نہ ہو بلکہ صرف احقاقِ حق' اور اصلاحِ خلق مطمحِ نظر ہو۔ خلاصہ یہ کہ یہ مجموعہ' الفاظِ حدیث میں تو موبہ مولف کے نقشِ قدم پر ہو لیکن اپنی ترتیب اور عنوانات میں تمام تر آزاد رہے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر ایسا کوئی مجموعہ مکمل طور پر تیار ہو گیا تو وقت کی بہت بڑی اور اہم ضرورت پوری ہو جائے گی۔ ندوۃ المصنفین کسی وقت بھی اس ضرورت کے احساس اور اس کی طرف عملی اقدام سے غافل نہیں رہا یہاں تک کہ جب حالات نے کسی درجہ میں بھی مہلت دی تو بہت سی مشکلوں اور دشواریوں کے باوجود قدم اٹھانے میں پس و پیش نہیں کیا گیا اور جو کام بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں کے کرنے کا تھا اسے اس ادارے نے اپنے ذمۂ ہمت پر لے لیا' اس عظیم الشان خدمت کے لیے جتنا علمی سرمایہ' جتنی قوتِ احساس' قوتِ فکر' قوتِ عمل درکار ہے' ظاہر ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک ہی تصنیف ہے مگر درحقیقت یہ مستقل چار تصنیفیں ہیں جن میں ہر تصنیف اپنی حیثیت میں بڑی جدوجہد اور سخت کاوش کی محتاج ہے۔ جدید عنوانات کا انتخاب' ان کے مناسب احادیث کا انتخاب پھر ان کا ترجمہ' اس پر تشریحی نوٹوں کا مرحلہ کھیل تماشہ نہیں ہے اگر کسی کے لیے قدرت یہ تمام سامان مہیا کر دے تو پھر وسعت وقت' طمانیت قلب اور سکونِ دماغ کا سوال سامنے رہتا ہے۔ لیکن جب اس خدمت کی تفویض کا وقت آیا تو کاتب ازل نے میرا نام سامنے کر دیا۔ کسی رسمی معذرت کے بغیر مجھے اس کا برملا اعتراف ہے کہ اس خدمت کے لیے جتنے ساز و سامان کی ضرورت ہے اس میں ایک سامان بھی پورے طور پر میرے ساتھ نہیں ہے۔ تاہم خدمت حدیث کے لیے جینا اور اسی میں مر جانا چونکہ میری ایک دلی تمنا ہے اس لیے اسی بے سروسامانی کے عالم میں اس کٹھن منزل کے سفر کا ارادہ کر لیا گیا ہے۔

سفر شروع کرنے کے لیے کچھ زادِ راہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ میں نے اپنے مفوضہ کام کی ابتداء مصر کی جدید تصنیف ''التاج'' سے کی کہ یہ کتاب حکومت مصر کی جانب سے ان ہی احساسات کے پیش نظر تصنیف کی گئی تھی۔ لیکن جب اس کتاب کو لے کر چند قدم اٹھا چکا تو معلوم ہوا کہ جس منزل پر مجھے پہنچنا ہے اس کے لیے یہ روشنی قطعاً ناکافی ہے۔ اس میں احادیث کا ذخیرہ توقع سے بہت کم ملا' عنوانات قطعاً ناکافی نظر آئے اور جو ملے بھی ان میں سوائے تقدیم و تاخیر کے کوئی جدت نہ دیکھی اور اس لیے اس کتاب پر میری ایک سال کی کی کرائی محنت بے سود ہو گئی۔ اسی غور و فکر میں مسند امام احمد کی جدید تبویب نظر سے گذری۔ یہ جدید خدمت دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی کہ اب اس کتاب کی مدد سے اپنے سفر کو کسی حد تک کامیاب دیکھ سکوں گا۔ مسند احمد محتاجِ تعارف نہیں ہے اس میں سات سو صحابہؓ کی تقریباً تیس' چالیس ہزار حدیثیں موجود ہیں اگر اس کو آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی[1] انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بجا ہے۔ یہ کتاب ابواب فقہیہ کے ترتیب کی بجائے صحابہؓ کی ترتیب پر تالیف کی گئی ہے اس لیے اس سے استفادہ بہت مشکل تھا۔ تبویب مسند نے اس مشکل کو حل کر دیا ہے اس پر محشی کی محنت نے تنقید کی جانفشانی سے بھی سبکدوش کر دیا۔ اسی کے ساتھ مستدرک حاکم علامہ ذہبی کی نقد کردہ موجود ہے اور مجمع الزوائد بھی طبع ہو کر آ گئی ہے۔ جدید انتخاب کے لیے یہ ذخیرہ کفایت کرتا ہے۔ کنز العمال کی آٹھ جلدوں میں اگرچہ ۴۶,۱۸۱ چھیالیس ہزار ایک سو اکیاسی احادیث کا ذخیرہ موجود ہے مگر اس میں صحت وضعف کا معیار قائم رکھنا مشکل ہے۔ شیخ علی متقی ہندی نے مکرر احادیث حذف کر کے ایک جدید ترتیب سے اس کو مرتب کر دیا ہے اور اس کا نام منتخب کنز العمال رکھا ہے اس میں حدیثوں کی تعداد تیس ہزار دو باقی رہ گئی ہیں اس تصنیف میں یہ کتاب بھی زیر نظر رہی ہے۔

معیارِ صحت ✻ جمع حدیث کے لیے معیار صحت قائم کرنا بنیادی مسئلہ ہے۔ ہم نے اپنے مقصد کے پیش نظر نہ تو اس میں اتنی شدت اختیار کی ہے کہ اس معیار پر احادیث کا ذخیرہ تلاش کرنا ہی مشکل ہو جائے اور نہ اتنی وسعت کہ احادیثِ موضوعہ بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ احادیثِ صحاح کے علاوہ جن حدیثوں پر کسی معتمد حافظ حدیث نے صحیح یا حسن ہونے کا حکم لگا دیا ہے اگر اس کا مضمون آیاتِ قرآنیہ اور مشہور صحیح احادیث کے خلاف نہیں ہے تو ہم نے اس کو صحیح یا حسن میں شمار کر لیا ہے[2] خواہ محدثانہ نقد اس میں باقی ہو۔ اہل علم جانتے ہیں کہ علمی نقد سے صحیحین کی احادیث بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکیں پھر یہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں کوئی نیا قدم اٹھانا اب مشکل ہے کسی حدیث کے متعلق اگر محدثین کی مختلف آراء دیکھنا ہوں تو اس کے لیے مستقل تصانیف موجود ہیں۔ ہم نے ان اصطلاحی مباحث کو چھیڑنا غیر مفید اور اپنے مخاطبین کی فہم سے بلند سمجھا ہے تاہم بضرورت کہیں کہیں مختصر اشارات کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تائیدی طور پر بعض ابواب میں ضعیف احادیث بھی ذکر کر دی گئی ہیں بشرطیکہ موضوع اور محض بے اصل نہ ہوں یہ وسعت صرف اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ جب ایک مضمون صحیح احادیث سے ثابت ہو چکا ہے تو اب اگر اسی مضمون کی دوسری

---

[1] شیخ تاج الدین سبکی طبقاتِ کبریٰ میں امام احمد سے نقل کرتے ہیں کہ اس کتاب کو میں نے پچاس ہزار سات سو احادیث سے بھی زیادہ کے مجموعہ میں سے منتخب کر کے جمع کیا ہے تاکہ جب کسی حدیث کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو تو وہ اس کتاب کی طرف رجوع کر لیں اگر اس میں مل جائے تو خیر ورنہ اس کو قابل احتجاج تصور نہ کریں۔

[2] حافظ ابن قیمؒ امام احمدؒ کے فتاوے کے اصول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''چوتھا ضابطہ یہ ہے کہ مرسل احادیث کو لے لیا جائے بلکہ اگر اس باب میں کوئی حدیث معارض نہ ہو تو ضعیف حدیث پر بھی عمل کر لیا جائے حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہاں ضعیف سے مراد وہ حدیث ہے جو ثقہ راویوں کی مخالف یا ایسے اشخاص کی بیان کردہ نہ ہو جس پر کوئی ایسی تہمت ہو جس کے بعد ان کی احادیث پر عمل کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ امام احمدؒ نے جس ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم رکھا ہے اس سے اسی قسم کی ضعیف حدیث مراد ہے اور اس بات پر اجمالاً دیگر ائمہ کا بھی اتفاق ہے''۔ (اعلام الموقعین ص ۲۵)

ان وجوہ کی بناء پر ہم نے صرف تائیدی طور پر ضعیف احادیث کا ذکر کرنا نامناسب نہیں سمجھا۔ اس مسئلہ کے متعلق حجیت حدیث کے عنوان میں مزید تفصیل دیکھیے۔

حدیثوں سے کچھ توضیح ہوسکتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امام احمدؒ جیسا مسلم محدث ہو کر حدیث کے نام پر ایک مسند جمع کرتا ہے پھر اس میں اتنی وسعت سے کام لے لیتا ہے کہ اس کی بعض احادیث کے متعلق وضع تک کا شبہ پیدا ہوسکتا ہے۔ گو حافظ ابن حجرؒ نے اس کو تسلیم نہیں کیا تاہم اس سے ان کی وسعت نظر کا ثبوت ضرور ملتا ہے امام موصوف کے اس طریق کار سے معلوم ہوا کہ جو شخص جمع احادیث کا ارادہ کرے اس کے لیے کسی حد تک وسعت اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔ ہم نے کسی باب میں مسائل کی بناء اس قسم کی احادیث پر نہیں رکھی ہمیشہ صحیح احادیث کے ساتھ ساتھ صرف تائیدی طور پر ان کو پیش کیا ہے وہ بھی ایسے ابواب میں جہاں تساہل اختیار کرنا محدثین کے نزدیک عیب شمار نہیں ہوتا۔ احکام اور دوسرے حلال وحرام کے موقعوں پر نظر اس سے بلند رکھی گئی ہے۔ جن حضرات نے مراسیل کا انکار کیا ان کے دلائل خواہ کچھ بھی ہوں مگر یہ ایک امر واقعہ ہے کہ احادیث نبویہ کے ایک بہت بڑے ذخیرہ سے ان کو دست بردار ہو جانا پڑا جس میں نہ معلوم امت کے لیے کتنی بیش بہا ہدایات موجود ہیں۔ اگر ہمارے وجدان میں وہ موضوع اور بے اصل نہیں تو محض منکرین حدیث سے ڈر کر ان کو ذکر نہ کرنا علمی جبن ہے۔ خود امام بخاریؒ کو دیکھئے ایک طرف ان کی کتاب بخاری موجود ہے اگر چہ اس کا موضوع صرف صحیح احادیث ہیں مگر ان کو بھی ترجمۃ الباب میں اپنی رائے کی تائید یا اظہار کے لیے آثار و تعلیقات ضعیفہ لانا ناگزیر ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ ''ادب المفرد'' اور ان کی دوسری تصانیف میں یہ معیاری رنگ باقی نہیں رہا۔

خلاصہ یہ کہ ہماری تصنیف کا موضوع صحیحین پر استدراک یا اس معیار کی کوئی کتاب جمع کرنا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس قسم کی احادیث سے آج تک امت اصولی طور پر استفادہ کرتی چلی آئی ہے۔ اسی قسم کی احادیث سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ اگر ہمارے خیال میں یہ اصول غلط نہیں تو اس جماعت کے اعتراضات سے ہمیں کیا خوف ہوسکتا ہے جس کے اعتراض سے صحیحین بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکیں۔ ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ محض اپنے معیارِ عقل سے صحیح احادیث کو رد کر کے امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدایات سے محروم کر دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ جن احادیث پر اب تک عام امت کی نظر نہیں پہنچی اگر وہ موضوع اور بے اصل نہیں ہیں تو ان سے استفادہ کا پورا موقعہ بہم پہنچایا جائے۔ منکرین حدیث کو اگر یہاں کوئی اختلاف ہے تو وہ اصولی ہے ان کے نزدیک احادیث صحیحین بھی دین میں حجیت کے قابل نہیں ہمیں ان حضرات کے نقش قدم پر چلنا ہے جن کے ہاتھوں میں امت کی باگ ڈور سمجھی گئی ہے، جن کو اپنے رسول کی ایک ایک ہدایت دنیا و مافیہا سے بیش بہا نظر آتی تھی اگر ان حضرات کے نزدیک کسی مسئلہ کی بناء ضعیف حدیث پر قائم کی جاسکتی ہے تو ہمارے یہاں صرف تائیدی طور پر کسی ضعیف حدیث کا ذکر کرنا جرم کیوں ہو۔

ترتیب احادیث وعنوانات ❋ اصحابِ سنن نے عام طور پر اپنی کتب کی ابتداء طہارت کے بعد عبادات پھر معاملات سے کی ہے۔ صحیحین میں یہ جدت ہے کہ ان کی ابتداء ایمان سے کی گئی ہے پھر امام بخاریؒ نے ایک نیا قدم یہ اٹھایا کہ ایمان پر وحی کو مقدم کر دیا۔ علمی اعتبار سے یہ پرواز قابل داد ہے۔ لیکن میں تقاضاء وقت و مصلحت کے لحاظ سے کسی اور نئے قدم اٹھانے کا متلاشی تھا کہ میں نے الفتح الربانی (تبویب مسند) کی ابتداء ''معرفتِ ربوبیۃ'' سے دیکھی اپنے مذاق طبیعت اور احساس ضرورت کی بنا پر

یہ ابتداء بہت پسند آئی اس لیے اس تالیف کی ابتداء بھی اسی عنوان سے کی گئی پھر خدائے تعالیٰ کی عظمت اور دیگر صفات کے ساتھ بالخصوص صفت رحمت کا ذکر کر کے آخر میں اسماء باری تعالیٰ پر اس باب کو ختم کر دیا اور باب کے خاتمہ پر احادیث اور تشریحی نوٹوں کی روشنی میں خدا کی ہستی کے متعلق جو تاثرات پیدا ہو سکتے تھے ان کو بشکل مقالہ منضبط کر دیا - یہ باب اس سے کہیں زیادہ پھیل سکتا تھا اور کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں پھیلے گا یہی سر دست اس کو جدید خدمت کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیے - دوسرے نمبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ہستی سامنے آتی ہے اس لیے ان پر بھی بہت سے مفید عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن میں ختم نبوت کو خصوصیت سے روشن کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت استاد مرحوم کی یادداشت اور مطبوعہ رسالہ خاتم النبیین سے کافی مدد لی گئی ہے اور پہلے باب کی طرح یہاں بھی جو تاثرات ان احادیث سے پیدا ہو سکتے تھے ان کو مقالہ کی صورت میں آخر میں درج کر دیا گیا ہے امید ہے کہ موجودہ مباحث کے پیش نظر یہ مقالہ بڑی حد تک بصیرت افروز ثابت ہو گا اس کے بعد نبوت کے ابواب سامنے آتے ہیں ان پر بھی اپنے علمی مبلغ پرداز کے بقدر ضرورت و مصلحت کے لحاظ سے مفید عنوانات قائم کر کے باب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماءِ مبارک پر ختم کیا گیا ہے - ان احادیث کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نقشہ دماغ میں پیدا ہو سکتا ہے اس کو یہاں بھی بشکل مقالہ سپردِ قلم کیا گیا ہے -

اللہ اور اس کے رسول کے تصور کی اس تکمیل سے فارغ ہو کر ابوابِ ایمان شروع کیے گئے ہیں اور اس موضوع پر دو مقالے لکھے گئے ہیں ایک قدرے طویل اور ایک بہت مختصر ان مقالوں میں مسائل کلامیہ کو اسلامی اور تبلیغی رنگ میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے - اس سلسلہ میں سب سے اہم کتاب حافظ ابن تیمیہؒ کی ''کتاب الایمان'' ہے - ان دو مقالوں کے لیے دیگر کتب کے علاوہ اس کتاب کا تقریباً پانچ مرتبہ مطالعہ کیا گیا ہے اور حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ ان مباحث کو سادہ سے سادہ رنگ میں پیش کیا جائے - امید ہے کہ خدا و رسول کے اس طرح تصور کے بعد کتاب الایمان کی احادیث کا لطف آپ پہلے سے زیادہ اٹھا سکیں گے اور آپ کو اس کا پورا یقین ہو سکے گا کہ خدا اور رسول پر صحیح معنی میں ایمان لانا صرف مذہب اسلام نے سکھایا ہے - دوسرے مندرِس یا محرف مذاہب صرف ایمان کا لفظ جانتے ہیں اس کی حقیقت سے قطعاً ناآشنا ہیں - یہی باب اسلام کی اساس ہے اس لیے اس میں مؤلف نے خود بھی کافی محنت اٹھائی ہے اور قارئین سے بھی یہی درخواست ہے کہ اگر انہیں اپنے مذہب سے کوئی دلچسپی ہے تو اس باب کو وہ بار بار پڑھیں ان شاء اللہ یہ تکرار بے فائدہ نہیں رہے گا -

تشریحی نوٹ ✵ جس مقصد کے پیش نظر یہ کتاب تالیف کی گئی ہے وہ تبلیغ دین اور اصلاحِ خلق ہے محض ایک فنی اور علمی خدمت نہیں ہے اس لیے نوٹوں میں بھی زیادہ تر ان ہی مقاصد کی رعایت کی گئی ہے اصلاحی مباحث، علمی مناقشات، اور مندرس مذاہب کے تذکروں سے ممکن احتراز کیا گیا ہے اور اگر کہیں اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو ان کو زیادہ سے زیادہ اختصار اور سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کتاب الایمان کے معرکۃ الآراء مباحث بہت کچھ جدوجہد کے بعد بھی اتنے سادہ اور مختصر نہیں رہ سکے، ان کو پوری کاوش و تحقیق کے بعد بشکل مقالہ مستقل طور پر علیحدہ کر دیا گیا ہے، خاص احادیث ایمان کی تشریح کی سطح ان مباحث سے بلند رکھی گئی ہے - بہت سے مقامات پر اجمال بھی کفایت کر سکتا تھا مگر اسی اپنے ایک مقصد کے پیش نظر بلا ارادہ کچھ پھیلاؤ اور تفصیل ہو

گئی ہے- فروعی مسائل میں پورے اعتدال اور انصاف کے ساتھ حنفی مذہب کی تائید ضرور کی گئی ہے مگر دیگر مذاہب کے بالمقابل اُکھاڑا قائم نہیں کیا گیا-

ہمارے پیش نظر ہر جگہ دفع اعتراض ہے نہ کہ دوسروں کو موردِ الزام بنانا- اس کے باوجود جن فروعی مسائل پر دوسری کتابوں میں آپ کی نظر سے اوراق گذریں گے یہاں چند سطور ہی ملیں گی اور جن اصولی مسائل پر دوسری جگہ سطور ہوگی یہاں اجزاء و اوراق کے انبار نظر آئیں گے-

مقدمہ ✻ کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں پہلی بحث افتراقِ امت کی حدیث پر کی گئی ہے یہ حدیث علمی لحاظ سے بھی ہر زمانہ میں زیر بحث رہی ہے اور اس زمانہ میں بھی زیر بحث ہے اس کے علاوہ چونکہ فرقِ اسلامیہ کے افتراق کا مرکزی نقطہ یہی قرآن و حدیث ہیں اس لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ کتاب کے شروع میں ان اسباب وعلل پر بھی بحث کر دی جائے جو اس افتراق کا سبب بن جاتے ہیں تا کہ کتاب کا مطالعہ کرنے والے اس روشنی میں ما انا علیه و اصحابی کا منہاجِ قویم صاف طور پر دیکھ لیں اور سبل منحرفہ سے اجتناب اختیار کر سکیں- اس بحث میں ضمنی طور پر بہت سے علمی مسائل کا حل کیا گیا ہے جو اپنی جگہ اُلجھے ہوئے سمجھے گئے ہیں اگر ان مباحث کو نظر انداز کر دیا جاتا تو صرف مسئلہ افتراقِ امت کے لحاظ سے کیا جا سکتا تھا لیکن ان مقاصد و فوائد کے پیش نظر جن کی بنا پر کہ اس بحث کو مقدمہ میں درج کیا گیا ہے حذف کرنا تو درکنار قصداً زیر بحث لانا ضروری تھا اس کے بعد حجیت حدیث کی بحث بھی ہمارے وقت کی اہم بحث ہے اس پر بھی جتنا کچھ لکھ دیا گیا ہے وہ منکرین حدیث کے لیے خواہ نا کافی رہے مگر نفس مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے ان شاء اللہ تعالیٰ کافی ہوگا-

فہرست مآخذ کتاب ✻ یہ فہرست کتاب ختم ہو جانے کے بعد زیادہ مکمل اور صحیح طور پر مرتب ہو سکے گی- ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ تالیف میں ہمیں کن کن کتابوں کی اور ضرورت ہو ہاں یہ یقینی امر ہے کہ یہ فہرست سو کتابوں سے زیادہ پر مشتمل ہوگی، صرف اس پہلے جزء میں بھی کافی مراجعت کی گئی ہے جن کے حوالہ جات موقعہ بموقعہ درج کر دیئے گئے ہیں-

اس ضمن میں حضرت استاد مرحوم کے علوم و معارف کا وہ ذخیرہ بھی جو اس کتاب کے موضوع کے مناسب ہے پیش کیا جائے گا اگر چہ حق یہ ہے کہ جس اندازِ فکر سے یہ کتاب لکھی جا رہی ہے وہ تمام تر حضرت استاد مرحوم ہی کا پیدا کردہ ہے لیکن وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس دعوے میں میرے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں- سلسلہ تلامذہ کا بڑا طبقہ وہی ہے جو سال دو سال شریک درس رہا اور سند لے کر رخصت ہو گیا جو شخص استاد مرحوم کے جلوت و خلوت کا شریک رہا ہو وہی جان سکتا ہے کہ یہ محدث جوامت میں صرف امام بخاریؒ کی طرح فن حدیث میں اپنی شہرت رکھتا تھا وہ امت کی اصلاح کے لیے کتنی دلسوزی اور اس کی دردمندی کے لیے کتنا مضطرب تھا-

ایک ضروری تنبیہ ✻ مآخذ حدیث میں ہر جگہ اصول کی مراجعت نہیں کی گئی بلکہ کتب حدیث کے اعتماد پر نقل در نقل پر کفایت کر لی گئی ہے- ہر چند کہ یہ ایک عیب ہے مگر جو عیب کہ تصانیف کا جزءِ لاینفک بن چکا ہے وہ غلط العام فصیح کے قاعدہ کے موافق عیب نہیں رہا- یہ تنبیہ اس لیے ضروری ہے کہ بعض مقامات پر جب اصول کی مراجعت کی گئی تو اصل و نقل میں کچھ معمولی سا فرق نظر آیا

مثلاً مشکوٰۃ شریف یا ''انتاج'' میں صحیحین کی ایک روایت دیکھی جب اس کا اصل متن سے مقابلہ کیا تو ایک دو لفظوں کا فرق ملا۔ اس بحث و تحقیق میں پڑنا اس لیے اہم نہ سمجھا گیا کہ اول تو ایک حدیث صحیح بخاری میں ہی کئی کئی جگہ مذکور ہوتی ہے پھر اصحاب نسخ کے لحاظ سے خود بخاری میں بھی الفاظ کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ فن حدیث کے لحاظ سے اگر چہ اس کو بہت اہمیت ہے مگر ہمارے موضوع کے لحاظ سے شاید اس کا فائدہ اتنا نہ ہو پھر اس کے لیے جتنی مدت درکار ہے وہ اہل علم ہی جان سکتے ہیں۔ ایک علمی تحقیق کے پیچھے ارشاد و تبلیغ کے اہم مقصد کو تاخیر میں ڈال دینا مناسب نہ تھا۔ ادھر ان کتب پر اعتماد کر لینا کچھ ناموزوں بھی نہیں۔ آخر صاحب مشکوٰۃ کو مصابیح جیسی کتاب کے لفظی اختلافات پر کہیں کہیں تنبیہ کرنا پڑی ہے اس کے باوجود اصل کتاب کا وزن کچھ کم نہیں ہوا بلکہ اس کو معمولی اختلاف سمجھ کر مختلف محامل پر محمول کر لیا گیا ہے۔

معذرت ✻ تمام خامیوں کے باوجود وقت کی تنگی قدم قدم پر میرے خیالات کو حسب دلخواہ عملی جامہ پہنانے میں مانع رہی۔ ایک طرف میری ایک سالہ خدمت رائیگاں جا چکی تھی دوسری طرف ندوۃ المصنفین اسی سال اس کتاب کے پیش کرنے کا اعلان کر چکا تھا اس لیے کام کی رفتار تیز رکھنی پڑی' دن بھر میں جتنا مسودہ تیار ہو جاتا کاتب کے حوالہ کر دیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں عنوانات و احادیث کی تلاش کے ساتھ تمام گذشتہ عنوانات کا استحضار رہنا مشکل تھا۔ اس لیے عنوانات میں جتنا حسن ترتیب قائم رہنا چاہیے تھا قائم نہیں رہ سکا۔ بسا اوقات کسی مضمون کے متعلق کوئی مفید حدیث خیال میں آئی لیکن اس کا اصل موقعہ ہاتھ سے نکل چکا تھا اس لیے دوسرے باب میں کسی دوسرے عنوان کے تحت میں اس کو درج کرنا پڑا مثلاً جس حدیث پر الاستشفاع بالرسول کا باب قائم کیا گیا ہے اس کا اصل محل عظمت باری کا باب تھا لیکن اس وقت اس حدیث کی طرف ذہن منتقل نہیں ہو سکا بدرجہ مجبوری اس کو رسالت کے باب میں ایک دوسرے عنوان سے درج کیا گیا اسی طرح ہر ہر قدم پر مختلف تصنیفی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے جن کی وجہ سے ندوۃ المصنفین کے قائم کیے ہوئے تخیل کا صحیح خاکہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اس عجلت میں اس خدمت کا جو نقش اوّل آپ کے سامنے آ رہا ہے وہ کتاب کے افادے اور مؤلف کی کاوش کا اندازہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

آخر میں باادب گذارش ہے کہ جو دماغ فلسفہ و سائنس کے دقیق سے دقیق مسائل حل کرنے سے نہیں گھبراتے وہ احادیث نبویہ کے اس ذخیرہ کو دیکھ کر پہلے سے پہلے ہی گھبرانہ جائیں بلکہ اس کو دیکھیں اور پھر دیکھیں اس پر بھی اگر کچھ مشکل باقی رہ جائے تو اس میں کوتاہی مؤلف کے ساتھ اس فن کی اجنبیت اور اپنے مذاقِ طبیعت کے اختلاف کا دخل بھی تصور فرمائیں اگر ابتداءً کچھ تلخی برداشت کر لی گئی اور آزردہ ہو کر کتاب کو چھوڑا نہیں گیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اتنی مناسبت پیدا ہو جائے گی کہ پھر بہ تکلف چھوڑنا بھی چاہیں تو چھوڑ نہ سکیں گے۔

اربابِ علم سے استدعا ہے کہ وہ اپنی منصفانہ علمی تنقید سے مطلع فرمائیں تاکہ طبع ثانی میں اس کا لحاظ رکھا جائے۔

اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَ تُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ. (آمین)

محمد بدر عالم عفا اللہ عنہ
ندوۃ المصنفین دہلی

حدیث افتراقِ اُمت

اور

اس کی اسناد پر ایک نظر

امام ترمذیؒ نے حدیث افتراق امت روایت کرنے والوں میں چار صحابہؓ کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمروؓ کی روایت تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے اور حضرت سعدؓ اور عوف بن مالکؓ کا صرف حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے پھر اوّل الذکر صحابی کی حدیث پر صحت کا حکم لگایا ہے اور ثانی الذکر[1] کی حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ❋

عن ابی هريرة رضی الله عنه ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال تفرقت اليهود على احدىٰ و سبعين او ثنين و سبعين فرقة و النصارى مثل ذلک و تفترق امتی علی ثلاث و سبعين فرقة. (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں منقسم ہوئے اور نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہوجائے گی۔

حافظ سخاوی نے بھی مقاصد حسنہ میں اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے اور شیخ محمد طاہر نے تذکرۃ الموضوعات میں اسے نقل فرما کر کوئی اختلافِ رائے ظاہر نہیں کیا۔ امام شاطبیؒ نے کتاب الاعتصام میں ابوہریرہؓ کی روایت پر کئی جگہ صحت کا حکم لگایا ہے[2]

حدیث افتراق کے پندرہ راویوں کے نام ❋ شارح سفر السعادۃ نے امام ترمذی کے پیش کردہ ناموں پر گیارہ صحابہ کا اور اضافہ کیا ہے۔ انس، جابر، ابوامامہ، ابن مسعود، علی، عمرو بن عوف، عویمر، ابوالدرداء، ابو معاویہ[3] ابن عمر واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ اس طرح اس حدیث کے رواۃ کی تعداد ۱۵ تک پہنچ جاتی ہے جن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے متعلق جہاں تک ہمیں معلوم ہے کسی نے کوئی قابل ذکر ردوقدح نہیں کی۔ بعض دوسرے صحابہؓ کی روایات میں البتہ کچھ کلام کیا گیا

---

[1] حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی ہے وہ ضعیف ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸)

[2] دیکھو ج ۲ ص ۱۶۳ و ۱۷۰ و ۲۰۶۔ اور الموافقات ج ۴ ص ۱۷۷۔ حاکم نے حدیث مذکور کو دو جگہ روایت کیا ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۶ و ۱۲۸) ذہبی فرماتے ہیں: على شرط مسلم یعنی یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔

[3] مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ مسند احمد و ابوداؤد صحابی کا نام معاویہ ذکر کیا ہے۔ اگر کتب حدیث میں کہیں ابو معاویہ کی روایت مل جائے تو خیر ورنہ بظاہر یہاں راوی معاویہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کنز العمال میں بھی راوی کا نام معاویہ ہے بحوالہ مسند احمد و طبرانی، مستدرک (ج ۱ ص ۵۴) مستدرک میں بھی معاویہ ہے۔ (دیکھو ج ۱ ص ۱۲۸)

ہے جو مختصراً درج ذیل ہے-

حضرت انسؓ کی روایت ✵ شیخ جلال الدین سیوطیؒ حضرت انسؓ کی روایت عقیلی اور دارقطنی کے حوالہ سے پیش کر کے تحریر فرماتے ہیں: و الحديث المعروف و احدة في الجنة و هي الجماعة . (یعنی معروف حدیث کے الفاظ یہ ہیں "ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ مسلمانوں کی جماعت ہوگی) پھر بطریق ابن عدی نقل کر کے کہتے ہیں و المحفوظ في المتن (یعنی اس متن کے جو الفاظ محفوظ ہیں یہ ہیں) تفترق امتي عن ثلاث و سبعين فرقة كلها في النار الا واحدة.[1]

اہل علم جانتے ہیں کہ معروف و محفوظ، منکر و شاذ کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور شاذ و منکر میں صرف راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا فرق ہے گویا پہلے الفاظ کے خلاف روایت کرنے والے راوی ثقہ نہیں ہیں اور دوسرے متن کے خلاف راوی اگرچہ ثقہ ہیں مگر ان کے الفاظ میں شذوذ ہے- بہر حال معروف و محفوظ کہہ کر حافظ سیوطیؒ نے حضرت انسؓ کی روایت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی ہے-

حافظ نورالدین ہیثمی نے اس مقام پر قدرے مبسوط کلام کیا ہے اور اس حدیث کے طرق سنن مشہورہ کے علاوہ مسند ابویعلی، مسند بزار اور طبرانی سے پیش فرما کر ہر صحابیؓ کی روایت پر تنقید کی ہے- چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت کو بطریق مسند ابویعلی ایک طویل سیاق کے ساتھ نقل فرما کر لکھتے ہیں-

و يزيد الرقاشي ضعفه الجمهور و فيه توثيق لين و بقية رجاله رجال الصحيح.[2]	اس میں ایک راوی یزید رقاشی ہے جس کو جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے اور ہلکے درجہ پر اس کی توثیق بھی کی گئی ہے بقیہ تمام راوی صحیح کے راوی ہیں-

ایک جگہ اسی حدیث کا دوسرا طریقہ پیش کر کے اس پر حسب ذیل کلام کرتے ہیں-

رواه ابو يعلى و فيه ابو معشر نجيح و فيه ضعف[3]	اس حدیث کو ابویعلی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی ابومعشر نجیح ہے اس میں قدرے ضعف ہے-

حضرت ابوامامہؓ کی روایت ✵ حضرت ابوامامہؓ کی روایت کے متعلق فرماتے ہیں-

رواه ابن ماجه و الترمذي باختصار و رواه الطبراني و رجاله ثقات[4]	اس کو ابن ماجہ اور ترمذی نے مختصراً روایت کیا ہے اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں-

ساتویں جلد میں اتنی تفصیل اور مذکور ہے-

رواه الطبراني في الاوسط و الكبير بنحوه و فيه ابو غالب و ثقه يحيى	اس حدیث کو طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے اور معجم کبیر میں بھی اسی کے قریب قریب الفاظ کے

---

[1] اللآلی ص ۲۴۸ و ۲۴۹- [2] مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۲۶- [3] ایضاً ج ۷ ص ۲۵۸- [4] ایضاً ج ۶ ص ۲۳۴-

بن معین وغیرہ و بقیۃ رجال الاوسط ثقات و کک احدی اسناد الکبیر۔[۲]

ساتھ روایت کیا ہے اس میں ایک روای ابو غالب[۱] ہے۔ یحی بن معین وغیرہ نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے بقیہ معجم اوسط کے سب راوی ثقہ ہیں اور اسی طرح معجم کبیر کی ایک اسناد کا حال ہے۔

حضرت سعد بن وقاصؓ کی روایت ✲ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت مسند بزار سے نقل کر کے لکھتے ہیں۔

رواہ البزار و فیہ موسیٰ بن عبیدۃ الربذی و ھو ضعیف۔[۳]

مسند بزار میں اس کو روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی موسیٰ بن عبیدہ ربذی ضعیف ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ✲ پھر اسی جلد میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت کے متعلق حسب ذیل ارشاد ہے۔

رواہ ابو یعلی وفیہ لیث بن ابی سلیم و ھو مدلس و بقیۃ رجالہ ثقات۔[۴]

اس کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اس میں ایک راوی لیث بن ابی سلیم ہے جو مدلس ہے[۵] بقیہ راوی ثقہ ہیں۔

حضرت ابوالدرداء و واثلہ کی روایت ✲ پھر حضرت ابوالدرداء، ابوامامہ، واثلہ اور انس کی روایات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

رواہ الطبرانی و فیہ کثیر بن مروان و ھو ضعیف جدًا۔[۶]

اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی کثیر بن مروان ہے اور وہ بہت ضعیف ہے۔

حضرت عمرو بن عوفؓ کی روایت ✲ اس کے بعد حضرت عمرو بن عوفؓ کی روایت بحوالہ طبرانی نقل کر کے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے۔

رواہ الطبرانی و فیہ کثیر بن عبداللہ و ھو ضعیف و قد حسن الترمذی لہ حدیثا و بقیۃ رجالہ ثقات۔[۷]

اس میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ ضعیف ہے۔ ترمذی نے اس کی ایک حدیث کی تحسین بھی کی ہے بقیہ تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہیں۔

بلا شبہ کثیر بن عبداللہ کے بارے میں محدثین کی رائے اچھی نہیں ہے اور اسی وجہ سے امام ترمذیؒ کی تحسین کو بھی قابل اعتراض سمجھا گیا ہے مگر اہل علم و تجربہ جانتے ہیں کہ ترمذی اگر ضعیف راویوں کی روایات کی تحسین کرتے ہیں تو بیشتر ایسی

۱۔ ابو غالب کے نام میں اختلاف ہے کوئی حزور کوئی سعید بن حزور اور کوئی نافع کہتا ہے۔ تہذیب التہذیب کی بارہویں جلد میں حافظ ابن حجرؒ نے ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ بعض کتب میں ابو غالب کی بجائے ابن ابی غالب لکھا گیا ہے ہمارے نزدیک اس حدیث کے راوی ابو غالب ہی ہیں اسی طرح کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۳۳ میں زاء کی بجائے حرور راء کے ساتھ لکھا ہے وہ بھی کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۲ و ۳ و ۴ مجمع الزوائد ج ۷ ص ۲۵۹۔

۵ یہ راوی مختلف فیہ ہے بایں ہمہ اس کو ثقہ بھی کہا گیا ہے۔

۶ مجمع الزوائد ج ۷ ص ۲۵۹۔ ۷ ایضاً ج ۷ ص ۲۶۰ و مستدرک ج ۱ ص ۱۲۹۔

جگہ کرتے ہیں جہاں تعامل یا خارجی دلائل سے روایت کی قوت ثابت ہو جاتی ہے صرف اس ضعیف طریقہ ہی پر ان کی نظر نہیں ہوتی - بنابریں اگر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کی صحت کے بعد اس طریقہ کی بھی تحسین کر دی جائے تو گنجائش نکل سکتی ہے-

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت ❋ باب افتراق امت کے خاتمہ پر حافظ نورالدین نے حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث تحریر فرما کر لکھا ہے-

رواه الطبرانی باسنادین و رجال احدهما رجال الصحیح غیر بکیر بن معروف و ثقه احمد و غیره و فیه ضعف.	اس حدیث کو طبرانی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے جس میں ایک سند کے راوی وہی ہیں جو صحیح کے راوی ہیں سوائے بکیر بن معروف کے کہ وہ صحیح کا راوی نہیں ہے مگر امام احمد وغیرہ نے اس کی توثیق کی ہے اور اس میں کچھ ضعف ہے-

حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت ❋ عوف بن مالکؓ کی روایت مستدرک حاکم میں موجود ہے اور اس کے متعلق حاکم کے الفاظ یہ ہیں-

هذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین [۱]	یہ حدیث بخاری و مسلم رحمۃ اللہ علیہما کی شرط پر صحیح ہے-

حاکم کی تصحیح کو عام طور علماء بنظر اعتبار نہیں دیکھتے مگر یہاں حافظ ذہبی نے بھی سکوت کیا ہے اور ان کے خلاف کوئی نکتہ چینی نہیں کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہبی کو بھی ان سے اتفاق ہے ورنہ وہ حسب عادت یہاں بھی اپنا اختلافِ رائے ظاہر کرتے-

حضرت علیؓ کی حدیث ❋ علامہ شاطبیؒ نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کر کے لکھا ہے **لا أضمن عهدة صحته** میں اس کی صحت کی ذمہ داری نہیں لیتا [۲] مگر کوئی خاص جرح بھی نہیں فرمائی -

حدیث معاویہؓ ❋ اور ابو ہریرہؓ کی حدیث نقل کر کے حاکم فرماتے ہیں-

هذه اسانید تقام بها الحجة فی تصحیح هذا الحدیث [۳]	یہ اسانید ایسی ہیں کہ ان کی بنا پر حدیث کو صحیح کہا جا سکتا ہے-

اتنی بات کو ذہبیؒ نے بھی تسلیم کیا ہے-

پندرہ صحابہ میں سے تیرہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی احادیث پر علماء کے یہ خیالات ہیں ان میں ابو ہریرہؓ، عبداللہ بن عمروؓ، انسؓ، ابوامامہؓ، عمرو بن عوفؓ، معاویہؓ، ابن عمرؓ، عوف بن مالکؓ کی روایات صحیح یا حسن کے درجہ پر آ سکتی ہیں- بقیہ روایات کی

---

[۱] مستدرک ج ۴ص ۴۳۰- [۲] الاعتصام ج ۲ص ۲۱۱- [۳] مستدرک ج ۱ص ۱۲۸-

اسانید اگر چہ ضعیف ہوں مگر تعدد طرق کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ بھی قاطبۃً نظر انداز کرنے کے لائق نہیں - اب اس مجموعہ روایات کو سامنے رکھ کر انصاف کیجئے کہ جو حدیث اتنے صحابہؓ سے مختلف صحیح اور حسن طریقوں سے مروی ہو کیا محض چند شبہات کی وجہ سے اس سے صرفِ نظر کر لینا درست ہوگا -

کسی حدیث پر اجمالی حکم اس کے مجموعہ طرق پر حکم نہیں ہے ✸ مذکورہ بالا بیان سے مختصراً یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ایک حدیث کتنے کتنے صحابہؓ سے روایت کی گئی ہے - پھر ایک ایک صحابی کی حدیث کے کتنے کتنے طریقے ہیں - اس لیے کسی حدیث کے متعلق ضعف یا صحت کا حکم دیکھ کر پہلے یہ تحقیق کر لینا چاہیے کہ یہ حکم اس کے تمام طریقوں پر حاوی ہے یا کسی خاص صحابی کی حدیث یا اس کے کسی خاص طریقے سے متعلق ہے پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک ایک حدیث کے تمام طریقے ہر محدث کے پیش نظر ہوں -

امام ترمذی جیسا جلیل القدر امام امام حدیث یہاں صرف چار صحابہ کا پتہ دیتا ہے حالانکہ ان کے علاوہ گیارہ صحابہ اور بھی ہیں جو اس کو روایت کرنے والے ہیں - پس اگر کوئی محدث کسی حدیث پر کوئی اجمالی حکم لگاتا ہے تو یہ صرف اس کے علمی استحضار کے لحاظ سے ہے - اب اگر خارجی ذرائع اور تحقیقات سے کسی خاص طریقہ کا ضعف وصحت ثابت ہو جائے تو یہ اس کے مبہم حکم کے ہرگز معارض نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کے علم میں یہ طریق نہ ہو ہاں اگر ان طرق کے علم کے بعد بھی اس کی رائے وہی رہتی ہے تو اب اس کو مخالف یا موافق کہنا درست ہوگا اس کے بعد اختلافِ رائے کا مرحلہ پھر زیر بحث رہے گا - راویوں اور روایات کے سلسلہ میں تضعیف وتوثیق کا معاملہ اہل علم کے نزدیک دن رات کی بات ہے - ایک ناواقف ایک محدث کی رائے نقل کر کے اسے سارے طریقوں پر حاوی بنا دیتا ہے اور اس ایک رائے کو سارے محدثین کی رائے سمجھ بیٹھتا ہے اور واقف حال کو تحقیق کے بعد غور کرنا پڑتا ہے کہ دلائل کا پلّہ کس طرف بھاری ہے - یہی حدیث جس کے متعلق آپ نے یہ تفصیل پڑھی - اب آیئے اس کے مخالف آراء کا حال دیکھئے علامہ مجد الدین فیروز آبادی سفر السعادۃ کے خاتمہ پر اس حدیث کے متعلق رکھتے ہیں -

لم یثبت فیه شئی. "اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوئی" -

احادیث پر تنقید کی تین تعبیرات اور ان کا فرق ✸ ان الفاظ کو دیکھ کر بعض لوگ تو یہاں تک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مصنف کے نزدیک یہ حدیث گویا موضوع ہے - کاش ان حضرات نے اگر اس کتاب کی ذرا ورق گردانی کی ہوتی تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ مصنف نے احادیث پر حکم لگانے کے لیے مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں کہیں "باطل موضوع" اور کہیں "لم یصح فیه حدیث" اور کہیں "لم یثبت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں - ان تینوں الفاظ میں بڑا فرق ہے پہلی تعبیر کا مطلب یہ ہے کہ اس مضمون کو حدیثِ رسول کہنا ہی غلط ہے اور دوسرا لفظ صرف صحت کی نفی کرتا ہے خواہ کسی درجے میں حدیث ثابت ہی کیوں نہ ہو - چنانچہ قنوت، جہر بسم اللہ اور وضوء بالنبیذ کی احادیث پر بھی مصنف نے یہی حکم لگایا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب حدیثیں بے اصل ہیں - اسی طرح "لم یثبت" کا لفظ ضعیف طرق کی نفی نہیں کرتا - اگر ان تعبیرات کے فروق کی رعایت کی جائے تو پھر بہت سے

مواضع پر مصنف کے کلام سے اعتراض اٹھ جائے گا۔[۱]

علاوہ ازیں شارح سفر السعادۃ لکھتے ہیں کہ علامہ مجد الدین کا یہ حکم صرف ان الفاظ پر ہے جو یہاں انہوں نے نقل کیے ہیں یعنی ۷۲ فرقوں میں امت کا افتراق۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ لفظ تمام طریقوں کے خلاف ہے۔ حافظ سیوطیؒ نے حضرت انسؓ کی روایت

---

[۱] مولانا عبدالحیٔ صاحب نے رسالہ الرفع و التکمیل میں ان فروق کی پوری تشریح فرمادی ہے ملاحظہ ہو۔

کثیر اما یقولون لا یصح او لا یثبت ھذا الحدیث و یظن منه من لا علم له انه موضوع او ضعیف و ھو مبنی علی جھله بمصطلحاتھم و عدم وقوفه علی مصر حاتھم. فقد قال علی القاری فی تذکرۃ الموضوعات لا یلزم من عدم الثبوت وجود الوضع انتھٰی. و قال الحافظ ابن حجر فی تخریج احادیث الافکار المسمی بنتائج الا فکار ثبت عن احمد بن حنبل انه قال لا اعلم فی التسمیة فی الوضوء حدیثا ثابتا قلت لا یلزم من نفی العلم ثبوت العدم و علی التنزل لا یلزم من نفی الثبوت ثبوت الضعف لا حتمال ان یرادبا لثبوت الصحة فلا ینتفی الحسن و علی التنزل لا یلزم من نفی الثبوت عن کل فرد نفیه عن المجموع. و قال نور الدین السمھوری قلت لا یلزم من قول احمد فی حدیث التوسعة علی العیال یوم عاشوراء لا یصح ان یکون باطلاً فقد یکون غیر صحیح و ھو صالح للاحتجاج به اذا لحسن رتبة بین الصحیح و الضعیف. اھ. و قال الزرکشی فی نکته علی ابن الصلاح. بین قولنا موضوع و بین قولنا لا یصح بون کثیر . فان الاول اثبات الکذب و الاختلاق و الثانی اخبار عن عدم الثبوت و لا یلزم منه اثبات العدم و ھذ ایجئ فی کل حدیث قال فیه ابن الجوزی لا یصح و نحن اھ . و قال علی القاری مع ان قول السخاوی لا یصح لاینا فی الضعف و الحسن اھ.قال الزرقانی و نقل القسطلانی عن ابن رجب ان ابن حبان صححه فیه رد علی قول ابن دحیه لم یصح فی لیلة نصف شعبان شئ الا ان یرید نفی الصحة الا صطلاحیة فان حدیث معاذ ھذا حسن لا صحیح اھ.

بسا اوقات محدثین لا یصح یا لا یثبت کا لفظ فرماتے ہیں۔ ناواقف اس کا مطلب یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک موضوع یا ضعیف ہے یہ خیال ان کی اصطلاح سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ ملّا علی قاری تذکرۃ الموضوعات میں فرماتے ہیں کہ عدم ثبوت کہنے سے اس کا موضوع ہو جانا ضروری نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نتائج الافکار میں فرماتے ہیں کہ امام احمد فرماتے تھے کہ میرے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کے متعلق کوئی حدیث ثابت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے تو کسی شخص کے نہ جاننے سے اس چیز کا فی الواقع نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے تو پھر نفی ثبوت سے اس کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے تو ہر ہر فرد کے نفی ثبوت سے مجموعہ کا ثبوت نہ ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ نورالدین سمہوری فرماتے ہیں کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے عاشوراء کی حدیث کے متعلق (لایصح) فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ باطل ہو، ہوسکتا ہے کہ صحیح تو نہ ہو مگر قابل استدلال ہو کیونکہ صحیح اور ضعیف کے درمیان ایک مرتبہ حسن کا بھی ہے زرکشی نکت ابن صلاح میں فرماتے ہیں کہ ہمارے (لایصح) اور (موضوع) کہنے میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ موضوع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راوی کا جھوٹ اور وضع ثابت ہوگیا ہے اور (لایصح) میں صرف عدم ثبوت کی خبر ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس کا عدم ثابت مان لیا جائے یہی بات ان تمام حدیثوں کے متعلق کہی جاسکتی ہے جن کے بارے میں ابن جوزی نے لایصح یا اسی طرح کا کوئی اور حکم لگا دیا ہے۔ اھ زرقانی کہتے ہیں کہ قسطلانی نے حافظ ابن رجب سے یہ نقل کیا ہے کہ ابن حبان نے شب نصف شعبان کی فضیلت کی حدیث کو صحیح کہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث کے متعلق ابن دحیہ کا (لم یصح) کہنا غلط ہے مگر یہ کہ اس کے کلام میں اصطلاحی صحت کی نفی مراد لی جائے کیونکہ معاذ کی یہ حدیث اصطلاحی طور پر یقیناً صحیح نہیں ہے گو حسن ہو۔

کے صرف ایک طریقہ میں یہ لفظ پیش کیا ہے. بقیہ سب طرق و روایات میں ۳۷ کا لفظ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ سفر السعادۃ کے بعض نسخوں میں دو کی بجائے تین کا لفظ بھی موجود ہے اس کے متعلق شارح فرماتے ہیں ''اگر ایں چنیں است محل سخن است'' اگر ۳۷ کی روایت کے متعلق بھی مصنف کی یہی رائے ہے تو اس میں کلام ہے۔

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ بھی زیرعنوان ''الکلام فیمن یکفرو من لا یکفر'' اس حدیث کے ساتھ ایک اور حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ھذان حدیثان لا یصحان اصلا عن طریق الاسناد [1]	یہ دونوں حدیثیں اسنادی لحاظ سے بالکل صحیح نہیں۔

یہاں بھی صحت کی نفی ہے اب ان دونوں حضرات کا یہ مجمل حکم دیکھئے اور اس کے مقابلہ میں وہ ساری تفصیلات سامنے رکھئے جہاں ایک ایک روایت کی پوری چھان بین کی گئی ہے۔

ابن حزم کی رائے فیصلہ کن نہیں ہے ٭ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ ان حفاظِ حدیث کے سامنے وہ سب طرق موجود بھی ہیں یا نہیں اور اگر موجود بھی ہیں تو کیا اصولِ حدیث کا یہ کوئی ضابطہ ہے کہ جس طرف ابن حزم ہو جائیں بس راہِ صواب اسی میں منحصر ہو جائے گی اگر ایک طرف حافظ ابن جوزی کا تشدد امت میں ضرب المثل ہے تو اس کے ساتھ ہی ابن حزم کی زبان کا سیف [2] حجاج ہونا بھی مشہور ہے۔

بہرحال حدیث کا معاملہ ماوشما کے تابع نہیں ہے۔ حدیث کے اسانید اب بھی موجود ہیں۔ ان مبہم اور مجمل کلمات کو چھوڑ کر اس کے رجال پر تفصیلاً نظر کر لینا چاہیے اس کے بعد بھی اگر رجحان ابن حزم اور علامہ مجد الدین کے ساتھ رہتا ہے تو امر دیگر ہے۔ [3] پھر یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ حافظ ابن حزم اپنی وسعت نظر کے باوجود خود امام ترمذی اور ان کی کتاب الجامع سے ناواقف ہیں اس لیے ان کا ''لایصح'' کہنا اور بھی بے اثر ہو جاتا ہے۔

---

[1] کتاب الفصل ج ۳ ص ۱۳۸۔

[2] اس کی وجہ حافظ ابن حزم نے اپنی تصنیف مداواۃ النفوس میں خود تحریر فرمائی ہے۔

ولقد اصابتنی علۃ شدیدۃ ولدت علی ربوا فی الطحال شدید افولد ذلک علی و من الفجر و ضیق الخلق و قلۃ الصبر و التزق امرا حاسبت نفسی فیہ فانکرت تبدل خلقی و اشتد عجبی من مفارقتی لطبعی. (توجیہ النظر ص ۳۱ تحت استدراك فی الفائدۃ السابعہ)	میں ایک شدید بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میری تلی بہت بڑھ گئی تھی اس لیے میرے مزاج میں تنگی، تیزی و بد اخلاقی، جلد بازی پیدا ہو گئی ہے جب میں اپنی پہلی زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میرے عادات و اخلاق کس قدر تبدیل ہو گئے ہیں اور میں اپنی اصلی طبیعت سے کتنا دور ہو گیا ہوں۔

[3] حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ابن حزم اپنی جلالت قدر کے باوجود امام ترمذی جیسے شخص سے بالکل ناآشنا ہیں حتی کے جب ان کے سامنے امام ﷲ

حدیث کی صحت پر معنوی قرائن

حنفیت اور یہودیت ونصرانیت کا تقابل ⁕ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی دنیا میں دین حنیف کے حریف صرف دو مذہب ہیں یہودیت اور نصرانیت عہد نبوۃ میں بھی حریفانہ جنگ ان ہی دو کے درمیان نظر آتی ہے اور احادیثِ صحیح بھی ان ہی دو کے درمیان مستقبل میں کشمکش کا پتہ دیتی ہیں۔ آیاتِ ذیل کو بغور پڑھئے اور اس جذبہ کا اندازہ کر لیجئے۔

قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا. (البقرۃ : ۱۳۵) کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ یا نصرانی بن جاؤ تو راہ یاب ہو گے آپ ان سے کہہ دیجئے بلکہ میں حضرت ابراہیمؑ کی ملت کا متبع ہوں جو ایک طرف ہو جانے والا تھا۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا. (آل عمران : ٦٧) حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ ایک طرف ہو کر خدا کے فرمانبردار نبی تھے۔

غیر المغضوب علیھم میں اتباع یہود ونصاریٰ کی طرف ایک لطیف اشارہ ⁕ غالباً اسی لیے قرآن کریم نے صراطِ مستقیم کی تفسیر کرتے ہوئے اثباتی پہلو میں منعم علیھم کا اور سلبی پہلو میں مغضوب علیھم اور ضالین ہی کا ذکر کیا ہے اور اس اہتمام سے کیا ہے گویا جب تک یہ سلبی پہلو ذکر نہ کیا جائے اس وقت تک صرف صراط الذین انعمت علیھم اس کے پورے مفہوم کو ادا ہی نہیں کرتا پھر اس دعاء کے پنجوقتہ تعلیم کرنے میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ملت حنیفیہ پر سب سے زیادہ خطرہ ہے تو شاید ان مغضوب علیھم اور ضالین کی اتباع کا ہے جس کا دوسرا نام یہودیت ونصرانیت ہے۔

مشرکین و یہود کے تعلقات ⁕ کتب سیرت کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیت ونصرانیت بھی گو آسمانی دین تھے مگر مشرکین کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات قائم تھے جونہی اسلام نے دنیا میں قدم رکھا سب سے پہلے مشرکین کے ساتھ اس کے مدمقابل یہی یہودی ونصرانی تھے حالانکہ دینِ سماوی میں اشتراک کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو دین حنفی کے ساتھ پوری ہمدردی ہوتی اور بجائے مشرکین کے ان کا رخ اسلام کی طرف ہو جاتا لیکن جیسے جیسے اسلام ترقی کرتا رہا اسی قدر یہودیت ونصرانیت بڑھ بڑھ کر اسی

لہ ترمذیؒ کا تذکرہ ہوا تو تعجب سے فرمایا "ومن محمد بن عیسٰی بن سورۃ؟" یہ محمد بن عیسٰی کون شخص ہیں۔

(دیکھو الباعث الحثیث الی معرفۃ علوم الحدیث)

حافظ ابن حجر امام ترمذی کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ و اما ابو محمد بن حزم فانه نادی علی نفسه بعدم الاطلاع فقال فی کتاب الفرائض من الایصال محمد بن عیسٰی بن سورۃ مجھول. ابن حزم کو اس بات کا خود اقرار ہے کہ وہ محمد بن عیسٰی (ترمذی) سے واقف نہیں ہیں چنانچہ ان کو مجہول لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب)

حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔ ترمذی کے بارے میں ابن حزم کا قول کہ وہ مجہول شخص ہیں کچھ قابل التفات نہیں ہے کیونکہ ان کو نہ امام ترمذی کی کتاب جامع سے واقفیت ہے اور نہ ان کی کتاب العلل کا علم ہے۔ (میزان الاعتدال)

کے مقابلہ پر آتی رہی یہاں تک کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو مشرکین عرب نے اسلام کے سامنے سپر ڈال دی اور ان کی طرف سے شریعت مطہرہ کو اتنا اطمینان میسر ہوا کہ صاف لفظوں میں یہ اعلان کر دیا گیا۔

ان الشیطان قدأیس ان یعبده المصلون فی جزیرة العرب. (مشکوٰۃ شریف)

شیطان اب اس بات سے ناامید ہو چکا ہے کہ نمازی مسلمان پھر کبھی جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں گے۔

پیغمبر اسلام کا یہود و نصاریٰ کی طرف سے خطرہ کا آخری الارم ✵ لیکن یہودیت و نصرانیت کا علم جنگ اسلام کے بالمقابل برابر لہراتا رہا اور کسی وقت بھی اسلام کو ان کی دسیسہ کاریوں سے اطمینان میسر نہ ہوا حتی کہ صاحب شریعت کے آخری لمحات کی وصیتوں میں ایک مہتم بالشان وصیت یہ تھی۔

اخرجوا الیهود و النصاری من جزیرة العرب.

یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب کے چپے چپے سے باہر نکال دینا۔

اسی حریفانہ کشمکش کا نتیجہ تھا کہ جب حنیفیت کا زمین پر اقتدار ہوا تو یہودیت و نصرانیت مغلوب ہو گئیں اور جب کبھی یہودیت و نصرانیت کا غلبہ ہوا تو حنیفیت کو مغلوب ہو جانا پڑا۔

یہود و نصاریٰ سے جزیہ قبول کرنے کی وجہ ✵ اس سلسلہ میں واضح رہنا چاہیے کہ یہودیت و نصرانیت کے مسخ ہو جانے کے باوجود اسلام نے محض دین سماوی ہونے کے باعث ان کی بڑی رعایت رکھی ہے۔

موافقت اہل کتاب کی عام سنت فتح مکہ تک تھی ✵ چنانچہ اسلام فتح مکہ سے قبل تک جن امور میں جدید ہدایات نازل نہ ہوتیں بہ نسبت کفار کے ان کی موافقت کو ترجیح دیتا رہا لیکن جب اس سلوک کے بعد بھی ان کا دل نہ پسیجا تو یہ ثابت ہو گیا کہ اب ان کے سینہ پر کینہ سے اسلام کی عداوت نکلنے والی نہیں ہے اس لیے مخالفت کا حکم دے دیا گیا اور آئندہ ان تمام مواقع پر جہاں جہاں سے حنیفیت کو یہودیت و نصرانیت سے خطرہ ہو سکتا تھا امت کو خبردار کر دیا گیا۔

مشترکہ حدود کی نگرانی میں اسلام کی خیر مضمر ہے ✵ روزہ، نماز، شکل و شباہت، دعاء و سلام میں غرض جہاں بھی اسلامی حدود ان کے حدود سے ملتے نظر آتے تھے ملت حنیفیہ کے حلقہ بگوشوں کو تنبیہ کر دی گئی کہ اپنے حدود کی نگرانی رکھیں۔ اس کے باوجود صاحب نبوۃ کی دُوربین نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ اس حریف کا ایک دن پھر غلبہ ہو گا اور پھر پیروانِ ملت حنیفی یہودیت و نصرانیت کے پیچھے چل پڑیں گے۔ اسی عہد نامسعود کا نقشہ صحیح بخاری کی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے۔

اس امت میں یہود و نصاریٰ کی اتباع کی پیشگوئی ✵

قال لتتبعن سنن الذین من قبلکم شبرا بشبر و ذراعا بذراع حتی لو دخلوا فی حجر ضب لاتبعتموه قلنا یا رسول الله الیهود و النصاری قال فمن.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ضرور گذشتہ لوگوں کے قدم بقدم چل کر رہو گے حتی کہ اگر ان میں کوئی گوہ کے سوراغ میں داخل ہوا ہو گا تو تم بھی ضرور داخل ہو گے ہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ پھر اور کون۔

3 دوسرے الفاظ میں اس مجنونانہ اتباع کی غایت یہاں تک بیان کی گئی ہے کہ اگر ان میں کسی نے اپنے ماں سے علانیہ زناء کیا ہوگا تو تم میں بھی ایسے افراد ہوں گے جو یہ رُوسیاہی کر کے رہیں گے۔

بعض نومسلموں کو مشرکین کی نقالی کی تمنا اور آپ کی سرزنش ٭ جب تک اسلام کا ضعیف دور رہا بعض نومسلموں کے قلوب میں ہر معمولی اور غیر معمولی امور میں یہ ہی جذبہ اتباع ابھرتا رہا۔

''ابوواقد لیثی فرماتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ خیبر کی سمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئے اس وقت ہم نو مسلم تھے وہاں مشرکین نے ایک درخت اپنے ہتھیار لٹکانے کے لیے مقرر کر رکھا تھا ہم نے اسے دیکھ کر کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی درخت ہتھیار لٹکانے کے لیے مقرر کر دیجئے آپ نے تعجباً تکبیر کہی اور فرمایا یہ تو وہی بات ہوئی جیسا بنی اسرائیل نے (سمندر عبور کرنے کے بعد کچھ بت پرستوں کو پوجا کرتے دیکھ کر کہہ دیا تھا) اے موسیٰ جیسا خدا ان کا ہے ہمارے لیے بھی ایک ایسا ہی خدا بنا دیجئے۔ تم ضرور یہود و نصاریٰ کی نقالی کر کے رہو گے''۔

لیکن جتنی اسلام کو قوت حاصل ہوتی گئی اس کے یہ جذبات فنا ہوتے رہے حتیٰ کہ کچھ دن بعد ہی اب ان کا نقشہ یہ تھا کہ:

''حضرت مقداد بن الاسود جنگ بدر کی تیاری کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں کہتے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم وہ نہیں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ کہہ دیں: اے موسیٰ جا تو اور تیرا رب لڑ آ۔ ہم تو آپ کے دائیں بائیں آگے اور پیچھے رہ کر آپ کے ساتھ جنگ کریں گے''۔ (بخاری شریف)

اب ان دونوں جذبات کا موازنہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہی بات یعنی حرصِ اتباع جو دورِ ضعف میں غیر اختیاری طور پر منہ سے نکل رہی تھی اب انتہائی قابل نفرت و عار بن رہی ہے مگر دونوں جگہ نقطۂ تجاذب وہی بنی اسرائیل ہیں۔ اسلامی دورِ انحطاط میں وہی اتباع بنی اسرائیل کا جذبہ پھر لوٹ آئے گا۔ اور بنی اسرائیل کے جو مشابہت پہلے انتہائی قابل نفرت و حقارت معلوم ہوتی تھی پھر لائق رغبت بن جائے گی۔ امت محمدیہؐ کے اسی رجعت قہقریٰ کو صحیح بخاری کی حدیث بالا میں بیان کیا گیا ہے یعنی وہی بات جو آپ کے زمانہ میں قابل تعجب تھی آئندہ دور میں ناگزیر طور پر ہونے والی بات ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر یہود و نصاریٰ میں کسی نے ماں سے زنا کیا ہوگا تو اس بے حیائی میں بھی یہ امت ان کی اتباع کر کے رہے گی۔

امت محمدیہ شغف اتباع ہی کی بدولت صفت افتراق میں بھی اتباع کرے گی ٭ اس شغفِ اتباع سے یہ مترشح ہو رہا ہے کہ یہ امت جب ہر معقول اور نامعقول بات میں ان کے نقش قدم پر چلے گی تو یقیناً ضلالت اور گمراہی کی وہ سب راہیں جو یہود و نصاریٰ نے اختیار کی تھیں یہ بھی اختیار کرے گی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جتنے گمراہ فرقے ان میں نمودار ہوئے تھے اس میں بھی نمودار ہوں گے لیکن افسوس یہ ہے کہ بلند تر جب گرتا ہے تو یہاں بھی فروتر رہتا ہے اس لیے امت محمدیہ جب دور عروج و کمال میں بلند تر تھی تو اپنے دورِ انحطاط میں اسے فروتر ہی رہنا چاہیے اور اسی لیے وصفِ افتراق میں یہود و نصاریٰ سے آگے آگے نظر آنا

3

چاہیے۔ آخر جو مسندِ اعلیٰ علیین پر جلوہ نما تھا جب ایمان اور عمل صالح سے محروم ہوا تو اس کا ٹھکانا اسفل السافلین ہی ٹھہرا۔

شدتِ اتباع اور حدیثِ افتراق کا تناسب ✵ غالباً اسی گہری مناسبت کی وجہ سے صحیح بخاری کی اس حدیث کو جامع ترمذی میں حدیث افتراق کے لیے بطور مقدمہ ذکر کیا گیا ہے یا بالفاظِ دیگر اس شدید افتراق کو اس مبالغہ آمیز اتباع کا ثمرہ اور نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو باتیں بنی اسرائیل میں ہوئیں وہ ٹھیک ٹھیک سب میری امت میں ہوں گی حتی کہ اگر ان میں سے کسی نے بے محابا اپنی ماں سے زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی کوئی ایسا بدبخت ہوگا جو اس بے حیائی کا ارتکاب کرے گا اور بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹے تھے۔ (آخر حدیث تک)

اس سیاق کو پڑھیے اور بغور پڑھیے اور اس عمیق ربط کی تہ تک پہنچ جائیے جو اس شدید اتباع اور شدید اختلاف کے مابین مستور ہے اگر آپ اس ربط کو پالیں تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ حدیثِ افتراق درحقیقت صحیح بخاری کی حدیثِ اتباع کا ایک تتمہ تھا جو وہاں رہ گیا تھا وہ یہاں ذکر کر دیا گیا ہے بہرحال اگر ہمارے پاس صرف صحیح بخاری ہی کی یہی ایک حدیث ہوتی تو افتراق امت کی اجمالی داستان پڑھنے کے لیے کافی تھی۔ آئندہ اوراق میں اس کے متعلق آیاتِ قرآنیہ کے کچھ اور اشارات بھی آپ کے ملاحظہ سے گذریں گے لیکن اس سے قبل ہم مفہوم اختلاف کو ذرا واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

لفظِ اختلاف کی توضیح

ہر یکساں حالت کے بعد جب اس کے خلاف کوئی دوسری حالت رونما ہوتی ہے تو اس کا نام ہم اختلاف رکھتے ہیں اس لحاظ سے اگر اس عالم پر عرش سے لے کر فرش تک نظر ڈالیں تو سارا عالم اسی اختلاف کی آماجگاہ نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس عالم کی کوئی زیادہ سے زیادہ صحیح تعریف ہوسکتی ہے تو بس یہی ایک لفظ اختلاف ہے۔

اختلافِ زمان ✵ لیل ونہار، شہور وسنین، پھر اس میں فصلوں اور موسموں کا ایک اختلاف ہے جسے اختلافِ زمان کہنا مناسب ہے اس اختلاف کو آیتِ ذیل میں ذکر کیا گیا ہے۔

وَ لَهُ اخۡتِلَافُ الَّيۡلِ وَ النَّهَارِ. (المومنون: ۸۰) شب و روز کا یہ اختلاف اللہ تعالیٰ ہی کا تصرف ہے۔

اختلاف السنہ والوان ✵ اس سے آگے بڑھیے تو حیوانات و نباتات و جمادات کا اختلاف پھر ان میں اجناس اور اجناس میں انواع اور انواع میں اصناف اور اصناف میں افراد کا اختلاف ہے پھر ان افراد میں طبیعتوں، مزاجوں، رنگوں اور زبانوں کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَ اَلۡوَانِكُمۡ. (الروم: ۲۲) تمہاری زبان اور رنگوں کا اختلاف۔

آفاق وانفس کا یہ اختلاف دیکھ کر صاف طور پر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ افتراق و اختلاف اس جہان کی فطرت ہے اور اسی پر اس کی آبادی کا مدار ہے۔

گل ہائے رنگ رنگ سے ہے رونق چمن　　اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اختلاف ضلالت و ہدایت ٭ لیکن اس وقت یہ اختلافات زیر بحث نہیں ہیں بلکہ اس سے بالاتر ضلالت و ہدایت کا ایک اختلاف ہے وہی ہمارا مرکز بحث ہے- اس لحاظ سے اگر مجموعۂ عالم پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ امم سابقہ ایک طرف ہیں اور امت محمدیہؐ دوسری طرف اسی کو حسب ذیل آیت میں ذکر کیا گیا ہے-

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ...... فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ...... (البقرۃ ۲۱۳)

تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے...... تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے مومنین کو ان باتوں میں ہدایت نصیب فرما دی جس میں کہ پیشتر امتوں نے ناحق اختلاف پھیلایا تھا-

امتحانی سوالات میں امت محمدیہ کی کامیابی کے مقامات ٭ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت میں اختلاف ہوا کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی' خدائے قدوس نے امت محمدیہ کو ہدایت نصیب فرمائی کہ یہ دونوں خیال غلط ہیں وہ دراصل حنیف تھے-

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اختلاف ہوا' یہود نے ان کا انکار کیا اور نصاریٰ نے خدا ٹھہرایا- یہاں امت محمدیہ کو ہدایت نصیب ہوئی اور جادۂ مستقیم ان ہی کے لیے مقدر رہا-

قبلہ کے بارے میں بھی ایک رائے یہی ہے کہ وہ امتوں کے انتخاب پر رکھا گیا تھا مگر انہوں نے یہاں بھی صحیح انتخاب نہ کیا اور جو اصل قبلہ تھا اس کی ہدایت اسی امت کو نصیب ہوئی-

جمعہ کا دن بھی اسی اختلاف کی ایک کڑی ہے پہلی امتوں نے یوم التعطیل میں غلطی کی' کسی نے یوم السبت اور کسی نے یوم الاحد مقرر کیا- امت محمدیہ کو یہاں بھی راہِ ہدایت نصیب ہوئی وغیرہ وغیرہ- اسی اختلاف کی طرف آیت ذیل میں بھی اشارہ کیا گیا ہے-

وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ.... (ھود: ۱۱۸-۱۱۹)

اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا لیکن وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے بجز ان کے جن پر آپ کا پروردگار رحم فرمائے اور اسی اختلاف کے لیے انہیں پیدا کیا ہے-

اختلاف امم ٭ عطاء اور مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہاں مختلفین سے یہودیت ونصرانیت' مجوسیت وحنیفیت کا اختلاف مراد ہے اور الامن رحم ربک سے مراد حنفاء ہیں- شاید اس لیے بھی اس امت کو امت مرحومہ کا خطاب دیا گیا ہو-

اختلاف امت محمدیہ ٭ لیکن اس اختلاف کے علاوہ ایک اور اختلاف ہے جو خود اس امت میں مقدر ہے وہ جماعت اہل حق اور باطل فرقوں کا اختلاف ہے اس بنا پر فرق باطلہ مختلفین کا مصداق رہیں گے اور اہل حق الامن رحم ربک کا-

اختلاف اہل حق ٭ اس سے بھی آگے خود جماعت اہل حق کا اختلاف ہے جس پر ہم آئندہ بحث کریں گے-

اختلاف کا تکوینی راز ٭ پہلے آیت کی مراد سنئے- اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نقاشِ عالم کو اپنی صفت جلال و جمال کی جلوہ نمائی منظور تھی اس لیے اس نے انسانوں کو ایسے ہی قویٰ فکریہ وعملیہ سے مرکب فرمایا ہے کہ وہ ہمیشہ اسبابِ سعادت وشقاوت میں

اختلاف کرتے ہی نظر آئیں گے اور اسی باہمی کشمکش میں خدائی قہر و مہر کا سامان مہیا ہوتا رہے گا۔ اگر اس دنیا میں یہ اختلاف رونما نہ ہوتا تو یہ محشرستان عالم خموشاں بن جاتا اور یہاں کے بسنے والے یا صرف خدائی مہر کے مظہر ہوتے یا صرف قہر کے لیکن عالم تقدیر کو ایک ناتمام کمال کا مظاہرہ ناپسند تھا اس لیے اس نے اختلاف اس کی بنیاد میں ڈال دیا اور اب ضروری ہوگیا کہ دنیا جس قدر پھیلتی جائے اختلاف کا دامن بھی اسی قدر وسیع ہوتا چلا جائے حتی کہ یہود اگر اکہتر فرقوں میں بٹے ہوں تو نصاریٰ بہتر فرقوں میں بٹیں اور امت محمدیہ جو آخری اور سب سے بڑی امت ہے وہ تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائے۔ سورۂ ہود کی اس آیت میں مختلفین کو ”الامن رحم ربک“ کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عالم تکوین نے تکوینی طور پر تمام انسانوں کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ (۱) اہلِ اختلاف (۲) مرحومین۔

اختلاف کرنا رحمت سے محرومی کی علامت ہے ٭ اس تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اہل اختلاف ہیں وہ رحمت کے تحت نہیں ہیں اور جو رحمت کے نیچے آچکے ہیں وہ قرآن کی نظر میں اہل اختلاف کی فہرست میں داخل نہیں اس کو یوں بھی کہا سکتا ہے کہ نجات صرف اس جماعت کے لیے ہے جو ”الامن رحم ربک“ کی مصداق ہے اور بقیہ اہل اختلاف کے لیے نجات نہیں۔ سورۂ انعام میں اس اختلاف کی مزید تشریح ملتی ہے۔

وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ. (انعام : ۱۵۳)	میرا سیدھا راستہ یہ ہے اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا کر کے تتر بتر کر دیں گے۔

راہ حق ایک ہے اور ناحق بہت ٭ آیت بالا میں صراطِ مستقیم کے لیے لفظ مفرد اور بقیہ اہل اختلاف کے لیے ”السبل“ لفظ جمع اختیار کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راہِ مستقیم ایک ہی ہے اور ضلالت و گمراہی کے راستے بہت ہیں۔

صراطِ مستقیم اور سبل متفرقہ کا نقشہ ٭ مسند احمد اور نسائی وغیرہ میں ہے کہ اس معنوی افتراق و تشتت کو محسوس طور پر سمجھانے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا پھر اس کے دائیں بائیں اور بہت سے خطوط کھینچے اور فرمایا دیکھو یہ سیدھا خط تو صراطِ مستقیم ہے اور اس کے دائیں بائیں جو خطوط ہیں وہ سبل اور ناپسندیدہ راہیں ہیں جن کی طرف شیاطین دعوت دیتے ہیں اس کے بعد آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔

قرآن کریم میں حدیث افتراق کی طرف اشارہ ہے ٭ اب اگر سورۂ ہود اور سورۂ انعام کی ان ہر دو آیات کے نتائج کو ملاؤ تو حدیث افتراق امت کا پورا پورا مفہوم سامنے آجاتا ہے صرف فرق باطلہ کی تحدید اور عدم تحدید کا فرق باقی رہتا ہے اور اگر دونوں آیتوں کے نتائج کا تجزیہ کرو تو حسب ذیل ہوگا۔

آیت انعام: ① صراطِ مستقیم صرف ایک ہے۔ ② سبل متفرقہ بہت ہیں۔

سورہ ہود: ③ نجات صرف ایک جماعت کے لیے ہے۔ ④ اہل اختلاف کے لیے نجات نہیں۔

یہی چاروں اُمور حدیثِ افتراق کا مفہوم ہیں اور بس۔ ضلالت و ہدایت کے اس اختلاف کو سورۂ بقرہ میں بھی حسب ذیل پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (البقرۃ : ۲۱۳)

سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر انہوں نے دین میں اختلاف ڈالا) تو اللہ تعالیٰ نے خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے اور ان کے ساتھ سچی کتاب اتاری تا کہ جن باتوں میں انہوں نے اختلاف ڈالا تھا فیصلہ کرے۔

رسول دنیا میں ناروا اختلافات کو مٹانے کے لیے آتے ہیں ✲ یعنی خدائے قدوس نے تو رسولوں کو اس لیے بھیجا تھا کہ ناروا اختلاف ختم کر دیا جاتا اور یک جہتی کے ساتھ اس قانون پر عمل کیا جاتا جو ''الکتاب'' کے نام سے اتارا گیا تھا مگر افسوس کہ عاقبت نا اندیشوں نے اس سامان اتحاد کو بھی سامان اختلاف بنالیا اور اس طرح بعثت انبیاء اور تنزیل صحف کا جو اصل منشاء تھا اس کو برباد کر ڈالا۔ اس کے مخفی راز کو سورۂ ہود کی آیت ''وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ'' میں سمجھایا گیا تھا جس کی طرف ہم مضمون کے شروع میں اشارہ کر چکے ہیں۔

قرآن کریم سے لفظ اختلاف کی توضیح ✲ اب اس اختلاف کی حقیقت کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لیے آیات ذیل پر غور کیجئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ. (انعام : ۱۵۹)

جنہوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور بہت سی پارٹیاں بن گئے آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ. (الروم : ۳۲)

اور ان لوگوں میں سے مت بنو جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈال دی اور پارٹیاں بن گئے ہر پارٹی اپنے اپنے خیال میں مست ہے۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ. (انعام : ۶۵)

خدائے تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اگر چاہے تو تمہاری پارٹیاں بنا دے اور تم کو آپس میں بھڑا دے۔

عذابِ افتراق عذابِ استیصال کا بدل ہے ✲ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ آپ کی امت پہلی امتوں کی طرح ہلاک نہ ہو' وہ دعا مستجاب ہوئی اور ''عذابِ استیصال'' ہمیشہ کے لیے اٹھا لیا گیا مگر آپس کے افتراق وتشتت کا مقدر عذاب پھر بھی باقی رہا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ پارٹیوں سے اہلِ ہواء کا اختلاف مراد ہے اور آپس میں بھڑانے کا مصداق یہ ہے کہ ایک دوسرے کو کافر کہہ کر جنگ شروع کر دے جیسا کہ خوارج نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ کیا تھا۔ (الاعتصام ج ا ص ۳۹)

افتراقِ مذموم کی حدود ✲ ان ہر سہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں جو افتراق مذموم ہے وہ یہ ہے کہ ملت کی ہیئت اجتماعیہ پارہ پارہ ہو جائے' محبت ومودت' تعاون وتناصر' ہمدردی وسازگاری کے سارے رشتے ٹوٹ جائیں اور جماعتی شیرازہ اوراقِ پریشان کی طرح منتشر ہو جائے۔

دین میں پارٹی بندی برداشت نہیں ✲ یہ اختلاف' یہ پارٹی بندی دین میں ایک لمحہ کے لیے قابل برداشت نہیں۔ اسی لیے

فرمایا "لَسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ" ایسی مفسد جماعت سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں ہوسکتا گویا یہ مکمل بائیکاٹ کا اعلان ہے-

اب سوال صرف یہ رہتا ہے کہ وہ کون سا اختلاف ہے جو بم کی طرح پھٹ کر ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے- دورِ صحابہؓ میں بھی مذہبی اختلافات نظر آتے ہیں اور خلافتِ راشدہ ہی کے زمانہ میں فرقہ بندیوں کے نشانات کا پتہ چلتا ہے- پھر کیا یہ مقدس قرن بھی اس اختلاف کا مصداق ٹھہرایا جاسکتا ہے اس شبہ کا جواب ہمیں خود قرآن کریم سے ہی دینا ہے لیکن بطور مقدمہ پہلے یہ سن لیجیے کہ اختلاف ائتلاف کی ضد ہے جس کے معنی باہمی الفت ومحبت کے ہیں اگر ائتلاف کے ساتھ اختلاف ہے تو درحقیقت یہ اختلاف ہی نہیں-

اختلافِ دین وملت ❊ حقیقی اختلاف دلوں کا اختلاف ہے اس کی دوصورتیں ہوسکتی ہیں- ❶ دین وملت کا اختلاف' ظاہر ہے کہ قدرت نے بنی نوع انسان کے لیے ایک ہی دین اتارا تھا- نوعِ انسانی پر واجب تھا کہ وہ یک جہتی کے ساتھ یک زباں ہوکر مضبوطی سے اس کو اختیار کرتی لیکن وہ باز نہ آئی اور طرح طرح کی بہانہ بازیوں اور حیلہ سازیوں سے اس کے قبول کرنے میں پس وپیش شروع کیا- اس اختلاف کی وجہ سے ہمیشہ وحدت کی دعوت پر پارٹیاں اور اجتماع کی آواز پر افتراق وتشتت پیدا ہوتا رہا- ان پارٹیوں میں ہمیشہ آتش بغض وعناد بھڑکتی رہی- یہاں تک کہ ایک ملک' ایک شہر' ایک خطہ اور ایک قبیلہ وخاندان کے ہوکر ایسے جدا ہوئے کہ کسی وصف میں گویا ایک دوسرے کے شریک ہی نہ تھے- یہاں تک کہ معاشرت وتمدن کا کوئی گوشہ نہ رہا جس میں یک جہتی کی کوئی جھلک نظر آتی- شکل وشباہت بدلی' نشست وبرخاست کے طریقے بدلے' طعام ولباس کے طریقے جدا جدا ہوگئے- جب ایک جماعت دوسرے کے ساتھ یہ اختلاف پیدا کرلیتی ہے تو اصطلاح میں ایسی دو مختلف پارٹیوں میں ایک کو مسلم اور دوسری کو کافر کا لقب دیا جاتا ہے اور اب یہ اختلاف فطرۃِ انسانی کے لیے ایسا تباہ کن اختلاف ہوجاتا ہے کہ اگر قدرت اپنے غیبی ہاتھ سے اس بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا نہ کرتی رہے تو عالم فنا ہوجائے- عجیب بات ہے کہ اس عالم اختلاف کی بقاء کا سبب بھی یہی اختلاف ہے اور اس کے فناء کا سبب بھی یہی' بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے ۔۔۔ اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اس کا نام اختلافِ ملت اور اختلافِ دین ہے-

ایک ملت میں اصول وکلیات کا اختلاف ❊ ❷ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ ایک ملت ایک دین سے وابستہ ہوکر پھر اس میں اندرونی اختلاف پیدا ہوجائے اب اگر یہ اختلاف صرف جزئیات کی حد تک ہے تب بھی یہ کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں نہ اس اختلاف سے قلوب میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تنافر پیدا ہوتا ہے نہ الفت ومحبت کے رشتوں پر اثر پڑتا ہے- ہاں اگر یہ جزئی اختلافات بھی اس کثرت سے پیدا ہوجائیں کہ اصول وکلیات کی جگہ لے لیں تو ظاہر ہے اس کا حکم دوسرا ہوگا-

اختلافِ اصول موجب افتراق ہے ❊ اور اگر دین میں اشتراک کے بعد اس کے بعض اصول وکلیات میں اختلاف ہوجائے تو یہ اختلاف البتہ اختلاف ملت ودین کی طرح افتراقِ قلوب کا موجب بن جاتا ہے- دیکھو معتزلہ خوارج' مرجئہ' اہل سنت سب ایک ہی ملت اور ایک ہی دین سے وابستہ ہیں مگر بعض اصول وکلیات میں اختلاف کی وجہ سے اس طرح گروہ اندر گروہ ہوگئے

ہیں کہ جو عداوت و بغض اختلاف ملت کا ثمرہ تھا وہی ان اختلافات کا نتیجہ بن گیا ہے۔

فروعی اختلاف اختلاف نہیں ✻ اب ہم قرآن سے ہی بتلانا چاہتے ہیں کہ اس کی نظر میں اصول وکلیات کے اتحاد کے بعد فروع کا اختلاف کوئی اختلاف نہیں۔

شَرَعَ لَکُمۡ مِنَ الدِّیۡنِ مَاوَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ. (الشوریٰ : ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے دین میں ان ہی باتوں کی راہ ڈالی ہے جن کا حضرت نوح کو حکم دیا تھا اور جو حکم کہ ہم نے آپ پر بھیجا اور حضرت موسیٰ کو اور حضرت عیسیٰ کو حکم دیا تھا یعنی یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

ادیانِ سماویہ میں اختلاف نہیں ✻ ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک شریعتوں اور منہاج کا کھلا ہوا اختلاف رہا۔ مگر پھر بھی قرآن کریم نے اس کو ایک ہی دین قرار دیا ہے اور شرائع کے باہمی فروعی اختلاف کو وحدت دین کے خلاف نہیں سمجھا' اگر فروعی اختلاف بھی افتراق و اختلاف کی حد میں آسکتے تو اس افتراق کے ہوتے ہوئے پھر "وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ" (دین میں افتراق مت پھیلاؤ) کا خطاب کیونکر درست ہوتا۔ پس جس طرح شرائع سماویہ اور صحف انبیاء علیہم السلام فروعی اختلافات کے باوجود ایک ہی دین کہلائے' ایک کا مصدق دوسرے کا مصدق رہا' ان کے ماننے والے سب ایک ہی رشتہ اتحاد و اخوۃ میں منسلک رہے۔ تحزب و تعصب اور بغض و عناد کی کوئی شان ان میں پیدا نہیں ہوئی اور اسی لیے وہ "کانوا شیعا" کی حد میں نہیں آئے۔ اسی طرح ایک دین حنیف کے اندر فروعی اختلافات اس کی شانِ اجتماع و وحدت میں خلل انداز نہیں ہوتے۔

اجتہاد بھی دین کا ایک اصول ہے ✻ اجتہاد کے موقع میں اجتہاد کرنا بھی دین کی ایک سمجھائی ہوئی بات ہے اور اسی کا قائم کردہ اصول ہے اسے دین میں اختلاف کیونکر کہا جا سکتا ہے اختلاف یہ ہے کہ اس کے کسی مقرر کردہ اصول یا کسی تصریح کردہ جزئی کا خلاف کیا جائے لیکن جہاں اس نے سکوت کیا ہے اور یہ سکوت قصداً کیا گیا ہے وہاں ہر مجتہد کو اس کی اجازت دے دی ہے کہ وہ پوری جدوجہد اور ملکہ استنباط و اجتہاد کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ مآخذ دین سے اس کا حکم معلوم کرے۔

صحابہ ؓ کرام کا اختلاف ✻ اب آیئے[1] صحابہ ؓ کے اختلافات کو دیکھیں۔ حدوث و قدم عالم صفات کے عین وغیر اور جبر و قدر کے باریک و دقیق مسائل میں قدم رکھنا تو ان کا اصول ہی نہ تھا اس لیے ان چیزوں میں اختلاف کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا وہاں سوال تھا تو صرف امتثال و اطاعت' فرمان برداری اور وفا شعاری کے طریقوں میں تھا اس بنا پر اگر اختلاف تھا تو یہی کہ فلاں چیز سے وضوٹوٹتا ہے یا نہیں؟ تیمّم وضو کا قائم مقام کب ہو سکتا ہے؟ کوئی آمین زور سے کہنا پسند کرتا تھا کوئی آہستہ سے۔ کوئی رکوع کو جاتے اور آتے ہاتھ اٹھالیتا تھا۔ پھر یہ اختلافی رنگ بھی اس قدر پھیکا تھا کہ ان اختلافات کے ساتھ ساتھ وہ ایک ہی مسجد میں نمازیں ادا

---

[1] دیکھو اعلام الموقعین ج ا ص ۴۰۔

کر لیتے بلکہ خوشی خوشی ایک دوسرے کے پیچھے اقتداء بھی کرلیا کرتے تھے خصومت وجدل تو درکنار موافقت ومخالفت کے تصور سے بھی ان کے دماغ خالی تھے اسی لیے اخوۃِ اسلامی' نصح وخیر خواہی' محبت ومودت کی اتنی سچی مثال تاریخ کبھی کسی دوسری جماعت میں نہیں دکھاسکتی۔

اندریں حالات ان فروعی اور جزوی اختلافات کو ان کے یہاں کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاسکتی۔ ہاں خلافت کے دورِ ثالث ورابع میں جو کچھ ہنگامہ آرائیاں ہوئیں ان میں تعصب وتحزب کا وجود ناقابلِ انکار حقیقت ہے مگر الفاظِ قرآنی پر غور کیا جائے تو اس کا جواب بھی ان ہی آیات میں موجود ہے۔ سورۂ انعام میں اور سورۂ روم کی مذکورہ بالا آیات کو ایک بار پھر پڑھیے آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن یہاں جس فرقہ بندی کی ممانعت کررہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دین میں اختلاف برپا کر کے اس کو مختلف دینوں کی طرح بنا دیا جائے یہ اختلاف اس کے اصول وکلیات میں اختلاف ہی کے بعد ہوسکتا ہے۔ آیت ذیل کو بغور ملاحظہ کیجئے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا. (الانعام:۱۵۹) جنہوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور بہت سی پارٹیاں بن گئے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں ان پارٹیوں کا ذکر ہے جن کی گروہ بندی کی بنیاد عقائد واعمال کا اختلاف ہو' اس اختلاف کو اختلاف فی الدین کہا جاسکتا ہے۔

صحابہ کا اختلاف آپس کا اختلاف تھا نہ کہ دین کا ❋ اب اس معیار کے مطابق ان پارٹیوں کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عقائد واعمال کا ان کے درمیان کوئی ذکر ہی نہ تھا وہ ایک ہی عقیدے' یکساں عمل اور ایک ہی دین کے حامل تھے اور اسی ایک متفقہ دین کی خاطر ہی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ ان میں اگر اختلاف تھا تو یہ تھا کہ اس متفقہ دین کا اس وقت علم بردار کون ہے پس جس فرقہ بندی کی ممانعت آیاتِ مذکورہ بالا میں کی گئی ہے ان حضرات کا اختلاف اس سے بہت دور تھا۔

یہاں ان شکوک وشبہات کی جوابدہی مقصود نہیں ہے جو مدت دراز کے یک طرفہ تصور کے بعد دماغوں میں راسخ ہوچکے ہیں بلکہ صرف اس علمی حقیقت کو واشگاف کرنا ہے کہ کیا صحابہؓ کے دور کا اختلاف ہمارے زیرِ بحث اختلاف کا مصداق بن سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک صحابہؓ کرام کے مشاجرات ہرگز اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ کی حد میں نہیں آتے۔ ہاں اگر الفاظِ قرآنیہ کو خواہ مخواہ کے لیے وسعت دے کر ان مشاجرات کو داخل کرنا ہی منظور ہو تو امر دیگر ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں اگر اجتہادی وفروعی اختلافات تھے تو اس بنیاد پر ان میں کوئی گروہ بندی نہیں تھی۔ اور جب پارٹیاں بنیں تو ان کی بنیاد عقائد واعمال یعنی تفرق فی الدین نہ تھی۔ آگے چل کر ہم اس کو اور واضح کریں گے کہ قرآن وحدیث میں سیاسی گروہ بندیاں زیرِ بحث نہیں۔

اب آپ کو اختیار ہے کہ اس اختلاف کو اختلاف ہی نہ کہیے یا اختلافِ مذموم سے جدا کر لیجئے۔ مجاہد پہلے مشرب کے معلوم ہوتے ہیں وہ "الامن رحم ربک" کی تفسیر میں فرماتے ہیں فان اهل الحق ليس فيهم اختلاف[1] اہل حق میں کوئی اختلاف نہیں اور حسن کا دوسرا مشرب معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں فان اهل رحمة الله لا يختلفون اختلافا يضرهم[2] یعنی اہل

---

[1] الاعتصام ج ۱ ص ۳۹۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۴۵۔

رحمت ایسا اختلاف نہیں کرتے جوان کو مضرت رساں ہو کیونکہ یہ اختلاف ان ہی مسائل میں ہے جہاں کوئی نص نہیں ہے-

دین میں اختلاف کے رفع کا اصول ٭ ان مسائل میں شریعت نے خود اپنی جانب سے اختلافات دور کرنے کا حسب ذیل ضابطہ مقرر کر دیا ہے-

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْ ءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ..... (النساء : ۵۹) پھر اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے خدا اور اس کے رسول کو سپرد کر دو-

یہ زریں قانون اسی لیے مقرر کیا گیا ہے کہ دینی اختلاف اختلاف نہ رہے بلکہ رد الی اللّٰہ و الرسول کی وجہ سے حکم منصوص ہی کا رنگ اختیار کر لے- اور اس طرح اس اختلاف میں پھر ایک شانِ وحدت پیدا ہو جائے-

آیت فان تنازعتم کی نادر تفسیر ٭ امام ابو اسحٰق شاطبیؒ نے موافقات میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس طرح اصولِ شریعت میں کوئی اختلاف نہیں اسی طرح اس کے فروع میں بھی کوئی اختلاف نہیں اور اس سلسلہ میں آیۃ فان تنازعتم کی تقریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رفع تنازع واختلاف ہی کے لیے تو رد الی اللّٰہ و الرسول کا حکم ہوا ہے اب اگر کتاب وسنت میں بھی اصول وفروع میں اختلاف تسلیم کر لیا جائے تو اس رد کا فائدہ کیا ہوگا- اختلاف پھر اپنی جگہ بحال رہے گا- ایک اختلاف دوسرے اختلافی آئین سے ختم نہیں ہو سکتا بلکہ اس آئین سے ختم ہو سکتا ہے جس میں خود کوئی اختلاف نہ ہو[1]-

محقق دمیاطی محشی موافقات کو اس دعویٰ میں کچھ تردد ہے ہمارے نزدیک امام شاطبیؒ کا دعویٰ بالکل درست ہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے-

اصولِ شریعت میں کوئی اختلاف نہیں ٭ اس کا حاصل یہ ہے کہ مقصد شریعت نہ اصول میں مختلف ہے نہ فروع میں بلکہ اتحادِ اصول کے بعد فروع میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ فروع اصول کے ہمیشہ تابع رہتے ہیں- اس لیے جب اصول میں اختلاف نہیں تو فروع میں کیسے ممکن ہے- لیکن آیت میں اس امر کا دعویٰ نہیں ہے کہ ردالی اللّٰہ و الرسول کے بعد ہر شخص کو وہ حکم قصد شارع کے مطابق حاصل بھی ہو جائے گا- ظاہر ہے کہ بعض مرتبہ ایک جزئی میں اصولِ متفرقہ صادق آنے کی صلاحیت ہوتی ہے ہر مجتہد اپنے اپنے خیال کے موافق اسے ایک اصل کے ماتحت داخل کرتا ہے اور اس اصل کے مطابق اس کا حکم اخذ کر لیتا ہے اس لیے اجتہاد وآراء کے اس تجاذب کی وجہ سے فروع میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ مختلف حکم خود شریعت کے بیان کردہ نہیں ہیں- اس نے ایک ہی قانون بنایا ہے اور اس کے مطابق اس کا ایک ہی حکم ہونا چاہیے حتی کہ اگر عہدِ نبوت ہوتا اور آپ سے براہ راست اس جزئی کے متعلق سوال کیا جاتا تو اس کا ایک ہی جواب ملتا- لیکن بعد میں جب راہِ صواب کا انتخاب صرف افہام پر موقوف رہ گیا تو اب اختلاف افہام وعقول کی وجہ سے مجتہد فیہ جزئیات میں اختلاف ضروری ہو گیا یہ دوسری بات ہے کہ شریعت حنیفیت نے قانونِ یسر کے موافق یہاں خطاؤ صواب دونوں صورتوں میں اجر کا وعدہ کر لیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ

---

[1] ج ۴ ص ۱۱۹ و اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۱-

درحقیقت اس کے آئین میں اس جزئی کے لیے دو حکم ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف موجود تھے۔
مفہوم اختلاف کی اس توضیح کے بعد مناسب ہے کہ اب اس کے اسباب پر بحث کی جائے۔

اسبابِ اختلاف وتفرق

یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ یہاں ہمارا مطلب اختلاف سے بعض اصول وکلیات کا اختلاف ہے اس لیے اسی کے اسباب پر ہمیں غور کرنا ہے۔ جہاں تک استقراء اور تلاش سے دریافت ہوسکتا ہے اس کے تین اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) ناقص اور سطحی علم۔ (۲) اتباع ہوئی وخواہش نفس۔ (۳) اتباع رسوم وعادات۔

ان اسباب پر غور کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس دور پر غور کرنا ضروری ہے جس میں مذہب کی سطح پر اختلاف کا کوئی چھوٹا سا بلبلہ بھی تیرتا نظر نہیں آتا پھر وہ کیا اسباب ودواعی ہوئے کہ یہ سمندر دفعۃً متحرک ہوا اور ایسا متحرک ہوا کہ اس کی امواج معمورہ عالم کو محیط ہوگئیں۔

دورِ اوّل کا طریق تحصیل علم ⁕ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی قوم جس کو قرآن کریم نے امی ہونے کا لقب دیا ہے اور جس کو خود بھی اپنے امی ہونے پر فخر تھا تحصیل علم کے لیے جس پہلی درسگاہ میں داخل ہوئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک تھی یہاں نہ کسی رسمی درسگاہ کا سند یافتہ معلم ان کا مربی تھا نہ کوئی مرتب کتاب ان کے سامنے تھی صرف ان ہی میں کا ایک امی انسان ان کے پیش نظر تھا جسے وہ خدا کا رسول تسلیم کرچکے تھے اور بس۔

دور اول میں اختلاف نہ ہونے کے اسباب ⁕ اسی بنا پر اس کی نشست وبرخاست، نطق وسکوت، طعام ولباس، آمد ورفت غرض کہ جملہ عادات وعبادات کی جو وضع دیکھ لیتے اس کو اپنا دستور العمل بنا لیتے جو کہہ دیتا اسے خدا کا حکم تصور کرتے اور جو کر لیتا اسے رضاء الٰہی کا یقینی ذریعہ سمجھتے خلاصہ یہ کہ کلماتِ طیبات کا سننا اور یاد کرنا یہی ان کا سبق تھا اور اپنے عمل کو آپ کے عمل کے مطابق بنانے میں لگا رہنا یہی ان کا عمل تھا اس لیے ان کی سادہ فطرت اور سادہ دماغ میں جو پہلا نقش قائم ہوا وہ حق ہی حق اور صواب ہی صواب تھا۔ پھر مزید برآں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیر صحبت سے ان علوم نے ان میں ایسا رسوخ اور ایسی نورانیت پیدا کردی تھی کہ وہ خود ایک معیارِ حق وباطل بن گئے تھے۔ اسی طرح قرآن کی ایک ایک آیت ان کے سامنے اترتی رہی اور وہ اس کی صحیح سے صحیح تفسیر آپ کے طرزِ عمل میں پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام کا تمام دین انہوں نے نہایت سہولت اور صحت کے ساتھ اس طرح سیکھ لیا جس طرح ایک بچہ بلا کسی تکلف وتکلیف اپنے والدین کے پورے پورے رنگ ڈھنگ اور طور طریق سیکھ لیتا ہے۔ ایسے ماحول میں اختلاف وافتراق کا کیا گذر ہوسکتا تھا۔

قرآن کریم کی اس عملی اور زندہ تصویر کے روپوش ہوجانے کے بعد گو تحصیل دین میں اب وہ سہولت تو باقی نہیں رہی تھی مگر چونکہ اصل کی عکسی تصاویر بکثرت چلتی پھرتی موجود تھیں اس لیے قرآن پڑھنے والے اگر کہیں اٹکتے تو ان عکسی تفسیر[illegible] سے ان کا حل کر لیتے لیکن جب یہ عکسی تصاویر وتفاسیر گم ہوتی گئیں اور ادھر اسلام عرب سے نکل کر مختلف سمتوں میں پھیل گیا تو وہ طریق تعلیم وتعلم

بھی بدل گیا-

دوسرے دور کا طریقہ ذہنی انتشار اور ماحول کا اختلاف فہم مراد میں مخل ہوتا ہے ⁂ علوم رسمیہ اور اہل عجم سے کثرت اختلاط کی وجہ سے ذہن منتشر ہو گئے اندازِ فکر بدل گیا قرآن کریم کے صرف الفاظ سامنے رہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات وتفصیلات کا جو ذخیرہ پہنچا وہ بھی بشکل الفاظ پہنچا اس لیے چون وچرا اور لا ونعم کا دروازہ کھل گیا عقلاء نے اپنی عقل کے بھروسہ پر اور بےعلموں نے اہل علم ہونے کی غلط فہمی میں دین کو تختہ مشق بنالیا اور رشدہ شدہ وہ اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے جن کی بنیاد عقائد تھی اور جن کو دین کا اختلاف کہا جا سکتا تھا-

پارٹیوں کا ظہور ⁂ اور اب وہ وقت قریب تر ہو گیا کہ آیت ﴿اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا﴾ (الانعام : ٦٥) کی تاویل دنیا بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لے یعنی اچانک خلافت راشدہ کے دورِ رابع میں ایک طوفان بدتمیزی اٹھا- ایک جماعت قرآن ہاتھ میں لیے ہوئے ہے تہجد کے نشانات اس کی پیشانیوں پر ہیں اور وہ خلیفہ وقت پر چڑھائی کے لیے اس لیے جمع ہوئی ہے کہ اس کے نزدیک وہ کافر ہو گیا ہے- ﴿اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ﴾ کون ہے جسے یہ بدبخت دائرۂ اسلام سے خارج کر رہے ہیں؟ وہ کہ جس کی شمشیر اور جس کی تقریر نے نہ معلوم کتنے کفار کو مسلمان بنایا تھا جس کی نسبت ارشادِ نبویؐ تھا **انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ** -علیؓ تمہیں میرے ساتھ وہ نسبت ہے جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ علیہما السلام سے تھی اور وہ جس کو امت باب العلم کہتی ہے- حیرت ہے کہ جس کو کل دور کفر میں پہلا مسلمان کہا جاتا تھا آج اسلام کے زمانہ میں خود اسی کے دور خلافت میں اسے اوّل کافر کہا جا رہا ہے یہ فتنہ خوارج کا فتنہ تھا جس کی تفصیل کتب تاریخ میں مذکور ہے-[1]

---

[1] حافظ ابن عبد البرؒ نے اس کی مختصر سرگذشت اس طرح لکھی ہے کہ جب خوارج حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر چڑھائی کر کے آئے تو لوگ آپ کی [خدم]ت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے امیر المؤمنین! دیکھئے یہ جاہل لوگ آپ کے مقابلہ میں آمادۂ پیکار کھڑے ہیں آپ نے جواب دیا کہ پہلے [ا]نہیں جنگ شروع کر لینے دو-

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ایک دن میں نے عرض کیا کہ آج ذرا تاخیر سے نماز ادا کیجئے میں ان لوگوں سے گفتگو کر لوں- وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھیڑ لگ رہی ہے' شب بیداری کی وجہ سے ان کے چہرے سیاہی مائل ہیں' سجدوں کے نشان پیشانیوں پر ہیں اور کہنیوں میں اونٹ کے گھٹنوں کی طرح ٹھیکیں پڑ گئی ہیں ڈھلی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہیں- حضرت ابن عباسؓ کو دیکھا تو بولے ابن عباسؓ کیسے آئے؟ اور یہ حلّہ کیسا پہن رکھا ہے؟ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ تمہیں اس حلّہ پر کیا اعتراض ہے میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر اچھے اچھے یمنی کپڑے دیکھے ہیں- اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾ (الاعراف: ٣٢) آپ کہہ دیجئے کہ یہ زینت اور اچھی اچھی غذائیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہیں کس نے حرام کیں-

پھر انہوں نے دریافت کیا: کہو کیوں آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور ایک ایسی جماعت کے پاس سے آ رہا ہوں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور جن میں قرآن نازل ہوا تھا اور تم میں کوئی شخص ایسا نہیں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو' میری آمد کا مقصد یہ ہے کہ ان کی باتیں تم تک اور تمہاری باتیں ان تک پہنچا دوں- انہوں نے آپس میں کہا ان سے بات مت کرو کیونکہ یہ قریشی ہیں اور ان کے حق میں قرآن کہتا ہے ﴿بَلْ ھُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ﴾ (الزخرف: ٥٨) بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں- بعض نے کہا کہ ہم ضرور گفتگو کریں گے اس کے [بقیہ] .....

ان کے اقوال وعقائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت موٹی عقل اور سطحی علم کے مالک تھے- درک مقاصد' فہم معانی' استنباط واستخراج کا ان میں کوئی ملکہ نہ تھا- قرآن شریف پڑھنے کا انہیں شوق ضرور تھا مگر اس کے معانی کی انہیں کوئی اہمیت نہ تھی- طوطے کی طرح قرآن ان کی زبانوں پر تھا مگر ان کے قلوب اس کی صحیح ہدایات اور لطیف مضامین سے قطعاً خالی تھے' ان کی اسی علمی بے مائگی کی طرف حدیث کے الفاظ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے- یقرؤن القران لا یجاوز حناجرھم یعنی وہ قرآن تو بہت تلاوت کریں گے مگر قرآن صرف ان کی زبانوں پر ہوگا ان کے قلوب میں علم وفہم کا کوئی ذرہ تک نہ ہوگا-

دوسری علامت ان کے علم نما جہل کی یہ بتائی گئی ہے کہ یقتلون اھل الاسلام و یدعون اھل الاوثان بت پرستوں کو چھوڑ کر اہل اسلام کو قتل کریں گے- کچھ یہ تجربہ بھی ہے کہ سطحی علم کے ساتھ مزاج میں شدت اور نفس میں تقشف پیدا ہونا لازم ہے- حضرت ابن عباسؓ جب ان سے مناظرہ کے لیے پہنچے ہیں تو جو پہلا فقرہ انہوں نے فرمایا ہے وہ یہ تھا- میں ایسی جماعت کے پاس سے آرہا ہوں جس میں یہ قرآن اترا ہے اور جو براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والی ہے-

قرآن خواں اور قرآن داں کا فرق ※ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم قرآن خواں ضرور ہو مگر قرآن داں نہیں- اگر انصاف

؎ ..... بعد ان میں سے دو تین شخص سامنے آئے- میں نے پوچھا کہ حضرت علیؓ پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟ انہوں نے کہا تین اعتراض ہیں- میں نے کہا بتاؤ انہوں نے کہا پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے دین کے معاملہ میں انسانوں کو حکم بنایا حالانکہ قرآن کریم میں ہے ﴿ان الحکم الا للہ﴾ (الانعام: ۵۷) فیصلہ صرف خدا کا ہے- میں نے کہا چلو ایک بات ہوئی' اور بولو- کہنے لگے حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ سے جنگ کی پھر نہ کسی کو قید کیا اور نہ مال غنیمت لوٹا- اب اگر ان کی جماعت مسلمان تھی تو ان سے جنگ کیوں کی اور اگر کافر تھی تو جس طرح ان کے ساتھ جنگ درست تھی قید کرنا بھی درست تھا- میں نے کہا اچھا اور کچھ؟ بولے تیسری بات یہ ہے کہ انہوں اپنا نام امارت سے کیسے مٹایا اس لیے اگر وہ مؤمنین کے امیر نہیں تو یقیناً کافروں کے امیر ہوئے-

میں نے کہا اگر میں ان سب باتوں کا تمہیں خود قرآن وسنت سے ہی جواب دے دوں تو کیا واپس چلے جاؤ گے؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں- اس پر میں نے کہا اچھا تو سنو!

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن ہی میں دوسروں کو حکم مقرر کرنے کا حکم موجود ہے چنانچہ حالت احرام میں کوئی شخص شکار کرے تو اللہ تعالی نے اس پر جزاء مقرر کی ہے اور اس کا فیصلہ دو منصف مسلمانوں پر رکھا ہے جو وہ کہہ دیں گے وہی قابل تسلیم ہو جائے گا- اسی طرح خلع میں طرفین کے دو شخص بلا کر فیصلہ ان کی رائے پر رکھ دیا ہے اب تم ہی انصاف کرو کہ جب جانوروں اور عورتوں تک کے معاملات میں مسلمانوں کا فیصلہ قابل تسلیم سمجھا گیا ہے تو مسلمانوں کے جانی معاملات میں کیوں قابل تسلیم نہیں ہوگا اب بتاؤ تمہارا یہ اعتراض جاتا رہا یا نہیں- کہنے لگے جی ہاں-

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بتاؤ حضرت عائشہؓ تمہاری ماں تھیں یا نہیں اگر انکار کرتے ہو تو کافر ہوتے ہو اور اقرار کرتے ہو تو کیا قید کرنے کے بعد ان کے ساتھ وہ سب معاملات درست رکھو گے جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ جائز ہوتے ہیں اگر اس کا اقرار کرتے ہو تو بھی کافر ہو- کہو اس پر تمہارا کوئی اعتراض ہے؟ انہوں نے کہا نہیں-

میں نے کہا کہ اب تیسری بات کا جواب سنو! صلح حدیبیہ میں ابوسفیان و سہیل کے اصرار پر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نام سے رسول اللہ کا لفظ محو کرنے کا امر نہیں فرمایا تھا پھر اگر حضرت علیؓ نے اپنا نام امارت سے علیحدہ کر دیا تو کیا ہوا-

سوال وجواب کے بعد ان میں دو ہزار اشخاص تو واپس ہو گئے اور جو رہ گئے وہ قتل کر دیئے گئے- (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۰۴)

کرتے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ قرآن کی صحیح مراد وہ لوگ زیادہ جانتے تھے جن میں سب سے پہلے قرآن اترا' اور جنہوں نے براہ راست صاحب کتاب سے اس کی مرادیں سمجھیں اور اپنی آنکھوں سے اس پر عمل کا طریقہ دیکھا' یا تم جو ان میں سے کسی ایک بات میں بھی ان کے شریک وسہیم نہیں' نہ تم قرآن کے نزول کے ماحول سے واقف ہو اور نہ اس کی مراد دریافت کرنے کا کوئی صحیح معیار تمہارے سامنے ہے صرف ایک سطحی علم' ایک جامد رائے اور ایک جہل آلود مزاج ہے- اس پر یہ دھوکا ہے کہ مخلص بھی تم ہی ہو' قرآن کو بھی تم ہی سمجھتے ہو اور تم ہی اس پر عمل کرتے ہو-

اسبابِ اختلاف حضرت ابن عباسؓ کی نظر میں ٭ اسی لیے جب ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے دریافت فرمایا کہ اس امت کا جب نبی ایک' قبلہ ایک' کتاب ایک ہے تو پھر اس میں اختلاف کیونکر پیدا ہوگا تو حضرت ابن عباسؓ نے یہی جواب دیا تھا کہ اے امیر المؤمنین! قرآن ہمارے سامنے اترا ہے- ہم تو اس کے موارد نزول کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں- لیکن آئندہ ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے مگر انہیں صحیح طور پر اس کے موارد و مصادر کا علم نہ ہوگا پھر اس میں اپنی طرف سے رائے زنی شروع کریں گے اور اٹکل کے تیر چلائیں گے- اس لیے ان میں اختلاف ہو جائے گا اور جب اختلاف ہوگا تو لڑائیاں ہوں گی- شروع میں تو حضرت عمرؓ نے اس خیال سے اتفاق رائے نہ کیا لیکن غور کرنے کے بعد انہیں بھی ابن عباسؓ سے اتفاق رائے کرنا پڑا[1]

حضرت ابن عباسؓ کی اس صوابدید کی اس سے زیادہ شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسلام میں ایک خوفناک گروہ بندی کی جب بنیاد پڑتی ہے تو وہ اسی ناواقفی وجہل کی بدولت نظر آتی ہے- چنانچہ خوارج کا نقطۂ ضلالت یہی تھا کہ جو آیات کفار کی شان میں نازل ہوئی تھیں انہیں وہ مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر انہیں کافر قرار دیتے پھر اس جاہلانہ بنیاد پر ان سے آمادۂ جنگ ہو جاتے تھے-

سلف کی یہ دقت نظر قابل داد ہے جنہیں ہر دینی معاملے میں سب سے پہلے یہی تلاش رہا کرتی تھی کہ اس میں صحابہؓ کرام کا طریقہ کیا تھا اور جب ان کی کوئی ایک رائے معلوم ہو جاتی تو اسی کو اپنے لیے اسوہ بنا لیتے اور اختلاف دیکھتے تو ان ہی آراء میں سے کسی کا اتباع کر لیتے اور ان سے باہر قدم نکالنا ضلالت و گمراہی تصور کرتے[2]

---

[1] الاعتصام ص ۱۵۷-

[2] حافظ ابن عبدالبر امام اوزاعی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے شاگرد بقیہ بن الولید سے فرمایا:

يا بقية العلم ماجاء عن اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم و ما لم يجئ فليس بعلم[1]

اے بقیہ بس علم تو وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں-

قال الشعبي ما حدثوك عن اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فخذ به و ما قالوا فيه برأيهم فبل عليه.[2]

عامر شعبیؒ کہتے ہیں لوگ جو باتیں تمہارے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی جانب سے نقل کریں تو انہیں اختیار کر لو اور جو اپنی رائے سے کہیں انہیں نفرت کے ساتھ چھوڑ دو- ......

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۹۳- [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۲-

کلام فہمی کے لیے محاورات کے سوا مصنف کی مزاجی خصوصیات کا علم بھی ضروری ہے ٭ اگر ملکی عادات، رسم و رواج، زبانی محاورات، مصنف کی خصوصیات کا علم کسی عام کلام کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے تو بلا شبہ کلام اللہ کی مراد متعین کرنے کے لیے بھی اس کا علم ضروری ہے کہ عرب کا ماحول، عرب کی زبان پھر سب سے پہلے کتاب اللہ کا طرزِ خطابت کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ ان اوصاف میں جس قدر عہد نبوت کے قریب ہوتے جاؤ گے اتنا ہی کمال نظر آتا جائے گا اور جتنا اس عہد سے نیچے اترتے آؤ گے اتنا ہی نقصان نظر آتا جائے گا۔

علم کا طول وعرض اور ہے اور اس کا عمق اور ٭ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ صحابہؓ کے علوم میں وہ طول وعرض نہیں ملتا جو متاخرین کے یہاں موجود ہے مگر صحیح علم طویل وعرض کا نام نہیں بلکہ اس کے رسوخ اور عمق کا نام ہے۔ اکتسابی اور رسمی فنون چونکہ محض انسانی دماغ کی پیداوار ہیں اس لیے ظنی ہیں اور ظنیات میں چونکہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لیے تحصیل یقین کی سعی میں دلائل اور تحقیقات کا طول وعرض خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن وحی کا علم قطعی ہے وہ جتنا نظر آتا ہے سب مغز ہی مغز ہوتا ہے اس لیے اس میں طول وعرض

؂ ..... حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:

لا یزال الناس بخیر ما اتاھم العلم من قبل اکابرھم فاذا اتاھم من قبل اصاغرھم ھلکوا[1] — جب تک لوگوں کے سامنے بڑے بڑے علماء کا علم رہے گا وہ دین میں ترقی یافتہ رہیں گے اور جب ناواقفوں کا علم شروع ہوگا تو برباد ہو جائیں گے۔

ابن مبارکؒ فرماتے ہیں اصاغر سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین میں اپنی رائے لڑائیں۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں میرے نزدیک اس کی مراد یہ ہے کہ جو لوگ صحابہ کے بعد ہیں ان کا علم حاصل کیا جائے اور صحابہؓ کے علم کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دی جائے۔[2]

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن امام ربیعہ پر سخت گریہ طاری ہوا ان سے دریافت کیا گیا خیر تو ہے کیا کوئی مصیبت درپیش ہے؟ فرمایا نہیں لیکن یہ دیکھ رہا ہوں کہ دین کی باتیں بے علموں سے دریافت کی جاتی ہیں اور یہی گمراہی کا پیش خیمہ ہے۔[3]

ان آثار اور اس طرح کے بہت سے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلف کے یہاں صحابہؓ کے علم کا کتنا وزن تھا ان کے یہاں اس علم کی اتنی قدر و قیمت کیوں تھی؟ اس کا راز یہ ہے کہ جس طرح سنت مقاصد قرآنیہ کے لیے کاشف ہے اسی طرح صحابہؓ کے کلمات مقاصد سنت کی شرح کرنے والے ہیں کیونکہ یہ کلمات اگر حضورؐ سے سنے ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل سے افضل کوئی نقل نہیں ہو سکتی اور اگر وہ ان کی اپنی رائے ہے تو دین میں ان کی رائے سے بہتر کس کی رائے ہو سکتی ہے۔

محمد بن سیرینؒ سے حج کے ایک مسئلہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ کرھھا عمر و عثمان فان یکن علما فھما اعلم منی و ان یکن رأیا فرایھما افضل[4] یعنی عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ اسے مکروہ سمجھتے تھے، اب اگر یہ علم تھا تو وہ مجھ سے زیادہ عالم تھے اور اگر ان کی رائے تھی تو ان کی رائے میری رائے سے افضل ہے۔

یہ محمد بن سیرین کا قول ہے جو مشہور ترین تابعی ہیں اور تابعین میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں وہ علم اسی کو کہہ رہے ہیں۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور اس کے سوا جو علم ہے اس کا نام رائے رکھتے ہیں پھر صحابہ کی رائے کا وہ مرتبہ سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں اپنی رائے قابل ذکر نہیں سمجھتے۔

---

[1] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۹۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۸۔ [3] الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۹۔ [4] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۳۱۔

نہیں ہوتا ہاں اس کی گہرائی بے اندازہ ہوتی ہے- اگر ایک شخص زمین پر کرویت یا اس کی حرکت بزور دلائل ثابت کرنا چاہے تو اس کے لیے بہت بڑے علم' بہت کافی تجربے اور ایک طویل عمر کی حاجت ہوگی لیکن وہ شخص جوان دونوں چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس کو ان میں سے کسی بات کی بھی ضرورت نہیں' سب سے بڑی دلیل' سب سے بڑا تجربہ اس کا اپنا مشاہدہ ہے اس لیے جو یقین اس کو حاصل ہے وہ پہلے شخص کو عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہوسکتا چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا ﴿اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى﴾ (النجم: ۲۱) کیا تم اس رسول سے اس کی آنکھوں دیکھی باتوں میں جھگڑتے ہو بہر حال جب دین کے علم اور دین کے مسائل پر بحث ہوگی تو سب سے پہلے یہ پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ اس باب میں صحابہؓ اور سلف[1] کی رائے کیا تھی اور ان کی رائے کے بالمقابل دوسری سب رائیں اسی طرح ٹھکرا دینے کے قابل ہوں گی جس طرح ہائی کورٹ کے نظائر کے مقابلہ میں دوسری عدالتوں کے فیصلے ٹھکرا دینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں- وہ دین کا ہائی کورٹ تھے اور ان سے زیادہ صحیح مراد حاصل کرنا عقلاً تو ممکن ہے مگر واقعات کے دائرہ میں ممکن نہیں اس کے سوا جو علم بھی ہے گو اس میں طول و عرض نظر آئے اور اس میں عمق کا بھی گمان ہوتا ہو لیکن وہ سب سطحی علوم ہیں اور ان کا اتباع یقیناً دینی افتراق کا باعث ہو کر رہے گا-[2]

اسی کی طرف حدیث ذیل میں اشارہ فرمایا گیا ہے-

---

[1] حضرت حسنؒ صحابہؓ کے حال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں' یہ جماعت پوری امت میں سب سے زیادہ نیک دل' سب سے زیادہ گہرے علم کی مالک اور سب سے زیادہ بے تکلف جماعت تھی- خدائے تعالیٰ نے اپنے رسول کی رفاقت کے لیے اسے پسند کیا تھا وہ آپ کے اخلاق اور آپ کے طریقوں سے مشابہت پیدا کرنے کی سعی میں لگی رہا کرتی تھی اس کو دھن تھی تو اسی کی تلاش تھی تو اسی کی اس کعبہ کے پروردگار کی قسم ہے کہ وہ جماعت صراط مستقیم پر گامزن تھی- (الموافقات ج ۴ ص ۸۷)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تعبیر اس سے بھی زیادہ صاف شاندار اور مکمل ہے-

من كان منكم متأسيا فليتأس باصحاب محمد صلى الله عليه وسلم فانهم كانوا ابر هذه الامة قلوبا و عمقها علما و اقلها تكلفا و اقومها هديا و احسنها حالا قوما اختارهم الله لصحبة نبيه و اقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم و اتبعوا في اثارهم فانهم كانوا على الهدى المستقيم.

تم میں جس کو اقتدا کرنا ہو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ہی کی اقتداء کرے کیونکہ وہ نیک دلی میں سب سے زیادہ' علم میں سب سے گہرے' نہایت بے تکلف' مضبوط کیرکٹر اور بہت اچھے حالات کے لوگ تھے اور اسی لیے خدائے تعالیٰ نے اس بہترین جماعت کو اپنے بہترین رسول کی صحبت اور دین کی حفاظت کے لیے انتخاب کیا تھا اس لیے تم بھی ان کی بزرگی پہچانو اور ان کے ہی نقش قدم پر چلو کیونکہ وہ سیدھے اور صاف راستہ پر تھے-

صحابہ کی صفات اور ان کے علمی پایہ کے متعلق الفاظ کا یہ توافق بتاتا ہے کہ ان میں یہ اوصاف اس قدر عیاں تھے کہ جو شخص بھی انہیں دیکھتا تھا وہ ان اوصاف کو سب سے پہلے ان میں دیکھ لیتا تھا اور اس لیے خود ان کے سامنے سرنگوں ہو جاتا اور دوسروں کو اس وصیت کے پہنچانے کے لیے مجبور تھا جو ان کے زمانہ میں ان مقدس ہستیوں کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والے تھے یا اس سے قریب تر زمانہ میں تھے- ان کی رائے تو یہ ہے اور جو ان دو صفتوں سے محروم ہیں اگر وہ کوئی اور رائے رکھتے ہیں تو وہ اس کے ذمہ دار ہیں-

[2] دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۶ و ج ۴ ص ۱۱۳ و ۱۳۶-

لا یقبض اللہ العلم انتزاعا ینتزعہ من الناس و لکن یقبض العلم بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالم اتخذ الناس رؤسًا جھالاً فافتوا بغیر علم فضلوا و اضلوا۔

اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے ایک دم نہیں نکالے گا بلکہ علماء کو ایک ایک کر کے اٹھالے گا۔ یہاں تک کہ جب کوئی صحیح عالم نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے وہ فتوے دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

عالم رئیس فتنہ نہیں ہوتا جاہل پر عالم کا گمان کرلیا جاتا ہے ✲ بعض علماء نے اس حدیث سے خوب استنباط فرمایا ہے کہ علماء کبھی رئیس ضلالت نہیں ہوتے مبدأ ضلالت ہمیشہ جاہل ہوتا ہے پھر اس کے اتباع میں گمراہی پھیلتی ہے مگر فتن جب ٹوٹتے ہیں تو ایک تاریکی لے کر نہیں ٹوٹتے اپنے گردو پیش میں اتنی تاریکیاں لے کر آتے ہیں کہ اس وقت عالم اور غیر عالم کی شناخت ہی ممکن نہیں رہتی غیر عالم بانی ضلالت ہوتا ہے اور یہ ٹیکہ علماء کے نام پر مفت لگ جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک امین انسان کبھی خیانت نہیں کرتا لیکن غلطی سے کبھی امین کے دھوکہ میں امانت خائن کے ہاتھوں میں جا پڑتی ہے۔ وہ خیانت کرتا ہے پھر مشہور یہ ہوتا ہے کہ فلاں امین نے خیانت کی ہے اسی طرح ایک عالم متقی، راسخ العلم، کبھی منشاء ضلالت نہیں ہوتا۔ یوں ذلت ولغزش انسانی فطرت ہے وہ اس وقت زیر بحث نہیں۔ فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کا جذبہ ہمیشہ بے علموں میں ابھرتا ہے مگر بدنامی علم کے نام پر باقی رہ جاتی ہے۔ آج بھی اگر ہندوستان کی فرقہ بندیوں پر نظر ڈالو گے تو ان کے مختلف عناصر میں ایک بڑا عنصر یہی بے علمی ہے یا وہ فرزانگی جس کی بلند پروازیوں کے لیے حدود اور غیر حدود کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔

سطحی اور عمیق علم کا فرق ✲ بحث تشنہ رہ جائے گی اگر اس مرحلے پر سطحی علم اور عمیق علم کی مناسب وضاحت نہ کی جائے صاحب موافقات نے اپنی کتاب کے شروع میں تیرہ مقدمات تحریر فرمائے ہیں جن میں ہر مقدمہ اپنی جگہ مہم اور ضروری ہے لیکن بارہواں مقدمہ ہمارے مضمون کے لحاظ سے اور بھی زیادہ اہم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم ہمیشہ محقق اور راسخ العلم شخص سے حاصل کرنا چاہیے کیونکہ مشہور ہے کہ ''از ناقصے کامل نزاید'' اس کی علامت تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ راسخ العلم کی بڑی علامت یہ ہے کہ اس نے علم شیوخ کی زیر نگرانی اور ان کی تربیت میں رہ کر حاصل کیا ہو تاکہ ان کے فیض صحبت سے اس کا رسوخ بھی حاصل ہو جائے صحبت اور ملازمت شیخ کو رسوخ علم میں بڑا دخل ہے۔ صحابہ کا علم اسی طریق پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ﴾ پڑھنے والا صحابی جس خوبی اور پختگی سے توحید اسلام سمجھا ہوا تھا آج تیس پاروں کا حافظ بھی اس کا عشر عشیر سمجھا ہوا نہیں۔

صرف مطالعہ کا علم اغلاط سے پاک نہیں ہوتا ✲ بات یہ ہے کہ الفاظ میں اشتراک و ترادف، حقیقت و مجاز اور عموم و خصوص کے احتمالات پھیلتے چلے جاتے ہیں اس لیے محض لفظوں کی لوٹ پلٹ سے یقین تک رسائی نہیں ہوتی، محقق معلم ایک نکھری نکھرائی مراد متعلم کو بتادیتا ہے پھر یہ کچھ قدرتی انتظام بھی ہے کہ جب ایک جماعت تشنہ لب، دست حاجت دراز کیے ہوئے تحصیل علم کے لیے آتی ہے تو اس اجتماع میں کچھ عجیب برکت پیدا ہو جاتی ہے یعنی معلم میں قوت افادہ اور متعلم میں وہبی طور پر قوت استفادہ کچھ اس طرح رونما ہو جاتی ہے کہ علوم جس انداز سے یہاں کھلتے ہیں صرف اپنے مطالعہ سے نہیں کھلتے آخر یہ کیا بات تھی کہ صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کے بعد ہی اپنے قلوب میں ایک تغیر محسوس کیا تھا۔ حضرت حنظلہ جب اپنے گھر

4
آتے تو ان کے قلب میں برد و یقین کی جو کیفیت آپ کی صحبت میں ہوتی بدل جاتی - یہ انشراح و یقین سب اسی ملازمت نبی کا کرشمہ ہی تو تھا -

زیر تربیت علم کی تاثیرات ⁂ اس تربیت اور صحبت کی تاثیر بعض مستعدین پر تو عجب حیرت انگیز طریقے سے ہوئی ان کی قوت استفادہ اتنی ترقی کر گئی کہ بعض مرتبہ نزول وحی سے پہلے ہی وہ بجلی کی طرح دور سے اس کو لپک لیا کرتے - کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا کہ وحی الٰہی کا فیصلہ کل کیا ہوگا - مگر نور نبوت کا یہ تربیت یافتہ' انوار صحبت سے لبریز' مجلس میں بول اٹھتا اور جو وہ بول اٹھتا تمام وحی اسی کے موافق نازل ہو جاتی ' صلاحیت و صواب رسی کی یہی وہ آخری منزل تھی جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو گیا ہوتا تو یہ خلعت اس کو پہنا دیا جاتا - یہ وہی ہے جس کو دنیا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نام سے پکارتی ہے - صحاح کی روایات میں تو موافقات عمرؓ کی تعداد تین ہی بتائی گئی ہے مگر موافقات عمرؓ اس سے کہیں زیادہ ہیں - بہر حال اگر عمرؓ اس ماحول کے سوا قرآن کریم کا مطالعہ کہیں اور رہ کر کرتے تو کیا یہ صواب رسی' یہ تو قد' یہ ذکاء ان کو میسر آتا -

صلح حدیبیہ میں صحابہؓ کے اضطراب اور پھر سکون میں ایک تعلیمی سبق ⁂ دیکھئے صلح حدیبیہ کا واقعہ ان کے اور دیگر صحابہؓ کے لیے کتنا مشکل سبق تھا فاتحانہ جرأت رکھتے ہوئے مفتوحانہ شرائط کو معقول سمجھنا اور ان کو قبول کر لینا کتنی کٹھن منزل تھی - پھر آپ کو معلوم ہے کہ وحی الٰہی نازل ہوئی اور اس نے اس واقعہ کا نام فتح رکھا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروقؓ کو جو اس معاملہ میں سب سے زیادہ الجھن میں پڑے ہوئے تھے بلایا اور وحی الٰہی کو پڑھ کر سنا دیا آپ کا پڑھ کر سنانا تھا کہ یا ابھی ابھی وہ بے چینی وہ اضطراب تھا کہ طبیعت سنبھالے نہ سنبھلتی تھی یا اب صلح حدیبیہ کا فتح ہونا ان کی رگ و پے میں اتنا سما چکا تھا کہ تمام اضطراب و بے چینی کی بجائے سکون ہی سکون و اطمینان ہی اطمینان تھا -

حادثہ وفات پر صحابہ کرام کا دوسرا اضطراب و سکون ⁂ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثہ وفات نے جو ہیجان ان کے سینہ میں برپا کر دیا تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کی موت کے نام لینے والے کا جواب شمشیر سے دینا چاہتے تھے مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آیت ﴿وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ... الخ﴾ (النساء : ۱۴۴) کا پڑھنا تھا کہ یہ اور ان کے ساتھ بہت سے مدہوش صحابہؓ ہوش میں تھے - صحبت میں رہ کر جو علوم حاصل کیے جاتے ہیں ان میں اول تو شبہات پیدا نہیں ہوتے اور جو پیدا ہوتے ہیں وہ اسی طرح ظاہری و باطنی اثرات سے کافور ہوتے رہتے ہیں حتی کہ

علم پڑھنا پھر اُسے گننا چاہیے ⁂ جب ایک متعلم اس طرح علم پڑھتا اور گن لیتا ہے تو اس کا قلیل علم بھی قلیل نہیں ہوتا - اب اس کا نام علم نہیں رہتا بلکہ قرآنی الفاظ میں شاید حکمت ہو جاتا ہے - قرآن کریم میں جس حکمت کو حضرت لقمان کا بڑا علم بتلا دیا گیا ہے ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ﴾ (لقمان: ۱۲) ہم نے لقمان کو حکمت مرحمت فرمائی تھی - وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے ﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ (البقرة: ۱۲۹) میں اسی طرف اشارہ ہے -

حکمت کا مفہوم ⁂ گو عام مفسرین نے حکمت کی تفسیر سنت کی ہے مگر یہاں اور بھی بہت اقوال موجود ہیں' تعلیم کتاب کے ساتھ جب حکمت کی تعلیم نہیں رہتی تو گویا اصل دوا کا بدرقہ نہیں رہتا اس لیے اس کی تاثیر میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے - معلم محقق

4

کتاب کے ساتھ حکمت کی بھی تعلیم دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ دوسری چیز ہوتی ہے- یہ حکمت کتاب کی شکل میں کوئی دوسری کتاب نہیں ہوتی بلکہ اس کتاب کو صحبت نبی میں پڑھنے کے وہ اثرات ہوتے ہیں جو مستعد شخص کی ذہنیت میں ایسی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں کہ صحیح فہم و فراست اس کے لیے ملکہ نفس بن جاتی ہے' اس کے خیالات و عقائد خود پاکیزہ اور دوسروں کو بھی پاکیزہ بنا دیتے ہیں- غلط بات کو اس کا ذوق قبول نہیں کرتا اور صحیح حقیقت قبول کرنے میں اسے کچھ تردد نہیں رہتا- امام مالکؒ فرماتے ہیں:

الحکمة و العلم نور یهدی به الله من یشاء.	حکمت اور علم ایک نور ہے خدائے تعالیٰ جسے چاہتا ہے دے دیتا ہے-

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسب کا ثمرہ ہی نہیں بلکہ وہبی نعمت ہے کسی نصیب والے کو مل جاتی ہے' کتاب اللہ کے ساتھ جب یہ حکمت نہیں ہوتی تو خام طبائع اسے فلسفہ بنا لیتی ہیں غالباً اقبال مرحوم نے اسی کے لیے یہ شعر کہا ہے ؎

فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی ۔۔۔ رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی

امام مالکؒ جب مسائل اجتہادیہ اپنے طلبہ کے سامنے بیان فرماتے تو طلبہ ان سے لکھنے کی اجازت طلب کرتے آپ منع فرما دیتے اور کہتے کہ یہ مسائل اگر دنیا میں پھیل گئے پھر کل ان کے متعلق میری رائے بدل گئی تو اس کی تلافی مشکل ہو جائے گی اس لیے لکھو مت' انہوں نے عرض کیا پھر کیا کریں تو فرمایا-

تحفظون و تفهمون حتی تستنیر قلوبکم ثم لا تحتاجون الی الکتابة.	بس زبانی یاد رکھو اور انہیں خوب سمجھ لو یہاں تک کہ جب تمہارے قلوب روشن اور منور ہو جائیں گے تو اسکے بعد لکھنے کی خود بخود ضرورت نہ رہیگی-

دوسری جگہ امام مالکؒ فرماتے ہیں-

لیس العلم بکثرة الروایة ولکنه نور یجعله الله فی القلوب.	علم کثرتِ روایات کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتا ہے-

پھر اس کی علامت بیان فرماتے ہیں-

و لکن علیه علامة ظاهرة و هو التجافی عن دار الغرورو الانابة الی دار الخلود.	اس کی ایک کھلی علامت دنیا سے نفرت اور آخرت کی طرف توجہ ہے-

علم ایک نور کا نام ہے ✻ امام مالکؒ جیسا شخص یہ بتا رہا ہے کہ علم کثرتِ روایت اور طول و عرض کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جس کے بعد دماغ رٹنے کا محتاج نہیں رہتا اس کی روشنی میں حقائق اشیاء اسی طرح نظر آنے لگتی ہیں جیسا کہ آفتاب کی روشنی میں سیاہ و سفید-

علم کے متعلق اشراقیہ کی رائے ✻ اشراقیین کا بڑا طبقہ علم کی حقیقت بھی اشراق نوری قرار دیتا ہے-علم درحقیقت اسی نور کا نام ہے جب تک یہ نور پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک مسائل غامضہ تو درکنار بدیہیات بھی اپنی پوری حقیقت کے ساتھ منکشف نہیں ہوتے وہ قرآنی سورتیں کی سورتیں پڑھ جاتا ہے- حدیثوں کے انبار کے انبار رٹ لیتا ہے لیکن اس کے قلب میں جو درحقیقت علم کی

تخت گاہ ہے علم وفہم کا کوئی حصہ نہیں پہنچتا اسی لیے خوارج کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ یقرون القران لا یجاوز حناجرھم علم کی حقیقت سے ناآشنا تو آیات واحادیث کا یہ طول وعرض' الفاظ کا یہ طمطراق دیکھ دیکھ کر مرعوب ہوتا رہتا ہے مگر حقیقت شناس جانتا ہے کہ یہ علم خوشنما الفاظ کا صرف ایک انبار ہے جس کی حقیقت قاعدۂ بغدادی کے صرف انتیس حروف ہیں اور بس- اس کے برخلاف جو علوم تاثیر صحبت سے راسخ ہو کر نور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں وہ کتنے ہی مختصر ہوں ان کا جامہ کتنا ہی کہنہ اور دریدہ ہو مگر قدر شناس خوب جان لیتا ہے کہ یہ گدڑیوں میں لعل ہے-

نور علم بلاعقیدت واتباع منتقل نہیں ہوتا ❋ یہ علم صرف مشائخ کرام اور علماء کبار کی زیر تربیت ہی حاصل ہوتا ہے اور اس لیے جب تک متعلم ان کے ساتھ عقیدت ومحبت کا تعلق نہ رکھے ان کے رنگ میں رنگین نہ ہو اس وقت تک علم کا یہ نور بھی اس کے سینہ میں منتقل نہیں ہوتا- وہ حرف شناس ہو کر حاضر ہوتا ہے اور فقرہ باز بن کر واپس چلا جاتا ہے اب جتنا چاہے اس پر ناز کرے-

غالبًا اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ سطحی علم سے ہمارا کیا مطلب تھا اور صحابہؓ کے علم کو ہم نے صرف حسن اعتقاد سے نہیں بلکہ حقیقت کی بنا پر عمیق کہا تھا- اب یہ علم اگر کسی سینہ میں سرایت کر جائے تو کیا آپ کے نزدیک اس پر مقاصد شریعت مخفی رہ سکتے ہیں- اگر علم کے مختلف حاملین ایک ہی منبع سے فیض یاب ہوں جہاں کوئی اختلاف نہیں تو کیا ان میں اختلاف پیدا ہونے کا کوئی احتمال ہو سکتا ہے-

اس کے بعد راسخ العلم کی دوسری علامت یہ تحریر فرمائی ہے کہ اس کا علم وعمل' حال وقال ایک دوسرے سے مطابق ہو-

علم صحیح عمل کی دعوت دیتا ہے ❋ مذکورہ بالا تفصیل کے بعد یہ نتیجہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ صحیح عالم بے عمل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ صحیح علم بلا عمل قائم رہ سکتا ہے- علم صحیح کا تسلط اور اس کی باطنی تسخیر اپنے حامل کو اس کے لیے جھکا دیتی ہے کہ وہ اس کے مقتضاء پر عمل کرے- کچھ دن عالم اور علم میں یہ کشمکش رہتی ہے پھر بالآخر یا عالم کو اقتضاء علم کے تابع ہو جانا پڑتا ہے ورنہ علم خود اس سے کنارہ کش ہو کر اپنی گدی ویران چھوڑ جاتا ہے-

علماء سوء کی علامت ❋ فاضل مؤلف نے آٹھویں مقدمہ کے آخر میں ایسے علماء کا نام علماء سوء رکھا ہے اور اس کی شہادت میں اکابر صحابہؓ وعلماءؒ کے آثار ذیل نقل کیے ہیں-

''حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اے گروہ علماء اپنے علم پر عمل کیا کرو کیونکہ عالم وہ ہے جو پہلے علم حاصل کرے پھر اس پر عمل بھی کرے اس کا علم وعمل یکساں نظر آئے- آئندہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے جو علم حاصل کریں گے مگر وہ ان کے گلے کے نیچے نہ اترے گا- ان کا باطن ان کے ظاہر کے مخالف اور ان کا علم ان کے عمل کے برخلاف ہو گا- حلقے بنا بنا کر بیٹھیں گے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کریں گے یہاں تک کہ اپنے شاگرد پر کوئی تو اس لیے ناراض ہو گا کہ وہ اسے چھوڑ کر دوسرے کے حلقہ درس میں کیوں بیٹھ گیا یہی لوگ ہیں جن کے اعمال قبول نہ ہوں گے-''

''حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ عالم تو وہ ہے جو اپنے علم کے موافق عمل بھی کرے لیکن جس کا علم وعمل مخالف ہو وہ کیا عالم ہے-''

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علماء وہ لوگ ہیں کہ جب علم حاصل کر لیتے ہیں تو اس پر عمل کرتے ہیں اور جب عمل کرتے ہیں تو اسی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب مشغول ہو جاتے ہیں تو عوام میں نظر نہیں آتے جب نظر نہیں آتے تو ان کی تلاش پڑتی ہے جب تلاش ہوتی ہے تو مخلوق سے بھاگتے ہیں-''

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے جو شخص لوگوں سے علم میں برتر ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ عمل میں بھی ان سے برتر رہے-''

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علم جب آتا ہے تو عمل کو پکارتا ہے اگر وہ بھی آ گیا تو ٹھہر جاتا ہے ورنہ رخصت ہو جاتا ہے-''

مذکورہ بالا آثار میں علم و عمل کا وہ ربط جو ان حضرات کی دور بین نظروں میں تجربہ کے بعد ثابت ہوا ہے ظاہر کر دیا گیا ہے- اس کے بعد صاحب موافقات لکھتے ہیں کہ علم میں لگے رہنے سے ایک نہ ایک دن عمل کے لیے مجبور ہو جانا پڑتا ہے-

''حسنؒ فرماتے ہیں شروع میں ہم نے دنیا کے لیے علم حاصل کیا آخر کار ہمیں علم نے آخرت کی طرف کھینچ ہی لیا-''

''معمرؒ کہتے ہیں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی علم دنیا کی نیت سے حاصل کرے گا تو آخر علم اسے کشاں کشاں خدا کی طرف لے ہی آئے گا-''

''حبیب بن ابی ثابتؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے علم حاصل کرنا شروع کیا تو اس وقت ہماری کوئی اچھی نیت نہ تھی لیکن جب علم آیا تو خود بخود اچھی نیت پیدا ہو گئی-''

اختلاف کا دوسرا سبب اتباع ہویٰ ہے ※ قدرت نے انسان میں فہم و فراست اور عقل و ذکاوت کی وہ طاقت ودیعت رکھی ہے کہ جب وہ اس کا پورا پورا ادراک کر لیتا ہے تو بر و بحر کی ساری طاقتیں اس کو اپنی ہی محکوم نظر آتی ہیں، وہ سمندروں کے طوفانوں، دریا کی موجوں اور بڑے بڑے حوادثِ ارضی کو نظر میں نہیں لاتا وہ سورج کی شعاعوں اور بادلوں کے پانی سے بڑی بے نیازی کے ساتھ فائدہ اٹھاتا ہے اور اگر اس کے نظام عمل میں یہ عظیم الشان مخلوق کبھی اس کے ارادہ کے موافق کام نہیں کرتی تو اپنا ایک الگ سورج اور جدا بادل بنا کر نہایت حاکمانہ انداز میں ان کا بائیکاٹ کر دیتا ہے-

انسان کچھ پر اپنی حکومت دیکھتا ہے اور سب کچھ پر حکومت کا یقین کر لیتا ہے ※ اپنی حاکمیت کی یہ بے پناہ وسعت دیکھ کر اسے یقین ہو جاتا ہے کہ بس وہی ایک حاکم علی الاطلاق ہے اور سب کچھ اسی کے زیر حکومت ہے- اسی زعم حاکمیت میں کبھی کبھی جب وہ آسمان کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو اس کی نظر ایک ایسے عالم پر پڑتی ہے جہاں اس کی حاکمیت کا وہ اثر ظاہر نہیں ہوتا جو اس کرۂ ارضی پر نظر آتا تھا یہ ہمہ وقت اس کے قدموں کے نیچے پامال ہو رہا ہے اور وہ اس کی قید حکومت سے تمام تر آزاد ہے- نظام شمسی و قمری اس کی دسترس سے بالکل باہر ہیں- سیارات کی گردش اور بے شمار ثوابت کی معین نشست پھر ان میں صغیر و کبیر، قرب و بُعد کا تناسب، یہ ابھی تک اس کے لیے موجب حیرت بن رہا ہے، مدتوں سعی کے بعد اگر اس نے بازوئے پرواز حاصل کیے بھی تو وہ بھی چند میل کے فاصلہ پر جا کر شکستہ ہو گئے- تاہم کبھی وہ ہواؤں پر اڑا اور کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھا اور اپنی عقل و فراست کی جتنی بھی طاقت تھی وہ سب خرچ کر ڈالی مگر ابھی تک اس کو یہ باور نہیں ہو سکا کہ عالم علوی پر بھی اس کو وہی تصرف و قبضہ حاصل ہو گیا

ہے جو عالم سفلی پر تھا قدرت اس کو اتنا زبردست حاکم بنا کر پھر کبھی کبھی اس لیے شکست دیتی رہتی ہے کہ اس کے دل میں کبھی اس سے برتر حکومت کا تصور بھی آ جائے اسی قدرت و عجز کے درمیان اس کا امتحان لیا جارہا ہے۔

معجزہ ✲ انبیاء علیہم السلام آتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسی بادشاہت کے پیغمبر ہیں جس سے وہ ہمیشہ شکست کھاتا رہا ہے اور اس دعویٰ کے ثبوت میں دنیوی طاقتوں کو چیلنج دیتے ہیں۔ کہ وہ اپنی ساری طاقتوں کو بروئے کار لے آئیں اور ان کا مقابلہ کرلیں اور اگر اس پر بھی مقابلہ نہ کرسکیں تو اس کا یقین کرلیں کہ وہ ضرور کسی ایسی حکومت کی طرف سے آئے ہیں جو ان ساری حکومتوں سے قوی تر اور بالاتر ہے اسی کا نام معجزہ ہے اس کے بعد وہ ان کے سامنے ایک دستور العمل رکھتے ہیں اور بے چون و چرا اس پر عمل کرنے کی عام دعوت دیتے ہیں۔

انسان کا قدرت کے ساتھ ایک فریب ✲ یہ شکست خوردہ انسان گو اس قاہرانہ طاقت کے بالمقابل کبھی کبھی سرنگوں ہو جانے پر مجبور تو ہو جاتا ہے مگر اندر ہی اندر کوشش کیا کرتا ہے کہ اس حاکم قانون کو بھی اپنی ہی قید حاکمیت میں لے آئے باغی تو یہاں صاف انکار کردیتا ہے اس سے ہمیں سروکار ہی نہیں۔ ایک فرمان بردار بھی اس موقع پر حق حاکمیت ادا کرتا نظر نہیں آتا اور ایک صحیح بات کی آڑ لے کر اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے اور بجا کرتا ہے کہ اس آئین کو معقول تر آئین ثابت کرے مگر یہاں فریب یہ ہے کہ اس معقولیت کا معیار اپنی عقل نارسا کو بنالیتا ہے اور اس لیے اس خیر خواہی میں وہ شریعت سماویہ کی گردن توڑتا موڑتا رہتا ہے۔ حکم یہ تھا کہ ہر اختلاف میں اس قانون کو حکم اور فیصل بناؤ اور عمل یہ ہے کہ اس قانون کو اپنی عقل کے مطابق کرنے کی سعی ہو رہی ہے اسی کا نام اتباع ہویٰ ہے۔

اتباعِ ہدیٰ اور اتباعِ ہویٰ متضاد صفتیں ہیں ✲ قرآن کریم اتباعِ ہویٰ اور اتباعِ ہدیٰ کو دو متضاد چیزیں قرار دیتا ہے یعنی جو تبع ہویٰ ہے وہ سماوی ہدیٰ کا تبع نہیں ہوسکتا اور جو آسمانی ہدایت کا تبع ہے وہ ہویٰ کے پیچھے نہیں جاسکتا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاکَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَ لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ. (جاثیہ:۱۸)

پھر ہم نے آپ کو دین کے راستہ پر رکھا ہے (یعنی ہدیٰ) تو آپ اسی پر چلئے اور بے علموں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلئے۔

یعنی اتباع ہدیٰ کو اتباع ہویٰ کا ترک لازم ہے۔ ہدیٰ اور ہویٰ اپنی اپنی جگہ دو کھلے ہوئے راستے ہیں، قدرت نے دونوں انسان کے سامنے رکھ دیئے ہیں وَهَدَیْنَاهُ النَّجْدَیْنِ اور ان دونوں راستوں میں ایک راستہ پر چلنے کا حکم اور دوسرے سے احتراز کا حکم دے دیا ہے۔

ہدیٰ اور ہویٰ کے دوراہے پر انسان کا امتحان ✲ اسی دوراہے پر کھڑا کر کے انسان کا امتحان لیا گیا ہے۔ راہ ہدیٰ پکارتی ہے کہ راہ یہ ہے اس پر چلو مگر ہویٰ مچلنے لگتی ہے اور سو طرح کی رکاوٹیں سامنے لے آتی ہے۔ ہدیٰ ایک آسمانی آئین ہے اس کے اتباع میں محکومیت کا داغ لگتا ہے اور ہویٰ اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں اس کے مان لینے میں حاکمیت کا مزا آتا ہے اس لیے یہاں تک ایک نیک بخت انسان بڑی حماقت یہ کرتا ہے کہ ھدیٰ اور ہویٰ کے درمیان اتفاق و سازگاری کی سعی کرنے لگتا ہے تاکہ۔ ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

مگر یہ سعی لاحاصل ہے قرآن نے پہلے اعلان کر دیا ہے کہ یہ دو راہیں علیحدہ علیحدہ ہیں ایک کا سرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے اور دوسری کا سرا شیطان کے ہاتھ میں ہے ایک کا منتہیٰ جنت ہے اور دوسری کا دوزخ۔

اتباعِ ہویٰ میں سکون کا راز ٭ یاد رکھنا چاہیے کہ خواہشات واہوا کا محرک چونکہ خود نفس انسانی ہے اس لیے وہ جسم انسانی میں جان کی طرح رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کی ہوئی ہوتی ہیں ان کا خلاف اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ جسم کو جان کا۔ ان میں اسی طرح فطری جاذبیت ہوتی ہے جیسا کہ لوہے اور مقناطیس میں اور جب کبھی ان پر قرآن وسنت کا ملمع چڑھ جاتا ہے تو اب وہی ہویٰ ٹھیک ھدیٰ کی صورت نظر آنے لگتی ہے اور ہدیٰ اور ہویٰ کے اس توافق کے بعد جو اطمینان وانشراح قلب میسر آتا ہے وہ گنگا وجمنا کے سنگھم کا سا لطف سامنے کر دیتا ہے۔ اس حد پر پہنچ کر انسان اپنے اندر اتنا سکون محسوس کرتا ہے کہ پھر تلاشِ حق کا لفظ سننا بھی اسے گوارا نہیں ہوتا۔ اسی لیے سورہ الجاثیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریق امتنان ارشاد فرمایا گیا تھا کہ دیکھئے اتباعِ ہویٰ کی اس گرم بازاری کے زمانہ میں ہم نے آپ کو ہدیٰ پر قائم رکھا ہے یہ کتنا بڑا احسان ہے' تو اب آپ ان بے علموں کی ہویٰ کا ساتھ نہ دیں۔ ہویٰ کے ان غیر معمولی اثرات اور برقی تاثیر وتعدیہ کا حال حدیثِ افتراق کے آخری جملوں میں بدیں الفاظ ذکر کیا گیا ہے۔

و انہ سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بھم تلک الا ھواء کما یتجاری الکلب بصاحبہ لا یبقی منہ عرق و لا مفصل الا دخلہ. (ابوداؤد)	آئندہ میری امت میں کچھ لوگ آئیں گے جن میں یہ اہوا اور خواہشات اس طرح رچی ہوئی ہوں گی جیسا کہ ہڑک کتے کاٹے کے جسم میں کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ اس کا ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری گھسی ہوئی نہ ہو۔

تشبیہات انبیاء علیہم السلام اور استعاراتِ شعراء میں فرق ٭ یہ انبیاء علیہم السلام کے تشبیہات ہیں' شاعروں اور افسانہ نگاروں کے استعارات نہیں اس لیے یہاں صرف رنگینی اور لطف اندوزی مقصود نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی صحیح سے صحیح ترجمانی مدنظر ہوتی ہے۔ کتے کاٹے کی بیماری پر غور کیجئے تو اس میں آپ کو دو باتیں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ چونکہ یہ بیماری ایک ایک جوڑ میں سرایت کر جاتی ہے اس لیے لاعلاج ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ جس طرح یہ بیماری دراصل دیوانے کتے میں موجود ہوتی ہے لیکن جب وہ کسی کو کاٹ لیتا ہے تو اس کو بھی اس بری طرح لگ جاتی ہے کہ پھر یہ شخص بھی کتے کی طرح خوفناک اور قابل احتراز ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اگر یہ کسی تیسرے انسان کو کاٹ لے تو اس پر بھی وہی اثر ظاہر ہو جاتا ہے جو دیوانے کتے کے کاٹنے سے ہوتا۔

اصحابِ ہویٰ کو توفیق توبہ میسر آنا مشکل ہے ٭ ان خصوصیات کے بعد اب اگر آپ اہل ہویٰ کے حالات کا موازنہ کریں تو اس تشبیہ میں آپ کو نبوت کا ایک اعجاز نظر آئے گا۔ ہویٰ کا حال بھی یہی ہے کہ جب وہ انسان کی رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر وہی انسان کو بشکل ''ہدیٰ'' نظر آنے لگتی ہے اس لیے یہاں توبہ کی امید نہیں رہتی' توبہ کی توفیق اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ قلب کا کوئی گوشہ ہویٰ سے خالی ہو مگر جب رگ رگ میں ہویٰ سرایت کر جائے تو اب توبہ کی توفیق کہاں سے آئے اسی لیے سورۂ جاثیہ میں فرمایا ہے۔

اَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشَاوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. (الجاثیہ:۲۳)

بھلا دیکھئے تو جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا اور حاکم ٹھہرا لیا اور علم رکھنے کے باوجود خدا نے اس کو راہ سے بھٹکا دیا اور اس کے کان اور دل پر مُہر لگا دی اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تو اب اس کو خدا کے بعد کون ہدایت دے سکتا ہے کیا تم اس پر غور نہیں کرتے۔

علم کی گمراہی جہل کی گمراہی سے بدتر ہے ❋ آیت بالا میں چند مہم فوائد بتلائے گئے ہیں پہلا یہ کہ جس طرح بے علمی گمراہی کا سبب بنتی ہے اسی طرح کبھی علم بھی گمراہی کا سبب ہو جاتا ہے مگر جو گمراہی علم کی راہ سے آتی ہے اس کا نتیجہ بھی انتہائی خطرناک ہوتا ہے یہ گمراہی تاریکی کی گمراہی نہیں بلکہ روشنی کی گمراہی ہے۔ جہل کی نہیں، علم کی گمراہی ہوتی ہے اس لیے یہاں اسبابِ ہدایت سب معطّل ہو جاتے ہیں، نہ کان کچھ سنتے ہیں اور نہ آنکھیں غور و فکر کرنے کے لیے تیار ہوتی ہیں اور قلب میں تو حکومت ہویٰ کی وجہ سے حق بینی اور حق فہمی کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی اس لیے یہاں ہدایت و توبہ کی کوئی توقع نہیں رہتی۔ اگر خدا ہی اسبابِ ظاہریہ سے بالا طریقہ پر ہدایت نصیب فرما دے تو یہ دوسری بات ہے اسی کو دوسری آیت میں بلفظ طبع ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ. (محمد: ۱۶)

یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مُہر کر دی ہے اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے۔

سورۂ جاثیہ میں جس بدنصیبی کو لفظ ختم سے تعبیر فرمایا تھا یہاں لفظ طبع سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ دونوں لفظوں کا حاصل وہی محرومی اور شقاوت ہے۔

ہویٰ پرست کو خدا پرستی کا مغالطہ ❋ دوسری بات یہ کہ ہویٰ پرست کو اتباعِ ہویٰ میں وہ مزا آتا ہے جو خدا پرست کو عبادت میں کیونکہ جب اس نے اپنی ہوا ہی کو اپنا خدا بنالیا ہے تو پھر اسی کی فرمان برداری اس کو خدا کی فرمان برداری نظر آنی چاہیے اس لیے جتنا ایک خدا پرست ہدیٰ کے اتباع کی سعی کرتا ہے اس سے زیادہ ایک ہویٰ پرست اپنی ہویٰ کے اتباع کے پیچھے رہتا ہے اور حیرت ہے کہ راستہ کے اس اختلاف کے باوجود دونوں کے خیال میں مقصد پھر ایک ہی ہوتا ہے یعنی خدائے قدوس کی فرمانبرداری اس التباس کے بعد متبع ہویٰ سے توبہ کی توقع ایسی ہے جیسی کہ ایک متبع ھدیٰ سے کفر کی توقع۔ نہ وہ اپنے اسلام کو چھوڑ سکتا ہے نہ یہ اپنی ہویٰ کو اس کا نتیجہ پھر وہی توبہ سے محرومی نکلتا ہے۔

اتباعِ ہویٰ کو گمراہی لازم ہے ❋ تیسری بات یہ کہ اتباعِ ہویٰ اور ضلالت لازم و ملازم ہیں اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ اتباعِ ہویٰ اور اتباعِ ہدیٰ دو متضاد نقطے ہیں۔ اس کا حاصل یہی تھا کہ اتباعِ ہویٰ کا نتیجہ ضلالت و گمراہی ہے اسی کو آیت ذیل میں بیان فرمایا گیا ہے۔

- يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى

اے داؤدؑ ہم نے آپ کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تو مخلوق میں سچائی کا فیصلہ کیجئے اور خواہش و ہویٰ کی اتباع نہ کریئے۔ کہ یہ

فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ. (ص : ۲۶) آپ کو خدا کے راستہ سے بھٹکا دے گی۔

خلافت حق اتباع ہویٰ کے منافی ہے ✻ اس آیت میں بھی اسی مضمون کو بتلایا جا رہا ہے کہ آپ خلیفہ ہیں آپ کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام نافذ کریں یہی خدائی خلافت کا حق ہے۔لیکن اگر آپ نے ہویٰ اور اپنی خواہش کی پیروی کی تو پھر خدا کی راہ آپ کو نظر نہیں آ سکتی اور کیسے نظر آ سکتی ہے جب کہ اس کی خاصیت اسباب ہدیٰ کا تعطل ہو۔

دوم اس آیت سے جہاں ہویٰ اور ضلالت کا ربط معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتباعِ ہویٰ شانِ خلافت کے بھی منافی ہے۔ خدا کا خلیفہ دنیا میں اس لیے آتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اسی کے راستہ پر لگائے نہ اس لیے کہ خود ہی گم کردہ راہ بن جائے۔

اتباع ہویٰ شریعت اور سیاست دونوں کے لیے مضر ہے ✻ تیسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہویٰ جس طرح مسائل شریعت کی فہم میں مخل ہوتی ہے اسی طرح حکومت عدل وانصاف' معاملہ فہمی کے لیے بھی سد راہ ہے چونکہ خلیفہ کا تعلق دونوں شعبوں سے ہوتا ہے اس لیے اس مرکزی نقطہ پر متنبہ رہنے کی اس کو پوری ہدایت کی گئی ہے۔اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَھْوَآئَھُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ..... (المومنون: ۱۷) اگر حق ان کے خواہشات کی پیروی کرتا تو آسمان وزمین فاسد ہو جاتے۔

معلوم ہوا کہ اتباع ہویٰ جس طرح نظام مذہب میں مخل ہے اسی طرح نظام عالم کو بھی درہم و برہم کرنے والا ہے۔اسی لیے صاحبِ موافقات نے تو اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کہ شریعت داعیہ ہویٰ کو ختم کرنے کے لیے ہی آئی ہے۔

مذمت ہویٰ میں سلف کے اقوال ✻ مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں ہم سلف کے چند آثار بھی نقل کر دیں کہ ہمارے نزدیک علم یہی ہے سفیان ثوریؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی خوش اعتقادی میں بولا ''انا علی ھواک '' میں تو آپ کی ہویٰ (خواہش) کا متبع ہوں۔اس پر ابن عباسؓ نے جواب دیا ''الھوی کلہ ضلالۃ '' ہویٰ (خواہشات) سب گمراہی ہے پھر بطریق تادیب وسرزنش فرمایا ''ای شی انا علی ھواک انا علی ھواک '' کیا چیز ہے یعنی کچھ نہیں۔ ابن وہب حضرت طاؤس سے نقل کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے جہاں ہویٰ کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی مذمت ہی فرمائی ہے۔[1] اب آیات ذیل کو بغور پڑھیے تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ جہاں ہویٰ کا ذکر آیا ہے مذمت ہی کے سلسلہ میں آیا ہے۔

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَھْوَی الْاَنْفُسُ. (النجم:۲۳) صرف اٹکلوں اور اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کررہے ہیں۔

آیت بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتباع ہویٰ اور اتباع ظن وتخمین یہ ایک ہی نوع کی باتیں ہیں واقعات اور حقائق سے دونوں دور دور رہتے ہیں۔

---

[1] کتاب الاعتصام ج۲ص۱۵۲و۱۵۵۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ. (محمد : ۱۴)

بھلا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرح سے کھلے ہوئے راستہ پر ہو ان کے برابر ہوسکتا ہے جن کی نظروں میں اپنے اعمال بدمزین ہوں اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ہوں۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى. (النازعات : ۴۰ - ۴۱)

جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو یقیناً اس کی جگہ جنت ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ احتراز ہویٰ مورثِ خوف ہے اور اتباعِ ہویٰ موجب بے خوفی۔

وَ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. (النجم : ۳ - ۴)

وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ صرف خدا کی وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔

یہاں آپ کا نطق دو ہی صورتوں میں منحصر کر دیا گیا ہے ہویٰ اور وحی تیسرا اور کوئی احتمال نہیں۔ اسی لئے جب ہویٰ آپ کے کلام سے منفی ہے تو صرف اس کا وحی ہونا متعین ہے۔ معلوم ہوا کہ ہویٰ اور وحی دو متضاد چیزیں ہیں۔ اگر ان چند آیات پر ہی غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہویٰ صرف ظنون یعنی اٹکل اور تخمین کا نام ہے کوئی سماوی روشنی اس کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ اپنے اعمال کی بدتری کو اچھی صورت میں سمجھنا اور سمجھانا اور خدا سے بے خوفی اس کا واحد منشا ہوتا ہے۔ وحی سماوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ضلالت و گمراہی اس کو لازم ہے۔ غرض نظام معیشت اور نظام مذہب دونوں کے لیے تباہ کن ہے اور شخصی مضرت کے لحاظ سے اس کا اثر انسان کے لیے اس کے اسباب ہدایت کا کلی تعطل ہے اسی لیے اس پر ایک طرح توبہ کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے اور اس کے شفایاب ہونے کی اسی طرح توقع نہیں رہتی جس طرح کتے کاٹے شخص کی۔

ہویٰ متعدی مرض ہے ✻ تشبیہ کا دوسرا جز وتعدیہ ہے آپ کے نزدیک تو یہ مجاز واستعارہ ہوگا مگر آیئے سلف کو دیکھئے کہ انہوں نے کیا سمجھا تھا۔

عن ابن مسعود قال من احب ان یکرم دینه فلیعتزل مخالطة الشیطان و مجالسة اصحاب الا هواء فان مجالستهم الصق من الجرب.

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص تم میں اپنے دین کی قدر کرنا چاہے اسے شیطانی افعال اور اصحابِ اہواء سے علیحدہ رہنا چاہیے کیونکہ ان کے پاس بیٹھنے سے ان کی بیماری خارش سے زیادہ اُڑ کر لگتی ہے۔

ایوب فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص ابن سیرین کے پاس گیا اور بولا اے ابوبکر (ان کی کنیت ہے) میں آپ کے سامنے قرآن کی صرف ایک آیت تلاوت کرنا چاہتا ہوں اسے پڑھ کر بس فوراً چلا جاؤں گا۔ ابن سیرین نے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور فرمایا اگر تو مسلمان ہے تو میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں' ابھی میرے گھر سے چلا جا اس نے کہا اے ابوبکر میں آیت پڑھنے کے سوا اور کوئی تقریر نہیں کروں گا۔ انہوں نے فرمایا جا بس تو چلا ہی جا۔ جب وہ چلا گیا تو فرمایا خدا کی قسم اگر مجھے یقین ہوتا کہ میرا دل ایسا ہی مطمئن رہے گا جیسا کہ اب ہے تو میں اسے آیت پڑھنے کی اجازت دے دیتا لیکن مجھے اندیشہ یہ تھا کہ

کہیں وہ آیت پڑھ کر میرے دل میں کوئی ایسا شبہ پیدا نہ کر دے جسے میں بعد میں نکالنا چاہوں اور نہ نکال سکوں۔[۱] امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ صاحب بدعت سے بات چیت مت کرو اور نہ اس سے جھگڑا کرو، وہ تمہارے دل میں فتنہ کا بیج ڈال دے گا۔[۲]

ان آثار سے معلوم ہو گیا کہ صاحب شریعت کی وہ تشبیہ کتنی پُر مغز اور حقیقت سے کتنی قریب تر تھی۔

ہویٰ کی جاذبیت ✻ اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہویٰ معنوی طور پر اپنے اندر کچھ ایسی جاذبیت رکھتی ہے کہ اس کے آثار بعض مرتبہ غیر اختیاری ہو جاتے ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ یہ چیز ناحق ہے مگر پھر اس کے باطل اثرات گھن کی طرح اندر ہی اندر اس کے ایمان کو کھائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ جبر و قدر اور مشاجراتِ صحابہؓ کے مسائل۔ ایک اچھا خاصہ ایمان دار شخص بھی جب اس وادی میں قدم رکھتا ہے تو کچھ دور چل کر شبہات اور وساوس کی جھاڑیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور ہزار کوشش کے باوجود اس کا ایمان زخمی ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لیے صاحب شریعت نے اس پر خار وادی میں قدم رکھنے کی ممانعت کر دی ہے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ جتنا ادھر سے ممانعت کی تاکید ہوئی، اتنا ہی یہاں اس کی سیر و سیاحت کا شوق بڑھا۔ حضرت ابن مسعودؓ کے الفاظ میں یہ دلیری اور ایمان کی پختگی کی بات نہیں بلکہ اپنے دین کے اکرام نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ہویٰ میں اتنی جاذبیت نہ ہوتی تو اس میں فرقہ بندی کی یہ طاقت بھی نہ ہوتی۔

قرآن و سنت عقل کے لیے روشنی ہیں نہ کہ عقل قرآن و سنت کے لیے ✻ ایک جماعت نے جب اپنی اہواء و خواہشات کی روشنی میں قرآن و سنت کا مطالعہ شروع کیا تو معیارِ صحت انہیں اپنی عقل ہی نظر آئی۔ پھر جو آیت اور حدیث اس معیار کے موافق اتری اس کو تسلیم کر لیا ورنہ تاویل یا انکار کا راستہ اختیار کیا اور اس معصیت کا عذر گناہ بدتر از گناہ یہ تراشا کہ صاحب شریعت کا کلام عقل کے مخالف ہو ہی نہیں سکتا یہ بالکل درست تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اس عقل کا بھی کوئی معیار ہونا چاہیے۔ خلاف عقل کہنے کا بھی کوئی ضابطہ ہونا چاہیے ان مراحل پر بحث کیے بغیر فلاسفہ دور نے جو طے کر دیا بس وہ تو وحی منزل من السماء بن گیا اور جو وحی حقیقی نے ہدایت کی اسے اساطیر الاوّلین کہہ کر محتاج نقد بھی نہ سمجھا گیا۔ چنانچہ حشر اجسام، صراط، میزان اعمال، جسمانی عذاب و ثواب رویت باری تعالیٰ، جنت و جہنم، اس قسم کے اور جتنے امور پروازِ عقل سے بالاتر تھے، سب کا گو صاف انکار تو نہیں کیا گیا مگر اس طرح تسلیم کیا جس کو درحقیقت ایک تسلیم نما انکار ہی کہنا چاہیے، بلاشبہ اگر مذکورہ بالا مسائل کو صرف عقل کے ذریعہ طے کیا جائے تو یہ مشکل ہے، نورِ وحی کے بغیر نہ وہ دریافت ہوئے اور نہ صفت ایمان کے بغیر وہ حدیقین میں آ سکتے ہیں۔

آخر کار اس غلط بنیاد کی وجہ سے دین میں عقائد و اصول کا دوسرا اختلاف پڑ گیا اور جس طرح کہ پہلے اختلاف کی بنیاد جہل پر قائم ہوئی تھی، اس اختلاف کا قلعہ عقل پر تعمیر ہو گیا اسی کی طرف حدیث افتراق امت کے بعض طرق میں یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں۔

الذین یقیسون الا مور برأیھم فیحلون الحرام و یحرمون الحلال.	یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو دین کے مسائل میں صرف قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنا دیتے ہیں۔

---

۱ الاعتصام ج۲ ص۲۴۱۔ ۲ ایضاً۔

ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ ابن معین نے اس زیادتی کو بے اصل قرار دیا ہے مگر صاحب الاعتصام بعض علماء سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں نے ابن معین کا یہ حکم تسلیم نہیں کیا اور کہا ہے کہ یہ ٹکڑا اور ثقہ راویوں سے بھی منقول ہے لہذا اس کی اسناد بے غبار ہے- ہاں اگر ان کے علم میں اس کے سوا کوئی اور خفی علت ہے تو دوسری بات ہے-

مذموم قیاس آرائی کیا ہے؟ ✻ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ الفاظ مذکورہ بالا میں اس قیاس آرائی ہی کی مذمت ہو رہی ہے جو دین کی حقیقت بدل ڈالے اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دے- غیر منصوص جزئیات کے احکام اصول شریعت کے مطابق حاصل کرنا پھر ان کے اسباب وحکم پر بحث کرنا مذموم قیاس آرائی میں داخل نہیں بلکہ اہل علم کے لیے ضروری ہے اس لیے یہ سمجھنا نافہمی ہے کہ ہم نے دین کو بلاوجہ ایک معمہ بنانے کی دعوت دی ہے یا غور وفکر کی راہ معطل کرنے کی سعی کی ہے-اس تقریر سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں-قرآن جگہ جگہ تدبر وتفکر کی دعوت دیتا ہے' طرح طرح سے واقعات ماضیہ بیان کر کے ان سے عبرت پذیری کی ترغیب دیتا ہے آیات آفاقی وانفسی کا بغور مطالعہ کرنا شیوۂ مؤمنین قرار دیتا ہے اور حلال وحرام کے معاملہ میں بھی اس حد تک غور وفکر کی ممانعت نہیں کرتا' جہاں تک اس کے احکام کی تبدیلی وترمیم نہ ہو' ہاں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اگر آپ کی عقل نارسا اس کے منصوص احکام کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز رہے تو ان کو توڑ موڑ کر اپنی عقل کے سانچے میں ڈھال لیں' یہی اتباع ہویٰ ہے-اتباع ہدیٰ یہ ہے کہ شریعت کو حاکم اور عقل کو محکوم شریعت کو متبوع اور اس کو تابع بنایا جائے اور اتباع ہویٰ یہ ہے کہ عقل کو حاکم اور شریعت کو اس کا محکوم بنا دیا جائے-قرآن وسنت کی روشنی میں عقل سے کام لینا حکمت ہے اور عقل کی حدود میں قرآن وسنت کو محدود کر دینا اتباع ہویٰ ہے-

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے غور وتفکر پر کوئی چوکی پہرہ قائم نہیں کرتا مقصد صرف یہ ہے کہ عقل کو عقل کی حد پر رکھئے اور اس کو دیو بے زنجیر کی طرح آزاد نہ بنایئے ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تافتن　　　که جاہا سپر باید انداختن

اختلاف وافتراق کا تیسرا سبب اتباعِ عادت ہے ✻ قومی ملکی یا خاندانی عادات اور رسم ورواج کچھ اتنی بری چیزیں بھی نہیں کہ ان کی اصولاً مذمت ہی کی جائے بلکہ اگر غور کیجئے تو یہ انسانی اصلاح معیشت کا ایک فطری دستور العمل بھی ہیں بہت سی وہ اصلاحات جو انسان آئینی طور پر قبول کرنا پسند نہیں کرتا اپنی خاندانی' یا ملکی عادات کی وجہ سے خوشی خوشی قبول کر لیتا ہے اسی لیے شریعت حنفیہ نے اس کا بڑا لحاظ کیا ہے- بلکہ قانون یسر کا یہی ایک بڑا اصول ہے-لیکن اسی کے ساتھ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانوں میں کوئی فاسد عنصر ظلم وتعدی اور محض اپنے جہل وبے علمی کی وجہ سے کوئی بات کر گذرتا ہے- اس کے دست نگر تو اس کے خوف کے سبب سے چون وچرا نہیں کر سکتے -اہل علم اپنے بے دست وپائی کی وجہ سے اغماض کر لیتے ہیں لیکن جب اسی حال پر کچھ زمانہ گذر جاتا ہے اور کوئی سماوی یا ارضی طاقت اس میں انقلاب پیدا نہیں کرتی تو پھر یہی عام عادت بن جاتی ہے اور رشدہ شدہ اہل مذہب اس کو اپنے مذہب کا جزو قرار دے دیتے ہیں-بعض مزارات پر بھنگ نوشی اور سجادہ نشینی کے لیے غروبت کی زندگی گویا شرط سجادگی تھی-آخر ایک دور آیا اور آنکھ کھلی تو اس کے خلاف آواز بلند کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ہائی کورٹ تک مقدمہ پہنچا- جب مدعین سے

اس کا ثبوت طلب کیا گیا تو ان کے پاس بجز اس کے کوئی دلیل نہ تھی کہ اس درگاہ کی قدیم رسم ہے۔

اسی طرح فاسد عادات کچھ زمانہ کے بعد مذہبیت کا رنگ پیدا کر لیتی ہیں اور دین میں محض اس رسم بد کی وجہ سے فرقہ بندی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ شب برات کی آتش بازی اور عرسوں میں شراب و قمار بازی مذہب کی تعلیم نہیں لیکن یہی عادات ہیں جن کو مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے یہ عادات بعض جہلاء میں تو اتنی راسخ ہو چکی ہیں کہ ان کے خلاف آواز اٹھانا گویا علم جہاد بلند کرنا ہے اسی کا نام اندھی تقلید ہے۔

اندھی تقلید کیا ہے؟ ❋ قرآن کریم نے جہاں کہیں مذمت کی ہے اسی قسم کی تقلید کی کی ہے۔ جب کبھی قرآن نے کفار کی بے تکی اور نامعقول باتوں پر دلائل کا مطالبہ کیا ہے تو ان کے پاس ایک یہی جواب تھا۔

قَالُوْ اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَ نَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُقْتَدُوْنَ. (الزخرف : ٢٣)	کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کی روش یہی دیکھی ہے اس لیے ہم ان ہی کے نقش قدم پر چلیں گے۔

اس پر قرآن کریم نے جو اعتراض کیا وہ یہ نہیں تھا کہ آباء و اجداد کی تقلید کرنا غلط ہے بلکہ یہ تھا کہ۔

اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ. (البقرة : ١٧١)	یعنی اگر تمہارے باپ دادوں میں عقل و ہدایت کا کوئی شمہ بھی نہ ہو پھر بھی تم ان ہی کی تقلید کیے چلے جاؤ گے۔

۔ ی جگہ ذرا اس سے نرم لہجہ میں ارشاد ہے۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَاءَ كُمْ قَالُوْا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ. (الزخرف : ٢٤)	آپ کہہ دیجئے اگر چہ میں تمہارے سامنے وہ راہ پیش کروں جو اس سے کہیں زیادہ بہتر ہو جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے انہوں نے جواب دیا جو طریق تم دیکر بھیجے گئے ہو ہم تو اسے مان نہیں سکتے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ان کے آباؤ اجداد میں عقل کی روشنی یا نور ہدایت ہوتا تو قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں کورانہ تقلید یہ ہے کہ گمراہی اور بے عقلی کی تقلید کی جائے خواہ پھر اس کے ساتھ ہزار دلائل بھی کیوں نہ ہوں اس کے بالمقابل روشن خیالی یہ ہے کہ ہدایت اور عقل کی بات کی پیروی کی جائے خواہ وہ کتنی ہی خاموش اور کتنی ہی سکوت کے ساتھ ہو۔ ہمارے موجودہ دور میں اندھی تقلید اور جمود کا مفہوم ہی غلط سمجھا گیا ہے۔ عالم غیب کی بلند سے بلند حقائق الٰہیات کے عمیق سے عمیق معارف اور اس کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کی ان تمام باتوں کو ان کے اعتماد پر مان لینا جن کو ان کی سچی نظروں نے خود دیکھا یا فہم سلیم نے خوب سمجھا ہے کورانہ تقلید کہلاتا ہے اور یورپ کے فلاسفروں کی ناتمام اور ادھوری تحقیقات کو پورے یقین کے ساتھ مان لینا روشن خیالی کے نام سے موسوم ہے۔ اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو اختلاف دلائل و بے دلیل ہونے کا نہیں بلکہ اعتماد و بے اعتمادی کا ہے۔ عصر حاضر کے موجدین پر چونکہ پورا اعتماد حاصل ہے، اس لیے ان کی باتیں دلیل یا بے دلیل ماننا سب روشن خیالی میں شمار ہے اور انبیاء علیہم السلام پر چونکہ دلی گہرائیوں میں وہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لیے یہاں تصدیق کے لیے ان کے فرمان سے بھی بڑھ کر کسی اور دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور ان کی باتیں بے دلیل ماننا اندھی تقلید نظر

آتی ہے- حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے سب علوم نہایت کھلے اور اتنے صاف ہوتے ہیں کہ ان کے لیے کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی -

(۱) اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ. (محمد:۱۴)

بھلا جو شخص اپنے پروردگار کے واضح راستہ پر چلتا ہے اس کے برابر ہو سکتا ہے جن کو اپنا برا کام بھلا نظر آتا ہے اور اپنی خواہشات پر چلتے ہیں-

(۲) اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ. (الزمر : ۲۲)

بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کے لیے کھول دیا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی میں ہے-

(۳) اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى. (الرعد:۱۹)

بھلا جو شخص یہ یقین کرتا ہے کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر اترا وہ حق ہے اس کے برابر ہوسکتا ہے جو نابینا ہے-

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس راستہ کی دعوت دیتے ہیں وہ خود ایک کشادہ اور کھلا ہوا راستہ ہوتا ہے' ان کی مقابل جماعتوں پر اس کی یہ کشادگی اس لیے پوشیدہ رہتی ہے کہ ان کے سامنے ان کے اعمال بدمزین ہوتے ہیں' ان کے اہواء وخواہشات خود ان کی آنکھوں کا حجاب ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ نور بصیرت ان سے اس طرح سلب ہو جاتا ہے کہ پھر وہ ایک نپٹ اندھے کی طرح ہو جاتے ہیں- اب انصاف کرو کہ اندھی تقلید کس کی ہے ان انبیاء علیہم السلام کی جن کو خود شرح صدر حاصل ہے' ان کے علوم سراپا نور ہی نور ان کا راستہ صاف وستھرا اور کھلا ہوا راستہ ہے یا ان کی جو خود نابینا ہیں' جن کی آنکھوں پر اہواء و خواہشات کے تو برتو حجابات پڑے ہوئے ہیں اور اس لیے انہیں اپنی بدعملی ہی بھلی نظر آتی ہے-

خلاصہ یہ کہ جس طرح سطحی علم اور اتباع ہوا فرقہ بندی کا سبب ہو جاتے ہیں اسی طرح اتباع عادات ورسوم بھی اس کا سبب بن جاتی ہے' یہ تینوں اسباب ایک جگہ جمع بھی ہو سکتے ہیں اور جدا بھی ہو سکتے ہیں اور وقت کی مساعدت اور ماحول کی مناسبت پر ان جماعتوں کے گھٹنے بڑھنے' پیدا ہونے اور فنا ہونے کا مدار رہتا ہے' امید نہیں ہے کہ مذہبی افتراق وتشتت کے لیے ان امور کے اسباب ہونے میں دورائیں ہوں مگر جو بات ہر دور میں عقدۂ لاینحل بن کر رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی فرقہ کے علم کو سطحی کہہ دینا یا اس کو متبع ہویٰ قرار دینا یا کسی رسم کو رسم جاہلیت ٹھیرا دینا آسان بات نہیں' ہر فرقہ اپنے علم کو عمیق اور اپنے طریق کو اتباع سنت اور اپنے رسم ورواج کو طریق سلف کہتا ہے' اس گتھی کو سلجھانے سے عقل کے ناخن عاجز ہیں- ایک فرقہ کا فیصلہ دوسرے کے حق میں معتبر نہیں ہوسکتا اور اس مرحلہ پر پہنچ کر خدا کی اس تقدیر پر راضی ہونا پڑتا ہے جس کی طرف اس نے یہ فرما کر اشارہ کیا ہے **ولذلک خلقهم** ہم نے اس تماشا گاہ اختلاف کو اختلاف ہی کے لیے پیدا کیا ہے- اسی ہنگامہ اختلاف میں انبیاء علیہم السلام وحدت واتحاد کی دعوت دیتے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ ان کی اس آواز پر اختلاف وتشتت بڑھتا رہا ہے اسی کشاکش میں دنیا کی حیات کا راز مضمر ہے- اگر خیر وشر ایک طرف ہو جائے تو شاید کارخانہ عالم درہم وبرہم ہو جائے-

فرقوں کی یہ کثرت پھر امت محمدیہ کی' عقلاء کے لیے عجب گرداب حیرت بن رہی ہے- ایک مفکر یہ سوچ رہا ہے کہ افتراق و تشتت کی اتنی کثرت میں آخر راز کیا ہے- پھر امت محمدیہ کے ۷۲ فرقوں کو دوزخی کہہ دینا اور صرف ایک فرقہ کو جنتی کہنا اس کے لیے

اور بھی مشکل کا ساماں بنا ہوا ہے ادھر ایک مؤرخ صفحات عالم کی ورق گردانی کر کر کے تھکا جاتا ہے مگر اس کا بیان حدیث کے عدد سے ٹکر نہیں کھاتا - بہت حساب لگاتا ہے مگر کبھی یہ عدد گھٹ جاتا ہے کبھی بڑھ جاتا ہے' ان الجھنوں سے گھبرا کر جب وہ نظر اوپر اٹھاتا ہے تو اس کو ایک راہ یہی آسان نظر آتی ہے کہ وہ اس حدیث ہی سے دستبردار ہو جائے - جس غریب کو یہ پہلا موقع پیش آیا ہو اس کا گھبرا جانا کچھ موجب تعجب بھی نہیں -

احادیث میں مفہوم عدد کی بحث ✲ لیکن ایک محدث جب ان مشکلات پر گذرتا ہے تو دنیا کی حیرت اس کے لیے خود موجب حیرت بن جاتی ہے وہ اعداد و شمار کی بحث کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتا - وہ جانتا ہے کہ اعداد و شمار صرف وقتی استحضار اور متکلم کے ذہنی اعتبار کی ایک بات ہوتی ہے کبھی وہ ابہام و اجمال کا ارادہ کرتا ہے تو عدد میں بھی پوری تفصیل اختیار نہیں کرتا اور کبھی تفصیل پر اترتا ہے تو عدد کی بھی تفصیل کر ڈالتا ہے طبیعت کے انشراح اور وقت و ماحول کی وسعت کے لحاظ سے دونوں صورتیں اختیار کر لینا معقول بات ہے افراد کو انواع اور انواع کو اجناس کے تحت میں داخل کرتے چلے جایئے تو عدد گھٹتا چلا جائے گا اور اس کے برعکس اجناس و انواع کی تحلیل کرتے جایئے تو وہی عدد بڑھتا چلا جائے گا - ان دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں سمجھا جاسکتا -

اعداد و شمار میں مؤرخ کا اختلاف نظر ✲ اسی طرح اگر کوئی مؤرخ فرقہائے عالم کے متعلق کوئی عدد لکھتا ہے تو یہ اس کی طبیعت پر منحصر ہے کہ وہ کس فرقہ کو کتنی تاریخی اہمیت دینا چاہتا ہے - ممکن ہے کہ بعض معمولی فرقے اس کے نزدیک تاریخی لحاظ سے قلم بند کرنے کے قابل ہوں اور بعض بڑے فرقے یہ اہمیت نہ رکھتے ہوں - ہر مؤرخ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقرر کردہ معیار کے لحاظ سے جو عدد چاہے ذکر کرے - یہاں تطبیق و اختلاف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوسکتا جب تک اس مؤرخ کے معیار اور اس کی اہمیت و غیر اہمیت کا اندازہ نہ لگالیا جائے' پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اس کے اس معیار سے اتفاق رائے بھی کر لے - ہر شخص کا ذوق اور اس کا نقطہ نظر علیحدہ ہوسکتا ہے اس لیے اس کو حق حاصل ہے کہ وہ کوئی دوسرا معیار مقرر کر لے ان معمولی مقامات پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے -[1]

---

[1] یہاں ہم آپ کے سامنے اسی نوع کی چند احادیث پیش کرتے ہیں تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ احادیث میں یہ دن رات کی باتیں ہیں - حدیث کی وضع و صحت کا فیصلہ ان پر نہیں ہوسکتا -

اختلاف عدد کی چند مثالیں ✲ (۱) احادیث شعب الایمان میں ایمان کے شعبوں کا عدد کہیں ۷۰ سے اوپر اور کہیں ۶۰ سے اوپر بتلایا گیا ہے - کیا ۶۰ کو پھیلا کر ۷۰ یا ۷۰ کو سمیٹ کر ۶۰ کہنا کوئی بہت ہی بعید از حقیقت بات ہے -

(۲) بعض احادیث میں رؤیا صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں جزء اور کہیں اس کے خلاف بتلایا گیا ہے احادیث میں یہاں سخت اختلاف ہے -

(۳) احادیث تقسیم رؤیا میں کہیں ثلاثی تقسیم مذکور ہے اور کہیں ثنائی -

(۴) خصائص نبوت کے سلسلہ میں کہیں ۵ خصائص مذکور ہیں اور کہیں زیادہ -

(۵) امت کے شہداء کے عدد میں بھی بڑا اختلاف ہے -

(۶) کنتم خیر امۃ کی تفسیر میں صاحب مشکوٰۃ نے جامع ترمذی کی ایک حسن روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے *لله* .....

پس جب تک کہ اس عدد و شمار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطہ نظر معلوم نہ ہو جائے مستقیم الاسناد احادیث کو ضعیف یا موضوع قرار دے دینا بڑی جسارت اور انتہائی دلیری ہوگی۔ حدیث افتراق امت بھی اسی سلسلہ کی ایک حدیث ہے۔ ہوسکتا ہے

لــــه ..... فرمایا کہ تم ۷۰ اُمتوں میں وہ آخری سترویں امت ہو جو خدا کو سب امتوں میں پیاری امت ہے۔ کیا نہیں ہوسکتا کہ اس امت کا سترویں امت ہونا تفاوتِ درجات اور مراتب خیریت کے لحاظ سے ہو۔

(۷) جامع ترمذی میں ہے کہ اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہیں۔ اَسی امت محمدیہ کی اور بقیہ دوسری امتوں کی۔

(۸) صحیح احادیث میں دجالوں کا عدد کہیں تیس اور کہیں ۷۰ تک بھی موجود ہے وغیرہ وغیرہ۔

اختلاف عدد کے مختلف جوابات * (۱) اس قسم کی احادیث میں علماء کے مختلف نظریات ہیں کوئی محض اپنی ذہانت سے نکتہ طرازیاں کر کے ان مختلف عددوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی یہ عذر کرتا ہے کہ ایک وقت آپ کو اس عدد کا علم دیا گیا تھا اس کے بعد اس سے زیادہ کا علم دے دیا گیا۔ محدث مزاج اگر قرائن دیکھ لیتا ہے تو کبھی کبھی اضطراب کی بھی ٹھہرا دیتا ہے۔ محاورات کلام سے ذوق رکھنے والا اس عدد کو صرف تکثیر کے لیے سمجھتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ جواب ان اعداد میں تو درست ہے جہاں محاورۂ عرب میں وہ عدد تکثیر کے لیے مشہور ہو جیسا ۷۰ کا عدد آیت ذیل میں یہی تکثیر کے معنی مراد ہیں۔

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ۔ (التوبة : ۸۰) اگر آپ ان کیلئے ستر بار بھی استغفار کریں تو بھی ہرگز ہم انکی مغفرت نہیں کریں گے۔

اب احادیث بالا پر غور کیجئے کیا اگر شعب الایمان' شمار کے بعد حدیث کے مذکورہ بالا عدد سے کم و بیش ثابت ہوں تو صحیح بخاری کی اس حدیث کو ضعیف یا موضوع کہہ دیا جائے گا' یا اگر دجالوں کا عدد تاریخی لحاظ سے احادیث کے عدد کے موافق ثابت نہ ہو تو اس سارے ذخیرۂ احادیث کو ناقابل اعتبار ٹھیرا دیا جائے گا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جن دجالوں کا حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے ان کے عدد و شمار میں کسی خاص صفت کی رعایت کی گئی ہو۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف ان دجالوں کا عدد بیان فرمایا ہے جن کو قوت و شوکت حاصل ہوگی ورنہ دعویٰ نبوت میں بسا اوقات سودائیت اور جنون کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے مدعیین نبوت بے شمار گذر رہے ہیں ان سے حدیث میں کوئی بحث نہیں۔

صحیح بخاری کتاب الفتن میں ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ مجھے امراء جور کے نام (ظالم بادشاہوں کے نام) بتلائے گئے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو ان کا نام و نسب تک بتلا سکتا ہوں۔

اس حدیث سے گمان ہوسکتا ہے کہ شاید تمام امراء جور کے نام ان کو بتلائے گئے تھے لیکن حضرت حذیفہؓ سے مشکوۃ شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان قائدین فتن کے نام بتلائے ہیں جن کے ساتھ تین سو یا اس سے زیادہ کی جماعت ہوگی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں عدد و شمار بیان کرتے وقت ضرور کوئی معیار رہتا ہے۔ حسن اتفاق سے وہ معیار یہاں ہمارے سامنے آ گیا ہے ورنہ حضرت حذیفہؓ کے متعلق ہم یہی سمجھتے تھے کہ ان کو ہر ہر قائد فتنہ کا نام بتلا دیا گیا تھا۔ احادیث فتن میں اس عام ابہام و انتشار کے علاوہ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی روایات احادیث حلال و حرام کی طرح عام صحابہؓ سے دستیاب نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کا مخاطب ہر ذی فہم اور غیر ذی فہم بنایا نہیں جاسکتا اس لیے اور ابہام و اجمال پیدا ہو جاتا ہے مگر یہ ابہام اس لیے مضر نہیں ہوتا کہ فتنے جب سامنے آتے ہیں تو اہل بصیرت پر اُن کا فتنہ ہونا مخفی نہیں رہتا۔ اس تشخیص و تعیین کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی ہے کہ یہ فتنہ کونسا فتنہ ہے۔ اسی طرح حدیث زیر بحث میں امت کے افتراق کی پیش گوئی کی گئی ہے اس کا مقصد اس افتراق سے آگاہ کرنا اور ان گمراہیوں کے دور میں اس کی تاکید کرنا ہے کہ دامنِ سنت اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اسی لیے صحابہ کرام نے اس حدیث کو سن کر یہ سوال نہیں کیا کہ وہ فرقے کون سے ہیں ان کی علامات کیا ہیں بلکہ یہ پوچھا ہے کہ وہ ایک فرقہ ناجیہ کون سا فرقہ ہے کیونکہ عملی لحاظ سے یہی مفید ہے کہ اس فرقہ کی تعیین ہو جائے جب یہ ایک ہی فرقہ ہے تو اس کے سوا جتنے فرقے ہیں وہ بلا بحث کیے خود بخود باطل فرقے ہوں گے۔ اس لیے صحابہؓ کے نزدیک اس بحث میں پڑنا ہی ایک دماغی تعزیر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

کہ یہاں بھی کسی خاص معیار ضلالت وفتنہ کے اعتبار سے یہ خاص عدد بتلایا گیا ہو۔

پھر امت کے ۷۳ فرقوں کا مسئلہ کوئی عقیدہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ سلسلہ فتن وانقلابات کی ایک پیش گوئی ہے اور اس باب کی عام احادیث کی طرح اس کے بھی بہت سے پہلو مبہم ہیں انہیں اپنے حال پر مبہم رہنے دو اس ابہام کی وجہ سے حدیث کو موضوع یا ضعیف کہنا بے معنی ہے۔

پیشگوئی کی احادیث میں ابہام ناگزیر ہے ٭ فن حدیث پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ دور فتن اور مستقبل کے واقعات کی احادیث میں اکثر ایک نوع کا ابہام ہوتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جزئیات کی جب تعیین کی جاتی ہے تو علی العموم وہ الفاظ کلیات کا جامہ پہن لیتے ہیں اور اس لیے جب انسان اس کو اپنے محل پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہے تو جتنی صفائی سے اس کا دل چسپاں کرنا چاہتا ہے چسپاں نہیں کر سکتا مثلاً تھوڑی دیر کے لیے آپ فرض کر لیجئے کہ زید کی شکل وصورت آپ قید الفاظ میں لانا چاہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا رنگ یہ ہے' نقشہ یہ ہے اور بہت سے بہت اس کا طول وعرض بتا سکتے ہیں۔مگر کیا یہ سب الفاظ اتنی تعیین پیدا کر سکتے ہیں کہ پھر دوسری صورت پر اس کا صادق کرنا ممکن ہی نہ ہو' بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کی یہ قیود خود زید ہی کی صورت کی تشخیص میں اور صعوبت پیدا کر دیں۔جب ایک نادیدہ شخص کی تعیین صرف الفاظ سے پوری نہیں ہو سکتی تو مستقبل کے حوادث کی تعیین باوجود ان کے تنوع اور تشابہ کے کیونکر ہو سکتی ہے۔

شریعت کا ایک اہم نصب العین ٭ اتنی تشریح شریعت کے اصل نصب العین کے بھی خلاف ہے وہ اپنے مخاطب دماغوں کو ایسی تربیت دینا چاہتی ہے کہ جو علوم غیبیہ وہ بیان کرے وہ بلا تردد صرف اس کے اعتماد ووثوق پر قابل یقین ہو جائیں اور اس تسلیم ورضا کی انہیں ایسی عملی مشق حاصل ہو جائے کہ پھر جہاں ان کے سامنے تفصیل کر دی جائے وہاں تفصیل ہی مناسب معلوم ہو اور جہاں اجمال رکھا جائے وہاں اجمال ہی پسندیدہ نظر آنے لگے۔آیئے آثار ذیل میں اس تربیت کے آثار ملاحظہ فرمایئے۔

خرج عمر علی الناس فقال احرج علیکم ان تسئلونا عمالم یکن فان لنا فیما کان شغلا[1]	حضرت عمرؓ باہر تشریف لائے اور فرمایا میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ جو واقعہ اب تک پیش نہیں آیا تم اس کے متعلق مجھ سے فرضی سوالات کرو کیونکہ جو واقعات اب تک پیش آ چکے ہیں ہمیں ان کے غور وخوض میں ہی کافی مصروفیت رہتی ہے۔
و کان زید بن ثابت اذا سئل عن شئی یقول کان ھذا فان قالوا لا قال دعواحتی یکون[2]	حضرت زید بن ثابتؓ سے جب فرضی سوالات کیے جاتے تو آپ دریافت کرتے کیا یہ واقعہ پیش آ چکا ہے۔اگر کہا جاتا نہیں تو فرماتے جب تک پیش نہ آ جائے اسے رہنے دو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے استلام حجر اسود کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے' اس پر سائل نے یہ فرضی سوالات شروع کر دیئے اگر بھیڑ ہو جائے اگر میں نہ کر سکوں

---

[1] و [2] جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۶۵۔

تو جواب یہ دیا ہے-

اجعل ارأیت بالیمن[1] اپنے ان فرضی سوالات کو یمن میں ڈال-

یعنی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اس کی اقتداء کی پوری کوشش کر اور خواہ مخواہ جان چرانے کے لیے فرضی سوالات مت کر- انسان بسا اوقات اس لیے سوالات کرتا ہے کہ وہ اس ذریعہ سے مخاطب پر جواب کا دروازہ تنگ کر کے اس کی زبان سے اپنے لیے جواز کی رخصت حاصل کر لے-

مسروق فرماتے ہیں کہ میں نے ابی بن کعب سے کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے پوچھا کیا یہ واقعہ پیش آ چکا ہے میں نے عرض کیا، نہیں، تو فرمایا-

اجمنا یعنی ارحنا حتی یکون فاذا کان اجتھدنا لک رأینا[2] ابھی تو ہمیں آرام سے رہنے دو جب پیش آ جائے گا تو ہم تمہاری خاطر اس میں غور کر لیں گے اور یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی حل بھی اس وقت ہماری سمجھ میں آ جائے گا-

صرف دماغی تفریعات عملی جدوجہد میں مخل ہوتی ہے ٭ ان کے علاوہ حضرت عمار، حضرت معاذ بن جبل اور دیگر تابعین و علماء سے بھی بکثرت ایسے آثار مروی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ محض دماغی تفریعات میں پڑے رہنا انسان کی عملی جدوجہد کے لیے مضرت رساں ہے- آج بھی جس قدر بے عمل افراد یا جماعتیں نظر آئیں گی، ان پر غور کرو گے تو ان کا مشغلہ یہی دماغی عیاشی نظر آئے گا اور بس- صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے دور میں اس نظریہ کے متعلق کیا کیا فرق ہوتا گیا اس پر بحث کا یہ موقعہ نہیں ہے-

اخبار غائبہ میں مذاقِ سلف ٭ ان آثار سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ پیش گوئیوں کے سلسلہ میں مذاقِ سلف کیا ہونا چاہیے، کیا انہوں نے کھلے طور پر ایک ایک بات کی ہندی کی چندی کرنے کی جرأت کی ہوگی- اگر جواب نفی میں ہے تو پھر خود ہی انصاف کیجئے کہ اگر کچھ وجوہات کی بنا پر ان احادیث کے بعض پہلو اسی زمانہ میں مبہم رہ گئے تو بعد میں اب کون ہے جو ان کو صاف کرسکتا ہے اور اگر نہیں کرسکتا ہے تو کیا اس لیے ان احادیث کی صحت پر کوئی اثر پڑنا چاہیے-

فرقہائے مختلفہ کی تعیین

جہاں تک ہمارا علم ہے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان فرقوں کی نام لے کر کسی حدیث میں تعیین نہیں کی گئی، ہاں کچھ ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے ان فرقوں کی تعیین میں مدد لی جاسکتی ہے، نام لے لے کر مدح و ذم کرنا ہماری شریعت کا دستور بھی نہیں ہے- فارس اور اہل مدینہ کے فضائل میں متعدد احادیث ملتی ہیں مگر کوئی حدیث ایسی ثابت نہیں ہوئی جس میں نام لے کر ان کا مصداق بتایا گیا ہو- علماء نے صرف اپنی جانب سے قیاس آرائیاں کی ہیں- پس جب مقام مدح پر نام

[1] و [2] جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ٦٥-

5

لینا احادیث کی سنت نہیں تو مذمت کے ذیل میں کسی کا نام لینا کب اس کے بلند اخلاق کا اقتضاء ہوسکتا ہے- بلکہ شریعت محمدیہ کا یہ ایک عام قانون ہے کہ اگر سہو ونسیاں کی بنا پر کسی شخص سے کوئی معصیت سرزد ہو جائے تو تا امکان اس کی پردہ پوشی ہی کرنی چاہیے' حدود کے باب میں شہادت کے اندر جس قدر شدت اختیار کی گئی ہے وہ بھی صرف ستر اور پردہ پوشی کی حکمت پر مبنی ہے[1] یعنی شریعت یہ نہیں چاہتی کہ پورے ثبوت کے بغیر فواحش اور حیا سوز جرائم کی اشاعت یا کسی مسلمان کی پردہ دری کی جائے-

مغیرہ بن شعبہ پر تہمت کی تشفی بخش تحقیق ❊ مغیرہ بن شعبہ کے متعلق تہمت زنا پر حضرت عمرؓ کی دعا کا جو واقعہ مشہور ہے اس کا منشاء بھی یہی تھا- نکتہ چینوں نے اسے دوسرا رنگ دیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عیوب کی فہرست میں شمار کیا ہے مگر دور بینوں نے اسی کو بڑی حکمت پر مبنی سمجھا ہے' یہ فہم اور درد اُسی کو میسر آ سکتا ہے جس کو مقاصد شریعت کا پورا ادراک ہو اور وہی اس کی رعایت کرسکتا ہے کہ اگر اسلام کے دور اول میں کسی مقتدر شخصیت کے متعلق کوئی غلط الزام حد ثبوت کو پہنچ جائے تو آئندہ نسلوں کے لیے وہ کتنا مضرت رساں ہوسکتا ہے-

واقعہ کی حقیقت یہاں کل اتنی تھی کہ انہوں نے خفیہ طور پر نکاح کرلیا تھا وہی برے عنوان سے مشہور ہوگیا چونکہ اس وقت اس قسم کے نکاح کی حضرت عمرؓ نے ممانعت فرمادی تھی[2] اس لیے انہیں یہ عذر کرنے کا موقعہ بھی نہ مل سکا کہ میں نے خفیہ نکاح کرلیا ہے چنانچہ جب عدم ثبوت کی وجہ سے مقدمہ خارج ہوگیا اور ان سے حقیقت حال دریافت کی گئی تو انہوں نے صاف طور پر اپنے نکاح کا حال بیان کردیا۔[3]

---

[1] انما امر الله بالعدد في شهود الزناء لانه مامور فيه بالستر و لهذا غلظ فيه النصاب. (اعلام الموقعين ج ۱ ص ۸۱)

اللہ تعالیٰ نے زنا کے گواہوں میں عدد اس لیے شرط قرار دیا ہے کہ ان معاملات میں (جب تک ثبوت نہ ہو) اصل ستر ہے اسی لیے نصاب شہادت میں نسبتہً زیادہ سختی اختیار کی گئی ہے-

[2] حضرت عمرؓ نے یہ ممانعت اس لیے فرمائی تھی کہ عام طور پر نکاح سر دو وجہ سے کیا جاتا ہے تو اس میں شرعی مصالح کی پوری رعایت نہیں کی جاتی اس لیے اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر کھلے طور پر یہ نکاح کرلیا گیا تو شاید کسی کو اس پر اعتراض ہوگا' یا اس دعویٰ کو فواحش کے لیے آڑ بنایا جاتا ہے- حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان دونوں باتوں کا سد باب منظور تھا- امام ابوحنیفہؒ نے بھی اسی قسم کے مصالح کے پیش نظر انعقادِ نکاح کے لیے نصاب شہادت شرط قرار دیا ہے- حالانکہ کسی اور عقد میں انعقاد کے لیے نصابِ شہادت شرط نہیں ہے-

[3] روى ابن النحوي في البدر المنير ان المغيرة ادعى في تلك المرءة التي رموه بها انها له زوجة قال و كان يرى نكاح السروري انه كان يتبسم عند شهادتهم فقيل له في ذلك فقال اني اعجب مما اريد ان افعله بعد شهادتهم فقيل و ما تفعله قال اقيم البينة على انها زوجتي ذكره في البدر المنير. (الروض الباسم ج ۱ ص ۱۴۷)

ابن النحوی بدر منیر میں روایت کرتے ہیں کہ جس عورت کے معاملہ میں حضرت مغیرہ کو تہمت لگائی گئی تھی ان کے نزدیک وہ ان کی بیوی تھی کیونکہ خفیہ طور پر نکاح کرلینا ان کے نزدیک جائز تھا- بیان کیا جاتا ہے کہ جب گواہ ان کے خلاف گواہی دے رہے تھے تو یہ کھڑے مسکرا رہے تھے جب ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے کہ ان کی گواہی کے بعد جو میں کہنا چاہتا ہوں اسی کی وجہ سے مجھے ہنسی آ رہی ہے- دریافت کیا گیا آپ کیا کہیں گے فرمایا میں اس کا ثبوت پیش کروں گا کہ یہ میری بیوی ہے- اس واقعہ کو بدر منیر میں ذکر کیا ہے-

علماء جرح وتعدیل نے تمام تر احتیاط کے باوجود اپنی ان نکتہ چینیوں پر جو تنقید حدیث کے سلسلہ میں انہوں نے راویوں کے متعلق کی ہیں بہت تاسف کا اظہار کیا ہے اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ شانِ ستاری ہرگز اس کے درپے نہیں ہے کہ وہ امت کے مجرمین کی برسر بازار رسوائی کا کوئی آئینی دستور تیار کرے۔[1]

یہ بنی اسرائیل جیسے باغیوں ہی کے لیے موزوں تھا کہ جب شب میں وہ کوئی گناہ کرتے تو اس کی صبح کو اپنے دروازوں پر لکھا ہوا دیکھ لیتے' یا مالِ حرام سے صدقہ دیتے تو آسمان سے آگ اترتی اور اس کو جلائے بغیر واپس ہو جاتی اور یہ ان کی رسوائی کا عام اعلان ہوتا۔ امت محمدیہؐ کے لیے اب یہ سب آئین پردہ دری منسوخ ہو چکی ہیں۔

امت محمدیہ کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت ⁕ علماء نے اس امت کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت یہی تحریر کی ہے کہ اب خدائے تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس امت کی داستان عمل بھی پہلی امتوں کی طرح کسی اور امت کے سامنے پڑھی جائے۔

جماعت منافقین کی ریشہ دوانیوں سے کتب سیرت وتاریخ بھری پڑی ہیں اس کے باوجود ان کے ساتھ شریعت کا سلوک یہی تھا کہ ان میں سے جس نے نمائشی طور پر بھی اسلام کا نقاب ڈال لیا اس کو رسوا نہیں کیا گیا یعنی جو مؤمن کا بھیس بنا کر آ گیا اسے آنے دیا گیا اور جس نے زبانی اسلام کی شہادت دے دی اس کی شہادت قبول کر لی گئی۔

ماسوا اس کے افتراق وتشتت' تعصب ونخوت کے دور میں جماعتوں کو نام لے لے کر گمراہ اور دوزخی ٹھیرانا بھڑکتے ہوئے فتنوں کو اور بھڑکانا ہے۔

امام غزالیؒ کی ایک مفید نصیحت ⁕ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عہد ماضی میں عوام کی گمراہی کا باعث بعض مرتبہ خود اہل حق کا تعصب بن گیا ہے' انہوں نے حق کی حمایت میں ناحق جماعت کو بنظر حقارت ونفرت دیکھا جاہلوں نے صرف ان کی ضد میں اپنے جہل وعناد میں اور تشدد اختیار کر لیا۔ شدہ شدہ یہ وقتی ضد دائمی عقائد بن گئے حتی کہ کلام اللہ کے حدوث وقدم کے مباحث میں یہاں تک مبالغہ آمیزیاں ہوئیں کہ جو آواز انسان کے حلقوم سے نکلتی ہے اس کو بھی قدیم کہہ دیا گیا۔ کاش اگر یہ مقابلے اور مناظرے نہ ہوتے تو یہ بے معنی کلمات جو بعد میں عقائد بن گئے شاید کسی مجنوں کی زبان سے بھی نہ نکلتے۔

اس عام سنت کے سوا اگر کہیں کسی جماعت یا فرد کا نام لیا گیا ہے تو کسی خاص ہی مصلحت کے لیے جس پر علماء نے اپنی جگہ کافی بحث کر دی ہے اس لیے ان فرقوں کی تعیین پر بحث کرنا قطعاً غیر ضروری ہے تاہم جب اذہان اس طرف متوجہ ہو گئے اور بحث شروع کر دی گئی تو مجبوراً ہمیں بھی کچھ لکھ دینا مناسب ہے۔

---

[1] ابن ابی حاتم کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک دن ان کے سامنے کتاب الجرح والتعدیل پڑھی جا رہی تھی۔ محمد بن مہرویہ رازی نے کہیں ان سے یحییٰ بن معین کا یہ مقولہ نقل کیا ''ہم ان لوگوں پر بھی طعن کر گذرتے ہیں جو ہم سے دو دو سال پیشتر اپنے خیمے جنت میں لگا چکے ہیں''۔
یہ سن کر ابن ابی حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے اور جسم پر ایسا رعشہ طاری ہوا کہ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس حکایت کو پھر دوبارہ انہوں نے سنا اور پھر خوب روئے۔

اس موضوع پر علماء کلام اور علماء اصول دونوں نے اپنی اپنی جگہ گفتگو کی ہے- ہمارے نزدیک علامہ طرطوشی کا کلام سب میں منتخب ہے اور اسی کو علامہ شاطبی نے بھی اختیار فرمایا ہے اس لیے ہم اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں-

یہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ حدیث میں زیر بحث صرف وہ اختلافات ہیں جو تفریق فی الدین کی حد میں آ سکتے ہیں- یہ وہ افتراق ہے جو صراطِ مستقیم سے وابستہ رہ کر انحراف کے نتائج میں پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام قرآنی لفظ میں ''السبل'' رکھا گیا ہے اس کا حاصل اصل دین سے منسوب رہ کر اس کے بعض اصول وکلیات کے ساتھ اختلاف کرنا ہے اس لیے یہاں اختلاف وافتراق سے امت اجابت ہی کا اختلاف وافتراق مراد ہوگا- امت دعوت کا اختلاف جس میں کفار بھی داخل ہو جائیں مراد نہیں ہوسکتا- یہ دوسری بات ہے کہ اگر یہ انحراف اپنی حد سے تجاوز کر جائے تو اس کی انتہاء کفر پر بھی ہوسکتی ہے-

حدیث نے لفظ ''امتی'' سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس اختلاف کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ لفظ امت کے تحت میں رہ کر ہی ہونا چاہیے- یہاں امت سے امت دعوت مراد لے لینا بہت بعید ہے کیونکہ اس امت کے اختلاف کو بنی اسرائیل کے اختلاف کے ساتھ تشبیہ دی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا اختلاف یہودیت ونصرانیت کے وسیع مفہوم میں داخل رہ کر ہی تھا اسی طرح اس امت کا اختلاف بھی امت اجابت میں رہ کر ہونا چاہیے- کفر اپنے تمام انواع واقسام کے ساتھ شریعت کی نظر میں ایک ہی ملت قرار دیا گیا ہے- اس کے تشتت وافتراق کی بحث شریعت میں غیر مفید بحث ہے- اگر تاریخی اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو بھی یہی نظر آتا ہے کہ اسلام میں جو مختلف فرقہ بندیاں ہوئیں ہمیشہ وہ اسلام ہی کے نام پر ہوئیں- خوارج کی جنگ کی تمام بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ اپنا قدم اسلام اور صراطِ مستقیم پر سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ کو دائرۂ اسلام سے باہر قرار دیتے تھے' معتزلہ ومرجیہ اور دیگر فرق باطلہ سب اپنی اپنی جگہ یہی دعویٰ رکھتے تھے کہ سیدھی راہ ان ہی کی راہ ہے دوسری جماعتیں منحرف اور حق سے ہٹی ہوئی جماعتیں ہیں ان وجوہ کی بنا پر ظن غالب یہ ہے کہ ان فرقوں کا ظہور صرف اسلام کے اندر مقدر ہے کفر کی جماعتیں اس میں شامل نہیں ہیں-

فرقہ باطلہ کی پہلی علامت بغض ونفاق ہے ٭ ان فرقہائے باطلہ کی تعیین کا راستہ اب یہی ہوسکتا ہے کہ ان کی علامات پر اصولی طور پر بحث کی جائے- کتاب وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انحراف' زیغ اور افتراق کی بڑی علامت خود آپس کا اختلاف ہے- پس اگر کوئی مسئلہ اسلام میں زیر بحث آتا ہے اور اس کی وجہ سے افتراق وتشتت نہیں پھیلتا' بغض وعداوت کی ہوا نہیں چلتی' امت کا شیرازہ منتشر نہیں ہوتا- آپس کی محبت ومودت ختم نہیں ہوتی تو اس کو اختلافِ مذموم نہیں کہا جا سکتا- لیکن اگر اس کا نتیجہ تحزب وتعصب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو اسے انحراف کا اثر سمجھنا چاہیے- آیت ﴿و لا یزالون مختلفین﴾ کی تفسیر کے ذیل میں مجاہد فرماتے ہیں کہ مختلفین اہل باطل ہیں اور مرحومین کے متعلق لکھتے ہیں-

اھل الحق لیس فیھم اختلاف — اہل حق میں اختلاف نہیں ہوتا-

مطرف بن شخیر کہتے ہیں کہ اگر کہیں اہل اہواء میں بھی محبت واتحاد ہوا کرتا تو یہ دھوکا لگتا کہ شاید یہی لوگ اہل حق ہوں لیکن جب اس نعمت سے وہ محروم ہیں تو اب ہر ذی عقل یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ اہل حق نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی شان اختلاف و

افتراق نہیں۔

حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ مختلفین اھل اھوا اور الامن رحم ربک اہل سنت والجماعت ہیں۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اہل رحمت اختلاف نہیں کرتے۔[1]

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ اس وقت تک اہل حق کے قلوب میں فروعی اختلافات رکھنے کے باوجود کوئی بغض وعناد نہ تھا گو آج یہ سمجھنا اور سمجھانا دونوں مشکل ہیں کہ فروعی اختلاف کے باوجود محبت کیسے قائم رہ سکتی ہے اگر غور کرو گے تو موجودہ افتراق کی بناء فروعی اختلافات نہیں ہیں بلکہ قلبی سردمہری ہے۔ہاں بہانہ بنانے کو یہ بوجھ مذہب کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے تاہم اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اگر رفع یدین اور آمین کے جھگڑے تحزب وتعصب اختلاف وافتراق کی صورت پیدا کر لیں تو ہرگز اس اختلاف کو بھی اہل حق کا اختلاف نہیں کہا جاسکتا۔

حافظ ابن قیمؒ قیاس کی مذمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ قیاسات ہی کی بدولت امت کے کلمہ میں تفریق پھیلی اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ قیاسات خدا کی مرضی کے برخلاف ہیں۔قرآن کریم میں ہے۔

وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا. (النساء : ٨٢) — اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف نظر آتا۔

حضرت ابن عباسؓ ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ (آل عمران : ١٠٦) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تبیض وجوہ کا مصداق اہل سنت اور اہل ائتلاف ہیں اور تسود وجوہ کا مصداق اہل فرقت واختلاف ہیں۔

اختلاف نہ کرنے کا حکم ✱ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپس میں اختلاف برپا نہ کرو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پڑ جائے گا۔اسی لیے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کے مفہوم میں صحابہؓ کا اختلاف دیکھتے تو آپ کو سخت ناگوار ہوتا اور آپ کو اتنا غصہ آتا کہ آپ کا روئے انور انار کے دانہ کی طرح سرخ ہوجاتا اور فرماتے ''کیا اس بات کا تم کو حکم دیا گیا تھا''۔بعثت رسول کا اصل مقصد ہی رفع اختلاف ہے اس لیے جو اختلاف کرتا ہے درحقیقت وہ اس اہم مقصد پر ہی ضرب لگاتا ہے۔حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا ''اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہارے بعد والے اور زیادہ اختلاف کریں گے''۔

ایک دن حضرت عمرؓ کو خبر پہنچی کہ ابی بن کعبؓ اور ابن مسعودؓ اس مسئلہ میں اختلاف کر رہے ہیں کہ نماز ایک کپڑے میں ادا کرنا سنت ہے یا دو کپڑوں میں؟ تو انہوں نے ممبر پر خطبہ دیا اور فرمایا ''جب تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو کر ایسے ایسے مسائل میں اختلاف کرو گے تو پھر تمہارے بعد مسلمان کس کے قول کو اختیار کریں گے۔اگر آج کے بعد میں نے سنا کہ دو شخصوں میں اختلاف ہو رہا ہے تو جو مجھے کرنا ہے کر گزروں گا۔''

حضرت علیؓ نے اپنے قاضیوں کو لکھ بھیجا ''جیسے تم پہلے فیصلہ کیا کرتے تھے اب بھی اسی کے موافق کرتے رہو مجھے اختلاف

---

[1] کتاب الاعتصام ج ١ ص ٣٩ و ٤٠۔

پسند نہیں' میری تمنا ہے کہ جس طرح میرے پیش رو دنیا سے گذر گئے اسی طرح کسی اختلاف کے بغیر میں بھی گذر جاؤں''۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ''پہلی امتیں اسی عادت کی بدولت ہلاک ہوئیں کہ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے سامنے اختلاف کیا کرتی تھیں۔'' اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ ''اپنی کتاب کے بعض حصہ کو بعض کے ساتھ متعارض سمجھ کر ٹکرایا کرتی تھیں۔ قرآن اس لیے نہیں آیا کہ تم اس میں اختلاف پیدا کر کر کے ایک آیت کو دوسری آیت سے ٹکراؤ بلکہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہوا اترا ہے۔[1]

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اسی عداوت وبغض کی رو میں بہے چلے جا رہے تھے خدائے تعالیٰ کا ان پر یہ بڑا انعام ہوا کہ اس نے ان کی بہتی کشتی اختلافات کی دھار سے نکال کر محبت ومودت کے کنارے لگا دی۔

وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا. (آل عمران : ۱۰۳)

اور اللہ کی نعمتیں یاد کرو جو تم پر کیں اور ذرا اس زمانہ کو بھی یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اب جو صبح ہوتی ہے تو تم اس کی مہربانی سے ایک دوسرے کے بھائی بنے ہوئے تھے۔

پس قلوب میں انس ومحبت' الفت واخوت یہ خدا کی بڑی نعمت ہے اس لیے یہ حصہ اسی کا ہوسکتا ہے۔ جو الا من رحم ربک کی فہرست میں داخل ہو چکا ہے اس کے بالمقابل اختلاف وافتراق اس نعمت سے محروم ہونے کی نشانی ہے۔

امام بخاریؒ نے کتاب الاعتصام میں ایک باب قائم کر کے لاتزال طائفہ .الخ کی حدیث نقل کی یعنی میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی۔ اس کے بعد دوسرا باب قائم کیا اور یہ آیت تحریر فرمائی ﴿او يلبسكم شيعا﴾ خدائے تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہاری پارٹیاں بنا دے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان دونوں بابوں کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے اس امت میں آئندہ اختلاف ہوگا حتی کہ حق پر قائم رہنے والا صرف ایک طائفہ رہ جائے گا اس لیے آئندہ باب میں اس اختلاف کی وجہ بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انواعِ عذاب میں اختیار دیا گیا تو آپ نے عذاب کی تمام قسموں میں سے عذابِ افتراق کو پسند فرمالیا تھا کہ اس میں پہلی امتوں کی طرح آپ کی امت کا استیصال تو نہ تھا۔ پس معلوم ہوا کہ اختلاف وتشتت یہ ایک عذاب ہے اور اہل باطل کی نشانی ہے۔[2]

---

[1] دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۲۵ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۳ و ۸۴۔ حضرت عمرؓ کے اس خطبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی سیاسی نظر کیسی دور بین تھی وہ اجتہاد کو نہیں روکتے اختلاف کو روکتے ہیں' مناظرے کو روکتے ہیں اور ایسی بحث کو روکتے ہیں جو سردست گو اختلاف نہ کہلائے مگر آئندہ کہیں امت کے لیے اختلاف کا تخم نہ ڈال دے۔ اسی طرح قرآن میں بحث وتمحیص کی ممانعت نہیں۔ ممانعت اس بحث کی ہے جس کا حاصل قرآن کی آیات میں اختلاف وتعارض ثابت کرنا ہو' کوشش یہ کرنا چاہیے کہ جہاں اختلاف ہو اس کو تا امکان رفع کیا جائے۔ جہاں تعارض نظر آئے اسے دور کیا جائے نہ یہ کہ جہاں اختلاف کا کوئی شائبہ نہ ہو وہاں دماغ سوزی کر کے اختلاف پیدا کیا جائے۔ اہل حق اور اہل اختلاف کے مزاج کا اگر اندازہ کرو گے تو دونوں کی بحثوں میں مابہ الامتیاز یہی ہوگا' ان کا مقصد بحث کر کے اختلاف مٹانا ہے ان کا مدعا بحث کر کے اختلاف پیدا کرنا ہے۔ واللہ المستعان.

[2] اگر آپ اختلاف کے صحیح معنی سمجھ گئے ہیں تو یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تو برعکس اہل حق میں اختلاف اور اہل باطل میں اتفاق نظر آتا ہے۔

دوسری علامت اتباع متشابہات ہے ❊ مسئلہ کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے پہلے محکم و متشابہ کی حقیقت ذہن نشین کرنا ضروری ہے قرآن کریم کہتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ اٰیَاتٌ مُحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَ اُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ. (آل عمران : ۷)

خدا ہی نے آپ پر کتاب اتاری ہے اس میں آیات محکمات ہیں جو کتاب کا بڑا حصہ ہے اور دوسری آیات متشابہات ہیں-

عربی میں لفظ اُمّ کے معنی اصل اور بڑے کے آتے ہیں- مکہ مکرمہ کو ام القریٰ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ زمین کا مرکزی نقطہ اور اس کی اصل یہی ہے' یہیں سے زمین اطراف و جوانب میں پھیلائی گئی ہے- سورۂ فاتحہ کو بھی ام الکتاب اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اصول کتاب پر حاوی ہے- ام الطریق بڑے راستہ کو کہا جاتا ہے وہ بھی چھوٹے راستوں کے پھٹنے کی اصل ہوتا ہے- دراصل اُمّ میں اصل ہونے کے ساتھ اس کے مرجع اور مرکز ہونے کا مفہوم بھی ملحوظ ہوتا ہے- ماں کو عربی میں اسی لیے ام کہتے ہیں کہ وہ اولاد کی اصل اور ان کا مرجع ہوتی ہے یعنی وہ اسی کے ارد گرد رہتے ہیں' ضرورت کے وقت اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں- جنگ کے بڑے جھنڈے کو بھی ام اسی لیے کہا جاتا ہے کہ لشکر کروفر کے وقت اسی جگہ لوٹ کر آتا ہے-[1]

اس لحاظ سے محکمات کے ام الکتاب ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ قرآن کا بڑا حصہ اور اصل ہیں یہ اپنی جگہ قائم رہیں گے اور قرآن کا دوسرا حصہ جو نہ اس کی اصل ہے اور نہ اتنا بڑا ہے وہ انہیں محکمات کے ارد گرد گھومتا رہے گا جب ان میں کوئی الجھاؤ پیش آئے گا تو ان ہی محکمات کی طرف لوٹ کر حل کر لیا جائے گا اور ام کی طرح ان کو مستقل حیثیت حاصل نہ ہوگی- جب آپ محکم و متشابہ کا فرق سمجھ چکے تو اب سنئے کہ محکمات و متشابہات کی اس تقسیم ہی نے یہاں خدا کی قہر و مہر کا سامان مہیا کر دیا ہے- مومن' راسخ فی العلم کے لیے راستہ یہ ہے کہ وہ محکمات پر عمل کرتا رہے اور متشابہات پر ایمان لاتا رہے- اس کے برعکس کج فطرت یہ وتیرہ اختیار کر لیتا ہے کہ قرآن کا جو کھلا ہوا حصہ ہے اسے تو متشابہات کی طرح عملاً چھوڑ دیتا ہے اور جو متشابہات ہے اس کو محکمات کی طرح زیر بحث لے آتا ہے متشابہات خود تو اپنی مراد میں واضح نہیں ہوتے اور یہ شخص ام کتاب کی طرف رجوع نہیں کرتا اس لیے جس قدر اس کی مراد حاصل کرنے میں دوڑتا جاتا ہے اسی قدر منزل مقصود سے بعید تر ہوتا چلا جاتا ہے- یہ چاہتا ہے کہ کہیں پہنچ کر اس کی پیاس بجھے مگر اس کی تشنگی اور بڑھتی رہتی ہے اور اسی جد و جہد میں اس کی عمر تمام ہو جاتی ہے نہ اسے ساحل مراد ہی ہاتھ آتا ہے نہ اس بد نصیب کا سفر ہی تمام ہوتا ہے-

خدائے قدوس نے حل و حرمت اور عمل کے جتنے آئین بنائے ہیں اس میں کوئی ابہام نہیں رکھا اور جہاں ابہام رکھا ہے اس پر عمل کی دعوت نہیں دی بلکہ صرف ایمان لانے کا امر کیا ہے- اب اگر کوئی بد نصیب صحیح راہ نہیں چلتا اور خود بھٹکتا پھرتا ہے تو یہ قصور

---

[1] اس لحاظ سے سورۂ فاتحہ کو ام الکتاب کہنے کی ایک لطیف حکمت یہ بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں اپنی جگہ رہتی ہے- بقیہ قرآن اس سے آ آ کر لگتا رہتا ہے- اب یہ بات بھی حل ہوگئی کہ ہر رکعت میں خاص سورۂ فاتحہ ہی کیوں واجب کی گئی ہے- بقیہ سورتوں میں کوئی اور سورت واجب کیوں نہیں کی گئی' اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن میں جو سورت ام کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی سورۂ فاتحہ ہے اس لیے اسی کا حق ہے کہ یہ سورت بہ حیثیت ام اپنی جگہ رہے اور بقیہ قرآن اس سے آ آ کر لگتا رہے- (از افادات حضرت استاذ قدس سرہ)

اس کا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۔ کا راز اسی میں مضمر ہے- اسی جگہ مخلص وغیر مخلص' سعید وشقی کا فرق واضح ہوتا ہے- شانِ تفویض وتسلیم اور تمرد وسرکشی کا یہی نقطہ امتحان ہے- فرقہائے باطلہ کے پھوٹنے کا یہی سرچشمہ ہے اس لیے اس پر دوبارہ پھر تفصیلی نظر ڈالئے-

محکم ومتشابہ کی تحقیق ✻ محکم کے دو معنی ہیں ایک عام اور ایک خاص- خاص اصطلاح[1] میں محکم منسوخ کے بالمقابل مستعمل ہوتا ہے- اس بنا پر قرآن کی جو آیات منسوخ نہیں وہ سب محکمات کہلائیں گی اور جو منسوخ ہیں ان کو متشابہات کہا جائے گا- محکم کے عام معنی یہ ہیں کہ جو آیات اپنی مراد میں واضح اور کھلی ہوئی ہیں وہ محکمات ہیں- اس اصطلاح کے موافق متشابہات وہ آیات ہوں گی جو اپنی مراد میں واضح نہ ہوں خواہ بحث وتمحیص کے بعد حل ہوسکیں یا نہ ہوسکیں اس بنا پر متشابہات کی دو قسمیں ہو جائیں گی (۱) حقیقی (۲) اضافی- متشابہ حقیقی وہ ہوگا جس کی مراد نہ خود شریعت نے بتلائی ہو نہ اس کے حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہو- یعنی تحقیقات کے تمام دروازے بند نظر آئیں اور جو دروازہ کھلا ہوا ہو وہ صرف ایک ایمان کا دروازہ ہو' قرآن کریم میں ایسے متشابہ کا وجود بہت ہی نادر ہے اور اس کا مقصد بھی بجز ایمان لانے کے اور کچھ نہیں ہے- آیت بالا میں متشابہات سے یہی معنی مراد ہیں-

متشابہ اضافی قرآن کریم کا وہ حصہ ہے جس کی تفصیل خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان کر دی ہے- مثلاً کسی عام کی تخصیص یا کسی مطلق کی تقیید لیکن بے علمی یا کج فطرتی یا اتباع ہویٰ اس تحقیق کی فرصت نہیں دیتی کہ کلام کے سیاق وسباق کو دیکھا جائے- عام وخاص' مطلق ومقید کے ارتباط کا لحاظ کیا جائے بلکہ صرف یک طرفہ نظر کر کے قرآن کے خلاف ایک معنی پیدا کر لیتی ہے- مثلاً ایک مرتبہ ایک شخص نے جابر جعفی سے دریافت کیا کہ ذیل کی آیت کا کیا مطلب ہے-

﴿فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ﴾ (یوسف : ۸۰)

اس نے جواب دیا اس آیت کا مصداق ہنوز ظاہر نہیں ہوا- سفیان نے فرمایا جھوٹ بولتا ہے- حمیدی کہتے ہیں ہم نے سفیان سے دریافت کیا- اس شخص کا مطلب کیا تھا فرمایا روافض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ بادلوں میں چھپے بیٹھے ہیں' جب کبھی ان کو حکم ہوگا تو اپنی اولاد کے ساتھ آسمانوں میں ظاہر ہوں گے' یہ رافضی اس پر اس آیت کو چسپاں کرنا چاہتا ہے-

اب غور کیجئے کہ آیت کا تمام سیاق وسباق صاف صاف حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے میں ہے- یہاں اس مہمل سرتاپا کذب عقیدہ کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا- مگر اس شخص نے جب آیت کو اپنے مذہب پر ڈھالنا چاہا تو اس کو اول وآخر سے علیحدہ کر کے صرف درمیان کا حصہ پڑھا- اسی طرح خوارج صرف اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ رٹا کیے اور یہ نہ دیکھا کہ خود قرآن ہی میں دوسری جگہ انسانوں کی تحکیم موجود ہے- جبریہ کا حال بھی یہی ہے وہ بھی صرف-

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ. (الصافات:۹۶) اللہ نے تمہیں اور تمہارے عمل کو پیدا کیا-

---

[1] یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں- (تفسیر المنار ج۳ ص۱۶۴)

کو لیے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے عمل بھی اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں تو اب ہمارا اختیار کیا رہا۔ لیکن اسی قرآن میں ﴿جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ﴾ (توبہ : ۹۵) (یہ بدلہ ہے ان کاموں کا جو انہوں نے خود کیے ہیں) بھی موجود ہے۔ جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے افعال اس کے کسب و اختیار سے صادر ہوتے ہیں۔

غرض باطل فرقوں کا یہی دستور ہے کہ پہلے وہ ایک خیال پکا لیتے ہیں پھر اس پر قرآن سے استدلال قائم کرنے کے لیے کسی آیت کی آڑ تلاش کر لیتے ہیں اور ہوئی پرہدیٰ کا رنگ چڑھا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ اسی قرآن میں دوسری جگہ اس کی تشریح ان کے مدعا کے خلاف موجود ہوتی ہے پس متشابہ اضافی بعض کے لحاظ سے تو متشابہ ہوتا ہے اور بعض کے لیے محکم ہوتا ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ جب خود شریعت نے مبہم کو مفصل، عام کو خاص، مطلق کو مقید کر دیا ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی تشابہ نہیں رہتا اور اس لیے علماء کو اس پر بحث کا حق حاصل ہوتا ہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنی توضیح میں ایک قاصر الفہم کے لیے دوسری آیت کی طرف رجوع کرنے کا محتاج ہوتا ہے، جس کی اہلیت اس شخص میں موجود نہیں ہوتی تو اس کے لیے یہی کہا جائے گا کہ جس طرح متشابہاتِ حقیقیہ کی تحقیق علماء کے لئے ممنوع تھی اسی طرح ان آیاتِ محکمات پر بحث کرنا اس کے لئے ممنوع ہے۔ اب متشابہ حقیقی اور متشابہ اضافی میں فرق یہ رہے گا کہ متشابہ حقیقی پر بحث و تمحیص کرنا مطلقاً زیغ کی علامت تھی۔ متشابہ اضافی پر بحث کرنا صرف نااہل اور بے علموں کے لیے زیغ کی علامت ہوگی۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ تشابہ کبھی فی نفسہٖ ہوتا ہے کبھی اپنے قصورِ علمی کی وجہ سے نظر آنے لگتا ہے، حکم دونوں جگہ ایک ہے۔ متشابہ حقیقی سب کے لیے متشابہ ہے اس لیے کسی کو بحث کرنے کی اجازت نہیں اور متشابہ اضافی جس کے حق میں متشابہ ہے خاص اس کے لیے اس پر بحث کی اجازت نہیں لیکن جب اہل زیغ اپنی بے علمی کا ادراک نہیں کرتے یا ادراک کے باوجود محض جسارت اور اتباعِ ہویٰ کی وجہ سے اس وادی میں قدم رکھ دیتے ہیں تو پھر اسی جگہ سے وہ شاخیں پھوٹنے لگتی ہیں جن کو قرآن کریم میں ''السبل'' کہا گیا ہے اور اختلافِ مذموم کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔[2]

تیسری علامت ✻ اتباع ہویٰ ہے۔ گذشتہ مباحث میں اس پر آیات و احادیث کی روشنی میں کافی بحث گذر چکی ہے۔ ان ہرسہ علامات میں فرق یہ ہے کہ پہلی علامت یعنی اختلاف و تشتت کی شناخت ہر شخص کرسکتا ہے دوسری علامت کی شناخت صرف علماء

---

[1] دیکھو الموافقات ج ۳ ص ۸۶-۹۳۔

[2] تفسیر المنار میں محکم و متشابہ کی بحث بہت مکمل موجود ہے۔ فاضل مصنف نے صرف اس مسئلہ پر ۳۳ صفحہ پر بحث کی ہے اگر اس کے دوسرے اطراف و جوانب کا بھی لحاظ کیا جائے تو پورے ۶۴ صفحات پر یہ مباحث پھیلے ہوئے ہیں اور محکم و متشابہ کی تفسیر میں دس اقوال پیش کرنے کے بعد یہ اختیار کیا ہے کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس کی مراد بالکل غیر معلوم ہو بلکہ اس کو غیر معقول قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس شے کا ہم ادراک نہیں کر سکتے وہ متشابہات کے معانی نہیں بلکہ ان کی پوری پوری کیفیات ہیں مثلاً صفات الٰہیہ کی کیفیت، جنت و دوزخ اور دوسرے عالم غیب کی تفصیلی کیفیت، استواء علی العرش اور قیام قیامت کی کیفیت اور اس قسم کے دوسرے امور، ان کے نزدیک قرآن کریم میں صرف متشابہ اضافی ہے، متشابہ حقیقی کا کوئی وجود نہیں جو لوگ متشابہات پر دور حاضر کے اعتراضات کا جواب دینا چاہیں ان کے لیے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے ان کے کلام کا اصل مآخذ حافظ ابن تیمیہؒ کی سورۂ اخلاص کی تفسیر ہے۔ محمد بن ابراہیم وزیر نے بھی اس جگہ مفید کلام کیا ہے۔ (دیکھو الروض الباسم ج ۲ ص ۵۲)

راسخین کا حصہ ہے کیونکہ وہ محکمات و متشابہات کے فرق پر موقوف ہے اور اس کا علم علماء ہی کو ہوسکتا ہے۔تیسری علامت خود انسان ہی کے فیصلہ کی بات ہے وہ خود ہی اس کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس کے باطن میں اتباعِ ھدیٰ کا جذبہ ہے یا اتباعِ ہویٰ کا۔

اب اگر آپ کو فرقہائے باطلہ کی شناخت کرنی ہے تو ان علامات سے کر لیجئے مگر ان علامات کے بعد بھی دائرۂ بحث ختم نہیں ہوگا اس لیے اس بحث کو تمام کرنے کا وہی ایک راستہ ہے جو یہاں صحابہ کرام نے اختیار فرمایا تھا یعنی ان ۷۲ فرقوں کی تعیین یا ان کی علامات پر سوال و جواب کی بجائے یہ تحقیق کر لی جائے کہ فرقۂ ناجیہ کون سا فرقہ ہے یہ مفید بھی ہے اور مختصر بھی۔

فرقہ ناجیہ کی تعیین اور بقیہ فرقوں کے ابہام کی حکمت ❊ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے اس راستہ کو اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ یہ جانتے تھے کہ راہِ مستقیم بغیر صاحب وحی کے بتائے ہوئے قطعی طور پر دریافت ہی نہیں ہوسکتی۔ اگر صرف ہماری عقل اس کے لیے کافی ہوسکتی تو انبیاء علیہم السلام کی حاجت ہی کیا رہتی اس لیے اس کی تعیین تو خود رسول ہی کی زبان سے ہوجانا چاہیے یہ امت کے اجتہاد پر سپرد کرنے کا مسئلہ نہیں ہے ہاں شاہراہ نجات متعین ہوجانے کے بعد سبل منحرفہ کی تعیین امت کے سپرد کی جاسکتی ہے گویا عمل کے لیے میدان صاف کر دیا گیا ہے اور صرف نظری مرحلہ میں امت کے فہم و اجتہاد کا امتحان لیا گیا ہے۔

شریعت محمدیہ صفت اعتدال میں اتنی اتم و اکمل ہے کہ دوسرے ملل مستقیمہ میں گویا ''الصراط المستقیم'' اس کا ایک لقب بن گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جتنا توازن، جتنا اعتدال، جتنا اقتصاد اور میانہ روی اس شریعت میں ملحوظ ہے اتنی دوسری شرائع میں نہیں۔شریعت موسویہ و عیسویہ کے افراط و تفریط کا حال معلوم ہے، گو وہ اپنے زمانہ کا توازن درست رکھنے کے لیے کتنی ہی معتدل ہوں مگر اس شریعت کے اعتدال کے بالمقابل رکھی نہیں جاسکتیں، آخر وہ اصر اور اغلال (شدید احکام) کیا چیزیں تھیں جن کو شریعت مصطفویہ نے میزان شریعت سے نکال کر اعتدال کی صورت پیدا کی ہے۔اسی وصف ممتاز کے لحاظ سے اس امت کو امت وسط کہا گیا ہے اس لیے یہاں ادنیٰ سے ادنیٰ انحراف بھی نمایاں ہوجاتا ہے اور وہ صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے سبل کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ ﴿وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ﴾ (النحل : ۹)

سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ ''قصد السبیل'' یعنی میانہ راستہ طریق سنت ہے اور ''منها جائر'' ملل و سبل متفرقہ ہیں۔مجاہد نے اس کو اور زیادہ صاف الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ''قصد السبیل'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

المقتصد بين الغلو و التقصير و ذلك يفيدان الجائر هو الغالي او المقصر و كلا هما من اوصاف البدع[1]	یعنی میانہ روی یہ ہے کہ نہ اس میں غلو اور مبالغہ ہو اور نہ کوتاہی رہے اس کے بالمقابل جائر کا مفہوم یہی ہوگا کہ اس میں یا تو غلو نظر آئے یا کوتاہی، یہ دونوں ملل منحرفہ کے اوصاف ہیں۔

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اقتصاد اور اعتدال کتنی کٹھن منزل ہے اگر پلہ ذرا جھکتا ہے تو غلو ہوجاتا ہے اگر ذرا اڑتا ہے تو تقصیر

---

[1] الاعتصام ج ۱ ص ۴۷۔

کا الزام عائد ہوتا ہے اس لیے اعتدال کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہمہ وقت شریعت پر ترازو کی طرح ٹکٹکی بندھی رہے کہ کہیں ڈگمگاتی تو نہیں ہر بوالہوس کے یہ نصیب کہاں ؎

ایں شربت عاشق یست خسرو　　بے خون جگر چشید نتواں

کلھم فی النار الاواحدۃ ✻ یہاں ایک شبہ یہ بھی پیش آ رہا ہے کہ اس امت کی اکثریت اگر جہنم میں ہو تو یہ مرحومہ کیسے ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ سوال ہی غلط ہے یہ فیصلہ ابھی قبل از وقت ہے۔ درمیانی مراحل سے گذر کر جب یہ امت جنت میں داخل ہو جائے اس وقت یہ توازن قائم کرنا چاہیے کہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں یہ امت زیادہ ہے یا کم' اس وقت یہ صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ درحقیقت یہ امت امت مرحومہ ہے یا نہیں۔[1]

نیز یہ بھی تو سوچئے کہ اس امت کی ضرب المثل وحدت' اس کی خدا ترسی' راست بازی' باہمی ہمدردی و سلوک یہ اس کے دورِ عروج کی باتیں ہیں اس کے برعکس اس کا افتراق وتشتت' اس کا تفرق و کجروی یہ اس کے دورِ نزول کی داستان ہے۔ کسی قوم کے دورِ عروج کی تاریخ اس کے دورِ زوال میں پڑھنے کی سعی کرنا بڑا ظلم ہے جن احادیث میں اس امت کی خیریت و برتری موجود ہے ان ہی میں اس کے دور انحطاط کا یہ افتراق مذکور ہے پھر اس میں تردد وشبہ کی کیا بات ہے۔

کلھم فی النار کی تحقیق ✻ یہاں ایک بڑے عالم محقق نے یہ جواب دیا ہے کہ ''کلھم فی النار'' دراصل ایک محاورہ ہے جو کسی چیز کے غلط اور نا قابل قبول ہونے کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسا کہ اردو میں کہہ دیتے ہیں کہ ''اسے چولھے میں ڈالو'' یہاں درحقیقت دوزخی ہونا مراد ہی نہیں مگر ہمیں اس جواب میں تردد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے دوسرے الفاظ میں ''واحدۃ فی الجنۃ'' صرف ایک فرقہ جنت میں ہوگا۔ موجود ہے۔ لفظ نار اور جنت کا تقابل یہاں اس محاورہ کی گنجائش نہیں دیتا۔

ہمارے نزدیک حدیث کی راجح مراد وہ ہے جو حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیان فرمائی ہے اور جس کو شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے جزوی اصلاح کے ساتھ اپنے فتاوئی میں نقل فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس ایک فرقہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو بلا کسی ادنیٰ عذاب کے جنت میں جائے گا اور یہ وہ ہوگا جس میں اعتقادی اور عملی کسی پہلو سے بھی بدعت نے راہ نہ پائی ہوگی' اگر بناء بر بشریت کوئی عملی کمزوری ان سے سرزد بھی ہوگئی ہوگی تو اللہ تعالیٰ عزوجل کی رحمت یا اسے معاف کر دے گی ورنہ قبر اور محشر کے شدائد میں کہیں اس کا حساب مجری کر لے گی۔ اس کے بالمقابل جو باطل فرقے ہیں ان کو اپنے افتراق وتشتت کی سزا بھگتنا پڑے گی اس کے بعد وہ بھی جنت میں چلے جائیں گے۔ آخر کار اس امت کا ہر ہر فرقہ کچھ عذاب پا کر یا بلا عذاب جنت میں داخل ہو جائے گا یہی مطلب ہوسکتا ہے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی اس حدیث کا۔

ما من امۃ الا و بعضھا فی النار و بعضھا فی　　ہر ایک امت کے کچھ لوگ جنت میں اور کچھ دوزخ میں جائیں گے

---

[1] ترمذی میں روایت ہے کہ اہل جنت کی کل صفیں ایک سو بیس ہوں گی جس میں اسی اس امت کی اور بقیہ چالیس سب امتوں کی۔

الجنة الا امتی فانها کلها فی الجنة. صرف ایک میری امت ہے جو پوری کی پوری جنت میں جائے گی۔

یہ حدیث معجم اوسط اور معجم صغیر میں طبرانی نے روایت کی ہے۔ صاحب جمع الفوائد فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد ضعیف ہے تاہم اس کی مراد وہ ہے جو ہم نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کی ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس امت کے لیے مدارِ نجات صرف کلمہ توحید ہے اور معصیت موجب عذاب نہیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کا مذہب نہیں ہے مرجیہ کا مذہب ہے۔ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ نے اپنی امت کے بعض افراد کو بچشم خود دوزخ میں دیکھا پھر یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام امت بلا عذاب جنت میں داخل ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ظاہر یہی ہے کہ اس فرقہ سے وہی فرقہ مراد ہے جس نے سنت پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا ہے۔ بدعت سے وہ ہمیشہ دور اور نفور رہا ہے' اس کے اعتقاد و عمل کے دونوں بازو درست ہیں' یہی فرقہ سیدھا جنت میں داخل ہوگا اور لفظ ''**ما انا علیہ و اصحابی**'' بھی زیادہ اسی پر چسپاں ہوتا ہے۔

فرقہ ناجیہ کی تحقیق

ما انا علیه و اصحابی ——— الجماعة ——— السواد الاعظم

درحقیقت یہی وہ مسطر ہے جس کو سرورِ کونین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے تیار کیا تھا کہ صفحاتِ عالم پر آئندہ عقائد و اعمال کی جب کوئی سطر کھینچی جائے تو وہ اسی مسطر سے برابر کر لی جائے۔ مضمون بالا مطالعہ کرنے کے بعد اب یہ فیصلہ کرنا آپ کو آسان ہوگا کہ وہ جماعت کون سی ہے جس کو معیارِ حق و باطل قرار دیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ یہ وہ راسخ العلم جماعت ہے جو نہ تو الفاظ کی جکڑ بندیوں میں اتنی مقید ہے کہ عقل کو بالائے طاق رکھ دے نہ عقل کے گھوڑے پر ایسی سوار ہے کہ آنکھ بند کر کے علم سلف کو پامال کرتی چلی جائے بلکہ علم صحیح اور فہم صحیح کی دو روشنیوں میں اس طریق کا پورا احترام رکھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا طریق تھا۔ اس راہ مستقیم پر نہ تو اختلاف کی کھائیاں ہیں اور نہ بغض و عناد کی پہاڑیاں بلکہ یہ وہ راہ ہے جس کے دن رات دونوں برابر ہیں۔ **لیلھا و نھارھا سواء۔**

اختلاف کی تشریحات پڑھنے کے بعد اب یہ یقین کر لینا آپ کو آسان ہوگا کہ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی جماعت میں کوئی اختلاف نہیں تھا وہ صرف فروعی مسائل ہیں جہاں ضروری سمجھتے اجتہاد کر لیتے تھے ان کے دور میں عمل ہی کا چرچا تھا اس لیے ایک مکمل دین کے جو طے شدہ مسائل تھے وہی مشغلہ ان کے لیے کافی تھا۔ فرضی مسائل' ذات و صفات کے مباحث سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا اگر دین کے عملی حصہ کو صرف عمل کے لیے دیکھا جائے تو وہ آج بھی اتنا ہی مختصر اور صاف نظر آئے گا۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ دور فتن نے بدنصیبی سے ہمارے حصہ میں عمل کی بجائے اختلاف کا مشغلہ لگا دیا ہے۔

اختلاف امتي رحمة کی تشریح ٭ یہ ایک ضعیف[1] الاسناد حدیث ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے اس کی شرح میں علماء کے مختلف خیال ہیں قاسم بن محمد فرماتے ہیں۔

''کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے عملی اختلاف میں ہمارا یہ بڑا فائدہ رکھا ہے کہ اب اگر کوئی شخص ان میں کسی کے مطابق بھی عمل کرلے تو اس کے لیے اتنی گنجائش نکل آئی ہے۔''

ابن وہب اس کی مزید تشریح نقل فرماتے ہیں:

''قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ مجھے خلیفہ عدل عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول بہت پسند ہے کہ: مجھ کو یہ تمنا نہیں ہوتی کہ صحابہؓ میں اختلاف نہ ہوتا اگر کہیں مسائل دینیہ میں ایک ہی قول ہوتا تو بعض صورتوں میں لوگوں کے لیے وہ عملی تنگی کا باعث ہوجاتا لیکن اب ان کے اختلاف سے دین میں عمل کی مختلف راہیں نکل آئیں چونکہ وہ ہمارے مقتدیٰ ہیں اس لیے اب اگر ان میں کسی کا قول اختیار کرلیا جائے تو وہ بھی دین کی ایک سنت پر عمل سمجھا جائے گا۔[2]''

اس کا بظاہر حاصل یہ ہے کہ صحابہ کرام چونکہ زیر سایہ نبوت تربیت یافتہ تھے۔ شریعت کے اغراض و مقاصد کو پوری طرح سمجھنے اور رعایت کرنے والے تھے اس لیے ان کے اختلاف کی وجہ سے ایک عمل کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوئیں وہ سب دین ہی کی راہیں کہلائیں گی اور سب مقبول ہوں گی اگر ان کے اختلاف کی بدولت ہمارے سامنے یہ مختلف صورتیں نہ آتیں اور ایک عمل کی ایک ہی صورت ہوتی تو بعض حالات میں اسی ایک صورت پر عمل کرنا دشواریوں کا موجب بن سکتا تھا۔ اس بنا پر ان کے اختلاف کے رحمت ہونے کا مطلب دین میں عملی وسعت ہوگا۔ امام شاطبیؒ کو یہاں ایک اور دشواری پیش آگئی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی کج فہم اس کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ حسب خواہش وہ جب چاہے جس صحابی کا قول چاہے اختیار کرسکتا ہے یہ بالکل غلط ہے اس لیے فرماتے ہیں۔

''یہ بات طے شدہ ہے کہ شریعت کے ہر ہر مسئلہ میں جزئی جزئی مصلحت کے علاوہ ایک کلی مصلحت بھی ہے۔ جزئی مصلحت تو خاص اس مسئلہ کی دلیل اور حکمت سے ظاہر ہوتی ہے لیکن کلی مصلحت یہ ہے کہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اعتقادی، قولی، عملی، ہر پہلو میں آئین شریعت کا مقید رہے اور ایک سانڈ کی طرح آزاد نہ رہ سکے اس کی ہر ہر نقل و حرکت شریعت کے اشاروں پر ہو۔[3]''

اس کے بعد پھر قاضی اسمٰعیلؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ:

---

[1] صاحب مقاصد حسنہ فرماتے ہیں کہ حدیث ''اختلاف امتي رحمة'' کو بیہقی نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں مرفوعاً روایت کیا۔ طبرانی اور دیلمی اور ضحاک نے اس کو منقطع طور پر روایت کیا ہے۔ عراقی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف مرسل ہے۔ خطابی کے کلام سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ حدیث بے اصل نہیں۔ بیضاوی کے حاشیہ میں ہے کہ اس حدیث کو سبکی وغیرہ نے ذکر کیا ہے مگر محدثین کے طبقہ میں یہ حدیث معروف نہیں (الموضوعات ص ۹۱) ان چند نقول سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کا سندی پایہ کمزور ہے تاہم بے اصل بھی نہیں۔

[2] الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۶۔ [3] الموافقات ج ۴ ص ۱۳۱۔

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے اختلاف سے جو وسعت ہم کو حاصل ہوئی ہے وہ دین میں اجتہاد کرنے کی وسعت ہے کیونکہ ان کا اختلاف اس کی دلیل ہے کہ غیر منصوص مسائل میں انہوں نے اجتہاد کیا ہے اور اس اجتہاد ہی کی وجہ سے ان میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اختلافات کے رحمت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہؓ کے مختلف افعال میں ہر شخص کو بے دلیل اپنی مرضی کے مطابق انتخاب کا حق حاصل ہو گیا ہے۔[1]''

''ابن عبدالبر نے قاضی اسمٰعیلؒ کی رائے پسند کی ہے اور اپنی کتاب جامع بیان العلم میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔[2]''

قاضی اسمٰعیلؒ کا مطلب یہ ہے کہ گوناگوں واقعات اور مختلف حوادث کے لیے ہمیشہ نص صریح کا ملنا تو دشوار ہے اس لیے امت کے لیے دینی مسائل میں اجتہاد کرنا ایک ناگزیر مسئلہ تھا جس کے لیے متاخرین امت کو ابتدائی قدم اٹھانا بہت مشکل ہو جاتا' جب صحابہ کرام میں اختلافات ہوئے اور معلوم ہوا کہ یہ اختلافات ان کے اجتہاد کی وجہ سے پیدا ہوئے تو اب امت کے لیے بھی اجتہاد کا جواز نکل آیا' یہی وہ رحمت ہے جس کی طرف ''اختلاف امتی رحمة'' میں اشارہ کیا گیا ہے اگر ان میں یہ اختلافات نہ ہوتے تو یہ ثابت ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم سے پیشرو امت نے دین کے باب میں اجتہاد کیا ہے یا نہیں' ان حالات میں ہمارے لیے از سرنو اجتہاد کا دروازہ کھولنا بہت مشکل تھا' ادھر اجتہاد کرنا مشکل' ادھر ہر جزئی مسئلہ میں نص صریح ملنا ناممکن۔ پھر دین کی مشکلات حل ہوتیں تو کیونکر ہوتیں۔ صحابہ کرام کے اختلاف نے ہماری یہ مشکل حل کر دی اور اب عملی طور پر ہمارے لیے اجتہاد کا اسوۂ حسنہ ثابت ہو گیا۔ اختلاف کے رحمت ہونے کا یہ مطلب غلط ہے کہ ہر شخص کو اپنے اہواء کے موافق صحابہؓ کے اقوال میں انتخاب کر لینے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو بالفاظ دیگر یہ ہے کہ شریعت کی کسی پر کوئی گرفت ہی نہیں کیونکہ بعض مرتبہ مسائل فروعیہ میں اختلاف نفی و اثبات کا اختلاف ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کا کوئی عمل' نفی و اثبات کے دائرہ سے عقلاً باہر نہیں رہ سکتا پس اس تقدیر پر اگر ہر شخص کو صحابہؓ کے افعال میں انتخاب کا حق حاصل ہو جائے تو اس کا جو عمل بھی ہو گا وہ یقیناً شریعت کے دائرہ میں کہلائے گا اور شریعت کا وجود و عدم برابر ہو جائے گا اور آپ معلوم کر چکے ہیں کہ یہ سرے سے شریعت کے مقاصد کلیہ کے بالکل برخلاف ہے وہ انسان کو اتنا آزاد چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔

تلاش کر کر کے صرف شرعی رخصتوں پر عمل کرنا فسق ہے

* حافظ ابن حزمؒ اس پر تو اجماع نقل کرتے ہیں کہ شرعی حجت کے بغیر صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا ناجائز بلکہ فسق ہے۔[3]

بہر حال صحابہ کرامؓ کے اختلافات دیکھ کر اختلاف امت کے رحمت ہونے کا مطلب خواہ صرف جواز اجتہاد کی حد تک ہو یا امت کے سامنے ایک عمل کی مختلف صورتوں کی وسعت بھی اس کے مفہوم میں داخل رہے۔ دونوں صورتوں میں صحابہ کرامؓ کے اختلاف کی نوعیت' دوسری جماعتوں کے اختلاف کی نوعیت سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ہر شخص کو مختلف اقوال میں حسب دلخواہ انتخاب کا حق حاصل نہیں' اس کے ضوابط و قواعد مستقل ہیں' ہماری غرض یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ

---

[1] الموافقات ج۴ص۱۴۲۔ [2] ج۲ص۷۸تا۹۲۔ [3] الموافقات ج۴ص۱۳۴۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین میں اصولاً تو کوئی اختلاف ہی نہ تھا ہاں فروعی اختلاف تھا مگر وہ ہمارے لیے باعث رحمت ہوا نہ کہ باعث تفریق و زحمت۔

مجتہدین امت کا اختلاف ✻ مجتہدین کے دور تک عمل کی گاڑی اسی طرح مشترکہ طور پر کھینچتی رہی۔ شدہ شدہ بے علمی کا دور آیا۔ ادھر تکوینی طور پر کچھ اہل علم کسی خطہ یا جماعت میں روشناس ہو گئے۔ بے علم جماعتوں نے ان سے مسائل پوچھنا شروع کیے پھر معاصر علما نے ان کا علم، خلوص و دیانت آزما کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اس طرح ایک زمانہ دراز تک اہل علم اور غیر اہل علم کی متفقہ آواز نے ان کو دنیا میں ایک غیر معمولی حیثیت دے دی، ان کے فروع و اصول مکمل طور پر قلم بند کیے گئے اور بحث و تمحیص کے تسلسل سے دیگر مجتہدین کے بالمقابل ان میں ایک خاص امتیاز پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے دائرۂ تلمذ کے مطابق ان کا مذہب اس مجموعی صورت میں پھیلتا رہا۔

تدوین دین میں فطری ارتقاء ✻ فطری ارتقاء، احساس ضرورت اور جذبات خدمت کی بناء پر جس طرح قرآن صحف سے مصحف، مصحف سے مصاحف اور مصاحف سے اعراب و سور و رکوعات کے مدارجِ ارتقائی طے کرتا چلا آیا اور بلاشبہ ان ارتقائی منازل کے بعد یہ قرآن وہی قرآن تھا جو دور اوّل میں موجود تھا۔

سنت میں ارتقاء ✻ اسی طرح سنت کے بھی ارتقائی دور ہیں، گو قرآن و سنت کے مراتب کے لحاظ سے عمل انسانی کو یہاں کچھ زیادہ آزادی حاصل ہوئی اس لیے وہ دور صحابہ سے گذر کر دور مجتہدین میں اور منضبط ہوئے پھر اس انضباط میں کچھ اور ترقیات ہوئیں اور ایک زمانہ تک حدیث و فقہ ایک ہی جگہ مدون چلتے رہے۔ اسی احساس ضرورت نے پھر مجبور کیا کہ دونوں فن علیحدہ علیحدہ کر دیئے جائیں۔ شروع میں صرف یہ قدم بھی نیا اور قابل اعتراض معلوم ہوا آخر کار اس کے فوائد دیکھ کر تمام دنیا نے اس کو مانا اور تمام علماء کی یہی متفقہ پالیسی بن گئی۔

فقہی ارتقاء ✻ اس فطری ارتقاء اور تکوینی اسباب کے ماتحت لاکھوں اہل علم اور کروڑوں انسانوں میں یہ دین بہ حیثیت مجموعی سفر کر رہا ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کا نام شافعیت و حنفیت رکھ کر دنگل قائم کر دو، یا اسے انحطاطِ دور کے لحاظ سے قدرت کی ایک اعانت تصور کر لو، جس نے تمہاری سہولت کے لیے، تمہاری ضرورت کے بقدر، مرتب شدہ دین تمہارے گھروں تک پہنچا دیا ہے۔

حنفیت و شافعیت کے اختلاف کی حقیقت ✻ حنفیت و شافعیت کا اختلاف بھی دین میں کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے، نہ یہ اختلاف اہواء پر مبنی ہے نہ اتباعِ متشابہات کا نتیجہ ہے، نہ علم سلف سے بے خبری اس کی بنیاد ہے بلکہ "اختلاف امتی رحمة" کا وہ حصہ ہے جو ہر زمانہ میں بقدرِ ضرورت امت مرحومہ میں تقسیم ہوتا رہا ہے۔ اگر نااہلوں اور بے علموں نے اس کو پارٹی بندی کا ذریعہ بنا لیا ہے تو یہ قصور ان کا ہے۔

ما انا علیه و اصحابی کی تحقیق ✻ اس کے بعد ہمیں عنوان بالا پر غور کرنا ہے۔ بظاہر یہاں آپ کا جواب سوال کے پورا پورا مطابق نظر نہیں آتا۔ صحابہ کا سوال فرقہ ناجیہ کے متعلق تھا آپ کا صاف جواب 'انا و اصحابی' ہونا چاہیے تھا یعنی وہ جماعت میں

ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں- بلا شبہ اس وقت فرقہ ناجیہ کا مصداق یہی جماعت تھی اور اگر اس سے بڑھ کر کوئی آئین کلی بتانا مقصود تھا- تو وہ کتاب وسنت ہے بلکہ ''ما انا علیه و اصحابی'' کا حاصل بھی یہی ہے پھر آپ کے اصحاب کا طریقہ آپ کے طریق کے سوا کوئی اور طریق نہیں تھا اس کے مستقل طور پر بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہونی چاہیے-

ان سوالات کے حل کی طرف جب انسان توجہ کرتا ہے تو اس کو صاحب نبوت کے ایک ایک لفظ کا کمال کھلتا چلا جاتا ہے بے شک متبادر یہی تھا کہ جواب ''انا و اصحابی'' ہوتا مگر یہاں سائل کا مقصود اس کے زمانہ کی جماعت حق کی تعیین نہ تھی وہ دورفتن میں حق جماعت کی تعیین کا طالب تھا اگر اسے آپ صرف کتاب وسنت ہی کا معیار بتاتے تو یہ جواب اس دور کے مناسب حال نہ ہوتا جس میں ہر باطل سے باطل فرقہ کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہی کتاب وسنت کا حامل ہے اس لیے یہاں آپ نے وہ فیصلہ کن آئین بتانا چاہا ہے جو اس زمانہ کے بھی مناسب حال ہو' وہ صرف کتاب وسنت نہیں بلکہ اس کی وہ عملی تصویر ہے جو آپ نے اپنے صحابہؓ کے سامنے بطریق اسوہ پیش فرمائی تھی- صحابہؓ کرام نے اس کے ایک ایک خط وخال کو دیکھا اور موبمو اس کی نقل کی- اب ادھر یہ اسوۂ حسنہ ادھر اس کا وہ مکمل نقشہ تھا- پوچھنے والوں کے لیے اس سے زیادہ صاف بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ جو صراط مستقیم کو دریافت کرنے آتا' اسے آنکھوں سے دکھا دیا جاتا اور زبان سے سمجھا دیا جاتا کہ وہ صراطِ مستقیم یہ ہے اس لیے یہاں افراد واشخاص کی بحث چھوڑ کر ان اوصاف کو بتا دیا گیا ہے جو فرقہ ناجیہ کی تعیین میں ہمیشہ کے لیے کارآمد ہوں-

الفاظ میں احتمالات باقی رہتے ہیں اس لیے فیصلہ کن صرف ان کی عملی صورت ہے ❊ اس جواب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دورِفتن میں کچھ ایسا تعصب نمودار ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ کی کٹ حجتی ختم کرنے کے لیے صرف الفاظ کافی نہیں ہوتے' یہاں حقیقت ومجاز' عموم وخصوص کے احتمالات پیدا کر دینے کا سہارا باقی رہتا ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوٹوک عمل ہی وہ کھلی ہوئی شریعت ہے جس میں یہ احتمالات نہیں چلتے- اسی لیے دورفتن کا بنیادی مسئلہ اسی تفصیلی شریعت کا انکار ہوا کرتا ہے- قرآن کریم سے زیادہ لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور حدیث سے زیادہ فقہ کا-

صحابہ کرامؓ پر آپؐ کا مکمل اعتماد ❊ رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی سنت کو یہاں مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے تو اس کی وجہ بظاہر اس کامل اعتماد کا اظہار کرنا ہے جو آپ کو اپنے صحابہ کی فہم پر حاصل تھا- صحیح احادیث میں موجود ہے کہ بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں کسی مافوق العادت امر کا تذکرہ ہوتا جیسے حیوانات کا تکلم تو آپ نے ابوبکرؓ وعمرؓ کی غیر حاضری میں یہ کلمات فرما دیئے ہیں ''امنت انا و ابوبکر و عمر'' میں اور ابوبکرؓ وعمرؓ بھی اس پر ایمان لائے- ان کی عدم موجودگی میں ان کی طرف سے ان کے ایمان کی شہادت دینا یہ ان پر کمال وثوق کی طرف ہی اشارہ تھا-

صحابہ کے بعض افعال کی صورت گو عہد نبوت میں نہ ملے مگر وہ مقاصد شریعت کے ماتحت ہوتے ہیں ❊ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے بعض اعمال کی صورت گو دورسنت میں ہمیں نظر نہ آئے مگر مقاصد شریعت کے لحاظ سے اس کا عین شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے لیکن دورفتن میں صحابہؓ کے متعلق یہ حسن ظن قائم رہنا مشکل ہے اس لیے اس بحث کو ختم کرنے کے لیے ان کے طریق کو ایک مستقل حیثیت دے دی گئی ہے- مثال کے طور پر تراویح کا مسئلہ ہے' کون نہیں جانتا کہ تراویح کی یہ اجتماعی

صورت جو آج ہمارے دور میں رائج ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ تھی - حضرت عمرؓ نے اس اجتماعی صورت کو شروع کیا - اس وقت طبائع میں کتنی سلامتی، کتنا اتحاد، کتنی یکسوئی، کتنا انقیاد تھا کہ سب نے اس کا اتباع کیا اور کوئی اختلافی ہنگامہ برپا نہ ہوا - بات یہ تھی کہ یہ درست تھا کہ تراویح کا یہ دور آپ کے زمانہ میں نہ تھا مگر صحابہ کرامؓ کو معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس التزام جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھنے سے جو بات مانع آئی تھی وہ صرف یہ تھی کہ ماہ رمضان کا مبارک مہینہ، نزولِ وحی کا دور موجود، اس میں صحابہ کرامؓ کا پرخلوص اجتماع اگر اسی طرح مسلسل ہوتا رہا تو اس کا بہت امکان تھا کہ یہ اجتماعی ہیئت جواب تک اختیاری تھی آئندہ لازم قرار نہ دے دی جائے اور جب ان بادہ نوشوں کا دور ختم ہو تو آئندہ جام وسبو کی یہ گردش کہیں بار نہ ہو جائے اس لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو جب دیگر مہماتِ اسلام سے فرصت ملی تو فوراً تراویح کے با جماعت ادا کرنے کی ترغیب دی کہ اب وحی بند ہو چکی تھی اور وجوب کا کوئی احتمال باقی نہ رہا تھا اس کی ایک مثال نہیں بہت سی مثالیں ہیں کہ صحابہ کے دور کا کوئی عمل گو صرف اپنی صورت کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نظر نہ آئے لیکن حقیقت کے لحاظ سے آپ کے منشا کے اتنا مطابق ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف فرما ہوتے تو یہی فرماتے - یہ ہمارا حسن ظن نہیں بلکہ عہد مبارک میں ....

قرآن کا حضرت عمر کی رائے کی تصویب کرنا ان کے دینی مزاج شناسی کی دلیل تھی ✻ خود وحی الٰہی کا حضرت عمرؓ کی بار بار تصویب کرنا اس بات کی کھلی ضمانت تھی کہ آئندہ بھی ان کی اصابت رائے امت کو تسلیم ہونا چاہیے - صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو موجودہ بے احتیاطیوں کو دیکھ کر عورتوں کا مسجدوں میں آنا بند کر دیتے، اس اختلافِ صورت اور اتحادِ مقصد کے پیش نظر مناسب ہوا کہ **"ما انا علیه"** کے ساتھ ساتھ "و اصحابی" کا لفظ اور اضافہ کر دیا جائے -

منصب تشریع اور منصب اجتہاد کی تقسیم ✻ خالق نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب تشریع سے نوازا تھا - اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو منصب اجتہاد سے نواز دیا اور اس طرح جو نعمت رسول کے حصہ میں آئی تھی امت کا بھی اس میں ایک حصہ لگ گیا -

السواد الاعظم الجماعة کا مصداق ✻ ان الفاظ کی تفسیر میں صاحب اعتصام نے متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں، ہمارے خیال میں حدیث کے گذشتہ الفاظ ہی اس کی تشریح کے لیے کافی ہیں یعنی جماعت اور سوادِ اعظم سے وہی جماعت اور وہی سوادِ اعظم مراد ہے جو "انا علیه و اصحابی" (یعنی کتاب وسنت کی تبع) ہے - اگر ان ہر سہ الفاظ کا خلاصہ نکالو تو یہ ہوگا کہ اہل حق ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہو اور نہ صرف یہی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے طریق کا بھی احترام کرنے والی ہو اگر کوئی جماعت صرف آپ کے طریقہ کا احترام کرتی ہے لیکن صحابہ کے طریق کا احترام نہیں کرتی تو وہ ان الفاظ کے حدود سے باہر ہے دورِ فتن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے مابین تفریق کا عقیدہ بھی ظاہر ہو چکا ہے -

خدائے قدوس اپنے اور اپنے رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا اور رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے مابین تفریق کا روادار نہیں ہے ٭ اللہ تعالیٰ اپنے اور رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا' اسی طرح رسول اپنے اور اپنے صحابہؓ کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا درحقیقت یہ انتہائی نادانی اور کجروی ہے کہ جو جماعت امت اور اس کے رسول کے درمیان واسطہ ہے' اس کے اقوال وافعال کو ہم تک پہنچانے والی ہے' اسی پر اعتماد نہ کیا جائے - اگر خدا کا رسول خود اپنی حیات میں ان پر اعتماد کر چکا ہے' بادشاہوں سے اور قبائل کفار سے گفت وشنید ان ہی کی معرفت کی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ امت اُن پر اعتماد نہ کرے - ایک عالمگیر دین جس جماعت سے نکلتا ہے اگر وہی جماعت ناقابل اعتماد ہے تو پھر آئندہ دور میں اس دین کا خدا حافظ -

اسوۂ صحابہ کی اہمیت ٭ اسی اہمیت کے پیش نظر الفاظ بالا میں صحابہ کرام کی سنت کو ایک مستقل حیثیت دے دی گئی ہے ورنہ جس طرح رسول کا طریقہ خدائے تعالیٰ کے طریقہ سے علیحدہ نہیں' ٹھیک اسی طرح صحابہ کی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے علیحدہ نہیں - اس لیے فرقہ ناجیہ کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ ان دونوں طریق کی جو بہ حقیقت ایک ہی ہیں اپنے اپنے مرتبہ میں بزرگی واحترام کی قائل ہو بلکہ اس پر گامزن بھی ہو - خوارج نے صرف سنت رسول کو لیا اور صحابہ کی ایک جماعت کو کافر ٹھیرایا' یہی ان کے ناحق ہونے کی پہلی علامت تھی اور اسی کی طرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے کلام میں اشارہ فرمایا تھا -

حواریین اور صحابہ کرام کا مقابلہ ٭ عیسائیوں کو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت سے مقابلہ کرنے میں ناکامی رہی - اسی طرح حواریین اور آپ کے صحابہ کرام کے مقابلہ میں بھی ناکامی رہی ہے بلکہ ان کو حسرت ہے کہ اگر کہیں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حواری بھی آپ کے صحابہ کی طرح جانباز اور اتنے ہی فداکار ہوتے تو اس طرح مسیحی دین صدیوں گمنامی کے عالم میں پڑا نہ رہتا -

ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب عروہ' قریش کی جانب سے شرائط صلح پر گفتگو کے لیے آتا ہے تو جن الفاظ میں صحابہ کی وفاداری کا نقشہ اس نے خود قریش کے سامنے کھینچا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایک کافر کے قلب پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا وہ کہتا ہے -

> ''کہ میں نے قیصر وکسریٰ ونجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن جو والہانہ عقیدت کا منظر یہاں دیکھا' کہیں نہیں دیکھا - جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو گردنیں جھک جاتی ہیں اور محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری ہوجاتا ہے - نظر بھر کر کوئی شخص ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا - آپ کے وضوء کا پانی اور آپ کا بلغم زمین پر گرنے نہیں پاتا کہ وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں -''

اسی لیے اس قوم کے احساسِ خودداری ووفاشعاری کی داستانیں پڑھنے والے مسلم وکافر اس پر متفق ہیں کہ اس سے زیادہ اطاعت وفرمان برداری کا ثبوت دنیا کی کسی قوم نے پیش نہیں کیا -

صحابیت کا احترام نجات کی علامت ہے ٭ الغرض چونکہ ایک صحابیت کے احترام ہی کا مخالف ہونا مقدر تھا اس لیے فرقہ ناجیہ کی ایک بڑی علامت صحابیت کا وقار واحترام بھی قرار دے دیا گیا ہے جو اس کا احترام نہیں کرتا ہے وہ درحقیقت آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم ہی کا احترام نہیں کرتا۔[1]

شانِ اجتماع حق کی علامت ہے ✻ دوسری علامت جماعت کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتی ہے کہ ان میں شانِ جمعیت و وحدت نمایاں ہونا چاہیے۔ افتراق وتشتت، بغض وعناد ان سے دور دور رہنا چاہیے اور سواد اعظم کے لفظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ افراد ایسے موقر ہونا چاہئیں کہ ان کا وجود ایک جماعت کی شکل میں بھاری، باشوکت اور بارعب نظر آئے۔ چنانچہ عبداللہ بن مبارک سے جب دریافت کیا کہ وہ جماعت کون ہے تو جواب میں ابوبکرؓ وعمرؓ سے شروع کر کے محمد بن ثابت اور حسین بن واقد کے دور تک پہنچ گئے جب ان سے کہا گیا کہ ان حضرات کی تو وفات ہوگئی تو فرمایا کہ پھر ابوحمزۃ السکری۔[2، 3]

افراد کی اکثریت معیار صداقت نہیں ✻ یہ ایک بہت ہی عامیانہ خیال ہے کہ سوادِ اعظم سے صرف افراد کی اکثریت مراد ہے غور کرنا چاہیے کہ دورِ فتن میں اہل حق کی اکثریت کب ہوسکتی ہے۔ پھر اس اکثریت کو ہر حق و باطل کے فیصلہ کا شرعی معیار قرار دے دینا اور بھی نافہمی ہے۔ اگر آج ایک طرف بے دینی، دہریت، مذہبی حریت، فواحش ومنکرات کی اکثریت موجود ہے تو کیا اس کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو سوادِ اعظم کا معزز لقب دے کر فرقہ ناجیہ کا مصداق ٹھرا لے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اختلاف کی بحث میں بتایا جاچکا ہے کہ اختلاف سے عقائد کا اصولی اختلاف مراد ہے اسی طرح ''**ما انا علیه و اصحابی**'' میں بھی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے عقائد کے اصول ہی مراد ہیں، ہر بحث وجدل کے موقعہ پر اس حدیث کو پڑھنا درحقیقت حدیث کی توہین کرنا ہے۔ حدیث **لا تجمع امتی علی ضلالة** اگر بلحاظِ سند درست ہو تو اس کی مراد بھی یہی ہے کہ امت پر کوئی دور ایسا نہیں آئے گا کہ اس میں حق پر کوئی باقی نہ رہے اور سب گمراہی پر متفق ہو جائیں بلکہ ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ یہاں بھی اکثریت کا فیصلہ مذکور نہیں ہے۔ دنیا میں اکثریت ہمیشہ حق کے خلاف ہوتی ہے مگر اس کی حقانیت کی یہ دلیل ہے کہ غلبہ آخر کار اسی کو حاصل ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو صحیح بخاری میں بالفاظ دیگر یوں ارشاد فرمایا ہے۔ **لن تزال هذه الامة قائمة علی الحق لا یضرهم من خالفهم حتی یأتی امر الله**۔

حدیث لن تزال، الخ کا مصداق ✻ روایت بالا میں ''**هذه الامة**'' کا لفظ ہے مگر عمرو بن ہانی کی روایت میں ''**طائفة من امتی**'' اور زید بن اصم کی روایت میں ''**عصابة من امتی**'' کا لفظ ہے جس کا یہ منشا ہے کہ یہ اوصاف جمہور امت کے نہیں بلکہ اس امت میں صرف ایک طائفہ و جماعت کے اوصاف ہیں۔ بلکہ ابن حزم تو یہ کہتا ہے کہ طائفہ لغت عرب میں بعض شئے کو کہتے ہیں اس لیے طائفہ کا اطلاق ایک شخص پر بھی آسکتا ہے۔ **و الطائفة فی لغت العرب یقع علی الواحد فصاعداً**۔[4]

امام بخاریؒ جزم کے ساتھ فرماتے ہیں کہ وہ طائفہ اہل علم کا طائفہ ہے اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ اہل حدیث ہیں۔

---

[1] دیکھو مقدمۃ اصابۃ فصل ثالث۔ [2] ان کا اسم مبارک محمد بن میمون مروزی ہے۔ [3] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۲۲۶۔

[4] الاحکام فی اصول الاحکام ج ا ص ۱۰۹۔

قاضی عیاض کہتے ہیں کہ امام احمد کی مراد اہل سنت ہیں ان تینوں الفاظ کا خلاصہ ایک ہی ہے- اہل حدیث اور اہل علم اور اہل سنت ایک ہی معنی کی مختلف تعبیریں ہیں- بعض نافہم اس کو بھی اختلاف سمجھ لیتے ہیں- صاحب موافقات نے جلد رابع میں اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے-

اقوال مفسرین اور الفاظ شارحین حدیث میں اکثر اختلافِ عبارت ہوتا ہے اسے اختلافِ حقیقت نہ بنانا چاہیے ٭

ما کان ظاهره الخلاف و ليس في الحقيقة كذلك و اكثر ما يقع ذلك في تفسير الكتاب و السنة فتجد المفسرين ينقلون عن السلف في معاني الفاظ الكتاب اقوا لا مختلفه في الظاهر فاذا اعتبرتها و جدتها تتلاقى [1]

یعنی جہاں ظاہر میں اختلاف نظر آئے اور درحقیقت اس میں کوئی اختلاف نہ ہو' یہ صورت زیادہ تر کتاب وسنت کی تشریحات میں نظر آتی ہے تم دیکھو گے کہ مفسرین قرآن کریم کے الفاظ کی شرح میں مختلف تعبیرات نقل کرتے ہیں لیکن جب ان کو بغور ملاحظہ کرو گے تو ان سب کا نقطہ نظر ایک ہی بات ہو گی صرف الفاظ مختلف ہوں گے-

حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس کو مفصل لکھا ہے- دیکھو توجیہ النظر-

بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے ہم نے یہاں ضمنی فائدہ کے طور پر صرف تنبیہ کر دی ہے کہ اگر اس کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے تو دین میں اختلافات کا بہت بڑا باب جو ہماری نافہمی سے اختلاف کی صورت میں نظر آ رہا ہے بند ہو جاتا ہے- **ما انا عليه و اصحابي - الجماعة - السواد الاعظم** - اسی سلسلہ کی ایک مثال ہے- یہاں بھی سواد اعظم اور جماعت سے وہی طائفہ مراد ہے جس کو مذکورہ بالا روایت میں ذکر کیا گیا ہے اُس طائفہ کے اوصاف پر غور کرنے سے اس کے سواد اعظم فرمانے کی وجہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے- حدیث بالا یہ کہتی ہے کہ مختلف رکاوٹوں اور ناسازگاریٔ ماحول کے باوجود وہ جماعت خدا کے دین پر قائم رہے گی اور بلحاظ اپنے عزم و استقلال دوسروں پر اتنی بھاری ہو گی کہ مخالفین کی مخالفت ان کو اپنے جادۂ مستقیم سے ہٹا نہ سکے گی- گویا اگر ایک طرف تکوینی طور پر فرقہ منحرفہ کی یہ کثرت رہے گی تو دوسری طرف ایک طائفہ ایسا بھی ضرور باقی رہے گا جو اقلیت میں ہو کر بھی اپنی شانِ جمعیت اور عزم و استقلال کی وجہ سے کبھی اکثریت سے مرعوب نہ ہو گا- [2]

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۲ ص ۲۱۴-

[2] نبوت ختم ہو چکی اس لئے امت کو عام گمراہی سے محفوظ رہنا چاہئے ٭ جس امت میں نبوت ختم ہو چکی ہے اس امت میں نبوت کی خدمات انجام دینے کے لیے ایک طائفہ مقدر ہونا چاہیے جو ان فرائض کو انجام دیتا رہے اور جس طرح کہ نبی وقت تن تنہا ہونے کے بعد بھی کفر کا مقابلہ کیا کرتا ہے اب اس جماعت کو باطل کا مقابلہ کرنا چاہیے اور جس طرح کہ تمام روئے زمین کی مخالفت اسے اپنی جگہ سے ایک انچ جنبش نہیں دے سکتی اسی طرح زائغین اس طائفہ کے قدم بھی دین متین سے متزلزل نہیں کر سکتے-

طائفہ میں امتی کا وجود جماعتی شکل پر ہونا ضروری نہیں ہے ٭ حافظ ابن حجر تصریح فرماتے ہیں- کہ اس طائفہ کا ایک جگہ ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے بلکہ جو افراد بھی اپنی اپنی جگہ منتشر طور پر احیاء سنت میں مشغول ہوں وہ شرعی نظر میں سب ایک جماعت اور اسی طائفہ کے افراد کہلائیں گے- لہٰذا یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ اجتماعی شکل میں کسی گوشہ یا کسی خاص خطہ میں یکجا موجود ہوں- للخ .....

اب سوچو کہ فرقہ ناجیہ کی اس سے زیادہ صاف تشریح اور کیا ہوسکتی تھی اور اسی لیے جب تک عہد نبوت اور عہد صحابہ باقی رہا یہ اختلافات بھی رونما نہ ہوئے لیکن جونہی آپ کا عہد باسعادت اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا دور مسعود ختم ہوا تو ''**ما انا علیه و اصحابی**'' کی وہی کھلی ہوئی بات ایک معمہ بن کر رہ گئی حتی کہ جس قدر اس زمانہ کو بعد ہوتا گیا اختلافات کی خلیج اسی قدر زیادہ وسیع ہوتی گئی۔لہٰذا ہر باطل سے باطل اور منحرف سے منحرف بھی دعویٰ کر رہا ہے کہ ''**ما انا علیه و اصحابی**'' کا مصداق وہ ہے لیکن اب یہاں نہ صحابہ ہیں نہ ان کے دور کے دیکھنے والے کہ اس نزاع کا فیصلہ ہو جاتا۔ایک جماعت خدا کی صفات کی ہی سرے سے منکر ہے اور خالص توحید اسی کا نام رکھتی ہے معتزلہ مدعی ہیں کہ اہل توحید وعدل وہی لوگ ہیں۔مشبہ چیخ رہے ہیں کہ صفات پر صحیح ایمان صرف ان کو حاصل ہے اور ہر ایک کے پاس دلائل میں وہی قرآن وسنت ہے غرض ہر ایک کا گمان یہی ہے کہ فرقہ ناجیہ اسی میں منحصر ہے۔

لله ..... مجددین کی اجمالی تشریح ✵ جیسا کہ ہر صدی پر مجددین کی آمد کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ مجدد کا فرد واحد ہونا ضروری ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ دین کی مختلف ضروریات کی تجدید شخص واحد کی بجائے ایک طائفہ سے حاصل ہو جائے اور بہ حیثیت مجموعی یہی طائفہ مجددین کہلائے۔
(دیکھو فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۲)

یہ ناواقفی بھی ایک مصیبت عظمیٰ ہے کہ عوام اور بعض خواص خود اپنی جانب سے کسی حدیث کی کوئی شرح سمجھ لیتے ہیں اور جب اس کے خلاف کوئی حقیقت سامنے آتی ہے تو اس سے کان کھڑے کرنے لگتے ہیں حالانکہ وہ بات اپنی جگہ بالکل صاف ہوتی ہے۔

امت کا پہلا مجدد ✵ بعض اشخاص پر مجدد کے لقب کی شہرت نے یہ تخیل پیدا کر دیا ہے کہ مجدد گویا بزرگی کا کوئی منصب ہے حالانکہ امت نے سب سے پہلے یہ لقب خلیفہ عادل عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے لیے استعمال کیا تھا پھر اس کے بعد امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق کہا گیا ہے اسی طرح آئندہ بھی تخمینی طور پر یہ لقب جاری رہا ہے۔بہر حال مجددین کے لیے نہ دعویٰ کرنا ضروری نہ اس کا ایک فرد میں انحصار ضروری ہے بلکہ آخری دین کی یہ مختلف اصلاحی صورتیں ہیں جو تکوینی طور پر کبھی اجتماعی اور کبھی انفرادی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔مجددین۔**طائفه من امتی** — **ما انا علیه و اصحابی** ہے **السواد الاعظم** سب اسی کے شعبے ہیں۔بات ایک ہے لفظ مختلف۔

اصلاحِ دین کا تکوینی نظام ✵ صحیح بخاری میں اس روایت کے ایک لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کا وجود تکوینی ارادہ کے ماتحت ہوتا ہے۔اختلاف کے نئے سے نئے شاخسانے دنیا میں رونما ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی نئی سے نئی تدبیریں قدرت پیدا کرتی رہے گی اسی خیر وشر کے ہنگامہ کا نام عالمِ اختلاف ہے جسے دنیا کہتے ہیں۔

من یرد الله به خیرا یفقهه فی الدین ولن یزال امر هذه الامة مستقیما حتی تقوم الساعة ، الخ

جس کے متعلق خدا خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین میں سمجھ دے دیتا ہے اور اس امت کا دین ہمیشہ مستقیم رہے گا یہاں تک کہ قیامت آ جائے گی۔

دین پر استقامت کے لئے دین کی سمجھ ضروری ہے ✵ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تفقہ فی الدین ارادۂ الٰہیہ کے ماتحت نصیب ہوتا ہے۔کسب کا ثمرہ نہیں اسی طرح دین کی استقامت کی راہیں بھی تکوینی ہیں۔بے شک جس دین میں ختم نبوت مقدر ہو چکا ہے اس میں بقاء استقامت کی بشارت اور اس کے تکوینی انتظامات کی خبر بھی ضروری امر تھا۔

کرمانی شارح بخاری فرماتے ہیں کہ الفاظِ بالا سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ استقامت میں تفقہ فی الدین داخل ہے اور اسی ارتباط کی وجہ سے حدیث میں دونوں باتیں ایک سیاق میں ذکر کی گئی ہیں۔ (فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۰)

بہرحال صحیح صورت عمل مخفی ہونے کے بعد اب یہ مشرح الفاظ بھی صرف ایک رسہ کشی کا میدان بنے ہوئے ہیں اسی کو سورۂ روم میں ارشاد فرمایا تھا۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ. (الروم : ۳۲) ہر پارٹی اپنے اپنے خیال میں مست ہے۔

منحرف جماعتیں دعوئٰ حقانیت میں دلیر ہوتی ہیں ✻ گویا منحرف جماعتوں کا یہ بھی ایک خاصہ بن کر رہ جاتا ہے کہ غور وتفکر کی بجائے انہیں صرف اپنی حقانیت کا زعم باطل ہو جاتا ہے۔ عالم اختلاف کی یہ ہنگامہ آرائی دیکھ کر تقدیر ہنستی ہے اور کہتی ہے۔

وَ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّکَ وَ لِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ. (ھود ۱۱۸-۱۱۹) یعنی یہ اختلاف اسی طرح باقی رہے گا اور بساط عالم کو اسی اختلاف کے لیے بچھایا بھی ہے۔

حدیث قرطاس میں ایک انوکھی تنبیہ ✻ اسی لیے شاید وفات کے وقت کوئی ایسی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم لکھتے لکھتے رہ گئے تھے اگر کہیں وہ لکھ دی جاتی تو امت میں اختلاف کا خطرہ مستقل مٹ جاتا۔

هلم اكتب لكم كتابا لن تضلوا بعده. لاؤ تمہارے لیے ایک ایسی بات لکھ دوں کہ اس کے بعد پھر کبھی گمراہ نہ ہوسکو گے۔

اگر کہیں یہ کتاب قید کتابت میں آ جاتی تو ممکن تھا کہ امت کی امت لا یزالون مختلفین سے نکل کر سب الا من رحم ربک کے نیچے داخل ہو جاتی مگر آخر کار تقدیر غالب آئی اور ایسے حالات رونما ہو گئے کہ یہ تحریر وجود میں نہ آ سکی۔[1]

تقدیر ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی تمناؤں کا ساتھ نہیں دیتی ✻ ایک مرتبہ آپؐ نے ارادہ کرلیا تھا کہ شب قدر کا صاف صاف علم بتا دیا جائے، مگر مسجد نبوی میں کچھ شور بپا ہوگیا آخر وہ علم بھی اسی طرح مستور رہ گیا یہاں بھی کچھ قصد مبارک تھا کہ لاؤ کوئی ایسی بات بتلا دی جائے کہ آئندہ تفرقہ کا اندیشہ ہی نہ رہے مگر یہاں بھی کچھ شور ہوگیا آخر کار وہ نوشتہ جوں کا توں رہ گیا۔ عالم تقدیر وتکوین کا یہ تماشا بھی قابل دید ہے کہ اگر، عام تدبیر نے کبھی وحدت واجتماع کے لیے زور لگایا بھی تو اسی وقت پردۂ غیب کے کسی اندرونی ہاتھ نے اس کا سارا کھیل بکھیڑا کر دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر قلم بھی خاموش ہو جاتا ہے۔قلم اینجا رسید سر بشکست۔

تقدیر اسباب کے پردہ میں نمایاں ہوتی ہے ✻ خیر وشر دو متضاد قوتیں ہیں جب ایک ابھرے گی تو دوسری مغلوب ہو جائے گی۔ قدرت خود انہیں زیر وزبر کیا کرتی ہے۔ بندۂ اسباب یہاں شکست وفتح کی دھن میں لگا رہتا ہے وہاں یہ منظور ہی نہیں کہ میدان کسی فریق کے بھی یک طرفہ ہاتھ آ جائے اس لیے شکست وفتح کا ڈول باری باری کھنچتا ہی رہتا ہے اور یہ بازی اس وقت تک برابر کھیلی جائے گی جب تک کہ عالم اختلاف کو آباد رکھنا ہے۔ ﴿وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ (البقرة : ۲۵۱)

---

[1] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۸۔

گویا نظامِ قدرت کی طرح یہ بھی اس کا ایک نظام ہے کہ وہ صوامع و بیع و مساجد کے اختلاف کو بساطِ عالم پر سجائے رکھے اور اگر کوئی طاقت اس کے برخلاف ابھرے تو اس کے مقابلہ کے لیے خود سامنے آ کر ان کو ایسے حدود پر روک دے جس کے بعد کسی کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہونے لگے۔ اس اختلاف کی آبادی کے لیے دنیا مشغولِ جنگ رہتی ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ جنگ اسبابِ موت ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ اسبابِ بقا یہی ہے۔ ہاں اگر قدرت کا ہاتھ نہ ہوتا تو اب تک ایک پارٹی نے غلبہ پا کر دوسری کو فنا کر دیا ہوتا اور چونکہ عالم اختلاف کی فطرت کے خلاف اس کو جینے کا حق نہیں ہے اس لیے اسے بھی فنا ہونا پڑتا۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ عالم تشریع و عالم تقدیر کے مابین ہمیشہ مطابقت ضروری نہیں ہے۔ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام برادرانِ یوسف علیہ السلام کو چشم زخم نہ لگنے کی تدابیر کیے جائیں گے مگر تقدیر نے جس کے مقدر میں جیل خانہ لکھ دیا ہے وہ جیل جا کر رہے گا۔

حدیث کی صاف صاف تشریح کے بعد اختلاف عالم تکوین کے ماتحت ہے ✽ الحاصل اگر ''ما انا علیہ و اصحابی'' کے صاف صاف بات ہونے کا آپ یہ مطلب سمجھتے تھے کہ اس فیصلہ کے بعد اختلاف کا تخم ہی دنیا سے مٹ جائے گا تو آپ نے غلط سمجھا تھا اور اگر شریعت کے سر یہ الزام رکھنا چاہتے ہیں کہ اس نے فرقہ ناجیہ کی کوئی صحیح تفسیر نہیں کی تو یہ اس سے زیادہ غلط سمجھے ہیں۔ عالم تشریع بصائر یعنی کھلی کھلی باتیں آپ کے سامنے بیان کرتا رہے گا مگر عالم تکوین شبہات کی گرد اڑا اڑا کر اس کو تاریک و مکدر بناتا رہے گا۔ آپ سلسلہ اسباب میں راہ حق تلاش کرنے کی تگ و دو جاری رکھئے اگر آپ کا نام ''الامن رحم ربک'' میں درج ہو چکا ہے تو جو راہ سب سے زیادہ صاف آپ کو نظر آئے گی وہ یہی ''ما انا علیہ واصحابی'' کی راہ ہوگی اور اگر خدانخواستہ اس فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے تو ایک تنکا بھی آپ کو پہاڑ معلوم ہوگا۔

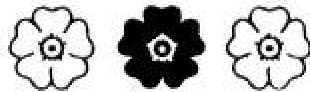
فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ. (الانعام : ۱۲۵)	سو جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تدبیر کو چھوڑ کر آپ کو تقدیر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں بلکہ اختلاف کا مفہوم' اس کے اسباب' فرقہائے منحرفہ کی شناخت پر تا مقدور بحث کر کے آخر میں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہاں اختلاف کے ان اسباب ظاہر کے ساتھ خاص طور پر اس کا ایک تکوینی سبب بھی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ﴿و لذلک خلقهم﴾ سے اشارہ فرمایا ہے اور اسی لیے اس افتراق کو دیکھ کر یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ حدیث کے قصور بیان کا ثمرہ ہے۔ بیان تو اتنا واضح ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے مگر چونکہ خطاب تکلیف علیحدہ ہے اور خطاب تقدیر علیحدہ اس لیے کبھی کبھی ایک صاف بات بھی چیستان بن کر رہ جاتی ہے اگر آج بھی کوئی

شخص ''ما انا علیه و اصحابی'' کی راہ معلوم کرنا چاہے تو اس کے لیے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ پس اشکال یہ نہیں ہے کہ فرقہ ناجیہ مبہم ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے دریافت کے جو اسباب ہیں خواہش نفس اس طرف آنے ہی نہیں دیتی۔ بقول اکبر مرحوم ؎

اللہ کی راہیں سب ہیں کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جو بحث یہاں کی گئی ہے وہ حدیث کے مذاق کے موافق کی گئی ہے' ایک مؤرخ کو حق ہے کہ وہ تاریخ کے مطابق اسبابِ اختلاف بتائے۔ اصحابِ تاریخ کا خیال ہے کہ ابتداء میں سیاست و مذہب مدغم تھے' اس لیے سیاسی تحریکات سب مذہبی رنگ میں ہی نمایاں ہوتی تھیں اس وقت ان دونوں عناصر کی تحلیل بہت ہی مشکل تھی۔ پھر جب قومیت نے مذہبی جذبات کی روح حاصل کر لی تو اس وقت سے سیاست کو مذہب کا جامہ پہننے کی ضرورت نہ رہی اس لیے مؤرخین نے مذہبی اختلافات کو سیاسی اختلافات کی بنیاد قرار دیا ہے مگر بنظر غور اگر آپ اس بنیاد کی بھی کوئی بنیاد تلاش کریں گے تو وہ اسباب پائیں گے جس کا مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔



حجیتِ حدیث

انکارِ حدیث کے فتنہ کا آغاز

اسلام میں تقریباً پہلی صدی تک صحیح احادیث کو بلا تفصیل متفقہ طور پر حجت سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ معتزلہ[1] ظاہر ہوئے' ان کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا انہوں نے حشر ونشر' رویتِ باری تعالیٰ' صراط ومیزان' جنت وجہنم اور اس قسم کی اور احادیث کو قابل تسلیم نہ سمجھا اور اپنے اس مزاجی فساد کی وجہ سے اخبارِ متواترہ کے سوا بقیہ احادیث کا سرے سے انکار کر دیا اور بہت سی قرآنی آیات میں جو اپنے مذاق کے خلاف دیکھیں تاویلیں کر ڈالیں- حافظ ابن حزمؒ فرماتے ہیں کہ:

''اہل سنت' خوارج' شیعہ' قدریہ تمام فرقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کو جو ثقہ راویوں سے منقول ہوں برابر قابل حجت سمجھتے رہے یہاں تک کہ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ آئے اور انہوں نے اس اجماع کے خلاف کیا-''[2]

سب سے پہلے امام شافعیؒ نے رسالہ میں اور کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس خیال کی تردید کی- امام احمدؒ نے بھی اطاعت رسول کے اثبات میں مستقل ایک جزء تصنیف کیا اور احادیث وقرآن سے مخالفین کی تردید کی جس کا ایک حصہ حافظ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے[3] اس کے بعد امام غزالی' ابن حزم اور حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے المستصفی' الاحکام' اور الروض الباسم میں اس کے خلاف مقالات لکھے حتیٰ کہ پھر اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کا یہ ایک مستقل موضوع ہی بن گیا- متاخرین میں حافظ سیوطیؒ نے بھی ایک مستقل جزء اس پر تالیف کیا-

معتزلہ کا یہ فتنہ ایک علمی فتنہ تھا اس لیے انکارِ حدیث میں انہیں بہت کچھ پس وپیش کرنا پڑا یہاں تک کہ ایک جماعت نے یہ تصریح کی کہ خبر واحد اگر عزیز ہو جائے (یعنی اس کے راوی اول سے آخر تک ہر طبقہ میں دو دو رہیں) تو چونکہ وہ مفید یقین ہو جاتی ہے اس لیے حجت ہو جائے گی- حافظ ابن حجرؒ نے ابوعلی جبائی معتزلی سے نقل فرمایا کہ حدیث کی صحت کے لیے اس کا عزیز ہونا شرط ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکارِ حدیث سے ان کا مقصد دین سے سبکدوشی حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ ایک اصولی غلطی تھی جو ان کے دماغوں میں ایک غلط بنیاد پر قائم ہو گئی تھی لیکن ہمارے دور کا فتنہ علم وفہم پر مبنی نہیں بلکہ جہل وعناد پر مبنی ہے' اس کا مقصد مذہب کی گرفت ڈھیلی کرنا اور اس کو ایسی صورت میں پیش کرنا ہے جو ہر سانچے میں ڈھلنے کے قابل ہو جائے اس لیے اب انکارِ حدیث کے

---

[1] علامہ جزائری لکھتے ہیں اگرچہ لوگوں میں یہ بہت مشہور ہے کہ معتزلہ کا مذہب علم فلسفہ میں توغل کی وجہ سے پیدا ہوا ہے مگر یہ خیال بے اصل ہے کیونکہ ان کا مذہب صحابہؓ کے آخری دور میں ظاہر ہو چکا تھا- حالانکہ اس وقت تک فلسفہ کی کسی کتاب کا بھی ترجمہ ہونے نہ پایا تھا (توجیہ ص ۷۷) ہمارے نزدیک اگر یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی فلسفی اثرات کے لیے کتابی توغل کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ان کے عقائد' طرزِ استدلال' اندازِ شبہات سب اس کی کھلی ہوئی شہادت ہیں کہ خارجی یا داخلی کسی نہ کسی طور پر ان کے دماغوں پر فلسفہ کا تسلط ضرور ہو چکا تھا- اگر مطالعہ کتب کے ذریعہ سے نہ ہو تو نہ سہی-

[2] الاحکام ج ۱ ص ۱۱۴- [3] ج ۲ ص ۲۱۷-

لیے کسی بڑی دلیل کی ضرورت بھی نہیں رہی بلکہ صرف چند احادیث میں معمولی شبہات پیدا کر کے بقیہ تمام احادیث کو بے دلیل رد کر دیا گیا۔[1]

قرآن نے تو شریعت موسویہ کے صرف چند شدید احکام ہی کو اصرواغلال سے تعبیر فرمایا تھا مگر یہاں بعض منکرین حدیث نے آپ کی تمام احادیث کو اصرواغلال کہہ ڈالا۔ العیاذ باللہ۔ اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ اطاعت صرف خدا کی کتاب کی واجب ہے۔ رسول کی اطاعت منصب رسالت کے لحاظ سے کوئی ضروری امر نہیں اس کا فریضہ صرف تبلیغ قرآن سے ادا ہو جاتا ہے اس کے بعد وہ عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ گویا اس کے کسی قول و فعل کو تشریعی کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوتی اگر اس کی اطاعت لازم ہوتی ہے تو ایسی ہی جیسے اپنے زمانہ کے ہر امیر و حاکم کی لازم ہوا کرتی ہے۔ اس عقیدہ کا مبنی درحقیقت مقام نبوت اور حقوق نبوت سے تمام تر جہالت اور ناواقفیت ہے یہ عقیدہ ایسا ہی بدیہی البطلان ہے جیسا یہ کہ ایمان لانا صرف خدا پر ضروری ہے۔ رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں اگر ﴿اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾ کی کوئی تاویل کی جا سکتی ہے تو ﴿اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ﴾ کی تاویل کیوں نہیں کی جا سکتی۔

اس لیے اس خیال کی اصلاح کر کے انکارِ حدیث کی ایک تیسری صورت پیدا کی گئی اور وہ یہ کہ دین میں کتاب اللہ کے سوا اسوۂ رسول کا اتباع اور لازم ہے۔ اسوۂ رسول۔ رسول کا وہ عمل ہے جو اس نے امت کو کتاب اللہ کے مطابق کر کے دکھلایا ہے اس کے علاوہ دوسرے اُمور میں اس کی حیثیت پھر وہی امیر کی حیثیت رہ جاتی ہے جس کی اطاعت صرف اس کے زمانہ حیات سے وابستہ ہوتی ہے اس خیال کے حامل مولوی اسلم صاحب جیراجپوری اور ان کی جماعت ہے۔ ان کے نزدیک بھی حدیث کو کوئی تشریعی حیثیت حاصل نہیں بہت سے بہت صرف تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک مولوی اسلم صاحب بھی مقام نبوت سے قطعاً بے خبر ہیں اور اسی لیے خدا کے مقدس رسولوں کو دوسرے امراء کی طرح ایک امیر تصور کرتے ہیں۔ گو اسوۂ رسول کو تسلیم کر کے انہوں نے پہلی جماعت سے ایک قدم ضرور آگے بڑھایا ہے مگر صرف اتنی بات تسلیم کر لینے سے حق رسالت ادا نہیں ہوتا۔

ہم نے ہر فریق کے دلائل کو بنظر انصاف دیکھا ہے مگر جہاں تک دعویٰ کے مثبت پہلو ہیں کسی فریق کے پاس ہمیں کوئی وزنی دلیل نظر نہیں آئی۔ البتہ منفی پہلو میں صرف چند شکوک شبہات ہیں جنہیں ہر فریق نے دلائل کا رنگ دے کر پھیلا دیا ہے۔ زیادہ تر افسوس ناک یہ ہے کہ یہ شبہات اہل سنت کی کتابوں سے ہی ماخوذ ہیں اور اُن ہی کتابوں میں ان کے جوابات بھی مذکور ہیں مگر

---

[1] ان عمر بن الخطاب كان يقول اصحاب الرائ اعداء السنن أعيتهم الاحاديث ان يحفظوها و تفلتت منهم ان يعوها و استحيوا حين سئلوا ان يقولوا لا نعلم فعارضوا السنن برأيهم فاياكم و اياهم. (اعلام ج ١ ص ٤٥)

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ متبعین عقل حدیث کے دشمن ہوا کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف سائلین کے جواب میں انکار کرتے تو انہیں شرم دامن گیر ہوتی ہے حدیثیں یاد کرنے کی توفیق ہوتی نہیں تو اپنی رائے سے جواب دیتے ہیں اور احادیث کا عقل سے مقابلہ شروع کر دیتے ہیں تم ایسے لوگوں سے بچتے رہنا۔

منکرین حدیث نے اس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے اور نہ ان جوابات کونقل کر کے کوئی تردید کی ہے- مولانا اسلم صاحب اور ان کے دوسرے ہم خیال صاحبان کا یہ طریقہ ایک علمی سرقہ کہا جا سکتا ہے- ہمارے نزدیک منکرین حدیث کے تمام طویل وعریض بیانات میں صرف دو باتیں قابل توجہ ہیں اور وہی ہر پھر کر ان کے تمام بیانات کا خلاصہ بھی ہیں-

❶ قرآن کریم ایک جامع کتاب ہے اس لیے دینی ہدایات کے لیے خود کافی ہے حدیث کا محتاج نہیں-

❷ قطعی دین کی بنیاد ظنیات پر قائم نہیں کی جا سکتی اور احادیث کا تمام ذخیرہ ظنی ہے-

مولانا اسلم صاحب نے بھی احادیث نبویہ کے ظنی اور غیر معتبر ہونے پر علم حدیث کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے- ہمارے نزدیک احادیث کی ظنیت وقطعیت پر مولانا کی یہ بحث ان کے نقطہ نظر سے بھی غلط ہے اور دوسروں کو بھی مغالطہ میں ڈالنے والی بات ہے کیونکہ مولانا موصوف کے نزدیک احادیث مروجہ کا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہی نہیں آپ نے صرف قرآن کی تبلیغ کی ہے اور اسی پر عمل کر کے امت کو دکھلایا ہے دین کے بس یہی دو رکن ہیں اور یہ دونوں تواتر سے ثابت ہیں- اس کے سوا دین کے معاملہ میں آپ نے کبھی کوئی ارشاد نہیں فرمایا- اگرچہ یہ خیال بہت ہی تعجب خیز ہے کہ جب حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے متعلق قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور ہدایت صادر ہی نہیں ہوئی تھی تو پھر حدیث کی یہ دنیا کی دنیا کہاں سے پیدا ہوگی- امت کے سب سے برگزیدہ اہل علم وفضل صاحب تقویٰ ودیانت صاحبان نے احادیث کا یہ سارا قلعہ صرف ہوا پر کیسے تعمیر کر دیا اور محض ایک غلط فہمی بلکہ بے علمی کی بنیاد پر صدیوں تک احادیث اور اسماء الرجال کے حفظ میں کیوں مفت سر مارا گیا اس لیے منکرین حدیث کو دو باتوں میں سے ایک بات صاف طور پر کہہ دینا چاہیے یا تو صاف اقرار کرنا چاہیے کہ احادیث نبویہ نہ تو تشریعی حیثیت رکھتی ہیں نہ تاریخی بلکہ ان تمام جھوٹوں میں سے وہ بدتر جھوٹ ہیں، جو دنیا کے پردہ پر کبھی نہیں بولے گئے-

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ. (الانعام:۹۳)	اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ افترا باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کوئی وحی نہیں بھیجی گئی-

دوسری صورت میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ارشاد فرمایا تھا اور امت نے اسے ضائع کر دیا تو اس کا اقرار کرنا چاہیے کہ دین محمدی کا بھی ایک حصہ یہودیت ونصرانیت کی طرح ضائع ہو گیا اور اب اس میں سے صرف قرآن کریم باقی رہ گیا ہے- یہ کہنا کہ احادیث چونکہ بعد کے دور میں مدون ہوئیں ہیں اس لیے حد یقین کو نہیں پہنچیں اور اس لئے قابل حجت نہیں ہو سکتیں- اس کا اقرار کر لینا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احادیث ارشاد تو فرمائی تھیں مگر وہ چند در چند وجوہ سے قابل اعتبار نہیں رہیں- یہ مولانا کے مسلک کے خلاف ہے- ان کے نزدیک احادیث مروجہ، سب اباطیل ومزخرفات کا مجموعہ ہے جسے محدثین ائمہ اربعہ اور دیگر حفاظ نے محض حسن ظن سے یا عمداً جھوٹ بول کر خود ترتیب دے لیا ہے- العیاذ باللہ-

قرآن کریم کی جامعیت ✻ تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم ایک جامع اور کامل کتاب ہے قائلین حدیث بھی منکرین حدیث سے بڑھ کر اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن نقطہ بحث یہ ہے کہ قرآن کی جامعیت کیا احادیث کے ثبوت اور حجیت

کے خلاف ہے یا صحیح معنی میں اس کی جامعیت احادیث نبویہ پر نظر کرنے کے بعد ہی روشن ہوتی ہے؟

قرآن کریم کی جامعیت کا یہ مفہوم تو غالباً کسی کے نزدیک بھی نہ ہوگا کہ وہ تعلیم وتوضیح کا محتاج نہیں' اس کی کسی آیت میں کوئی اجمال' کسی عموم میں کوئی تقیید' کسی مراد میں کوئی ابہام نہیں' ارکان وشرائط اسباب ومواقع کی تمام تفصیلات اس میں مذکور ہیں ہر باب کے غیر متناہی جزئیات کا اس نے احاطہ کرلیا ہے۔ فرائض وواجبات' مستحبات وسنن کی تمام حدود اس نے قائم کردی ہیں حتیٰ کہ بحث ونظر کے لیے اب اس نے کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا۔ سوچو اور انصاف کرو کہ کیا کسی کتاب کے کامل ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے یا عقلاً ایسا ہونا ممکن بھی ہے اگر جواب نفی میں ہے تو خاص کتاب اللہ کے بارے میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کی کسی آیت میں کوئی اجمال کسی عموم میں کوئی تقیید اور کسی مراد میں کوئی ابہام نہیں رہاحتی کہ وہ اپنے معنی ومراد حاصل کرنے میں رسول کے بیان کا بھی محتاج نہیں' اگر درحقیقت قرآن کی جامعیت اور اس کی وضاحت اسی درجہ ہوتی تو رسول کی بعثت بے فائدہ رہتی۔ قرآن کریم براہ راست اتار دیا جاتا اور دنیا خود اس سے استفادہ کرلیتی۔ لیکن قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کے لیے رسول کی بعثت کے بغیر کوئی چارہ نہیں' رسول کے واسطہ کے بغیر کتاب اللہ سمجھی نہیں جاسکتی' خدا کا فرشتہ اس کی کتاب کی پہلے رسول کو تعلیم دیتا ہے پھر رسول اس پر مامور ہوتا ہے کہ وہ خدا کی اور مخلوق کو اس کی تعلیم دے۔ ﴿عَلَّمَهُ شَدِيْدُ الْقُوىٰ ذُوْمِرَّةٍ﴾ (النجم: ۵) حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بڑا مقصد قرآن کریم کی تلاوت وتعلیم ہی فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ. (آل عمران: ١٦٤)

بے شک بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر جب کہ بھیج دیا ان میں پیغمبر انہیں میں سے' جو پڑھتا ہے ان پر اللہ کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور عقل کی باتیں۔

بعثت رسول کے تین اہم مقاصد ❋ یہاں رسول کی بعثت کے تین اہم مقاصد بتلائے گئے ہیں (۱) تلاوت کتاب۔ (۲) تزکیہ۔ (۳) تعلیم۔ تلاوتِ کتاب بظاہر تو سب سے ہلکا اور ادنیٰ مقصد نظر آتا ہے بالخصوص عرب اہل زبان کے لیے مگر اس کی اہمیت کا اندازہ صرف آپ کی اس دعا سے کیا جاسکتا ہے جو آپ نے تلاوت کی توسیع کے متعلق فرمائی تھی آپ نے فرمایا اے اللہ میری امت امی ہے اگر ان پر قرآن کی تلاوت صرف ایک نہج پر لازم کی گئی تو ابتدائی حالات میں یہ ان کے لیے بڑی دشواری کا موجب ہو جائے گا۔ اس لیے کچھ اور توسیع نازل فرما یہ درخواست آپ نے اس وقت تک برابر جاری رکھی جب تک کہ سات حروف تک تلاوت کرنے کی اجازت حاصل نہ کرلی اگر کہیں رسول نے قرآن کی خود تلاوت کر کے نہ بتایا ہوتا تو معلوم نہیں کہ عرب اور بالخصوص عجم کے تلاوت میں کتنے نقائص باقی رہ جاتے آج امت نے اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم کی صحیح طور پر تلاوت کرنے کے لیے مستقل ایک فن مدون کردیا ہے۔ منکرین حدیث کو شاید یہ بھی قرآن کی جامعیت اور اس کے تیسیر کے خلاف معلوم ہوتا ہوگا۔

تعلیم وتزکیہ ❋ یہ بات درست ہے کہ قرآن کریم کے اوّلین مخاطب عرب تھے جو خود اہل زبان تھے مگر کسی' کتاب کی مراد سمجھنے کے لیے صرف زبان دانی کافی نہیں ہوتی۔ بسا اوقات مصنف کی مراد محاورات کے توسعات' اشتراک وترادف اور مجاز وکنایات

کے پردوں میں پوشیدہ رہ جاتی ہے بلکہ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اتنی ہی شرح وبسط کی محتاج سمجھی جاتی ہے- دیوان غالب اُردو ہی کا ایک دیوان ہے اس کی ادبیت بھی ضرب المثل ہے اس کا مولف بھی شعراء کی سب سے پہلی صف میں شمار ہوتا ہے لیکن جب غالب دنیا سے رخصت ہوگئے اور ان کے کلام کی مراد براہ راست معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تو اب ان کا دیوان لوگوں کی طبع آزمائی کے لیے تختۂ مشق بن گیا صوفی مزاج نے چن چن کر ان کے کلام میں تصوف بھر دیا- رند مشرب نے شراب کا لفظ دیکھ کر مستی وکیف کے سارے نقشے کھینچ دیئے -فلسفی نے اپنی تمام موشگافیاں ختم کر ڈالیں لیکن غالب کی صحیح مراد کے موافق شاید کوئی شرح بھی نہ لکھی گئی ان سے اگر پوچھا جائے تو وہ ان کے متعلق شاید یہی جواب دیں ؎

ہر کس از ظن خود شد یارِ من　　　　و زدرون من نہ جست اسرارِ من

جب ایک انسان کی تالیف کا حال یہ ہے تو اب انصاف کیجئے کہ اگر قرآن بھی اسی طرح لوگوں کی طبع آزمائی کا میدان بنا دیا جاتا تو اس کا حشر کیا ہوتا -عرب اس وقت اگر زبان دانی کے اعلیٰ سے اعلیٰ دورِ عروج سے گذر رہا تھا تو قرآن بھی اعجاز کے بلند سے بلند مراتب طے کر کے آ رہا تھا- یہ اعجاز صرف اُس کے الفاظ تک محدود نہ تھا' اس کے معانی میں بھی موجود تھا وہ ان کے پاس ہدایت کے ایسے علوم لے کر آیا تھا جو نسل انسانی کو آخری معراج تک پہنچانے کے ضامن تھے- تاریخی واقعات اور ملی نزاعات میں اس کی حیثیت حکم کی حیثیت تھی' وہ مبدأ و معاد' الٰہیات و مجردات' اسرار غیب اور روحانی حقائق کا معلم' معاشرت و معاشیات کا مقنن بن کر نازل ہوا تھا ادھر مخاطبین اپنی طویل گمراہی' بے علمی اور طبعی ضد کی وجہ سے ایسی تاریکی میں گر چکے تھے کہ ان میں ان علوم کے از خود سمجھنے سمجھانے کا کوئی سلیقہ ہی باقی نہ رہا تھا جو لوگ ایک اللہ کے لفظ کے سوا رحمٰن کے نام سے بھی ناآشنا ہوں ان سے از خود قرآن فہمی کی توقع رکھنا کتنا بعید ہے-

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ. (الفرقان : ٦٠)　　جب ان سے کہا گیا رحمٰن کو سجدہ کرو' بولے رحمٰن کیا ہوتا ہے؟

اس ماحول میں اگر قرآن صرف ان کی زبان دانی اور ان کی فہم پر چھوڑ دیا جاتا اور رسول کی ذات درمیان سے علیحدہ کر لی جاتی تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد کو پہنچ جاتے- دیوانِ غالب کی شرحیں اگر مختلف ہوگئیں ایک ایک شعر کے کئی کئی معنی بیان کیے گئے تو یہاں غالب کو اور داد ملی لیکن اگر یہی حال قرآن کا ہو جاتا تو سوچو کیا راہِ ہدایت صحیح طور پر کسی کے ہاتھ آ جاتی؟ بات یہ ہے کہ غالب کا دیوان شعر کا ایک دیوان ہے' شعر خود نازک خیالیوں اور مبالغہ آمیزیوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے اس لیے یہاں جو شارح جتنا دور اور جتنا گہرا گیا اتنا ہی کامیاب سمجھا گیا- یہاں بحث صرف یہ ہے کہ جو معنی غالب کے الفاظ میں پہنائے گئے ہیں الفاظ میں ان کی قریب یا بعید صلاحیت موجود بھی ہے یا نہیں- غالب کی مراد سے یہاں نہ کوئی بحث ہے نہ اب ہو سکتی ہے- کتاب اللہ میں میں صرف الفاظ کی صلاحیت پر بحث نہیں ہوتی وہ شاعری نہیں حقیقت اور ٹھیک حقیقت کا پتہ دینے آئی ہے جو کتاب ہر معاملہ کی حقیقت کا فیصلہ کرنے آئی ہے اگر وہ بھی رائے زنی اور محض دماغی مشاقی کا میدان بنا دی جائے تو یہاں بھی دیوانِ غالب کی طرح حقیقت کا سراغ لگنا ناممکن ہو جائے اور جب دورِ صحابہ میں قرآن کا نقش اوّل ہی اس ابہام و اجمال میں قائم

ہوتو آئندہ نسلوں میں قرآن کے ابہام کا حال کیا ہو یقیناً دین الٰہی جیسا پہلے مجہول تھا کتاب اللہ کے نزول کے بعد اس سے زیادہ مجہول ہو جائے اور کوئی شخص بھی یہ نہیں بتلا سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی ذات وصفات کے متعلق کیا عقائد لے کر تشریف لائے تھے اور آپ نے عبادات و معاشرت' تمدن و معیشت کے کیا اصول مقرر فرمائے تھے اور اس طرح یہ کامل دین ناقص در ناقص بن کر رہ جائے - اس لیے یہاں رائے زنی کو سب سے بڑا جرم قرار دے دیا گیا اور صاف طور پر یہ اعلان کر دیا گیا کہ اگر کسی نے قرآن میں صرف اپنی رائے سے کام لیا اور فرض کرلو کہ حسب الاتفاق اس کی صحیح مراد حاصل بھی کر لی تو بھی اس کا یہ اقدام نہایت غلط ہے-

خطا گر راست آید تاہم خطا است

جب محض زبان دانی عام کتابوں کے سمجھنے کے لیے بھی کافی نہیں اور رائے زنی کی اس میں ممانعت کر دی گئی تو اب اس کے سوا اور کیا صورت تھی کہ خدا کا رسول خود آ کر اس کی تعلیم دے پہلے خود پڑھے پھر انہیں پڑھ کر سنائے جب وہ الفاظ کی تصحیح سے فارغ ہولیں تو اس کے بعد خدا تعالیٰ کی مراد بتلائے اور ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل کرنے کی ایسی اسپرٹ پیدا کر دے کہ ان کے جوارح جنبش عمل کے لیے بے چین ہو جائیں اور اس طرح بہت جلد انہیں اسلام کے پاکیزہ عقائد اور خالص اعمال سے مزین کر کے کفر کی ظلمتوں سے باہر نکال دے-

اگر اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعہ جلد جلد انہیں تعلیم وتزکیہ کے مراحل طے نہ کراتا تو یقیناً وہ مدت العمر اس کی مراد حاصل نہ کر سکتے - کتاب اللہ جو خالص عمل کرنے کے لیے نازل ہوئی تھی وہ صرف دماغی کدو کاوش کا مشغلہ بن کر رہ جاتی اور خدا کی مخلوق ان تمام ترقیات و مدارج سے محروم رہ جاتی جو اعمالِ صالحہ کے صلہ میں ان کے لیے موعود تھیں اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا احسان کیا کہ اپنی راہ کی تلاش ان کے ذمہ نہیں ڈالی بلکہ ان میں اپنا ایک رسول بھیج دیا اور اپنی کتاب نازل فرمائی پھر اس کتاب کی مراد سمجھنے کا بار بھی ان کے امی دماغوں پر نہیں ڈالا بلکہ عالم کا سب سے بڑا معلم اس کی تعلیم دینے کے لیے بھیج دیا اس نے پڑھایا' سمجھایا اور اگر انہیں کوئی شبہ پڑا تو نہایت سہولت سے اسے حل بھی کر دیا اور اس طرح ان کی ہدایت کا راستہ بہت مختصر کر دیا- صرف یہی نہیں بلکہ اپنی جدو جہد سے اس پر عمل کرنے کے لیے انہیں مضطر بھی کر دیا اور بہت جلد ان کی زندگی میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ وہ اپنی آبائی وراثت یعنی جنت سے محروم ہو جانے کے بعد پھر اس کے مستحق و مالک بن گئے-

آیاتِ قرآنیہ میں صحابہ کے چند شبہات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات ❋ یہاں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی چند مثالیں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن سے یہ اندازہ کیا جا سکے گا کہ صحابہ کرام کو بھی قرآن فہمی میں شبہات پیش آجاتے تھے اگر کہیں وہ دور نہ کیے جاتے تو نہ معلوم کب تک وہ اسی عالم تردد میں پڑے رہتے-

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَ ھُمْ مُّھْتَدُوْنَ﴾ (الانعام:۸۲) (جو لوگ ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے ایمانوں میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی ہدایت یافتہ ہیں) تو صحابہ کرامؓ گھبرا اُٹھے اور دربارِ رسالت میں عرض کیا - یا رسول اللہؐ ہم میں ایسا شخص کون ہے جس نے ایمان

لانے کے بعد کوئی ظلم اور معصیت نہ کی ہو پس اس آیت کے بموجب تو ہم میں کوئی بھی امن اور ہدایت کا مستحق نہیں رہتا آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے ہر معصیت مراد نہیں ہے بلکہ خاص شرک مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں شرک کو ظلم ہی سے تعبیر فرمایا گیا ہے ﴿اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ (لقمان:۱۳) (شرک بہت بڑا ظلم ہے) یہ جواب سن کر صحابہ کے دل مطمئن ہو گئے اور ان کا تردد جاتا رہا۔

(۲) ایک مرتبہ آپ نے فرمایا قیامت کے دن جس کا بھی حساب لیا گیا سمجھ لو کہ بس وہ ہلاک ہوا۔ اس پر ایک بی بی نے عرض کیا یارسول اللہؐ قرآن تو یہ کہتا ہے ﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا﴾ (الانشقاق:۸) (جس شخص کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہوگا) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہلاک نہ ہوں گے۔ آپ نے فرمایا حساب یسیر کے معنی عرض کے ہیں۔ یعنی اعمال نامہ ان کے سامنے رکھ کر ان کو صرف جتلا دیا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیا ہے مگر اس پر باز پرس نہ ہوگی۔ اس کے سوا اگر کسی سے یہ سوال کر لیا گیا کہ یہ کام کیوں کیا تھا تو بے شک اس کی خیر نہیں۔ (صحیح بخاری) یہ سن کر ان کا شبہ رفع ہو گیا۔

(۳) جب روزہ کے احکام میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷) (کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سیاہ و سفید دھاگہ میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے) تو عدی بن حاتمؓ نے دو دھاگے ایک سفید اور دوسرا سیاہ لے کر اپنے تکیہ میں رکھ لیے اور شب میں ان دھاگوں کو دیکھتے رہے جب دونوں کا رنگ نظر آنے لگا تو انہوں نے کھانا پینا بند کر دیا۔ آپ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا اے عدی تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا معلوم ہوتا ہے جس میں رات اور دن دونوں سما جاتے ہیں یہاں سفید اور سیاہ دھاگے مراد نہیں، شب کی تاریکی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ اس کے بعد مزید توضیح کے لیے آیت میں ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ کا ٹکڑا اور نازل ہو گیا تاکہ پھر اس غلط فہمی کا اعادہ نہ ہو۔

(۴) بعض صحابہ کو آیت ﴿مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ﴾ (النساء: ۱۲۳) (جو شخص کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا۔) میں یہ شبہ ہوا کہ ہر انسان سے کوئی نہ کوئی قصور تو ہوتا ہی ہے لہٰذا اس آیت کے موافق ہر شخص کے لیے عذاب میں گرفتار ہونا ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں بدلہ سے جہنم کا عذاب سمجھنا صحیح نہیں بلکہ ہر وہ تکلیف جو انسان کو دنیا میں پہنچتی ہے وہ بھی اس کی فروگذاشت کا بدلہ بن جاتی ہے۔

ہر چند کہ منکرین حدیث کے سامنے احادیث سے کوئی بات ثابت کرنا بے سود ہے مگر یہاں ہماری غرض احکام کا اثبات نہیں بلکہ صرف تاریخی حیثیت سے یہ بتلانا منظور ہے کہ صحابہ کرام کو بھی اہل زبان ہونے کے باوجود قرآن کریم میں کچھ شبہات پیش آئے ہیں جنہیں اگر وہ براہ راست صاحب رسالتؐ سے حل نہ کرتے تو نہ معلوم ان آیات کی مرادیں سمجھنے میں کتنی الجھنیں پیش آتیں۔ کیا کوئی شخص صرف زبان عربی کی مدد سے یہ متعین کر سکتا ہے کہ سوال اول میں ظلم سے شرک مراد ہے یا سوال نمبر۲ میں حساب یسیر کے معنی اعمالنامہ سامنے رکھ دینے کے ہیں یا سوال نمبر۴ میں جزاء سے دنیوی تکالیف مراد ہیں۔ پہلی آیت عقائد اور دوسری معاد اور تیسری عبادات سے متعلق ہے۔ یہ تینوں باب صرف ایک غلطی کی وجہ سے خدا جانے کتنی تاریکی میں پڑے رہتے۔ مزید براں قرآن فہمی کے بھی اتنے مراتب ہیں کہ بعض مرتبہ چھوٹوں کا ذہن ایسی بات کی طرف منتقل ہو جاتا تھا کہ بڑوں کا ذہن

اس طرف نہ جاتا تھا مثلاً سورۂ ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ﴾ میں ابن عباسؓ کا یہ سمجھنا کہ اس میں آپ کی وفات کی اطلاع دی گئی ہے یا ایک عورت کا حضرت عمرؓ کے زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت کو تسلیم نہ کرنا اور کہنا کہ ﴿وَ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰهُنَّ قِنْطَارًا﴾ (النساء: ۲۰) سے معلوم ہوا کہ اگر مہر زیادہ بھی مقرر کر دیا جائے تو جائز ہے۔ جس قرآن میں نافہمی سے یہ شبہات اور فہم کے یہ مراتب ہوں وہ رسول کے بیان کے بغیر کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ اگر قرآن کی مراد صرف عقول کے حوالہ کر دی جاتی اور رسول آ کر خود اس کو بیان نہ کرتا تو نہ معلوم شریعت کا حال کیا بن جاتا۔

سوال نمبر ۳ سے یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ شبہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ منشاء شبہ خود کتاب اللہ میں بھی موجود ہو بلکہ بعض مرتبہ انسانی دماغ کسی مغالطہ میں پھنس کر از خود کوئی شبہ پیدا کر لیتا ہے پھر اگر یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہو تو قابل رعایت نہیں ہوتا لیکن کسی حد تک معقول ہو تو اس کا جواب بھی دے دیا جاتا ہے شبہ کے ان مراتب کی تشخیص متکلم کی مرضی پر موقوف ہے اسی لیے قرآن کریم نے بہت سے شبہات کا جواب دے دیا ہے اور بہت سے شبہات کو نا قابل جواب سمجھ کر جواب کی طرف توجہ نہیں کی۔

قرآن کریم کے مضامین کے متعلق بعض تشریحی سوالات ❋ یہ تو ان مشکلات کی چند مثالیں تھیں جو صحابہ کرام کو قرآن کی نفس مراد سمجھنے میں پیش آئیں' اب ان مشکلات کی چند مثالیں دیکھئے جو صحابہؓ نے قرآن کی بعض تفصیلات کے متعلق آپ سے دریافت کیں۔

(۱) قرآن کریم کہتا ہے کہ قیامت میں باری تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ صحابہ اہل زبان تھے رؤیت کا مفہوم ان کو معلوم تھا اس لیے رؤیت کے مفہوم میں انہیں کوئی مغالطہ نہیں ہوا انہوں نے اس کی پوری حقیقت سمجھ لی اور معتزلہ کی طرح اس کی کوئی تاویل بھی نہیں کی لیکن جو کچھ دشواری انہیں پیش آئی وہ صرف اس کی تفصیل سمجھنے میں تھی کیونکہ دنیا میں معمولی اجتماع کے وقت کسی ایک شخص کو باطمینان دیکھنا ممکن نہیں ہوتا' پھر قیامت میں جہاں اوّلین و آخرین کا بہت بڑا اجتماع ہوگا ایک خدا کی رؤیت کیسے ہوگی' بظاہر بہت سی گردنیں پھلانگنی پڑیں گی' بہت سے کاندھے چھل جائیں گے اور پھر بھی شاید سب اہل محشر برابر کی رویت سے فیض یاب نہ ہو سکیں۔ یہ تخیلات نہ رویت کے ثبوت کے متعلق ہیں نہ اس کی مراد میں بلکہ پورے وثوق کے بعد ان تفصیلات کے معلوم کرنے میں ہیں جن کے لئے کہ ایک مشتاق متلاشی رہا کرتا ہے۔ آپ نے نہایت سادگی سے فرما دیا کہ مخلوقات کے دائرہ ہی میں آؤ' دیکھو آفتاب اور چاند تمہارے سامنے ہیں' اس کا نور گرم ہے اِس کا سرد' اس کی تمام تر تمازت اور اس کی انتہائی ملاحت کے باوصف جس طرح بلا مزاحمت تم ان دونوں کو دیکھا کرتے ہو اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ اپنے رب کو محشر میں دیکھو گے جب مخلوقات کے دائرہ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک مثال نہیں بلکہ دو مثالیں ایسی موجود ہیں جہاں تمام عالم کو بیک وقت دیدار میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تو خالق کے دائرہ میں بھی جو اس سے کہیں اعلیٰ و ارفع ذات ہے کوئی دشواری نہ ہوگی۔ آپ کی اس مثال کے بعد آیت ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ (القیامۃ: ۲۰'۲۱) اس دن بہت (لوگوں کے) منہ تروتازہ ٹکٹکی لگائے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

(۲) ایک مرتبہ تقدیر کے مسئلہ میں صحابہ کرام کو یہ شبہ ہوا کہ جب ہمارے اعمال پہلے سے طے شدہ لکھے پڑھے جا چکے ہیں تو اب آئندہ عمل کی جدوجہد کرنا بے کار ہے' ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ کیوں نہ رہیں' آپ نے فرمایا اگر تم سعید لکھے جا چکے ہو تو تم سے یہ ہو ہی نہیں

سکتا کہ اعمال صالحہ نہ کرو اور اگر خدا نہ کردہ تقدیر دوسری طرف جا چکی ہے تو اعمال صالحہ کی ہزار کوشش کرو مگر تم کر ہی نہیں سکتے - تم سمجھتے ہو کہ عمل کی جدو جہد کرنا تقدیر سے باہر بات ہے ایسا نہیں بلکہ تقدیر کا وسیع احاطہ جہاں جزا و سزا کو محیط ہے ایسا ہی عمل خیر اور عمل شر کو بھی محیط ہو چکا ہے لہٰذا عمل کیے جاؤ تم سے وہی عمل صادر ہوں گے جو تمہاری تقدیر کے موافق ہیں[1] اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی ○ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ○ وَ اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰی ○ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ○ فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی﴾ (الیل: ۵-۱۰) یعنی نیکی کی توفیق اور بدی سے احتراز سب اللہ تعالیٰ ہی کے تیسیر سے میسر آتا ہے-

(۳) ﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ﴾ (ابراهیم: ٤٨) ﴿وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِیّٰتٌۢ بِیَمِیْنِهٖ﴾ (الزمر: ٦٧) (اس دن جب کہ زمین اپنی حالت سے بدل دی جائے گی اور آسمان دست ایزدی میں لپٹے ہوئے ہوں گے) صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسولؐ جب ایک طرف زمین اپنی موجودہ حالت سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی لپیٹ دیئے جائیں گے، تو اس وقت خدا کی یہ ساری مخلوق کہاں ہوگی؟ فرمایا پل صراط پر-

(۴) سورۂ والنجم میں جب اللہ تعالیٰ کے دیدار کا ذکر آیا تو صحابہؓ نے از راہِ اشتیاق پوچھا یا رسول اللہؐ آپ نے اپنے رب کو دیکھا، کیسا تھا؟ فرمایا ایک نور تھا - عالم قدس کی تعبیر دنیا میں نور کے لفظ سے زیادہ واضح کسی اور لفظ سے ہو ہی نہیں سکتی، اس پر نور کا اطلاق ایسا ہی ہے جیسا وادی ایمن کے نور پر نار کا اطلاق - وہ بھی دراصل ایک نور ہی تھا مگر اس وقت بشکل نار نظر آ رہا تھا-

(۵) صحابہ کرامؓ نے جب یہ بار بار سنا کہ مرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ زندہ ہونا ہے تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ مٹی ہو کر، ریزہ ریزہ ہو کر، پھر نئے سرے سے زندگی کیوں کر ہوگی؟ فرمایا کبھی بارش سے قبل تم نے زمین کی حالت دیکھی ہے کیسی خشک کیسی بے آب و گیاہ نظر آتی ہے پھر بارش کے بعد کتنی سبز کتنی تر و تازہ ہو جاتی ہے وہ تنکے جو ابھی زمین پر مردہ لیٹے ہوئے تھے ایک چھینٹا پڑنے کے بعد ہی کیسے اکڑتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں- ﴿كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ﴾ اسی طرح مرنے کے بعد تم بھی پھر جی اٹھو گے-

(۶) قرآن کریم کی بے شمار آیتوں میں وحی کا لفظ آیا ہے، عرب وحی کے لفظ اور اس کی عام شرح سے تو واقف تھے لیکن وحی رسالت اور وحی نبوت کی تفصیل نہ جانتے تھے اس لیے آپ سے دریافت کیا گیا، یا رسول اللہؐ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ نے اس کی اجمالاً تین صورتیں بتلائیں جو صحیح بخاری کے پہلے ہی صفحہ میں مذکور ہیں - ایک مرتبہ ایک شخص کو اس سے بھی بڑھ کر عین حالتِ وحی میں آپ کو دیکھنے کا شوق دامنگیر ہوا، اس نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا انہوں نے موقع پا کر فرمایا آ دیکھ لے - وہ آیا اور اس نے عین وحی کی حالت میں آپ کو دیکھا اور اس طرح نزول وحی کی شدت جو کبھی وہ پہلے سنا ہی کرتا تھا اب اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر گیا-

(۷) ﴿یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا﴾ (مریم: ۲۸) اس پر بعض اہل کتاب نے صحابہؓ سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہ ہارون علیہ السلام کی بہن کہاں سے آ گئیں حضرت ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کا

---

[1] یہ جواب سن کر سراقہ بن جعشمؓ فرماتے ہیں کہ میں آج سے عمل میں جتنی کوشش ہو سکتی ہے کروں گا - حیرت ہے کہ تقدیر کا مسئلہ سن کر صحابہؓ نے کیا کہا تھا اور آج دنیا کیا کہتی ہے - حضرت عمرؓ سے بھی اسی کے قریب الفاظ منقول ہیں - ۰

زمانہ تو ایک ہی زمانہ ہے اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان بہت بڑی مدت ہے- صحابہؓ سے اس کا جواب نہ آیا' آپ سے دریافت کیا آپ نے فرمایا' یہ بھی کوئی اعتراض ہے ہر قوم اپنے نبیوں کے ناموں پر تبرکاً نام رکھتی چلی آئی ہے' یہاں وہ ہارون نبی مراد نہیں بلکہ ان کے ہمنام اور شخص مراد ہے-

(۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے دریافت کیا آیت قرآنیہ ﴿لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ﴾ میں یہ سبا کسی عورت کا نام ہے یا ملک کا- آخر تمام صحابہ جغرافیہ داں تو نہ تھے امی لوگ تھے' ان کے دماغوں میں یہ سوالات آ جانا کچھ بعید نہ تھا آپ نے فرمایا نہ کسی عورت کا نام ہے نہ ملک کا بلکہ ایک شخص کا نام تھا جس کی طرف عرب کے دس قبائل منسوب ہیں-

(۹) ﴿وَ الَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ (المومنون : ۶۰)

اس پر بعضوں نے دریافت کیا شاید یہ ان لوگوں کا حال ہے جو خدا کی نافرمانی کرتے ہیں اس لیے انہیں عذاب کا ڈر رہو گا- آپ نے فرمایا بلکہ یہ وہ نیک لوگ ہیں جو اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں کہ ان کے یہ اعمال کہیں قیامت کے دن قبول نہ ہوں-

(۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یہ تعویذ' گنڈے اور مختلف قسم کی دوائیں' کیا تقدیر الٰہی پلٹ دے سکتی ہیں فرمایا نہیں بلکہ یہ بھی تقدیر کے احاطہ میں داخل ہیں- جو دوا اثر کرتی ہے اس کے متعلق تقدیری احاطہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہ شخص فلاں دوا کرے گا اور اچھا ہو جائے گا- اس مختصر جواب سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے کہ کونین خود جراثیم ملیریا کے لیے مہلک ہے اس لیے اس کے استعمال سے بخار چلا جانا ضروری امر ہے- ہر جگہ تقدیر کا مسئلہ اڑا دینا جہالت کی بات ہے- اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا فرمانا درست ہے مگر اس مہلک جراثیم کا استعمال کرنا نہ کرنا بھی تقدیر میں پہلے سے لکھا ہوا ہے- اور یہ بھی کہ اس مرتبہ مثلاً وہ جراثیم ہلاک نہ ہوں گے اس لیے بعض مرتبہ بیسیوں گرین کونین استعمال کر لینے کے بعد بھی یہ جراثیم فنا نہیں ہوتے اسباب اور تقدیر میں مزاحمت نہیں اسباب کسی حد تک مؤثر ہیں مگر دائرہ تقدیر سے باہر نہیں-

فروعی مسائل کے متعلق چند سوالات ✻ اس کے بعد ہم یہاں چند مثالیں ایسی بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جو صحابہؓ کے بعض فروعی سوالات سے متعلق ہیں-

(۱) ایک مرتبہ صحابہ کا ایک دستہ جس کا گذران بیشتر سمندر کے شکار پر تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا یا رسول اللہؐ ہم لوگ اکثر سمندر میں سفر کرتے ہیں اور صرف پینے کے لیے تھوڑا سا پانی ہمارے ساتھ ہوتا ہے اگر اس سے وضو کر لیں تو پیاسے رہیں' کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں' آپ نے فرمایا کیوں نہیں' اس کا پانی اور مردار دونوں پاک ہیں- سوال کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کریم میں جس پانی کی صفت طہور بتلائی گئی تھی وہ بارش کا پانی تھا ﴿وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا﴾ (الفرقان: ۴۸) (اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا ہے) کنویں کا پانی بھی دراصل یہی پانی ہوتا ہے جو جذب ہو کر زمین کی تہ میں محفوظ رہتا ہے- سمندر کا پانی دوسرے قسم کا پانی تھا اس کا ذائقہ جدا اس کا رنگ جدا' پھر اس میں بہت سے جانور بھی مرتے کھپتے رہتے ہیں- اس لیے ابتدائی حالات میں یہ سوال بے جا نہ تھا آپ کے جواب سے وہ مطمئن ہو گئے-

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک کنواں بیر بضاعہ کے نام سے مشہور تھا اس کے ذریعہ سے چند کھیتوں کی آبپاشی بھی کی جاتی تھی چونکہ جنگل میں واقع تھا اس لیے جنگل کے کنوؤں کی طرح وہ بھی محفوظ نہ رہتا تھا ہر چند کہ آب پاشی کی وجہ سے اس کا پانی اکثر نکلتا رہتا تھا تاہم نظیف المزاج صحابہ کو یہ سوال کرنا پڑا کہ وہ ایک ایسا کنواں ہے جس میں طرح طرح کی نجاستوں کا جا پڑنا بہت ہی قرین قیاس ہے کیا اس کا پانی وضوء کے قابل ہے آپ نے فرمایا (شبہ مت کرو) جب تک نجاست کا اثر پانی میں نظر نہ آئے (غیر محفوظ) پانی ناپاک نہیں ہوتا - قدرت نے جب پانی کو پاک پیدا کیا ہے تو جب کوئی دلیل ظاہر موجود نہ ہو اس کے ناپاک کہنے کی کوئی وجہ نہیں - اگر محض شبہات کی بنا پر پانی ناپاک کہہ دیا جائے تو عرب جیسی سرزمین پر یہ حکم بڑی تنگی کا موجب بن جائے -

(۳) حضرت ام سلمہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ میں اپنے بال سخت گوندھتی ہوں کیا جنابت سے غسل میں مجھے اپنے بال ہر بار کھولنا چاہیے؟ آپ نے فرمایا نہیں جڑوں میں پانی پہنچا لینا کافی ہے -

(۴) ایک عورت اپنا دامن ذرا لمبا رکھتی تھیں مسجد کا راستہ ناصاف تھا - جب مسجد جاتیں تو دامن زمین پر گھسٹتا اس لیے ان کو وہم ہوا کہ شاید ناپاک ہو جاتا ہوگا - آپ سے عرض حال کیا - آپ نے فرمایا پاک کپڑا زمین پر گھسٹنے سے ناپاک نہیں ہوتا جب تک اس میں ناپاکی کا کوئی اثر نظر نہ آئے -

(۵) ایک مرتبہ گھی میں چوھیا گر گئی اور مر گئی، اس گھی کے متعلق آپ سے دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا اگر گھی جما ہوا ہے تو چوھیا پھینک دو اور اس کے ارد گرد کا گھی بھی پھینک دو بقیہ گھی استعمال کر لو، اور اگر گھی پگھلا ہوا ہے تو اب کھانے کے قابل نہیں رہا -

(۶) آپ سے مردار کی کھال کے متعلق پوچھا گیا کیا اسے استعمال کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں دباغت اسے پاک کر دیتی ہے -

(۷) آپ نے تین تین بار وضو کر کے فرمایا وضو اس طرح کرنا چاہیے اس سے زیادہ پانی بہانا پانی ضائع کرنا ہے -

(۸) ایک بادیہ نشیں شخص نے دریافت کیا ہم چار چار مہینے ریگستان میں رہتے ہیں پانی نہیں ملتا غسل کے موقعہ پر ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا تیمم کر لیا کرو تمہارے لیے یہی پاکی ہے -

(۹) ایک شخص آپ کی خدمت میں نماز کے اوقات دریافت کرنے کے لیے آیا آپ نے فرمایا دو دن ہمارے ساتھ نماز پڑھو' پہلے دن تمام نمازیں اوّل وقت ادا کیں دوسرے دن آخر وقت پھر فرمایا نماز کے اوقات دیکھ لیے یہ ہیں -

(۱۰) ایک سائل نے پوچھا یا رسول اللہؐ دن رات میں وہ گھڑی کون سی ہے جس میں پروردگار اپنے بندوں کے سب سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا آخر شب -

ہم نے مثال کے طور پر یہاں صرف دس دس سوال و جواب ذکر کیے ہیں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ایک سو دس صفحات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے سوال و جواب تحریر فرمائے

ہیں[۱] ان سینکڑوں سوال و جواب کے مرتب اور پرمغز سلسلہ کو جو اسانید ثابتہ کے ساتھ روایت ہوتا چلا آیا ہے یک لخت موضوع کہہ دینا منکرین حدیث کے لیے تو بہت آسان ہے لیکن جنہوں نے ابھی تک انکار حدیث کا فیصلہ نہیں کیا ہے ان کو کم از کم اس پر تو غور کرنا چاہیے کہ اگر بالفرض صحابہ کرام کے دماغوں میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوئے ہوں یا آج جب عمل کے لیے قدم اٹھایا جائے اور یہ سوالات پیدا ہونے لگیں تو کیا ان کے جوابات صرف قرآن اور عقل کی مدد سے دیئے جاسکتے ہیں بالخصوص اس امی قوم سے جس کو ابھی تک استنباط کے طریقوں اور مسائل کے استخراج سے کوئی واسطہ نہ پڑا ہو' اور اگر بالفرض دیئے جاسکتے ہیں تو کیا وہ اتنے ہی مختصر اور حقیقت سے لبریز اور اتنے ہی تشفی بخش ہوں گے جو یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں- میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سوال و جواب کے اس تمام سلسلہ پر انصاف کے ساتھ نظر ڈالتا رہے تو اس کو بہت جلد یقین آ جائے گا کہ یہ جوابات حدیث کی مدد کے بغیر ہرگز براہ راست قرآن سے اخذ نہیں کیے جاسکتے اور اس لیے قدرے مشترک طور پر وہ مجبور ہوگا کہ ان کی اصلیت اور واقعیت تسلیم کر لے- وہ ہرگز یہ ہمت نہیں کر سکتا کہ اس تمام قیمتی اور علمی ذخیرہ کو محض چند شبہات کی بنا پر موضوع کہہ ڈالے- اسی کے ساتھ اس کا بھی اس کو پورا پورا احساس ہوگا کہ کتاب اللہ کی جامعیت اور اس کی صحیح مراد سمجھنے کے لیے یقیناً ایک ایسے معلم کی بھی ضرورت ہے جو اپنی عقل سے نہیں بلکہ خدا سے علم پا کر حسب ضرورت اس کی تفصیل کرتا رہے- کتاب اللہ کے ساتھ اگر کوئی معلم نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے معلم کے ساتھ کتاب نہ ہو- اس لیے کتاب اللہ کا رشتہ رسول سے ہرگز قطع نہیں کیا جاسکتا- اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا- جو رشتہ کہ خدا اور رسول کے مابین ہے وہی کتاب اللہ اور حدیث رسول کے درمیان سمجھنا چاہیے-

اسوۂ رسول اور کتاب اللہ

یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ کتاب اللہ صرف ایک علمی کتاب نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر حل کر لینا ہو اور بس بلکہ یہ افراد و اقوام کا وہ دستور العمل بھی ہے جسے زندگی کے ایک ایک شعبہ میں نافذ کرنا ہے اس لیے رسول کی تعلیم کے بعد بھی ایک اہم ضرورت اور باقی رہتی ہے اور وہ اس کا نقشہ عمل ہے- دنیوی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو عملی مشاق کے بغیر اوّلاً تو سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں بھی آ جائیں تو اس وقت تک صحیح طور پر کیے نہیں جاسکتے جب تک کہ اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو' جیسے ڈاکٹری کا علم یا سائنس کے دوسرے تجربات کہ ان کا علمی طور پر سمجھنا بھی پہلے ان کے عمل کو دیکھنے پھر خود عملی طور پر ان کو کر لینے پر موقوف ہے صرف ان کا پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے قطعاً نا کافی ہے- جب ان معمولی علوم کا حال یہ ہے تو پھر ربانی علوم کی دقتیں اور معاملات و عبادات کی نزاکتیں اپنے انواع و اقسام کے اختلاف کے ساتھ کسی ربانی معلم کی تعلیم اور اس کے کسی صحیح نقشے کے دیکھے ہوئے بغیر کیسے سمجھی جاسکتی ہیں- اس لیے ضروری ہوا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اس کا صحیح صحیح نقشہ عمل بھی بھیجا

---

[۱] دیکھو اعلام الموقعین ج ۱۴ از ص ۲۳۰ تا ۳۴۱-

جائے تاکہ تعلیم رسول کے بعد اس میں جو عملی الجھنیں باقی رہ جائیں وہ اس مکمل نقشہ کو دیکھ دیکھ کر حل کر لی جائیں، مشیت ایزدی نے یہاں معلم کتاب کے ساتھ اس کا نقشہ عمل علیحدہ نہیں بھیجا بلکہ جو معلم تھا خود اسی کو مجسم نقشہ عمل بنا دیا تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (الاحزاب : ۲۱) ہر قوم کے لیے اپنے پیشوا نمونہ ہوتے ہیں تمہارے لیے بہتر نمونہ خدا کا یہ رسول ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول صرف تبلیغ وحی کے لیے نہیں آتے بلکہ عملی طور پر کتاب اللہ کا نمونہ بھی ہوتے ہیں اس لیے ہر عمل میں ان کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔

اسوۂ رسول کی جامعیت ❋ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم تمام کتب سماویہ میں سب سے زیادہ جامع کتاب ہے اس لیے اس کا نقشہ عمل بھی تمام نقشوں میں جامع تر ہونا چاہیے یعنی اگر کتاب اللہ میں روزہ، نماز، حج، زکوۃ کے احکام مذکور ہیں تو اس کی زندگی میں بھی ان عبادات کا مکمل نقشہ ملنا چاہیے اور اگر اس میں امارت و امامت، غزوات و جہاد، نظم و نسق اور فصل خصومات کے ہدایات بھی موجود ہیں تو ان کا نقشہ بھی اس کی زندگی میں نظر آنا چاہیے۔ اگر اس کی حیات میں قرآن کا ایک ہی پہلو ہو، فصل خصومات اور دیگر انتظامی اُمور کا نمونہ نہ ہو تو اس نمونہ کو مکمل نمونہ اور اس نقشہ کو قرآن کریم کا مکمل نقشہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس نمونہ کو جامع اسی وقت کہا جا سکتا ہے جب کہ قرآن کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی تصویر اس کی ساعات زندگی میں نظر آ جائے صرف عبادات و معاملات کی نہیں بلکہ ان فطری حالات کی بھی جہاں شریعت نے کچھ نہ کچھ دخل دے دیا ہے یعنی بول[1] و براز، طعام و شراب، رفتار و گفتار، خندہ و گریہ، نوم و بیداری، حتیٰ کہ انسانی زندگی کے نازک سے نازک حالات کی بھی اگر قرآن کی جامعیت کے لیے ان معمولی گوشوں پر بھی علمی حیثیت سے روشنی ڈالنا ضروری تھا تو اس کے نقشہ عمل کی تکمیل کے لیے ان کی عملی نزاکتوں کا ظاہر کرنا بھی ناگزیر تھا۔ پس اگر قرآن

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض منافقوں نے طعن کے لہجہ میں صحابہؓ سے کہا اچھا صاحب تمہارا رسول تو پاخانہ پھرنے اور پیشاب کرنے کا طریقہ بھی بتلاتا ہے گویا ان نافہموں کے نزدیک انسانی زندگی کے یہ شعبے کسی سماوی ہدایت کے محتاج ہی نہیں تھے حالانکہ سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ جو گوشے زیادہ کمزور ہوتے ہیں وہی زیادہ قابل اصلاح بھی سمجھے جاتے ہیں۔ نافہم انسان صرف ایک گوشہ کی تکمیل کو تکمیل سمجھ لیتا ہے اور ذی فہم جانتا ہے کہ بعض مرتبہ مکان کے غیر اہم گوشوں کی طرف غفلت کرنے سے تمام مکان ہی غیر محفوظ ہو جاتا ہے اگر بول و براز کی نزاکتیں معلوم نہ ہوں تو طہارت کیسے حاصل ہو اور جب طہارت حاصل نہ ہو تو نماز کیا ہو اور جب نماز ہی نہ ہو تو دین کیا رہ جائے۔ تعجب ہے کہ کل جاہلیت کے دور میں جو اعتراض منافقین کی زبانوں سے نکل رہے تھے وہی اعتراضات آج خود مسلمانوں کی زبانوں سے نکل رہے ہیں وہ ان احادیث پر جو انسانی مستور زندگی سے متعلق ہیں وہی اعتراضات کرتے ہیں جو منافقین قضاء حاجت انسانی کی احادیث پر کرتے تھے۔ حالانکہ ان کو اس پر بھی غور کرنا ضروری تھا کہ کیا ان شعبوں پر خود قرآن کریم نے بھی روشنی ڈالی ہے یا نہیں اگر قرآن کریم نے بھی ان کے متعلق کچھ ہدایات نازل فرمائی ہیں تو کیا وہ اس کا بھی تمسخر اڑائیں گے۔ پھر اس پر بھی غور کرنا ضروری تھا کہ نزول قرآن کے وقت عالم انسانی میں ان گوشوں کے متعلق بھی کچھ کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں یا نہیں اگر درحقیقت یہاں بھی افراط و تفریط کا بدتر حال موجود تھا تو کیا ان کی اصلاح فرمانا رسول کا فرضِ منصبی نہ تھا اور کیا ان کے لیے اسوۂ حسنہ میں کوئی صحیح نمونہ نظر نہ آنا چاہیے۔ اس لیے اگر ان گوشوں کی قرآنی ہدایات کا اسوۂ حسنہ بھی آپ کی زندگی میں موجود ہے تو ہونا چاہیے یہاں معترضین کو ان احادیث کا ہونا ناگوار ہے اور طالب حق کو اسوۂ حسنہ کی تکمیل کے پیش نظر ان کا نہ ہونا موجب ملال ہے۔

نے ازدواجی زندگی کی تشریحات کرنا انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھا ہے تو ان نزاکتوں کی باریکیاں بھی اس نقشہ میں صفائی سے نظر آنا چاہئیں چہ جائیکہ باہمی معاملات کے فیصلے امت کے مہمات اور جنگ وصلح کی تدابیر جیسے مسائل- مولانا اسلم صاحب کی یہ بڑی کوتاہ نظری ہے کہ انہوں نے ان جیسے اہم امور کو اسوۂ رسول سے خارج کر دیا ہے- اگر قرآن کریم نے ان معاملات کے متعلق بھی کچھ اصولی ہدایات فرمائی ہیں تو پھر ان کا نمونہ اگر یہاں اسوۂ رسول میں نظر نہیں آتا تو اور کہاں نظر آ سکتا ہے-

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو صرف کسی خاص شعبہ زندگی کا نمونہ نہیں بنایا تھا بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا تھا وہ سب یہاں دکھلا دیا گیا تھا- ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا آپ کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا کہ یہ قرآن ہی آپ کا خلق تھا- خلق میں اقوال اور افعال سب داخل ہیں- مطلب یہ تھا کہ آپ کا کوئی قول کوئی فعل' ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو' گویا اسوۂ رسول کی جامعیت بھی کتاب اللہ کے ہم رنگ تھی- اسی لیے آپ کی ذات کو بلا کسی تفصیل کے تمام عالم کے لیے اسوۂ بنا دیا گیا تھا' ایک طرف خدا کی یہ جامع کتاب موجود تھی- دوسری طرف یہ جامع اسوہ موجود تھا خلاصہ یہ کہ ایک قرآن بشکل مصحف تھا اور دوسرا بشکل اسوۂ رسول' فرق یہ تھا کہ وہ خاموش تھا یہ ناطق' یہاں تیسری چیز احادیث رسول تھیں یہ بھی قرآن ہی کی ایک شکل تھی مگر وہ مجمل تھا یہ مفصل' یہ تینوں قرآن گو بلحاظ اجمال وتفصیل جدا جدا تھے مگر بلحاظ اصل حقیقت یہ ایک ہی قرآن تھا-[1]

---

[1] مولانا اسلم صاحب اسوۂ رسول کو تو تسلیم کرتے ہیں مگر اس کو متواتر فرماتے ہیں- ہمیں علمی لحاظ سے مولانا سے یہ سخت شکوہ ہے کہ وہ حدیث کے لیے پورے پورے ثبوت بھی ناکافی سمجھتے اور انہیں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن جب خود کوئی دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھتے' اگر اسوۂ رسول کے تواتر سے ان کی غرض یہ ہے کہ آپ نے نماز پڑھی تھی اور بس' تو اس کے لیے صرف قرآن ہی کا تواتر کافی ہے لیکن اگر اس سے آگے بھی تفصیل مراد ہے تو ان کو یہ صاف کرنا ضروری تھا کہ کن ارکان میں ان کو تواتر مسلم ہے اور کن میں نہیں- اسی طرح قرآن کے تمام عبادات کی ادائیگی کا نقشہ انہوں نے کیا تیار کیا ہے' آپ کے اسوۂ حسنہ میں آپ کی امامت آپ کا نظم ونسق امت اور فصل قضایا بھی شامل ہیں یا نہیں' اگر ہیں تو صرف بہ حیثیت رسالت یا یہاں کوئی تقسیم ہے اگر ہے تو وہ تقسیم بھی تواتر سے ثابت ہے یا نہیں- بہر حال جتنی بات قرآن سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول تمہارے لیے مطلقاً بلا کسی تخصیص کے اسوۂ اور نمونہ بنایا گیا ہے اور بلا کسی تقسیم کے وہ تمہارا رسول ہے پس جب رسول کی ذات بلا کسی تفصیل کے اسوۂ ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ بھی عملی پہلو میں اس نے کر کے دکھلایا ہے وہ سب مولانا کے نزدیک بھی قرآنی امر کے ماتحت واجب التسلیم ہونا چاہیے اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کی پوری زندگی آپ کا تمام اسوۂ حسنہ حرف بحرف بطریق تواتر منقول ہے یا اس کا ایک حصہ متواتر ہے اور بڑا حصہ غیر متواتر پہلی صورت تو تواتر کے خلاف ہے دنیا میں کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آپ کے عبادات و معاملات کا ہر ہر پہلو تواتر سے ثابت ہے لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ اس کا ایک حصہ متواتر اور دوسرا غیر متواتر ہے بلکہ بڑا حصہ غیر متواتر ہے مثلاً یہ متواتر ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھی یہ بھی متواتر ہے کہ چار پڑھیں' رکوع سجدہ کیے' رکوع پہلے کیا پھر سجدہ' نماز کے آخر میں بیٹھے اور سلام بھی پھیرا- شروع نماز میں ہاتھ اٹھائے اس کے بعد ایک آدھی بات کا اور اضافہ کر لیجیے لیکن صرف ان متواتر امور سے بھی نماز کی پوری ہیئات مکمل نہیں ہوتیں- پھر دین کے اس حصہ کے متعلق مولانا کا فیصلہ کیا ہوگا جو صحابہؓ کے سامنے اسوۂ رسول میں نظر آنے کی وجہ سے قابل قبول تھا اور اب تواتر کے ساتھ منقول نہ ہونے کی وجہ سے قابل تسلیم نہیں رہا- ان جزئیات کے لیے اب تجویز کیا ہے یہ بھی غور طلب ہے کہ نماز میں سہو بھی پیش آ سکتے ہیں اس کی تلافی کی صورت اب کیا ہونا چاہیے- ﷲ .....

اسوۂ رسول اور عرب ✲ جہاں ایک طرف کتاب اللہ کی عملی تشریح کے لیے ایک نمونہ کی ضرورت تھی اسی کے ساتھ عرب کی دماغی حالات کی وجہ سے بھی اسوۂ رسول کی بڑی ضرورت تھی' وہ امی قوم تھی' تمدن اور تعلم کے طریقوں سے بہت دور تھی' اُن کی تفہیم وتربیت کے لئے وہی طریقہ مناسب تھا جو فطری کہا جا سکتا ہے-فطری تعلیم یہی ہے کہ خود عمل کر کے دکھلا دیا جائے' بچہ جب پیدا ہوتا ہے نہ وہ کچھ کہنا جانتا ہے نہ کرنا مگر جتنا وہ ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی اپنے گھر کی زبان' اس کا طور وطریق سب سیکھتا چلا جاتا ہے-حتیٰ کہ ایک انگریز کا بچہ کسی تعلیم کے بغیر ایسی فصیح انگریزی بولنے لگتا ہے جو ایک ہندوستانی کالج میں تعلیم پانے کے بعد بھی نہیں بول سکتا اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ فطری طریقہ پر تعلیم حاصل کرتا ہے وہ اپنے والدین کو بولتا دیکھ کر بولتا ہے اور جس طرح کسی عمل میں مصروف دیکھتا ہے اسی کی نقالی میں خود بھی مصروف ہو جاتا ہے اس لیے اسے اپنی زبان اور اپنے طور وطریق میں کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں پڑتی -اسی طرح صحابہ کرامؓ نے بھی اس مکمل دین کا بڑا حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے سیکھا ہے صرف اعمال نہیں بلکہ اقوال بھی اور صرف اقوال ہی نہیں بلکہ ایک ایک عقیدہ بھی -اسی عملی تربیت وتعلیم کے اثرات تھے کہ تمام دین ان کے رگ وپے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا جیسا طبعی اخلاق انسان میں غیر شعوری طور پر سرایت کیے ہوئے ہیں-اگر یہ وسیع دین صرف زبانی طور پر آج کل کی طرح اسکولوں میں پڑھایا جاتا تو عمریں صرف ہو جاتیں اور اس کا ایک حصہ بھی حاصل نہ ہو پاتا -اُمی اور آزاد دماغ لفظوں کے رٹنے میں اور غیر مانوس طریقوں کے نقشہ بنانے اور جمانے میں اتنا بار محسوس کرتے کہ جس کو زیادہ مدت نبھانا بھی مشکل ہو جاتا اس لیے ان کی دماغی ساخت کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا جس نے اپنے کمالات سے اپنی ذات میں ایسی جاذبیت حاصل کر لی کہ ہر شخص کا منظور نظر بن گیا -اس کے طور وطریق عادات وعبادات دلوں میں اس طرح گھر کر گئے کہ اس نمونہ کے سوا سب نمونے دل سے محو ہو گئے اس لیے دین کے عملی حصہ کے سمجھنے میں کم سے کم الجھنیں پیش آئیں اور اگر پیش آئیں تو ذرا سے اشارہ سے دور ہو گئیں- آج وہی اسوۂ حسنہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں رہا جس کے ساتھ کل تک ہم قرآن کو ملا ملا کر پڑھا کرتے تھے اس لیے قرآن فہمی میں بھی اختلاف آراء پیدا ہو گیا -اگر احادیث کی یہ تفصیلات بھی ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو خدا ہی جانے عقولِ انسانیہ کتاب اللہ کا نقشہ صرف اپنے ذہن سے کیا بنا ڈالتیں-اس لیے جہاں ایک طرف کتاب اللہ کی تعلیم کے لیے رسول بھیجا گیا تھا -اسی کے ساتھ اس کا نقشہ بھی خود اپنی جانب سے مکمل کر کے بھیج دیا گیا تا کہ

ﷺ .....قرآن کریم ضرور قیام کی حالت میں پڑھا جاتا تھا لیکن اگر بھول کر رکوع یا سجدہ میں پڑھ لیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے- بہر حال یہاں عملی طور پر بہت سے عمل کے گوشے ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جس کا حکم ہمیں متواتر طور پر اسوۂ حسنہ میں ملتا-صرف اپنی عقل کے زور سے ان کے جوابات سمجھ میں نہیں آ سکتے -اب ایک راستہ تو یہ ہے کہ جو کچھ اپنی سمجھ میں آ جائے اسی کو قرآنی حکم قرار دے دیا جائے -دوسرا راستہ یہ ہے کہ ان کے جوابات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور اسوۂ حسنہ میں تلاش کیے جائیں اور جو جو حد یقین کو پہنچتے جائیں ان کو بلا پس وپیش مان لیا جائے- یہ راستہ تو مولانا اسلم صاحب اختیار کر نہیں سکتے - ہر بات کی تفصیل قرآن سے ثابت نہیں ہوتی تو اب طفل تسلی کی صورت یہی تحریر فرماتے ہیں کہ صرف اسوۂ رسول متواتر ہے اور وہ عملی تفصیلات کے لیے کافی ہے مگر کیا اس اجمالی حکم سے وہ دین کا تفصیلی نقشہ تیار کر سکتے ہیں اور کیا اس تواتر کی قید کے بعد قرآن کی طرح اسوۂ رسول کی جامعیت کا ثبوت دے سکتے ہیں- حدیث کا انکار کرنا تو آسان ہے مگر اس کا انکار کر کے جو مشکلات سامنے آتی ہیں اس کا حل آسان نہیں-

انسان حتی الوسع خدا کی عبادت کا نقشہ اپنے دماغ سے نہ تراشے اور اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت و سکون میں اسی نقشہ الٰہی کا موبمو اتباع کرتا رہے اور اس مختصر راہ پر چل کر خدائے تعالیٰ کی محبوبیت کے مقام تک بہت جلد پہنچ جائے۔ جس امت کے لیے جد و جہد کی مدت قلیل رکھی گئی ہو اور تقدیر یہ ہو کہ اس کو تمام امتوں پر فائق رکھا جائے اس کے لیے صورت یہی تھی کہ تھوڑے عرصہ میں اس کو بڑی مسافت طے کرادی جائے اگر کتاب اللہ کی فہم' اس کے رموز کی تفصیلات' اس کا عملی نقشہ تمام امت ہی کے عقول کے سپرد کر دیا جاتا تو ایک شخص بھی اپنی تمام عمر صرف کرنے کے بعد یہاں کامیاب نہ ہوسکتا۔

جمیع العلم فی القرآن لکن　　تقاصر عنه افهام الرجال

قرآن کریم کی جامعیت کا اصل مفہوم ٭ مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ واضح ہوگیا کہ قرآن کریم کی جامعیت احادیث کے تسلیم کرنے سے مانع نہیں بلکہ اس کی جامعیت ہی اس کی متقاضی ہے کہ اس کے اصول کی تشریح' اس کے دفعات کی تفصیل اور اس کے اشارات کی تفہیم کی جائے کیونکہ کسی کتاب کے جامع ہونے کا مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام بہ شکل کلیات بیان کردیئے گے ہوں۔ امام شاطبی فرماتے ہیں۔

القرآن علی اختصاره جامع و لا یکون جامعا الا و المجموع فیه امور کلیات[1]

قرآن کریم مختصر ہونے کے باوصف پھر جامع کتاب ہے اور یہ جامعیت اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ اس میں کلیات مذکور ہوں۔

قال محمد و بلغنی ان جوامع الکلم ان الله یجمع الامور الکثیرة التی کانت تکتب فی الکتب قبله فی الامر الواحد او الامرین او نحو ذلک.[2]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جوامع الکلم کی تفسیر مجھے یہ معلوم ہوئی ہے کہ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے پہلی کتابوں میں بہت (سے پھیلاوے کے ساتھ) بیان فرمائی تھیں وہ ایک دو جملوں ہی میں جمع کردے۔

جوامع الکلم کی تفسیر ٭ حافظ ابن قیمؒ جوامع الکلم کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

و جوامع الکلم هی الالفاظ الکلیة العامة المتناولة لافرادها فاذا انضاف ذلک الی بیانه الذی هو اعلی رتب البیان لم یعدل عن الکلمة الجامعة التی فی غایة البیان لما دلت علیه الی لفظ اطول منها و اقل بیانا مع ان الکلمة الجامعة تزیل الوهم و ترفع الشک و تبین المراد.[3]

جوامع الکلم وہ کلی اور عام الفاظ ہیں جو اپنے تمام افراد کو شامل ہوں اور اپنے اختصار کے باوجود پھر اتنے حاوی ہوں کہ جب ان کی زیادہ سے زیادہ تفصیل کی جائے تو یہ تمام تفصیل ان سے باہر نظر نہ آئے پھر اتنے واضح اور عام فہم بھی ہوں کہ اس کی مراد سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہو اور کوئی شک و وہم بھی پیش نہ آئے۔

حافظ ابن قیمؒ کی اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام کی جامعیت اس وقت کمال سمجھی جاتی ہے جب کہ اس میں حسب ذیل

---

[1] الموافقات ج۳ ص۳۶۷۔ [2] بخاری باب المفاتیح فی الید ص۳۸۔ [3] اعلام الموقعین ج۱ ص۲۲۶۔

اوصاف بھی موجود ہوں۔ (۱) وہ اپنے ماتحت انواع وافراد کو اتنا حاوی ہو کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو اس کا کوئی فرد اس سے باہر باقی نہ رہے۔ اسی کے ساتھ وہ ان افراد کے حکم پر بھی دلالت کرے جو اس کے الفاظ کی قید سے خارج ہو گئے ہیں۔ گویا کلام کی جامعیت اس وقت کمال سمجھی جائے گی جب کہ اس کے الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ اس میں موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں کے حکم پر دلالت ہو جیسا کہ حافظ ابن قیمؒ نے اسی کتاب میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔

(الکلمة الجامعة) و ھی قاعدة عامة و قفیة کلیة تجمع انواعا و افرادًا او تدل دلالتین دلالة طردود لا لة عکس[1]

وہ ایک ایسا عام قاعدہ اور کلی جملہ ہوتا ہے جو بہت سے انواع و افراد کو شامل ہو اور اپنے افراد کے لیے موافق اور دوسرے افراد کے لیے اس کے مخالف احکام پر دلالت بھی کرے۔

جیسے "کل مسکر حرام" یہ حدیث جوامع الکلم میں شمار ہے اس میں دونوں دلالتیں موجود ہیں یعنی جتنی نشہ آور چیزیں ہیں خواہ وہ کتنی ہی مختلف انواع و اصناف کی ہوں سب اس ایک حدیث کے ماتحت حرام ہیں اور اسی کلام کی دوسری دلالت یہ ہے کہ جو چیزیں نشہ آور نہیں وہ اسی حدیث کی رو سے سب جائز ہیں۔ پس یہ ایک ہی حدیث ایک پہلو سے مسکرات کا حکم اور دوسرے پہلو سے غیر مسکرات کا حکم بتلانے کے لیے کافی ہے۔

(۲) جوامع الکلم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی ایسی تنگی بھی نہ ہو کہ مراد کے خلاف کچھ اور وہم پیدا ہونے لگے۔ وہ کلام خواہ کتنا ہی جامع کیوں نہ ہو مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا جس میں خود متکلم کی مراد کے خلاف اوہام پیدا ہو جائیں۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ اتنے مبہم بھی نہ ہوں کہ جو مراد ان کی بتلائی جائے وہ ان سے ظاہر نہ ہو جامعیت کا کمال یہ ہے کہ پورے اختصار کے باوجود پھر اس کے الفاظ اتنے صاف ہوں کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو ہر ہر تفصیل پر وہ ایسا ہی صادق نظر آئیں گویا اسی کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ ان اوصافِ ثلاثہ کے لحاظ کرنے کے بعد جب آپ کسی اونچے سے اونچے مصنف کا کلام ملاحظہ فرمائیں گے تو ہر مصنف کے کلام میں دو خامیوں میں سے ایک خامی ضرور دیکھیں گے۔ اگر وہ شان جامعیت میں ممتاز ہوگا تو اس میں اغلاق و ابہام کا عیب ضرور نظر آئے گا اور اگر واضح اور صاف ہوگا تو اس میں شان جامعیت مفقود ہوگی' ان دو متضاد صفتوں کا اجتماع یا آپ آیاتِ قرآنیہ میں دیکھیں گے یا بعض احادیث نبویہ میں یہ شانِ جامعیت بھی درحقیقت اعجاز کا ایک شعبہ ہے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو انبیاء ورسل کی صف میں اپنی ایک خصوصیت شمار کیا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جس رسول کو تمام عالم انسانی کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا تھا۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے کلام میں بھی اس کی بعثت کی وسعت کے بقدر جامعیت اور وسعت مرحمت کی جاتی تا کہ ہر زمانہ میں ہر قسم کے انسان اپنی ہر قسم کی ضرورت ان جامع اور مختصر الفاظ سے حل کر سکتے۔ اس جامعیت کے بھی مراتب ہیں ہر رسول کے کلام میں اپنے دائرہ بعثت کی وسعت کے بقدر ایک قسم کی جامعیت ہونا ضروری ہے اس لیے جس رسول کی بعثت سب سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اس کے کلام کی جامعیت بھی

---

[1] اعلام الموقعین ج اص ۲۸۹۔

سب سے زیادہ ہونا چاہیے۔مختصر الفاظ میں جوامع الکلم ٹھیک کوزے میں دریا کی مثال ہوتے ہیں اسی کا دوسرا نام سہل ممتنع بھی ہے۔

حافظ ابن قیمؒ کی اس تقریر سے اب آپ قرآن کی جامعیت کا مفہوم بھی سمجھ سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اس کے بعد اب تفصیل وتشریح میں جانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی معلم ومفسر کی حاجت نہیں ہوتی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خدا شناسی اور آدابِ عبدیت کے تمام اصولوں پر حاوی ہے جیسا کہ جہاں بانی کے ایک ایک نکتہ ایک ایک شوشہ کے لیے مکمل آئین ہے ایک چوبِ خشک اس پر عمل کر کے عارف کامل ہو سکتا ہے اور ایک فقیر بے نوا اس کے اتباع کی بدولت تاجِ شاہانہ پہن سکتا ہے۔ پھر شاہی اور گدائی کے یہ عمیق اور دقیق اصول اس نے ایسے جامع اور سادے الفاظ میں قائم کیے ہیں کہ دنیا کے مختلف زمانوں کی مختلف ضروریات میں سے کبھی کوئی ضرورت ایسی پیش نہیں آسکتی جس کے متعلق قرآن کریم کے ان الفاظ میں پوری روشنی نہ ملے۔ پھر اتنی جامعیت کے ساتھ اس کی سطح ایسی صاف نظر آتی ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے علم کا شخص بھی ان کی گہرائی سمجھنے کا گھمنڈ کر لیتا ہے' اس کی اسی شان سہل ممتنع کی وجہ سے ایک جاہل اور ایک عالم ایک فقیر اور ایک بادشاہ اس سے برابر کا فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔قلیل العلم شخص خوش ہو جاتا ہے کہ اس نے اس کی تہ کو پا لیا اور نہیں جانتا کہ یہ قرآن کی شانِ جامعیت کا کرشمہ تھا' یہاں ہر شخص اپنی اپنی پیاس اور اپنے اپنے ظرف کے بقدر سیراب ہو جاتا ہے لیکن اس بحر ناپیدا کنار میں پانی کتنا ہے اس کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔ آخر یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ یہ کلام کس کا ہے اگر کسی بڑے شاعر یا کسی بڑے عالم کے کلام میں اس کی سطح کے علاوہ اس کا کچھ عمق بھی ہوتا ہے تو یہاں خالق کے کلام میں اس کی تلاش کیوں نہیں ہوتی۔ اسی لیے حدیث میں ارشاد ہے لکل اية ظهر و بطن ہر آیت کی ایک مراد اس کے ظاہر سے ہاتھ لگ جاتی ہے دوسری مراد اس کے عمق اور گہرائی میں جانے سے نصیب ہوتی ہے۔ اگر کوئی بدنصیب یہاں صرف اس کے ایک ہی حصہ پر قناعت کر کے بیٹھ رہے تو یہ اس کا نصیب۔ اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ جس کلام کا متکلم ایسی ذات پاک ہو جس کے علم کی کوئی نہایت نہیں' تمام عالم کے علوم اس کے بحر علم کا ایک قطرہ بھی نہ ہوں اس کے کلام میں کتنی گہرائی اور کتنی بلندی ہو سکتی ہے۔ کیا ہر شخص ان ساری گہرائیوں اور تمام بلندیوں کو حاصل کر لینے کا دعویٰ کر سکتا ہے یا اسے کرنا چاہیے۔ پھر جتنا حصہ اس کو حاصل ہو گیا ہے کیا اس کے متعلق اسے وثوق کے ساتھ یہ گمان کر لینا چاہیے کہ اس نے متکلم کی پوری پوری مراد کو پا لیا ہے۔ حافظ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں۔

ان دلالة النصوص نوعان حقيقية و اضافية فالحقيقية تابعة لقصد المتكلم و ارادته و هذه الدلالة لا تختلف و الا ضافية تابعة لفهم السامع و ادراكه و جودة فكره و قريحته و صفاء ذهنه و معرفته بالالفاظ و مراتبها و هذه الدلالة تختلف اختلافامتباينا بحسب تباين السامعين في

نصوص کی دلالت دو قسم کی ہے حقیقی' اضافی۔ حقیقی دلالت تو متکلم کے قصد اور اس کے ارادہ کے تابع ہوتی ہے۔ اس دلالت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا اضافی دلالت فہم سامع اس کی جودتِ فکر' صفائی ذہن' الفاظ اور اس کے مراتب کے شناسائی پر موقوف ہے اس دلالت کے اتنے ہی مختلف مراتب ہیں جتنا کہ ان اوصاف میں سامعین کے مراتب

ذلک[1] مختلف ہیں۔

پس جو دلالت کہ حقیقی ہے وہ تو یہاں متکلم کے ارادہ کے تابع ہے اس کو یقینی طور پر اس وقت تک کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے جب تک کہ خود متکلم ہی اس کو نہ بتلائے، رہ گئی دوسری قسم تو اس کے اتنے لاتعد و لاتحصٰی مراتب ہیں کہ کوئی شخص یہاں یہ دعویٰ کر ہی نہیں سکتا کہ کلام کی جو مراد اس نے سمجھ لی ہے اس کے بعد اب اس میں آئندہ کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، اگر یہ ابہام نصوصِ کتاب میں بھی باقی رہے تو جزم کے ساتھ کوئی بھی یہ نہ کہہ سکے کہ کتاب اللہ پر اس نے عمل کر لیا ہے اس لیے یہاں مراد متکلم بتلانے کے لیے خود متکلم کی جانب سے ایک معلم مقرر کر دیا گیا ہے اس نے اس کی جامعیت کے پیش نظر وہ حدود بیان کر دی ہیں جہاں تک ان کا احاطہ پھیلتا ہے اب آپ آیت ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ (البقرۃ: ۲۲۲) پر غور کیجئے، پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ یہاں حائضہ عورت سے اعتزال کے کتنے مراتب ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ صرف اپنی عقل سے انہیں متعین کرنا چاہیں تو کیا متعین کر سکتے ہیں، ہاں احادیث رسول کی روشنی میں آپ ان پر بآسانی بحث کر سکتے ہیں اور بسہولت وہ حدود بتا سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی شانِ جامعیت احادیثِ نبویہ کی تشریحات سے ہرگز بے نیاز نہیں کرتی، بلکہ ان کے بغیر پورا نقشہ ہی ذہن میں نہیں آ سکتا۔ جب ایک انسان حلال و حرام کے تفصیلی ابواب، اصولِ عقائد کی وضاحت، تمدن اور معیشت کے مفصل طریقے احادیث میں پھیلے ہوئے دیکھ لیتا ہے اور اس ضمن میں ایسی ایسی تفصیلات پر مطلع ہوتا جاتا ہے جدھر اس کا ذہن بھی نہ جا سکتا تھا۔ پھر ان تمام تفصیلات کو جب کسی ایک آیت کے تحت میں درج پا لیتا ہے تو قرآن کی جامعیت پر جو وثوق اس کو اس تفصیلی سیر کے بعد حاصل ہوتا ہے وہ اس کے بغیر ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا پس احادیث نبویہ قرآن کی جامعیت کا بہت بڑا ثبوت ہیں نہ کہ اس کے مخالف۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قرآن کی جامعیت ✻ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گنوار شخص زناء کا ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے لڑکے نے زناء کر لیا ہے میں نے اس کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ اسے رجم کرنا چاہیے، میں نے اس کے عوض میں سو بکریاں اور ایک باندی ادا کر دی ہے پھر کچھ لوگوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اس کے لیے سو کوڑے اور سال بھر جلاء وطنی کی سزا ہے آپ نے یہ سن کر فرمایا "**لا قضين بينكما بكتاب الله**" (میں کتاب اللہ کے مطابق تمہارا فیصلہ کروں گا) تیری باندی اور بکریاں تو واپس ہیں اور لڑکے پر سو کوڑے اور سال بھر کے لیے جلاء وطنی کی سزا اور انیس تم اس عورت کے پاس جاؤ جس سے یہ زناء کا دعویٰ کرتا ہے اگر وہ اقرار کر لے تو اسے رجم کر دو۔ انیس گئے اس نے اقرار کر لیا اور رجم کر دی گئی۔ اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم کتاب اللہ کے موافق فیصلہ قرار دیا ہے حالانکہ کتاب اللہ میں رجم اور جلاء وطنی کہیں مذکور نہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی کتاب اللہ کی جامعیت کا مفہوم کتنا وسیع تھا۔

صحابہؓ کے دور میں قرآن کی جامعیت ✻ یہ بات سمجھنے کے لیے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں بھی قرآن کی جامعیت ہمیشہ بلحاظ

---

[1] اعلام الموقعین ج ا ص ۳۰۵۔

اصول ہی سمجھی گئی ہے ذیل کے چند واقعات کو پیش نظر رکھنا چاہیے-

(۱) قبیلہ بنی اسد کی ایک عورت نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا میں نے سنا ہے آپ ان عورتوں پر لعنت کرتے ہیں جو جسم گودنے کا پیشہ کرتی ہیں یا خود گدواتی ہیں- انہوں نے فرمایا جی ہاں' جس پر خدا نے لعنت کی ہو اور جو خود قرآن میں بھی مذکور ہو میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں' اس نے عرض کیا قرآن تو میں بھی پڑھتی ہوں مگر میں نے تو قرآن میں یہ کہیں نہیں دیکھا- آپ نے فرمایا اگر تو قرآن سمجھ کر پڑھتی تو یقیناً اس میں دیکھ لیتی کیا قرآن میں یہ نہیں ہے-

مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا. (الحشر : ۷) رسول جو تمہیں دے اسے قبول کرو اور جس بات سے روکے اس سے رک جاؤ-[۱]

اس اجمالی حکم کے ماتحت یہ سب جزئیات درج ہیں' اس نے ایک اجمالی قانون بتلا دیا ہے- ان تمام فروعات کو اس کے

---

[۱] مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کو یہاں عجیب شبہ گذرا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''ما اتاکم'' کی آیت مالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہے حدیث سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے یہاں ''آتا'' کے لفظ کو جو ''نہی'' کے بالمقابل واقع ہے لوگوں نے غلط فہمی سے امر یا قال کے معنی میں سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سینکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا بلکہ ہر جگہ اس کے معنی دینے ہی کے ہیں لہذا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیثیں اقوال ہیں ان کے لیے دینے کا لفظ نہیں کہا سکتا' رسول اللہؐ نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے- انتہٰی -

مولانا کو چونکہ قرآن کی جامعیت کا علم ہی نہیں اس لیے یہاں بھی انہوں نے آیت بالا کو صرف مالِ غنیمت سے خاص کر ڈالا ہے- قائلین حدیث کے نزدیک آیت بالا اپنی شانِ جامعیت کی وجہ سے صرف مال کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ان ساری ہدایات کو بھی شامل ہے جو آپ نے اپنی امت کو دی ہیں' یہ تحقیق بھی عجیب ہے کہ حدیث کے متعلق تو دینے کا لفظ مستعمل نہیں ہو سکتا مگر قرآن کے متعلق ہو سکتا ہے اس پر یہ کہنا کہ ''حدیثیں چونکہ اقوال ہیں اس لیے ان کے لیے دینے کا لفظ نہیں کہا جا سکتا'' اور بھی مضحکہ خیز ہے کیا قرآن اقوال ہی کا مجموعہ نہیں پھر اگر اقوال کے اس مجموعہ کو دیا جا سکتا ہے تو حدیث کے دوسرے مجموعہ کو کیوں نہیں دیا جا سکتا ہمارے نزدیک دونوں وحی ہیں صرف متلو اور غیر متلو ہونے کا فرق ہے- یہاں آیت بالا کے سمجھنے میں ہمیں تو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی البتہ مولانا کو یہ غلط فہمی ضرور ہوئی کہ انہوں نے قرآن کریم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ایک جلد بندھا بندھایا تصور کر لیا ہے جو شاید تورات کی طرح دے دیا گیا تھا اگر ایسا نہیں ہے بلکہ اس کی متفرق آیتیں نازل ہوتی تھیں اور انہیں آپ صحابہؓ کے سامنے پڑھ کر ہی سناتے تھے- اس کے باوجود لفظ آتا اس پر بولا جا سکتا تھا تو اگر دوسرے وقت آپ اسی زبان اسی دہن مبارک سے کچھ احادیث ارشاد فرما دیتے ہوں اس پر بھی لفظ آتا کیوں نہیں بولا جا سکتا- مولانا کی قرآن دانی کی یہ انتہا ہے کہ انہیں سینکڑوں جگہ میں ایسی کوئی آیت نظر نہیں آئی جہاں یہ لفظ ایسے معنی میں مستعمل ہو جو حدیث پر بھی بولے جا سکیں- قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ﴾ (اللہ تعالیٰ درجات بلند کرتا ہے مومنین کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا ہے) اگر علم کے لیے یہ لفظ مستعمل ہو سکتا ہے تو کیا حدیث ایک علم ہی نہیں- دوسری جگہ فرمایا و اتیناہ الحکم- و اتیناہ من لدنا علما- اتینا لقمان الحکمۃ اتانی الکتاب و جعلنی نبیا- و اتاکم ما لم یوت احد امن العالمین اتیناہ الحکم و فصل الخطاب. ان آیات میں ''آتـــا'' کا لفظ کتاب کے لیے' علم کے لیے' حکمت کے لیے' حکم اور نبوت کے لیے فضائل و کمالات کے لیے اور آخری آیت میں ''فصل الخطاب'' یعنی اقوال کے لیے بھی مستعمل ہوا ہے اس لیے مولانا کا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے- یہ چند سطور ہی مولانا کے دعویٰ کی تردید کے لیے کافی [illegible]س لیے اس مختصر حاشیہ پر ہی کفایت کی جاتی ہے-

پیچے سمجھو- آپ نے دیکھا کہ حدیث کے تسلیم کر لینے سے قرآن کی جامعیت کہاں سے کہاں پہنچ گئی- اگر ہم اس سے قطع نظر کر لیں تو کیا اس کی یہ جامعیت ثابت ہو سکتی تھی-

(۲) حضرت عبدالرحمٰن بن یزید نے ایک محرم شخص کو سلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو اس کو منع فرمایا- اس نے کہا قرآن میں کہاں ہے دکھلایئے' انہوں نے یہی آیت تلاوت فرمادی ﴿مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ رسول جو دے دے وہ لے لو اور جس بات سے روک دے رک جاؤ [1]

(۳) حکم بن ابان نے عکرمہ سے ام ولد کا حکم دریافت کیا انہوں نے فرمایا وہ آزاد ہے' میں نے پوچھا کس دلیل سے؟ کہا قرآن سے' میں نے کہا کس آیت سے؟ کہا ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:٥٩) (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولوالامر کی) حضرت عمرؓ ام ولد کو آزاد فرماتے تھے چونکہ وہ بھی اولوالامر اور حاکم تھے اور حاکم کی اطاعت کرنا قرآنی حکم ہے اس لیے ان کا منع کرنا بھی قرآنی حکم ہے-

ان آثار سے ثابت ہے کہ صحابہؓ کے نزدیک قرآن کی جامعیت اصول ہی کے اعتبار سے تھی اسی لیے جب کسی تفصیلی حدیث کے متعلق ان سے سوال ہوتا تو وہ قرآن کی کسی اجمالی آیت پر حوالہ کر دیتے اور اس تفصیل کو اس اجمال کے تحت میں قرار دیتے-

ائمہ کے نزدیک قرآن کی جامعیت ٭ ائمہ کے طبقہ میں امام بخاریؒ نے اپنی تصنیف الجامع الصحیح المسند میں جہاں احادیث صحیحہ کو جمع کیا ہے اس کے ساتھ اور بھی بہت فوائد اور نوادر کی طرف اشارات فرمائے ہیں انہوں نے فقہ کا بے شمار ذخیرہ تراجم میں پھیلایا ہے پھر اس کے مناسب آثار صحابہؓ اور احادیث مرفوعہ پیش کی ہیں تاکہ حدیث اور فقہ کا ربط ظاہر ہو جائے پھر ہر باب میں ان احکام کے مناسب قرآنی آیات تلاوت کی ہیں تاکہ فقہ کے تمام ابواب قرآن کریم میں اجمالاً نظر آجائیں اور ان کے مناسب احادیث دیکھ کر قرآن کی جامعیت کا پورا مشاہدہ ہو جائے' اسی کے ساتھ حدیث اور قرآن کا ربط بھی معلوم ہو جائے اور اس طرح ایک ہی تصنیف منکرین فقہ اور منکرین حدیث دونوں کا جواب بن جائے- فقہ کو برا بھلا کہنے والے احادیث سے مسائل کے استنباط کا طریقہ سیکھ لیں' اور حدیث کو قرآن کے خلاف کہنے والے قرآن میں احادیث کے مآخذ معلوم کر لیں- حافظ ابن حزمؒ ظاہری ہو کر لکھتے ہیں-

كل ابواب الفقه ليس منها باب الاوله اصل فى القرآن نعلم و الحمدلله حاشا القراض فما وجدنا له اصلا فيهما البتة.
(الموافقات ج ٣ ص ٣٧١)

فقہ کے تمام ابواب میں کوئی باب بھی ایسا نہیں جس کی اصل قرآن وسنت میں موجود نہ ہو' خدا کا شکر ہے کہ ہم اس اصل کو خود بھی جانتے ہیں ہاں ایک قراض [2] کا باب ایسا ہے جس کی اصل ہمیں کتاب وسنت دونوں میں نہیں ملی-

---

[1] حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن یزید کے ان دونوں بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت ﴿ما اتاکم... الخ﴾ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بھی شامل ہے اس کا تعلق صرف مال دینے اور اس کے قبول کرنے سے نہیں ہے جیسا کہ مولوی اسلم صاحب سمجھے ہیں بلکہ مال اور ہدایت دونوں کو شامل ہے- [2] حافظ ابن قیمؒ اور امام شاطبیؒ نے اس کی اصل بھی ثابت کی ہے دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۴۱- اور الموافقات ج ۳ ص ۳۷۱-

ظاہری فرقہ حالانکہ قیاس کا منکر ہے مگر وہ بھی اس کا اقرار کرتا ہے کہ تمام ابواب فقہیہ کے اصول قرآن میں مذکور ہیں' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ کے طبقہ میں بھی قرآن کی جامعیت اصول ہی کے لحاظ سے مسلم تھی۔ امام شاطبیؒ فرماتے ہیں۔

تعریف القران بالاحکام الشرعیة اکثره کلی لا جزئی و حیث جاء جزئیاً فاخذه علی الکلیة[1]	قرآن کریم نے احکام شرعیہ اکثر کلی طور پر بتلائے ہیں اور جہاں جزئی طور پر کوئی حکم بتلایا بھی ہے وہ کسی حکم کلی کے ماتحت ہے۔
القرآن فیه بیان کل شی...... فالعالم به علی التحقیق عالم بجملة الشریعة و لا یعوزه منها شیء.[2]	قرآن کریم میں ہر چیز کا بیان ہے۔ اس کا جاننے والا اجمالاً تمام شریعت کا جاننے والا ہے اس طرح پر کہ اس کا کوئی حکم اس سے باقی نہیں چھوٹتا۔

پھر جلد رابع میں لکھتے ہیں۔

لیس فی السنة الا و اصله فی القرآن.	حدیث میں کوئی حکم ایسا نہیں جس کی اصل قرآن میں نہ ہو۔

ان نقول سے ظاہر ہے کہ قائلین حدیث بھی جامعیت قرآن کے معترف ہیں مگر ان کے نزدیک اس کی جامعیت صرف بلحاظ اصول ہے۔ قرآن کی اسی شان جامعیت پر نظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا حسبنا کتاب اللّٰه ۔ اگر اس کا مطلب وہ ہوتا جو منکرین حدیث سمجھے ہیں تو وہ احادیث جمع کرنے کے لیے مجلس مشاورت طلب نہ کرتے جس کی تفصیل آئندہ آ رہی ہے' اپنے وعظوں میں یہ اعلان نہ کرتے ردوا الجهالات الی السنة[3] اور یہ ارشاد بھی نہ فرماتے تعلموا الفرائض و السنة کما تتعلمون القران[4] اپنے دین کے فرائض اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اسی طرح ذوق وشوق سے سیکھو جیسا قرآن سیکھتے ہو۔ جو لوگ کسی کلام کی مراد اپنے زاویہ نظر سے سمجھنے کے عادی ہو جاتے ہیں انہیں بلاوجہ ہر جگہ تعارض نظر آتا ہے۔ منکرین حدیث کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تمام احادیث میں سے صرف یہی ایک حدیث صحیح نظر آئی ہے اور اس ایک حدیث کی بنا پر وہ ان کی اس قسم کی تمام احادیث پر موضوع ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر بے دلیل موضوع کہنا بھی کوئی صحیح طریقہ کہا جا سکتا ہے تو ان احادیث کے مقابلہ میں ایک ''حسبنا کتاب اللّٰه'' کی حدیث کو موضوع کیوں نہ کہا جائے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی تعارض نہیں ہے تعارض صرف اس لیے پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے کلام کی مراد ہی غلط سمجھی گئی ہے صحیح مراد وہ ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

قرآن کی تفسیر و بیان صرف رسول کا منصب ہوتا ہے ٭

وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الذِّکۡرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیۡهِمۡ. (النحل : ٤٤)	ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اسے خوب واضح کر دیں۔

---

[1] الموافقات ج۳ص۳۶۶۔ [2] ایضاً ج۳ص۳۶۹۔ [3] جامع بیان العلم ج۲ص۱۸۷۔ [4] ایضاً ج۲ص۱۲۳۔

آیت بالا میں لفظ ''للناس'' سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اگرچہ خود بیان سہی لیکن ہر شخص اس بیان کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس قصور کی وجہ سے اس بیان کو اور واضح کرنے کے لیے رسول بھیجا جاتا ہے پس یہ احتیاج قرآن کے قصور بیان کی وجہ سے نہیں بلکہ لوگوں کے قصورِ فہم کی وجہ سے ہے۔ یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ جو کلام جس قدر بلند پایہ ہوتا ہے اسی قدر شرح کا زیادہ محتاج ہوتا ہے دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا کی کتاب کی مراد بیان کرنا صرف رسول کا منصب ہے بلکہ اس کی بعثت کی یہ ایک بڑی غایت وغرض ہے۔

عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے فرمایا تو احمق ہے کیا قرآن میں کہیں ظہر کی چار رکعتیں اور ان میں جہر نہ ہونا مذکور ہے اس کے بعد فرمایا:

ان کتاب اللہ ابھم ھذا و ان السنۃ تفسر ذلک.[1] — کتاب اللہ نے اس کو مبہم رکھا پھر سنت رسول نے اس کی تفسیر کر دی۔

مطرف بن شخیر سے ایک شخص نے کہا آپ ہمارے سامنے قرآن کے سوا کچھ اور مت بیان کیجئے انہوں نے فرمایا۔

و اللہ ما نرید بالقران بدلا و لکن نرید من ھوا علم بالقران.[2] — خدا کی قسم ہے کہ قرآن کی بجائے ہم بھی کوئی اور کتاب نہیں چاہتے لیکن ہم اس سے کیسے قطع نظر کر سکتے ہیں جو قرآن کا سب سے زیادہ جاننے والا تھا۔

قرآن وحدیث کا ربط ✻ عمران بن حصینؓ کے بیان سے قرآن وحدیث کا ربط بھی معلوم ہو گیا کاش اگر منکرین حدیث اس ربط کو پا لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن کو تسلیم کر کے حدیث کا انکار ممکن نہیں اور حدیث کا انکار کر کے قرآن کو ماننے کی کوئی صورت نہیں' یہاں ان دونوں میں متن وشرح کی نسبت ہے پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا اقرار وانکار دوسرے کا اقرار وانکار بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن کی طرح اس کا بیان بھی خدا ہی کی طرف سے ہے گو ماتن ہی خود شارح بنا ہوا ہے اس لیے ایسی شرح کو متن سے جدا نہیں کیا جا سکتا نہ ایسے بیان کو اصل کتاب سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض وواجب کے مراتب کا اختلاف ✻ اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ قرآن وحدیث کا مرتبہ ایک ہی رہتا مگر یہاں نوعیت ثبوت کے فرق سے حکم میں تفاوت پیدا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے ثبوت کی جو نوعیت ہے وہ حدیث کے ثبوت کی نہیں اس لیے حدیث کا رتبہ قرآن سے کمتر سمجھا گیا ہے' امام شاطبی نے اس پر مستقل ایک فصل قائم کی ہے۔

رتبۃ السنۃ التاخر عن الکتاب فی الاعتبار.[3] — سنت کا مرتبہ قرآن کریم کے بعد میں ہے۔

اس کے ذیل میں وہ ایک بڑی حقیقت پر تنبیہ فرما گئے ہیں اور وہ یہ کہ جب حکم شریعت یکساں ہے تو پھر احکام فقہ میں فرض

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱۔ [2] الموافقات ج ۴ ص ۲۶۔ [3] الموافقات ج ۴ ص ۷۔

اور واجب کا اختلاف کیسے ہو گیا - سنت' استحباب' اباحت وغیرہ کے مراتب تو اور ائمہ کے فقہ میں بھی موجود ہیں لیکن واجب کی اصطلاح صرف فقہ حنفی میں ملتی ہے اسی لیے کتب اصول میں مرتبہ واجب کے اثبات میں بڑی بحث کی گئی ہے- امام شاطبی اس عنوان کے ذیل میں اس کے متعلق بھی ایک مفید بات تحریر فرما گئے ہیں-

و ما فرق به الحنفية بين الفرض و الواجب راجع الى تقدم اعتبار الكتاب على السنة و ان اعتبار الكتاب اقوى من اعتبار السنة. و قد لا يخالف غيرهم فى معنى تلك التفرقة و المقطوع به فى المسئلة ان السنة ليست كالكتاب فى مراتب الا عتبار[1]

حنفیہ نے واجب اور فرض کا جو فرق کیا ہے وہ اسی بات پر مبنی ہے کہ قرآن کو حدیث پر ترجیح ہے اور اس بات پر کہ قرآن کریم کا اعتبار سنت سے قوی تر ہے اتنی بات میں دوسروں کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے- اجمالی طور پر یہ بات یقینی ہے کہ مراتب اعتبار میں حدیث قرآن کے برابر نہیں ہو سکتی-

امام شاطبیؒ کے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ جب دلیل میں کسی وجہ سے ظنیت پیدا ہو جاتی ہے تو حنفیہ اس فرق کو ظاہر کرنے کے لیے اسے قطعی کے برابر نہیں کرتے - ارکان و فرائض شیٔ کی ماہیت ہوتے ہیں پس جو ماہیت قطعی ہو اس کے اجزاء ظنی کیسے ہو سکتے ہیں مثلاً نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' یہ سب آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہیں- لہٰذا جو ان عبادات کے اجزاء اور ارکان ہوں وہ بھی اسی درجہ قطعی دلیل سے ثابت ہونے چاہئیں جیسے قیام' سجدہ' رکوع قراءت یہ تمام ارکان قرآن سے ثابت ہیں اس کے برخلاف تعدیل ارکان' قعدۂ اولیٰ اور خاص سلام کا لفظ قرآن سے ثابت نہیں بلکہ ان احادیث سے ثابت ہیں جو ثبوت میں قرآن سے کمتر ہیں اس لیے حنفیہ نے ان دونوں قسموں کے حکم میں فرق کرنے کے لیے ایک قسم کو فرض اور دوسری کو واجب کہہ دیا ہے- دلائل کے قوت و ضعف کے اعتبار سے احکام میں مراتب کا تفاوت قرار دینا بالکل معقول بات ہے- حنفیہ کے کتب اصول میں اس فرق کی پوری توضیح و تقریر کی گئی ہے ہمارے نزدیک فرض اور واجب کا فرق صرف اس حقیقت پر مبنی نہیں اگر چہ یہ بات اپنی جگہ قابل تسلیم ہے کہ قرآن کا مرتبہ حدیث سے مقدم ہے لیکن صرف اتنی بات سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو قرآن سے ثابت ہو' اس کو فرض اور جو حدیث سے ثابت ہو اس کو واجب کہہ دیا جائے بلکہ بہت سے مستحبات قرآن سے اور بہت سے فرائض احادیث سے ثابت ہو سکتے ہیں- البتہ نوعیت ثبوت کے لحاظ سے جو فرق رہے گا وہ یہ ہو گا کہ وہ مستحبات بلحاظ ثبوتِ قطعی ہوں گے اور یہ فرائض ظنی -قوت و ضعف کے تفاوت سے خود فرض میں بھی مراتب قائم کیے جا سکتے ہیں ایک فرض کو قطعی دوسرے کو ظنی کہا جا سکتا ہے یہ کہنا کہ فرض ظنی بعینہٖ واجب ہے' زیر تامل ہے- یہاں شیخ ابن ہمام نے جو بحث فاتحہ خلف الامام کے ضمن میں فرمائی ہے قابل مراجعت ہے-

فرض و واجب کے مراتب میں بحر العلوم کی تحقیق ❋ ہمارے نزدیک مسئلہ کی پوری حقیقت وہ ہے جو بحر العلوم نے رسائل الارکان میں تحریر فرمائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ماہیت کے اجزاء اہمیت اور غیر اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے ایک

---

[1] الموافقات ج ۴ص ۸-

درخت میں جڑ، شاخیں، پتیاں، ٹہنیاں سب اس کے اجزاء کہلاتے ہیں مگر ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے یہ تمام اجزاء ایک حیثیت نہیں رکھتے اسی طرح زید میں ہاتھ، پیر، سر، دل، دماغ وغیرہ سب اس کے اجزاء شمار ہوتے ہیں۔ مگر ان اجزاء میں پھر اتنا بڑا تفاوت نظر آتا ہے کہ بعض کے کٹ جانے سے درخت باقی رہتا ہے اور بعض کے کٹنے سے درخت کی صرف زینت میں فرق پڑتا ہے اور بعض کے کٹنے سے اس کے نمو میں نقصان پیدا ہو جاتا ہے اور بعض کے کٹنے سے درخت کی حقیقت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زید کے اگر ہاتھ پیر قطع کر دیئے جائیں تو پھر بھی اس کو زید ہی کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کی گردن کاٹ دی جائے تو پھر وہ انسان نہیں رہتا بلکہ اس کا ایک ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس کو اب زید کہنا صرف اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ پہلے اس ڈھانچے پر زید کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا پس جس طرح خارج میں کسی ماہیت کے اجزاء میں حکم کا اتنا تفاوت موجود ہے اسی طرح فقہاء نے شرعی ماہیات کے اجزاء میں بھی یہی فرق سمجھا ہے۔ نماز کے بعض اجزاء وہ ہیں جن کے نقصان سے نماز کی زینت میں فرق آتا ہے اور بعض سے اس کی حقیقت میں نقصان پیدا ہوتا ہے اور بعض سے نماز کا اسم اطلاق کرنا ہی درست نہیں رہتا۔ پہلی قسم مستحبات، دوسری واجبات اور تیسری فرائض و ارکان کہلاتی ہے رہا یہ کہ ان مراتب کا اندازہ کیسے ہو تو یہ اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور عمل سے ہوتا ہے۔ بعض اجزاء کے ترک سے آپ نے اس عمل کو ناقص قابل اعادہ قرار دیا اور بعض کے ترک سے گو ناقص کہا مگر اس کا اعادہ لازم نہیں کیا۔ اور بعض کی وجہ سے اس عمل کا ہونا نہ ہونا برابر سمجھا جب آپ کے فرمان میں یہ تفاوت موجود ہے ادھر قرآن ﴿اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ کہہ کر نماز کا تقاضہ کر رہا ہے تو لامحالہ فقہاء کو یہ غور کرنا پڑا کہ نماز میں وہ اجزاء کون سے ہیں جن کے ادا کر لینے سے خدا کا مطالبہ پورا پورا ادا ہو جاتا ہے اور وہ کون سے ہیں جن کے ترک سے ناقص ادا ہوتا ہے اور وہ کون سے جن سے نماز کی صرف زینت میں فرق پڑتا ہے اصل حقیقت فوت نہیں ہوتی۔ فقہاء نے صرف ہماری سہولت کے لیے ان اجزاء کے علیحدہ علیحدہ نام تجویز کر دیئے ہیں تاکہ تعلیم و تعلم میں آسانی ہو جائے۔ اگر منکرین حدیث کو ان ناموں سے چڑ ہو تو وہ ان ناموں کو استعمال نہ کریں مگر کیا اس حقیقت سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے اجزاء سب برابر کے اجزاء نہیں۔ پس فرض و واجب کا فرق صرف دلیل کے قطعی یا ظنی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ دراصل خود ان اجزاء کی حقیقت کی وجہ سے ہے جو جزء واجب ہے وہ درحقیقت اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ فرض، اسی طرح جو مستحب ہے وہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ واجب، اس لیے صیغہ امر ایک ہی رہتا ہے مگر مطالبہ کی اہمیت میں خود اس جزء کے اہم اور غیر اہم ہونے کے لحاظ سے فرق پڑ جاتا ہے۔[1]

خلاصہ یہ کہ جب اجزاء کی یہ فطری تقسیم تمام کائنات میں موجود ہے تو پھر یہی تقسیم اگر ماہیاتِ شرعیہ میں بھی موجود ہو تو اس میں کیا تردد ہے۔ آج بھی اردو میں ہم امر و نہی کے صیغے استعمال کرتے ہیں مگر کیا ہر امر کا اقتضاء برابر سمجھا جاتا ہے یا آج بھی بعض حکم معمولی بعض اس سے زیادہ تاکیدی ہو سکتے ہیں۔ پس جس طرح مراتب کا یہ تفاوت ہمارے حکم میں موجود ہے اسی طرح خدائی احکام کو سمجھنا چاہیے۔ ﴿اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ (نماز قائم کرو) میں بھی ایک حکم ہے۔ اور ﴿وَاِذَا حَلَلۡتُمۡ فَاصۡطَادُوۡا﴾ (جب حج کا احرام

---

[1] اس تحقیق سے اس شخص کا بھی جواب ہو جاتا ہے جس نے ایک مناظرہ میں امام شافعیؒ سے کہا تھا کہ جب قرآن میں امر و نہی ایک ہیں تو پھر آپ فرض و واجب کا اختلاف کہاں سے پیدا کرتے ہیں۔ (دیکھو کتاب الام ج ۷)

کھول دو تو شکار کرو) میں بھی ایک حکم ہے مگر نماز کو فرض کہا جاتا ہے اور شکار کرنا کوئی شخص فرض نہیں کہتا حالانکہ صیغہ امر ایک ہی ہے مگر فرض و مباح کے مراتب اسی ایک امر کے تحت میں پیدا ہو رہے ہیں- ان امور کے لحاظ کے بعد رسول کے بیان اور احادیث کی اہمیت اور پیدا ہو جاتی ہے منکرین حدیث کو یا تو قرآنی امر و نہی سب یکساں مرتبہ میں لحاظ رکھنے ہوں گے یا پھر محض اپنی عقل سے ان میں مراتب کا تفاوت پیدا کرنا پڑے گا-

مولانا اسلم صاحب جس کو اسوۂ رسول کہتے ہیں وہ ہمارے نزدیک حدیث ہی کا ایک بڑا شعبہ ہے جیسا کہ آئندہ واضح کیا جائے گا- بہر حال اگر قرآن اپنی جامعیت کے ساتھ اسوۂ رسول کا محتاج ٹھہر سکتا ہے تو اسے حدیث کا محتاج ٹھہرانے میں بھی کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے' یہ احتیاج صرف ایسی ہی احتیاج ہے جیسی متن کو شرح کی احتیاج ہوتی ہے- اس احتیاج سے شرح کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہاں شرح اور متن کی احتیاج ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے- اصل فضیلت متن ہی کو ہے اگر متن نہ ہوتا تو شرح کس پر لکھی جاتی لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اگر یہ شرح نہ ہوتی تو ہر شخص اس متن کو اس سہولت کے ساتھ کس طرح سمجھتا - اس کی مثال ایسی ہے جیسا تعزیراتِ ہند کی دفعات اور قوانین کی دوسری کتابیں- گورنمنٹ کی جانب سے یہ قوانین مجمل الفاظ میں مدون ہو کر شائع ہوگئے ہیں- عدالتیں اس کی مختلف مختلف مرادیں بیان کرتی رہتی ہیں مگر اس کی صحیح مراد وہی سمجھی جاتی ہے جو ہائی کورٹ بیان کرتا ہے اسی لیے اس کے نظائر ہر جگہ ناطق سمجھے جاتے ہیں- اسی طرح قرآن بھی ایک قانون کی کتاب ہے اس کی مراد متعین کرنے کے لیے صرف رسول کا بیان معتبر ہے- اگر قرآن رسول کی اس ذمہ داری کی تصریح نہ بھی کرتا جب بھی ہمارا فرض ہوتا کہ ہم اس بیان کو تلاش کریں جو رسول نے خواہ غیر ذمہ دارانہ طور پر قرآن کی تشریح میں پیش کیا ہے- چہ جائیکہ جب وہ اس کا ذمہ دار بھی بنا کر بھیجا گیا ہے- یہ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے رسول نے صرف قرآن کے الفاظ کو دہرایا نہ ہوگا نہ دہرانے کو کوئی شخص بیان کہہ سکتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نے صرف الفاظ کے ترجمہ پر کفایت بھی نہ کی ہوگی کیونکہ اہل زبان کے لیے اس میں کوئی دشواری نہ تھی' یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر آج قرآن کی مراد سمجھنے میں کچھ مشکلات حائل ہوسکتی ہیں تو یقیناً اس وقت بھی حائل ہوئی ہوں گی ہاں قلت و کثرت کا فرق ہوسکتا ہے اور شبہات کی نوعیت کا فرق بھی ممکن ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ تمام قرآن میں کبھی کسی کو شبہ ہی پیش نہ آیا ہو- حافظ ابن قیمؒ وفد بنی المنفق کی آمد کے واقعات کے سلسلہ میں ان کا ایک سوال تحریر فرماتے ہیں:

''جب ہمیں درندے کھا پی کر برابر کردیں گے اور ہوائیں فضاء عالم میں منتشر کرکے نیست و نابود کردیں گی تو پھر ہمارا دوبارہ جینا کیوں کر ہوگا-''

اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کا یہ خیال ہے کہ آپ کے دور میں چپ چاپ عمل کر لینے کے سوا، کبھی عقلی شبہات کے متعلق کوئی حرف بھی منہ سے نہیں نکالا گیا یہ سراسر غلط ہے اور اسی طرح یہ بھی ایک خیال خام ہے کہ معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ دین کے عملی حصہ کو ان سے کچھ زیادہ سمجھنے والے تھے پھر لکھتے ہیں-

و فیه دلیل علی انهم کانوا یوردون علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ما یشکل علیهم من

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو جو شبہات پیش آتے وہ برابر انہیں آپ کے سامنے پیش کرتے تھے اور آپ

الاسئلة و الشبهات فيجيبهم عنها بما يثلج صدورهم و قد اورد وا عليه صلى الله عليه وسلم الاسئلة اعداؤه و اصحابه اعداؤه للتعنت و المغالبة و اصحابه للفهم و البيان و زيادة الايمان و هو يجيب كلاعن سؤاله الا ما لا جواب عنه كسوال عن وقت الساعة[1]

بھی دل ٹھنڈا کر دینے والے جوابات انہیں مرحمت فرما دیا کرتے یہاں دوست و دشمن کا فرق نہ تھا سب ہی سوال کرتے اور سب ہی کو جواب دیا جاتا فرق صرف یہ تھا کہ دشمن جھگڑا کرتے اور اپنے غالب آنے کی فکر میں رہتے اور آپ کے صحابہ دین کی باتیں سمجھنے اور زیادہ سے زیادہ ان پر یقین حاصل کرنے کی فکر میں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی زبان سے كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے) کا سوال نکل سکتا ہے اور کسی کی زبان سے یہ بھی ادا ہو سکتا ہے۔ ﴿اَنّٰى يُحْيِ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ (بھلا اس بستی کی اس طرح بربادی کے بعد اب اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ کہاں زندہ کرے گا) تو غریب صحابہ کرام کے سوالات پر کیا استبعاد ہے۔ پس یہ کس قدر ضروری ہے کہ ہم ان تمام شبہات کو پیش نظر رکھیں اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ ان کلمات کو تلاش کریں جو رسول نے ان شبہات کے جواب میں یا خود قرآن کی مراد بتلانے میں ذمہ دارانہ طور پر ادا فرمائے تھے[2] جتنا ہم اس اہمیت پر غور کرتے جاتے ہیں اسی قدر حدیث کی

---

[1] زادالمعاد۔ ج ۳ ص ۷۵۔ [2] مولانا اسلم صاحب رسول کے بیان کی اس اہمیت کو کم کرنے کے لیے تحریر فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نور مبین اور مفصل کتاب ہے جس کو اس کے اولین مخاطب یعنی صحابہ کرام بے تکلف سمجھتے تھے .... کل زمانہ نبوت میں قرآنی تعلیمات کے متعلق صحابہ نے جس قدر باتیں پوچھیں وہ امام رازیؒ کے بیان کے مطابق ۱۴ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں صرف ۱۲ ہیں' ان سب کے جوابات قرآن ہی میں نازل کیے گئے ہیں۔ نیز مختصر جامع بیان العلم کے آخری صفحہ میں ایک ایک کر کے گنا دیئے ہیں۔ (علم حدیث ص ۳۷) پھر صفحہ ۳۶ میں تحریر فرماتے ہیں ''یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو قرآن کا مخاطب قرار دیا ہے وہ انسانی عقل ہے جس میں اس نے فکر و نظر کی قوت ودیعت فرمائی ہے اس کی ہدایت کے لیے جس قدر روشنی کی ضرورت ہے اس کتاب میں رکھ دی ہے جو ہر زمان و مکان میں اس کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔'' ان دونوں عبارتوں کے ملانے سے یہ صاف سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک قرآن فہمی کے لیے صرف عقل کافی ہے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقل انسانی میں بھی بڑا تفاوت ہے پھر عرب کے سواء عجم کو زبان عربی کے سمجھنے کا سلیقہ بھی درکار ہے پھر زبان دانی کے بعد قرآن پر اتنا عبور بھی ضروری ہے کہ ہم معنی آیات سب بیک وقت دماغ میں متحضر ہوں تا کہ کتاب اللہ کی مراد کتاب اللہ سے حل ہو سکے۔ پھر بہت سی آیات قصہ طلب ہیں' بہت سی مجمل نظر آتی ہیں۔ ان سب مراحل سے گذرنے کے لیے کتنا وقت درکار ہے' کیا اس مدت میں دین معطل رکھا جائے یا صرف منکرین حدیث کا بیان معتبر سمجھا جائے۔ ان تمام مشکلات کو طے شدہ سمجھ کر مولانا ایک دوسری طرف متوجہ ہو گئے ہیں وہ یہ کہ قرآن میں ہی یہ موجود ہے کہ ہم نے تمہیں اس لیے بھیجا ہے کہ تم ہماری کتاب کو واضح کر کے ان پڑھ لوگوں کو سمجھا دو' ان کی ناقص عقلوں پر براہ راست سمجھنے کا بوجھ ڈالنا ان کو بڑی تنگی میں ڈال دینا ہے۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور عقل کے علاوہ رسول کے بیان کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔ ''لاریب آپ کی تعلیم و تبیین دینی ہے۔ لیکن وہ وہی عملی تشریح یعنی اسوۂ حسنہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا۔''

معلوم نہیں کہ مولانا کو رسول کے قول سے کیا ضد ہے کہ دین کے باب میں رسول کے منہ سے ایک لفظ کا صدور بھی وہ تسلیم نہیں کرتے اور عمل کے درجہ میں تمام تفصیلات کو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ یہ بحث نہیں ہے کہ اسوۂ رسول متواتر ہے یا غیر متواتر۔ چلئے آپ حدیث کو غیر متواتر ہونے کی .....

ضرورت ہمیں اور عیاں ہوتی جاتی ہے اسی اہمیت اور ضرورت کو مطرف بن شخیر نے بتلایا تھا "و لکن نرید من ھو اعلم بالقران" (یعنی ہمیں قرآن کے ساتھ اس کی تلاش بھی ضروری ہے جو قرآن کا سب سے زیادہ سمجھنے والا تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔

امام اوزاعیؒ کے قول کی تشریح ✻ حدیث کی اسی صفت بیان و توضیح کے پیش نظر امام اوزاعیؒ سے منقول ہے۔

الکتاب احوج الی السنة من السنة الی الکتاب. (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹)	کتاب اللہ سنت کی طرف زیادہ محتاج ہے بہ نسبت سنت کے کتاب اللہ کی طرف۔

امام اوزاعیؒ نے یہ مقولہ اپنی جانب سے نہیں کہا بلکہ مکحول سے نقل فرمایا ہے حافظ ابو عمر اس کی مراد یہ بیان فرماتے ہیں۔

ل ..... کی وجہ سے تسلیم نہ کیجئے مگر اتنا تو تسلیم کر لیجئے کہ دین کے باب میں آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وحی الٰہی سے نہ سہی اپنی عقل سے سہی کچھ نہ کچھ سمجھا ہوگا آخر وہ کیا تھا۔ پھر اگر قرآن و عقل کی دو روشنیاں بھی آپ کے لیے کافی نہیں اور ان کے بعد اسوۂ رسول کا ہونا بھی ضروری ہے تو اتنی توسیع کے بعد آپ رسول کے قول پر کہاں سے کنٹرول کر سکتے ہیں۔ رسول کے بیان کو صرف عمل کے دائرہ میں محدود کر دینا آخر کس دلیل سے ہے۔

مولانا کو چونکہ احادیث سے دلچسپی نہیں ہے اس لیے انہوں نے یہاں ۱۲ اور ۱۴ کے اختلاف کو یونہی چھوڑ جانا اپنے لیے اور مفید سمجھا ہے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ یہاں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کل سوالات ۱۴ ہیں۔ جس میں سے روح اور ذوالقرنین کا سوال صحابہ کی طرف سے نہ تھا اس لیے مجموعی تعداد ۱۴ ہے اور صحابہ کے سوالات کی بارہ۔ اس کے بعد سنئے کہ آپ نے شاید اس پر بھی غور نہیں کیا کہ ابن عباسؓ خورد سال تھے یہ تمام صحابہؓ کے سوالات کے اعداد و شمار کیسے بیان کر سکتے ہیں۔ ہزاروں صحابہؓ ان سے پہلے گذر چکے ہوں گے اور بہت سے صحابہؓ سے ان کی ملاقات بھی نہ ہوئی ہوگی پھر اس قسم کی احادیث کو بلا قید پورے عموم کے ساتھ سمجھ لینا کتنا عقل کے موافق ہو سکتا ہے لیکن چونکہ اس اجمالی اور مبہم حکم سے حدیث کے انکار میں مدد مل سکتی تھی اس لیے یہاں مولانا کو پورا شرح صدر حاصل ہو گیا۔ اگر یہی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو تواتر سے اس طرف مولانا کا تردد دور ہی نہیں ہوتا اور اس میں بھی یہ تردد پڑ جاتا ہے کہ تواتر کا وجود ہے بھی یا نہیں، لیجئے اب وہ مراد سنئے جو محدثین نے بیان فرمائی ہے۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں۔

قلت المراد ابن عباس بقوله ما سالوه الا عن ثلاث عشرة مسئلة المسائل التی حکاھا اللہ فی القران عنھم و الا فالمسائل التی سألوه عنھا و بین لھم احکامھا بالسنة لا تکاد تحصی. (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۵۹)	یعنی ابن عباسؓ نے یہاں کل ان شبہات کی تعداد بیان فرمائی ہے جن کے جوابات قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ یقیناً ابن عباسؓ سے پہلے اور ان کی لاعلمی میں بھی بہت سے سوال ہوئے مگر تعریف کے محل پر ان ہی سوالات کا تذکرہ کرنا مناسب ہے جن کی اہمیت کو خود قرآن نے محسوس کیا اور ان کا جواب خود دیا

اگر مولانا حدیث کی روشنی میں قرآن پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ قلت سوال کی وجہ خود قرآن کی ممانعت ہے ﴿ لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَاءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ﴾ (المائدہ: ۱۰۱) رسول سے بہت باتیں دریافت مت کیا کرو اگر تمہیں تمام باتوں کا جواب دے دیا جائے تو بعض مرتبہ تمہیں پسند نہ ہوگا اور قرآنی بیان کے بعد ان کا تسلیم کرنا ضروری ہوگا۔ اس آیت سے تو الٹا یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس وقت سوالات کی کثرت اتنی ہو گئی تھی کہ قرآن کو روکنا پڑا۔ پس جو عدد قرآن میں مذکور ہے اسے صحابہؓ کے سوالات کا تمام عدد سمجھ لینا محض غلط ہے۔ مولانا کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اھلہ۔ الساعة۔ الجبال کا سوال کرنا قرآنی تعلیمات میں شامل ہو سکتا ہے تو کیا اس جیسے اور سوالات قرآنی تعلیمات میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ پھر کیا ماذا ینفقون اور خمر اور میسر کا بیان اسوۂ رسول میں نہ تھا۔ اعتراض کا نقد اور جواب کا ادھار اچھا نہیں۔ صحابہؓ کے سوالات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات کا نمونہ دیکھنا ہو تو اعلام الموقعین ملاحظہ کیجئے۔ از جلد ۲ ص ۲۳۰ تا ۳۱۳۔

یرید انها تقضی علیه و تبین المراد منه. امام اوزاعیؒ کا مطلب یہ ہے کہ سنت قرآن کی مراد بیان کر دیتی ہے۔

حافظ ابوعمر نے امام اوزاعی کے الفاظ کی جو مراد اپنی جانب سے بیان کی ہے وہ[1] خود امام اوزاعی نے حسان بن عطیہ سے بھی نقل فرمائی ہے۔

کان الوحی ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و یحضرہ جبرئیل بالسنة التی تفسر ذلک. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آیا کرتی تھی اور جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس وہ سنت لے کر آیا کرتے تھے جو اس کی تفسیر کر دیتی تھی۔

امام شاطبیؒ امام اوزاعیؒ کے الفاظ کی اور شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لا الکتاب یکون محتملا لا مرین فاکثر فتاتی السنة یتعین احدهما فیر جع الی السنة و یترک مقتضی الکتاب. (الموافقات ج ٤ ص ٨ و ١٠) قرآن کی عبارت میں کبھی دو باتوں کا کبھی اس سے بھی زیادہ کا احتمال ہوتا ہے اور یہ متعین نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مراد کیا ہے۔ حدیث ان میں سے ایک احتمال متعین کر دیتی ہے اور وہی قرآن کی مراد سمجھی جاتی ہے۔ پھر قرآن کریم کے دوسرے احتمالات پر عمل نہیں کیا جاتا۔

اس کی اور شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "فمعنی کون السنة قاضیة علی الکتاب انها مبینة له فلا یوقف علی اجماله و احتماله و قد بینت المقصود منه لا انها مقدمة علیه کون السنة قاضیة علی الکتاب کا مطلب یہ ہے کہ جب سنت کتاب اللہ کی مراد بیان کر دے تو اب کتاب اللہ کے اجمال یا اور لفظی احتمالات پر عمل نہ کیا جائے گا پھر اس کی مزید توضیح کے لیے ایک مثال دیتے ہیں۔

مثلاً قرآن کریم نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹ دینا مقرر فرمائی ہے مگر یہ بیان نہیں فرمایا کہ کتنے مال چرانے کی یہ سزا ہے۔ اسی طرح یہ بھی تفصیل نہیں کی کہ کتنا ہاتھ کاٹا جائے' ان احتمالات کو سنت نے صاف کر کے بتلا دیا کہ جس مال کی چوری سے ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے وہ مثلاً کم از کم دس درہم کی مقدار ہونا چاہیے پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مال محفوظ ہوتا کہ چوری کا لفظ اس پر صادق آسکے اس کے بعد جب ہاتھ کاٹا جائے تو پہونچے پر سے کاٹنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ احکام حدیث سے ثابت کیے گئے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ یہ احکام خود قرآن سے ثابت شدہ ہیں' مگر حدیث نے صرف یہ بتلا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہاں مراد یہ تھی جیسا کسی آیت کا مطلب اگر ہم امام مالکؒ سے دریافت کرلیں اور ان کے بیان کے موافق اس پر عمل کرلیں تو یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہم نے امام مالکؒ کے قول پر عمل کیا ہے بلکہ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ ہم نے قرآن پر عمل کیا ہے۔ پس جس طرح یہاں اصل حجت قرآن کریم ہی سمجھا جاتا ہے اور امام مالکؒ کو صرف مفسر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن وحدیث کا معاملہ ہے۔ یہاں بھی حدیث کی تفصیل کو مستقل

---

[1] امام اوزاعیؒ کے قول کی شرح آپ نے خود ان کے اور دوسرے علماء کی زبان سے سن لی۔ کیا آپ کے نزدیک وہ درحقیقت حدیث کو قرآن پر فوقیت دیتے ہیں مگر مولانا اسلم صاحب نے جن کتابوں سے یہ مقولہ نقل فرمایا ہے ان ہی میں اس کا یہ مطلب بھی مذکور تھا۔ مگر پھر یہ لکھ دیا ہے "آخر کار حدیث کا غلبہ یہاں تک پہنچ گیا کہ قرآن کریم سے بھی اس کی اہمیت بڑھا دی گئی۔" (ص ۱۰)

اس کے جواب میں ہم بادب یہی عرض کر سکتے ہیں کہ جیسا آپ نے عقل اور اسوۂ رسول کی اہمیت بڑھا دی ایسا ہی ہم نے رسول کے ایک بیان کی اور اہمیت بڑھا دی۔ اگر وہ اہمیت قرآن کے مخالف نہیں تو یہ بھی نہیں۔

کہنا غلط ہے بلکہ حدیث صرف یہ بیان کر دیتی ہے کہ یہاں قرآن کریم کی مراد یہ ہے- آخر میں لکھتے ہیں:

فکان السنة بمنزلة التفسیر و الشرح لمعانی احکام الکتاب. (ج ٤ ص ١٠) گویا سنت' کتاب اللہ کے احکام کے لیے بمنزلہ تفسیر اور شرح کے ہے-

حدیث کی یہی حیثیت امام اوزاعیؒ نے حسان بن عطیہ سے نقل فرمائی ہے اور یہی حیثیت عمران بن حصین صحابیؓ کے الفاظ میں آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہیں- پس سلف اور خلف کے ان متفقہ الفاظ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث میں متن و شرح کا ربط ہے' ان میں ایک دوسرے کا مخالف نہیں بلکہ مبین اور شارح ہے- کتاب اللہ بمنزلہ متن ہے اور حدیث اس کے لیے بمنزلہ شرح- اسی کی طرف آیت مذکورہ میں تنبیہ کی گئی ہے- ﴿وَ اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ (النحل: ٤٤) رسول کی جس خدمت و فرض کو یہاں بیان کیا گیا ہے اسی کا دوسرا نام حدیث ہے-

احادیثِ رسول کے بیان ہونے کی تفصیل

احادیث میں قرآن کے مجمل احکام کی تشریح ❋ اس ربط کی[1] تشریح کے لیے ہمیں قدرے اور تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے امام شاطبیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سنت کیا ہے؟ وہ درحقیقت قرآن ہی کی دوسری ایک مفصل شکل ہے- اس کے مجملات کی تفصیل اس کی مشکلات کا بیان اور اس کے مختصر اشارات کی شرح ہے- مجملات کی تفصیل سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں روزہ' نماز' حج زکوٰۃ بلکہ تمام عبادات و معاملات کی کوئی تفصیل ذکر نہیں کی گئی- سنت نے اس اجمال کی تفصیل کی ہے- قرآن نے اگر نماز کا حکم دیا ہے تو سنت نے اس کے ایک ایک جزو کی تفصیل کی ہے مثلاً شروع میں ہاتھ اٹھائے تو کس طرح' ہتھیلیوں کا رخ کس جانب رکھے' کہاں تک اٹھائے' اٹھاتے وقت کیا کہے پھر ہاتھ چھوڑے یا باندھے' اگر باندھے تو کہاں باندھے' بہرکیف عمل کے لیے ان تمام سوالات کا جواب دینا ضروری ہے- یہاں منکر حدیث تو ان سوالات میں کسی ایک کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ قرآن نے ان امور کی طرف کوئی توجہ نہیں کی- مولوی اسلم صاحب البتہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرمائیں گے کہ اسوۂ رسول ان تمام

---

[1] حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ احادیث کے ذخیرہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو کل تین قسم کی احادیث نظر آتی ہیں (۱) بعض احادیث وہ ہیں جن میں بعینہ وہی حکم مذکور ہے جو قرآن میں ذکر کیا گیا ہے (۲) بعض میں کسی مجمل کی مراد یا کسی لفظ کی تفسیر مذکور ہوتی ہے- ان دونوں قسموں میں آپ کی اطاعت کا کوئی خاص مفہوم ادا نہیں ہوتا- اگر یہ احادیث بھی نہ ہوتیں جب بھی یہ احکام قرآن میں مذکور ہونے کی وجہ سے واجب الاطاعت تھے- پس یہ اطیعو اللّٰہ کے (خدا کی اطاعت کرو) تحت میں درج ہیں- (۳) بعض احادیث میں جن میں وجوب و حرمت کے ایسے احکام مذکور ہیں جن سے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہے- ان ہی احکام کے ماننے کے لیے وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا حکم دیا گیا ہے- اگر یہ تیسری قسم واجب الاطاعت نہ ہو تو پھر خاص اطاعت رسول کا کوئی مصداق ہی نہیں نکلتا- خلاصہ یہ ہوا کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کی پوری آیت پر اسی وقت عمل ہوسکتا ہے جب ہر سہ اقسام کی اطاعت کی جائے- قرآن کریم نے رسول کی مستقل اطاعت کو بھی خدا کی اطاعت کی دوسری شکل قرار دیا ہے- مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ - رسول کی اطاعت ایک لحاظ سے خدا ہی کی اطاعت ہے- (اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۲)

تفصیلات کے جواب کے لیے کافی ہے مگر آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ جواب بھی قطعاً غیر تشفی بخش ہے- یہ امتیاز صرف اہل سنت کو حاصل ہے کہ وہ حدیث رسول کی مدد سے چھوٹی سے چھوٹی بات کا جواب دے سکتے ہیں وہ بھی تاریکی میں نہیں بلکہ پوری روشنی میں وہ اپنے ہر دعویٰ کے لیے اصولی طور پر ایک حدیث پھر حدیث کے لیے سند اور ہر سند کے راوی اور ہر راوی کی پوری تاریخ پیش کر سکتے ہیں- گویا اس ذریعہ سے وہ اسوۂ رسول کو آج بھی دنیا کو دکھلا سکتے ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ رسول نے قرآن کے اس اجمال پر کس طرح عمل کر کے دکھلایا تھا حدیث کا ایک حصہ تو یہ ہے-

احادیث میں مشکلاتِ قرآن کا حل ✽ اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں قرآنی مشکلات کا خود صاحب رسالت نے حل فرمادیا ہے- اس کی چند مثالیں پہلے گذر چکی ہیں یہاں ایک مثال اور پیش کی جاتی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی:

وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ. (التوبة : ٣٤)	جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے-

صحابہ کو یہ سن کر بہت فکر ہوئی کیونکہ ان میں اگرچہ بیشتر غریب تھے لیکن کچھ مال دار بھی تھے ان کے پاس سونا اور چاندی جمع بھی رہتا تھا اور قرآن کی اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو سخت عذاب ہوگا اس لیے انہوں نے آپ سے استفسار کیا آپ نے فرمایا کہ آیت کا وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھے ہو جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ نہ دی جائے' جس مال کی زکوٰۃ دے دی جائے وہ کنز اور خزانہ کی تعریف میں نہیں آتا' اور ان کی مزید تسلی کے لیے فرمایا:

ان الله لم يفرض الزكوة الا ليطيب بها ما بقى من اموالكم.	اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ اسی لیے تو لازم کی ہے تاکہ تمہارا باقی مال پاک وصاف ہو جائے-

اگر شریعت میں مطلقاً مال جمع کرنا حرام ہوتا تو میراث کی آیت کا مطلب کیا ہوتا جب قرآن نے میت کے مال تقسیم کرنے کا قانون خود بتایا ہے تو یہ اس کی صاف دلیل ہے کہ اس نے کسی حد تک مال جمع کرنا بھی جائز قرار دیا ہے کیونکہ مال کی تقسیم کا قانون اسی وقت نافذ ہو سکتا ہے جب پہلے مال موجود ہو' اگر مال نہ ہو تو تقسیم کس چیز کی کی جائے گی' یہ سن کر صحابہ کرام کا شبہ حل ہو گیا اور مال جمع کرنے کے حدود بھی انہیں معلوم ہو گئے اگر سنت نہ ہو تو یہ بیان کہاں سے آئے' حدیث کی دوسری قسم یہ تھی-

احادیث میں قرآن کی تفسیر ✽ تیسری قسم ان اشارات کی تفصیل ہے جو نظم قرآنی میں متفرقاً موجود ہیں جیسے (۱) ﴿وَ عَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا﴾ (التوبة:١١٨) (وہ تین شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ساتھ جنگ میں شامل نہ ہوئے اور پیچھے رہ گئے تھے) یہ اور اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جو قصہ طلب ہیں جب تک وہ پورا واقعہ معلوم نہ ہو ان آیات کا پورا مفہوم ہی روشن نہیں ہوتا-

حدیث میں ان قصوں کی پوری تفصیل موجود ہے- قصوں کے علاوہ بعض تفسیری اجزاء بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جن کے بغیر قرآن کا پورا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا- یہاں تفسیری اجزاء سے ہماری مراد حسب ذیل اُمور ہیں-

(۲) ﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ﴾ (البقرة:٥٩) (جنہوں نے ظلم کیا تھا انہوں نے جو کلمات کہنا انہیں

بتائے گئے تھے وہ بدل ڈالے) قرآن میں وہ کلمات مذکور ہیں جن کے کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ﴿و قولوا حطة﴾ جب دروازہ میں داخل ہو تو حطة کہنا (اے اللہ ہمارے گناہ بخش دے) لیکن ضد میں آ کر جو مہمل اور گستاخانہ کلمات انہوں نے بکے وہ اس قابل کب تھے کہ قرآن ان مہملات کو بھی نقل کرتا۔ رسول نے ان کو بیان کر کے اس قوم کے تمرد اور سرکشی کا حال ظاہر فرما دیا ہے۔ قالوا ''حبة فی شعرة'' یعنی حطة کی بجائے انہوں نے حبة فی شعرة کا مہمل کلمہ بکنا شروع کیا۔

(۳) یا مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّ سَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾(البقرة:۱۴۳) (ایسا ہی ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور تمہارا رسول تمہارے لیے گواہی دے) قرآن کی یہ آیت واقعہ طلب ہے حدیث نے اس کی تشریح کی کہ جب قیامت میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں آئیں گی تو اس وقت انبیاء علیہم السلام سے تبلیغ دین کا سوال کیا جائے گا ان کی قوم جھوٹ بول دے گی اور کہے گی۔

مَا جَاءَ نَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّ لَا نَذِيْرٍ .(المائدہ:۱۹) ہمارے پاس تو نہ کوئی خوش خبری سنانے والا آیا نہ ڈرانے والا۔

رسولوں سے پوچھا جائے گا تمہارا کوئی گواہ ہے وہ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت۔ اس وقت یہ امت آ کر ان رسولوں کے لیے گواہی دے گی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی امت کے لیے گواہی دیں گے۔

(۴) ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾(الحجر:۸۷) (ہم نے آپ کو سبع مثانی مرحمت کیں اور قرآن عظیم دیا) حدیث نے تفسیر کی کہ سبع مثانی سورۂ فاتحہ ہے۔

(۵) حدیث کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس سے قرآن کریم کا شانِ نزول معلوم ہوتا ہے اگر وہ معلوم نہ ہو تو قرآن کریم کی مراد ہی مختل ہو جاتی ہے۔ خوارج کا تمام مذہب اسی مغالطہ پر مبنی تھا وہ ان سب آیات کو جو کفار کے حق میں تھیں مسلمانوں پر چسپاں کر کے ان سے جہاد کرنا لازم سمجھتے تھے۔ ہم یہاں اس کی ایک مثال لکھتے ہیں مروان نے اپنے ایک خادم کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھیجا اور ان سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا:

وَ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا . اور وہ لوگ چاہتے ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کیے اس پر ان کی مدح سرائی کی جائے۔ (آل عمران:۱۸۸)

اس میں اشکال یہ ہے کہ اگر محض اس خصلت پر عذاب ہونا لازم ہو تو فطرۃً ہر انسان کے دل میں پوشیدہ طور پر یہ خواہش موجود ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ بہت سے وہ کام جو وہ نہیں کرتا لوگ سمجھیں کہ وہ کرتا ہے اور اس پر لوگوں کی تعریف کا متمنی رہتا ہے اس لحاظ سے تو اکثر لوگ عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں اتری تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تورات کی کوئی بات دریافت کی انہوں نے از راہِ شرارت اس کو چھپا لیا اور دوسری بات آپ کو بتلا کر یہ امید کی کہ آپ ہمارے مشکور ہوں گے اور ہماری تعریف کریں گے اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی اور ان کا فریب اور دھوکا دہی کھول دی گئی۔[1]

---

[1] مولانا اسلم صاحب شاید یہ فرمائیں گے کہ یہ سب تاریخی امور ہیں اور تاریخی امور میں حدیث ہمارے نزدیک بھی حجت ہو سکتی ہے مگر للہ .....

ہمارے مضمون کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو حدیثیں بظاہر قرآن کریم سے باہر سمجھی جاتی ہیں' ان کے متعلق بھی کچھ تشریح کر دی جائے۔ یہاں جو بحث سنت سے کتاب اللہ پر زیادتی کے متعلق حافظ ابن قیم نے فرمائی ہے قابل مراجعت ہے۔[1]

یہ واضح رہنا چاہیے کہ جب قرآن کی جامعیت بلحاظ اقامت اصول ہے تو اب یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر جزئی اس میں مذکور ہو۔ اگر ایسا ہوتو نہ حدیث کی ضرورت رہے نہ رسول کی صرف خدا کی کتاب براہ راست اتار دی جائے اور وہی تمام ضروریات کے لیے کافی ہو جائے' جب ایسا نہیں کیا گیا بلکہ کتاب کے بیان کے لیے اس کے ساتھ ایک رسول بھی بھیجا گیا تو یہ ضروری ہوا کہ قرآن کو صرف ایک اصولی قانون بنا دیا جائے اور اس کے دفعات کی تشریح رسول کے سپرد کر دی جائے یہ تشریحات تمام کی تمام خدا کی مراد کے مطابق ہوں گی مگر سب رسول کی زبان سے ہوں گی۔

احادیث رسول کو بیان کہنے کے چند اصول اور قواعد ⁕ ان تمام تشریحات کو قرآن کا بیان سمجھنے کا ایک کلی طریقہ تو وہ تھا جو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک سے آپ نے سنا یعنی جب قرآن میں اجمالاً یہ حکم دیا گیا کہ رسول جو تمہیں دے اسے قبول کرو تو اسی ایک قانون میں احادیثِ صحیحہ کا تمام ذخیرہ آ گیا اس لیے جب کبھی صحابہ کو آپ نے کوئی حکم دیا تو انہوں نے آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ بات قرآن میں کہاں لکھی ہے۔ البتہ زمانہ نبوت کے دور کے بعد یہ سوالات ضرور کیے گئے تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس وقت تک حدیث متفرق طور پر لوگوں کے پاس تھی قرآن کی طرح پورے کا پورا ذخیرہ بلا بحث و تفصیل کیے ہر شخص پر واجب التسلیم نہ تھا ہاں جب یہ ثابت ہو جاتا کہ یہ آپ کا فرمان ہے تو اس کے بعد کبھی کسی کا پس و پیش کرنا ثابت نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان تشریحات کو قرآن کی مجمل آیات کی تشریح یا تفسیر کہا جائے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ قرآن میں کبھی دو قسم کے احکام ہوتے ہیں اور کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جس کے متعلق یہ فیصلہ مشکل ہوتا

لله ..... ہمارا سوال یہاں یہ ہے کہ اگر ان احادیث کی اسانید اس درجہ سمجھی جا سکتی ہیں کہ قرآن کی تفسیر میں پیش کی جا سکیں تو حلال و حرام کی آیات میں وہ اس درجہ کیوں نہیں سمجھی جاتیں چلئے اگر وہ قطعیت کو مفید نہ ہوں مگر ظنیت کو مفید ہونا تو آپ کو بھی تسلیم ہے۔ اس تقدیر پر ان سے اتنا تو ثابت ہو ہی جائے گا کہ حلال و حرام کے متعلق بھی آپ نے کچھ نہ کچھ تفصیلات ضرور فرمائی تھیں اس کے ساتھ ہی اگر اس قسم کی تمام احادیث کو آپ ایک جگہ جمع کر لیں تو ہر حدیث اپنی جگہ اگر چہ خبر واحد ہوگی مگر ان سب کے مجموعے سے کیا یہ یقین حاصل نہیں ہوگا کہ حلال و حرام کے متعلق بھی آپ نے کچھ تفصیلات ارشاد فرمائی تھیں پس ان تمام مجموعہ سے جو یقین حاصل ہوا ہے اس کے رد کرنے کے لیے ایک ایک حدیث کی ظنیت ثابت کرنا کیا کارآمد ہو سکتا ہے۔ پھر آپ کو تو یہاں ظنیت کا بھی اقرار نہیں۔ آپ کے نزدیک تو یہ سب احادیث موضوعات کا ذخیرہ ہیں۔ معلوم نہیں کہ جب وہی راوی وہی مسند' حلال و حرام کے سوا دوسری جگہ آئیں تو مفید ظن ہو جائیں اور جب حلال و حرام کے باب میں آئیں تو بجائے مفید ظن ہونے کے یقینی موضوع سمجھی جائیں' کیا یہ انصاف ہے اس لیے انہیں اس کا اقرار کر لینا چاہیے کہ حلال و حرام کے بارے میں بھی آپ نے بہت سی تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔ جنہیں ظنی ہونے کی وجہ سے ہم تسلیم نہیں کرتے یکسر انکار کرنا بڑا ظلم ہے۔

[1] اعلام الموقعین ج۲ ص ۲۳۱ تا ۲۴۹۔

ہے کہ وہ کس میں درج کی جائے اس لیے اس کا حکم معلوم نہیں ہو سکتا - احادیث یہ فیصلہ کر دیتی ہیں کہ یہ چیز ان دو حکموں میں سے فلاں حکم میں درج ہونے کے قابل ہے اور اس طرح یہ احادیث اس کا بیان سمجھی جاتی ہیں مثلاً -

تیسرے قاعدہ کی چند مثالیں ٭ قرآن نے حلال و حرام کے متعلق ایک ضابطہ کلیہ یہ بیان فرما دیا ہے کہ جو طیبات ہیں وہ حلال ہیں اور جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں لیکن اب درندے اور شکاری پرند' خرگوش اور فاختہ وغیرہ کے متعلق یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس نوع کو کس حکم میں درج کیا جائے' حدیث نے اس کو بیان کر دیا کہ پہلی قسم خبائث میں داخل ہے اور دوسری طیبات میں - اب منکر حدیث تو یہ سمجھتا ہے کہ ذی ناب من السباع اور ذی مخلب من الطیر کی حدیث قرآن کے مخالف ہے مگر منصف شخص جانتا ہے کہ یہ عین قرآنی حکم ہی کی تشریح اور اسی کا بیان ہے - اگر یہاں طیبات اور خبائث کی تشریح صرف عقل کے سپرد کر دی جائے تو حرام خوروں کی جماعت تمام خبائث کو طیبات کہہ کہہ کر حلال بنا ڈالے - موجودہ دور میں شراب کو بھی کسی معین مقدار میں بہت مفید صحت سمجھا گیا ہے - پھر ایسا حرام کون سا ہے جس میں کوئی نہ کوئی نفع نہ ہو' ایسے خواہشات پرستی کے دور میں فیصلہ صرف عقل انسانی پر چھوڑنا مقصد شریعت ہی کو فناء کرنا ہے -

(۲) اللہ تعالیٰ نے پینے کی چیزوں میں جو مسکر اور نشہ آور نہیں وہ حلال فرمائی ہیں اور جو نشہ آور ہیں حرام کی ہیں' درمیان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو تھوڑی پی جائیں تو نشہ پیدا نہیں کرتیں اور زیادہ مقدار میں استعمال کی جائیں تو نشہ پیدا کر سکتی ہیں - حدیث نے سد باب کرنے کے لیے ان کو پہلی قسم میں درج کر دیا اور فرمایا:

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ جو بہت نشہ لائیں وہ تھوڑی بھی حرام ہیں -

(۳) قرآن کریم نے سکھائے ہوئے شکاری کتے کا شکار حلال قرار دیا ہے - لہٰذا معلوم ہوا کہ جو شکاری نہ ہو اس کا شکار حرام ہے - لیکن اگر شکاری اپنے شکار کو کھا لے تو اس کا کیا حکم ہے یہ زیر تردد ہے اگر یہ دیکھا جائے کہ کتا تعلیم یافتہ ہے تو اس کا شکار حلال ہونا چاہیے اور اگر اس طرف نظر کی جائے کہ اس کا خود شکار کھا لینا اس کی دلیل ہے کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں ہوا یا نہیں رہا تو اسے حرام ہونا چاہیے - حدیث نے اس کو واضح کر دیا کہ اس کا شکار حرام ہے کیونکہ اس کا کھانا اس کی دلیل ہے کہ اس کی تعلیم میں قصور ہے -

(۴) قرآن کریم نے محرم کو مطلقاً شکار کرنا منع فرمایا ہے اور جو عمداً شکار کرے اس پر جزاء واجب کی ہے اور غیر محرم شخص کو مطلقاً شکار کی اجازت دی ہے اور اس پر کوئی جزاء واجب نہیں کی - اب اگر کوئی محرم غلطی سے شکار مار دے اس کا حکم زیر تردد رہ گیا - سنت نے واضح کر دیا کہ یہاں عمد و خطاء کا کوئی فرق نہیں - دونوں صورتوں میں جزاء برابر ہے ہاں خطا میں گناہ نہیں - امام زہریؒ سے اسی طرح منقول ہے -

(۵) قرآن نے دریا اور سمندر کا شکار حلال قرار دیا ہے اور مردار جانور کو حرام فرمایا ہے لیکن اگر سمندر کے شکار میں مچھلی مر جائے تو کیا وہ بھی مردار ہونے کی وجہ سے حرام ہو گی آپ نے فرما دیا کہ دریا کے شکار کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر اس کا شکار مر جائے تو حلال ہے -

ان تمام مثالوں میں دونوں اصول واضح تھے سنت نے صرف یہ بتا دیا ہے کہ یہ جزئی ان دونوں حکموں میں سے کس حکم کے

تحت میں درج ہونے کے قابل ہے۔ سوچو کہ اگر ان مقامات پر صرف عقل انسانی کو حکم مقرر کر دیا جاتا یہ بہتر تھا' یا رسول کی معرفت خدا نے اپنی مراد خود بتا دی یہ بہتر ہوا۔ مالکم کیف تحکمون۔

حدیث رسول کے بیان ہونے کا ایک اور قاعدہ اور اس کی مثالیں ❊ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ایک حکم کسی علت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے' حدیث اس علت کے لحاظ سے کچھ جزئیات اس حکم کے تحت میں اور درج کر دیتی ہے مثلاً۔

(۱) قرآن نے ربوا اور سود حرام فرمایا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں سود کی صورت یہ تھی کہ قرض خواہ قرض دار سے کہتا کہ یا میرا قرض ادا کر دے ورنہ مجھے بجائے دس کے پندرہ روپیہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کو قرآن نے اس لیے حرام قرار دیا کہ یہاں بلا وجہ اپنے بھائی سے ایک زیادتی وصول کرنا لازم آتا ہے۔ اس کے مناسب حدیث نے قرض میں ہر قسم کا ناجائز نفع حاصل کرنا منع فرمادیا ہے اور اس کو بھی ایک قسم کا سود قرار دیا ہے مثلاً اگر ایک شخص نے کسی کو دو ہزار روپیہ قرض دیا اب اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس دباؤ میں اس کے مکان میں مفت رہا کرے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا ناجائز نفع ہے جو وہ اپنے قرض کے دباؤ میں بلاعوض حاصل کر رہا ہے۔ عقل انسانی یہاں مختلف فیصلے کر سکتی تھی پھر عقل کے ساتھ دوسرے ادراکات کی مزاحمت کبھی صحیح رائے قائم کرنے میں حائل بھی ہو جاتی ہے اس لیے کیا یہ بہتر نہ ہوا کہ رسول نے ایک نکھری ہوئی بات بتا دی۔

(۲) قرآن کریم نے دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے اس کی علت یہ ہے کہ اس وجہ سے ان میں فطرۃً قطع رحمی پیدا ہو جائے گی اور دو بہنوں میں جو شرعاً صلہ رحمی واجب تھی وہ نکاح کے اس علاقہ کے بعد قدرۃً ختم ہو جائے گی۔ حدیث نے اس علت کی وجہ سے بعض ان رشتوں کو بھی اسی حکم میں درج کر دیا ہے جہاں اس صلہ رحمی کے قطع ہونے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے جیسے پھوپھی' بھتیجی یا خالہ' بھانجی۔ چنانچہ بعض روایات میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔

فانکم اذا فعلتم ذلک قطعتم ارحامکم[۱] اگر تم ان رشتوں میں جمع کرو گے تو ان کی باہمی ہمدردی ختم کرنے کا تم باعث بنو گے۔

منکر حدیث سمجھے گا کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے لیکن منصف سمجھتا ہے کہ قرآن کے خلاف تو اس وقت ہوتی جب جمع بین الاختین کی حرمت کے خلاف ہوتی۔ یہاں تو دو بہنوں کے درمیان جمع کی حرمت کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کو ایک اصول بنا کر دوسری جگہ اور جاری کر دیا گیا ہے۔ رسول نے بتایا کہ خدا کی مراد صرف یہ دو ہی رشتے نہیں بلکہ اس قسم کے اور رشتے بھی یہی حکم رکھتے ہیں۔

(۳) قرآن کریم نے حرمت رضاعت میں صرف ماں اور بہن کو ذکر کیا ہے۔ ماں اصول میں ہے اور بہن اصل قریب کے فروع قریبہ میں' حدیث نے ماں بہن کے ساتھ اور نسبی رشتوں کو بھی شریک کر دیا ہے کیونکہ رضاعت کی وجہ سے جیسا ماں بہن کا رشتہ پیدا ہو سکتا ہے ایسا ہی پھوپھی اور خالہ کا رشتہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس حرمت کا تعلق جیسا کہ عورتوں کے ساتھ ہے ایسا ہی

---

[۱] رواہ ابن حبان کما فی نیل الاوطار (الموافقات۔ ج ۳ ص ۱۹۲)۔

مردوں کے ساتھ بھی قرار دے دیا ہے۔ حتیٰ کہ جس عورت کا دودھ پیا گیا ہے اس کا وہ شوہر جس کے زیر نکاح یہ دودھ پیدا ہوا ہے باپ بن جاتا ہے۔

ان تفصیلات سے ہماری غرض یہ ہے کہ آپ ان کو ملاحظہ فرما کر احادیث کے بہت بڑے ذخیرہ کا قرآن کے بیان ہونے پر عینی یقین حاصل کر لیں اور جو احادیث کہ محض سطحی نظر کی وجہ سے آپ کو قرآن کریم کے مخالف معلوم ہوتی تھیں وہ مخالف معلوم نہ ہوں۔ حافظ ابن قیمؒ نے بیان رسول کے دس اقسام بتلائے ہیں [1]

ایک سوال اور اس کا جواب ٭ اب رہا یہ سوال کہ جن جزئیات کو کسی علت مشترکہ کی وجہ سے حدیث نے بیان کیا ہے اگر وہ قرآن کی مراد ہوتیں تو وہ خود ہی ان کو بیان کر دیتا محض ایک معقولی سوال ہے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ قرآن نے تمام اشیاء خود ہی کیوں نہ بیان کر دیں۔ ہمارے نزدیک ہر ماتن شارح کے لیے کچھ جگہ چھوڑ جاتا ہے اور ہر شارح کچھ اشیاء محشی کے لیے باقی رکھتا ہے قرآن کا کمال یہ ہے کہ وہ اصول محکمہ قائم کر جائے اور رسول کا کمال یہ ہے کہ وہ قرآنی اصول کی ایسی تشریحات کر جائے جو اس کی مرضی کے عین مطابق ہوں۔ اس سوال کا حاصل تو یہ ہے کہ رسول کے علوم ظاہر ہونے کا کوئی محل ہی نہ رہے۔ قرآن کریم سے خود معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی رائے و اجتہاد کا بھی دین میں اعتبار ہے۔

اِنَّـا اَنـزَلْنَا اِلَیکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاکَ اللّٰہُ. (النساء : ۱۰۵) — ہم نے آپ پر سچائی کے ساتھ کتاب اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو سمجھائے۔

رسول کی رائے کو یہ رتبہ اس لیے حاصل ہے کہ یہ رائے بھی خدا کی اراءۃ سے پیدا ہوتی ہے پس جو اصول کہ خدا نے بتائے یا اس کے رسول نے اس کی کتاب سے خدا کی اراءۃ کے بعد سمجھے دراصل وہ سب [2] خدا ہی کی طرف سے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض قانون کے الفاظ بھی الٰہی الفاظ ہیں اور بعض کے الفاظ خواہ رسول کے ہوں مگر وہ بھی بلاشبہ خدا تعالیٰ کی منشاء کے مطابق اور اس کی اراءۃ کے تابع ہوتے ہیں۔ دین کی اس طرح تکمیل میں رسول کے علوم و کمالات کے اظہار کے سوا شاید یہ حکمت بھی ہو کہ اگر دین کا ایک ایک جزو ضبط قرآن میں آجاتا تو یہ تمام اجزاء اہمیت میں یکساں ہو جاتے اور شاید قانون یسر کے خلاف ہوتا وہ چاہتا ہے کہ دین میں سہولت رکھی جائے اس لیے کچھ مسائل تو منصوص ہو گئے وہ اعلیٰ درجہ کے قطعی سمجھے گئے۔ اس میں کسی کو خلاف کرنے کی گنجائش ہی نہیں دی گئی اس کے بعد دوسرے نمبر کے مسائل حدیث سے ثابت ہوئے وہ قطعیت میں پہلی قسم سے کمتر رہے پھر راویوں کے اختلافات نے یہاں کچھ اور وسعت پیدا کر دی اس کے بعد احادیث کے اشارات کو جب ائمہ نے پھیلایا تو وہ مسائل اجتہادیہ کہلائے اور چونکہ یہاں خدا کی اراءۃ کا وعدہ بھی نہ تھا اس لیے اختلاف اور خلاف کو یہاں پوری وسعت مل گئی یہ

---

[1] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۸۔ ملاحظہ فرمائیے۔

[2] حافظ ابن قیمؒ ''بِمَا اَرَاکَ اللّٰہ'' کے لفظ میں ایک لطیف نکتہ بیان فرما گئے ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں ''بما رأیت'' اسی لیے نہیں فرمایا گیا کہ دین کے معاملہ میں اطاعت صرف خدا اور رسول کی ہے حتیٰ کہ رسول بھی یہاں اپنی ذاتی رائے کوئی نہیں رکھتا۔ یہاں اس کی رائے بھی خدا کی اراءۃ کے تابع رہتی ہے۔ (اعلام ج ۱ ص ۱۹۸)

تینوں مراتب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی موجود تھے مگر حکم کا خلاف کبھی معاف نہیں کیا گیا اور اجتہادی غلطی پر کبھی گرفت نہیں کی گئی۔ ان اختلاف مراتب کی وجہ سے دین ایک نہایت معتدل صورت میں مکمل ہو گیا اب وہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت پر حاوی بھی ہے پھر اتنی وسعت بھی رکھتا ہے کہ معمولی فروگذاشت' انسانی ضعف سب اس میں کھپ سکتا ہے۔ معتزلہ نے دین کو مجرد کر کے اپنے خیال میں تمام تر قطعی بنیادوں پر قائم کر دیا مگر نتیجہ کیا ہوا' آخر انہیں مرتکب کبیرہ کو دائرہ اسلام سے خارج کہنا پڑا' خوارج نے دین کی تمام بنیاد قرآن پر قائم کرنے کا ارادہ کیا آخر انہیں بھی مسلمانوں کو کافر بنانا پڑا۔ کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ تمہارے لیے دین میں کوئی وسعت باقی نہ رہے۔

اتباعِ قرآن کے مفہوم میں ایک غلط فہمی ❋ مولانا اسلم صاحب کو یہاں چند آیات کے مفہوم سمجھنے میں خواہ مخواہ کے لیے غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے وہ آیات ذیل کے متعلق یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان میں صرف قرآن ہی کو دستور العمل بتایا گیا ہے اور اس لیے حدیث پر عمل کرنا ان کے خلاف ہے حالانکہ ان آیات کو حدیث سے دُور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ان سب آیات کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خدا کے حکم کو چھوڑ کر خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنا یا دوسرے لوگوں کی رائے کی اتباع کرنا نہیں چاہیے۔ مولانا اسلم نے ان کا رخ خواہشاتِ نفس اور عوام الناس سے پھیر کر خود اللہ تعالیٰ کے رسول ہی کی طرف سمجھ لیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖ اَوْلِیَآءَ. (الاعراف: ۳) اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے اتارا گیا ہے اور اس کے سوا اولیاء کی پیروی نہ کرو۔

یہاں ﴿من دونہ اولیاء﴾ میں رسول کو بھی داخل کر لینا قرآن سے انتہائی بدمذاقی کی دلیل ہے یہ لفظ قرآن کریم میں رسولوں کے لیے کبھی استعمال نہیں ہوا۔ رسول خود اللہ تعالیٰ کے داعی ہوتے ہیں قرآن نے کبھی ان کو مخالف پارٹی میں شمار نہیں کیا اور اسی بات کے صاف کرنے کے لیے کہ رسول کی اطاعت ﴿من دون اللہ﴾ کی اطاعت ہے یا اللہ کی یہ صاف طور پر فرما دیا کہ۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ. (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی۔

پس رسول کی اطاعت کو ﴿من دون اللہ﴾ کی اطاعت سمجھنا خود قرآن کے صریح خلاف ہے چہ جائے کہ اس پر اُلٹا قرآن سے استدلال کیا جائے۔ اس سے بڑھ کر غلط فہمی یہ ہے کہ جن آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی اتباع کا امر فرمایا گیا ہے وہ حدیث کی اتباع کے خلاف سمجھی جائیں۔

اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ. (الانعام: ۱۰۶) اس کی پیروی کیجیے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کی گئی۔

یہاں شاید ما اوحی کے لفظ سے صرف قرآن مراد لے لیا گیا ہے حالانکہ قائلین حدیث' حدیث کو بھی ایک قسم کی وحی کہتے ہیں رسولوں پر کتاب اللہ کے علاوہ اور بھی بہت سے قسم کی وحی اترا کرتی ہے حتیٰ کہ بعض انبیاء پر کوئی کتاب نازل ہی نہیں ہوئی اور یقیناً وحی ان پر بھی اتری ہے پس قرآن اور حدیث کے دو مختلف نام امتیوں کے طبقہ میں ہیں رسول کے حق میں چونکہ دونوں بذریعہ وحی ہیں اس لیے دونوں ﴿مَّا اوحی الیک من ربک﴾ میں داخل ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں کبھی کسی بادشاہ نے ایسا نہیں کیا کہ پہلے اپنے کسی معتمد شخص کو اپنا سفیر مقرر کر لیا ہو پھر بحالت سفارت ہی

اس کے متعلق ایسے احکام بھی بھیجے ہوں جو اس پر بداعتمادی کی مہر لگا دیں اگر من دون اللہ کی اطاعت میں رسول بھی داخل مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اپنے رسول پر بھی یہ شبہ ہے کہ وہ دنیا میں جا کر شاید میرے احکام کے سواء اپنی اتباع کی دعوت دے سکتا ہے اس لیے اس کے ذریعہ سے ایک طرف تو مخلوق کو اپنی اطاعت کے احکام دیتا ہے' اسی کے ساتھ یہ بھی تنبیہ کر دیتا ہے کہ رسول کی اتباع مت کرنا کیونکہ وہ من دون اللہ کی اتباع ہوگی - اگر درحقیقت رسول کی اطاعت خدا کے مخالف اطاعت ہے تو پھر آیت ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ﴾ کا کیا مطلب ہے - اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی محبت کا معیار قرآن کے نزدیک صرف یہ ہے کہ رسول کی اتباع کی جائے - جو قرآن اس تاکید کے ساتھ رسول کے اتباع کا حکم دے رہا ہے بھلا وہ اس کے اتباع کو من دون اللّٰہ کی اتباع کب کہہ سکتا ہے - اگر منکرین حدیث یہ سمجھ لیتے کہ خدا اور رسول کا رشتہ ناقابل انقطاع ہے' یہاں اطاعت و معصیت میں تفریق سمجھنا ہی غلط ہے تو حدیث و قرآن میں بھی تفریق پیدا نہ کرتے' اب آیئے دوسری قسم کی آیات ملاحظہ فرمایئے جو اس بات کی تصریح کرتی ہیں کہ یہ آیات اتباع اہواء سے روکنے کے لیے نازل ہوئی ہیں نہ کہ اتباعِ رسول سے -

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (جاثیہ:۱۸)

پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک راستہ پر لگا دیا ہے تو آپ اسی پر چلیے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے جو کچھ علم نہیں رکھتے -

اس آیت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اتباع شریعت کا امر لوگوں کی خواہشات کی اتباع سے روکنے کے لیے دیا گیا تھا نہ کہ حدیث کی اتباع سے - جو نبی کہ لوگوں کے تمام معاملات میں حکم مقرر کیا گیا ہو اس کے پاس سینکڑوں قسم کے لوگ' ہزاروں قسم کے مقدمات آتے ہوں' ہر شخص اپنی چرب زبانی سے اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا ہو اسے ربانی تربیت اس قسم کے نازک موقعوں پر یہ تنبیہ کرتی رہتی تھی کہ خبردار رہیے : دوسری جگہ فرمایا -

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ. (القصص : ۵۰)

اگر یہ لوگ آپ کے کہنے کے مطابق کر نہ دکھائیں تو سمجھ لیجیے کہ یہ صرف اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں -

یہاں حصر کے طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ آپ کا اتباع نہیں کرتے ان کے متعلق یہ یقین کر لینا چاہیے کہ وہ اپنی خواہشات ہی کا اتباع کرتے ہیں - غرض تمام قرآن میں کبھی رسول کی اطاعت کا صراحۃً حکم دیا گیا ہے کبھی اس کی اطاعت کو ٹھیک خدا کی اطاعت کہا گیا ہے اس کے خلاف ایک آیت میں بھی اس کی اطاعت کی ممانعت نہیں کی گئی اور جہاں صرف قرآن یا وحی کے اتباع کا امر کیا گیا ہے وہاں کسی شبہ و تردد کے بغیر صرف خواہشات اور قرآنی حکم کے خلاف اتباع کرنے کی ممانعت مقصود ہے -

حدیث کی تشریعی حیثیت ٭ قرآن و حدیث کا ربط معلوم کر لینے کے بعد اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حدیث کی حیثیت صرف تشریعی حیثیت ہے کیونکہ احادیث کا تمام ذخیرہ قرآن کریم کا بیان اور اس کی شرح ہے - پس اگر قرآن کی حیثیت تشریعی ہے تو اس کے بیان کی حیثیت بھی تشریعی ہونی چاہیے - یہی عقیدہ صحابہ کرام سے لے کر آج تک تمام امت کا ہے حدیث کا انکار اگرچہ بداہت کا انکار ہے مگر حدیث کو تسلیم کر کے اس کی تشریعی حیثیت کا انکار اس سے بڑھ کر بداہت کا انکار ہے - احادیث کا بڑا حصہ اگرچہ متواتر نہیں مگر یہ عقیدہ بلاشبہ متواتر عقیدہ ہے کہ مسلمانوں میں حدیث کی حیثیت ہمیشہ تشریعی حیثیت تسلیم کی گئی ہے'

کافر اور مسلمان اس بارے میں دو رائیں نہیں رکھتے - کیا یہ کوئی باور کر سکتا ہے کہ دور سلف سے لے کر آج تک لیل و نہار حدیث کے حفظ کا یہ شغل صرف ایک تاریخ کی حیثیت سے تھا -

عہد صحابہؓ میں حدیث کی حیثیت * اس موضوع کے دو پہلو ہیں - پہلے وہ واقعات ہیں جن سے صحابہؓ کے دور میں حدیث کی تشریعی حیثیت واضح ہوتی ہے اور اس کا دوسرا پہلو وہ واقعات ہیں جن سے اس کے خلاف نتیجہ اخذ کیا گیا ہے - ہمارے نزدیک صحابہ کے دور میں حدیث کے تشریعی حیثیت کا ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس پر گفتگو کرنا بدیہی کو نظری بنانا ہے - ہمارے علم میں ایک واقعہ بھی ایسا ثابت نہیں ہوتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ان کے نزدیک حدیث کی حیثیت تاریخی حیثیت تھی بلکہ انکارِ حدیث کا پہلا قدم ہی اس کی دلیل ہے کہ اس وقت حدیث کی تشریعی حیثیت سمجھی جاتی تھی - اگر حدیث صرف ایک تاریخ کی حیثیت رکھتی اور دین کے حلال و حرام سے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہوتا تو معتزلہ کو حدیث کے انکار کی کوئی وجہ ہی نہ تھی پھر معتزلہ کی ایک بڑی جماعت نے جب صحیح حدیث کے لیے عزیز ہونا شرط کیا تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اگر بحث تھی تو حدیث کی ظنیت و قطعیت کے متعلق تھی نہ کہ تشریعی یا تاریخی حیثیت کی -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اختلاف آپ کے دفن کے متعلق ہوا لیکن کیا اس کے خلاف کوئی ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کا فیصلہ اس حدیث کے سوا جو اس وقت حضرت ابو بکرؓ نے پڑھ کر سنائی کسی اور دلیل سے کیا گیا تھا کیا تاریخ سے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس وقت ایک آواز بھی حدیث کے اس فیصلہ کے خلاف اٹھائی گئی یا سب نے اسی کو تسلیم کیا اور اسی کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین عمل میں آئی - صحیح بخاری میں موجود ہے کہ حضرت عمرؓ چونکہ مدینہ سے باہر رہتے تھے اس لیے انہوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ ایک دن وہ خود آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور آپ سے احادیث سنتے دوسرے دن اپنے ایک پڑوسی کو بھیج دیتے وہ آتا اور اس دن کی احادیث سن کر حضرت عمرؓ کو پہنچا دیتا - کیا یہ اہتمام ایک معمولی تاریخ کی حفاظت کے لیے ہی کیا گیا تھا اس کے علاوہ خلیفہ اول سے لے کر خلفاء کے آخری دور تک جب کبھی مذہبی اور سیاسی نزاع پیش آئے تو ہمیشہ جانبین سے قرآن و حدیث ہی پیش کی گئی ہیں حتیٰ کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی جنگ میں بھی دونوں طرف سے اپنی اپنی حقانیت میں حدیثیں ہی پڑھی گئی ہیں -

صحابہؓ کی نظر میں احادیث کی اہمیت کی چند مثالیں * (۱) حضرت صدیق اکبرؓ نے جب مانعین زکوٰۃ سے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ اس میں مانع ہوئے اور ان کے خلاف میں حدیث ہی سے استدلال فرمایا حضرت عمرؓ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اس کے سامنے گردن تسلیم خم کر دی -

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور اپنے پوتہ کے ترکہ میں حصہ مانگنے لگی انہوں نے فرمایا کہ میں تیرا حصہ کتاب اللہ میں نہیں پاتا - حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو $\frac{1}{6}$ چھٹا حصہ دلوایا - فرمایا کہ تمہارے اس قول پر کوئی شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ بولے میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ نے دادی کو $\frac{1}{6}$ دلوایا ہے آپ نے ان کی شہادت پر فیصلہ کر دیا -

(۳) حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فریعہ بنت مالک بن سنان کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کیا حکم دیا تھا جب انہیں معلوم ہوا کہ آپ نے اسی گھر میں عدت گذارنے کا حکم دیا تھا تو اسی کے موافق انہوں نے بھی فیصلہ صادر کر دیا۔

(۴) حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ بی بی کو اپنے شوہر کی دیت سے وراثت نہ ملنی چاہیے لیکن جب ضحاک بن سفیان نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت زوج سے بھی وراثت دلوائی ہے تو اپنے قول سے رجوع فرمالیا۔

(۵) مجوس سے جزیہ لینے کے متعلق حضرت عمرؓ کو تردّد تھا لیکن جب عبدالرحمٰن بن عوف نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوس ہجر سے جزیہ لیا ہے تو انہوں نے اپنے خیال سے رجوع فرمایا۔

(۶) طاؤس روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑے میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اس کی جزاء کیا دینی چاہیے؟ تو حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ دو عورتوں میں لڑائی ہوگئی ایک نے دوسرے کے خیمہ کی چوب ماری جس کے صدمہ سے دوسری عورت کا حمل ساقط ہوگیا۔ مقدمہ آپ کے سامنے آیا آپ نے اس پر پانچ سو درہم بطور دیت لازم فرمائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ کرتے۔

(۷) حضرت ابن عمرؓ مخابرہ (مزارعت کی ایک صورت ہے) کیا کرتے تھے جب رافع بن خدیج نے اس کی ممانعت روایت کی تو انہوں نے مخابرہ کرنا چھوڑ دیا۔

(۸) حضرت زید حائضہ کے لیے بھی طوافِ صدر کرنا واجب سمجھتے تھے لیکن جب ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طوافِ صدر ترک کرنے کی اجازت دی ہے تو اپنے قول سے رجوع کرلیا۔

(۹) حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے زمانہ میں ایک غلام فروخت ہوا بعد میں مشتری کو اس میں کوئی عیب ثابت ہوا اس نے واپسی کا دعویٰ کیا جو آمدنی ان ایام میں غلام کے ذریعہ سے ہوئی اس میں جھگڑا ہوا کس کو دی جائے؟ ان کی رائے یہ ہوئی کہ وہ آمدنی بائع کو دی جائے لیکن جب حضرت عائشہؓ نے اسی قسم کے معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ نقل کیا کہ آمدنی مشتری کو ملنا چاہیے کیونکہ اس درمیان میں اگر غلام مرجاتا تو نقصان مشتری ہی کا ہوتا لہذا جس کا نقصان ہوتا نفع بھی اسی کو ملنا چاہیے۔ یہ سن کر عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی رائے سے رجوع کیا۔

یہ تمام واقعات کتب سنن مشہورہ میں موجود ہیں اور امام شافعیؒ نے اس کو باسناد روایت کیا ہے' چونکہ ہماری غرض یہاں ان مسائل کا اثبات نہیں صرف تاریخی حیثیت سے یہ بتانا ہے کہ صحابہ کے درمیان حدیث کی حیثیت کیا سمجھی جاتی تھی اس لیے ہم نے ان کی اسانید کے متعلق کلام کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اگر محدثین نے یہ واقعات کسی ایک باب کے تحت میں شمار کیے ہوتے یا یہ واقعات ایک ہی صحابیؓ کے ہوتے تو شاید یہ شبہ کیا جا سکتا تھا کہ عمداً اسی مقصد کے پیش نظر کسی نے وضع کر دیئے ہوں مگر جب قتال' حج' جنایت' بیع' وراثت' عدت' مزارعت غرض کہ شریعت کے تمام ابواب میں ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن

سے حدیث کی حیثیت صرف تشریعی ثابت ہوتی ہے پھر کسی ایک دور میں نہیں بلکہ ہر دور میں یہی عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت تک ہر دور میں حلال وحرام کے مسائل میں ہمیشہ حدیثیں ہی پیش کی گئیں تو اب حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار آنکھوں میں خاک جھونکنا نہیں تو اور کیا ہے۔

(۱۰) بلال حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ان کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ نے عورتوں کو مسجد میں نماز کے لیے جانے سے روکنے کی ممانعت فرمائی ہے میں نے عرض کیا کہ قبلہ اب زمانہ نازک ہے میں تو اپنی بی بی کو روکوں گا۔ ابن عمرؓ میری طرف متوجہ ہوئے اور تین مرتبہ لعنک اللہ فرما کر کہا تیرے کان ہیں یا نہیں‘ میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کررہا ہوں اور تو یہ جواب دیتا ہے‘ بعض روایات میں ہے کہ پھر ان سے ابن عمرؓ نے عمر بھر بات نہیں کی۔

(۱۱) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہے۔ عروہ نے عرض کیا کہ شیخین تو تمتع کی ممانعت کرتے تھے اس پر حضرت ابن عباسؓ کو غصہ آ گیا اور فرمایا کہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کررہا ہوں اور تم ابوبکرؓ وعمرؓ کا نام لیتے ہو‘ میرا گمان ہے کہ ان باتوں سے تباہی آئے گی۔

(۱۲) ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ مجھے امیر معاویہؓ کے بارے میں کون معذور رکھے گا کہ میں ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث روایت کرتا ہوں وہ ادھر سے مجھے اپنی رائے بتاتے ہیں جہاں وہ رہیں اب میں اس سرزمین پر رہنا بھی پسند نہیں کرتا۔[۱]

اگر اس قسم کی احادیث جمع کی جائیں تو مستقل ایک تصنیف بن سکتی ہے مگر ہم نے صرف چند واقعات اس لیے پیش کیے ہیں کہ مولوی اسلم صاحب کا یہ سمجھانا کہ صحابہؓ کے دور میں بھی حدیث کی حیثیت تاریخی سمجھی جاتی تھی‘ صحابہؓ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ اُن کی تاریخ کا ایک ایک ورق اس کی تردید کرتا ہے۔

حدیث کی تشریعی حیثیت کا ایک اور ثبوت ٭ اس کے علاوہ ابوعمرؒ نے اس پر مستقل ایک فصل قائم کی ہے کہ بعض تابعین بے وضو یا لیٹ کر حدیث سنانا مکروہ سمجھتے تھے۔ ضرار بن مرارہ فرماتے ہیں‘ ہمارے زمانہ میں دستور یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وضو کیے بغیر بیان کرنا مکروہ سمجھا جاتا تھا۔ اعمش کا طریقہ یہ تھا کہ اگر انہیں بے وضو حدیث بیان کرنے کی نوبت آتی تو تیمم کر لیتے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں حدیث بیان کرنے کے لیے وضو کرنا مستحب سمجھا جاتا تھا۔ شعبہ فرماتے ہیں کہ قتادہ وضو کیے بغیر حدیث کی روایت نہ کرتے تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جعفر بن محمد جب حدیث کی روایت کرتے تو باوضو کرتے۔ ابومعصب فرماتے ہیں کہ خود امام مالکؒ کا طریقہ بھی یہی تھا۔ عبدالرحمٰن بن ابی الزناد فرماتے ہیں کہ ایک دن سعید بن المسیب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے کا ارادہ کیا یہ اس وقت بیمار تھے اور لیٹے ہوئے تھے فرمایا مجھے بٹھاؤ

---

[۱] جامع بیان العلم ج ۳ ص ۱۹۲۔

9

لیٹے لیٹے حدیث بیان کرنا مجھے بہت مکروہ معلوم ہوتا ہے۔[1]

یہ وہ جماعت ہے جس نے خود صحابہؓ سے ہی علم حاصل کیا ہے ان کے طور وطریق کو دیکھا ہے اگر ان کے علم میں صحابہؓ کے نزدیک حدیث کی حیثیت صرف ایک تاریخ کی ہوتی تو کیا وہ اس کا یہ احترام کرتے۔ امام زہریؒ جو بہت بڑے تابعین میں شمار ہیں فرماتے ہیں کہ ہمیں اہل علم صحابہؓ سے یہ عقیدہ معلوم ہوا ہے۔

الاعتصام بالسنن نجاة.[2] سنت پر عمل کرنا نجات اسی میں ہے۔

درحقیقت حدیث کو محض تاریخ کے برابر سمجھنا اس کی سب سے بڑی توہین ہے اور اس کی نہیں بلکہ اس کے قائل کی توہین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث کو رسول کی حیثیت بھی ایک امیر کے برابر کردینا پڑی ہے میرے خیال میں یہ بھی اس تواتر کے خلاف ہے جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلم اور کافر میں مشترک ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں جو حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سمجھی گئی وہ امیر کی حیثیت نہ تھی بلکہ صرف ایک رسول کی حیثیت بلکہ رسولوں میں بھی سب سے افضل رسول کی حیثیت تھی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حدیث کی حیثیت کا انکار اور رسول کی حیثیت کا انکار دو مسئلے نہ سمجھنے چاہئیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی مسئلہ ہے۔ جو شخص حدیث کی تشریعی حیثیت تسلیم نہیں کرتا اس کو رسول کی تشریعی حیثیت سے انکار کرنا بھی لازم ہے۔ اسی لئے منکرین حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت صرف تبلیغ قرآن پر ختم ہوجاتا ہے۔ گویا آپ کی حیثیت ایک پوسٹ مین سے زیادہ حیثیت نہ تھی والعیاذ باللہ۔ اس لیے ہمیں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن میں رسول کی حیثیت کیا ہے۔

قرآن میں رسول کی حیثیت ٭ رسولوں کا تقرر خدا خود فرماتا ہے۔ امیر وحکام کی طرح ان کا تقرر مخلوق نہیں کرتی نہ مخلوق کے مشوروں کی اس میں کوئی رعایت کی جاتی ہے نہ اس کا انہیں حق دار سمجھا جاتا ہے۔

(۱) اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ. (الحج : ۷۵) اللہ تعالیٰ فرشتوں میں اور انسانوں میں رسول اپنی ہی پسند سے بناتا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ یہ منصب براہ راست خدا کے انتخاب پر موقوف ہے بندوں کے سپرد نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس منصب کے لیے تمام مخلوقات میں صرف دو نوع کا انتخاب عمل میں آیا ہے فرشتے اور انسان' اس لیے بظاہر جنات میں کوئی رسول نہیں ہوا۔ شاید اس معاملہ میں بھی وہ انسانوں کے تابع رہتے ہیں۔ غرض رسالت کا معاملہ رزق کی طرح صرف خدائی تقسیم پر موقوف ہے اسی لیے جب کفارِ مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں اپنی رائے زنی شروع کی تو نہایت تحمیق کے لہجہ میں یہ کہہ کر ان کو خاموش کردیا گیا۔

﴿أَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ﴾ (الزخرف : ۳۲) یعنی نبوت ورسالت رزق کی طرح ربوبیت کا حق ہے۔ جب رزق کی تقسیم اس نے کسی کے حوالہ نہیں کی اپنے ذمہ رکھی ہے تو نبوت کی تقسیم بھی ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔ پھر

[1] جامع بیان العلم ج ۲۔ [2] ایضاً ج ۲۔

یہ کہ نبوت ایک رحمت ہے اور رحمت کی تقسیم کا حق رحمٰن ہی کو ہوسکتا ہے جو خود رحمت کے محتاج ہوں وہ نبوت جیسی بڑی رحمت کی تقسیم کے ٹھیکیدار کیسے بن سکتے ہیں۔

(۲) اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ. (الانعام:۱۲۴) یہ بات خدا ہی خوب جانتا ہے کہ اسے اپنا رسول کسے بنانا ہے۔

علماء لکھتے ہیں کہ آیت بالا سے معلوم ہوا کہ رسالت صرف وہبی ہے کسبی نہیں۔ یعنی عبادات و ریاضات سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ جس میں چاہے نبوت و رسالت کی اہلیت رکھ دیتا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منصب رسالت و نبوت جن خصوصیات کی بنا پر مرحمت ہوتا ہے ان کا علم بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں اور ان کا انتخاب کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ امام اور امیر کی خصوصیات اور شرائط معلوم ہیں اس کا انتخاب بھی مسلمانوں کے سپرد ہے اور اسی لیے ان کے عزل کر دینے سے وہ معزول بھی ہوسکتا ہے۔

(۳) چونکہ قدرت خود ان کا انتخاب کرتی ہے اس لیے خود ہی ان کی تعلیم کا انتظام بھی کرتی ہے۔ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ﴾ (الاعلیٰ:۶-۷) ہاں پڑھیے اس پروردگار کے نام کی برکت سے پڑھیے جس نے آپ کو پیدا کیا ہے۔

(۴) وہ پڑھا کر خود انہیں یاد کراتی ہے اگر اس میں کچھ حصہ وہ بھول جاتے ہیں تو وہ بھی اسی کی مشیت کے ماتحت ہوتا ہے۔ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ﴾ (الاعلیٰ:۶-۷) ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہ بھولیں گے بجز اس کے جس کو خدا چاہے۔

(۵) اس وحی کے بیان کی بھی وہ خود ہی متکفل ہوتی ہے۔ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ (القیامۃ:۱۹) اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

(۶) جس طرح وہ ان کی تعلیمی تربیت کرتی ہے اسی طرح ان کی اخلاقی تربیت بھی خود ہی کرتی ہے اسی لیے عین بداخلاقی کے دور میں وہ ایسے بلند اخلاق کے مالک ہوتے ہیں جہاں دنیا اپنے پورے عروج کے بعد بھی نہیں پہنچتی۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا. (لقمان:۱۸)	لوگوں کے ساتھ بے رخی نہ کیجئے اور زمین پر اترا کر نہ چلئے۔
وَ اصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِىِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ. (الکہف:۲۸)	جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کی یاد صرف اسی کی رضا جوئی کے لیے کرتے ہیں آپ اپنی نشست و برخاست ان ہی میں رکھئے۔
وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ. (الحجر:۸۸)	مومنوں کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئیے۔
وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا. (طٰہٰ:۱۳۱)	دنیا کی زندگی کی جو رونق ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو صرف کام چلانے کے لیے دی ہے اس کی طرف نظر نہ کیجئے۔
لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَ لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ. (بنی اسرائیل:۲۹)	آپ اپنا ہاتھ اپنی گردن کی طرف سمٹا ہوا نہ رکھئے نہ اس کو بالکل کھولیے (بلکہ خرچ کرنے میں میانہ روی رکھیے۔

(۷) جس طرح وہ ان کی تعلیمی اور اخلاقی نگہبانی کرتی ہے اسی طرح کبھی اس کی جسمانی تحفظ کی ذمہ دار بھی خود بن جاتی ہے۔ وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ. آپ غم نہ کریں تبلیغی فرائض کھلے طور پر انجام دیں لوگوں سے آپ کی حفاظت کرنے والا اللہ خود ہے۔

حدیث میں ہے کہ اس سے پہلے شب میں آپ پہرہ داری کی جاتی تھی - اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے پہرہ منسوخ کر دیا اور خیمہ سے باہر منہ نکال کر فرمایا کہ جاؤ میری حفاظت کا اللہ تعالیٰ کفیل ہو چکا ہے اب مجھے کسی کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہی -

(۸) اس سے بھی بڑھ کر وہ ان کے عواطف ومیلان قلبی کی بھی نگران رہتی ہے -

وَلَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنَاکَ لَقَدْ کِدْتَّ تَرْکَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا. (الاسراء: ۷۴)

اگر ہم آپ کو تھام نہ لیتے تو کچھ نہ کچھ آپ ان کی طرف جھک چلے تھے -

چونکہ انبیاء علیہم السلام کے عزائم اور افعال تو درکنار قلبی خطرات بھی قدرتِ الٰہیہ کے زیر نگرانی رہتے ہیں اس لیے امت ان کے متعلق معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتی ہے یہ صفت صرف نبی و رسول کی ہے کسی امیر و حاکم کے متعلق عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا -

(۹) اسی خصوصیت کا اعلان کرنے کے لیے یہ بتا دیا جاتا ہے کہ ان کی غلطی عام انسانوں کے برابر نہیں ہوتی اگر وہ خدا کے متعلق ایک بات بھی جھوٹ کہیں تو نہایت بے دردی سے ان کو ہلاک کر دیا جائے اور دنیا کے دوسرے جھوٹوں کی طرح کبھی ان کو مہلت نہ دی جائے لیکن کسی امیر و حاکم کے متعلق یہ شدت نہیں کی گئی' اسی لیے رسولوں میں کوئی جھوٹا نہیں گذرا اور سینکڑوں حاکم جھوٹے اور ظالم گذر چکے ہیں -

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ○ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ. (الحاقة: ۴۴-۴۶)

اگر بالفرض آپ ہماری طرف سے کوئی بات بھی اپنی طرف سے لگاتے تو ہم آپ کا دایاں ہاتھ پکڑ کر آپ کی رگِ جان کاٹ ڈالتے -

(۱۰) اس ربانی تربیت وتعلیم' عصمت اور ہمہ وقت نگرانی کی وجہ سے اس کی جو بات ہوتی ہے خواہش نفس سے پاک اور صاف ہوتی ہے -

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ○ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی [۱] (النجم: ۳-۴)

وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا ہے جو بولتا ہے وہ خدا کی وحی ہوتی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے -

---

[۱] مولوی اسلم صاحب اس آیت کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں حالانکہ یہاں رسول کی صفت نطق کی مطلقاً مدح مقصود ہے قرآن کریم پڑھنے کے لیے تمام جگہ تلاوت یا قراءت کا لفظ مستعمل ہوا ہے اگر یہاں قرآن مراد ہوتا تو وما ینطق کی بجائے وما یتلو یا وما یقرأ کا لفظ ہونا چاہیے تھا - منکرین حدیث چونکہ حدیث کے سرے سے مخالف ہیں اس لیے وہ رسول کو کسی ایسی صفت کے ساتھ موصوف دیکھنا نہیں چاہتے جس کے بعد اس کو عام امراء و حکام سے کوئی خصوصی امتیاز حاصل ہو جائے - اصل یہ ہے کہ رسول اپنی ذات اور تمام صفات میں عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے اس لیے اس کے کان وہ سنتے ہیں جو عام مخلوق کے کان نہیں سنتے - اس کی آنکھیں وہ دیکھتی ہیں جو عام آنکھیں نہیں دیکھتیں - اسی لیے فرمایا انی اری ما لا ترون - یہی حال اس کے نطق کا ہے اسی لیے آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس منہ سے حق بات کے سوا کبھی کچھ نہیں نکلتا حتی کہ اپنی خوش طبعی کے متعلق بھی فرمایا انی لا اقول الا حقا (میں خوش طبعی میں بھی سچی بات کہتا ہوں) اسی لیے فرمایا کہ غصہ اور رضامندی کے ہر حال میں جو میرے منہ سے نکلے ....

(۱۱) انہیں رائے کی عصمت بھی حاصل ہوتی ہے۔

اِنَّا اَنزَلْنَا اِلَیکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاکَ اللّٰهُ. (نساء : ۱۰۵)

ہم نے آپ پر قرآن سچائی کیساتھ اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات میں اس رائے کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھائے۔

رسول کے سوا کسی کے ساتھ یہ وعدہ نہیں ہے کہ مخلوق میں فیصلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ خود ان میں سمجھ پیدا کر دیتا ہے۔

(۱۲) خواہشاتِ نفس سے پاکیزگی خطرات ورائے کی اس عصمت کی وجہ سے وہ عالم کے لیے مجسم نمونہ عمل بنتے ہیں یہاں حق و ناحق کی تفصیل، نیکی اور معصیت کی تقسیمیں سب ختم ہو جاتی ہیں وہ جو بھی کہہ دیتے ہیں سب خواہشات نفس سے پاک اور جو کرتے ہیں وہ سب نیکی ہی نیکی ہوتی ہے اس لیے ان کی ہستی آنکھ میچ کر قابلِ اتباع ہوتی ہے۔ اماموں کی طرح یہاں کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں ہوتا اسی لیے فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (احزاب : ۲۱)

ہر قوم کے لیے اپنے پیشوا نمونہ ہوتے ہیں تمہارے لیے بہترین نمونہ خدا کا یہ رسول ہے

(۱۳) ان کے قلب میں امت کے لیے انتہائی رحمت اور خیر خواہی ڈال دی جاتی ہے حتی کہ پھر ان کو اپنی امت سے اتنی محبت پیدا ہو جاتی ہے جتنی خود کسی کو اپنے نفس سے نہیں ہوتی۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ. (الاحزاب:۶)

نبی کو مومنین سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ محبت ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ. (الشعراء : ۳)

شاید آپ اپنی جان ہلاک کر دیں گے اس غم میں کہ وہ ایمان کیوں نہیں لائے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (توبة : ۱۲۸)

تمہارے پاس تم ہی میں کا ایک رسول آیا ہے ایسا مہربان کہ جو بات تمہیں تکلیف دہ ہو وہ اس پر بھاری ہے تمہاری بہی خواہی کا حریص ہے اور مومنین پر بڑا شفیق اور مہربان ہے۔

(۱۴) امت پر اس کا احترام اتنا واجب ہوتا ہے کہ اس کی بیبیاں ان کی ماؤں کے برابر سمجھی جاتی ہیں جیسا اپنی ماں سے نکاح درست نہیں ہوتا ایسا ہی نبی کی وفات کے بعد اس کی ازواج سے نکاح کرنا درست نہیں ہوتا۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ. (احزاب : ۶)

نبی کو مومنین سے ان کی جانوں سے زیادہ تعلق ہے اور اس کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں۔

للہ ..... نکلے سب لکھ لو وہ حق ہی حق ہوگا۔ جب اس کے عام نطق کا حال یہ ہے تو جو قرآن اس کی زبان سے نکلتا ہے وہ صدق وصفا کی کس منزل پر ہوگا۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں قرآن نے آپ کے کسی خاص بات کہنے کے متعلق صفائی پیش نہیں کی یعنی و ما ینطق بالقرآن وغیرہ نہیں فرمایا بلکہ مفعول کو حذف کیا ہے لہٰذا بلاغت کے قاعدہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مفعول مقصود ہی نہیں بلکہ صرف آپ کی صفت نطق کی پاکیزگی بتلانا منظور ہے یہاں تفتازانی نے جو تقریر ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لایعلمون میں کی ہے دیکھ لی جائے۔

اس کے سامنے آگے بڑھ کر کوئی بات کہنا ممنوع ہوتا ہے۔

يا اَيُّها الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ. (حجرات : ۱)

اے ایمان والو! آگے نہ بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

اس کے سامنے اونچی آواز سے بولنا اس کو عام انسانوں کی طرح آوازیں دینا حبط عمل کا موجب ہوتا ہے۔

يا اَيُّها الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ. (حجرات : ۲)

اے ایمان والو! اونچی نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اور اس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے ایک دوسرے کے سامنے تڑخ کر بولا کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا. (نور)

رسول کو آپس میں اس طرح مت پکارو جیسا ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرَاتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ. (حجرات : ٤)

جو لوگ آپ کو دیوار کے باہر سے پکارتے ہیں وہ اکثر عقل نہیں رکھتے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ. (الحجرات : ۵)

اگر وہ اتنی دیر انتظار کر لیتے کہ آپ باہر آ جائیں تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ رسول کی آواز سے اپنی آواز اونچا کرنا جب عمل کو اکارت کر دیتا ہے تو اس کے احکام کے سامنے اپنی رائے کو مقدم کر دینا اعمالِ صالحہ کے لیے کیونکر تباہ کن نہ ہوگا۔ (اعلام ج ۱ ص ۴۲)

(۱۵) ان کے ساتھ بیعت کرنا خدا سے بیعت کرنا ہوتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ. (الفتح : ۱۰)

جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔

(۱۶) ان کی اطاعت اور ان کی جنگ خدا کی اطاعت اور جنگ بن جاتی ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. (النساء : ۸۰)

جو رسول کا حکم مانے اس نے خدا ہی کا حکم مانا۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ. (البقرۃ : ۲۷۹)

(جو سود باقی رہ گیا) اگر تم نہیں چھوڑتے تو اللہ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔

(۱۷) خدا کی محبت کا دعویٰ ان کی اتباع کیے بغیر قابل تسلیم نہیں ہوتا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ. (آل عمران : ۳۱) آپ کہہ دیجئے! اگر تمہیں اللہ سے واقعی محبت ہے تو میری اتباع کرو۔

(۱۸) رسول مجلس مشاورت کی رائے کا تابع نہیں ہوتا دوسرے لوگ اس کے تابع ہوتے ہیں۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰهِ . (آل عمران:۱۵۹) جب آپ کسی بات کا پختہ ارادہ فرمالیں تو پھر خدا پر بھروسہ کر کے اسے کر گذریئے خواہ اب کسی کا مشورہ کچھ ہو۔

امام بخاریؒ نے رسول کی مشاورت پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

باب قول الله و امرهم شوری بينهم و شاورهم في الامر و ان المشاورة قبل العزم و التبيين لقوله فاذا عزمت فتوكل على الله. فاذا عزم الرسول لم يكن لبشر التقدم على الله و رسوله و شاور النبي صلى الله عليه وسلم اصحابه يوم احد في المقام و الخروج فرؤا له الخروج فلما لبس لأمته و عزم قالوا أقم فلم يمل اليهم بعد العزم و قال لا ينبغي لنبي يلبس لأمته فيضعها حتى يحكم الله وشاور عليا و اسامة فيما رمى به اهل الافك عائشةؓ فسمع منهما حتى نزل القران فجلد الرامين و لم يلتفت الى تنازعهم و لكن حكم بما امر الله. و كانت الائمة بعد النبي صلى الله عليه وسلم يستشيرون الامناء من اهل العلم في الامور المباحة ليا خذو ابا سهلها فاذا وضح الكتاب و السنة لم يتعدوه الى غيره اقتداء بالنبي صلى الله عليه وسلم. و رأى ابوبكر قتال من منع الزكوٰة فقال عمر كيف تقاتل الناس و قد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فاذا قالوا لا اله الا الله عصموا مني دماءهم و اموالهم الا بحقها حسابهم على

قرآن کریم نے امتیوں کے لیے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ ان کے معاملات ان کے باہمی مشوروں سے طے ہوا کریں گے اور رسول کے لیے بھی مشورہ کا حکم دیا ہے لیکن یہاں مشورہ کا حکم اس کے عزم کرنے سے پیشتر ہے جب رسول عزم کر لے یا خدا کی وحی صاف آ جائے تو اب مشورہ کا کچھ لحاظ نہیں بلکہ اب اس کے خلاف مشورہ دینا خدا اور رسول کے سامنے تقدم اور پیش دستی شمار ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ اُحد میں جنگ کرنے کے لیے صحابہ سے مشورہ طلب فرمایا لیکن جب آپ نے جنگ کا پختہ ارادہ فرمالیا اور ذرہ پہن لی تو جن لوگوں نے اب مدینہ میں رہنے کا مشورہ دیا اس پر عمل نہ فرمایا اور کہا یہ بات نبی کی شان سے بعید ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ ذرہ پہن لے تو اب خدا کے حکم کے بغیر اس کو اتار دے اسی طرح حضرت عائشہؓ کی تہمت کے قصہ میں بھی آپ نے حضرت علیؓ اور اسامہؓ سے مشورہ فرمایا' ان کے مشوروں کو بغور سنا لیکن جب قرآن نازل ہوگیا اور مسئلہ صاف واضح ہوگیا تو ان کے باہمی اختلافِ رائے کی کوئی پرواہ نہیں کی اور قرآن کے مطابق حکم نافذ کر دیا۔ یہی دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء کا تھا۔ وہ بھی امت کے امین لوگوں سے مشورہ کرتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا جو لوگ کلمہ توحید پڑھ رہے ہیں آپ بھلا ان سے کیسے جنگ کر سکتے ہیں حالانکہ حدیث میں یہ موجود ہے کہ جب لوگ کلمہ توحید پڑھ لیں تو اب ان کی جان و مال محفوظ ہو گئے۔ یہ احتمال کہ انہوں نے اوپری طور پر پڑھا ہے یا دل سے ہماری بحث سے باہر بات ہے یہ خدا کے سپرد ہے۔ کچھ گفت و شنید کے بعد آخر حضرت عمرؓ نے بھی ان

الله فقال ابوبکر و الله لا قاتلن من فرق بین ما جمع رسول الله صلی الله علیه وسلم ثم تابعه بعد عمر فلم یلتفت ابوبکر الی مشورة اذکان عنده حکم رسول الله صلی الله علیه وسلم فی الذین فرقوا بین الصلوة و الزکوة و ارادوا تبدیل الدین و احکامه الخ......

کی رائے سے اتفاق کرلیا-اب دیکھئے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس چونکہ ان لوگوں کے بارے میں جو نماز روزہ میں فرق کرتے تھے اور دین کی تبدیلی کرنا چاہتے تھے ایک حکم نبوی موجود تھا اس لیے اس کے سامنے انہوں نے کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہ کی- (اگر ان کے پاس یہ حکم نبوی موجود نہ ہوتا تو وہ صرف اپنی رائے سے خلاف نہیں کر سکتے تھے-)

خلاصہ فرق یہ ہے کہ رسول صرف خدا کے حکم کا متبع ہوتا ہے وہ کسی کے مشورہ کا تابع نہیں ہوتا' اس کے سوا تمام امام اور امیر مشیروں کے مشورہ کے پابند ہوتے ہیں' وہ اپنے ذاتی عزم کے مالک نہیں ہوتے' انہیں اختلافِ رائے کی صورت میں کوئی آیت یا حدیث پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اور صرف حدیث پیش کرنا بھی کافی نہیں ہوتا' جب تک کہ بحث و تمحیص کر کے مجلس مشاورت کو پورے طور پر مطمئن نہ کر دیں' یہ صرف ایک رسول ہی کی شخصیت ہے جسے عزم کر لینے کے بعد دوسروں کو مطمئن کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ خود دوسروں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ رسول کا رجحان دیکھ کر اسی جانب پر مطمئن ہو جائیں- پھر جو شخص یہاں جس قدر زیادہ مطمئن ہو جاتا ہے وہ اتنا ہی قابل تعریف شمار ہوتا ہے-کسی امام اور کسی امیر کی یہ شان نہیں ہے-صلح حدیبیہ میں شیخین کے اضطراب وسکون کے حالات احادیث میں موجود ہیں اور جن دلائل سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت تمام صحابہ پر ثابت ہوتی ہے ان میں سے ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ اس واقعہ میں جب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے سینے اضطراب و بے چینی سے بھرے ہوئے تھے اس وقت جس کا قلب تمام تر اطمینان وسکون سے لبریز تھا وہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی تھے-

آیاتِ بالا میں پورے عموم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمان برداری اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا ذمہ لیا گیا ہے کہ وہ جو پڑھ کر سنائیں گے پھر اس کی جو مراد بیان کریں گے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو گی جو کلمہ زبان سے نکالیں گے وہ خواہشاتِ نفس سے قطعاً پاک ہو گا -قرآن میں جو رائے دیں گے وہ بھی خدا کی پیدا کردہ ہو گی حتیٰ کہ ان کے دل میں جو خطرات بھی گذریں گے وہ بھی قدرت کی حفاظت کے نیچے رہیں گے اس کے بعد کیا یہ حق کسی کو ہوسکتا ہے کہ وہ رسول کے کلام میں اپنی جانب سے یہ تفریق پیدا کر دے کہ جو اس نے قرآن کہہ کر سنایا وہ تو واجب الاطاعت ہے لیکن جو اس نے اس کی مراد بتلائی یا جو اس نے خود فرمایا وہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ اس کو شرعی کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں-رسول بذاتِ خود ایک شرعی منصب ہے وہ اس لیے آتے ہیں کہ دنیا کو ہدایت اور خدا کی رضامندی کی راہ دکھلائیں اس لیے اس بارے میں وہ جو کہتے ہیں وہ سب رب العزت کی رسالت کی حیثیت سے کہتے ہیں- جو پہنچاتے ہیں وہ خدا ہی کا حکم ہوتا ہے اگر قرآن پہنچانا رسالت میں داخل ہے تو اس کی مراد بیان کرنا اس کی تفصیلات سمجھانا' یا دین کے بارے میں اپنی ہی جانب سے قرآنی آیات کے ماتحت کچھ اور احکام صادر کرنا رسالت کا جزو کیوں نہیں' قرآن کی کسی ایک آیت میں اس طرف کوئی معمولی بھی اشارہ نہیں ملتا کہ رسول کی یہ تمام صفات صرف

قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں، حتیٰ کہ وہی جب دین کے معاملہ میں قرآن کے علاوہ کچھ اور کہتا ہے تو اس کی حفاظت نہیں کی جاتی، اس میں خواہش نفس کا دخل ہونے لگتا ہے اور یہاں اس کی کوئی تشریعی حیثیت نہیں رہتی۔

اب ایک طرف آپ یہ آیات قرآنی پڑھیے، دوسری طرف رسول کے متعلق مولانا اسلم صاحب کا یہ تصور دیکھئے کہ صرف قرآن سنا کر رسالت کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، رسالت کا حق صرف یہ ہے کہ جو قرآن انہوں نے پڑھ کر سنایا ہے اس کو ان کے اعتماد پر اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ لیا جائے اس کے بعد اب وہ اور ہم برابر ہیں جیسا اُن کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جیسا وہ قرآن سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ لیتے ہیں، دین کے معاملات میں ان کی رائے کا وزن وہی ہے جو ہماری رائے کا۔ خلاصہ یہ کہ اتباع اور اطاعت میں ان کا ایک ذرہ بھی حق نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ رسول اپنی زندگی کے طویل و عریض عرصات میں بہت ہی مختصر لحات کے لیے منصب رسالت پر مامور ہوتا ہے بقیہ زندگی میں اس کی حیثیت پھر وہی ہو جاتی ہے جو عام انسانوں کی ہے لیکن ان آیات سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کے لیے یہ آداب اور عظمتیں کسی وقت کے ساتھ خاص ہیں بلکہ اس کا جو احترام تبلیغ قرآن کے وقت واجب ہے وہی تدبیر مہمات اور فصل خصومات اور امت کے دوسرے نظم ونسق کے وقت واجب ہوتا ہے حتیٰ کہ جب وہ اپنے گھر میں چلا جائے اور بستر خواب پر ہو اس وقت بھی اس تمام احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے بلکہ منکرین حدیث کو چھوڑ کر بقیہ امت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اس کے ان آداب میں آج بعد از وفات بھی سرمو کوئی فرق نہیں ہے۔ پس جب اس کا احترام ہمہ وقت واجب ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ ہمہ وقت رسول ہے اور جب وہ ہمہ وقت رسول ہے تو دین کے معاملہ میں اس کا جو حکم ہے وہ ہمہ وقت واجب الاطاعت ہے۔

مولانا اسلم صاحب کا آپ کی ذات میں دو حیثیتیں پیدا کرنا تبلیغ قرآن کے وقت آپ کو رسول اور فصل خصومات کے وقت آپ کو صرف ایک امام سمجھنا قرآن کے قطعاً مخالف ہے اگر قرآن کی نظر میں آپ کی یہ دو حیثیتیں ہوتیں تو ضرور قرآن کریم ان کو جدا جدا بیان کرتا، ان کے جدا جدا حقوق بتلاتا، لوگ آپ کے ساتھ ان حیثیتوں کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ معاملات کرتے۔ ایک وقت آپ کے سامنے آواز بلند کرنا حبط عمل کا موجب سمجھتے دوسرے وقت آپ سے منازعت کی بھی پرواہ نہ کرتے لیکن تمام قرآن میں، آپ کی تمام حیات باحیا میں، صحابہؓ کے تمام تذکروں میں کہیں آپ کے ساتھ دو قسم کے معاملات ثابت نہیں ہوتے اور ذخیرۂ نقل میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کبھی کبھی آپ منصب رسالت سے اس طرح علیحدہ ہو جاتے تھے جیسا ایک پوسٹ مین ڈاک تقسیم کر کے اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمام دعاوی قرآن کے خلاف اور اس کی صریح تحریف ہیں۔ پس حق صرف یہی ایک بات ہے کہ آپ ہمہ وقت رسول ہیں اور ہمہ وقت آپ کی اطاعت اور اتباع لازم ہے اخلاقی اطاعت واتباع نہیں بلکہ شرعی و مذہبی اتباع ایسی اتباع نہیں جو ختم ہونے والی ہو بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی وہ اتباع نہیں، جس میں ہمارا اختیار ہو بلکہ وہ اتباع جو سب سے بڑھ کر ہم پر فرض ہے اور ہمارا اس میں کوئی اختیار نہیں۔

قرآن میں رسول کی اطاعت ✻ رسول کی اطاعت مستقل حیثیت سے بھی واجب ہوتی ہے۔

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِی الۡاَمۡرِ — فرمان برداری کرو اللہ کی اور فرمان برداری کرو رسول کی اور ان

مِنۡکُمۡ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ. (النساء: ۵۹) جو تم میں حکم کے مالک ہوں۔ (یعنی حکام وغیرہ) پھر اگر تم کسی بات میں جھگڑ پڑو تو اسے خدا اور رسول کے سامنے پیش کر دو۔

میمون بن مہران کہتے ہیں کہ خدا کے سامنے پیش کرنے کا مطلب اس کی کتاب کے سامنے پیش کرنا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے سامنے پیش کرنے کا مطلب آپ کی سنت اور احادیث کے سامنے پیش کرنا ہے۔[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین اطاعتیں واجب فرمائی ہیں، دو مستقل اور ایک غیر مستقل۔ اللہ اور رسول کی اطاعت تو مستقل واجب کی گئی ہے اور اولوالامر کی تیسری اطاعت ان دو اطاعتوں کے ماتحت درج کر دی گئی ہے اسی لیے پہلی دو اطاعتوں کے لیے لفظ اطیعوا (فرمان برداری کرو) مکرر استعمال کیا گیا ہے اور تیسری اطاعت کے لیے جداگانہ امر نہیں فرمایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت کی طرح ایک مستقل حیثیت بھی رکھتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت ان اطاعتوں کی طرح مستقل حیثیت[2] نہیں رکھتی یہی وجہ ہے کہ تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کے حکم کے بعد صحابہؓ نے کبھی آپ سے اس پر قرآن سے دلیل پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہو، اس کے برخلاف اماموں کو ہمیشہ اپنی اطاعت کے لیے قرآن و حدیث پیش کرنا پڑی ہیں بلکہ بعض مرتبہ اپنے قول سے رجوع بھی کرنا پڑا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی امر میں تشریعی حیثیت کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں ہے اس لیے یہاں رسول کی اطاعت بھی صرف تشریعی حیثیت سے واجب ہوگی نہ

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۸۷۔

[2] حافظ ابن قیمؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اطاعت رسول کے مستقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہر حکم ماننا چاہیے خواہ اس کی اصل ہمیں قرآن میں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض سنتوں کی اصل قرآن میں موجود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ رسول کی اطاعت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلف ہی نہیں بنایا کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں تلاش کی جائے۔ اولوالامر کی اطاعت اس طرح واجب نہیں ہے وہ کتاب اللہ اور سنت رسول کے ماتحت ہے اس لیے جب تک وہ احکام خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق حکم دیں، ان کی اطاعت کی جائے گی اور جب ان کا خلاف کریں واجب الاطاعت نہ رہیں گے۔ صحیح حدیث میں ہے لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔ انما الطاعة فی المعروف (اطاعت صرف اچھی بات میں کرنی چاہیے) ایک مرتبہ مسلمانوں کے امیر نے اپنی فوج کے دستے کو حکم دیا کہ وہ آگ میں گھس جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں صحابہ نے تامل کیا جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا انهم لو دخلو الماخرجوا منها (اگر یہ لوگ آگ میں چلے جاتے تو پھر انہیں اس سے کبھی نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ حکم شریعت اسلامیہ کے خلاف تھا۔ اس میں کسی امیر و حاکم کی اطاعت واجب نہیں ہے حافظ ابن قیمؒ کے اس بیان سے اطاعت رسول کے مستقل اور اولوالامر کی اطاعت غیر مستقل ہونے کا مفہوم واضح ہو گیا (دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۱) پھر اسی کتاب کی جلد ۲ ص ۲۳۲ پر فرماتے ہیں کہ اگر رسول کی اطاعت صرف ان احکام تک محدود رہے جو قرآن کریم میں بھی صاف صاف موجود ہیں تو پھر و اطیعوا الرسول کی آیت کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا۔ اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی) کی آیت یہ چاہتی ہے کہ خدا کے نزدیک رسول کی اطاعت بھی ایک مستقل مد ہے۔ بیسیوں آیتوں میں اطاعت رسول کا علیحدہ حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کی براہ راست اطاعت کرنا بھی خدا ہی کا ایک حکم ہے اس لحاظ سے جو شخص رسول کی اطاعت نہیں کرتا وہ خدا کی اطاعت بھی نہیں کرتا۔

کسی اور حیثیت سے- یہاں منکرین حدیث کو بڑا مغالطہ یہ ہو گیا ہے کہ وہ دو اطاعتوں کی وجہ سے یہ سمجھ گئے ہیں کہ مطاع بھی دو بن گئے اس لیے یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ دو اطاعتیں واجب ہونے کی وجہ سے مطاع دو نہیں بنتے دراصل مطاع دونوں جگہ خدا ہی کی ذات رہتی ہے- رسول کی اطاعت میں یہ سمجھنا کہ مطاع خدا کی ذات پاک نہیں ہوتی بڑی غلط فہمی اور قرآن سے ناواقفی ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے-

مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی-

گویا رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی مطاع خدا ہی کی ذات رہتی ہے- پس اطاعت کے تعدد سے مطاع میں تعدد نہ سمجھنا چاہیے اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا بیان اس لحاظ سے کہ اس تفصیل سے قرآن میں مذکور نہیں ہوتا ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس اعتبار سے یہاں مطاع بظاہر اس کی ذات معلوم ہوتی ہے اور اگر یہ لحاظ کیا جائے کہ یہ تمام تفصیل بعینہٖ قرآن کے اجمال کی مراد ہوتی ہے تو اس کی حیثیت کوئی مستقل حیثیت نہیں رہتی اور یہاں بھی اصل مطاع خدا ہی کی ذات ہو جاتی ہے- پس احادیث رسول پر عمل کرنے والا بلحاظِ بیان تو رسول کا مطیع کہلاتا ہے اور بلحاظ مراد خدا ہی کا مطیع ہوتا ہے' فرق صرف یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرنے والا خدا کے الفاظ پر ہی عمل کرتا ہے اور حدیث پر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مراد پر عمل کرتا ہے- اس بناء پر اطاعتیں اگرچہ دو نظر آتی ہیں مگر مطاع درحقیقت ایک ہی رہتا ہے-[1]

خلاصہ آیت یہ ہے کہ خدا کا اصل قانون تو صرف خدا کی کتاب ہے' اس کی مرادوں کو واضح کرنے والی احادیث رسول ہیں اور اس مفصل قانون کو تا قیامت چلانے والے ائمہ دین ہیں اگر کبھی ان میں کسی معاملہ میں اختلاف پڑ جائے تو ان ائمہ کے لیے بھی اصل مرجع وہی اللہ اور رسول ہیں-

آیت اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ الخ کے متعلق مولانا اسلم صاحب کی تفسیر ❋ مولوی اسلم صاحب نے جو تفسیر اور نظم اسلامی کی جو تشریح یہاں لکھی ہے وہ صرف ان کے دماغ کی تراشیدہ ہے- قرآن کریم سے اس کو دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے پہلے ہم ان کے الفاظ بعینہٖ ذیل میں درج کرتے ہیں- اس کے بعد اس پر تنقید کی جائے گی-

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں (۱) تھیں- (۱) پیغمبری یعنی پیغاماتِ الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا- اس حیثیت (۲) سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا-

(۲) امامت- یعنی امت کا انتظام- اس کو قرآن کے مطابق چلانا' اس کی شیرازہ بندی' ان کے باہمی قضایا کے فیصلے' تدبیر مہمات و جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ- اس حیثیت (۳) سے آپ کی اطاعت اور فرمان برداری لازم کی گئی-

یہ امامتِ کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوع انسان کی صلاح و فلاح کے لیے قائم ہوئی قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے (۴)

---

[1] دیکھو الموافقات ج ۴ ص ۱۹-

زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ رہنی چاہیے-قرآن میں اطاعت رسول کے جو احکام ہیں وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصب امامت کے لیے ہیں-جس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں-ان (۵) کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے-قرآن (۶) میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے-جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم امت میں موجود تھے' ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی (اور یہ امت ہمیشہ آپ ہی کی امت رہے گی کیونکہ آپ کے اوپر ایمان لائی ہے) اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی-اور اطاعت (۷) عربی میں کہتے ہی ہیں زندہ کی فرمان برداری کو' رسول کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کچھ کہہ دے ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں-یہ ذہنیت (۸) امت میں اس وقت پیدا ہوئی جب کوئی صحیح خلیفۂ رسول نہیں رہا اور مستبدوں نے مرکز پر تغلب حاصل کر کے امت کو اپنا غلام بنالیا اور ان کی دینی قیادت چھوڑ دی' جو علماء اور رواۃ حدیث نے لے لی-اسی (۹) دن سے امت مذہبی انفرادیت اور انتشار میں مبتلا ہوگئی-ورنہ دین کی ضروریات (۱۰) قرآن کی اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں امام کے (۱۱) ساتھ امت کے منتخب افراد ہوں گے جن کی مشاورت سے وہ اس کو حسب اقتضاء زمانہ قرآن کے مطابق چلائے گا اور اس میں وحدت مرکزی قائم رکھے گا اور متفرق نہ ہونے دے گا-الغرض قرآن امام وقت ہی کے ساتھ امت کی نجات اور کامیابی کا ذریعہ ہے اور حدیثوں (۱۲) کی حیثیت صرف تاریخی ہے ان میں سے جو قرآن کے مطابق ہوں گی قبول کی جائیں گی-[1]

مولانا اسلم صاحب کی تفسیر پر تنقیدی نظر ✲ مولانا موصوف نے اطاعت خدا اور رسول کے معنی بیان کرنے میں تقریباً ایک صفحہ سے زیادہ خرچ کیا ہے-اس پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ مذہب اسلام صرف مولانا کی دماغی تجویز پر موقوف نہیں ہے بلکہ تیرہ سو سال سے اس پر مسلسل عمل ہوتا چلا آیا ہے جن باتوں کا تحریر مذکور میں دعویٰ کیا گیا ہے ان کے متعلق قطعی طور پر یہ ثبوت پیش کرنا مولانا کے ذمہ ہے کہ آج تک اسلامی نظام کی بنیاد درحقیقت اسی نقشہ کے مطابق سمجھی گئی ہے یا کم ازکم عہد نبوت اور صحابہ و تابعین میں سمجھی گئی تھی لہٰذا فقرہ نمبر ۸ صرف ایک دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی-

(۱) مولانا نے پہلا دعویٰ یہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں-رسالت اور امامت .رسالت کی حیثیت سے آپ پر صرف ایمان لانا ضروری تھا اور آپ کی اطاعت کرنا بہ حیثیت امامت تھا نہ کہ بہ حیثیت رسالت-ہمارے نزدیک یہ تینوں باتیں واقعات کے بھی خلاف ہیں اور خود قرآن کے بھی خلاف ہیں-یوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں ذہنی اعتبار سے دو حیثیتیں کیا اس سے زیادہ بھی حیثیات قائم کی جاسکتی ہیں مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا آپ کی ان دو حیثیتوں کو قرآن نے کہیں جدا جدا اعتبار کیا ہے یعنی کبھی بہ حیثیت رسول اور کبھی بہ حیثیت امام آپ کے دو قسم کے حقوق بتلائے ہیں-پھر کیا صحابہ کرام

---

[1] علم حدیث ص ۳۴ و ۳۵ و ۳۶-

نے ان دو حیثیتوں کے لحاظ سے کبھی آپ کے ساتھ دو قسم کے معاملات کیے ہیں پھر امت مسلمہ نے اپنے تواتر کے باوجود کیا آپ کی ان دو حیثیتوں کو سمجھا ہے میں پورے وثوق کے ساتھ ان تینوں سوالات کے جوابات نفی میں سمجھتا ہوں- رسول کی ذات میں یہ حیثیتیں قائم کرنا بالکل ایک منطقی اعتبار ہے جس کا خارج میں کہیں وجود نہیں- قرآن کریم نے ہمیشہ آپ کی حیثیت صرف ایک رسالت کی حیثیت بیان کی ہے اور ہمیشہ آپ کو رسول ہی کے لفظ سے پکارا ہے صحابہ نے بھی ہمیشہ آپ کو رسول ہی کہا ہے یہاں تک کہ کفار میں بھی آپ کی جو حیثیت مشہور تھی وہ صرف اللہ کے رسول ہونے کی ایک ہی حیثیت تھی-

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ. (المائدۃ : ٦٧)

اے رسول جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے اس کو آپ دوسروں تک پہنچا دیجئے-

یہاں آپ کو تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے اور رسول ہی کے لفظ سے مخاطب فرمایا ہے-

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ. (الاحزاب:٣٦)

جب خدا اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو کسی مؤمن مرد یا عورت کو پھر اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا-

اس آیت میں بھی آپ کو رسول ہی کہا گیا ہے اور رسول ہی کے فیصلہ کا یہ حق بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد کسی کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا- پس فقرہ نمبر ١ و نمبر ٢ و نمبر ٣ کی تفریق قرآن کریم کے صریح مخالف ہے- اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے-

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا. (النساء : ٦٥)

آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک کہ آپس کے اختلافات میں آپ ہی کو حکم نہ ٹھیرائیں اس کے بعد آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح اس کے سامنے سر نہ جھکائیں-

ایمان کی تکمیل رسول کی اطاعت کے بغیر نہیں ہوتی * اس آیت سے یہ خوب واضح ہوگیا کہ رسول پر ایمان لانا اس کی اطاعت کے بغیر قرآن کے نزدیک ایمان ہی نہیں ہے، کوئی انسان صرف ایک لفظ امنت کہہ کر حقوقِ رسالت سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا، جب تک کہ وہ ہر معاملہ میں رسول کو اپنا حکم نہ بنائے، باہمی جو اختلاف بھی ہو اس میں اسی کا فیصلہ ناطق نہ سمجھے اور یہی نہیں بلکہ تکمیل ایمان کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اگر وہ فیصلہ اپنے مخالف ہو تو بھی اپنے دل میں اس میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے پھر بھی صرف اس منفی پہلو سے ایمان کامل نہیں ہوگا جب تک کہ اثباتی پہلو میں انقیاد و تسلیم اس کی رگ رگ میں نہ سما جائے-

پس مولانا تو یہ فرماتے ہیں کہ منصب رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ اطاعت کے بغیر رسول پر ایمان ہی کامل نہیں ہوتا وہ صرف ایک ادھورا اور ناتمام ایمان ہوتا ہے دوسری جگہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ. (النور : ٦٢)

جو لوگ آپ سے اجازت لے کر جاتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں-

معلوم ہوا کہ ایمان کے حدود میں استیذان جیسی معمولی اطاعتیں بھی درج ہیں - پس جب آپ کے حکم کے بغیر کہیں جانا بھی درست نہیں تو اپنی رائے سے کوئی شرعی حکم اختیار کرنا کیسے درست ہوگا - (اعلام ج ا ص ۴۳)

مولانا اسلم صاحب کی ایمان کے معنی سمجھنے میں ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ ✻ درحقیقت یہاں مولانا اسلم صاحب کو ایک شدید غلطی ایمان کے معنی سمجھنے میں پیش آ گئی ہے اگر وہ ایمان کی صحیح حقیقت معلوم کر لیتے تو اطاعت کو ایمان سے علیحدہ کر ہی نہیں سکتے تھے وہ یہ سمجھے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے تصدیق کر لینے کا نام ہے اس لیے ان کے نزدیک رسول کا حق صرف تصدیق کر کے ادا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی حالانکہ اگر وہ ذرا تحقیق کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اوّلاً تو اطاعت کے بغیر ایمان ہی حاصل نہیں ہو سکتا' دوم قلبی تصدیق حاصل ہو جانے کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اطاعت کا عہد دل میں نہ پیدا ہو جائے - جو شخص رسول کی اطاعت کا عہد نہیں کرتا یقیناً وہ دل میں اس کی تصدیق بھی نہیں رکھتا اسی بنا پر ہرقل بادشاہ کو مسلمان نہیں کہا گیا حالانکہ اس نے آپ کی کھلی محفل میں تصدیق کر لی تھی - اگرچہ اپنی قوم کی برہمی دیکھ کر بعد میں بات بنا دی - اسی طرح ابوطالب کی تصدیق[1] بھی ان کے اشعار سے ثابت ہے ۔

و دعوتنی و زعمت انک صادق   و صدقت فیہ و کنت ثم امینا

ترجمہ: ''آپ نے مجھے دعوتِ اسلام دی اور یہ سمجھ کر دی کہ آپ سچے ہیں - بے شک آپ ایسے ہی ہیں کیوں نہ ہو کہ آپ ان کے درمیان ہمیشہ سے امین مشہور ہیں -''

و عرفت دینک لا محالة انہ   من خیر ادیان البریة دینا

ترجمہ: ''میں یہ یقین کر چکا ہوں کہ آپ کا دین یقیناً تمام دینوں سے بہتر ہے -''

لو لا الملامة اوحذار مسبة   لوجدتنی سمحا بذاک مبینا

ترجمہ: ''اگر ملامت اور لوگوں کے طعن و تشنیع کا خوف نہ ہوتا تو آپ دیکھ لیتے کہ میں بڑی فراخ دلی سے اس کو کھلا کھلا قبول کر لیتا -''

اس کے باوجود جمہور امت نے ان کا ایمان تسلیم نہیں کیا اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے ہزار آپ کی تصدیق کی ہو لیکن جب ان کے دل نے معمولی انسانوں کے عار کی خاطر رسول عربی کی اطاعت کرنا قبول نہیں کیا تو ان کو مسلمان کیسے کہہ دیا جائے -

---

[1] بعض متنورین ابوطالب کے ایمان کے قائل ہیں ان کو بھی یہی مغالطہ ہوا ہے انہوں نے صرف ان کی تصدیق پر تو نظر کی رسول کی ہمدردی کی داستان کا تو مطالعہ کیا' مگر یہ نہ دیکھا کہ جو شخص تھوڑی دیر کے لیے قومی عار بھی برداشت نہیں کرتا' اس کے نزدیک رسول کی شخصیت کا وزن کتنا تھا - اگر دین بھی صرف ایک معاشرتی قانون ہوتا جس کا تسلیم کرنا صرف اخلاق کی حد تک واجب ہو سکتا ہے تو ابوطالب کے سوا اور لوگوں کو بھی اس کی گرفت سے آزادی مل سکتی تھی مگر وہ تو مذہبی اور الٰہی قانون ہے اس سے آزاد رہنا کسی کے لیے برداشت نہیں کیا جا سکتا - جن بعض علماء نے ابوطالب کے اسلام کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے اس کی بنا یہ نہیں ہے کہ اسلام کے لیے صرف تصدیق کرنا کافی ہے بلکہ چند ضعیف احادیث ہیں -

جمہور ان کو ثابت شدہ نہیں سمجھتے - صرف یہ دیکھ کر کہ بعض اور علماء بھی ابوطالب کے ایمان کا اعتبار کرتے ہیں - یہ سمجھنا کہ ان کے نزدیک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے خواہ عہد اطاعت نہ ہو کوتاہ نظری ہے -

حافظ ابن قیم وفد نجران کے قصہ میں ایک کاہن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے پر تحریر فرماتے ہیں- و فیها ان اقرار الکاهن الکتابی لرسول الله صلی الله علیه وسلم بانه نبی لا یدخله فی الا سلام ما لم یلتزم طاعته و متابعته -اس واقعہ سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی کتابی کاہن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات کی تصدیق کر لے کہ آپ نبی ہیں تو صرف اس اقرار کرنے سے وہ اسلام میں داخل نہیں مانا جا سکتا- جب تک کہ وہ آپ کی اطاعت اور اتباع کا بھی پورا پورا عہد نہ کرے- اسی واقعہ کی نظیر ان دو یہودی علماء کا قصہ ہے جنہوں نے آپ کی خدمت میں آکر آپ سے امتحاناً تین سوالات کیے تھے اور جب ان کے جواب باصواب حاصل کر لیے تو بولے ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا بولو اب میری اتباع سے تمہیں کیا چیز مانع ہے؟ انہوں نے جھٹ یہ بہانہ کر دیا کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ یہود کہیں ہمیں مار نہ ڈالیں- اس واقعہ سے بھی یہی معلوم ہوا کہ صرف نبوت کا اقرار کر لینے سے اسلام کا حکم نہیں لگایا جاتا جب تک کہ آپ کی اطاعت کا عہد بھی نہ کیا جائے- اسی کی تیسری شہادت ابو طالب کا واقعہ ہے' ان کے اس پرزور اقرار کے باوجود کہ ان کے نزدیک آپ کا دین تمام ادیان سے افضل و بہتر ہے' ان کو اسلام میں داخل نہیں مانا گیا- اس کے بعد حافظ ابن قیمؒ تحریر فرماتے ہیں-

و من تامل ما فی السیر و الا خبار الثابته من شهادة کثیر من اهل الکتاب و المشرکین له صلی الله علیه وسلم بالرسالة و انه صادق فلم تدخلهم هذه الشهادة فی الاسلام علم ان الا سلام امر وراء ذلک و انه لیس هو المعرفة فقط و لا المعرفة و الاقرار فقط بل المعرفة و الا قرار و الا نقیاد و التزام طاعته و دینه ظاهرا و باطنا[1]

جو شخص کتب سیرت کا مطالعہ کرے گا اور ان میں بہت سے اہل کتاب اور مشرکین کی تصدیق کے واقعات پڑھے گا تو اس پر یہ بخوبی روشن ہو جائے گا کہ اسلام صرف آپ کی رسالت کی تصدیق کا نام نہیں نہ وہ صرف معرفت ہے نہ صرف معرفت و اقرار کا نام ہے بلکہ جب تک ان کے علاوہ آپ کی ظاہراً و باطناً فرمان برداری اور آپ کی پوری پوری اطاعت کا عہد بھی نہ کرے اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہو سکتا-

خلاصہ یہ کہ ایمان میں تصدیق کے ساتھ التزام طاعت ہی ایسا جزء ہے جس سے ایمان و کفر کی پوری پوری حقیقت جدا ہو سکتی ہے جنہوں نے ایمان کی تعریف میں صرف تصدیق پر اکتفاء کی ہے وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ رگ و پے میں تصدیق سرایت کر جانے کے بعد رسول کی اطاعت سے روگردانی کیسے ہو سکتی ہے[2] معتزلہ نے تو اس شبہ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ان کے نزدیک تصدیق

---

[1] زادالمعاد: ج ۳ ص ۵۵-

[2] جمہور اس کو معتزلہ کا مبالغہ سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس اعتراض کا مبنیٰ صرف عقلیات پر چلنا اور واقعات سے صرف نظر کر لینا ہے- آج بھی سب کو معلوم ہے کہ قتل کی سزا پھانسی اور چوری کی سزا جیل خانہ ہے مگر کیا یہ جرائم بند ہو گئے یا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان جرائم پیشہ کو اس قانون کی تصدیق حاصل نہیں ہوتی- اصل یہ ہے کہ انسان میں قوت واہمہ بھی ایک زبردست قوت ہے اس کا تصادم بسا اوقات یقین کے مقتضیٰ پر انسان کو عمل کرنے نہیں دیتا .....

حاصل ہونے کے بعد معصیت کا ارتکاب ممکن ہی نہیں وہ کہتے ہیں کہ جو شخص گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے درحقیقت اس کو اس پر ایمان ہی نہیں ہوتا کہ گناہ کبیرہ عذاب کی چیز ہے' اس لیے ان کے نزدیک مرتکب کبیرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے پس معتزلہ جن کی عقل کا مولانا اسلم صاحب کو بھی اعتراف ہے تصدیق کے ساتھ رسول کی اطاعت کو اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ عاصی کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش ہی نہیں دیکھتے - اور مولانا اطاعتِ رسول کو اتنا غیر ضروری سمجھے ہوئے ہیں کہ اُسے رسول کا حق ہی قرار نہیں دیتے - یہاں قرآن کا فیصلہ آیت بالا کے بموجب یہ ہے کہ ایمان کے لیے رسول کی اطاعت اتنی ضروری چیز ہے کہ جو شخص رسول کی اطاعت نہیں کرتا وہ مومن کامل بھی نہیں کہلا سکتا - یہ تو رسول کی اطاعت کا پہلو تھا' اب اس کے خلاف کا پہلو سنئے -

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ. (النور:٦٣)

تو جو لوگ اس کے حکم کا خلاف کرتے ہیں انہیں ذرا ڈرتے رہنا چاہیے کہیں کوئی فتنہ یا خدا کا دردناک عذاب نہ پکڑ لے -

ان تمام مقامات پر یہ کہے چلے جانا کہ رسول کے حکم سے مراد امام کا حکم ہے اور اس کی اطاعت سے مراد بھی امام ہی کی اطاعت ہے قرآن کے صریح الفاظ کو معطل کرنا ہے اگر ایسی تاویلات جائز سمجھی جائیں تو پھر قرآن سے کوئی مراد حاصل کرنا بھی مشکل ہوگا اور اس کے الفاظ سے امن اٹھ جائے گا اور ہر شخص من مانی جو چاہے مراد بیان کرے گا - رسولوں کے مطاع ہونے کا قانون اللہ تعالیٰ کا مستمر قانون ہے - قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول اطاعت ہی کے لیے رسول بنایا گیا ہے -

وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ. (النساء : ٦٤)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم کے ماتحت ان کی اطاعت اور فرمان برداری کی جائے -

پس رسولوں کا مطاع ہونا قرآن کے نزدیک حق رسالت ہے اور ایک ایسا عام قانون ہے جس سے کبھی کوئی رسول مستثنیٰ نہیں رہا اب مولانا کا یہ فرمانا کہ کبھی کسی رسول کو بہ حیثیت رسول مطاع نہیں سمجھا گیا' قرآن کے کتنا مخالف دعویٰ ہے - قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ہر رسول اطاعت ہی کے لیے مبعوث ہوا ہے' مولانا یہ کہتے ہیں کہ کوئی رسول اطاعت کے لیے نہیں آیا صرف ایمان کے لیے آیا ہے - مولانا فرماتے ہیں کہ ایمان کے لیے اطاعت لازم نہیں' قرآن یہ کہتا ہے کہ اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں -[1]

لله ..... دیتا مثلاً جب انسان کسی بلند دیوار پر چلتا ہے تو اگر اس کے وہم کا تصادم نہ ہو تو اس کے اپنے چلنے میں کوئی دشواری نہ ہو مگر اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب گرا' اب گرا اور اس لیے اس کو چلنا دوبھر ہو جاتا ہے -

حتیٰ کہ بسا اوقات وہ گر ہی پڑتا ہے - اسی طرح پورے یقین کے باوجود کبھی خواہشات انسانی اس کے نفس پر اتنا غلبہ کر لیتی ہیں کہ اسے توبہ' رحمت وغیرہ کے بھروسہ پر مقتضی یقین کے خلاف کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں - بہر حال یہاں تو بحث یہ ہے کہ تصدیق کے بعد اطاعت کرنے کا عزم بھی ایمان کے لیے ضروری ہے یا نہیں' اب آگے اس پر کتنا عمل میسر آتا ہے کتنا نہیں - یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے - مولانا کے نزدیک تو اطاعت رسول کا حق ہی نہیں یہ حق صرف امام کا ہے -

[1] پس اگر یہی تسلیم کر لیا جائے کہ منصب رسالت کے لیے صرف ایمان لانا ضروری ہے - پھر بھی رسول کی اطاعت ضروری ٹھیرتی ہے کیونکہ اطاعت کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں ہوتا -

اصل یہ ہے کہ قرآن صداقتوں کا ایک مجموعہ ہے اس کی ایک صداقت تسلیم کرنے سے دوسری صداقت تسلیم کرنی ضروری ہو جاتی ہے- اسی طرح جب اس کی ایک صداقت کا انکار کیا جاتا ہے تو دوسری صداقت کا انکار خود بخود سر پڑ جاتا ہے- مولانا نے جب قرآن کے خلاف یہ دعویٰ کیا کہ منصب رسالت کے لیے اطاعت ضروری نہیں ہے تو ان کو یہ بھی ماننا پڑا کہ رسول کو صرف زبان سے سچا کہہ دینے کا نام ایمان ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایک شخص آپ کی تصدیق کرتا ہے مگر آپ کے احکام نہیں مانتا وہ بھی مؤمن کہا جا سکتا ہے' یہ دوسری بات ہے کہ امام وقت کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے اس کو فاسق وغیرہ کہہ دیا جائے اور اگر کافر کہا جائے تو ہر امام کی اطاعت نہ کرنے سے کفر لازم آئے گا- رسول کی پھر کوئی خصوصیت نہ رہے گی- ان سب اختلافات کی بنیاد یہ ہے کہ منکرین حدیث کے نزدیک رسول کی وہ حیثیت ہی نہیں جو قرآن نے بتلائی ہے اس لیے وہ اس کو جتنا ہلکا بنا سکتے ہیں بنا دیتے ہیں- ہمارے نزدیک جب یہ ثابت ہے کہ رسول کی حیثیت امام کی حیثیت سے کہیں برتر ہوتی ہے وہ معصوم ہوتا ہے' اس کے لئے عصمت ضروری نہیں اس پر ایمان لانا ضروری ہے' امام کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں تو یہ کیسے معقول ہے کہ امامت کے لیے تو اطاعت لازم قرار دی جائے اور رسالت کے لیے لازم قرار نہ دی جائے یہ بھی عجیب فلسفہ ہے کہ جس پر ایمان لانا وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہو اس کی اطاعت کوئی ضروری امر نہ ہو- درحقیقت یہ تمام شاخیں رسول اور ایمان کی حقیقت سے ناواقفی کی بدولت پیدا ہوئی ہیں-

کتاب اللہ اور اطاعت رسول کا مطلب ⁕ یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کسی کی اطاعت کا مطلب اس کی ذات کی اطاعت نہیں ہوا کرتا' بلکہ اس کے احکام کی اطاعت ہی ہوا کرتا ہے- اسی لیے اللہ کی اطاعت کے معنی اس کی کتاب کی اطاعت ہیں- اسی طرح رسول کی اطاعت کے معنی بھی اس کے احکام کی اطاعت ہونا چاہئیں یہاں حیات اور وفات میں اگر کوئی فرق پڑتا ہے تو اتنا ہی کہ حالتِ حیات میں آپ ہمارے سامنے موجود تھے اَب دوسرے جہان میں موجود ہیں تو کیا اطاعت کے لیے مطاع کا سامنے موجود ہونا شرط ہے؟ آپ کی حیات میں بھی لوگ دیگر ممالک میں رہ کر آپ کے اسی طرح مطیع کہلائے جیسا مدینہ میں آپ کے احکام کی اطاعت کرنے والے-

فقرہ نمبر ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رسول کی اطاعت کا لفظ امام وقت کی اطاعت کے طفیل میں صادق کرنا چاہتے ہیں اور قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام وقت کی اطاعت رسول کے طفیل میں ہے اگر رسول کی اطاعت واجب نہ ہوتی تو کسی امام کی اطاعت بھی واجب نہ ہوتی - اماموں کی اطاعت اسی لیے ضروری ہے کہ اصل میں رسول کی اطاعت واجب ہو چکی ہے اور یہ اس کے جانشین بن کر اسی کی اطاعت کی طرف بلاتے ہیں' اسی لیے اگر ان کی دعوت کا رخ خدا اور رسول کی طرف نہ رہے تو ان کی اطاعت بھی واجب نہیں رہتی- ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جب مولانا کے نزدیک آپ کی اطاعت بہ حیثیت رسالت ضروری نہ ٹھیری اور جو اطاعت بہ حیثیت امامت واجب تھی وہ بعد وفات ختم ہوگئی اس لیے کہ مولانا کے نزدیک اطاعت عربی میں صرف زندہ کی فرمان برداری کو کہتے ہیں تو مولانا صاف یہ اعلان کیوں نہیں کر دیتے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہی نہیں رہی اور کیوں خواہ مخواہ زندہ جانشینوں کے پردہ میں اس کو مستمر بنانا چاہتے ہیں- پھر فقرہ نمبر ۵ میں یہ کیوں لکھ رہے ہیں کہ خلفاء کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے- خلفاء کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کہنا ہی غلط ہے اوّلاً

تو اس لیے کہ مولانا کے نزدیک رسول کی اطاعت ہی واجب نہیں- پھر فقرہ نمبر ۱۰ میں مولانا نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ دین کی ضروریات صرف قرآن کی اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں- یہاں مولانا نے اطاعت رسول کی مد درمیان سے صاف حذف کر ڈالی ہے- لہٰذا ہر زمانہ میں ہر امام کی اطاعت اسی طرح مستقل اطاعت ہے جیسا کہ آپ کے زمانہ امامت میں آپ کی اطاعت- اس کو رسول کی اطاعت کہنا بالکل بے معنی بات ہے رسول بھی اپنی عقل سے سمجھ کر قرآن کے تحت میں فیصلے کرتا تھا یہ امام بھی اسی طرح اپنی عقل سے سمجھ کر فیصلے دے گا- بلکہ اس امام کے سامنے رسول کے فیصلوں کی وہ حیثیت بھی نہیں ہے جو ماتحت عدالتوں کے نزدیک ہائی کورٹ کے فیصلوں کی ہوتی ہے' وہ اس کے ماننے پر مجبور ہیں یہ مجبور نہیں- والعیاذ باللہ- 10

ہمارے نزدیک قرآن میں ہر جگہ اطاعت رسول کی مستقل مد کو ختم کرنا اور اطاعت امام کی غیر مستقل مد کو مستقل حیثیت دیئے چلے جانا قرآنی آیات کے صریح تحریف ہے اگر نظم شریعت اس نقشہ کے مطابق ہوتا جو فقرہ نمبر ۱۰ میں مولانا نے ذکر کیا ہے تو آیت بالا میں اطاعت کا امر اس طرح ہوتا- ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء: ۵۹) اور اطاعت رسول کا ذکر ہی نہ ہوتا اور اگر ہوتا تو اس کو مستقل حیثیت اور اولوالامر کی طاعت کو غیر مستقل حیثیت نہ دی جاتی -فقرہ نمبر ۶ میں آیت بالا کی اس سے بڑھ کر ایک اور تحریف یہ کی گئی ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے- اس سے مراد امام وقت کی اطاعت ہے-

امام کی اطاعت کا وہ مقام نہیں ہوسکتا جو اللہ و رسول کی اطاعت کا ہے ❊ اگر یہ تسلیم کیا جائے تو آیت بالا میں تین اطاعتوں کی بجائے صرف ایک ہی اطاعت باقی رہ جاتی ہے- پھر اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد اولوالامر یعنی امام کی اطاعت کا دوبارہ حکم دینا بے معنی تکرار بن جاتا ہے- نیز پہلے اولوالامر کا ذکر آ جانے کے باوجود آخر آیت ﴿فان تنازعتم. الخ﴾ میں مرجع نزاع اللہ و رسول کو ٹھہرانا اور فردوہ الیھم کی بجائے ﴿فردوہ الی اللّٰہ و الرسول﴾ فرمانا اور زیادہ غیر مناسب ہے بلکہ صاف فردوہ الی الامام یا اولی الامر ہونا چاہیے- اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ اور رسول اور اولوالامر کی اطاعتیں جدا جدا ہیں- اللہ' رسول اور امام یہ تینوں الفاظ عربی زبان کے الفاظ ہیں' اللہ و رسول کے لفظ سے امام کا لفظ مراد لینا کون سا محاورہ اور کون سی لغت ہے- اگر اس خیال کی کوئی حقیقت ہوتی تو قرآن میں ایک آیت اس مضمون کی بھی ضرور آ جاتی **من یطع الامام فقد اطاع اللّٰہ و الرسول** (جس نے امام کی اطاعت کی اس نے اللہ و رسول کی اطاعت کی) جیسا کہ یہ فرمادیا ہے-

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. (النساء: ۸۰) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی-

پس یہ کہنا کہ اللہ اور رسول کے لفظ سے قرآن میں امام وقت کی اطاعت مراد لی گئی ہے سب سے بڑھ کر قرآن کی تحریف ہے- یہاں منکرین حدیث کا مفسرین کی عبارتوں سے مدد لینا نہایت نامناسب ہے جو لوگ حدیث رسول کو حجت نہیں مانتے وہ مفسرین کی آراء سے مدد لینا کیونکر جائز سمجھتے ہیں' انہیں جو دعویٰ کرنا ہے اسے قرآن سے ہی ثابت کرنا چاہیے- فقرہ نمبر ۱۰ میں مولانا نے اتباع قرآن کو یاد رکھا ہے مگر اس آیت کو فراموش کر دیا-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ. (آل عمران: ۳۱) آپ کہہ دیجئے اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو-

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ. (الاعراف:۱۵۷) جو (ہمارے ان) رسول نبی امیؐ (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی اے اللہ تو دنیا اور آخرت کی رحمت میرے اور میری امت کے لیے لکھ دے اس پر ان کو یہ جواب ملا کہ خدا کی رحمت کسی فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوسکتی وہ آئندہ ہر اس شخص کے نصیب میں آچکی ہے جو منجملہ اور اوصاف کے نبی امی کی اتباع کرے گا۔ اس کے بعد پھر قرآن نے آپ کی اور اپنی اتباع کی دعوت دی ہے یہ کس قدر صریح ظلم ہے کہ جہاں جہاں رسول کی اطاعت اور صرف رسول ہی کی اتباع کا ذکر ہے اس کو صاف حذف کر دیا جائے یا اس سے امام کی حیثیت مراد لے لی جائے۔

امام کی اطاعت کو بعینہٖ خدا اور رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکتا ٭ اس کے بعد ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ رسول کی اطاعت چونکہ خدا کے بیان' اس کی اراءۃ' اس کی وحی کے بعد ہوتی ہے اس لیے اس کو بعینہٖ خدا کی اطاعت کہا جاتا ہے' امام پر نہ وحی آتی ہے نہ خدا کی طرف سے اس کی صواب رسی کی کوئی ضمانت دی گئی ہے۔ وہ جو حکم دیتا ہے اپنی صواب دید' اپنی فہم اپنے علم کے مطابق دیتا ہے۔ اس لیے امام کی اطاعت کو بعینہٖ خدا اور رسول کی اطاعت کہنا بھی غلط ہے۔ ہاں اگر اس معنی سے کہا جا سکتا کہ امام کی اطاعت خدا اور رسول کے حکم سے کی جاتی ہے تو یہ اور بات ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا تو یہ فرمایا دیکھو جب دشمن کا محاصرہ کرو اور محاصرہ توڑنے کی نوبت آئے تو خدا کے فیصلہ پر محاصرہ مت توڑنا بلکہ یہ کہنا کہ میں اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے فیصلہ کے مطابق تم سے صلح کرسکتا ہوں' اگر تم خدا کا نام درمیان میں لاؤ گے تو تمہارے پاس اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان کے بارے میں جو خدا کا فیصلہ ہے وہ یقینی تمہاری سمجھ میں بھی آ ہی جائے گا (وحی تم پر آتی نہیں' عصمت تمہاری صفت نہیں' حفاظت ربانی تمہاری ضامن نہیں) اس لیے تم اپنے ہی فیصلہ کا حوالہ دینا' اس میں دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر تمہیں اس فیصلہ کا توڑ دینا قرین مصلحت معلوم ہو تو آسانی توڑ بھی سکتے ہو کیونکہ خدا کا فیصلہ کہہ کر توڑنا تو آسان بات نہیں ہے ہاں اپنا فیصلہ جیسا پہلے ایک طرف تھا اب دوسری طرف بھی بآسانی بدلا جاسکتا ہے۔

اس واقعہ سے ثابت ہے کہ امام کی اطاعت کو ٹھیک اللہ اور رسول کی اطاعت کا مقام نصیب نہیں ہوسکتا تاکہ قرآن میں ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مراد لی جاسکے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے منشی نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر یہ الفاظ لکھ دیئے ''هذا ما أرى الله امير المومنين عمر'' (یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خیال میں ڈالا ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور کہا کہ یوں مت لکھو بلکہ یہ لکھو ''هذا ما رأى امير المومنين عمر'' (یہ وہ فیصلہ ہے جو امیر المومنین عمرؓ نے خود اپنے خیال کے مطابق صادر کیا ہے)[1] ایک مرتبہ منبر پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

---

[1] اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۳۲۔

ايها الناس ان الرأى انما كان من رسول الله صلى الله عليه وسلم مصيبا ان الله كان يريه و انما هو منا الظن و التكلف.[1]

لوگو دیکھو آنحضرتؐ کی رائے دین کے بارے میں اس لیے صواب ہوتی تھی کہ وہ خدا کی طرف سے ہوا کرتی تھی' ہماری رائے تو ہماری جانب سے صرف ایک اٹکل ہوتی ہے وہ قابل اعتماد نہیں-

اطاعت رسول کی دس خصوصیات ٭ یہ بات یادر کھنے کے لائق ہے کہ قرآن کریم سے جو خصائص ہمیں اطاعت رسول کے معلوم ہوئے ہیں وہ اطاعت امام کے ثابت نہیں ہو سکے-

(۱) اپنے ہر معاملہ کو رسول کے سپرد کر دینا' پھر اس کے ہر فیصلہ کو حق سمجھنا اور اس پر ایسی خوشی سے راضی ہو جانا کہ خلاف ہونے کی صورت میں دل کے اندر بھی کوئی تنگی محسوس نہ ہو-

(۲) اس کے فیصلہ کا کہیں اپیل نہ ہونا-

(۳) اس کے فیصلہ پر رضامندی شرط ایمان ہونا-

(۴) اس کا ہر فیصلہ ناطق ہونا-

(۵) اس کی اطاعت میں ہدایت منحصر ہونا- و ان تطیعوہ تھتدوا - (اگر تم اس کی اطاعت کرو گے تو یقیناً راہ ہدایت پاؤ گے)-

(۶) اس کی اطاعت کا بعینہ خدا کی اطاعت ہونا-

(۷) اس کی اتباع میں خدا کی محبت اور گناہوں کی مغفرت کا یقینی حاصل ہونا-

(۸) کسی خاص مشورہ کی مجلس میں اس سے استیذان لازم ہونا اور اس اجازت کا معیار کمال ایمان ہونا-

(۱۰) اس کی اطاعت کے لیے کسی دلیل کا محتاج نہ ہونا-

یہ دس خصوصیات ہیں جو قرآن کریم سے صرف رسول کی اطاعت کی ثابت ہوتی ہیں- امام کی اطاعت کی یہ خصوصیات نہیں اس لیے قرآن کریم میں ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مراد لینا صحیح نہیں- نیز اطاعت رسول کی ان تاکیدی آیات سے مولانا کے دوسرے خیال کی بھی تردید ہوتی ہے- مولانا فرماتے ہیں کہ اطاعت رسالت کا حق نہیں ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ سب سے بڑھ کر اطاعت کرنا رسول ہی کا حق ہے-

مذکورہ بالا وجوہات کے سوا یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر اللہ و رسول سے مراد امام وقت ہو تو یہاں سوال یہ ہے کہ اگر امام سے ہر امام مراد ہو تو فاسق امام کی اطاعت کو بھی اللہ و رسول کی اطاعت کہا جا سکے گا اور اگر خاص صالح امام مراد لیا جائے تو خلفاء راشدین کے بعد تیرہ سو سال میں خدا و رسول کی اطاعت کا مصداق ہی شاذ و نادر ہو گا پھر جس دور میں مسلمانوں کا کوئی امام ہی نہ رہے اس میں لازم آئے گا کہ خدا اور رسول کی اطاعت کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے اور اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا نظام معطل پڑا رہے-

---

[1] اعلام الموقعین: ج ۱ ص ۴۵-

خلاصہ یہ کہ قرآن کی بے شمار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور نجات کا راستہ صرف اطاعت خدا اور رسول میں منحصر ہے' اب اگر یہاں اطاعت سے مراد امام کی اطاعت ہو تو یقیناً تیرہ سو سال میں اماموں کا بڑا حصہ ایسا ہی ہے جن کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں کہا جا سکتا- مولانا اسلم صاحب کی تفسیر کے مطابق لازم آتا ہے کہ اس تمام دور میں مسلمانوں کے لیے راہِ نجات و ہدایت مسدود ہوا اور مسلمانوں کے پاس اپنے باہمی نزاعات رفع کرنے کی کوئی صورت ہی موجود نہ ہو گویا دین اسلام ایک ایسا آئین ہو جس پر عمل کرنا دنیا کی طاقت سے باہر ہو'اب ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس زمانہ میں مولانا کا اپنے متعلق خیال کیا ہے- کیا وہ اللہ و رسول کی اطاعت میں مصروف ہیں یا امام وقت نہ ہونے کی وجہ سے اس امر کا امتثال کرنے سے معذور ہیں-

انتشارِ امت کا سبب احادیث نہیں بلکہ ترکِ احادیث ہے ⁕ فقرہ نمبر ۹ میں انفرادیت اور انتشار کا جو باعث قرار دیا گیا ہے وہ بھی محض بے بنیاد ہے' بلکہ اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو رسول کی اطاعت نہ کرنا ہی اس انتشار کا باعث ہوا ہے- عجیب بات ہے کہ قرآن کی مجمل آیات کی تشریح اگر عقل کے ذریعہ سے کی جائے تو موجب انتشار نہ ہو اور اگر خود رسول کے بیان کے بموجب کی جائے تو انتشار کا سبب بن جائے' اللہ تعالیٰ نے فہم انسانی کے اختلافات مراتب ہی کی وجہ سے قرآن فہمی کا مدار انسانی عقول پر نہیں رکھا تھا بلکہ اپنے رسول کے ذریعہ خود اپنی مراد واضح کر دی تھی تاکہ عبارتی احتمالات کا دائرہ مختصر ہو جائے لیکن مولانا نہایت سادگی سے علم حدیث کے صفحہ ۴۴ پر یہ فرماتے ہیں-

''بے شک آیاتِ قرآنی کے معانی سمجھنے میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں مگر یہ اختلافات چونکہ الفاظ وعبارات کے نہ ہوں گے بلکہ صرف فہم کے ہوں گے اس لیے مزید غور وفکر سے مٹ جائیں گے اور ان سے فرقہ بندی نہ ہو سکے گی-''

شاید مولانا کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ تاریخ میں جتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں ان کی اصل بنیاد قرآن ہی پر ہے- معتزلہ خوارج 'مرجیہ'جہمیہ سب کو دیکھ لیجئے' سب کے ہاتھوں میں پہلے قرآن ہے بعد میں حدیث ہے بلکہ معتزلہ تو خبر واحد حدیث کے منکر ہیں پھر حدیث کو بدنام کرنا فضول ہے حقیقت یہ ہے کہ فرقہ بندی کا باعث نہ قرآن ہے نہ حدیث بلکہ وہ عقل ہے جو صرف اپنے اعتماد پر مذہب کا نقشہ تیار کرنا چاہتی ہے چونکہ عقل وفہم کے مراتب احادیث کے الفاظ سے زیادہ مختلف ہیں اس لیے ان کا اختلاف بھی زیادہ ہونا چاہیے- مزید غور وفکر سے اختلافات نہ آج تک کبھی ختم ہو سکے نہ آئندہ ہو سکتے ہیں- یہ طفل تسلی منکرین حدیث کے لیے تو کافی ہے مگر واقعات کے سرتاسر خلاف ہے- عقل انسانی کی نارسائی اور قصور ہی کی وجہ سے آسمان سے کتابیں آئیں' رسولوں کو ان کو سمجھانے کے لیے بھیجا گیا پھر ان کے ذریعہ سے اس پر عمل کرا کے دکھلا دیا گیا- اگر عبادات ومعاملات کا نقشہ صرف الفاظ قرآنی سے تیار ہو سکتا تو رسول کا واسطہ ہی بیکار رہتا- پس افتراق وتشتت کا اصل منشا احادیث نہیں بلکہ خود ان کی عقل ہے جب کبھی وہ احادیث کی روشنی کے بغیر ہدایت کا راستہ تلاش کرنے میں پڑ گئی اسی وقت افتراق وانفرادیت نمودار ہونے لگی جیسا کہ ہمارے مضمون ''افتراقِ امت'' میں اس پر تفصیلی بحث گذر چکی ہے- ابوعمر حسن بن واصل سے نقل کرتے ہیں کہ پہلی امتوں میں افتراق و تشتت اسی وقت پھیلا ہے جب کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے آثار وسنن چھوڑ کر رائے کی اتباع کرنا شروع کر دی پھر خود بھی گمراہ

ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔[1]

صحابہ کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ✻ صحابہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سب سے پہلے' بعد کتاب اللہ کے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی تلاش کیا کرتے تھے اگر وہ نہ ملتی تو اس کے بعد اپنی جانب سے جو سمجھ میں آتا فیصلہ کرتے اور اگر اس کے بعد بھی آپ کی سنت ہاتھ آجاتی تو اسی کی اتباع کرتے اور اپنے قول سے رجوع کر لیتے جیسا کہ اس کی مثالیں حدیث رسول کی حیثیت میں پہلے مذکور ہو چکی ہیں - اگر بقول مولانا آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ان کی نظر میں صرف ایک امام کی حیثیت ہوتی تو وہ آپ کی اطاعت صرف آپ کے زمانہ حیات سے وابستہ سمجھتے اور اس کے بعد ان کے نزدیک آپ کے قضایا اور فیصلوں کی حیثیت ایک عدالت کے فیصلے سے زیادہ نہ رہتی مولانا کے نزدیک نظم اسلامی کی بنیاد صرف کتاب اللہ پر ہے پھر ہر شخص اپنی عقل کے مطابق اس کے تحت میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے -آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عقل سے سمجھ کر جو فیصلے کیے ان کی حیثیت ایسا ہی ہے جیسا کہ بعد کے خلفاء نے اپنی اپنی اندازۂ عقل سے فیصلے صادر کیے جس طرح ایک خلیفہ کا فیصلہ دوسرے کے لیے حجت نہیں ہوتا اس کو اختیار ہے کہ اس کے ساتھ موافقت کرے یا مخالفت' یہی حیثیت آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے فیصلوں کی بھی ہے مگر ہمیں صحابہ کی تاریخ سے اس کے بالکل برعکس ثابت ہوتا ہے -ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بتایا جا سکتا جہاں کسی صحابیؓ نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ سنا ہو اور اس کے ثبوت کے بعد پھر اس کے خلاف فیصلے کرنے کا اپنے دل میں خطرہ بھی محسوس کیا ہو -یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کے درمیان آپ کی حیثیت آپ کی وفات کے بعد بھی وہی تھی جو آپ کی حیات میں تھی دونوں حالتوں میں وہ آپ ہی کا فیصلہ تلاش کرتے تھے اور جب آپ کا فیصلہ انہیں مل جاتا تھا تو دونوں حالتوں میں اس پر راضی ہو جانا اور اس کے خلاف میں اپنا اختیار باقی نہ رہنا بالکل یکساں سمجھتے تھے - یہ ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کسی ایک متنفس نے بھی آپ کی اطاعت میں زندگی اور وفات کے بعد ایک ذرہ برابر بھی کبھی فرق کیا ہو' ان کے نزدیک جس طرح رسول کی وفات سے اس پر ایمان لانے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اسی طرح اس کے احکام کی اطاعت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا' یہ ایمان منکرین حدیث ہی کا ایمان ہے جس میں رسول کی وفات کے بعد اس کی اطاعت سے آزادی میسر آجاتی ہے اور اس کی حیثیت ایک امام وقت سے بھی گھٹ جاتی ہے کیونکہ امام وقت کی اطاعت کرنا واجب ہوتی ہے اور رسول کی اطاعت اس کے بعد واجب نہیں رہتی - رسول کو امام اور حدیث کو اسلام کی محض ایک تاریخ کہنا اسلامی تعلیمات پر سب سے بڑا بہتان ہے جس کی تردید کے لیے ایک دلیل نہیں بلکہ مسلمانوں اور کفار کا تواتر موجود ہے لیکن جس دور میں ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں قلم ہے اپنے خیالات کے اظہار میں آزاد ہو' اس میں تواتر کا انکار بھی مشکل نہیں -

رسالت کی ضرورت ✻ ہم پہلے بہ تفصیل یہ بتلا چکے ہیں کہ قرآن کریم کو اپنی تلاوت کے ابتدائی مرحلہ سے لے کر اپنی مراد کی تعیین اور عمل کی تشکیل کے ایک ایک گوشہ تک رسول کی احتیاج ہے - رسول کی ضرورت صرف اتنی بات کے لیے نہیں ہوتی کہ وہ

[1] اعلام الموقعین : ج ۱ ص ۶۵ -

خدا کی کتاب ہم تک پہنچا دیں بلکہ اس سے بڑھ کر اس کو سمجھانے، اس پر عمل کر کے دکھلانے، اپنی موعظت اور نصائح اور صحبت کے غیر معمولی اثرات سے اس پر عمل کی اسپرٹ بھی پیدا کر دینے اور اس راہ میں جو عملی مشکلات ہوں ان کو بھی دور کرنے کی جد و جہد میں لگا رہنے کے لیے ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں یہ سب فرائض یکساں طور پر نظر آتے ہیں اور یوم بعثت سے لے کر یوم وفات کے ایک ایک دن کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ آپ کا نصب العین اور آپ کا اصل مشن ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس میں دین کے قانون کو خدا کی زمین پر بلا زحمت قائم کرنا آپ کی بعثت کا وہ بڑا نصب العین سمجھا گیا ہے کہ جب تک یہ مقصد پورا نہیں ہولیا آپ کو عالم قدس کی طرف بلانے کی دعوت بھی نہیں دی گئی اور جب خدا کا آئین مکمل کر دیا گیا اس کی تعلیم اور عملی تشکیل پورے طور پر کر دی گئی اور خدا کی زمین پر یہ مکمل آئین پوری تمکین وقدرت کے ساتھ نافذ ہونے لگا تو قرآن نے یہ اعلان کر دیا کہ اب بعثت تامہ کا مقصد پورا ہو گیا ہے لہٰذا اب رسالت کے فرائض کے بعد صرف خلافت کے فرائض کے انجام دہی باقی ہے اس کو آپ کے خلفاء انجام دیتے رہیں گے اسی کی طرف سورہ ''النصر'' میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

منکرین حدیث کی یہ بڑی غلطی ہے کہ رسالت کی ضرورت کو انہوں نے صرف کتاب کی تبلیغ میں منحصر کر دیا ہے اس کے بعد اس کے دوسرے اہم گوشوں کو عقل انسانی کے حوالہ کر دیا ہے، قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پر براہ راست قرآن اترا کرتا تھا اگر ان کی حفاظت بھی سماوی طور پر نہ ہوتی رہتی تو بعض بعض عملی مقامات پر پائے نبوت کو بھی لغزش ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ رسول کی عصمت اور اس حفاظت کے باوجود قدم قدم پر انہیں استقامت اور احتیاط کی تاکیدیں کی جاتی تھیں۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ وَ لَا تَطْغَوْا. (ھود : ۱۱۲)

(اے پیغمبر) جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے تم اور جو لوگ کفر و شرک سے توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہوئے ہیں اسلام پر قائم رہو اور حد اعتدال سے نہ بڑھو۔

ہمہ وقت وحی الٰہی انہیں متنبہ کرتی رہتی تھی کہ کہیں ان کے فیصلوں میں خواہشاتِ نفس کا دخل نہ ہو جائے، کامل سے کامل عقل عطا فرما کر ان کو یہ جتایا جاتا تھا کہ یہ علوم صرف خدائی موہبت اور اس کا انعام ہیں تمہاری عقل و ادراک سے بالاتر ہیں۔ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ کبھی کبھی ان کو ٹو کا بھی جاتا تھا تا کہ یہ ثابت ہو جائے کہ رسول بھی اپنی ذاتی عقل سے ہمیشہ خدا کی مرضیات نہیں پا سکتا اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اگر کبھی کوئی حرکت ان کے منصب کے خلاف ان سے سرزد ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی فوراً اس پر متنبہ کیے بغیر نہیں رہتی پس رسولوں سے عتاب آمیز خطاب اگر ہوتا ہے تو اسی بات کے ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ جس امر کے خلاف وحی الٰہی نہ آئے اس میں رسول کی رائے خدا کا حکم سمجھنا چاہیے۔ سوچئے کہ جب دین کے معاملات میں خود رسول کے حق میں یہ نزاکتیں ہیں تو کیا قرآن فہمی، اس کی عملی تشکیل، اس کے معانی کی تفسیر یہ عام عقول کے سپرد کی جا سکتی ہیں اور جب اس عصمت و حفاظت کے باوجود، اس کمال عقل و فراست کے باوصف رسولوں سے لغزش کا امکان ہے تو عام عقول یہاں کتنی تاریکی پیدا کر سکتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے اس کی بہت سی کوتاہیاں اس کے ذاتی ضعف کا نتیجہ ہیں۔ اگر قدرت ان کے اثرات سے محفوظ نہ رکھے تو ان کا صدور اس کے لیے لازم ہے۔ یہ قصور و تقصیرات ذاتی طور پر قابل ملامت نہیں لیکن اگر آئین میں یہ قصور داخل ہو جائے تو وہ ذاتی قصور نہیں رہتا بلکہ عالم کے نقصان کا باعث بن جاتا ہے اس لیے کتاب اللہ کے

ساتھ رسول کے آئینی بیان میں کوئی ادنیٰ فروگذاشت برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اگر آئین سازی میں بھی عام عقلوں کا دخل ہو تو کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے۔

وَ لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ. (المومنون : ۷۱)	اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان اور زمین اور اس میں جو کچھ ہے سب کا نظام بگڑ جائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَ اعْلَمُوْا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ. (الحجرات:۷)	اور سمجھ لو کہ تم میں خدا کا رسول ہے اگر بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت کرے تو تم بڑی مشقت میں مبتلا ہو جاؤ۔

معلوم ہوا کہ قانونی معاملات میں رائے عامہ کا کوئی دخل نہیں ہے یہ سب تفصیلات رسول کے حوالہ ہیں مولانا اسلم صاحب رسول کی اس عقل کامل کے مقابلہ میں ہمہ شما کی عقول کو ترجیح دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ کے تمام فیصلوں کی وہی قدر و قیمت ہے جو ایک عدالت کے سامنے دوسری معمولی عدالتوں کے فیصلوں کی قیمت ہوتی ہے۔ مولانا کے نزدیک رسول کی ضرورت صرف قرآن کے لیے ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں کے لیے رسول کی ضرورت ہے جو شخص رسول کی احادیث سے مستغنی ہونا چاہتا ہے اور محض اپنی عقل سے قرآن کی تشریحات کرتا ہے وہ درحقیقت کتاب اللہ کے ساتھ آئین سازی میں شرکت کا مدعی ہے اور جو شخص اپنے فیصلوں کو رسول کے فیصلوں کے ہم پلہ سمجھتا ہے وہ درحقیقت رسول کا منکر ہے۔ بلکہ رسالت کی ضرورت ہی کا منکر ہے۔ قرآن کریم سے رسالت کی جو ضروریات ثابت ہوتی ہیں وہ صرف ایک قرآن کی تبلیغ نہیں اس کی تعلیم، اس کا بیان اور اس کی عملی تشکیل بھی اس کے فرائض میں ہے اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ حدیث یعنی بیانِ رسول کا انکار اور رسول کا انکار ایک ہی مسئلہ ہے۔ یہ بات فراموش نہ کرنا چاہیے کہ جو شخص رسول کا صحیح مقام نہیں پہچانتا اس کی عظمت اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتا وہ بھی رسولوں کے منکرین ہی کی صف میں شامل ہے فرق صرف یہ ہے کہ ایک صاف منکر ہے اور ایک اقرار نما منکر ہے۔

رسول میں رسالت اور امامت کی دو حیثیتیں نہیں ہوتیں ✻ اسی لیے منکرین حدیث کو رسول کی عظمت ختم کرتے کرتے اس کو صرف ایک پوسٹ مین کی حیثیت دینی پڑتی ہے وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ ڈاک کا تھیلہ اس کے گلے میں ہو، جونہی کہ وہ تبلیغ رسالت سے فارغ ہوا اس کے بعد پھر فوراً اماموں کی صف میں آ کر شامل ہو جاتا ہے اس کی رسالت کے تمام حقوق اس سے مسلوب ہو جاتے ہیں اور وہ عام اماموں کی طرح ایک امام بن جاتا ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ شاید ابھی اس کو یہاں بھی اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہو اور جب تک وہ امام کے فرائض انجام دے امام سمجھا جاتا ہو اور جب اس سے بھی فارغ ہو لے تو پھر رسول اور امام دونوں حیثیتوں سے نکل کر اسے عام انسانوں کی صف میں آنا پڑتا ہو۔ کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) دن بھر میں صرف چند لمحات کے لیے تو بہ حیثیت رسول سمجھے جاتے تھے پھر کچھ وقت کے لیے بہ حیثیت امام، اس کے بعد عام حیثیات میں صرف معمولی انسانوں کی حیثیت میں سمجھے جاتے تھے اگر منبر اور مصلیٰ میدانِ جنگ اور مدینہ، محفل اور بستر خواب پر آپ کی ایک ہی حیثیت سمجھی گئی ہے تو پھر معلوم نہیں کہ مولانا نے ان حیثیات کی تقسیم از خود کہاں سے پیدا کر لی۔ پھر امامت و رسالت کے حقوق بھی

متضاد حقوق ہیں- رسول پر بقول مولانا صرف ایمان لانا واجب ہے مگر امام پر ایمان نہ لانا ضروری ہے- آپ بیک وقت لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے تھے اور اسی وقت اپنی اطاعت کا امر بھی فرماتے تھے مگر کبھی یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ آپ نے اپنے ان متضاد حقوق کو اپنے دو مختلف منصبوں سے خود متعلق سمجھا ہو یا دوسروں کو اس پر کبھی تنبیہ کی ہو پھر اس وقت ان امی مخاطبین کے لیے جنہوں نے منطق کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا رسالہ بھی نہیں پڑھا تھا یہ تقسیم کرنا کتنا مشکل ہوتا ہوگا کہ وہ ان متضاد حقوق کو ہمیشہ دو مختلف حیثیتوں کے ساتھ جدا جدا ملحوظ رکھیں جب محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ حیثیت رسول ظاہر ہوں تو ان پر فوراً ایمان لے آئیں اور جب بہ حیثیت امام نمودار ہوں تو ان کا انکار کر دیں اور کہہ دیں کہ یہ انکار بہ حیثیت امامت ہے نہ بہ حیثیت رسالت یا یہ اطاعت بہ حیثیت امامت ہے نہ بہ حیثیت رسالت، پس حق بات یہ ہے کہ آپ کی ذات میں ذہنی لحاظ سے خواہ کتنی بھی حیثیات پیدا کر دی جائیں مگر آپ نبوت سے سرفرازی کے بعد سے یوم وفات کے ایک ایک لمحہ تک کبھی حیثیت رسالت سے علیحدہ نہیں ہوئے ہمیشہ آپ پر ایمان، آپ کی اطاعت، آپ کی عظمت اسی منصب کے ماتحت ہوئی اور آج بھی آپ پر ایمان آپ کی اطاعت اور آپ کا احترام اسی منصب رسالت کے اعتبار سے ہے اور تا قیامت اسی حیثیت سے کیا جاتا رہے گا اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ سب حق کے خلاف ہے-

اسوۂ رسول کی حیثیت ✻ یہ سوال بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ رسالت اور امامت کی دو حیثیتوں کی تقسیم کے بعد یہ بتایا جائے کہ اسوۂ رسول کی پیروی کس حیثیت سے ہے اگر حیثیت رسالت سے ہو تو اطاعت اس کا حق نہیں- اس حیثیت سے رسول کا حق صرف اس پر ایمان لانا ہے اور اگر بہ حیثیت امامت قرار دی جائے تو پھر اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی خصوصیت کیا ہے ہر امام اسوۂ حجت بن سکے گا- اگر یہ کہا جائے کہ اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بعینہٖ قرآن پاک ہے لہٰذا اس کی اطاعت قرآن کی اطاعت میں درج ہے تو یہ بتانا چاہیے کہ جب کتاب اللہ اور اسوۂ رسول میں کوئی فرق ہی نہ تھا تو پھر قرآن کے بعد اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت کیا تھی- اور اگر اس اسوۂ میں کچھ تفصیلات قرآن سے زیادہ تھیں تو پھر اس زیادتی میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا جواب دیا جائے کہ وہ کس حیثیت سے ہے؟ رسالت کی حیثیت سے اطاعت واجب ہو نہیں سکتی اور امامت کی حیثیت اسوہ بننے کے قابل نہیں- مولانا اسلم صاحب ایک طرف تو رسول کے مطاع ہونے کا انکار کرتے جاتے ہیں دوسری طرف اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو متواتر کہہ کر اس کی پیروی کرنا بھی لازم قرار دیتے جاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ انہوں نے اسوۂ رسول کو متواتر کہہ کر معاملہ کی نوعیت صاف کر دی ہے حالانکہ یہاں سوال تواتر کا نہیں ہے بلکہ یہ سوال ہے کہ اگر رسول اصولاً مطاع ہوتا ہی نہیں تو پھر اس کے اسوہ کی پیروی کیسے لازم ہو سکتی ہے- دیکھئے امامت کا حق اگر ایمان نہیں تھا تو کسی امام کے اسوہ کے متواتر ہونے سے کیا اس پر ایمان لانا اس کا حق ثابت ہو سکتا ہے- پس اگر رسول خود مطاع نہیں ہوتا تو اس کا اسوہ متواتر ہو یا غیر متواتر کیسے مطاع ہو سکتا ہے ہاں اگر پہلے اطاعت رسول کا حق تسلیم کر لیا جائے تو پھر بعض اعمال کی اطاعت اور بعض کی اطاعت نہ کرنے میں تواتر یا غیر تواتر کا عذر پیش کرنا معقول ہو سکتا ہے- پس اسوۂ رسول کو حجت تسلیم کر لینا اس کا اقرار کر لینا ہے کہ رسول مطاع ہوتا ہے بلکہ مطاعون میں بھی وہ مطاع ہوتا ہے جس کی اطاعت سب سے بڑھ کر واجب ہے- اسوۂ رسول کو تسلیم

کر کے اطاعت رسول سے انکار کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی- یہاں مولانا نے اس پر غور ہی نہیں فرمایا کہ اسوۂ رسول کی اتباع کا اقرار کر لینا ان کے حق میں اتنی بڑی اطاعت کا اقرار کر لینا ہے جو کسی امام کے لیے نہیں کیا جا سکتا- اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولوں کا علی الاطلاق اسوہ ہونا ان کی عصمت کا نتیجہ ہوتا ہے جو ہر گناہ سے منزہ اور ہر معصیت سے مبرا ہوحتیٰ کہ اس کے خطرات بھی خدا تعالیٰ کے زیر نگرانی ہوں' اس کی کوئی بات اپنی خواہش نفس سے نہ ہو- وہی اس قابل ہے کہ اس کی ذات کو علی الاطلاق نمونہ کہہ دیا جائے اسی کا ہر عمل مقبول' ہر قول حق اور ہر ادا محبوب ہو سکتی ہے اور وہی اس قابل بن سکتا ہے کہ تمام مخلوق کو آنکھ میچ کر اس کے اتباع کی دعوت دے دی جائے اس حیثیت کو تسلیم کر کے مولانا اسلم صاحب کا یہ کہنا کہ رسول کی اطاعت کسی معمولی جزئی میں بھی واجب نہیں ہے کتنا عجیب دعویٰ ہے-

اسوۂ رسول اور حدیث ٭ اسوۂ رسول کو حدیث سے بالکل ایک جدا شعبہ سمجھنا بھی بڑی غلطی ہے اس غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ مولانا اسلم صاحب نے خود بخود یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ تمام اسوۂ رسول متواتر ہے اب چونکہ حدیث کا متواتر ہونا وہ تسلیم نہیں کرتے اس لیے انہوں نے اسوۂ رسول کو حدیث سے ایک جدا چیز سمجھ لیا ہے- شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث صرف اس حصہ کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے متعلق ہے اس لیے آپ کے افعال حدیث میں شمار نہیں کرتے- حالانکہ آپ کا ہر قول اور آپ کا ہر عمل سب حدیث کا جزء ہے' اسی طرح اسوۂ رسول صرف عمل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ آپ کا قول و فعل جو کچھ بھی ہے وہ سب امت کے لیے نمونہ ہے' کچھ نماز' روزہ' حج اور زکوۃ ہی پر موقوف نہیں بلکہ رسول کی ذات جس طرح اس بارے میں اسوہ ہے اسی طرح فصل خصومات' امت کے نظم و نسق اور دیگر ضروریات میں بھی اسوہ ہے حتیٰ کہ خوش طبعی' ہنسی اور مسکراہٹ کے طور و انداز میں بھی قرآن کریم نے کسی ادنیٰ تفصیل کے بغیر تمام امور میں آپ کی ذات کو اسوہ کہا ہے اور کوئی معمولی سے معمولی اشارہ بھی اس طرف نہیں کیا کہ نماز و روزہ یا عبادات کی تشریح کے سوا بقیہ امور میں آپ کی ذات اسوہ نہیں ہے جن لوگوں نے یہاں کوئی تفصیل کی ہے وہ خود ان کے دماغ کی ایجاد کردہ ہے اور وہ خود ہی اس کے ذمہ دار ہیں- قرآن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے- مولانا اسلم صاحب اسوۂ حسنہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں-

> ''بے شک قرآن کریم نے ان تفصیلات کو اپنے ذمہ نہیں لیا مگر اس نے اپنے احکام کی عملی تشکیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دی ہے وہ عملی نمونے بسلسلہ متواتر چلے آ رہے ہیں اور بالکل یقینی ہیں لاریب آپ کی تعلیم و تبیین دینی ہے لیکن وہ وہی عملی تشریح یعنی اسوۂ حسنہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا-''

(علم حدیث ص ۳٦)

صحابہؓ کے دور میں اسوۂ حسنہ کا عموم ٭ (۱) عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مسئلہ دریافت کیا گیا' ایک شخص نے یہ نذر کی ہے کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھا کرے گا- اتفاقِ وقت کہ اس کے بعد ہی عید الاضحیٰ یا عید الفطر آ گئی' کیا وہ ان ایام میں بھی روزہ رکھے فرمایا نہیں اور یہ آیت پڑھی ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بقرعید

اور عید الفطر میں نہ خود روزہ رکھتے تھے۔ نہ روزہ رکھنا پسند کرتے تھے۔[1]

(۲) سعید بن جبیر کہتے ہیں اگر ایک شخص اپنے نفس پر کوئی چیز حرام کر لے تو اسے کفارۂ یمین ادا کرنا چاہیے اس کے بعد ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت کی۔ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾. (الاحزاب: ۲۱)[2]

(۳) عمرو بن دینار کہتے ہیں ہم نے ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق مسئلہ دریافت کیا جس نے عمرہ کا طواف تو کر لیا ہے مگر ابھی صفا و مروہ کی سعی نہیں کی کیا وہ اپنی بی بی سے صحبت کر سکتا ہے؟ فرمایا (نہیں) کیونکہ جب آپ مکہ مکرمہ تشریف لائے تھے تو آپ نے بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پاس رکعتین طواف ادا فرمائیں (پھر درمیان میں حلال نہیں ہوئے) اس کے بعد صفا و مروہ کی سات مرتبہ سعی کی اور یہ آیت پڑھی ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾. (الاحزاب: ۲۱)[3]

(۴) نافع کہتے ہیں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے سال حج کا ارادہ کیا' لوگوں نے عرض کیا ہمیں امسال جنگ کا اندیشہ ہے ایسا نہ ہو کہ لوگ آپ کو حج ادا کرنے سے روک دیں آپ نے فرمایا کیا مضائقہ ہے۔ اگر انہوں نے مجھے روکا تو میں وہی عمل کروں گا جو ایسے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور یہ آیت پڑھی ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾۔ (الاحزاب: ۲۱)[4]

(۵) زیاد بن جبیرؒ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ ابن عمرؓ ایک شخص کے پاس آئے وہ اپنے اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا تھا فرمایا کہ اسے کھڑا کر کے نحر کر۔ سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اسی طرح تھا۔[5]

(۶) عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا حجر اسود کو بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے اگر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں ہرگز بوسہ نہ دیتا۔[6]

(۷) ایک شخص نے حجر اسود کے استلام کے متعلق ابن عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا انہوں نے فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے اس نے کہا اگر بھیڑ ہو' اگر موقعہ نہ مل سکے فرمایا اگر اگر کو تو یمن میں پھینک میں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے۔[7]

پہلے چار واقعات میں صراحت کے ساتھ صحابہؓ نے اسوۂ حسنہ کی آیت پیش کی ہے اور آخر کے تین مواقع میں اگرچہ اس آیت کو تلاوت نہیں کیا مگر یہاں بھی اسی کے ہم معنی الفاظ ادا فرمائے ہیں۔ ان ساتوں واقعات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ اختلافی مقامات پر بھی کبھی کسی نے اسوۂ حسنہ کو صرف قرآنی احکام یا امورِ متواترہ کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھا بلکہ جس کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فعل ثابت ہو گیا وہ اس کے یہاں اسی اسوۂ حسنہ کا جزء سمجھا گیا۔ یہاں اگر کوئی بحث پیدا ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ اس فعل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کیا تھا مگر ایک واقعہ میں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسوۂ حسنہ کے مصداق میں صحابہؓ کے درمیان کوئی اختلاف ہوا تھا اس لیے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سلف کے دور میں آنحضرت

---

[1] بخاری ص ۲۹۲۔ [2] ایضاً ص ۷۲۹۔ [3] ص ۲۴۱۔ [4] ص ۲۳۱۔ [5] ۲۳۱۔ [6] ص ۲۱۸۔ [7] ۲۱۹۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ افعال اسوۂ حسنہ کے جزء شمار ہوتے تھے خواہ قرآن کریم نے ان کی صراحت کی ہو یا نہ کی ہو-

اسوۂ رسول کا تواتر ٭ یہاں سوال یہ ہے کہ جن احکام کی تشکیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی تھی وہ شریعت کے کسی خاص باب سے متعلق تھی یا تمام ابواب سے- پہلی صورت میں بقیہ ابواب کی تشکیل کس کے سپرد رہی اور جن ابواب کی تشکیل آپ نے کی کیا وہ تمام تشکیل بطریق تواتر ہم تک منقول ہے اگر تمام کی تمام منقول نہیں تو جو رہ گئی اس کی تکمیل کی اب کیا صورت ہے- دوسری صورت میں اگر تمام ابواب کی تشکیل آپ ہی کے سپرد تھی تو یقیناً اس کو تواتر کے طور پر منقول ہونا چاہیے- ہمارے نزدیک شریعت کے ہر ہر باب کی عملی تشکیل کے تواتر کا ثبوت بہت زیادہ تامل کا محتاج ہے- تمام ابواب تو درکنار ایک نماز ہی کو لے لیجئے اس کی کسی ایک صورت عمل کے متعلق بھی تواتر کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا- ہندوستان چونکہ اکثر حنفی مذہب رکھتا ہے اس لیے اگرچہ یہاں اس کی ایک ہی صورتِ عمل نظر آتی ہے اور اس لیے یہ مغالطہ لگ سکتا ہے کہ نماز کی یہی صورت شاید متواتر ہو لیکن جب آپ بلادِ مغرب اور حجاز پر بھی نظر ڈالیں گے جہاں اکثر مالکی اور شافعی آباد ہیں تو وہاں آپ کو نماز کی شکل ہندوستان سے بالکل مختلف نظر آئے گی اور کسی ایک صورت پر بھی آپ تواتر کا حکم نہ لگا سکیں گے-

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک طرف مولانا موصوف اسوۂ حسنہ کے عملاً مسلسل اور متواتر ہونے کا دعویٰ کرتے جاتے ہیں اور دوسری طرف امت کے موجودہ عمل کو قرآن کے خلاف بھی کہتے جاتے ہیں- اگر درحقیقت نماز کی جو موجودہ تشکیل ہے وہ قرآن اور اسوۂ حسنہ کے مطابق نہیں ہے تو پھر اس کے خلاف جو تشکیل ہے وہ بتانی چاہیے کیا ہے اور کیا اس پر تواتر کے ساتھ عمل ہو رہا ہے-؟ اگر نماز کی ان سب صورتوں میں سے کسی قدر مشترک صورت کو مولانا متواتر فرمائیں تو پھر بھی مولانا کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اتنی بات سے نماز کے اجزاء کا تواتر تو ثابت ہو سکتا ہے مگر نماز کی کسی ایک مجموعی صورت کا تواتر پھر ثابت نہیں ہوتا- شاید مولانا نے عملی تواتر کے مفہوم پر بھی غور نہیں کیا ہے اور صرف اپنے ایک ذہنی مجوزہ نقشہ کو متواتر سمجھ لیا ہے- حالانکہ تواتر کوئی ذہنی چیز نہیں اس کو خارج میں ناقابل انکار طور پر نظر آنا چاہیے-

نماز کو چھوڑ کر اب ذرا زکوٰۃ کی طرف توجہ فرمایئے یہاں وہ کون سی تشکیل ہے جس کو عہد نبوت سے لے کر آج تک برابر متواتر کہا جا سکتا ہے یا مدتیں ہوگئیں کہ حیوانات کی زکوٰۃ، عشر، خراج کے مسائل کا تخم ہی مٹ چکا ہے حتیٰ کہ آج ہندوستان میں یہ کسی کو یاد بھی نہیں رہا کہ شریعت میں کبھی حیوانات کی زکوٰۃ بھی لی گئی تھی- اکثر مسائل طلاق، عدت، نفقہ و سکنی اور ایلاء کی عملی تشکیل کا حال بھی یہی ہے- اسی طرح جہاد کا تمام باب، غنائم کی سب تفصیلات فدیہ اور قیدیوں کے جملہ احکام، تدبیر و کتابت، ام ولد اور عتق کے سب مسائل کا نام و نشان تک نابود ہو چکا ہے- تواتر تو کجا یہی حال معاملات یعنی بیع و شراء، رہن و وقف کا ہے حدود و تعزیرات کا تو دنیا کے کسی خطہ پر نفاذ ہی نہیں بلکہ خود بعض مسلمانوں کو کفار کے اتباع میں ان کی مشروعیت پر بھی اعتراض ہے- مولانا تو دین کی بنیاد متواتر اسوۂ حسنہ پر قائم کرنا چاہتے ہیں مگر یہاں ہمیں تواتر کی بجائے آج اس کا وجود ہی نظر نہیں آتا- کاش امت محمدیہ اگر اس اسوۂ حسنہ پر تواتر کے ساتھ نہ سہی متفرقاً ہی عمل کرتی رہتی تو مسلمانوں کو اپنے زوال کا یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا- پس یا تو مولانا کو صاف یہ کہنا چاہیے کہ قرآن خود اپنا بیان ہے اس کو کسی اور بیان کی احتیاج ہی نہیں اور اگر یہ احتیاج مسلم ہے تو پھر اس کو صرف

اسوۂ حسنہ کے ساتھ مقید کرنا مناسب نہیں اور اگر مخصوص کیا ہے تو اس کے تواتر کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دین کی تشکیل کے متعلق تواتر کا دعویٰ کرنا چاہتا ہے یہ صرف خوش نما اور خوش کن الفاظ ہیں جو موجودہ دین کی صورت عمل کی تخریب میں تو کارآمد ہو سکتے ہیں لیکن اس کی کسی جدید صورت کی تعمیر کے لیے ہرگز کارآمد نہیں ہو سکتے۔

مولانا موصوف نے دین کے ہر ہر جزء کے متعلق تواتر کا دعویٰ کر کے دین کو کوئی نفع نہیں پہنچایا بلکہ ایک طرف اس کے بہت بیش قیمت حصہ کو دشمنوں کے ساتھ خود بھی فنا کرنے کا سامان کر دیا ہے اور دوسری طرف اس امت کے اس خصوصی امتیاز کو بھی منا دیا ہے جو اسے دوسری امتوں کے بالمقابل عطا کیا گیا تھا۔

یہ بات سوچنا چاہیے کہ دنیا ایک محقق فیلسوف' ایک عارف کامل' ایک مجرب حکیم یہاں تک کہ ایک شاعر بلیغ کے حالات کو بھی جب بنظر احترام دیکھنا اپنا فرض سمجھتی ہے' اس کے ایک ایک ٹکڑے کی تلاش کرتی ہے' اس کے ایک ایک حرف کو قدیم تاریخوں سے جمع کرتی ہے پھر اگر کسی قدیم شخص کی کوئی ایسی یادگار طبع کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اسے اپنی حیوۃ کے شاہکاروں میں ایک بڑا شاہکار شمار کر لیتی ہے مگر یہاں تذکرہ کسی شاعر یا حکیم کا نہیں بلکہ رسولوں میں بھی اُس رسول کا ہے جس کو آخری ہدایت دے کر بھیجا گیا تھا۔اگر ہم ایک فیلسوف' ایک حکیم' یا ایک شاعر کے حالات زندگی سے ناواقف رہیں تو اس کا نقصان ہماری زندگی کے صرف ایک شعبہ تک محدود رہے گا۔مگر یہاں تذکرہ کسی ایسی ہستی کا نہیں ہے جس کی علمی یادگار کی پراگندگی سے صرف کسی ایک کتاب کے چند اوراق پراگندہ ہوتے ہیں یا صرف کسی ایک جلیل القدر ہستی کی تاریخ زندگی مٹتی ہے یا کسی خاص فرد یا جماعت کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ یہاں اس کا تذکرہ ہے جس کے آثارِ ہستی مٹنے سے کتاب ہستی ہی کے اوراق پراگندہ ہوئے جاتے ہیں۔یہ بدیہی بات ہے کہ جب کسی شخص کی اندرونی اور بیرونی زندگی کو اس استیعاب کے ساتھ دیکھنے کا قصد کیا جائے تو اس کے لیے بہت بڑی جدوجہد کی حاجت ہونی چاہیے۔مگر جس کی زندگی کو عالم کے لیے اسوۂ حسنہ بنا دیا گیا تھا اس کو قدرت نے خود کچھ اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص اسے دیکھنا چاہے تو بلا شک وشبہ دیکھ سکتا ہے' صرف اس کی عبادات ومعاملات ہی کا پہلو نہیں' صرف اس کی گفتگو اور غصہ ومسکراہٹ نہیں بلکہ ہر گفتگو کا انداز بھی اور غصہ ومسکراہٹ کی ایک ایک ادا بھی۔یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ از سر نو تاریخ کے اوراق تلاش کیے جائیں اور آپ کی زندگی کو دنیا کے مشاہیر افراد کی زندگی سے علیحدہ کیا جائے' پھر آپ کی زندگی کے حالات میں صحیح وغلط کو چھانٹا جائے پھر محض قیاسات کے ذریعہ آپ کی زندگی کے واقعات کو اس طرح ترتیب دے لیا جائے جیسا کہ دنیا کی دوسری شخصیتوں کے واقعات ترتیب دے لیے گئے ہیں بلکہ یہاں آپ ہی کے سامنے آپ کی زندگی مرتب ہوئی ایک ایک دن کے واقعات محفوظ کیے گئے اور محض تاریخ کے طور پر نہیں بلکہ آئین حیات اور زندگی کے دستور العمل کے طور پر اس کے بعد آپؐ نے صحابہ پر یہ بھی لازم کر دیا تھا کہ وہ اس زندگی کو بے کم وکاست غائبین تک پہنچا دیں تا کہ آپؐ کا اسوۂ حسنہ پورے استیعاب کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا جائے اور جو فائدہ موجودین کو پہنچا تھا وہی غائبین کو بھی پہنچ جائے۔ظاہر ہے کہ ان واقعات میں جب آپ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پھر اجتماعی زندگی میں بہت بڑی جماعت اور محض چند افراد کے درمیان کی زندگی بھی شامل ہے تو لازمی طور پر آپ کی حیاتِ طیبہ کے بعض واقعات بھی جماعتوں سے منقول ہوں گے اور بعض محض

چند افراد یا ایک فرد سے مثلاً حج کا معاملہ ہے جسے ہزاروں نے دیکھا اس کے ناقلین بھی بکثرت ہونے چاہئیں' یہاں ناقلین کی قلت یقیناً یہ شبہ پیدا کرسکتی ہے کہ جو واقعہ اتنی بڑی جماعت کے ساتھ پیش آیا ہے' اس کے نقل کرنے والے صرف ایک یا دو افراد کیوں ہیں لیکن جو آپ کی انفرادی زندگی ہے یا اسلام کے ابتدائی دور کے واقعات ہیں یا کسی ایک شخص کے استفسار پر اس کو علیحدہ جواب دیا گیا ہے یا تہجد کے وقت کسی خاص خادم کے ساتھ کوئی گفتگو ہوئی ہے یا حاجت انسانی کو جاتے' آتے کسی سے آپؐ نے کچھ فرمایا ہے یہ اور اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہو سکتے ہیں جن کے سننے والی ہمیشہ جماعتیں نہیں ہوئیں- آپؐ کی یہ زندگی افراد یا فردِ واحد ہی کے ذریعہ سے جماعتوں تک پہنچی ہے اس سے آگے وہ واقعات ہیں جن کا دیکھنے والا ایک شخص بھی نہ تھا یعنی ازواج مطہراتؓ کے ساتھ آپؐ کا اسوۂ حسنہ' شب کی تاریکیوں میں آپؐ کی آہ وزاری آپؐ کا نالہ و بکا' آپؐ کی عاجزانہ نمازیں' آپؐ کی لمبی لمبی قراءتیں' رو رو کر قرآن پڑھنا اور گڑگڑا کر امت کے لیے دعائیں کرنا یہ سب امہات المؤمنین کے ذریعہ اُمت کو پہنچا ہے حتیٰ کہ آپؐ کی تہجد کی رکعات اور اس کے رکوع وسجود کی کیفیت' درمیانی وقفے' اوقات کی تقسیم' اس کے طول وقصر کے حالات جتنے بسط و شرح کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں شاید ہی کسی اور صحابی سے مروی ہوں- اگر درحقیقت آپؐ کا اسوۂ حسنہ ان سب واقعات کو حاوی ہے اور حاوی ہونا چاہیے تو کیا یہاں تواتر کی قید لگانا کوئی صحیح احساس کہا جا سکتا ہے- جہاں اصل خبر اور اس کی ابتداء ہی فردِ واحد سے شروع ہوُا اس کے لیے تواتر کا مطالبہ کرنا کتنا نامعقول ہے اس قید کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساٹھ سالہ حیات میں سے آپؐ کی طفولیت- آپؐ کے حراء کے قیام' اور آپؐ کے دوسرے انفرادی واقعات سننا ہی نہیں چاہتے' اور چلئے اگر آپ کو قبل از نبوت کے واقعات سے دلچسپی نہیں ہے تو نبوت کے بعد کے واقعات میں بھی آپ صرف وہی واقعات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو اتنے کثیر مجمع میں پیش آئے ہوں جن کو تواتر کی مقدار کہا جا سکتا ہو پھر اس پر بھی آپ راضی نہیں ہیں جب تک کہ ہر زمانہ میں اس کے ناقلین اسی قدر موجود نہ ہوں کیا قرآن نے عالم کے سامنے آپؐ کا جو اسوۂ حسنہ پیش کیا تھا وہ صرف ان ہی چند واقعات کا مجموعہ تھا جو آج ہم تک بطریق متواتر پہنچا ہے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپؐ کے دیکھنے والوں کے لیے بھی ظن ویقین کی کوئی بحث تھی یا جتنے واقعات جس کے سامنے گذر گئے وہ اس کے نزدیک ہر تواتر سے بڑھ کر قابل یقین تھے- پس جب ان کے سامنے آپؐ کی زندگی سب کی سب اسوۂ حسنہ تھی تو ہمیں بھی اس پورے اسوۂ حسنہ کو تلاش کرنا چاہیے' یہاں تواتر کی قید لگانا دوسرے لفظوں میں اسوۂ حسنہ سے انکار کرنا ہے کیونکہ تواتر کے لحاظ سے آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا جو حصہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ نہ ہماری ضروریات کے لیے کافی ہے نہ قرآن کے ایضاح وبیان کے لیے اس لیے اس قید سے ہمارا شرعی نقصان بھی ہے اور تاریخی بھی- اور صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ تمام نسل انسانی کا کیونکہ اس کی سب سے بڑی محرومی یہ ہوگی کہ جو انسان اس کے شعبہ حیات مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا صرف اپنے قول سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کے اکثر حالاتِ زندگی اس سے پوشیدہ رہ جائیں اور جتنے کچھ پایہ ثبوت کو پہنچیں اگر ان کو چھانٹے بغیر سب کو متواتر تسلیم کرلیا جائے تو وہ بھی اس کی بہت ہی محدود زندگی کے بہت محدود شعبے ہوں- یہاں یہ جواب دینا کہ غیر متواتر اسوۂ حسنہ کو تاریخی طور پر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں بہت غلط ہے کیونکہ ہماری بحث اس وقت اُس اسوۂ حسنہ سے ہے جو قرآن کریم نے صحابہؓ کے سامنے بہ حیثیت شرعی پیش کیا تھا- یقیناً وہ تواتر

اور غیر تواتر کی بحث سے بالاتر تھا اور بلاشبہ اس میں تشریعی حیثیت کے سوا صرف تاریخی حیثیت نہ تھی- آپ کی ذات مجسم ان کے مشاہدہ میں تھی اور وہ سب کی سب ان کے لیے اسوہ قرار دی گئی تھی اور تواتر کی قید سے اس تمام اسوہ کا صرف وہی حصہ ہمارے لیے بچ رہتا ہے جس میں تواتر کی شروط پائی جائیں یہ مقدار اصل اسوۂ حسنہ کی نسبت عشر عشیر بھی نہیں- اصل بات یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک قرآن فہمی کے لیے صرف عقل کافی ہے جیسا کہ وہ عبارتِ مذکورہ میں اس کو بہت صفائی کے ساتھ لکھ چکے ہیں- لیکن چونکہ قرآن کریم نے لفظ اسوہ کو بہت تاکیدی طور پر ذکر کیا ہے اس لیے بادل ناخواستہ اسے بھی مولانا کو نبھانا پڑ رہا ہے ورنہ کھلے دل سے ان کے نزدیک اسوۂ رسول کی حاجت بھی نہیں ہے' جب رسول کے کلام سے اس کو استغناء ہوسکتا ہے تو اس کے افعال کی احتیاج چہ معنی دارد- ان کے خیال میں رسول قرآن پہنچا کر اپنے منصب سے علیحدہ ہوگیا- اب وہ جو چاہے کہے اور جو چاہے کرے یہ سب اس کے شخصی افعال و اقوال ہیں جن کا اسلام میں بشرطِ ثبوت صرف اتنا ہی احترام ہوسکتا ہے جتنا کہ تاریخ کا- ہمارے خیال میں اس احترام کے تمام منصف مؤرخین بھی قائل ہیں- پس اگر منکرین حدیث بھی اس کی حیثیت اتنی ہی سمجھتے ہیں تو اس میں مسلم و کافر کی بھی کوئی تقسیم نہیں ہے بلکہ دیگر مؤرخین تو اسلام کی اس امتیازی جدوجہد سے بہت متاثر بھی نظر آتے ہیں مگر مولانا اس تاریخی جدوجہد سے متاثر بھی نہیں بلکہ اپنی تصنیف علم حدیث میں اس پر اور پھبتیاں کس رہے ہیں[1] جس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا موصوف کے باطن میں بہ حیثیت تاریخ بھی کتنا حدیث کا احترام ہے-

سند صرف اسلام کی خصوصیت ہے ✻ حافظ ابن حزمؒ تحریر فرماتے ہیں کہ پہلی امتوں میں کسی کو یہ توفیق میسر نہیں ہوئی کہ

---

[1] ملاحظہ فرمایئے ڈاکٹر اسپرنگر تو یہ لکھتا ہے ''نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے-''

ڈاکٹر اسپرنگر کے اس قول سے یہ بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کا شغف فن حدیث سے صرف تاریخ کی حد تک تھا یا تشریح کی حد تک. اب مولانا کا احساس دیکھیے-

''مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ لاکھ میں سے ایسے حضرات کے سوا جنہوں نے اعلاء کلمۃ الحق یا ملت کی تعمیر کے کارنامے چھوڑے ہیں بقیہ کے متعلق جن کا کام سوائے روایت کشی کے اور کچھ نہ تھا' یہ دریافت کرنا کہ ان کا نام کیا تھا ان کی کنیت کیا تھی' ان کے کون کون استاد تھے اور کون کون شاگرد' ان کی کس قدر روایتیں صحیح ہیں اور کس قدر غلط وغیرہ وغیرہ- کوئی مفید یا قابل فخر تاریخی علم نہیں ہے بلکہ ملت کے لیے ایک قسم کی دماغی تعزیر ہے جو روایت پرستی کے سبب ملی ہے-'' (علم حدیث ص ۲۷)

اسی کتاب میں آپ دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں- ''محدثین میں شروع سے لے کر آج تک جو اہم اور معرکۃ الآرا امور زیر بحث رہے ہیں بالعموم اس قسم کے ہیں جن کا ملت کی صلاح و فلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی عملی تعلق نہیں ہے مثلاً حضرت ابوبکرؓ افضل ہیں یا حضرت علیؓ- قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق- رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سماء دنیا پر کس طرح نزول فرماتے ہیں- قیام نماز میں ہاتھوں کو باندھنا چاہیے یا نہیں کیا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے- آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ وغیرہ وغیرہ-''

ان عبارات سے آپ کو صحیح اندازہ ہوسکتا ہے کہ مولانا موصوف کے قلب میں حدیث کا صحیح مقام کیا ہے- حدیث پر تشریعی یا تاریخی حیثیت سے بحث کرنا ہے یا اصل مقصد اس سلسلہ کو بے وقعت بنا کر نابود کرنا ہے-

اپنے رسول کے کلمات صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کر سکے یہ صرف اس امت کا طغرائے امتیاز ہے کہ اس کو اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کو صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کرنے کی توفیق بخش دی گئی ہے- آج روئے زمین پر کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریق پر پیش کر سکے- اس کے برخلاف اسلام ہے جو اپنے رسول کی سیرت کا ایک ایک شوشہ پوری صحت و اتصال کے ساتھ پیش کر سکتا ہے-

دین کے ثبوت کی چھ صورتیں ⁕ ہمارے دین کی معتبر اور غیر معتبر طور پر منقول ہونے کی کل چھ صورتیں ہیں-

(۱) پہلی صورت میں شرق سے لے کر غرب تک، مسلم و کافر سب شریک ہیں، یہاں منصف و معاند کی بھی کوئی تفصیل نہیں ہے جیسا قرآن کریم- تمام عالم اس کا شاہد ہے کہ جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے یہ وہی قرآن ہے جو آپؐ پر نازل ہوا تھا- اسی طرح پنج وقتہ نماز، رمضان کے روزے، زکوٰۃ، حج اور اسی قسم کے وہ احکام جو قرآن کریم میں منصوص ہیں، سب تواتر کے ساتھ ثابت ہیں- یہود و نصاریٰ کے مذہب میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کے متعلق وہ اتنا عظیم الشان تواتر پیش کر سکیں- ان کی شریعت کا تمام دار و مدار تورات پر ہے جس کے خود ثبوت ہی میں سو طرح کے شبہات ہیں- یہود کو اس کا اعتراف ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد عام ارتداد پھیل گیا تھا زمانہ دراز تک بت پرستی کی جاتی تھی انبیاء علیہم السلام کو ایذائیں دی جاتی تھیں حتیٰ کہ بعض کو قتل بھی کر دیا جاتا تھا- شر و فساد کے اس دور میں بھلا تورات کی حفاظت کا کیا خیال کیا جا سکتا ہے اس کا تواتر تو درکنار-

نصاریٰ کا حال یہ ہے کہ ان کے کل مذہب کی بنیاد پانچ اشخاص پر ہے جن کا جھوٹ خود ان کے بیانات سے ثابت ہے- قرآن کریم کے تواتر سے بھلا اس کا کیا مقابلہ کیا جا سکتا ہے-

(۲) دوسرا طریقہ بھی متواتر ہے مگر اس کا دائرہ پہلے سے کسی قدر تنگ ہے یعنی پہلی صورت میں اہل علم اور بے علم، مسلم اور کافر سب اس میں شریک ہوتے ہیں- یہاں صرف ایک محدود دائرہ کو اس کا علم ہوتا ہے اگرچہ اس کا احاطہ بھی ہزاروں کی تعداد سے متجاوز ہوتا ہے جیسا کہ آپؐ کے معجزات، مناسک حج اور زکوٰۃ کے بعض احکام، اہل خیبر سے آپ کا معاہدہ وغیرہ وغیرہ- یہود و نصاریٰ کے پاس اس جنس کا ثبوت بھی ندارد ہے-

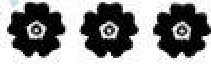
(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اس کے نقل کرنے والے اگرچہ حد تواتر کو نہ پہنچیں مگر معتمد اشخاص ہوں پھر وہ اسی قسم کے دوسرے چند اشخاص یا ایک شخص سے ایک بات نقل کریں اور اسی طرح یہ نقل طبقہ بہ طبقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو جائے- یہود و نصاریٰ کے یہاں اس قسم کی بھی کوئی سند نہیں ہے، یہ امتیاز صرف امت محمدیہ کا ہے کہ اس نے اپنے رسول کا ایک ایک کلمہ ہر ممکن سے ممکن طریق سے محفوظ کر لیا ہے اور اس خدمت کے لیے شرق و غرب میں اتنے نفوس مارے مارے پھرے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں- اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کسی فاسق کی یہ مجال نہیں رہی کہ وہ دین کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا سکے، اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ اپنے دین کے کسی ایک مسئلہ کے متعلق بھی وثوق کے ساتھ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ ان کے دین کا جزء ہے-

(۴) چوتھی صورت مرسل ہے یعنی رسول اور ناقل کے درمیان کا واسطہ مذکور نہ ہو، کوئی تابعی براہ راست آپؐ کا قول و فعل نقل

کرے- یہود و نصاریٰ کے پاس بہت سے بہت اپنے دین کی کوئی سند ہے تو اس قسم کی ہے پھر اس طریقہ میں بھی زمانہ نبوت سے جو قرب ہمیں حاصل ہے انہیں حاصل نہیں' اس پر ان کے لیے اندرونی اور بیرونی حالات کی ناموافقت مزید براں ہے اس لیے جتنے تردد اور شبہات کے امکانات وہاں پیدا ہو سکتے ہیں یہاں نہیں ہو سکتے - ہمارے علم میں یہود و نصاریٰ کے پاس صرف ایک ہی مسئلہ ایسا ہے جس کو ان کے کسی عالم نے بنی اسرائیل کے کسی آخری نبی سے براہ راست سنا ہے- اس کے علاوہ ان کے تمام دین کے ثبوت کی درمیانی کڑی غائب ہے- ہم ان طریقوں میں سے اپنے تمام دین کی بنیاد صرف پہلے تین طریقوں پر قائم کرتے ہیں-[1]

(۵) پانچویں صورت یہ ہے کہ اس کے بعض راوی مجروح اور غیر ثقہ بھی ہوں ہمارے نزدیک ایسی سند کا اعتبار کرنا حلال نہیں-

(۶) چھٹی صورت یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل ہی نہ ہو بلکہ مذکورہ بالا طریق سے کسی صحابی کا قول وفعل ہو' اس کے تسلیم کرنے نہ کرنے میں بھی اختلاف ہے ہم اسے واجب التسلیم نہیں سمجھتے[2] [3]



---

[1] مرسل کے قبول و رد کرنے کے متعلق اصولِ حدیث میں اختلاف نقل کیا گیا ہے- ہر فریق کے دلائل وہاں مذکور ہیں' یہاں طوالت کے خوف سے ان کو نقل نہیں کیا گیا-

[2] قول وفعل صحابی کے متعلق بھی بڑی تفصیل ہے اگر حکماً مرفوع ہے تو وہ بھی قابل حجت ہے اس کی بحث بھی اصولِ حدیث کی کتابوں میں دیکھ لی جائے-

[3] الملل والنحل: ج۲ص ۶۶-۶۹-

خبر واحد کی حجیت

اصولِ حدیث کی اصطلاح کے لحاظ سے اجمالی طور پر حدیث کی دو قسمیں ہیں: (۱) خبر واحد: ہر اس خبر کو جو متواتر نہ ہو اصطلاحی طور پر خبر واحد ہی کہا جاتا ہے۔

لہٰذا خبر واحد کے لفظ سے اس کا جو مفہوم دماغ میں پیدا ہوتا ہے اسی میں خبر واحد کا انحصار نہ سمجھنا چاہیے بلکہ اگر تواتر کا عدد کسی ایک طبقہ میں بھی فوت ہو جائے تو اس خبر کو خبر واحد ہی کہا جاتا ہے خواہ وہ خبر کتنے ہی افراد سے روایت کی گئی ہو۔ اس کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ اس کا روایت کرنے والا ہر دور میں صرف ایک ہی شخص ہو۔ جو لوگ متواتر کے سوا خبر واحد کو مطلقاً حجت نہیں مانتے ان کو ذرا اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر کسی حدیث کے راوی صحابہ و تابعین کے دور میں بکثرت موجود ہوں پھر کسی ایک دور میں اساتذہ و تلامذہ کی نقل و حرکت کی قلت و کثرت، ماحول کی موافقت یا ناموافقت کی وجہ سے کسی قدر کم ہو جائیں تو کیا ایسی خبر کو بھی رد کر دینا عقلاً مناسب ہے یہی وجہ ہے کہ بعض معتزلہ جو خبر واحد کے سب سے پہلے منکر ہیں اس پر غور کرتے کرتے اس فیصلہ کے لیے مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر ہر دور میں اس کے راوی دو، دو موجود ہوں تو پھر ایسی خبر کو حجت کہہ دیا جائے گا اس کی تردید کی اب کوئی وجہ نہیں رہتی حالانکہ صرف دو راویوں سے کسی خبر کو متواتر نہیں کہا جا سکتا۔ وہ خبر واحد ہی رہتی ہے مگر اس کو ایسی قوت ضرور حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کو مفید یقین کہا جا سکتا ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ یہ تمام تقسیمیں اس قدر محدود وقت کے اندر اندر ہیں کہ اس میں ذخیرۂ حدیث کو بالکل ساقط الاعتبار قرار دینا بہت بڑی غفلت ہے۔ تدوین حدیث کا دور تیسری صدی تک قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔ پہلی صدی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین خود موجود تھے۔ اور آپ کی احادیث کا ذخیرہ مختلف طور پر ان کے پاس محفوظ تھا۔ اس کے بعد دوسری صدی شروع ہونے نہیں پائی کہ تدوین حدیث کا باضابطہ آغاز ہو گیا۔ اتنے قلیل عرصہ میں تمام ذخیرۂ احادیث کا یک قلم مشکوک ہو جانا بہت بعید از قیاس ہے۔

اگر تدوین حدیث صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین و تابعین رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کے دور کے بعد شروع ہوتی تو حدیث کے ثبوت میں شبہ کرنا معقول ہوتا لیکن جب کہ فقط احادیث کا سلسلہ خود آپ کے زمانہ سے برابر متصل طور پر چلا آ رہا ہے تو اب اس میں شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے رسالہ میں اس پر مستقل ایک مقالہ لکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی کے واقعات سے خبر واحد کی حجیت ثابت کی ہے۔ ہم یہاں اس کا مختصر خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ ٭ تحویل قبلہ سے پہلے اہل قباء کا قبلہ بھی بیت مقدس تھا۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد صبح کی نماز میں تحویل قبلہ کی خبر لے کر ان کے پاس پہنچا تو سب نے نماز کے اندر ہی اپنا رخ بیت اللہ کی طرف بدل دیا۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک دینی مسائل میں خبر واحد حجت تھی اور اگر بالفرض ان کا یہ اقدام غلط ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم ان کو تنبیہ فرماتے کہ جب تم ایک قطعی قبلہ پر قائم تھے تو تم نے صرف ایک شخص کے قول پر ایک فرضِ قطعی کو کیسے چھوڑ دیا اور براہ راست میری ہدایت یا خبر متواتر کا انتظار کیوں نہ کیا مگر یہاں اعتراض کرنا تو درکنار اپنی جانب سے فرد واحد کا بھیجنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ خود صاحب نبوت کے نزدیک بھی دین کے بارے میں ایک ثقہ اور صادق شخص کا قول کافی ہے۔

دوسرا واقعہ ٭ یہ ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں، میں ابوعبیدہ، ابوطلحہ، ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ دفعۃً ایک شخص آیا اور اس نے خبر دی کہ شراب حرام ہوگئی ہے۔ یہ سن کر فوراً ابوطلحہؓ نے کہا انسؓ اٹھو اور شراب کے مٹکے توڑ ڈالو۔ میں اٹھا اور شراب کے برتن توڑ دیئے۔

ظاہر ہے کہ شراب پہلے شرعاً حلال ہی تھی لیکن یہاں صرف ایک شخص کے بیان پر اس کی حرمت کا یقین کرلیا گیا اور اس کے برتن توڑ ڈالے گئے۔ حاضرین میں سے کسی نے اتنا تامل بھی نہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ جا کر پوچھ آتا اور نہ کسی نے یہ اعتراض کیا کہ قبل از تحقیق یہ اضاعت مال اور اسرافِ بیجا کیوں کیا گیا۔

تیسرا واقعہ ٭ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے آپؐ نے زنا کے ایک مقدمہ میں زانی کے اقرار پر اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا اور جس عورت کے متعلق اس شخص نے زنا کرنے کا اقرار کیا تھا اس کے پاس حضرت انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا اور فرمایا کہ اس سے دریافت کرو اگر وہ بھی اقرار کرے تو اس کو رجم کرو ورنہ اس شخص کو حد قذف اور لگاؤ کیونکہ اس نے بلا شرعی ثبوت کے ایک عورت پر زنا کی تہمت کیسے رکھی۔ حضرت انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پہنچے اس عورت نے زنا کا اقرار کیا اور وہ بھی رجم کر دی گئی۔

چوتھا واقعہ ٭ عمرو بن سلیم زرقی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم منیٰ میں مقیم تھے کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اونٹ پر سوار چیخ چیخ کر یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ یہ کھانے پینے کے دن ہیں کوئی شخص ان میں روزہ نہ رکھے۔

پانچواں واقعہ ٭ یزید بن شیبان کہتے ہیں کہ ہم مقام عرفات میں تھے۔ اتفاقاً ہمارا مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ سے دور تھا۔ اسی درمیان میں ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد یہ پیام لے کر پہنچا کہ ہم جہاں ٹھیرے ہوئے ہیں اپنی اسی جگہ پر رہیں وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں، میدانِ عرفات میں جہاں بھی قیام ہو جائے فریضۂ وقوف ادا ہو جاتا ہے۔

چھٹا واقعہ ٭ ہجرت کے نویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ کو حج کا امیر بنا کر بھیجا تاکہ فریضہ حج کو انجام دیں اور ان کے بعد حضرت علیؓ کو روانہ کیا کہ وہ کفار کو سورۂ براءت کی آیات سنا کر ہوشیار کر دیں کہ انہوں نے خود بدعہدی کی ہے اب خدا کا بھی ان سے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔

ان سب احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک شخص کو اپنی جانب سے بھیجنا باوجودیکہ آپ کا بنفس نفیس

تشریف لے جانا بھی ممکن تھا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ دین میں ایک ثقہ اور صادق شخص کی خبر حجت گردانی گئی ہے-

خبر واحد کی حجیت کا ایک اور ثبوت ٭ اس کے سوا آپؐ نے عامل اور قاصد جہاں جہاں بھیجے ہیں ان میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا- قیس بن عاصم' زبرقان بن بدر اور ابن زبیر وغیرہ کو اپنے اپنے قبائل کی طرف روانہ کیا' وفد بحرین کے ساتھ ابن سعید بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھیجا اور معاذ بن جبل کو یمن کے بالمقابل بھیجا اور جنگ کے بعد ان کو شریعت کی تعلیم دینے کا حکم دیا- لیکن کہیں منقول نہیں کہ آپؐ کے عاملین کے ساتھ کسی نے یہ مناقشہ کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی فرد ہے اس لیے اس کو صدقات و عشر نہیں دیئے جائیں گے-

خبر واحد کی حجیت کا تیسرا ثبوت ٭ اسی طرح آپؐ نے دعوت اسلام کے لیے مختلف بلاد میں بارہ قاصد روانہ فرمائے اور صرف اس بات کی رعایت کی کہ ہر سمت میں ایسا شخص بھیجا جائے جو اس نواح میں متعارف ہو تا کہ اس کے جھوٹے ہونے کا شبہ نہ رہے اور ان کو اس کا اطمینان ہو جائے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہے- اس کے علاوہ آپؐ کے عاملوں اور قاضیوں کے پاس جب بھی آپؐ کے خطوط پہنچے تو ہمیشہ انہوں نے فوراً ان کو نافذ کیا اور خواہ مخواہ کے شبہات کو کوئی راہ نہیں دی- پھر آپ کے بعد بھی آپؐ کے خلفاء وعمال کا یہی دستور رہا حتیٰ کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک ہی خلیفہ' ایک ہی امام' ایک ہی قاضی ایک ہی امیر ہونا ایک مسلم مسئلہ تھا جس میں کوئی اختلاف نہ تھا-

امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ خبر واحد کی حجیت کے لیے یہ چند احادیث بطور مشتے نمونہ از خروارے کافی ہیں' یہ وہ عقیدہ ہے جس پر ہم نے ان لوگوں کو پایا ہے جن کو کہ ہم نے دیکھا اور یہی عقیدہ انہوں نے اپنے پہلوں کا ہم سے بیان کیا ہے-

خبر واحد کی حجیت کا چوتھا ثبوت ٭ ہم نے تو مدینہ میں ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ سعید' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو سعید خدریؓ کی ایک حدیث نقل کر دیتے ہیں اور اس سے دین کی ایک سنت ثابت ہو جاتی ہے- ابو ہریرہؓ ایک روایت کرتے ہیں اس سے ایک سنت ثابت ہو جاتی ہے اسی طرح ایک ایک صحابیؓ کے بیان پر دین کے مسائل اور سنتیں ثابت ہوتی چلی جاتی تھیں' خبر واحد اور متواتر ہونے کا کوئی سوال وہاں نہیں کیا جاتا تھا آخر میں امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ میں نے مدینہ و مکہ' یمن و شام اور کوفہ کے حضرات ذیل کو دیکھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت کرتے تھے اور صرف اس ایک صحابی کی حدیث سے ایک سنت ثابت ہو جاتی تھی' اہل مدینہ کے چند نام یہ ہیں:

محمد بن جبیر' نافع بن جبیر' یزید بن طلحہ' محمد بن طلحہ' نافع بن عجیر' ابو مسلمہ بن عبدالرحمٰن' حمید بن عبدالرحمٰن' خارجہ بن زید' عبدالرحمٰن بن کعب' عبداللہ بن ابی قتادہ' سلیمان بن یسار' عطاء بن یسار وغیرہم-

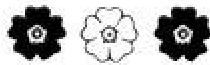
اور اہل مکہ کے چند اسماء حسب ذیل ہیں:

عطاء' طاؤس' مجاہد' ابن ابی ملیکہ' عکرمہ بن خالد' عبید اللہ بن ابی یزید' عبداللہ بن باباہ' ابن ابی عمار' محمد بن المنکدر وغیرہم اور اسی طرح یمن میں وہب بن منبہ اور شام میں مکحول اور بصرہ میں عبدالرحمٰن بن غنم' حسن اور محمد بن سیرین' کوفہ میں اسود' علقمہ

اور شعبی غرض تمام بلادِ اسلامیہ اسی عقیدہ پر تھے کہ خبر واحد حجت ہے۔ اگر بالفرض کسی خاص مسئلہ کے متعلق کسی کے لیے یہ کہنا جائز ہوتا کہ اس پر مسلمانوں کا ہمیشہ اجماع رہا ہے تو خبر واحد کی حجیت کے متعلق بھی میں یہ الفاظ کہہ دیتا مگر احتیاط کے خلاف سمجھ کرا تنا پھر بھی کہتا ہوں کہ میرے علم میں فقہاء مسلمین میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

خبر واحد پر عمل نہ کرنے کی چند صورتیں ❊ ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر کسی کے پاس خبر واحد پہنچی ہو تو اس نے اس پر اس لیے عمل نہ کیا ہو کہ اس کے نزدیک وہ خبر حد صحت کو نہ پہنچی ہو یا وہ حدیث دو معنوں کو محتمل ہو اور اس نے دوسرے معنی پر عمل کرلیا ہو یا اس کے معارض اس سے زیادہ صحیح حدیث اس کے پاس موجود ہو' غرض جب تک وجہ ترجیح یا اسبابِ ترک میں سے کوئی سبب اس کے پاس موجود نہ ہو ہرگز کسی کے لیے خبر واحد کا ترک کرنا جائز نہیں۔

خبر واحد کے مراتب ❊ اسی کے ساتھ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایک وہ حدیث جس پر سب کا اتفاق ہو اور ایک وہ جو کسی خاص مسئلہ کے متعلق صرف ایک راوی سے روایت کی گئی ہو' اس میں مختلف تاویلوں کی گنجائش بھی نہ ہو دونوں برابر نہیں ہو سکتیں' پہلی حدیث کا تسلیم کرنا بلا شبہ قطعی ہے اگر اس کا کوئی منکر ہو تو اس سے توبہ کرائی جائے لیکن دوسری قسم کی حدیث اس درجہ قوی نہیں اگر اس حدیث میں کوئی شک کرے تو اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا لیکن اس پر بھی عمل کرنا واجب ہوگا جب تک کہ اسباب ترک میں سے کوئی سبب پایا نہ جائے جیسا کہ شاہدوں کے بیان پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہاں بھی غلطی اور شکوک کا احتمال باقی رہتا ہے لیکن پھر بھی جب تک کہ تحقیق نہ ہو ظاہر حال پر عمل کیا جاتا ہے۔



ظن وعلم کے مفہوم پر ایک اہم بحث

خبر واحد کی حجیت کے برخلاف منکرین حدیث کے پاس بڑا استدلال یہ ہے کہ وہ مفید ظن ہوتی ہیں اور دین کی بناء ظنیات پر قائم نہیں کی جاسکتی اس لیے ہم یہاں پہلے ظن وعلم کے مفہوم کے متعلق تحقیق کرنا ضروری سمجھتے ہیں صحابہؓ کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظن کا استعمال اردو میں ٹھیک اٹکل کے موقعہ پر کیا کرتے تھے۔ پس جو خیال واقعہ کی تحقیق کے بغیر محض اپنی جانب سے پکا لیا جائے ان کے نزدیک ظن کہا جاتا تھا اب وہ خواہ رجحان کے مرتبہ کو پہنچے یا نہ پہنچے۔[1]

---

[1] مولانا اسلم صاحب نے معلوم نہیں کس مجبوری سے صحابہؓ کے دور کے ان واقعات کی جواب دہی حسب ذیل الفاظ میں کی ہے حالانکہ ان کے لیے سیدھی بات یہ تھی کہ وہ ان تمام واقعات کو سرے سے غلط کہہ کر نبٹ جاتے مگر آپ رقم طراز ہیں۔

''مگر عہد صحابہ میں شاہد کا ملنا ممکن تھا اس لیے اس وقت یہ طرزِ عمل بالکل حق بجانب تھا لیکن زمانہ مابعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہوگئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کے جملہ افراد پر جن کی تعداد کروڑوں بلکہ ممکن ہے کہ اربوں ہو جائے ایک عقیدہ یا عمل کی پابندی عائد کرنی چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی واسطہ در واسطہ ہے اس لیے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ دو شاہد عدل پیش کرے جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سنا ہے پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک ہر راوی کے سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔ بلا ان کے اصول عدالت اور قانون شریعت کے مطابق اس کا قول تسلیم کے قابل نہیں۔'' (علم حدیث ص ۳۰)

اس طویل اور بے مغز تقریر کے جواب میں یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کا بار جیسا بعد کے راویوں پر ہے اس سے بڑھ کر اس صحابی کی گردن پر ہے جس نے کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہے پہلا مدعی وہ ہے جس نے اربوں افراد امت کے سر کسی عمل کی پابندی عائد کرنے کی بنیاد رکھی ہے سب سے پہلے یہ اس کے ذمہ ہے کہ وہ اپنے اس دعویٰ کے لیے دو گواہ لائے اگر دو گواہ نہیں لاتا یا دوسرا شخص اس سے گواہوں کا مطالبہ نہیں کرتا اور اس کے بغیر بھی اس کا دعویٰ قبول کرلیا جاتا ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ راوی کے لیے دراصل عدد کی شرط ہی غلط ہے۔ اس کا یہ عذر کرنا ''کہ اس وقت شاہد کا ملنا ممکن تھا'' ایک عذر لنگ ہے اوّلاً تو یہی صحیح نہیں کہ صحابہ نے سب روایتیں براہ راست صاحب نبوت سے خود سن کر بیان کی ہیں اس لیے ان کی حیثیت مدعی کی حیثیت نہیں کیونکہ ان کی روایتوں میں ایسی روایات بھی شامل ہیں جو انہوں نے خود نہیں بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سن کر بیان کی ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔

ما کل ما نحدث به سمعناه من رسول الله صلى الله عليه وسلم و لكن كان يحدث بعضنا بعضا. (مستدرک حاکم)	جو حدیث ہم بیان کرتے ہیں وہ تمام ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود نہیں سنیں ہیں بلکہ ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو ہم میں بعض بعض سے روایت کرتا تھا۔

اس بناء پر صحابی کی حیثیت بھی ٹھیک وہی حیثیت ہوگئی جو دوسرے راوی کی ہے اس کے علاوہ یہ بھی مسلم نہیں کہ جس نے آپ سے براہ راست کوئی حدیث سنی ہے اس کی حیثیت مدعی کی نہیں ہوتی پھر اس کو بارِ ثبوت سے کیوں سبکدوش کیا جائے پھر یہ کون سا عقلی یا شرعی قاعدہ ہے کہ کسی مدعی کے دعویٰ کی ڈگری صرف اس بناء پر دے دی جائے کہ وہ گواہ پیش کرسکتا ہے اور اس امکان پر اس سے گواہی کا مطالبہ ہی نہ کیا جائے اور فرض کرلو کہ اگر دو گواہوں سے حدیث کی صحت ثابت ہوسکتی ہے تو چلئے مولانا اسلم صاحب اسی کا اقرار کرلیں کہ اگر کسی خبر کے راوی دو دو ہوں یا اس کے دو دو شاہد ہوں تو وہ اس کو حجت تسلیم کرسکتے ہیں۔ معتزلہ نے تو اس کا اقرار کرلیا ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے نکت علی ابن الصلاح میں اس کی تصریح کی ہے۔ ﷲ .....

حضرت عمرؓ نے ایک دن اپنے خطبہ میں فرمایا لوگو! دین کے بارے میں رائے تو بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی صواب تھی - و انما هو منا الظن و التكلف - ہم تو صرف اٹکل کے تیر لگاتے اور تکلف کر کر کے خیال جماتے ہیں - ان مختصر الفاظ میں قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ تھا - ﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ﴾ پس جو رائے خدا کی اراءۃ اور اصابۃ کے ساتھ ہو اس کا نام رائے ہے اور وہی صواب بھی ہو سکتی ہے اور جو محض اپنی جانب سے ایک اٹکل ہو' خدائے تعالیٰ کی اراءۃ اس میں شامل نہ ہو اس کا نام ظن اور تکلف ہے -

عن عبدالله بن عمر انه كان اذا لم يجد في الامر يسأل عنه شيئا قال ان شئتم اخبر تكم بالظن. (اعلام ج ۱ ص ۴۹)

حضرت ابن عمر کا یہ دستور تھا کہ جب کسی معاملہ کے متعلق انہیں کتاب و سنت میں کوئی فیصلہ نہ ملتا تو فرماتے اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ظن اور اٹکل سے بتلا دوں - (یعنی فیصلہ نہ دیتے)

اسی ظن کو رائے بھی کہا جاتا ہے اور اسی معنی میں رائے زنی کی ممانعت کی گئی ہے یعنی محض اپنی عقل سے کسی شرعی بنیاد کے بغیر کوئی بات کہہ دینا - حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں؟ اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے -[1] حضرت ابوموسیٰ کے الفاظ پر غور کیجئے -

من كان عنده علم فليعلمه الناس و ان لم يعلم فلا يقولن ما ليس له به علم فيكون من المتكلفين.[2]

اگر کسی کے پاس کوئی علم کی بات ہو تو وہ لوگوں کو سکھلا دے اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو علم نہیں تاکہ متکلفین میں اس کا شمار نہ ہو جائے -

---

ﷲ ..... لیکن موصوف تو پھر بھی اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں - چنانچہ چند سطور بعد خود ہی تحریر فرماتے ہیں ''اس لیے تمام روایتیں غیر یقینی ہیں - روایت کی صرف ایک قسم یقینی ہو سکتی تھی یعنی متواتر اور ایسی کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں -'' (علم حدیث ص ۳۰ و ۳۱)

مذکورہ بالا تحریر سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مولانا موصوف حدیث متواتر کے سوا خبر واحد کی حجت تسلیم نہیں کرتے پھر صفحہ ۱۴ پر خبر واحد کی تعریف یہ نقل فرماتے ہیں - اس مقام پر خبر واحد سے مراد وہ حدیث ہے کہ حد تواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے مثلاً ایک حدیث جس کو کوئی جماعت پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرتی ہو خبر واحد ہے - جب مولانا موصوف کا عقیدہ یہ ہے تو پھر خواہ مخواہ دو گواہوں کی شرط کس لیے ہے اگر ایک جماعت کسی حدیث کو چھ اشخاص سے بھی روایت کرے وہ بھی مولانا کے نزدیک مسلم نہیں تو دو گواہوں کا بیان کیا مسلم ہوگا - گویا کہ اب مولانا کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کی کوئی قسم بھی حجت نہیں - خبر متواتر اگر بالفرض موجود ہوتی تو اسے تسلیم کر سکتے تھے مگر بدقسمتی سے وہ موجود ہی نہیں اس لیے نتیجہ کورا انکار ہے -

یہاں یہ نکتہ اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خبر متواتر کی ایک شرط یہ ہے کہ اس کا مبنی امر محسوس ہو' اگر کسی غیر محسوس امر کو ایک کروڑ انسان بھی نقل کریں تو بھی وہ متواتر نہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک ہزار صحابہ و تابعین بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی غیر محسوس امر کو نقل کریں تو وہ بھی مولانا کو مسلم نہ ہوگی کیونکہ ان کے نزدیک وہ خبر واحد رہے گی اور وہ مفید یقین نہیں ہو سکتی انا للہ وانا الیہ راجعون - میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ایک ہزار اشخاص کے بیانات کا بھی یقین نہیں لاتا اور اس لیے نہیں لاتا کہ وہ متواتر نہیں ہیں اسے اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ پھر اس دنیا میں اس کے نزدیک خبر پر یقین کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں - اسے تحصیل یقین کے لیے کوئی دوسرا جہاں تلاش کرنا چاہیے -

[1] اعلام ج ۱ ص ۴۴ - [2] ایضاً ج ۱ ص ۵۰ -

اس سے معلوم ہوا کہ تکلف یہ ہے کہ جب کسی بات کا علم نہ ہو تو بے علمی کے چھپانے کے لیے اپنی جانب سے کوئی بات گھڑ لی جائے اسی کو ظن کہتے ہیں- اسی کو حضرت عمرؓ نے اپنے ان الفاظ میں ادا فرمایا تھا- و انما هو منا الظن و التکلف - حضرت ابو موسیٰؒ کے اس مختصر سے بیان میں حسب ذیل آیات کی طرف اشارہ تھا-

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ. قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَ مَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ.	اس بات کے پیچھے مت پڑیئے جس کا آپ کو علم نہیں- آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس پر مزدوری نہیں چاہتا اور میں تکلف کرنے والوں میں نہیں ہوں-

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں-

ما علمک الله فی کتابه فاحمد الله به و ما استأ ثربه علیک من علم فکله الی عالمه و لا تتکلف فان الله عزوجل یقول لنبیه قل ما اسئلکم علیه من اجر و ما انا من المتکلفین.[1]	کتاب اللہ کا جو علم اللہ تعالیٰ تجھے مرحمت فرما دے اس پر اس کی تعریف کر اور اس کا جو علم اس نے خود اپنے نفس کے لیے رکھا ہے اور تجھے نہیں بتلایا اس کے متعلق تکلف مت کر اور جو اس کا عالم ہے اس کے سپرد کر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے یہی ارشاد فرمایا ہے آپؐ کہہ دیجئے کہ میں تم سے مزدوری نہیں چاہتا اور میں تکلف کرنے والوں میں نہیں ہوں-

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے-

اتقوا الرأی فی دینکم.[2]	دین میں رائے لڑانے سے بچو-

غرض سلف میں بیشتر ظن اور رائے اپنی جانب سے تخمینہ اور خیال آرائی کو کہتے ہیں جو رائے کتاب اللہ اور سنت رسول کے تحت ہو اس کو مطلقاً رائے نہیں کہا جاتا تھا نہ وہ مذموم ہے- حضرت ابن عباسؓ کے کلام میں اس تقسیم کی طرف اشارہ موجود ہے-

من احدث رأیا لیس فی کتاب الله و لم تمض به سنته من رسول الله لم یدر علی ما هو منه اذا لقی الله عزوجل.[3]	جس نے کوئی ایسی رائے ایجاد کی جو قرآن میں نہیں اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہے وہ نہیں جانتا کہ کل قیامت میں اس کا حشر کیا ہوگا-

ان الفاظ سے رائے کی دو قسمیں ظاہر ہوتی ہیں ایک وہ جو کتاب اللہ کے ماتحت ہو دوسری وہ جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو- اس کے مقابلہ میں علم اس کو کہا جاتا تھا جو قرآن و حدیث نے بتایا' یا صحابہؓ سے منقول ہوا- اوزاعی فرماتے ہیں کہ علم صرف وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں-[4]

ابن جریج روایت کرتے ہیں کہ میں نے عطاء سے ایک مسافر کے متعلق مسئلہ پوچھا کہ اس نے حج کے مہینوں کے سوا کسی اور مہینہ میں عمرہ کیا پھر اس کا خیال ہوا کہ حج کے ایام میں حج کر لے کیا وہ متمتع ہو جائے گا فرمایا کہ متمتع نہیں ہو سکتا جب تک کہ اشہر

---

[1] اعلام ج اص ۴۷ و جامع بیان العلم ج ۲ ص ۵۰- [2] اعلام ج اص ۴۵- [3] اعلام ج اص ۴۵- [4] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۹-

ج میں پھر اپنے میقات پر لوٹ کر نہ آئے میں نے کہا کہ أرای ام علم؟ یہ جو آپ نے جواب دیا ہے یہ رائے ہے یا علم۔[۱]

ان کلمات سے ظاہر ہے کہ رائے اور علم' اسی طرح ظن اور علم سلف میں دو متقابل چیزیں تھیں واقعی بات کو علم اور تخمینی باتوں کو ظن کہا جاتا تھا' جانب راجح اور مرجوح کی ان کے یہاں کوئی تفصیل نہ تھی۔ یہی اصطلاح قرآن کی بھی ہے۔

(۱) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ. (حجرات:۱۲)

اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے بچا کرو کیونکہ بعض خیال و گمان گناہ کی حد تک پہنچتے ہیں۔

آیت بالا میں گناہ ہونے کا حکم اس پر نہیں ہے کہ وہ جانب راجح ہے یا مرجوح بلکہ خلافِ واقع اور بے تحقیق بات پر ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

(۲) وَ اِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ السَّاعَةُ لَا رَیْبَ فِیْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ. (جاثیه : ۳۲)

جب کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے اور قیامت آنے میں کوئی شبہ نہیں تو تم نے یہ جواب دیا ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے۔ ہمیں تو یہ بات یونہی بے تحقیق سی معلوم ہوتی ہے اور ہم ہرگز اس کا یقین نہیں کر سکتے۔

اسی طرح آیات ذیل بھی اسی معنی میں مستعمل ہیں:

(۳) اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى. (النجم : ۲۳)

صرف اٹکل اور نفس کی خواہشات پر چلتے ہیں اور ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی ہے۔

(۴) مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا. (النجم:۲۷)

اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں صرف خیالات پر چلتے ہیں اور خیالات حق کی جگہ کچھ کار آمد نہیں ہوتے۔

(۵) وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ اَنَّ اللّٰهَ لَا یَعْلَمُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ وَ ذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخَاسِرِیْنَ. (حم سجده : ۲۲، ۲۳)

لیکن تم کو یہ خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ بہت سی چیزیں جو تم کرتے ہو نہیں جانتا اور تمہارے اسی خیال نے جو تم نے اپنے رب کے متعلق پکا رکھا تھا تم کو ہلاک کیا اور تم نقصان میں رہ گئے۔

(۶) یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِیَّةِ. (آل عمران : ۱۵۴)

وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جاہلوں کے سے جھوٹے خیال رکھتے تھے۔

(۷) وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا. (احزاب:۱۰)

اور تم اللہ تعالیٰ کے متعلق طرح طرح کے خیالات کرنے لگے۔

(۸) وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ. (نساء : ۱۵۷)

جو لوگ عیسیٰ کے معاملہ میں کئی باتیں کہتے ہیں وہ یہاں شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کو اس کا کچھ علم نہیں صرف اپنے خیالات کی پیروی ہے۔

---

[۱] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۹۔

(۹) وَ مَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ. (یونس: ۶۶)

اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو شریک پکارتے ہیں یہ صرف خیال کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

(۱۰) وَ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيٰ وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ وَ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ. (جاثیہ: ۲۴)

اور کہتے ہیں یہی ہماری زندگی ہے جس میں ہم جیتے اور مرتے ہیں اور ہم کو نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ ان کو کچھ علم نہیں وہ صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔

(۱۱) وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ. (الانعام: ۱۱۶)

روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کی باتیں مان لیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے وہ صرف خیالات کی پیروی کرتے ہیں۔

ان تمام آیات میں ظن ان خیالات ہی کو کہا گیا ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیے جائیں پھر وہ خواہ حد یقین کو پہنچ جائیں یا صرف شک کے مرتبہ میں رہ جائیں پہلی آیت میں ظن سے اجتناب کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ دوسری آیت میں کفار کا قیامت کے متعلق ظن کا اقرار مذکور ہے تیسری آیت میں ظن اور خواہشاتِ نفس کے مقابلہ میں خدا کی ہدایت کو رکھا گیا ہے اسی طرح چوتھی آیت میں علم اور ظن کو مقابل قرار دیا گیا ہے آٹھویں آیت میں جن لوگوں کے متعلق شک کی حالت میں ہونا فرمایا گیا ہے' ان ہی کے متعلق اسی آیت میں یہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ ظن کی اتباع کرتے ہیں حالانکہ اصطلاح کے لحاظ سے ظن اور شک متقابل چیزیں ہیں۔ نویں آیت میں ظن اور خرص یعنی تخمینہ کو قرین اور ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان تمام مقامات میں کہیں بھی ظن کے اصطلاحی معنی مراد نہیں ہیں اور نہ یہ وہ ظن ہیں جو ادلہ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ قرآن جس ماحول میں آیا اس وقت خدا کی ذات وصفات' قیامت اور اہل کتاب کے معاملات کا مشرکین کو کچھ بھی علم نہ تھا اور جو علم تھا وہ صرف سنی سنائی باتیں یا غلط قیاسات اور باطل ظنون تھے قرآن آیا تو اس نے بنیادی طور پر یہ سکھلایا کہ اب خدائی تعلیم کی اتباع کرو اتباع ظنون وقیاسات چھوڑ دو۔

ظاہر ہے کہ اس وقت جو ظن مشرکین کو قیامت کے متعلق تھا یا سورۂ آل عمران کی آیت میں جو ظن مسلمانوں کے دل میں پیدا ہونے لگا تھا یا سورۂ حم سجدہ میں خدا کے علم کے بارے میں جو ظن کہ مشرکین کے قلوب میں موجود تھا اور اسی طرح دوسری آیات میں جہاں جہاں ظن کا ذکر اور اس کی مذمت کی گئی ہے یہ وہ ظن ہرگز نہیں ہیں جو ادلہ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوئے بلکہ اپنی جانب سے پکائے ہوئے بے بنیاد خیالات تھے جو ظن کہ ادلہ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے قرآن نے اس کی مذمت کا کہیں ایک حرف بھی نہیں کہا ان جملہ مواقع پر جتنے ظنون ہیں یہ وہ ظنون ہیں جو شریعت کے خلاف یعنی خدا اور رسول کے بیان کردہ عقائد کے خلاف ہیں۔ جب خدا کی جانب سے حق بات پہنچا دی جائے تو اس کے خلاف اب نہ ظن معتبر ہوتا ہے نہ یقین۔ چوتھی آیت کا یہی مطلب ہے۔ مولانا اسلم صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ ظن کی مذمت اس لیے کی گئی ہے کہ وہ ظن ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے جن ظنوں کی ان آیات میں

مذمت کی گئی ہے اگر وہ یقین کے مرتبہ میں پہنچ جائیں تو اور زیادہ قابل مذمت ہوں گے- خلاصہ کلام یہ ہے کہ سلف میں اور قرآنی محاورات میں بیشتر ظن کا اطلاق بے تحقیق بات پر اور علم کا واقعی بات پر کیا گیا ہے- ان آیات میں ان ظنی احکام کے خلاف جو ظنی احادیث سے ثابت ہوں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ہے- بلکہ یہ وہ ظنون ہیں جو حق کے صریح خلاف محض اپنی دماغی ایجاد اور خواہش نفس کی بنا پر پیدا کر لیے گئے ہیں- خدائی ہدایات اور سماوی علوم کو قرآن کے مذمت کردہ ظن کا مصداق سمجھنا قرآن کی کھلی ہوئی تحریف ہے-[1]

---

[1] امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں "الظن اسم لما یحصل عن امارة و متی قویت اوت الی العلم و متی ضعفت جدا لم یتجاوز حد الوهم" -ظن اس خیال کو کہتے ہیں جو علامات دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوتا ہے اب اگر قوی ہو گیا تو علم بن جاتا ہے اور اگر بہت کمزور رہا تو وہم کے مرتبہ میں رہ جاتا ہے اور یہ سب سے کمزور مرتبہ ہے-

امام راغبؒ نے اس عبارت میں ظن کی ٹھیک وہی حقیقت متعین کی ہے جس کو ہم نے ابھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے پس لغت کے لحاظ سے ظن، یقین اور شک کے خلاف کسی حالت کا نام نہیں بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینہ کا نام ہے اس کے بعد واقعات کے لحاظ سے وہ یقین اور وہم دونوں حالتوں کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے- انسان میں یہ ایک ممتاز صفت ہے اور اس کی فطرت کی سلامتی اور کجی کی بہت بڑی دلیل ہے سلیم الفطرت انسان اکثر واقع کے مطابق ہی ظن کیا کرتا ہے اور کج فطرت ہمیشہ اٹکل کے تیر لگاتا ہے ان ہی دونوں قسموں کا نقشہ ذیل کی دو آیتوں میں کھینچا گیا ہے چنانچہ خاشعین کے متعلق فرمایا:

وَ اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ. (البقرۃ: ٤٦)	نماز بہت گراں ہوتی ہے بجز ان کے جنہیں یہ خیال لگ رہا ہے کہ انہیں اپنے پروردگار سے ایک دن ضرور ملنا ہے-

اور کفار کے حق میں فرمایا:

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ○ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○ (المطففین: ٤ - ٦)	ان لوگوں نے یہ تخمینہ کیوں نہ کیا کہ انہیں ایک بہت عظیم الشان دن میں حساب کے لیے پھر اٹھ کھڑا ہونا ہے- یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ رب العالمین کے سامنے آئیں گے-

ہر شخص جو رب کا قائل ہے اس کی فطرت میں لقاء رب کی تمناء ہونا چاہیے جو لوگ لقاء رب کے خیال میں لگے ہوئے ہیں وہ یقیناً سلیم الفطرت اور قابل مدح انسان ہیں اور جن کو یہ خیال نہیں وہ یقیناً پست فطرت اور قابل مذمت ہیں انہیں یہ خیال ضرور ہونا چاہیے تھا کہ رب العالمین جب حساب کے لیے سب کو بلائے گا تو ہمیں کیوں نہ بلائے گا- ان دونوں آیتوں میں فطرت کی اسی صحیح آواز کی طرف دعوت دی گئی ہے ورنہ پہلی آیت میں جن خاشعین کا ذکر ہے انہیں قیامت کا ظن نہیں بلکہ کامل یقین حاصل تھا جیسا کہ ارشاد ہے-

وَ بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ. (البقرۃ: ٤)	یہی لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں-

اور کفار کو قیامت کے متعلق ایک شمہ برابر بھی یقین نہ تھا-

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ. (الجاثیہ: ٣٢)	ہمیں قیامت کا یونہی خیال سا ہے ہم ہرگز اس پر یقین لانے والے نہیں-

چونکہ ظن یقین کے ساتھ جمع ہو سکتا تھا اس لیے کفار نے یہاں یہ تصریح کرنا ضروری سمجھا کہ ہمارا یہ ظن وہ ظن نہیں جس کے بعد یقین پیدا ہو سکے بلکہ یہ ان اوہام کے قبیلہ کی چیز ہے جو جانب مخالف کے یقین کے حال میں بھی دماغ میں گذر سکتی ہے- ہمارے نزدیک ان دونوں آیتوں میں ظن اپنے ہی معنی میں مستعمل ہے اور یہ تنبیہ کرنے کے لیے مستعمل ہے کہ قیامت کا معاملہ انبیاء علیہم السلام کی تمام تعلیمات کی طرح عین فطرت کی آواز کے لحاظ .....

دلیل متواتر بھی مفید ظن ہوسکتی ہے ٭ یہ یادرکھنا چاہیے کہ قرآن کا حرف حرف اگرچہ متواتر ہے لیکن اس کے باوجود اس کے جو مسائل فروعیہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں ان کے متواتر ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کرسکتا کیونکہ ثبوت کی قطعیت دلالت کی قطعیت کو مستلزم نہیں ہے قرآن کی ایک ایک آیت بلاشبہ قطعی الثبوت ہے لیکن کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہر آیت قطعی الدلالۃ بھی ہے خود صحابہ کرام کے زمانہ میں بعض آیات کا مفہوم سمجھنے میں خلاف ثابت ہے' اگر ان آیات کے مفہومات بھی متواتر ہوتے تو الفاظ کی طرح ان میں بھی کسی کو خلاف کی مجال نہ ہوتی۔

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ کسی متواتر کا قطعیت کو مفید ہونا اس پر موقوف ہے کہ اس کے جمیع مقدمات بھی متواتر ہوں۔لیکن

لــــہ ..... مطابق ہے اس لیے خاشعین کا یقین ان کی فطرت کی سلامتی کی علامت اور قابل مدح ہے اور مشرکین کی ضد ان کی فطرت کی کجی اور قابل مذمت بات ہے اگر آپ یہ سمجھ گئے ہیں تو یہ نکتہ بھی آپ کے ذہن میں آسکتا ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ لقاء رب کے لیے ظن اور رجاء کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔اور آخرت کے لیے یقین کا لفظ کیوں۔بات یہ ہے کہ آخرت ایک غیبی حقیقت ہے۔جو انبیاء علیہم السلام نے بتائی اس کا تسلیم کرنا ان کے اعتماد پر ضروری ہے اور لقاء رب انسان کی فطرت کی آواز ہے صرف ایک غیبی حقیقت نہیں وہ از خود ہر انسان کے دل میں گذرنا چاہیے۔امام بخاری نے کتاب الفرائض میں عقبہ بن عامر کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔الظانین یعنی الذین یتکلمون بالظن۔''ظانین وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے تخمینہ سے باتیں بتاتے ہیں''۔مہلبؒ ایاکم و الظن کی شرح میں فرماتے ہیں و ھو الذی لا یستند الی اصل۔یعنی ظن ممنوع وہ ہے جو کسی دلیل پر مبنی نہ ہو محض اپنی جانب سے ایک انکل ہو۔بہرحال ہمیں حدیث وقرآن سے ایک جگہ بھی یہ ثابت نہ ہوسکا کہ جو ظن دلائل شرعیہ کی روشنی میں پیدا ہو وہ کبھی قابل مذمت ہوسکتا ہے۔ہمارے نزدیک تمام دلائل کی پرواز صرف ظن ہی کی حد تک ہے اس کے بعد یقین حاصل ہونا صرف خدا تعالیٰ کی بخشش کی چیز ہے اس لیے جس حد تک انسان مکلف ہوسکتا ہے وہ صرف تحصیل ظن ہے۔یقین کی وہ منزل جس میں جانب مخالف کا خطور بھی نہ ہو بہت نادر ہے اگر تمام شریعت کی بنیاد ایسے ہی یقین پر قائم کی جائے تو فروعات تو درکنار اصول کے بہت سے مسائل بھی دلائل کی روشنی میں اس حد تک ثابت ہونا مشکل ہیں اسی لیے تحصیل یقین کا ذریعہ صرف ایک یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر ان کی تمام باتوں کو بے دلیل مان لیا جائے۔پس جہاں ہمیں بلا تردد یقین رکھنے کا مکلف بنایا گیا ہے وہاں دلائل کی تحصیل کا حکم نہیں دیا گیا اور جہاں اجتہاد و استدلال کا حکم دیا گیا ہے وہاں یقین کے آخری مراتب کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ ظن ہی کو یقین کا حکم دے دیا گیا ہے۔اگر ہر ہر قدم پر یقین کا حاصل کرنا فرض کردیا جاتا تو دین و دنیا دونوں کے نظام معطل ہوکر رہ جاتے اب آپ کو اختیار ہے کہ اس تعبیر کو اگر پسند نہیں کرتے تو یوں تعبیر کرلیجئے کہ شہادت اور دلائل کی روشنی میں جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس کا نام ظن ہی نہیں وہ یقین ہی ہے خواہ عقلی طور پر اس میں کتنے ہی شبہات باقی رہیں مثلاً اگر ایک کنوئیں میں نجاست کا گرنا ثابت نہیں ہوسکا تو اس کو پاک کہنا یقینی ہوگا۔حالانکہ یہ احتمال ہر وقت ممکن ہے کہ اس میں نجاست گرگئی ہو اور اس کا ہمیں علم نہ ہو۔لیکن جب اس احتمال کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں تو اس کا اعتبار بھی نہیں۔بہرحال اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ مسائل فروعیہ میں ہرگز اس یقین کا اعتبار نہیں ہے جو تواتر سے حاصل ہوتا ہے بلکہ ہر یقین جو دلائل کی راہبری سے حاصل ہوجاتا ہے وہ بھی بلا تردد معتبر ہے خواہ آپ اس کا نام یقین رکھیں یا اسے ظن سے تعبیر کریں قرآن اور حدیث میں ایک حرف بھی اس کے خلاف نہیں ہے اس کے مقابلہ میں علم صرف یقین کا نام نہیں بلکہ کسی چیز کے واقعہ کے مطابق جاننے کا نام ہے امام راغبؒ فرماتے ہیں العلم ادراک الشئی بحقیقۃ یعنی علم وہ ادراک ہے جو ٹھیک حقیقت کے موافق ہو خلاصہ یہ ہے کہ ظن اور علم میں فرق یہ ہے کہ ظن صرف انکل اور اندازہ کا نام ہے اور علم واقعی بات کے ادراک کا یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ یقین بلحاظ یقین بھی علم متواتر کے ہم پلہ ہو۔یہاں جن کو مغالطہ ہوا ہے وہ اصطلاح منطق کی بدولت ہوا ہے قرآن وحدیث میں ظن ہمیشہ اس معنی میں نہیں' منطق میں جہل مرکب بھی تصدیق کی ایک قسم ہے۔

اگر اس کے مقدمات ظنی ہیں تو پھر وہ ظن ہی کو مفید ہوگا مثلاً ہر کلام کا سمجھنا لغت اور نحویوں کی رائے پر بھی موقوف ہے۔ پس اگر کسی مسئلہ نحوی میں نحویوں کی رائے مختلف ہے یا کسی لغت میں اہل لغت کا اختلاف ہے تو اس اختلاف کا اثر اس متواتر کلام کے مفہوم پر بھی ضرور پڑتا ہے کیونکہ جن امور پر اس کلام کے مفہوم کا سمجھنا موقوف ہے جب وہی ظنی ہیں تو پھر اس کلام کو مفید قطع کیسے کہا جا سکتا ہے۔[1]

پس اگر ظن ایسا ہی قابل تردید چیز ہے تو پھر جو ظنی احکام کتاب اللہ سے ثابت ہوں گے ان کے متعلق بھی یہی فیصلہ کرنا لازم آئے گا۔

اصولِ دین قطعی ہونا چاہئیں فروعی مسائل ظنی ہو سکتے ہیں ❊ مولانا اسلم صاحب کو یہاں اصولی غلطی یہ پیش آ گئی ہے کہ انہوں نے اصول اور فروع میں فرق نہیں کیا 'اصول دین' دین کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر ظنی ہوں تو بے شک دین کی بنیاد ظنی امور پر قائم ہونا لازم آتا ہے لیکن فروع پر دین کی بنیاد قائم نہیں ہوتی بلکہ وہ اصولِ دین کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں اس لیے قطعیت کا مسئلہ صرف اصول کے ساتھ خاص ہے۔ فروع میں اگر ظنیت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اس کی مثال بالکل قانونی دفعات کی سمجھئے قانون کے الفاظ اپنے اجمال کے ساتھ قطعی ہوتے ہیں اور اس کی ضمنی دفعات وتشریحات بسا اوقات ظنی ہوتی ہیں اسی لیے ان میں ہر عدالت کو اختلاف کرنے کی گنجائش مل جاتی ہے۔ امام شاطبیؒ نے مقدماتِ کتاب کے پہلے مقدمہ میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ پس فروعی مسائل کے ظنی ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے نہ ان مسائل کے تسلیم کرنے سے دین کی بنیاد کا ظنی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہاں امام شاطبیؒ کی ایک اور تحقیق بھی نہایت قابل قدر ہے غور سے مطالعہ فرمائیے۔

دلائل شرعیہ کی چار قسمیں ہیں: (۱) قطعی (۲) ظنی۔ مگر وہ ظنی جو کسی قطعی اصل کے ماتحت ہے جیسے وہ اخبارِ آحاد جو قرآن کریم کا بیان واقع ہوئی ہیں مثلاً وضو، غسل، نماز اور حج وغیرہ کی تفصیلات اگر چہ یہ تمام تفصیلات اپنی جگہ ظنی ہوں مگر چونکہ یہ ایک قطعی نص قرآنی کا بیان ہیں اس لیے ان کا اعتبار کرنا بھی ضروری ہے۔ (۳) وہ ظنی دلیل جو کسی قطعی کے معارض ہے اور دوسری کوئی قطعی دلیل اس کے لیے شاہد بھی نہیں۔ ایسی ظنی دلیل یقیناً قابل قبول نہیں۔ چنانچہ اسی قاعدہ کے ماتحت حضرت عائشہؓ نے چند ظنی احادیث کا انکار فرمایا ہے۔

(۱) ایک مرتبہ ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ میت کو زندوں کے رونے پیٹنے سے عذاب ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی﴾ (الاسراء:۱۵) یعنی یہ حدیث صرف ایک شخص کا بیان ہے اس کی وجہ سے قطعی آیت کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا آپ نے فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے۔ ﴿لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ﴾ (الانعام:۱۰۳) آنکھیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ پا سکتا ہے آنکھوں کو۔

---

[1] دیکھو الموافقات ج ۱ ص ۳۵۔

(۳) حضرت ابن عمرؓ نے روایت فرمائی کہ نحوست تین چیزوں میں ہے- گھوڑا، عورت، مکان- حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ﴿اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ﴾ (آل عمران: ۱۵٤) جو بات ہوتی ہے خدا کے حکم سے ہوتی ہے-

اس قسم کے واقعات سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں- (۱) یہ کہ سلف میں احادیث کی حیثیت تشریعی تھی (۲) یہ کہ خبر واحد حجت ہے اگر حدیث کی یہ حیثیت نہ ہوتی یا خبر واحد حجت نہ ہوتی تو نہ شرعی معاملات میں ان سے حجت قائم کی جاتی اور نہ مخاطب کو انکار کے لیے کسی دلیل قطعی پیش کرنے کی ضرورت پڑتی- (۳) یہ کہ اگر دلیل قطعی کسی ظنی دلیل کے معارض ہو جائے تو ظنی دلیل کو رد کر دینا چاہیے، لیکن یہ بحث کہ کہاں معارضہ ثابت ہے اور کہاں نہیں- اختلاف نظر کے تابع ہے- ان ہی مذکورہ بالا صورتوں میں حضرت عائشہؓ کے سوا دوسرے صحابہؓ نے یہاں قطعی اور ظنی کا معارضہ ہی تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ پہلی صورت میں زندوں کے نوحہ کرنے سے میت کو عذاب اس وقت ہوتا ہے جب کہ نوحہ ان کے گھر کا دستور ہو اور میت نے اپنی حیات میں اس سے روکا بھی نہ ہو ظاہر ہے کہ اب یہ فعل میت ہی کا بن جائے گا اور اس لیے جو عذاب اس کو ہوگا وہ اپنے ہی فعل کا نتیجہ کہلائے گا نہ کہ دوسرے کے افعال کا- اسی طرح رؤیت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں بعض صحابہ نے آیت قرآنیہ میں مطلق رویت کی نفی تسلیم نہیں کی بلکہ علی وجہ الاحاطۃ رؤیت کی نفی سمجھی ہے جب دنیا میں کسی بادشاہ کے چہرہ پر آنکھ بھر کر نظر ڈالی نہیں جا سکتی تو جہاں رداء کبریا موجود ہو وہاں باادب نظروں کے سواء بیباکانہ نظر کب ڈالی جا سکتی ہے- اسی طرح ابن عمرؓ کی حدیث میں بھی وہ نحوست تسلیم نہیں کی جو جاہلیت کے دور میں مانی جاتی تھی بلکہ صرف ناموافقت مراد لی ہے اگرچہ ناموافقت ہر چیز میں ہو سکتی ہے مگر جو ناموافقت دائمی اور زندگی کی تلخ کرنے والی ہو سکتی ہے وہ صرف ان ہی تین چیزوں میں ہے- اس کے سوا عرب کے ماحول میں کوئی اور ایسی چیز نہ تھی جس کے ساتھ انھیں اپنی حیات میں اتنی طویل مصاحبت کی نوبت آتی ہو-

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کے سفر میں جب وباء کا حال معلوم ہوا تو آپ نے اپنے رفقاء سے شہر میں داخل ہونے نہ ہونے کے متعلق مشورہ کیا- رائے یہ طے پائی کہ واپس ہو جانا چاہئے اور شہر میں داخل نہ ہونا چاہئے اس پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دلیل قطعی سے معارضہ فرمایا اور کہا افرارًا من قدر اللہ- اے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ! کیا آپ تقدیر سے بھاگتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ایسی سطحی بات کہنا تمہارے شایانِ شان نہ تھا نحن نفر من قدر اللہ الی قدر اللہ بے شک ہم بھاگتے ہیں مگر خدا ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں- اس کے بعد ایک مثال دے کر ان کو سمجھایا کہ اگر ایک جنگل خشک ہو اور دوسرا سبز تو چرواہا اپنے جانور خشک جنگل کی بجائے سبز جنگل ہی میں چرائے گا کیا اس کا نام تقدیر سے فرار رکھا جا سکتا ہے- خلاصہ یہ ہے کہ اسباب کا ارتکاب کرنا بھی تقدیر کے اندر داخل ہے اسی لیے میری واپسی تقدیر سے فرار نہیں ہے بلکہ یہ بھی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے- یہاں ایک ظنی معاملہ میں دو قطعی اصل معارض تھے- ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نظر ایک طرف گئی اور دوسرے کی دوسری طرف اسی قسم کے محتمل مقامات پر اختلاف اجتہاد سے احکام کا اختلاف نمایاں ہو جاتا ہے اسی لیے ہم نے کہا تھا کہ دین کے اصول ظنی نہیں ہو سکتے ہیں مگر اس کے فروع ظنی ہو سکتے ہیں تمام اصول و فروع کے لیے قطعی دلائل تلاش کرنا قطعاً خلاف واقع ہے-

العمل بالظن ثابت فی تفاصیل الشریعة[1] شریعت کی تفصیلات میں ظن پر عمل کرنا دین میں ثابت شدہ امر ہے۔

امام ابوحنیفہؒ پر حدیث کی مخالفت کا طعن اور اس کا جواب ❋ اسی ضمن میں امام شاطبیؒ ایک بڑی الجھن کو حل کر گئے ہیں۔بعض محدثین نے جن کے مزاج میں حدیث کا رنگ تفقہ پر غالب تھا بہت سے فروعی مسائل میں امام صاحبؒ پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے حافظ ابن عبدالبرؒ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کثیر من اھل الحدیث استجازوا الطعن علی ابی حنیفة لردہ کثیرا من اخبار الاحادا لعدول لا نہ کان یذھب فی ذلک الی عرضھا علی ما اجتمع علیہ من الاحادیث و معانی القرآن فما شذ من ذلک ردہ و سماہ شاذا[2]

بہت سے محدثین نے امام ابوحنیفہؒ پر اس لیے طعن کیا ہے کہ انہوں نے بہت سی ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا اصل بات یہ ہے کہ امام صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ خبر واحد کو اس باب کی دوسری احادیث اور قرآن کریم کے مجموعہ سے ملا کر بھی دیکھا کرتے تھے اگر اس کا مضمون ان سے مطابقت کھا جاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس کو شاذ حدیث سمجھتے۔

امام صاحب کا یہ طرز قابل داد تھا مگر کیا کیجئے کہ طبائع اور مزاجوں کے اختلاف کی وجہ سے سب کے نزدیک قابل قبول نہ ہوا۔ یہاں منکرین حدیث کو بہت زیادہ غور کرنا چاہیے۔

(۴) دلیل کی چوتھی قسم یہ ہے کہ وہ خود ظنی ہو لیکن نہ اس کی موافقت میں کوئی دلیل قطعی ہاتھ آئے نہ مخالفت میں۔ اس کے متعلق امام شاطبی تحریر فرماتے ہیں۔

و الا ستقراء یدل علی انہ غیر موجود[3] تلاش کے بعد ایسی کوئی ظنی دلیل نہیں مل سکی۔

امام شاطبیؒ کی اس مفید تفصیل سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دین کے جن گوشوں میں ظنی دلائل کا اعتبار ہے وہ کس قسم کے ظنیات ہیں یعنی یہ وہ ظنیات ہیں جو کسی قطعی اصل کے ماتحت درج ہیں اگر ان کے لیے کوئی قطعی اصل شہادت نہیں دیتی تو ایسی ظنیات کا دین میں اعتبار نہیں بلکہ ان کا وجود ہی نہیں اب انصاف فرمایئے کہ دین کی بنیاد قطعیات پر قائم کرنے کے لیے یہ راہ معتدل ہے یا یہ کہ صرف قطعی دلائل اور قطعی مسائل کے علاوہ تمام دین کا انکار کر دیا جائے اس بناء پر تو سینکڑوں وہ ظنی احکام جو قرآن سے بھی ثابت ہیں قابل انکار ہو جائیں گے۔

خبر متواتر کے مفید علم یقین ہونے میں ایک غلط فہمی ❋ محدثین کے اس بیان نے کہ خبر متواتر علم یقین کو مفید ہوتی ہے اور خبر واحد علم یقین کو مفید نہیں ہوتی' یہاں یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ جب خبر واحد مفید علم یقین نہ ہوئی تو یقیناً مفید ظن ہو گی اس لیے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ خبر متواتر کے علاوہ جتنی حدیثیں ہیں وہ سب ظنیات کا مجموعہ ہیں اور ظن ہی کو مفید ہیں حالانکہ یہ نتیجہ ان کے کلام کو نہ دیکھنے اور نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جس علم کو متواتر کے ساتھ مخصوص کیا ہے وہ صرف علم بدیہی ہے یعنی

---

[1] الموافقات ج ۳ ص ۲۶۔ [2] ایضاً ج ۳ ص ۲۴۔ [3] ایضاً ج ۳ ص ۲۶۔

وہ علم جو کسی دلیل و برہان کے بغیر حاصل ہوتا ہے جیسا کہ آفتاب کے وجود کا علم یہاں ہر مسلم و کافر' جوان و بوڑھا' سمجھ دار اور احمق شخص بھی اس کے وجود کا علم رکھتا ہے اور اس کے لیے کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے- اس قسم کا علم صرف خبر متواتر کا خاصہ ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسا علم صرف اپنے مشاہدات پر ہی حاصل ہو سکتا ہے اس کے سوا اگر ہزاروں افراد بھی کسی بات کو نقل کریں تو یہ علم حاصل نہیں ہونا- مثلاً لاکھوں انسان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں اور کروڑوں انسان آواگون کے قائل ہیں مگر اتنے انسانوں کی خبر کے بعد بھی یقین تو درکنار اس کا ظن بھی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ یہاں خبر متواتر کی اور شرطوں کے علاوہ سب سے بڑی یہ شرط مفقود ہے کہ اس کا مبنیٰ امر محسوس نہیں بلکہ امر معقول ہے- مولانا اسلم صاحب خود اپنے رسالہ میں تسلیم کرتے ہیں کہ خبر متواتر کی شرطوں میں یہ شرطیں بھی داخل ہیں-

(۱) خبر متواتر کا مبنیٰ محسوس ہو' اگر غیر محسوس ہو تو متواتر نہ ہوگی مثلاً مکہ ایک شہر ہے یہ خبر متواتر اور یقینی ہوگی-

(۲) اس خبر کو سنتے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے-[۱] (علم حدیث ص ۳۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خبر واحد کے متعلق جس علم کی انہوں نے نفی کی ہے وہ علم بدیہی ہے اور ان کا مطلب یہ ہے کہ خبر واحد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ خبر متواتر کی طرح علم بدیہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی ظنی اور کبھی علم نظری ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ خبر متواتر سے علم حاصل ہونے میں سب لوگ یکساں ہوتے ہیں خواہ ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہو یا نہ ہو لیکن خبر واحد سے علم حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے- جن میں نظر و فکر کی اہلیت موجود ہو- یہاں ہر شخص کو یکساں علم حاصل نہیں ہو سکتا اسی لیے خبر متواتر میں سند سے بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور خبر واحد میں یہ ضرورت باقی رہتی ہے-[۲]

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ اگر تمام دین کی بنیاد علم بدیہی ہی پر قائم کی جائے تو پھر تمام دین کو قطعی طور پر حاصل کرنے کی بجائے پورے سے ہاتھ ہی دھونا پڑے گا' عقائد' اصول شرائع' مغیبات اور دین کے تمام نظری مسائل سب ظنی ہو جائیں گے اور حسب زعم منکرین حدیث قابل اعتبار نہ رہیں گے- امام شاطبیؒ تحریر فرماتے ہیں-

و انما الا دلة المعتبرة مهنا المستقرأة من — عام طور پر جو دلائل یہاں معتبر ہیں وہ اس قسم کے ہیں جو علیحدہ علیحدہ

---

۱ اب مولانا اسلم صاحب اور ان کی جماعت ذرا بتلائیں کہ اس لحاظ سے تمام قرآن کو متواتر کہنے کا کیا مطلب ہے- صرف یہی نا کہ یہ وہی قرآن ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اس کے علاوہ جتنے اس کے غیر محسوس احکام ہیں اور ہزاروں عالم غیب کے اسرار و حقائق ہیں کیا وہ سب متواتر کی تعریف میں آتے ہیں پھر ان کے متعلق کیا سامع کو سننے کے ساتھ فوراً یقین آ جاتا ہے- فرمائیے آج یہ قرآن شرق و غرب میں پھیلا پڑا ہے کس کس سامع کو اس پر بے دلیل یقین حاصل ہوا پھر احادیث متواتر نہیں ہیں کی چکی پیسے چلے جانے سے کیا فائدہ ہے- قرآن اگر متواتر ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کے الفاظ تواتر کے ساتھ سنے گئے ہیں اس کے علاوہ جب احکام شرعیہ کا مرحلہ آئے گا تو اکثر آیات کا مفہوم غیر محسوس ہونے کی وجہ سے ان کو متواتر نہیں کہا جا سکتا لہٰذا منکرین حدیث کو ان کا بھی صاف انکار کر دینا چاہیے کیونکہ یہ احکام بھی متواتر کی تعریف میں نہیں آتے اس لیے مفید یقین ان کو بھی نہیں کہا جا سکتا-

۲ دیکھو شرح نخبۃ الفکر مصنفہ حافظ ابن حجرؒ-

جملة ادلة ظنية تضافرت على معنى واحد حتى افادت فيه القطع فان للاجتماع من القوة ما ليس للافتراق و لا جله افاد التواتر القطع و هذا نوع منه. فاذا حصل من استقراء ادلة المسألة مجموع يفيد العلم فهو الدليل المطلوب و هو شبيه بالتواتر المعنوی[1]

اگر چہ ظنی ہیں مگر کسی ایک مسئلہ میں سب متفق ہو جانے کی وجہ سے خاص اس مسئلہ میں یقین کا فائدہ دینے لگتے ہیں ظاہر ہے کہ جب دلائل کے ملنے کے بعد جو قوت پیدا ہو سکتی ہے وہ ان کی انفرادی حیثیت میں پیدا نہیں ہو سکتی خبر متواتر بھی اسی اجتماعی قوت کی وجہ سے یقین کا فائدہ دیتی ہے پس جب کسی ایک مسئلہ کے لیے متفرق دلائل جمع ہو جائیں تو ان کے مجموعہ سے ایک یقین حاصل ہو جاتا ہے اور یہ بھی ایک قسم کا معنوی تواتر بن جاتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ دین کے ارکانِ خمسہ بھی اسی طریقہ سے ثابت ہیں ورنہ نماز' روزہ' زکوٰۃ وغیرہ کی فرضیت پر اگر صرف اقیمو الصلوة وغیرہ سے استدلال کیا جائے تو اس میں کئی وجہ سے تردد رہ سکتا ہے۔صلوٰۃ کے معنی لغت میں صرف دعا کے ہیں لیکن اس کے ساتھ اگر خارجی قرائن کو بھی ملا لیا جائے صحابہؓ کے عمل اور اہل اسلام کے مجموعی تعامل کو بھی دیکھا جائے تو یہ حکم بدیہی ہو جاتا ہے کہ نص قرآنی میں صلوٰۃ کے لفظ سے یہی معروف نماز مراد ہے ان مجموعی قرائن کے بعد بھی اب یہاں وہی شخص شک کر سکتا ہے جن کو مسلمانوں کے اصل دین ہی میں شک ہے۔[2]

امام شاطبیؒ کی مذکورہ بالا تحقیق سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ دین کے اکثر مسائل اگر چہ متواتر حدیثوں سے ثابت نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود پھر قطعی اور یقینی کیوں ہیں ان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ یقین کا افادہ صرف تواتر میں منحصر نہیں بلکہ جب متفرق دلائل اور خارجی و داخلی قرائن کسی ایک امر کی شہادت دیتے چلے جاتے ہیں تو یہاں بھی لفظی تواتر نہ سہی مگر ایک قسم کا معنوی تواتر پیدا ہو جاتا ہے اور اس مجموعہ سے یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین میں ایک بڑی بھاری جماعت یہ کہتی ہے کہ صحیحین کی تمام احادیث قطعیت کو مفید ہیں۔

احادیثِ صحیحین مفید یقین ہیں ❋ حافظ ابن حزم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک حدیث کے لیے کتنے راویوں کی ضرورت ہے جس کے بعد حدیث بداھۃً علم کو مفید ہو جاتی ہے۔ اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی خاص عدد مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دو شخص بھی کوئی خبر دیں جن کے متعلق ہمیں یہ یقین ہو کہ اس سے پہلے نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں اور نہ اس خبر میں ان کی طمع یا خوف کا کوئی مضمون ہے پھر ایک دوسرے کی لاعلمی میں اس طویل خبر کو ہمارے سامنے بیان کریں وہ بھی از خود نہیں بلکہ ایک ایک جماعت کے واسطے سے تو ہمیں ان کے صدق کا بدیہی طور پر یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے معاملات میں گذرتا ہے ہمارے اس بیان کی شہادت دے سکتا ہے۔ کسی کی موت' ولادت' نکاح' عزل' ولایت اور اس قسم کے تمام واقعات کا بدیہی علم ان طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں وہی شخص شک وشبہ پیدا کر سکتا ہے جو اپنے ان دنیوی معاملات کی

---

[1] الموافقات ج ۱ ص ۳۶۔ [2] الموافقات ایضاً۔

طرف غور نہ کرے اور روزمرہ کے ان واقعات سے قطع نظر کرلے۔

اگر آپ کسی آدمی سے ایک جھوٹا افسانہ تیار کرنے کے لیے کہیں تو وہ یقیناً ایک لمبا افسانہ گھڑ سکتا ہے لیکن اگر دو مکانوں میں دو شخصوں کو علیحدہ علیحدہ بند کردیں تو یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ کوئی ایسی حکایت اپنی جانب سے تیار کرلیں جس میں دونوں اوّل سے آخر تک متحد ہوں۔ ہاں شاذ و نادر کبھی ایسا واقع ہوگیا ہے کہ دو شاعروں کے خیالات ایک آدھے مصرعہ میں اتنے مطابق ہوگئے ہیں کہ ان میں لفظی اتحاد بھی پیدا ہوگیا ہے مگر ہمیں اب تک اپنی عمر میں ایک واقعہ بھی ایسا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا جس میں دو شاعروں کا کسی ایک شعر میں بھی پورا پورا اتفاق ہوگیا ہو' اگرچہ لوگوں نے اس بارے میں ایسے کلام کی ایک فہرست پیش کی ہے مگر ہمارے نزدیک وہ اکثر علمی سرقے ہیں جن میں اپنی عیب پوشی کے لیے اتحاد خواطر کے دعوے کردیئے گئے ہیں۔ پس کبھی خبر واحد میں بھی ایسے قرائن جمع ہوجاتے ہیں کہ وہ بھی بدیہی طور پر یقین کو مفید ہوجاتی ہے اور کبھی ایک جماعت کی خبر بھی یقین کا فائدہ نہیں دیتی مثلاً اگر کسی خبر سے کسی شہر کے شہر کا نفع و نقصان متعلق ہو تو عقل کے نزدیک اس تمام شہر کا جھوٹ پر متفق ہوجانا بھی محال نہیں ہے۔ بہر حال خبر کے مفید یقین ہونے کا کوئی ایک ضابطہ نہیں ہے یہ حالات اور زمانہ کے تابع ہے۔

خبر واحد کے مفید یقین ہونے پر قرآن سے ایک استدلال ❋ اس کے بعد ابن حزم لکھتے ہیں کہ ایک قسم کی حدیث وہ ہے جس کا خبر دینے والا ایک ہی شخص ہے پھر جس سے وہ نقل کرتا ہے وہ بھی ایک ہی شخص ہے اسی طرح ایک ہی ایک راوی کے واسطے سے یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہوجاتی ہے اگر یہ واسطے حسب ضابطہ سچے اور عادل اشخاص ہیں تو اس پر عمل کرنا بھی واجب ہے۔ حارث بن اسد محاسبی' حسین بن علی الکرابیسی کا یہی مذہب تھا۔ ابو سلیمان کا مختار بھی یہی تھا اور ابن خویز منداد نے یہی امام مالکؒ سے بھی نقل کیا ہے۔ قرآن کریم بھی اس کی صحت کا شاہد ہے۔

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ. (التوبۃ:۱۲۲)	ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہر جماعت میں سے ایک طائفہ دین کی تعلیم کے لیے نکل کھڑا ہوتا تاکہ جب وہ لوٹ کر اپنی قوم کے پاس آتا تو ان کو ڈراتا شاید وہ بھی بری باتوں سے بچنے لگتے۔

لغت میں طائفہ کسی چیز کے ایک حصہ کو کہتے ہیں اس لیے اس کا اطلاق ایک شخص سے لے کر جماعت تک کیا جاسکتا ہے لہٰذا آیت بالا کی بموجب ہر جماعت کا فرض ہے کہ جب ایک شخص یا کوئی جماعت ان کو دین کی باتیں پہنچائے تو وہ ان کو قبول کریں اور مانیں۔[۱]

حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس پر مستقل دو مقالے لکھے ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ جب ایک واقعہ ایک شخص کی زبانی ہمارے سامنے منقول ہوتا ہے پھر مختلف گوشوں سے مختلف طور پر اس کی مختلف شہادتیں ہمیں مل جاتی ہیں تو اگرچہ ہر ہر شہادت اپنی جگہ خبر

---

۱ توجیہ النظر ص ۴۴ و ۴۰۔

واحد ہوتی ہے لیکن ان خبروں کے مجموعہ[1] سے ہمیں یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً صحیح ہے عقل یہ ہرگز باور نہیں کرسکتی کہ مختلف اشخاص ایک دوسرے کی لاعلمی میں کوئی ایک واقعہ نقل کریں اور پھر وہ ازاوّل تا آخر کسی ایک بیان میں متفق ہو جائیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جابر کا ایک واقعہ صحیحین میں موجود ہے کہ ایک سفر میں آپؐ نے جابر سے اونٹ خریدا گو اس اونٹ کی قیمت بیان کرنے میں راویوں کا اختلاف ہے لیکن متعدد طریقوں سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے جابرؓ سے اونٹ خریدا تھا پس جب مختلف اشخاص نے ہمارے سامنے اس ایک واقعہ کو بیان کیا ہے درانحالیکہ ہمارے پاس اس کا بھی کوئی قرینہ نہیں ہے کہ ان اشخاص نے اس سے قبل کہیں بیٹھ کر اس خبر کو بنانے میں کوئی مشورہ کیا تھا یا اس خبر کے بیان کرنے سے ان کی کوئی خاص غرض متعلق ہے تو اس واقعہ کے یقین کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں رہتا۔[2] اگر اس کے بعد بھی ہم اس واقعہ میں محض عقلی طور پر شک و تردد کریں تو اس کا نام تحقیق واقعہ نہیں بلکہ وہم پرستی ہے۔

خبر واحد کے مفید یقین ہونے پر قرآن کریم سے دوسرا استدلال ❋

يَآ اَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اِنۡ جَآءَ كُمۡ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِيۡنَ. (حجرات:٦)	اے ایمان والو! جب کوئی فاسق شخص تمہارے سامنے کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بے تحقیق کسی قوم پر جا پڑو' بعد میں اپنے کیے پر نادم اور شرمندہ ہونا پڑے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے خبر واحد کو قبول کیا ہے اگر ایک شخص کی خبر قابل قبول نہ ہوتی تو وہ اس کو تحقیق کی بجائے رد کرنے کا امر کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے خبریں پہنچانے کے لیے بھی جو ذریعہ اختیار فرمایا ہے وہ بھی خبر واحد ہی ہے یعنی اللہ کا رسول ایک ہی ہوتا ہے اگر دین میں اصولی لحاظ سے ایک شخص کی خبر قابل قبول نہ ہوتی تو خود رسول تنہا اپنی خبر پر دوسروں کو ایمان لانے کا حکم کیسے دے سکتا تھا۔ قرآن کریم نے جہاں بھی زور دیا ہے راوی کی عدالت پر اور اس کے صدق پر زور دیا ہے حتیٰ کہ صرف زنا کے ایک معاملہ کے سوا جان کے معاملہ میں بھی دو شخصوں کا بیان اعتبار کرلیا ہے اور ایک جگہ بھی خبروں کی تصدیق کے لیے تواتر شرط نہیں کیا۔ اگر دو شخصوں کے بیان پر ایک مسلمان کو قصاصاً قتل کیا جاسکتا ہے یا ایک چور کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے' یا ایک شخص پر حد قذف لگائی جاسکتی ہے یا لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی مالیت تقسیم کی جاسکتی ہے تو کیا یہ اس بات کا بدیہی ثبوت نہیں ہے کہ شریعت نے یقین کا معیار صرف تواتر نہیں رکھا کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ شریعت نے ایک مسلمان کا قتل' ایک معصوم کا ہاتھ قطع' ایک بے گناہ پر حد قذف اور لاکھوں کی مالیت کے تقسیم یقین حاصل ہوئے بغیر محض ظن کی بنا پر جائز قرار دے دی ہے۔

---

[1] علامہ جزائری نے ضمنی طور پر یہاں ایک اور مفید بات لکھی ہے۔ بہت سے ناواقف اصحاب کو محدثین پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے حدیث کی کتابوں میں ضعیف حدیثیں کیوں جمع کر دی ہیں۔ اس کے جواب میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ محدثین مجہول اور کمزور حافظہ کے اشخاص کی احادیث صرف اس لیے جمع کرتے تھے کہ یہ احادیث کم از کم ایک مضمون کی تقویت اور تائید میں کارآمد ہوسکتی ہیں۔ قال احمد قد اکتب حدیث الرجل لا عتبره۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں۔ میں کبھی ایک شخص کی حدیث اس لیے بھی لکھتا ہوں کہ اس کو متابعت اور شواہد کے طور پر کام میں لاسکوں۔ (توجیہ ص ۱۳۴)

[2] توجیہ ص ۱۳۴۔

واقعہ تو یہ ہے کہ اگر زنا جیسے نازک معاملہ کے لیے بھی قرآن کریم نے چار شخصوں کی گواہی بصراحت لازم نہ کی ہوتی تو امت محمد یہ یہاں بھی دو شخصوں کے بیان سے رجم کرنے کا فیصلہ کر دیتی - علماء نے اس کی حکمتیں اپنی جگہ مفصل بیان کی ہیں مگر شاید اس کی ایک حکمت یہ بھی ہو کہ چونکہ زنا کے ایک ہی معاملہ کا تعلق دو جانوں کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی دو شخصوں کو اس ایک ہی جرم کے ثبوت میں رجم کرنے کی نوبت آ جائے اس لیے یہاں اس جرم کے ثبوت کے لیے وہ شہادت شرط کر دی گئی ہو جو تنہا تنہا دو جرموں کے لیے شرط کی گئی تھی -

یہاں یہ عذر کرنا کہ دو شخصوں کا بیان ایک مسلمان کے قتل کر ڈالنے کے لیے تو کافی ہو سکتا ہے مگر نماز کے ایک واقعہ، آپ کے حج کی ایک صورت، آپ کے روزہ کی ایک سنت نقل کرنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا قطعاً غیر معقول ہے - معتزلہ بھی جو دراصل منکرین حدیث کے قافلہ کے ساربان ہیں یہ دیکھ کر خبر عزیز کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں - دینی ثبوت کے لیے یقین کا مطالبہ تو معقول ہو سکتا ہے مگر تواتر کی شرط لگانا بالکل بے معنی بات ہے - پس منکرین حدیث کو دو باتوں میں ایک بات صاف کر دینا چاہیے یا یہ کہ شریعت نے تواتر کے علاوہ یقین کو یقین ہی نہیں کہا یا خبر واحد کسی حال میں مفید یقین ہوتی ہی نہیں - اگر خارجی قرائن ملا کر کبھی خبر واحد بھی یقین کا فائدہ دے سکتی ہے اور شریعت کے نزدیک بھی یہ یقین معتبر ہے تو پھر یہ تفریق کہ اس قسم کا یقین تو دین کے معاملہ میں معتبر ہے اور اس قسم کا معتبر نہیں محض ایک وہم پرستی ہے -

اسلام میں تنقید و تبصرہ

خبر واحد کی حجیت کے سلسلہ میں یہاں دو غلط فہمیاں اور بھی ہیں ایک یہ کہ محدثین کا گروہ محض ایک جامد گروہ ہے جسے فن درایت سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا وہ دقیانوسی خبروں کو آنکھ میچ کر مان لینا علم اور دین سمجھتا ہے اور نقد و تبصرہ کو بد دینی تصور کرتا ہے - دوم یہ کہ ادیانِ ساویہ کا مبنیٰ صرف روایت پر ہے درایت کو یہاں کوئی دخل نہیں دراصل پہلی غلط فہمی بھی اسی کی ایک فرع ہے - ان دو غلط فہمیوں کی وجہ سے بعض ناواقف تو حدیث کا رتبہ تاریخ سے بھی کمتر تصور کرتے ہیں اس لیے ہمیں اس کے متعلق بھی کچھ لکھنا ہے -

فن تاریخ اور حدیث ❋ دائرۃ المعارف میں بستانی نے تاریخ کے متعلق ارسطو کا یہ مقولہ نقل کیا ہے -

الشعر احسن من التاريخ التاريخ يذكر اشياء كما هي و لكن الشعر يذكرها كما يجب ان يكون.	شعر تاریخ سے بہتر چیز ہے کیونکہ تاریخ واقعات کو جوں کا توں نقل کر دیتی ہے اور شعر میں ان کا ذکر اس طرح ہوتا ہے جیسا انہیں واقع میں ہونا چاہیے -

ہمارے نزدیک ارسطو کا یہ مقولہ تاریخ کے اس دور تک تو بالکل درست تھا - جب تک کہ اس میں نہ روایت کی اہمیت تھی نہ درایت کی بحث - لیکن جب علم تاریخ کو کچھ ترقی ہوئی، علم سیاست، علم نفسیات اور علم تمدن نے بہت سے واقعات کو نقد و تبصرہ کی روشنی میں چھانٹ ڈالا تو اب علم تاریخ کا پایہ ذرا بلند ہو گیا اور اس کا نام فلسفہ تاریخ رکھا گیا - اب علم تاریخ کی مثال صرف اینٹوں کے ایک ڈھیر کی نہیں رہی جس میں کار آمد اور بیکار ہر قسم کی اینٹیں ہوتی ہیں، بلکہ فلسفہ تاریخ کی وجہ سے ایک مؤرخ کی مثال اب

ایک ماہر معمار کی سمجھ لی گئی جو اپنی تعمیر کی موزونیت کے لحاظ سے کچھ اینٹیں بیکار سمجھ کر پھینک دیتا ہے اور کچھ اپنی تعمیر میں استعمال کر کے ان کو ایک خوب صورت قصر کی شکل پر کھڑا کر دیتا ہے۔ اسی لیے محقق ابن خلدون لکھتا ہے کہ ایک مؤرخ کے لیے قواعد سیاست' طبائع موجودات اور علم عمرانیات کا جاننا بھی ضروری ہے' دنیا کے عادات و اخلاق اور مذاہب کے مختلف رنگ ڈھنگ' موجودہ اور ماضی کے حالات کا موازنہ پھر اس کے اتفاق و اختلاف کے اسباب پر غور و خوض' اصول حکمت کی تنقیح اور ان کے اسباب کے ظہور کا علم بھی اس کے فرائض میں داخل ہے اگر کوئی مؤرخ ان مراحل سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے تو بلاشبہ اس کو عرش تحقیق پر بیٹھنے کا حق حاصل ہے۔ (مقدمہ)

بلاشبہ یہ سب گوشے اپنی جگہ بڑی علمی وسعت رکھتے ہیں لیکن جہاں تک نقد و تبصرہ کا تعلق ہے وہ تمام تر اب بھی صرف فن درایت پر مبنی رہا اور تاریخ کے اس دورِ شباب میں بھی اس کا روایتی سرمایہ یا صرف چند مخطوطات ہیں جو کہنہ الواح یا بوسیدہ ہڈیوں کی شکل پر دستیاب ہو گئے یا وہ محفوظات جو محض سنی سنائی افواہ پر بلا کسی سند کے زیر ترتیب آ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی واقعہ اور حادثہ کے ثبوت کے لیے اس کی سند کا مطالبہ سب سے پہلا سوال ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہاں یاس و قنوط نے اس سوال کو ذہن سے ایسا نکال دیا ہے کہ گویا سند کا فقدان تاریخی واقعات کے ثبوت کے لیے کوئی عیب ہی نہ تھا۔ اس کا اقتضا تو یہ تھا کہ یہ بے سند واقعات اگر فن درایت کی بدولت کچھ چھن جاتے تو اس کے بعد بھی ان کا رتبہ صرف قیاسات کے برابر رہتا لیکن چونکہ دوسری طرف نقد و تبصرہ اپنی عقل کی روشنی میں ہوتا ہے اس لیے یہاں انسانی دماغ اس کو یقین کا آخری مرتبہ دے دیتا ہے حتیٰ کہ ایک انسان کو حیوانات کے ساتھ اپنا الحاق کرنے میں کوئی تامل نہیں رہتا۔ وہ یہ اعلان کرنے میں بڑا فخر محسوس کرنے لگتا ہے کہ انسان درحقیقت حیوانات ہی کی ایک ارتقائی شکل ہے اور اپنی اس ادھوری اور نامکمل تحقیقات کی بنا پر قرآن کریم کے اس بیان کی تکذیب میں ذرا تامل نہیں کرتا۔ جو انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں خود خالق نے بتلایا ہے سوچئے اور انصاف کیجئے کہ یہاں بنیاد ثبوت کیا ہے اور نوعیت عقیدت کیا اگر کبھی یہ بے بنیاد تاریخ قرآن کریم سے ہلکی سی ٹکر بھی کھا جاتی ہے تو تاریخ پرست دنیا خوشی خوشی قرآن کے بیان میں ہی شبہ کرتی ہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ حق و یقین کی اس ٹکر کے بعد خود تاریخ کی شکست تسلیم کرے۔[1]

تاریخ کا ایک دوسرا شعبہ جو تاریخ سے کٹ کر مذہب کے نام سے موسوم ہو گیا تھا اس نے اس کے برعکس درایت کی بحث ختم کر دی اور صرف روایت کا پہلو اپنے سامنے رکھ لیا مگر افسوس کہ وہ بھی اتنا نا تمام تھا کہ نہ تو اس میں تسلسل کی کوئی قید تھی نہ افراد و اشخاص کے کیرکٹر پر کوئی بحث۔ ہماری مراد یہاں یہودیت و نصرانیت ہے۔ احبار و رہبان نے ان کو اس راستہ پر ڈال دیا تھا کہ جسے وہ حلال کر دیں بس وہ حلال ہے اور جسے حرام کہہ دیں وہ حرام۔ گویا اب اصل مذہب کی تاریکی میں ایک تاریکی کا اور اضافہ ہو گیا

---

[1] حال ہی میں ڈاکٹر ٹسڈل نے قرآن کریم پر اعتراض کرتے ہوئے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ گوسالہ بنانے والا درحقیقت سامری نہ تھا بلکہ وہ خود حضرت ہارون علیہ السلام ہی تھے۔ اس اعتراض کو جدید دماغوں نے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا حتیٰ کہ اس کی تردید میں ''برہان'' کو اس سے بڑھ کر تاریخی ثبوت کے ساتھ ایک مقالہ شائع کرنا پڑا حالانکہ اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ قرآنی بیان تاریخی بیانات کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا جب تعلیم یافتہ دماغوں میں قرآن کا وزن یہ رہ جائے تو حدیث کا کیا ذکر کیا جائے۔

پہلے تو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان صرف ان کتب محرفہ کا ہی ایک واسطہ تھا' اب مذہب کی جگہ ان احبار و رہبان نے سنبھال لی- حالانکہ صدیوں کا مندرس شدہ مذہب پہلے خود اپنے ثبوت ہی کا محتاج تھا مگر یہاں اس غلط بنیاد پر احبار و رہبانیت کی قیادت نے اور بہت سی غلط بنیادیں قائم کر دیں اور یہ مذہبی تعمیر گو دیکھنے میں تو بہت اونچی گئی مگر اس میں صدق و راستی کا عنصر بہت ہی کم باقی رہ گیا تھا- اس کا تمام میٹریل وہی تھا جو احبار و رہبان نے محض اپنی خواہشات کی خاطر خود ترتیب دے لیا تھا' ادھر قوم بنی اسرائیل میں اعتدال کلیۃً مفقود تھا' جب وہ تحقیق پر آتے تو کوہِ طور پر کلام باری بلا واسطہ سن کر سو طرح کے شبہات نکالنے لگتے اور جب تقلید پر آمادہ ہوتے تو جو ان کے احبار و رہبان ان کے سامنے ڈالتے اسے اندھوں کی طرح نگلنے کے لیے تیار ہو جاتے- غرض نقد و تبصرہ اور فہم و فکر کی ان میں کوئی استعداد نہ تھی اسی کو قرآن کریم نے ذیل کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے-

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ. (التوبة : ٣١)

انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا کی جگہ پر سمجھ لیا تھا-

روایت اور درایت کے اس غیر متوازن دور میں اسلام آیا اور اس نے ان دونوں کا توازن قائم کر کے صحیح تنقید کی راہ دکھلائی اور اس کے لیے ایک ایسا معتدل آئین مرتب فرمایا جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط' اس نے بتایا کہ ہر کان پڑی خبر کی طرف دوڑ پڑنا بھی غلط ہے اور تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں بدگمانی کی حد تک پہنچ جانا بھی غلو اور وہم پرستی ہے- انسان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بے اعتمادی کی حالت میں آنکھ میچ کر تغلیط اور اعتماد کی صورت میں بے دلیل تصدیق کر لیا کرتا ہے مگر قرآن نے یہاں دوست و دشمن' اپنے اور پرائے کا فرق ختم کر کے سب کے لیے یکساں تحقیق و تبیین کا قانون مقرر کر دیا ہے اور دوسری طرف وہ تجسس اور تحقیق جس کی بنیاد وہم پرستی اور صرف بدظنی پر ہو اس سے بھی روک دیا ہے- امام غزالی مستصفیٰ میں لکھتے ہیں کہ:

''فرقہ سمینہ کے نزدیک علم صرف حواس کے مدرکات و معلومات میں منحصر ہے ان کے نزدیک خبر متواتر بھی مفید علم نہیں ہوتی وہ یہاں بھی دس طرح کے شبہات پیدا کر دیتے ہیں-'' (توجیہ ص ۳۸)

سوفسطائی ان سے بھی ایک قدم آگے ہیں انہیں اپنے مدرکات حتیٰ کہ اپنے وجود میں بھی شبہ نظر آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب بسا اوقات ہمارے چشم و گوش اپنے اپنے دائرہ ادراکات میں غلطی کر جاتے ہیں تو پھر ان کے مدرکات کو قطعی کیسے کہا جا سکتا ہے- خلاصہ یہ ہے کہ اگر شکوک و اوہام کا دروازہ کھول دیا جائے اور ہر شک کو یقین کی راہ میں حائل تسلیم کر لیا جائے تو پھر عالم میں یقین حاصل کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے- نہ خبر متواتر اور نہ اپنے حواس- اس کا نام تحقیق و تنقید نہیں بلکہ یہ ایک جنون کا شعبہ ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور آخرت کے تمام معاملات معطل ہو کر رہ جائیں لیکن اگر اس کے برخلاف ہر خبر کو تسلیم کر لیا جائے اور ہر جگہ حسن ظن کا دروازہ کھول دیا جائے تو اس کا نتیجہ بھی عالم کے درہم و برہم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں' اس لیے قرآن نے یہ تعلیم دی کہ ہر خبر کی تحقیق و تبیین کر لیا کرو خواہ وہ فاسق شخص ہی کی خبر کیوں نہ ہو' ہر چند کہ فاسق آدمی کی خبر رد کر دینے میں بھی مضائقہ نہیں تھا مگر قرآن کسی خبر کا بے دلیل رد کرنا بھی پسند نہیں کرتا- فاسق آدمی بھی صحیح خبر دے سکتا ہے پس اس کی ہر خبر کا رد کر دینا بھی قرین مصلحت اور طور انصاف نہیں ہے-

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ. (حجرات:۶)

اے ایمان والو! جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آیا کرے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بے تحقیق کسی قوم پر حملہ کردو بعد میں اپنے کیے پر شرمندہ ہونا پڑے۔

دوسری طرف اس نے تجسس اور بدظنی کی بھی ممانعت فرمائی کہ ایسی تحقیق سے بھی نظام عالم برباد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّ لَا تَجَسَّسُوْا. (حجرات : ۱۲)

اے ایمان والو! بہت سی بدگمانیوں سے بچا کرو کیونکہ بعض بدگمانی گناہ کی حد تک ہوتی ہیں اور تجسس اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں کے عیب بھی تلاش کرنے کی خصلت مت اختیار کرو۔

تیسرے مقام پر یہ بھی بتایا کہ ہر خبر کی تفتیش کا ہر انسان سلیقہ نہیں رکھتا بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی تفتیش خاص افراد ہی کرسکتے ہیں گویا یہ تفتیش کے محکمہ جات کی طرف اشارہ ہے غرض ہر خبر کی تحقیق کے لیے اہلیت درکار ہے۔

وَ اِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ. (النساء : ۸۳)

جب ان کے پاس کوئی امن یا ڈر کی خبر آتی ہے تو اس کو مشہور کردیتے ہیں اگر اس کو رسول یا اپنے علماء و حکام تک پہنچا دیتے تو جو ان میں ملکہ استنباط رکھنے والے شخص تھے وہ اس کو پورے طور پر معلوم کرلیتے۔

روایتی پہلو میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہوسکتی ہے وہ مخبر اور شاہدوں کا بیان ہے اس لیے ان کو یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے بیان اور گواہی میں پوری احتیاط سے کام لیں جھوٹ یا طرفداری کا شائبہ نہ آنے پائے۔ اس لیے جھوٹ بولنے یا ایک دوسرے پر جھوٹا الزام لگانے کی اتنی مذمت کی گئی کہ اس سے بدتر سوسائٹی کا کوئی عیب نہ رہا۔ لعنت کا لفظ عربی زبان میں انتہائی مذمت و نفرت کا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے عام طور پر جھوٹ بولنے والوں پر لعنت کا اعلان کردیا۔

لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ. (آل عمران:۶۱)

جھوٹ بولنے والوں پر خدا کی لعنت ہو۔

دوسری جگہ جھوٹ بولنا مخالف پارٹی یعنی بے ایمانوں کا شعار قرار دیا۔

اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَاذِبُوْنَ. (النحل:۱۰۵)

خدا پر جھوٹ کی افترا پردازی وہی لوگ کرتے ہیں جو اس کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اور دراصل پکے جھوٹے یہی لوگ ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی پاکباز کی عصمت پر تہمت لگادے تو اس کے لیے دائمی طور پر یہ تعزیر مقرر کردی۔

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا.

ان کی گواہی آئندہ کبھی قبول نہ کرو۔

گویا انسانی سوسائٹی میں ہمیشہ کے لیے ان کے قول کی بے وقعتی آئینی طور پر تسلیم کرلی گئی۔ بوقت ضرورت شہادت کا چھپا لینا ایسا گناہ قرار دیا جو انسان کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ. (البقرة:۲۸۳)

جو شخص گواہی چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔

وَلَوْ كَانَ ذَاقُرْبٰى. (الانعام:١٥٤) اگر چہ وہ شخص ہمارا قرابت دار ہی ہو۔

پھر کذب وافتراء کی اس عام مذمت پر ہی کفایت نہیں کی بلکہ یہ خاص طور پر سمجھایا کہ خدا پر افتراء پردازی کا نمبر ہر قسم کے جھوٹ اور افتراء سے بڑھ کر ہے تاکہ عام طور پر راست بازی کے علاوہ یہاں خاص طور پر بھی اس کا لحاظ رکھا جائے۔

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا. (الانعام:٩٣) اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ افتراء کرے۔

آئین روایت اور درایت کو خوب مرتب اور مہذب کر کے جب اپنے رسول کی خاص وحی کا ذکر کیا تو قانونِ روایت کے مطابق اس کی سند پھر اس کے راوی کی عدالت بھی خود واضح فرمائی۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ○ ذِىْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِى الْعَرْشِ مَكِيْنٍ○ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ○ (التكوير:١٩، ٢١) یہ قرآن ایسے فرشتے کی زبانی ہے (جو حسب ذیل اوصاف کا مالک ہے) قوت والا ہے خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہے اور وہاں ایک امانت دار افسر ہے۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نطق کے متعلق عام انسانوں سے ایک صفت برتری یہ بیان فرمائی۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى○ (النجم: ٢ – ٣) اپنی خواہش نفس سے وہ کچھ نہیں بولتے جو بات کہتے ہیں وہ خدا کی وحی ہوتی ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

آپ نے درایت پر زور دیتے ہوئے مخاطبین کے سامنے اپنی صفائی ان الفاظ میں پیش کی۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (یونس:١٦) آخر اپنے دعویٰ نبوت سے پہلے بھی میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تمہارے درمیان ہی گذارا ہے (پھر کبھی جھوٹ بولا) تو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

اس کے روایتی پہلو کی صفائی کے لیے قرآن کریم نے رسول کے بارے میں ایک خاص آرڈیننس کا بھی ذکر فرمایا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ○ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ○ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ. (الحاقة:٤٣ – ٤٥) اگر بالفرض آپ ایک بات بھی ہماری طرف اپنی جانب سے بنا کر منسوب کرتے تو ہم دایاں ہاتھ پکڑ کر ان کی شہ رگ کاٹ دیتے۔

ان بنیادی اصول کی روشنی میں مذہب اسلام جتنی ترقی کرتا رہا اسی قدر اس کے بنیادی تنقید کے اصول بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتے رہے حتیٰ کہ اسناد' جرح و تعدیل' احوالِ رواۃ' ہر ایک کے لیے جدا جدا مستقل فن مرتب ہو گئے۔ علامہ جزائری نے توجیہ النظر میں حدیث کے سلسلہ میں ۵۲ قسم کے علوم بالتفصیل بیان فرمائے ہیں۔ جن کے مطالعہ کے بعد احادیث کے مفید یقین ہونے میں ایک منٹ کے لیے بھی شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ سمنیہ اور سوفسطائیہ کی طرح شبہات نکالے چلے جانے کا تو کسی کے پاس بھی کوئی علاج نہیں ہے لیکن واقعات کی دنیا میں جہاں ذہنی اوہام کی کوئی قیمت نہیں ہے ہر محکم سے محکم طریق اور ہر جائز سے جائز احتمال کا لحاظ رکھ کر یہ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص بھی حدیث کے مختلف طرق' اس کے راویوں کے صدق و کذب اور اس کے جروح و علل پر نظر کرے گا اس کو ان کی سچائی پر یقین کیے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں چند لمحات کی محنت و مشقت اٹھائے بغیر پہلے سے اس کے انکار کا ارادہ کر لیا جائے اور محدثین کی شب و روز کی ان تھک محنتوں کی تردید کے لیے صرف

چند مضحکانہ کلمات کو کافی سمجھ لیا جائے - علامہ محمد بن ابراہیم وزیر تحریر فرماتے ہیں -

''یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام کے تمام فرقے ہر طبقہ میں ہر فن کے بارے میں اسی اہل فن کے قول کو دلیل سمجھتے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام علوم باطل ہو جاتے کیونکہ دوسرے فن کا شخص یا تو اس فن سے بحث ہی نہیں کرتا اگر کرتا ہے تو ناکافی بحث کرتا ہے - اگر قرآن وسنت کے لغات اہل تجوید سے حل کیے جائیں' قراءت کا اختلاف اہل لغت سے پوچھا جائے معانی ونحو کے مسائل محدثین سے اور علم حدیث اور اسناد کے مباحث متکلمین سے دریافت کیے جائیں تو یقیناً تمام علوم درہم برہم ہو جائیں گے اور یقیناً یہ عقل کے بھی خلاف ہوگا -'' (الروض الباسم ج ۱ ص ۷۷)

یہ مقولہ مشہور ہے -

کن یهودیا صرفا و الا فلا تلعب بالتورات . یا ٹھیٹ یہودی بن جا ورنہ تورات سے مت کھیل .

پس خبر واحد پر یقین یا تو اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ جن کو یہاں شب و روز خرچ کرنے کے بعد یقین حاصل ہو چکا ہے ان کے بیان پر اعتماد کر لیا جائے نہیں تو پھر خود اس جانفشانی کے لیے کمر ہمت کس لی جائے -

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ محدث کی مثال ایک صراف کی ہے بسا اوقات روپیہ کی شکل وصورت اور آواز تک میں فرق نہیں ہوتا مگر صراف کی چٹکی اس کا کھوٹ بتا دیتی ہے - پس اگر انصاف کے ساتھ احادیث کی روشنی میں اسوۂ رسول کو تلاش کرنا منظور ہے تو صراف کی طرح یا تو خود مشاق پیدا کی جائے ورنہ کسی صراف کے قول پر اعتماد کیجئے - اگر آپ نہ یہ کر سکتے ہیں نہ وہ اور صرف احادیث رسول کو ایک غیر دلچسپ افسانہ یا رطب ویابس سے بھری ہوئی ایک تاریخ قرار دیتے ہیں تو اب یہ آپ کی مرضی ہے -

محدثین اور راویوں کا جمودِ رائے ٭ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس قوم نے تحقیق وتبیین' استنباط واستشہاد کی اہمیت کذب وافتراء سے نفرت' بدگمانی وبدظنی سے احتراز کے دور میں پرورش پائی ہو' کیا اس کا طبعی مزاج تساہل وغفلت' اغماض اور چشم پوشی ہو سکتا ہے یا ہر معاملہ کی تحقیق وتفتیش کرنا ان کی طبیعت ثانیہ ہو جانا چاہیے' اور حسن ظن وبدظنی سے علیحدہ ہو کر واقعہ کی تحقیق کرنا انہیں اپنا ایک فرض منصبی سا نظر آنا چاہیے - حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل[1] کو آپ پہلے مشاہدہ کر ہی چکے ہیں کہ اگر ان

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰؓ حضرت عمرؓ کے دروازہ پر آئے اور تین بار سلام کے بعد جب جواب نہ ملا تو واپس ہو گئے چند قدم چلے تھے کہ خادم اندر سے آیا اور اس نے کہا آئیے امیر المؤمنین آپ کو بلاتے ہیں - یہ پہنچے تو ان سے واپسی کا سبب دریافت کیا گیا انہوں نے اس کے متعلق ایک حدیث سنا دی حضرت عمرؓ نے فرمایا یا تو اس پر گواہی پیش کیجئے ورنہ سزا ملے گی پھر خود ہی یہ بھی فرما دیا کہ:

انی لم اتهمک و لکنی خشیت ان یتقول الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم. (توجیہ ص ۱٦) میں نے تم پر کسی شبہ کی وجہ سے شہادت طلب نہیں کی بلکہ یہ اندیشہ کیا کہ آئندہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غلط بیانی نہ کریں -

یہی وجہ تھی کہ سفیان بن عیینہ فرماتے تھے کہ اگر حضرت عمرؓ ہمارے زمانہ میں ہوتے تو ہمیں سزا دیتے - (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۳۰) .

اس ایک ہی واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کو حدیث کا کتنا اہتمام تھا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں سزا مزید احتیاط کی بنا پر تھی یا حدیث کی روایت کرنے پر اور یہ بھی کہ ابن عیینہ کے اس فرمان کا اصل منشاء کیا تھا - حیرت ہے کہ مولانا اسلم صاحب ان جیسے تاکیدی احکام کو نقل کر کر کے .....

کے سامنے کوئی شخص کوئی حدیث بیان کرتا تو اس سے پہلا سوال گواہی کے متعلق ہوتا تھا اگر چہ دوسری مجلس میں یہ بات بھی صاف کر دی جاتی تھی کہ یہ تحقیق کسی بدگمانی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ حدیث کی اہمیت آئینی طور پر اس کی مقتضی تھی کہ اس کے نقل میں ہر ممکن سے ممکن احتیاط کو کام میں لایا جائے۔

افسوس ہے کہ صحابہؓ کے دور میں اس قسم کے جتنے واقعات حدیث کی تشریعی حیثیت اور ان کے یہاں اس کی حفاظت کی سب سے بڑی دلیل تھے ان ہی کو منکرین حدیث نے اس کے برعکس انکارِ حدیث کی دلیل گردان لیا ہے۔ سلف کے دور سے گذر کر جب ائمہ کے دور میں آیئے تو یہاں بھی ابن ابی حاتم جیسے شخصوں کی کمی نہیں ہے جو بڑے بڑے محدثین پر بھی تنقید کر دیتے پھر خود ہی ان کی جلالت قدر کی طرف نظر کر کے بعض اوقات رونے بھی لگتے تھے کہ ہم کیسی کیسی بڑی ہستیوں پر کلام کر جاتے ہیں کہیں ہم سے اس کی باز پرس نہ ہو۔ صحابہؓ میں حضرت علیؓ کی شخصیت مختلف ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے کچھ اس طرح زیر بحث آ گئی ہے کہ محدثین کو مجبوراً فن درایت کی بنا پر ان کے متعلق بہت سی احادیث سے دست بردار ہو جانا پڑا ہے' حالانکہ ان کے علم' ان سے محبت اور ان سے عقیدت برابر اس کو مقتضی رہی کہ ان کے معاملہ میں جو سنا جائے اس کو سچ ہی سچ یقین کر لیا جائے مگر یہاں رسول کی عقیدت اور اس کی حدیث کی عظمت کا سوال ان سے مقدم تھا وہ ہمیشہ یہ تنبیہ بھی کرتی رہی کہ کہیں ان کی شان میں بے جا عقیدت رکھنے والوں نے لا معلوم طور پر ان کی احادیث میں کذب وافتراء کا زہر داخل نہ کر دیا ہو۔ اور اس بنا پر کوئی خلافِ واقع کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔

لله ..... کے اس سے انکار حدیث کے متعلق کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہ انصاف آپ ہی پر ہے کہ جہاں مخلصین صحابہؓ کے بیان پر گواہیاں طلب کی جاتی ہوں وہاں منافقین کو کذب بیانی اور افتراء کا کیا موقعہ مل سکتا تھا۔

فائدہ سے خالی نہ ہوگا اگر ہم آپ کو یہ بتلا دیں کہ جب تک کفر کو طاقت رہی نفاق ظاہر نہیں ہوا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچے اور اسلام کے ہاتھ میں طاقت آ گئی' کفر مغلوبیت کی زندگی بسر کرنے لگا تو اب کفار کو نفاق کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی ان کے متعلق بھی قرآن نے یہ فرمایا ہے ﴿وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ﴾ (محمد: ۳۰) جب وہ آپ کی خدمت میں آ کر آوازیں بنا بنا کر باتیں کریں گے تو آپ انہیں پہچان بھی لیں گے۔ (کتاب الایمان)

کیا یہ انصاف ہوگا کہ منافقین کی اس مقہور و ذلیل زندگی کے اثرات کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت شدہ اور مستحکم آثار کو مشتبہ تسلیم کر لیا جائے۔ مولانا اسلم صاحب کے لیے تو منافقین کا وجود احادیث کے ماننے میں مانع ہے لیکن ان کو معلوم نہیں کہ منکرین قرآن یہی شبہ قرآن کے بارے میں پیش کرتے ہیں اور قرآن کے تواتر کو مخالفین کا تواتر سمجھ کر اس سے کچھ تسلی حاصل نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک منکرین حدیث کے پاس اکثر شبہات وہی ہیں جو شیعوں نے حفاظت قرآن کے سلسلہ میں پیش کیے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ پہلے ہی قدم میں ان میں الجھ کر رہ گئے اور یہ قرآنی تواتر کی وجہ سے یہاں سے تو بچ نکلے مگر دوسرے قدم میں بچ نہ سکے۔ آخر حدیث کے مرحلہ پر پہنچ کر بے طرح پھسلے اور پھسل کر زمین پر گر گئے۔ عقائد شبہات سے بنانا نہیں چاہئیں ان کے لیے روشن دلائل کی ضرورت ہوتی ہے زائغین اہل حق کے دلائل میں صرف شبہات پیدا کر کے خوش ہو لیتے ہیں کہ انہوں نے بڑا تیر مارا اور گویا بازی جیت لی اور نہیں جانتے کہ اگر قرآن نہ آتا تو لوگوں کو شبہات تو اللہ تعالیٰ کے وجود میں بھی تھے۔ اور آج یہ قوم موجود ہے جو اللہ کا وجود تو درکنار اس کو بلاشبہ ایک وہم پرستی تصور کرتی ہے۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

و لکن قاتل اللہ الشیعة فانهم افسدوا کثیرا من علمه بالکذب علیه و لهذا تجد اصحاب الحدیث من الصحیح لا یعتمدون من حدیثه الا ما کان من طریق اهل بیته و اصحاب عبدالله ابن مسعود[1]

خدا تعالیٰ شیعوں کا برا کرے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علم کا بڑا حصہ ان پر جھوٹ بول کر محدثین کی نظر میں مشتبہ کر دیا ہے اس لیے صحیح حدیث جمع کرنے والوں نے بجز خاص خاص حضرات کے ان کے بارے میں ہر شخص کے بیان پر اعتماد نہیں کیا۔

اس لیے جب ان کی احادیث کو وہ اپنے معیار پر پورا نکھار نہ سکے تو انہیں اسی شک کے حال میں حدیث رسول ٹھہرانے سے دست بردار ہو جانا بدرجہا بہتر معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ بھی غور کر لینا چاہیے کہ اگر حدیثوں میں بہت بڑا ذخیرہ موضوعات کا داخل ہو جاتا تو یقیناً ہمیں زیادہ تر حدیثیں شیخین جیسی جلیل القدر ہستیوں کی طرف منسوب نظر آتیں کیونکہ وضاعین کے لیے ان کی شخصیتوں کا احترام ان کی احادیث کو رائج کرنے میں یقیناً بہت کارآمد ہوتا مگر یہاں اس کے برعکس امت میں جو سب سے بڑا اصحابی شمار ہے اسی کی احادیث کا ذخیرہ سب سے کم ہے پس یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وضاعین کو ہر جگہ دخل اندازی کا موقعہ نہیں مل سکا اور جہاں ملا ہے وہاں دودھ اور پانی کو علیحدہ کرنے والوں نے حقیقت کو صاف کر دیا ہے اور ہر شک و تردد کے موقعہ پر اصول یہ رکھا ہے کہ کسی مشکوک ذخیرہ کو حدیث میں شمار کر لینے کی بجائے اس کو حدیث سے خارج کر دینا چاہیے۔ اب اس نقد و تبصرہ، حزم و احتیاط کے بعد بھی شک کیے چلے جانا ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا ہے۔ مانا کہ وضاعین نے احادیث وضع بھی کی ہیں مگر کیا اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ان کے اس جرم کی پاداش میں صادقین کا قول بھی جھوٹ سمجھ لیا جائے، تمام دنیا میں تنقید اس لیے تعریف کی چیز سمجھی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے صحیح و سقیم میں امتیاز حاصل ہو جاتا ہے اگر نقد کا نتیجہ سقیم کے ساتھ صحیح کو بھی رد کر دینا ٹھہر جائے تو پھر تنقید سے بدتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ کون سی معقول بات ہے کہ دنیا میں چونکہ چند جھوٹوں نے جھوٹ بولا ہے اس لیے اب کسی سچے سے سچے شخص کے بیان پر بھی اعتبار نہ کرنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ بھی ان ہی کی طرح ایک جھوٹا ہی انسان ہو۔ عقل کی روشنی اسی لیے عطا کی گئی ہے کہ اس روشنی میں محنت و جان فشانی کر کے یقین کی منزل طے کی جائے لیکن جن کے نزدیک رسول اور اس کے کلام کی قیمت ہی کچھ نہ ہو ان کے لیے یہ سرگردانی مفت کا آزار ہے اسی لیے مولانا اسلم صاحب نے محدثین کی ساری جدوجہد کا نام دماغی تعزیر رکھ دیا ہے۔ آج بھی بہت سے روشن خیال ایسے موجود ہیں جو قرآن کریم حفظ کرنے کو بھی دماغی تعزیر سے کم نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ جامیٹری اور الجبرا کے اشکال یاد کرنا اس سے کہیں زیادہ مفید ہے۔ مولانا اسلم صاحب کا احادیث کے متعلق جو عقیدہ تھا تو آپ گذشتہ اوراق میں ملاحظہ کر چکے اب محدثین کے متعلق ان کا خیال سنئے۔ وہ معتزلہ کی بربادی کا مرثیہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۶۔

''معتزلہ اگر چہ اپنی تباہی کے ذمہ دار آپ ہیں مگر ان کے فنا ہو جانے سے امت کا عقلی اور دینی نقصان ہوا محدثوں نے منقولات سے جو جمود پیدا کر دیا تھا اس کے مقابلہ میں ان کی عقلیت نے توازن قائم کر رکھا تھا ان کے مٹ جانے سے پھر وہی جمود عود کر آیا۔''

انہیں محدثین اور فقہاء کے جمود کی شکایت غالباً اسی وجہ سے ہو سکتی ہے کہ معتزلہ کی طرح انہوں نے ذات وصفات کے مسائل میں موشگافیاں نہیں کیں۔ براہین عقلیہ کا جو طریقہ فلاسفہ سکھا گئے تھے وہ انہوں نے اختیار نہیں کیا۔ عقلاء زمانہ کی طرح طویل وعریض و عادی نہیں کیے جو بات حل ہو گئی اس کا جواب دے دیا اور جو حل نہ ہو سکی اس کے متعلق صاف کہہ دیا۔ اگر اپنی رائے کے خلاف کوئی بات ثابت ہو گئی تو اپنی بات پر ضد نہیں کی اور اپنی پہلی رائے سے بڑی صفائی کے ساتھ رجوع کر لیا۔ اگر یہ امور قابل اعتراض ہیں تو ذرا نظر اٹھا کر صحابہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے وہاں کتنی بال کی کھال نکالی جاتی تھی۔ قدرت، سمع و بصر، صفت علم وکلام پر کتنی کتنی بسیط بحثیں کی جاتی تھیں۔ افعال عباد کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے پر کیا کیا تبصرے کیے جاتے تھے۔ اگر محدثین کی خدمتیں دماغی تعزیریں تھیں تو یقیناً یہ مباحث بھی دماغی عیاشی کا عذاب تھا جو محض عقلیت کی بدولت معتزلہ پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ منکرین حدیث کے درمیان یہ اعتراض ہمیشہ سے اہمیت رکھتا چلا آیا ہے یہاں تک کہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کو اس پر مستقل ایک مضمون لکھنا پڑا اس لیے ہم بھی یہاں اس اعتراض کے چودہ جوابات میں سے ان کے ایک جواب کا خلاصہ نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

''اگر عقلیات کی مذمت ہم کسی محدث کی زبانی نقل کریں تو یہ کہنا ممکن ہو گا کہ ''الناس اعداء ما جهلوا'' لوگ جو فن نہیں جانتے اس کی مذمت ہی کیا کرتے ہیں اس لیے ہم یہاں ان علماء کے کلمات پیش کریں گے جو فلک عقلیات کے شمس وقمر شمار کیے گئے ہیں۔''

امام غزالیؒ احیاء میں فرماتے ہیں ''ہمیں یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حقائق اشیاء کے معرفت کی راہ یہ عقلیات نہیں ہیں اس راہ سے اگر مسائل پر کچھ روشنی پڑتی بھی ہے تو اتنی ہی جتنی کہ ان کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی تھی۔

المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں۔ ''دلائل کلامیہ مفید یقین نہیں ہوتے۔''

التفرقه بين الايمان و الزندقه میں لکھتے ہیں۔ ''اگر ہم مداہنت نہ کریں تو صاف صاف کہہ سکتے ہیں کہ علم کلام میں غلو کرنا حرام ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں ''میں نے طرقِ کلامیہ اور فلسفیہ سب کا تجربہ کر دیکھا ہے جو نفع مجھے قرآن عظیم میں نظر آیا کہیں نظر نہ آیا۔ کیونکہ قرآن اس پر زور دیتا ہے کہ تمام جلال وعظمت خدا ہی کے لیے تسلیم کر لی جائے اور اس کے مقابلہ و معارضہ سے احتراز کیا جائے کیونکہ ان تنگ و تاریک راستوں میں عقل انسانی گم ہو جاتی ہے پھر یہ وصیت کرتے ہیں کہ میں آنحضرت کا دین اختیار کر چکا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرا مجمل ایمان ہی قبول فرما لے اور مجھ سے تفصیل کا مطالبہ نہ کرے اسی مضمون پر امام نے حسب ذیل اشعار کہے ہیں۔

العلم للرحمٰن جل جلاله	علم صرف ایک اللہ جل جلالہ کے لیے ہے۔
و سواه فی جهلاته یتغمغم	بقیہ سب اپنی جہالتوں میں مبتلا ہیں۔
ما للتراب و للعلوم و انما	اس خاک کے پتلے کو علم سے بھلا کیا واسطہ
یسعی لیعلم انه لا یعلم	وہ یہی کوشش کرتا ہے کہ یہ جان لے کہ وہ نہیں جانتا۔

امام قرطبیؒ مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ائمہ متکلمین نے اپنی عمریں صرف کرنے کے بعد اس علم کو چھوڑ دیا ہے چنانچہ ابوالمعالی فرماتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کو علماء اسلام کے لیے چھوڑ کر میں نے ایک بڑے سمندر کا سفر اختیار کیا تھا تا کہ تقلید کی تاریکی سے نجات میسر ہو اور تحقیق کی راہ نظر آ جائے مگر اب میں نے اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا ہے۔تمہیں چاہیے کہ پرانی عورتوں کا سا سادہ ایمان رکھو۔ اے اللہ! تو میرا انجام بخیر فرما اس کے بعد حسرت سے فرمایا ''اے ابوالمعالی تیری گذشتہ عمر پر افسوس۔''

امام ابوالمعالی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے ''دیکھو علم کلام کا بہت مشغلہ مت رکھنا اگر مجھے اس کا انجام پہلے معلوم ہوتا تو آج میرا یہ انجام نہ ہوتا۔''

احمد بن سنان کہتے ہیں کہ ''امام ولید بن ابان کرابیسی میرے ماموں تھے جب ان کی نزع روح کا وقت آیا تو انہوں نے اپنی اولاد سے مخاطب ہو کر فرمایا تمہارے نزدیک مجھ سے زیادہ عالم کوئی اور شخص ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا میرے متعلق کوئی بدگمانی کر سکتے ہو؟ انہوں نے کہا نہیں۔ فرمایا اچھا تو میں تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں مانو گے؟ انہوں نے کہا ضرور، فرمایا بس اسی طریقہ پر قائم رہنا جس پر محدثین تھے مجھے اب خوب ثابت ہو چکا ہے کہ حق ان ہی کے ساتھ ہے۔''

امام ابوالوفا بن عقیل فرماتے ہیں میں نے اپنی ساری عمر اصول کی تحقیقات ہی میں خرچ کی ہے آخر تھک کر پھر سیدھے سادے ملاّ جی کے مذہب پر ہی آنا پڑا۔

شہرستانی علم کلام میں ساری عمر صرف کرنے کے بعد نہایۃ الاقدام میں لکھتا ہے۔

لعمری لقد طفت المعاهد کلها و سیرت	اپنی جان کی قسم میں بڑے بڑے مقامات پر خود گھوما اور اپنی نظر کو
طرفی بین تلک المعالم فلم أرا لا و اضعا	خوب گھما کر دیکھا مگر جس کو دیکھا اپنی ٹھوری کے نیچے ہاتھ رکھے
کف حائر علی ذقنه او قارعاً سن نادم.	حیرت زدہ دیکھا اور جس کو پایا شرمندہ شخص کی طرح دانت کریدتا پایا۔

اس کے بعد یہ نصیحت کرتا ہے کہ دیکھو بوڑھی عورتوں کا سا سادہ دین اختیار کیے رہنا۔[1]

ان چند نقول سے عقلا کے نزدیک محدثین کا جمود یا سیلان طبع معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے خود دونوں فن پڑھے اور ان کا کافی مطالعہ بھی کیا ہے۔ ہم بلا کسی حسن عقیدت کے یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ عقل کی جو گہرائی ہمیں محدثین بالخصوص فقہاء محدثین میں نظر آئی اس کا کوئی شمہ فلاسفہ میں نظر نہ آیا اگر یہاں ہم ان کی مثالیں لکھیں تو مضمون اور زیادہ طویل ہو جائے گا۔

---

[1] الروض الباسم ج ۲ ص ۱۲-۱۵۔

حفاظ حدیث اور حفاظت دین ٭ منکرین حدیث کو یہ دیکھ کر کہ تدوین حدیث کی تاریخ بالعموم پہلی صدی کا آخر حصہ بتلائی گئی ہے یہ شبہ پیدا ہوگیا ہے کہ اس سے پہلے گویا حدیث کا وجود ہی نہ تھا اور اس کی بنیاد دوسری صدی کے شروع میں پڑی ہے اسی لیے ہم نے تدوین حدیث کا عنوان چھوڑ کر حفظ حدیث کا عنوان اختیار کیا ہے تاکہ بحث کا مرکزی نقطہ نظروں سے غائب نہ ہونے پائے۔ ہمارے نزدیک اصل بحث یہ ہونا چاہیے کہ تدوین حدیث سے پہلے حدیث کا رنگ کیا تھا اگر وہ محفوظ تھی تو پھر اس کی تدوین اگر پہلی صدی میں نہیں چوتھی صدی میں بھی ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بعض قاصر الفہم اشخاص نے یہ بے معنی غوغا بھی مچا رکھا ہے کہ فلاں صحابیؓ نے حدیث روایت کرنے کی ممانعت کی ہے، فلاں نے کتابت کی ممانعت کی ہے، فلاں نے حدیث کے مشغلہ سے روکا ہے۔ مگر ان کے ان ہی بیانات سے دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں آتا جاتا ہے کہ اسی دور میں حدیث کے شغف کا عالم کیا تھا یعنی یہ کثرت اس کی روایتیں کی جاتی تھیں، برغبت انہیں لکھا جاتا تھا اور ان کے حفظ کا مشغلہ اتنا غالب تھا کہ کسی کسی کو اعتدال قائم رکھنے کے لیے اس سے روکنے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ حدیث کی یہ ساری تاریخ وہ ہے جو خود صاحب نبوت اور صحابہؓ کے دور کی تاریخ ہے پس ان ادھوری نقول سے منکرین حدیث کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، انہیں یہ ثابت کرنا چاہیے کہ پہلی صدی تک حدیث کی کوئی پرواہ نہ تھی، کوئی شخص ان کا ایک حرف بھی یاد نہ کرتا تھا۔ اچانک دوسری صدی میں لوگوں نے سنے سنائے قصے تدوین کرنا شروع کر دیئے لیکن ایسا ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ﴿وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (الاسراء : ۸۸)

یہاں حدیث کی تدوین کا معاملہ قرآن کی جمع و ترتیب کے معاملہ سے بہت ہی مشابہت رکھتا ہے، کیا کوئی عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور پر نظر کرنے والا یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ قرآن پہلے محفوظ نہ تھا پھر ان کے زمانہ میں محفوظ ہوا ہاں سن لیجئے کہ خود مدعین اسلام ہی میں ایک جماعت قرآن کریم کے بارے میں بالکل وہی اعتراضات رکھتی ہے جو منکرین حدیث، حدیث کے متعلق رکھتے ہیں اگر منکرین حدیث کو یہ خیال ہے کہ احادیث محض اپنے اپنے اغراض کے ماتحت بعد میں جمع کی گئیں تو منکرین قرآن بھی قرآن پر یہی تہمت لگاتے ہیں۔ جوابات دونوں ہی جگہ دیئے گئے ہیں مگر شفا ہونا نہ ہونا یہ اپنے اپنے مقدر کی بات تھی۔

ہمیں یہاں صرف یہ تنبیہ کرنا ہے کہ منکرین حدیث جس قسم کے شبہات حدیث میں پیدا کر کر کے اسے غیر معتبر ٹھیرانے کی سعی کر رہے ہیں انہیں ذرا اس پر بھی نظر رکھنا چاہیے کہ اگر ان ہی تمام اعتراضات کو لے کر خصوم نے قرآن کی حفاظت کے مقابلہ میں استعمال کر لیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؂

اے چشم اشک بار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہاں جو الفاظ جمع قرآن کے سلسلہ میں فرمائے تھے اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جو الفاظ حدیث کی جمع کے متعلق کہے ہیں اگر ان دونوں کو پاس پاس رکھئے تو آپ کو یہ بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ دونوں جگہ ان انتظامات کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی ہے جب آئندہ اس مستحکم طریقہ حفاظت کے ہمیشہ قائم رہنے میں کسی ضعف کا خطرہ لاحق ہونے لگا ہے ورنہ قرآن اور حدیث ابتدائی دور میں اہل اسلام کی زندگی کا اس طرح جزء لاینفک بنے ہوئے

تھے کہ ان کی حفاظت کے لیے انہیں کسی اہتمام کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تہجد اور فرائض وسنن کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی قرآن کا دور جاری رہا کرتا تھا۔ پھر سال بھر میں تراویح کا ایک مشغلہ ایسا تھا کہ اس سلسلہ سے خواندہ و ناخواندہ حافظ اور غیر حافظ سب کے کانوں تک کئی کئی بار بھی قرآن پہنچ جایا کرتا تھا۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ عبادات تو الگ رہیں یہاں عادات میں بھی اتباع کا یہ عالم تھا کہ ان میں بھی پوری مشابہت پیدا کرنے کے لیے صحابہ کی جدوجہد جاری رہا کرتی تھی۔ آپؐ ہی کی طرح نشست و برخاست، رفتار و گفتار، طعام و شراب، نوم و بیداری کی ایک ایک حالت گذارنا ان کا آخری جذبہ تھا اگر کسی نے آپ کی قمیص کا گریبان کھلا دیکھ لیا تو وہ اسی اداء پر مرمٹا، اگر کسی نے لوکی کے ٹکڑوں کی طرف آپؐ کی انگلیاں چلتی دیکھ لیں تو اسی دن سے اسے لوکی سے عشق پیدا ہوگیا اور اگر کسی نے کوئی بات کہہ کر ہنستے دیکھا تو اس نے وہ بات نقل کر کے آپؐ کی طرح ہنس پڑنا بھی اپنے اوپر لازم تصور کرلیا۔ جب تک قرآن کا یہ چرچا نبی کی ہر ہر ادا اور ان کی ہر حرکت کا یہ نقشہ ہر گھر میں موجود ہو تو اس دور میں اس کا کیا گمان ہوسکتا تھا کہ قرآن یا آپ کی حدیثیں جمع کرنے کا کوئی سرکاری طور پر بھی انتظام ہونا چاہیے۔

قرآن و حدیث کی حفاظت کا یہ دور دورِ شباب تھا اس لیے حفاظ کی کثرت، صحابہ کی یک جہتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت کے عمیق اثرات نے اس ضرورت کا احساس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ قرآن کے لیے کسی جدید نظم و نسق کا تخیل اپنے دماغوں میں لاتے اسی طرح حدیث کا معاملہ بھی لوگوں کے اپنے اپنے انفرادی جذبہ تحفظ کی وجہ سے کسی مزید اہتمام کے قابل نہ سمجھا گیا حتیٰ کہ جب جنگِ یمامہ میں دفعۃً صحابہ کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی تو اب حاملین قرآن کے بھی اچانک اور غیر معمولی نقصان سے قرآن کی حفاظت میں خلل پڑ جانے کا خطرہ بھی محسوس ہونے لگا چنانچہ یہاں حضرت عمرؓ کے جو الفاظ ہیں پورے غور کے ساتھ ملحوظ رکھئے۔

ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ بقرأ القران و انی اخشی ان استحرا لقتل بالقراء بالمواطن فیذھب کثیر من القران و انی اری ان تأمر بجمع القران.	جنگ یمامہ میں حفاظ بے طرح شہید ہوئے ہیں خدا نہ کردہ اگر کہیں آئندہ اسی طرح حفاظ قتل ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قرآن مجید کا بہت سا حصہ ضائع نہ ہوجائے اس لیے آپ قرآن جمع کرنے کا سرکاری طور پر انتظام کیجئے۔

دوسری طرف اب اس دور پر غور فرمایئے جب کہ صحابہؓ ایک ایک کرکے اٹھتے جارہے تھے۔ یعنی دیکھنے والوں کا دور تو ختم ہو رہا تھا اور ان کی جگہ اب ان مشاہدات کو الفاظی لباس میں دیکھنے والوں کی باری آرہی تھی، جمالِ جہاں آرا کو بے حجاب دیکھنے والوں کے سینوں میں جو حرارت بھڑک رہی تھی آپؐ کے انتقالِ مکانی کا حجاب پڑ جانے سے اس کے شعلوں میں بھی وہ تیزی باقی نہ رہنے کا امکان نظر آنے لگا تھا اس لیے یہاں بھی دیکھنے والوں کے دل میں یہ بے چینی پیدا ہونا شروع ہوگئی کہ کہیں اس محبوب عالم کی ادائیں ان کے رخِ انور کے نظارہ کرنے والوں کے ختم ہوجانے سے تاریخ کا ایک صفحہ بن کر نہ رہ جائیں اس لیے وہ انتظام کرنا چاہیے جو عالم کی تاریخ میں ایک یادگار رہ جائے۔ اگر یہ فقط ان کے اُمتیانہ جذبات ہی کا کرشمہ ہوتا تو رسول اور امتی کے رشتے اس سے پہلے بھی بہت ہو چکے تھے مگر یہاں یہ سب پیرائے ہی پیرائے تھے۔ اندرونی ہاتھ کوئی اور تھا جس نے اس تمام مشینری کو

حرکت دے رکھی تھی۔ جس قدرت نے آپؐ کے تمام عالم کے لیے راہنما بنا کر بھیجا تھا وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ آپؐ کی تصویر بھی آئندہ نسلوں کے سامنے کرشن اور رام چندر کی صرف کہانیوں کی طرح پیش کی جائے۔ ایک طرف نبوت ختم ہو چکی ہو، رسالت کا دروازہ مسدود ہو، دوسری طرف اس آخری رسول کے صفحات زندگی بھی محو شدہ اور مشتبہ صورت میں رہ جائیں حتیٰ کہ آئندہ رسول کا دیکھنا تو درکنار، ان کی سیرت کا صحیح مطالعہ بھی میسر نہ آسکے اس لیے قرآن کریم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ حدیث کی حفاظت کی جہاں تک ضرورت تھی اس کا احساس بھی قلوب میں پیدا کر دیا گیا۔ آخر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے[1] ابوبکر بن حزم کے نام یہ فرمان لکھ بھیجا۔

---

[1] یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز خلیفہ عدل نے ابوبکر بن حزم کو اس کام کے لیے اس لیے مقرر فرمایا تھا کہ وہ اس وقت مدینہ طیبہ میں ان کے نائب تھے اور ان کا علمی پایہ بھی اتنا بلند تھا کہ امام مالکؒ ان کے حق میں یہ فرماتے ہیں۔

لم یکن احد بالمدینة عندہ من علم القضاء ما کان عند ابی بکر بن حزم. (توجیہ النظر: ص ۷)

اس وقت مدینہ میں علم قضاء کا عالم ان سے بڑھ کر کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔

علاوہ ازیں ان کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقات، دیات اور سنن کے کچھ احکام بھی وراثۃً موجود تھے۔ حافظ ابن عبدالبر ابن شہاب المعروف بہ زہری سے نقل کرتے ہیں۔

امرنا عبدالعزیز بجمع السنن فکتبنا ھا دفترا دفترا فبعث الی کل ارض له علیھا سلطان دفتراً. (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷٦)

ہمیں عمر بن عبدالعزیزؒ نے حدیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے ایک ایک کر کے اس کو لکھا پھر انہوں نے اپنی قلم رو میں اس کا ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابن شہاب اپنے زمانہ کے اتنے کثیر العلم شخص تھے کہ ان کے متعلق معمر ایک واقعہ نقل کرتے ہیں پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہم نے زہری کا بہت سا علم حاصل کر لیا ہے۔ جب ولید بن یزید کے قتل کا واقعہ پیش آیا تو ہم نے دیکھا کہ اس کے خزانہ سے جانوروں پر لد لد کر کتابیں آ رہی ہیں۔ ہم نے جب ان کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے بیان کیا کہ یہ سب زہری کا علم ہے۔ (جامع بیان العلم ج ا ص ۷۳)

ان کے قلمی ذخیرہ کا تو یہ حال تھا۔ اب ان کے حافظہ کا حال سنئے۔ ابن شہاب خود اپنا حال لکھتے ہیں کہ جب میں مقام بقیع سے گذرتا تو اپنے کان اس خوف سے بند کر لیا کرتا تھا کہ کہیں اس میں بیہودہ باتیں نہ پڑ جائیں خدا کی قسم ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے کان میں کوئی بات پڑ گئی ہو پھر میں اسے بھول گیا ہوں۔ شعبی کا حال بھی یہی تھا۔ (جامع بیان العلم ج ا ص ٦۹)

آپ نے دیکھا کہ یہاں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم نامہ میں حدیث کا لفظ تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ ابوبکر بن حزم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خاص ابواب کے احکام موجود ہونے کی بھی شہادت ثابت ہے زہری بڑی صفائی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن جمع کرنے کا لفظ کہہ رہے ہیں اس پر بھی مولانا اسلم صاحب کو یقین نہیں آتا اور وہ علم الحدیث کے صفحہ ۱۳ پر اس کا یہ عذر تراشنے میں ذرا تامل نہیں فرماتے۔

''یہی وجہ ہے کہ تابعین کبار کے عہد تک حدیثیں غیر مدون تھیں اور سوائے قرآن مجید کے امت کے ہاتھوں میں کوئی دوسری کتاب نہ تھی بعض چیزیں محض علمی لحاظ سے لکھ لی گئی تھیں۔''

ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بعض چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اور ان کی روشنی میں صحابہؓ کے علوم کے سوا کوئی اور علمی چیز نہ تھیں۔ صحابہ کی اصطلاح میں علم نام ہی ان ہی چیزوں کا تھا۔ کیا مولانا کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام عمر کا علمی سرمایہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ .....

انظر ما کان من حدیث رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم و ذھاب العلماء.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تلاش کر کے قلم بند کر لو کیونکہ مجھے آئندہ علم کم ہو جانے اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اب حضرت عمرؓ کے وہ الفاظ تقریباً نوے سال بعد کے ان الفاظ کے پہلو بہ پہلو رکھئے تو آپ کو ان دونوں میں وہ یکسانیت نظر آئے گی جو ایک ہی شخص اور ایک ہی دماغ کے خیالات میں نظر آتی ہے وہاں بھی خدائی حفاظت کے وعدہ نے حضرت عمرؓ کے ارادہ میں جنبش پیدا کی تھی اور یہاں بھی وہی وعدہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس اقدام کے لیے محرک بنا ہے باقی .ع

ما و شما را بہانہ ساختہ اند

جمع احادیث کے متعلق حضرت عمرؓ کی مجلس مشاورت ✻ یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ صحابہ کرام دین کے معاملہ میں اتنے محتاط تھے کہ وہ اپنی رائے سے ایک قدم اٹھانا بھی پسند نہ کرتے تھے چنانچہ جمع قرآن کا ایک بدیہی معاملہ جب زیر بحث آیا تو وہاں بھی مجلس مشاورت منعقد کی گئی اور جب بڑی ردوکد کے بعد یہ معاملہ طے پا گیا تو سرکاری طور پر جمع قرآن کا کام شروع کر دیا گیا۔ٹھیک اسی طرح جمع حدیث کی تحریک کا حال ہے۔یہ تحریک اصل میں آج سے بہت پہلے حضرت عمرؓ کے دل میں پیدا ہوئی تھی مگر یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دنیا کو قلم سے زیادہ اپنے حفظ پر ناز تھا۔حفظ ہی کے ذریعہ سے مخطوطات کی تصحیح کی جاتی تھی پھر حدیث کا جتنا حصہ عملی تھا وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت موجود تھا اور اس کا جو حصہ صرف اقوال سے متعلق تھا وہ والہانہ محبت' انتہائی عقیدت اور ان کے فطری ماحول کی وجہ سے کسی اہتمام کے بغیر دماغوں میں محفوظ تھا۔ادھر قرآن کریم کے ایک ایک نقطہ اور زیرو

لله ..... کہ اس کو بعض علمی چیزوں کی فہرست میں بھی شمار کر لیا جائے۔پھر اس کا ثبوت کون دے سکتا ہے کہ وہ صرف علمی لحاظ ہی سے لکھی گئی تھیں۔کیا اوزاعی اور زہری جیسے ائمہ ان علمی چیزوں کے لکھنے میں بھی کوئی بار محسوس کر سکتے تھے۔پھر زہری یہ کیا کہتے ہیں کہ ہم نے امراء کے زور دینے پر حدیثیں جمع کی ہیں اور اوزاعی یہ کیا فرما رہے ہیں کہ جب سے علم مدون ہوا ہے اس کا نور جاتا رہا۔چاہیے تو یہ کہ ایک علمی خدمت پر زہری اور اوزاعی کو بڑا ناز ہوتا مگر یہاں مولانا نے اس علمی خدمت کے ادا کرنے پر ان کے علاوہ ضحاک بن مزاحم' داؤد طائی' فضیل بن عیاض' سفیان ثوری' شعبہ اور ابن عیینہ کے جو تاسف کے کلمات نقل فرمائے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہے کہ درحقیقت ان حضرات نے کوئی ایسا علم جمع کیا تھا جس میں ایک بال برابر لغزش کا وبال انہیں ایک پہاڑ کے برابر نظر آ رہا تھا آخر وہ کون سا علم تھا جس کو ابن عیینہ ایک طرف تو خود ہی روایت فرماتے جاتے ہیں اور دوسری طرف ڈر کے مارے یہ بھی کہتے جاتے ہیں۔

''کاش یہ علم میرے سر پر شیشوں کا ایک ٹوکرا ہوتا اور گر کر چور چور ہو جاتا کہ اس کے خریداروں سے نجات ملتی''

آخر ایسی وہ علمی خدمت کون سی تھی جس کو ابن عیینہ سر پر اٹھائے اٹھائے پھر رہے تھے اور جس کو نہ تو ادا کر کے چین نصیب تھا اور نہ ادا کیے بغیر کوئی چارہ نظر آتا تھا۔بات کیا تھی اگر یہ لوگ اتنے ہی علم کے دشمن تھے تو کس نے انہیں اس علم کی ادائیگی کے لیے مجبور کیا تھا خود ہی لیے لیے پھرنا اور خود ہی ایک علمی خدمت کی ادائیگی کے فریضہ سے سبکدوش ہو کر اس کا نوحہ کرنا۔آپ نے کبھی سوچا یہ کیا بات تھی۔کہیں یہ علمی خدمت وہی علم حدیث نہ ہو جس کے کتمان میں بھی آتشیں لگام کا خطرہ ہے اور جس کا پہنچانا بھی شیشوں کے سنبھالنے سے زیادہ نازک کام ہے۔آپ کو اختیار ہے ایک ہزار بار حدیث کو چاہے تو مت مانئے مگر خدارا صحابہؓ اور محدثینؒ کی تاریخ تو مسخ نہ کیجئے کہ یہ صرف مذہبی جرم نہیں تاریخی اور علمی جرم بھی ہے۔

زبر کی ذمہ داری سے کاندھے دبے جارہے تھے اس لیے یہ تحریک صرف دماغوں میں گذر کر رہ گئی۔

ان عمر بن الخطابؓ اراد ان یکتب السنن فاستفتی اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ذلک فأشاروا علیہ بان یکتبھا فطفق عمر یستخیر اللہ فیھا شھرا ثم اصبح یوما و قد عزم اللہ لہ فقال انی کنت ارید ان اکتب السنن و انی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتابا فاکبوا علیھا و ترکوا کتاب اللہ و انی و اللہ لا أشوب کتاب اللہ بشیء ابدا[1]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ احادیث قلم بند کر لی جائیں تو اس بارے میں صحابہؓ سے دریافت کیا انہوں نے مشورہ دیا کہ قلم بند کر لینا چاہیے اس کے بعد حضرت عمرؓ ایک مہینہ تک استخارہ کرتے رہے حتیٰ کہ اللہ کی طرف سے ان کے خیال میں یہ بات آئی کہ پہلی امتوں نے کتاب اللہ کے علاوہ بھی کوئی یادداشت قلم بند کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ اسی پر جھک پڑے اور کتاب اللہ کو چھوڑ بیٹھے۔ خدا کی قسم ہے میں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور چیز ملانا پسند نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں ہے۔ لا کتاب مع کتاب اللہ۔

اس بیان سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ (۱) حضرت عمرؓ جمع حدیث کے خود محرک تھے (۲) مشیروں کی رائے حدیثوں کے جمع کرنے کی طرف تھی۔ (۳) حدیثوں کو قلم بند نہ کرنے کی وجہ اہل کتاب کی تاریخ تھی۔ (۴) لا أشوب کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت سنت کی کتابت کا خیال قائم ہو جاتا تو شاید کتاب اللہ کے ساتھ ہی حاشیہ پر ان کو لکھا جاتا۔ دوسرے لفظ ''لا کتاب مع کتاب اللہ'' بھی اسی کے شاہد ہیں پس اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اس طرح ملی جلی قلم بند کر دی جاتیں تو یقیناً اسلام کے ابتدائی دور میں نو آموزوں کے لیے بڑی مشکل کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اتفاق یہ کہ حدیث بھی جب پہلے پہلے کتابت کے دور سے گذری تو اس میں بھی احادیث مرفوعہ اور آثار صحابہ کو ایک ساتھ ہی جمع کر دیا گیا تھا۔ پھر افکار اور ضروریات کی تدریجی ترقی نے مرفوعات کو آثار سے جدا جدا کر دیا ہے اس لیے بہت ممکن تھا کہ جمع حدیث کے نقش اوّل میں شاید اتنی ارتقائی ترتیب و تہذیب کے مدارج کی طرف ذہن نہ جاتا۔ بالخصوص جب کہ اس دور میں قوتِ حافظہ کی وجہ سے قرآن و حدیث میں کسی ادنی اختلاط کا اندیشہ بھی نہ تھا۔ آج بھی تفسیر کی کتابیں اسی طرح کتاب اللہ و تفسیر کے ساتھ ساتھ مخلط چھپی ہوئی ہیں۔ مگر اس اختلاط سے حفاظ کو کوئی شبہ نہیں پڑتا پھر وہ زمانہ تو کچھ اور ہی تھا مگر حضرت عمرؓ کی شانِ حزم و احتیاط نے یہ طریقہ بھی پسند نہ فرمایا کیونکہ ان کے سامنے اس قوم کی تاریخ ابھی زندہ تھی جو آسمانی کتاب کو اسی کتابت کی بدولت اپنے ہاتھوں تحریف کے گھاٹ اتار چکی تھی اس لیے شہروں میں یہ حکم لکھ بھیجا کہ اگر کسی کے پاس کوئی یادداشت لکھی ہوئی ہو تو اسے مٹا دے۔[2]

حیرت ہوتی ہے کہ چھپی ہوئی کتابوں میں ان واقعات کے ہوتے ہوئے بھی منکرین حدیث پھر بے دریغ یہ کیسے لکھ دیتے ہیں کہ صحابہؓ کے درمیان حدیث کی کوئی تشریعی حیثیت نہ تھی اور اسی لیے وہ اس کے جلانے اور مٹانے کا حکم دے دیتے تھے۔ حالانکہ

---

[1] جامع بیان العلم ج ا ص ۶۴۔ [2] دیکھو جامع بیان العلم ج ا ص ۶۵۔

یہی ایک واقعہ نہیں' عام طور پر سلف سے ثابت ہے کہ وہ صرف کتابت کے مخالف تھے نہ کہ حدیث کے زبانی یاد کرنے کے بھی۔
سلف کے نزدیک کتابت حدیث کی ممانعت کے اسباب ❋ ابوسعیدؓ سے کسی نے کہا اگر آپ فرمائیں تو ہم آپ کی بیان کردہ حدیثیں لکھ لیا کریں؟ انہوں نے جواب دیا لکھو مت' بلکہ جیسا ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زبانی سن کر یاد کی ہیں تم بھی ہم سے سن کر زبانی یاد کرو۔

ابو بردہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے بہت سی احادیث روایت کیں جب ہم ان کو لکھنے کے لیے اٹھے تو فرمایا اچھا کیا تم جو مجھ سے سنتے ہو اس کو لکھتے بھی ہو؟ ہم نے عرض کیا جی ہاں۔ کہا وہ سب لاؤ پھر پانی منگا کر ان کو دھو ڈالا اور فرمایا جیسے ہم نے زبانی یاد کی تھیں تم بھی ہمارے حوالہ سے زبانی یاد کر کے نقل کرو۔

مسروق نے علقمہ سے کہا کہ مجھے قرآن کی متناسب سورتیں لکھا دیجئے فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ سلف کو لکھنا پسند نہیں تھا۔ میں نے عرض کیا معلوم تو ہے مگر میرا ارادہ یہ ہے کہ میں یاد کر کے پھر انہیں جلا دوں گا۔
سلف میں اپنی علمی یادداشتوں کو مٹانے کا ایک اور داعیہ ❋ عبیدہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اپنے وفات کے وقت اپنی سب کتابیں منگائیں اور ان کو مٹا ڈالا جب ان سے سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا مجھے اس کا خطرہ ہے کہ کہیں یہ نااہلوں کے ہاتھ نہ پڑ جائیں اور وہ اس کی غلط مرادیں بیان کریں۔

اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک یہ علم زبانی چلتا رہا معزز رہا جب کتابوں میں مدون ہو گیا تو نااہلوں کے پلے پڑ گیا اور اس کا نور جاتا رہا۔

ابراہیم کتابت کی ممانعت کی ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ ''لکھا مت کرو کیونکہ لکھنے کے بھروسہ پر آدمی یاد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔[۱]''

ان چند واقعات سے یہ امر روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ صحابہؓ میں حفظ حدیث کا اہتمام ہمیشہ رہا اور اتنا اہتمام رہا کہ ابتدائی دور میں عام طور پر اس کی کتابت کی اجازت بھی نہیں دی گئی مبادا اس کے حفظ میں کوئی تساہل پیدا ہو جائے اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کتابت کی ممانعت ان کے نزدیک مسئلہ کے طور پر نہ تھی بلکہ وہ صرف ایک وقتی مصلحت بنی تھی ورنہ حضرت عمرؓ کتابت حدیث کے متعلق مشورہ ہی کیوں کرتے' صحابہ کرامؓ کی رائے بالاتفاق کتابت کی طرف کیسے چلی جاتی' خود بہت سے صحابہؓ حدیثیں کیوں لکھتے اور ان سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم' عبداللہ بن عمروؓ سے یہ کیسے فرما دیتے۔

''مجھ سے جو سنا کرو سب لکھ لیا کرو'' انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ خواہ غصہ کے حال کا کلام ہو یا خوشی کا؟ فرمایا ''ہاں میں دونوں حالتوں میں جو کہتا ہوں حق ہی کہتا ہوں''۔[۲]

حافظ ابن عبدالبرؒ حضرت انسؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں۔ **قیدوا العلم بالکتاب** (علم کو تحریر کر کے مقید کرو) اسی لیے

---

۱ جامع بیان العلم۔ ۲ ایضاً ج ۱ ص ۷۱۔

حضرت انسؓ اپنی اولاد کو کتابت علم کی وصیت فرمایا کرتے تھے- حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں-

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا' میں علم کو مقید کرلوں؟ فرمایا کرلو- عطاء کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمروؓ سے پوچھا علم کے مقید کرنے کا کیا مطلب ہے' فرمایا قلم بند کرلینا- یہی وجہ تھی کہ ابوہریرہؓ جیسے مشہور کثیر الحدیث صحابی کہتے ہیں کہ میرے علم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ذخیرہ مجھ سے زیادہ کسی کو محفوظ نہیں سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے کیونکہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا-[1]

پس اس قسم کی احادیث و آثار کے ہوتے ہوئے کتابت حدیث کی ممانعت کو ایک مسئلہ بناڈالنا انتہائی ناواقفی ہے- اصل بات یہ تھی کہ عرب کے خداداد حافظہ کے ہوتے ہوئے قرآن کے ساتھ عام طور پر کتابت حدیث کی اجازت دے دینا بالخصوص ان امیوں کو جنہیں ابھی تک کتابت کا پورا سلیقہ بھی حاصل نہیں ہوا تھا یقیناً مناسب نہ تھا جن حضرات کو یہ سلیقہ حاصل تھا ان کو اس وقت بھی اجازت دے دی گئی تھی پھر بعد میں جب کتابت کی ضرورت زیادہ محسوس ہونے لگی تو عام طور پر بھی اجازت دے دی گئی- جو امور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ زمانہ کی ضروریات اور حالات کے تابع رہا کرتے ہیں- قرآن ہی کو دیکھئے ایک زمانہ تھا کہ اس میں اعراب اور سورتیں اور رکوع لکھنا بدعت سمجھا جاتا تھا' پھر ایک زمانہ آیا کہ اعراب وغیرہ کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ رہا حتیٰ کہ اب بدعت ہونا تو درکنار اعراب لگانا واجب ہوگیا- پھر ایک زمانہ آیا جب کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا تحت اللفظ ترجمہ بھی علماء میں شورش کا باعث بن گیا- اب ایک زمانہ ہے کہ سب سے اہم ضرورت ترجمہ کی محسوس کی جارہی ہے' بات وہ بھی درست تھی اور یہ بھی درست ہے- حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ کتابت حدیث کے مسئلہ میں شروع میں کچھ رائے کا اختلاف ضرور رہا ہے پھر یہ اختلاف ختم ہوگیا تھا اور علم کی کتابت سب کا متفقہ دستور العمل بن گیا تھا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو آج ہمارے زمانہ میں علم کا نام ونشان بھی نہ ملتا-[2]

خلاصہ یہ کہ تدوین حدیث تحفظ علم کی ایک ارتقائی شکل تھی جس طرح موجودہ صورت قرآن کے جمع و ترتیب کی ارتقائی شکل ہے پہلے وہ عموماً سینوں میں محفوظ تھا پھر صحف میں لکھا گیا. پھر صحف سے مصحف بنا' پھر غیر مشکل سے مشکل ہوا' رکوع اور سورتوں کے نشانات قائم کیے گئے' پھر مترجم ہوا' پھر اس کی مختلف تفاسیر اور فہرستیں مرتب ہوئیں اسی طرح حدیث بھی پہلے منتشر طور پر محفوظ رہی- پھر زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہاں بھی ایک ارتقاء نمودار ہوا اور اس کے قلم بند کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی پہلے آثار اور مرفوع حدیثیں یکجا لکھی گئیں- اسی حال پر ایک دور گذرا دوسرا دور آیا تو مرفوع کو آثار سے جدا کرلیا گیا اس کے بعد صحیح و ضعیف کے جدا جدا لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی یہ تمام صورتیں فطری ارتقاء کی بنا پر ظاہر ہونا ناگزیر تھیں- ہر ارتقائی حرکت پہلے پہل قابل اعتراض نظر آئی- آخر کار وہی متفقہ دستور العمل بن گئی- اسی بنا پر امام زہریؒ نے بھی حدیث کا جمع کرنا شروع میں پسند نہ کیا اور شکایت کے لہجہ میں کہا کہ ہمیں ان امراء نے مجبور کردیا ہے ورنہ ہم حدیث کی تدوین نہ کرتے مگر کیا آپ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

1- جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۱- 2- دیکھو مقدمہ ابن الصلاح ص ۱۷۱-

جیسے خلیفہ عدل کے متعلق یہ گمان کر سکتے ہیں کہ ان کا یہ حکم ایک انچ بھی تعلیمات اسلام کے خلاف ہو سکتا تھا یہ کلمات ناگواری جیسے ہر حرکت ارتقائی کی ابتداء میں منہ سے نکلا کرتے ہیں یہاں بھی نکلے بالآخر یہی محدثین تھے جن کی عمر کا محبوب ترین مشغلہ یہی تدوین حدیث تھا - یہاں کسی کے جبر و قہر کا گمان کرنا ایک بدگمانی ہے' یا یہ سمجھنا کہ تدوین حدیث سے حدیث کی تاریخ شروع ہوتی ہے بالکل خلافِ واقع ہے - تدوین سے پہلے بھی حدیث محفوظ تھی' فرق صرف یہ پڑا کہ اب حفظ صدور کے ساتھ اوراق میں بھی مدون ہو گئی -

مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہے کہ منکرین حدیث کا یہاں تدوین حدیث کے مسئلہ سے مدد لینا محض ایک مغالطہ ہے - اسی طرح کسی کسی صحابی کا عام طور پر روایت حدیث کی ممانعت کرنا یا روایت کرنے والوں سے گواہی طلب کرنا ہرگز اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ ان کے نزدیک اصولی طور پر حدیث حجت نہ تھی بلکہ یہ تمام واقعات اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں کہ ان کے درمیان حدیث کی حیثیت قطعاً تشریعی حیثیت تھی اور اسی لیے وہ اس کا اہتمام مذہب کی طرح کیا کرتے تھے - ورنہ تاریخی واقعات کی تدوین کے لیے نہ کبھی ممانعت کی گئی ہے اور نہ تاریخ کے ہر ہر جزء کے لیے کبھی شاہدوں کا مطالبہ کیا گیا ہے' یہ اہتمام صرف مذہب اور شریعت کے لیے کیا گیا ہے - حافظ ابن عبدالبرؒ اور علامہ جزائری نے اس پر بہت بسط و شرح سے بحث کی ہے ہم یہاں صرف اس کا ایک ٹکڑا نقل کرنے پر کفایت کرتے ہیں -

و قد رد علیهم الجمهور بان الرد انما كان لا سباب عارضة و هو لا يقتضى رد جميع اخبار الا حاد كما ذهب اولئک علی ان الا خبار التی استندوا اليها انما تدل علی مذهب من يشترط فی قبول الخبر التعدد فی رواته و لا تدل علی مذهب من يشترط التواتر فيه.

(توجيه ص ۱۵)

جن چند واقعات سے حدیث کے لیے تواتر شرط کہنے والوں نے استدلال کیا ہے وہ کئی وجہ سے درست نہیں - پہلے تو اس لیے کہ اگر کسی صحابی نے کسی حدیث کو کسی عارضی سبب سے تسلیم نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں نکل سکتا کہ اس کے نزدیک خبر واحد قبول نہ کرنا اصولی طور پر بھی مسلم تھا ہو سکتا ہے کہ اصولاً اس کے نزدیک خبر واحد حجت ہو - لیکن خاص اس جگہ راوی یا متن کے شرائط میں کوئی شرط موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس نے قبول نہ کیا ہو' یا کسی وقتی مصلحت کی بناء پر اس نے اس حدیث کے لیے گواہ طلب کر لیے ہوں علاوہ ازیں اگر یہ واقعات دلیل بن سکتے ہیں تو اس شخص کی دلیل بن سکتے ہیں جس کے نزدیک خبر واحد کے لیے راوی کا تعدد ضروری ہے نہ کہ اس شخص کے لیے جس کے نزدیک تواتر ضروری ہے -

اس کے بعد اب ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ قرآن کی حفاظت کا مفہوم کیا ہے اور کیا یہ تسلیم کر کے کہ احادیث کا تمام ذخیرہ تلف ہو گیا ہے' قرآن کو پوری طرح محفوظ کہا جا سکتا ہے - یہاں ابوالحسن بن منتاب اور قاضی ابواسحٰق کا ایک مکالمہ بہت دلچسپ ہے - علامہ شاطبی نقل فرماتے ہیں کہ ابوالحسن بن منتاب نے ایک دن قاضی ابواسحٰق سے پوچھا آخر اس کا سبب کیا ہے کہ اہل تورات کو تورات کی تحریف پر قدرت حاصل ہو گئی لیکن قرآن کی تحریف پر کسی کو قدرت نہ ہوئی ؟ قاضی نے جواب دیا اہل تورات کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے -

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ. (المائدہ:٤٤) اس سبب سے کہ ان پر خدا کی کتاب کی حفاظت کا بوجھ ڈالا گیا تھا-

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ توراۃ کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہیں لی بلکہ اس کو خود اہل توراۃ کے سپرد کر دیا تھا اس کے بالمقابل قرآن کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے-

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ. (الحجر:۹) یہ ذکر ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے-

یہ فرق ہے کہ قرآن کی تحریف پر کسی کو دسترس حاصل نہیں ہوسکی- (الموافقات)

یہی سوال اگر کسی مؤرخ سے کیا جاتا تو وہ بہت سے بہت اس کا سبب عرب کا ماحول اور ان کا ذوق حفظ ہی قرار دیتا -لیکن اگر یہ اثرات اس ماحول کے ہوتے تو ان کا دائرہ بھی یقیناً ان حدود ہی میں محدود رہنا چاہیے تھا مگر یہاں جب عجم پر نظر کی جاتی ہے جو نہ قرآن کی زبان سے آشنا نہ اس کے تلفظ پر پورے قادر' نہ قوت حفظ میں کچھ ممتاز تو وہ بھی قرآن کے حفظ میں عرب سے پیچھے نظر نہیں آتے بلکہ اگر انہیں کچھ پیش گام کہہ دیا جائے تو مبالغہ نہیں ہے-

اسی کے ساتھ جب اس پر بھی غور کیا جاتا ہے کہ اس غیر معمولی حفاظت کا دائرہ قرآن کے صرف الفاظ تک محدود نہیں رہا بلکہ ان کی طرزِ کتابت اور طرز ادا تک پھیلتا چلا گیا ہے اور اس سے بھی گذر کر ان[1] تمام علوم وفنون کو محیط ہوگیا ہے جو اس سلسلہ میں قریب یا بعید طور پر کارآمد تھے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ حفاظت انسانی حفاظت کا نتیجہ نہیں بلکہ ضرور اسی وعدۂ الٰہی کا نتیجہ ہے اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جس حفاظت کے حدود اتنے وسیع ہوگئے ہوں قرآن کے معانی اور اس کی ضروری تفصیلات اس کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتیں-

یہ بات ہر شخص کو باور کر لینا چاہیے کہ معانی کی حفاظت کو بھی الفاظ کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے الفاظ اور معانی دونوں کا باہم ایسا علاقہ ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے - اصولِ فقہ میں جب قرآن کی بحث شروع ہوتی ہے تو علماء لکھتے ہیں کہ

---

[1] علامہ شاطبیؒ تحریر فرماتے ہیں :و هكذا جرى الامر فى جملة الشريعة فقيض الله لكل علم رجالا حفظه على ايديهم -(الموافقات ج۲ص۵۹) قرآن کریم کی طرح حفاظت الٰہیہ کا دائرہ تمام شریعت کو محیط ہے-اللہ تعالیٰ نے جو علم بھی اس سلسلہ میں کارآمد ہوسکتے تھے سب کے لیے کچھ لوگ ایسے مقرر فرمادیئے ہیں جن کے ذریعہ سے اس کی حفاظت ہوتی رہتی ہے-لغت قرآن کے لیے اہل لغت الفاظ واعراب کی تصحیح کے لیے اہل صرف و نحو-اسی کے ساتھ ایک ایسی جماعت بھی پیدا فرمائی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بحث کی' ثقہ اور عادل راویوں کے حالات لکھے- ان کی ولادت ووفات کے سن مدون کیے تاکہ ایک دوسرے کی ملاقات کا حال صحیح صحیح کھل سکے اور سند کا اتصال روشن ہوجائے اور اس طرح آپؐ کی صحیح و سقیم احادیث کو ایک ایک کرکے نکھار دیا- پھر ایک جماعت ایسی پیدا فرمائی جس نے اغراض شارع سے بحث کی اور ان کے مطابق احکام استنباط کیے حتیٰ کہ قرآن وسنت کو دفعات وار ایک مبوب اور مفصل آئین کی شکل پر مرتب کردیا-ان کے علاوہ وہ علماء پیدا فرمائے جنہوں نے مخالفین کے شبہات اور معاندین کے الحاد وزیغ کی تردید کا ذمہ لے لیا پھر آخر میں لکھتے ہیں-و هكذا جرى الامر فى كل علم توقف فهم الشريعة عليه او احتيج فى ايضا حها اليه و هو عين الحفظ الذى تضمنته الادلة الشرعية. (ج۲ص۶۱)

خلاصہ یہ کہ جس جس علم پر شریعت کا سمجھنا موقوف تھا یا اس کی ایضاح وتفصیل میں اس کی ضرورت پیش آسکتی تھی سب کے لیے ایک ایک قوم پیدا فرمادی اور یہ سب کچھ ٹھیک اسی حفاظت الٰہیہ کا مصداق تھا جن کا تذکرہ قرآنی آیات میں کیا گیا ہے-

قرآن در حقیقت نظم اور معنی کے مجموعہ ہی کا نام ہے یعنی یہ دونوں قرآن کے دو رکن ہیں جس میں معنی کی رکنیت ایک اعتبار سے بہ نسبت لفظ کے اہم تر ہے- ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسا ایمان میں تصدیق و اقرار کی - اگر چہ ایمان کے یہ دونوں رکن ہیں مگر تصدیق کی رکنیت بہ نسبت اقرار کے زیادہ اہم ہے- اسی لیے اکراہ کی حالت میں اقرار کی رکنیت تو ساقط ہوسکتی ہے مگر تصدیق کی رکنیت کسی حالت میں ساقط نہیں ہوسکتی - اکراہ و رضا کے دونوں حالتوں میں قلبی تصدیق قائم رہنا ضروری ہے-

اسی طرح یہاں الفاظ و معانی کا معاملہ ہے' الفاظ بھی قرآن کا ایک رکن ہیں اور معانی بھی لیکن معانی کی رکنیت بہ نسبت الفاظ کے زیادہ اہم ہے اس لیے چاہیے تو یہ تھا کہ ان کی حفاظت بھی الفاظ کی حفاظت سے زیادہ اہم ہوتی لیکن ہر کلام کا ڈھانچا چونکہ الفاظ ہی سے تیار ہوتا ہے الفاظ نہ ہوں تو کوئی کلام وجود میں نہیں آسکتا جیسے انسان میں جسم و جان' جسم موجود نہ رہے تو انسان کو موجود کون کہے- الفاظ ہی ان معانی کا لباس ہیں الفاظ ہی سے قرآن کا اعجاز ظاہر ہوتا ہے اور الفاظ ہی کے لحاظ سے معانی کے حدود پھیلتے اور سمٹتے ہیں- اس کے برخلاف معانی صرف مفہومات ہوتے ہیں جن کی ادائیگی کے لیے پھر الفاظ کی ضرورت ہے اور وہ قرآنی الفاظ سے زیادہ خوب صورت میسر نہیں آسکتے - اس اعتبار سے دیکھو تو الفاظ کی حفاظت مقدم ہونی چاہیے- اس لیے مقدر یوں ہوا کہ الفاظ کی حفاظت تو بطریق تواتر ہو اور معانی قرآن یعنی اس کی تفصیلات کی حفاظت صرف اس حد تک محدود رہے جو اس کی مراد کو تحریف معنوی کی زد سے بچائے رکھے اور اس طرح ایک طرف الفاظ کا تواتر معانی کو بکھرنے نہ دے' دوسری طرف معانی کی حفاظت الفاظ کی بندش میں معین رہے اور مراد متکلم کے خلاف غیر مقصود احتمالات کا دائرہ پھیلنے نہ دے- یہ ہے وہ حفاظت جس کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے- اگر قرآن کے صرف الفاظ ہی محفوظ ہوں تو ہر ملحد و زندیق اپنے اغراضِ نفسانی کے مطابق جو معنی چاہے ان میں پہنا دے اور اگر صرف معانی محفوظ ہوں تو ان کے انتشار کے سمیٹنے کا ہمارے پاس کوئی قطعی ذریعہ ہی باقی نہ رہے- اب الفاظ و معانی دونوں محفوظ ہیں- الفاظ کی گرفت سے معانی باہر نہیں جاسکتے اور معانی کے لحاظ سے الفاظ میں رد و بدل نہیں ہو سکتی- دونوں کی حفاظت میں فرق ہے تو یہ کہ الفاظ بعینہا محفوظ ہیں اور معانی قدرے مشترک محفوظ- جیسا کہ حاتم کی سخاوت کی حکایات کہ اس کی ہر ہر جزئی حکایت تو متواتر نہیں مگر ان سب میں مشترک طور پر اس کی سخاوت کا مضمون متواتر ہے اسی طرح قرآن کے معنی کی تمام تفصیلات اگر چہ متواتر نہیں مگر ان سب میں پھر ایک مشترک امر متواتر ہوتا ہے' وہی ان مختلف تفصیلات کا سرچشمہ ہوتا ہے- اگر قرآن کے معنی بھی الفاظ کی طرح کسی ایک صورت میں محدود ہو کر رہ جائیں تو یہ اس کی بلاغت اور بلندی کے شایان شان نہیں- تجربہ شاہد ہے کہ جس قدر بلند پایہ کلام ہوتا ہے اتنے ہی خوب صورت سے خوبصورت معانی کا حامل ہوتا ہے- نظم قرآنی کی بلندی بھی اس کو مقتضی ہے کہ اس میں مختلف معانی پیدا ہوں اور ہر معنی ہدایت کا ایک بہتا ہوا چشمہ ہو' اس کے علاوہ قانونِ یسر بھی یہی چاہتا ہے کہ اختلافِ معانی کی وجہ سے عاملین کو کچھ اور وسعت مل جائے لیکن ان مختلف معانی اور مختلف احتمالات کا معیار اگر صرف لغت دانی اور عقل کو ٹھیرا دیا جاتا تو یسر ہی یسر اور وسعت ہی وسعت رہ جاتی اور ضبط آئین کا جو اصل مقصد تھا وہ سب فناء ہو جاتا- اس لیے وسعت کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کے حدود مراد شارع کے اندر ہی اندر دائر رکھے جائیں یہی

وسعت و تنگی کے درمیان کا وہ مُیدان ہے جسے احادیث نے متعین کر دیا ہے۔ اب ایک حد تک یہاں آزادی بھی حاصل ہے اور اسی کے ساتھ بالکل مطلق العنانی بھی نہیں۔

ان تمام تفصیلات کا ہر ہر جزء اگر چہ متواتر نہیں لیکن اس مجموعہ سے جو حدود تحریف ہیں وہ قدرِ مشترک بطریق تواتر ثابت ہو جاتی ہیں مثلاً قرآن کی آیت ''اقیموا الصلوۃ'' ہی کو لیجئے اس کی تمام تفصیلات اگر چہ متواتر نہیں ہیں لیکن ان سے یہ بات بداہۃً ثابت ہو جاتی ہے کہ لفظ صلوٰۃ سے صرف دعاء مراد لے لینا قرآن کی تحریف ہے۔ اسی طرح اگر آج کوئی شخص نماز کی کوئی نئی ہیئت ایجاد کرنا چاہے اور سجدہ کو رکوع سے مقدم یا رکوع کو قراءت کے درمیان یا دو سجدوں کے درمیان رکوع یا دو سجدوں کے درمیان قراءت یا قیام کے حالت میں سلام تجویز کر دے تو یہ سب تحریف شمار ہو گا۔ اور یہ تحریف اسی طرح قرآن کی تحریف کہلائے گی جیسا کہ آیت مذکورہ میں لفظ صلوٰۃ کی بجائے لفظ الدعا کی تحریف۔ پس اگر قرآن کے الفاظ کا تحفظ اس لیے ضروری ہے کہ کتاب اللہ کی صورت محفوظ رہے تو اس کی تفصیلات کی حفاظت اس لیے ضروری ہے کہ ان محفوظ الفاظ کی مرادیں اور ان کے صحیح مصداق بھی محفوظ رہیں۔

ذرا انصاف کرنا چاہیے کہ اس کامل دین کی حفاظت کا وعدہ کیا صرف الفاظ کی حفاظت سے پورا ہو سکتا ہے یہ حفاظت تو شاید تورات و انجیل کو بھی حاصل تھی۔ لیکن کیا محض الفاظ کی حفاظت سے یہودیت و نصرانیت محفوظ رہ گئیں کیا احبار و رہبان نے تحریف معنوی کر کر کے ان کو تباہ و برباد نہیں کیا۔ چلئے اگر راجح قول کی بنا پر تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں لفظی تحریف بھی ہو گئی ہے تو بھی یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ تحریف معنوی کے اثرات لفظی تحریف سے زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ پس قرآن کے صرف الفاظ کو محفوظ کہہ کر دین محمدیؐ کے اصل خط و خال کی حفاظت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ حفاظت صرف ان احادیث کی بدولت ہے جو اگر چہ انفرادی حیثیت سے خبر آحاد کہلاتی ہیں مگر قدرِ مشترک حدود تحریف کو بطریق تواتر متعین کر دیتی ہیں آج بھی بہت سے منتسبین اسلام محرف عقائد قرآن کے الفاظ میں ٹھونسنا چاہتے ہیں مگر قرآن کی معنوی حفاظت کا یہی دوسرا مضبوط بازو ہے جو انہیں کامیاب ہونے نہیں دیتا۔ بہت سے ہیں جو اپنی زبان سے آیت خاتم النبیین بڑی خوش الحانی سے پڑھتے ہیں پھر اسی آیت سے نبوت کا تاقیامت تسلسل ثابت کرتے ہیں۔ بہت ہیں جو رسول کو عام انسانوں کی صف میں لا کر ان کے بالکل برابر کھڑا کر دینا چاہتے ہیں اور بہت ہیں جو اس کو اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی ذات میں مدغم کر دینا چاہتے ہیں اور سب کے ہاتھوں میں یہی قرآن ہے مگر یہ سب کے سب اس لیے ناکام رہتے ہیں کہ قرآنی حفاظت صرف اس کے الفاظ تک محدود نہیں رہی اس کے معانی کو بھی شامل ہو گئی ہے اس لیے اگر کوئی زبان ایک ہزار بار آیت خاتم النبیین پڑھ کر ایک بار بھی نبوت کا دعویٰ کر دیتی ہے تو وہ امت کے نزدیک منکرین ہی کی فہرست میں شمار ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کے الفاظ کا انکار کرنے والا اور اس کے کسی متفق علیہ معنی کا انکار کرنے والا ایک ہی صف میں سمجھا جاتا ہے۔

پس اگر آپ کے نزدیک بھی یہ ضروری ہے کہ قرآن کی حفاظت لفظی اور معنوی دونوں طریقوں پر ہو تو اب صفحات تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھ جائیے کہ وہ کون سی جماعت تھی جس نے اس فریضہ کو ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کے الفاظ کی حفاظت حفاظ

نے کی ہے تو اس کے معانی کے بہتے ہوئے دریا کی نگہداشت محدثین کے سوا کسی نے نہیں کی - اگر محدثین کی یہ حفاظت حفاظت الٰہیہ کا مصداق نہ ہوتی تو ڈاکٹر اسپرنگر اس حفاظت کا محیر العقول نقشہ دیکھ کر حیرت زدہ نہ رہ جاتا -

ابن حزم جیسا وسیع النظر مؤرخ اور عالم فن اسناد کو اس امت کی خصوصیات میں شمار نہ کرتا لیکن وہ بڑے فخر سے یہ اعلان کرتا ہے کہ دین کی حفاظت کے جو چند طریقے اس امت کو مرحمت ہوئے ان میں سے ایک بھی پہلی کسی امت کو نصیب نہیں ہوا - بقول منکرین حدیث اگر دین کی حفاظت صرف تواتر کی ایک ہی صورت میں منحصر ہو تو پھر تمام دین کی حفاظت کا دعویٰ یا تو صرف ایک بے دلیل خوش عقیدگی بن جائے یا دین کے بہت بڑے حصہ سے دست بردار ہونا پڑے - قرآن کریم اگرچہ متواتر ہے - مگر بہت سے مقامات پر اس کی مراد اور معنی کا تواتر ثابت نہیں ہو سکتا لغت میں اشتراک ثابت ہے پھر حقیقت و مجاز استعارات و کنایات کا ایسا وسیع باب ہے جس پر معتزلہ نے تو اپنے سارے مذہب کی بنیاد ہی رکھ دی ہے - ان کے نزدیک ذات وصفات کی آیات اکثر اسی باب میں داخل ہیں - ان احتمالات کے موجود ہوتے ہوئے ہر جگہ تواتر اور قطعیت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے - اس بنا پر احادیث تو درکنار قرآنی احکام کے بہت بڑے حصہ سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا اور اگر ہٹ دھرمی سے یہی دعویٰ کر دیا جائے کہ اس کی تمام تفصیلات بھی قطعی الثبوت اور متواتر ہیں تو مذہبی دنیا میں موجودہ حالت سے بھی زیادہ انتشار برپا ہو جائے گا - ہر شخص اپنے اندازۂ عقل کے مطابق ایک معنی تراش لے گا اور اس پر اس زعم میں مبتلا رہے گا کہ یہی معنی متواتر اور قطعی ہیں مثلاً منکرین حدیث' اتباع وحی کی تمام آیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں حدیث کے انکار کی بہت بڑی دلیل موجود ہے اور قائلین حدیث ان ہی آیات کو اثبات حدیث کی بہت بڑی حجت سمجھتے ہیں - اب سوچیے کہ اگر یہ دونوں معنی متواتر ہوں تو ایک دوسرے سے کہاں تک کشیدگی کی نوبت آ جائے گی - لیکن اگر مسائل ظنیہ بھی قرآن کے ماتحت داخل رہ سکتے ہیں تو پھر کسی فریق کو یقینی طور پر دوسرے کو باطل کہنے کا حق نہیں ہو سکتا - بہت سی آیات کے معانی میں صحابہ کرام کا اختلاف ثابت ہے اس کے باوجود چونکہ قطعیت کا دعویٰ کسی کو نہ تھا اس لیے ان میں مخالفت کا کوئی اثر بھی نہ تھا -

انکارِ حدیث کے نتائج وعواقب ❊ انکارِ حدیث اور حصولِ یقین کے لیے تواتر شرط کرنے کے لازمی نتائج حسب ذیل ہیں -

(۱) قرآن کریم کی معنوی حفاظت اور اسلام کے امتیازی طرق محافظت کا انکار -

(۲) قرآن کی جامعیت کا وہ وسیع مفہوم جو احادیث نبویہ پر نظر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے اس سے دستبرداری -

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیش قیمت تشریعی کلمات سے محرومی اور آپؐ کی پراسرار حالات زندگی سے لاپرواہی -

(۴) آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کی اطاعت سے اصولی انکار -

(۵) قرآن کریم میں جہاں بیسیوں جگہ اطاعت رسول کا صریح حکم موجود ہے ان سب کی تاویل بلکہ تحریف -

(۶) جس دور میں عامل بالقرآن امام نہ ہو اس میں ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ کے تمام نظام کا تعطل -

(۷) رسول کی ذات میں بلا کسی شرعی ثبوت کے دو حیثیتوں کا اعتقاد پھر ان کے جدا جدا حقوق کی محض اپنے دماغ سے تقسیم -

(۸) اسوۂ رسول جو قرآن کی جامعیت کا مفصل نقشہ تھا اس کی قطع و برید اور بقیہ کی ذہنی تشکیل۔

(۹) رسول کی ذات میں جو شرعی اور فطری جاذبیت ہے اس سے علیحد گی اور یکسوئی۔

(۱۰) مذہبی آئین سازی میں عقولِ عامہ کی اصولی دست اندازی۔

حدیث کا انکار تو آسان ہے لیکن اس کے انکار کے جو عواقب ہیں ان کا سنبھالنا ذرا مشکل ہے۔ یہ پہلو دین کی صرف تخریب کا پہلو ہے اس کی تعمیر کا پہلو نہیں۔ منکرین حدیث کو چاہیے کہ پہلے وہ صرف قرآن اور اپنی عقل کی مدد سے دین کا ایک مکمل نقشہ تیار کرلیں اس کے بعد اس مفصل نقشہ سے موازنہ کر کے دیکھیں جو احادیث کی زیر ہدایات مرتب ہو چکا ہے اس وقت ان کو یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ مملکت دین کی وسعت' محکمات ومتشابہات کے علاقے' حرام وحلال کے حدود' عقائد واعمال کی باریکیاں' معیشت و تمدن کے شوشے' نظام وسیاست کی لائنیں کس میں زیادہ نمایاں اور صاف نظر آتی ہیں۔ ہر مشکل کو غیر ضروری کہہ کر ٹال دینا ہر مطلق العنانی کو دین کے یسر میں داخل سمجھ لینا' سلف وخلف کی معروف شاہراہ کو چھوڑ کر نئے راستہ کی بنیاد ڈالنا اپنے خود تراشیدہ خیالات ومذعومات کو حقائق اور حقائق کو خیالات سمجھ لینا دین نہیں بلکہ کوتاہ نظری خود پسندی اور واجب التوقیر ہستیوں کی تحقیر کرنا ہے درحقیقت یہ قدرت کی ایک تعزیر ہے جو انکارِ حدیث کے باعث ملی ہے۔

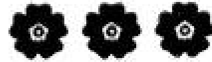
یہ امر یقینی ہے کہ امت کا جو طبقہ جس قدر صاحب نبوت سے قریب تر ہے اسی قدر مذہبی لحاظ سے صحیح تر ہے اس لیے مذہب کی جھلک جتنی صحیح طور پر ان میں نظر آسکتی ہے بعد کے دور میں نظر نہیں آسکتی۔ لہٰذا خالی الذہن ہو کر آپ براہ راست ان کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو بلا کسی غور وفکر کے جو بات آپ کے ذہن میں پیدا ہوگی وہ صرف ایک یہی بات ہوگی کہ ان کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اپنی ۲۳ سالہ حیاتِ طیبہ میں رسالت ہی کی حیثیت سمجھی گئی ہے اور آپ ؐ کو ایک لمحہ کے لیے بھی صرف ایک عام امام یا عام امیر کی حیثیت میں نہیں سمجھا گیا' ان کی نظروں میں آپ ؐ پر ایمان لانا' آپ ؐ سے محبت کرنا' آپ ؐ کی اطاعت کرنا اور وہ تمام قربانیاں جو ان کے بس میں تھیں کر گذرنا صرف رسالت ہی کی ایک حیثیت سے متعلق تھا وہ آپ ؐ کی اطاعت اور آپ ؐ کی حکم برداری کے لیے کسی ادنیٰ پس وپیش کے بغیر ہر وقت تیار رہتے تھے اور کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کے حکم یا آپ کے حکم کی بجا آوری میں سرمو کوئی تفریق کرتے ہوں یا آپ ؐ کا حکم ثابت ہو جانے کے بعد حیات و وفات کی تفریق ان کے ذہنوں میں کبھی گذری ہو۔ ان کے نزدیک آپ ؐ کے احکام اور آپ ؐ کی جو حیثیت تھی وہ ہرگز کسی حاکم کسی امیر اور کسی بادشاہ کے حکم کی سی نہ تھی سلف کی تاریخ کا یہی نقشہ اتنا سچا ہے کہ اس میں مسلمان وکافر دو رائیں نہیں رکھتے۔ رہ گئی سند کی تحقیق' شاہدوں کی تلاش' ہر شخص کو معنی سمجھے ہوئے بغیر حدیث بیان کرنے کی ممانعت تو وہ صرف بنظر احتیاط اور آپ ؐ کی طرف غلط انتساب کے سدباب کے لیے تھی۔ اگر قرآن کی طرح لکھنے' قرآن کی طرح حدیث کو اپنا مشغلہ بنائے رکھنے کی کسی دور بین نے ممانعت کی تو اس نے صرف اس تحریف سے حفاظت کی خاطر کی جو اس کی آنکھوں کے سامنے ابھی تورات وانجیل میں ہو چکی تھی۔ الغرض سند کی تحقیق' شاہدوں کا مطالبہ' کتابت کی ممانعت مگر حفظ کا اہتمام' ہر شخص کو تعلیم کی ممانعت اور ہر قسم کی حدیث کی روایت کی روک تھام' روایت حدیث کے وقت خوف وہراس' تکثیر روایات سے احتراز وغیرہ وغیرہ۔ یہی صحابہؓ اور حدیث کی تاریخ کا خلاصہ ہے اب چاہے لو اسے آپ حدیث

کی مخالفت کا پروگرام کہہ لیجئے یا حدیث کی حفاظت، تعلیم دین کی اہمیت، روایت احادیث میں فہم مخاطبین کی رعایت اپنے احساس ذمہ داری، حدیث میں لاپرواہی سے اجتناب، اور انتہائی تشدد و احتیاط سے تعبیر کیجئے۔

ہر شخص کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر اس کے عام مذاق یا اس کے زمانہ کے عام مذاق کے بھی خلاف ہوسکتے ہیں، ان کی اصل وجہ وقتی مصلحت یا کوئی اور عارضی سبب بھی ہوسکتا ہے، صرف ان واقعات کی بنا پر اس کی ساری زندگی یا اس زمانہ کے سارے مذاق کو بدل دینا اس دور کی تاریخ کو مسخ کرنے کے مرادف ہے۔

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی لٹریچر اوّل تو کوئی دیکھتا نہیں اور اگر کوئی دیکھتا ہے تو وہ بھی مخالف ہی کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ اسلام کے واضح اور کھلے ہوئے حقائق ہر روز نظری مسائل بنتے چلے جاتے ہیں اسلامی ذہنیت بدل لینے کا یہ پہلا نقصان ہے اور ہر نقصان جو اس کے بعد ہے وہ اس سے شدید تر ہے۔

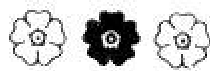
لمثل هذا يذوب القلب من كمد
ان كان فى القلب اسلام و ايمان



ائمہ اربعہ اور بعض ان مشہور محدثین کے تذکرے جن کی تصنیفات اس مجموعہ کی زمین اور مآخذ ہیں

اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ ان مقتدر ہستیوں کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے جن کے خزانوں سے لے کر حدیث کے یہ موتی آپ کے سامنے بکھیرے گئے ہیں- اس مرحلے پر یہ کیسے ممکن تھا کہ ائمہ اربعہ کا تذکرہ نہ آتا کہ درحقیقت یہی حضرات ان تمام محدثین اوران کی مؤلفات گرامی کا اصل سرچشمہ ہیں- یہاں یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ یہ تذکرے ان شخصیات بارزہ کے صرف تعارف کی حد تک ہیں- ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات یا ان پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں کہ اس کے لیے بڑی فرصت درکار ہے- پھر یہ اس کا محل بھی نہیں- ہاں ان مختصر تر تذکروں سے اجمالاً یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جن بزرگوں کے حفظ، دیانت وعبادت، عادت واخلاق، عقل وفہم کا حال یہ ہو ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں کے یہ عظیم الشان دفتر کس وزن اور مرتبہ کے ہو سکتے ہیں، چونکہ اصل مقصد حدیث اور حاملین حدیث کی وقعت ذہن نشین کرنا ہے اس لیے ہم نے اپنے نزدیک جو ایک نکھری ہوئی حقیقت تھی اس کو سامنے رکھ دیا ہے، اس سے قطع نظر کہ اس سے پہلے اس باب میں دنیا کے خیالات کیا تھے اور آئندہ اس پر کس انداز کی تنقیدیں ہوں گی- ہمارے دل کی گہرائیوں میں اس مؤقر جماعت کی عقیدت ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ان کا عقیدت مند بنا دیں- امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا تذکرہ نسبتہً بسیط ہو گیا ہے یہ صرف عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت کی بناء پر کثرتِ تبعین اگر انبیاء علیہم السلام کے لیے وجہ فخر ہو سکتی ہے تو یہ فخر امام صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حاصل ہے- اس کے ساتھ جتنے ائمہ ہدیٰ ہیں وہ سب ہمارے نزدیک آفتاب و ماہتاب ہدایت ہیں- ان سب کی محبت سے الحمدللہ کہ ہمارا قلب معمور ہے اور یہی درخواست اپنے قارئین کرام سے بھی ہے، فقیہانِ ذی شان ہوں یا محدثین والا مقام، علماء ہوں یا فقراء ان کے درمیان فرقِ مراتب کی بحثوں میں پڑنا گروہ بندی کی بنیاد ہے اور اگر حد سے تجاوز ہو جائے تو گمراہی بھی ہے، نہ تو یہ اپنا مشغلہ ہے نہ دوسروں کو اس کی تعلیم دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان تذکروں میں جرح وقدح کا حصہ بہت ہی کم ہے- ان تذکروں کو بصیرت اور عقیدت کے ساتھ پڑھئے تاکہ اس امت کے بعد والوں کو معلوم ہو جائے کہ اس کے پہلے کیسے تھے۔

اولئک ابائی فجئنی بمثلھم اذا جمعتنا یا جریر المجامع



ابوحنیفۃ الامامؒ

ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ

شجرہ نسب ✲ مؤرخ ابن خلکان نے امام اعظمؒ کا شجرہ نسب اس طرح نقل کیا ہے: ''ابوحنیفۃ النعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ-'' اور زوطی کو زاء کے پیش اور طاء کے زبر اور آخر میں یاء مقصورہ کے ساتھ ضبط کیا ہے-لیکن امام صاحب کے پوتے نے جو شجرۂ نسب اپنے دادا کا خود بیان کیا ہے وہ اس طرح ہے اسمٰعیل بن حماد بن النعمان بن ثابت بن النعمان بن المرزبان-

علامہ شبلی کا خیال یہ ہے کہ جب زوطی اسلام لائے ہوں گے تو ان کا نام نعمان رکھ دیا گیا ہوگا اس لیے جب اسمٰعیل نے اپنا شجرہ نسب بیان کیا تو اپنے دادا کے اسلامی نام ہی کا ذکر کیا ہے-

صحیح روایات کی بناء پر یہ طے شدہ ہے کہ امام صاحب کے والد ماجد کی ولادت اسلام ہی پر ہوئی ہے-خطیب بغدادی نے جو کچھ اس کے خلاف لکھا ہے وہ محض بے اصل اور ان کے مشہور تعصب پر مبنی ہے- غالبًا اسی خیال کی تائید کے لیے انہوں نے حسب ذیل روایت بھی نقل کی ہے-

کان ابو حنیفۃ اسمہ عتیک بن زوطرۃ فسمی نفسہ النعمان و اباہ ثابتا.	ابوحنیفہ کا نام عتیک اور ان کے والد کا زوطرہ تھا پھر انہوں نے اپنا نام نعمان اور اپنے والد کا ثابت بدل دیا تھا-

اس کا راوی ''الساجی'' مختلف فیہ ہونے کے علاوہ مشہور متعصب ہے تاہم اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو غالبًا ثابت کو زوطرہ ان کے والد زوطی کی مناسبت سے کہا گیا ہوگا-

ہمارے نزدیک نام ونسب کے فیصلہ کے لیے سب سے زیادہ معتبر شہادت خود اہل خاندان ہی کی ہو سکتی ہے لہٰذا یہاں اسمٰعیل کے بیان کے خلاف جو بیانات بھی ہیں وہ سب مرجوح یا قابل توجیہ ہوں گے- اسمٰعیل یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ ہمارے پردادا ثابت زمانہ طفولیت میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے آپ نے ان کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعاء برکت فرمائی تھی اور ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ دعاء ہمارے حق میں ضرور قبول ہوئی ہوگی-وہ کہتے ہیں کہ ثابت کے والد نعمان وہی ہیں جو حضرت علیؓ کی خدمت میں ہدیہ لے کر حاضر ہوئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظمؒ کے خاندان کو حضرت علیؓ سے ہمیشہ خاص تعلق رہا ہے اور اسی بنا پر انہوں نے ثابت اور ان کی اولاد کے لیے خصوصیت سے دعا فرمائی ہوگی- اسمٰعیل یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہم فارسی النسل ہیں ہمارے باپ دادے سب آزاد لوگ تھے اس کے بعد قسم کھا کر کہتے ہیں-

و اللہ ما وقع علینا رق قط.	خدا کی قسم ہے غلامی کی ذلت میں ہم کبھی مبتلاء نہیں ہوئے-

ان کے اس تاکیدی بیان سے اس غلط شہرت کی تردید ہوتی ہے جو امام صاحب کے دادا کے متعلق پیدا ہوگئی تھی کہ وہ بنی تیم اللہ کے آزاد کردہ غلام تھے-اسمٰعیل امام اعظمؒ کے پوتے ہیں' اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کو اپنے دادا کے حالات کی بھی پوری تحقیق نہ ہوگی- اسلامی عہد میں رقیت کی غلط فہمی پیدا ہو جانا وہ بھی عجم کے نسب میں کچھ بعید نہیں ہے اور واقعہ کی حقیقت منکشف ہو

جانے کے بعد غلط فہمیوں کے اسباب بیان کرنے کی مفت دردسری اٹھانا بھی غیر ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک اس افواہ کو شہرت دینے میں بہت بڑا دخل اس خلش کو بھی ہے جو امام اعظمؒ سے رقابت کے سلسلہ میں بعض علماء کو پیدا ہوگئی تھی۔ علامہ کوثری نے مشکل الآثار کی ایک روایت کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ کو مولیٰ حلیف کے معنی میں کہا گیا تھا۔ اگر بالفرض تاریخ سے صحیح طور پر آپ کا اولاد موالی ہونا ثابت ہو جاتا تو اسلامی نقطہ نظر سے یہ اتنا بڑا عیب بھی نہ تھا جس کی مدافعت کرنا ہمارے لیے ضروری ہوتا لیکن افسوس یہ ہے کہ عصبیت کی آنکھ جب خشم آلود ہو جاتی ہے تو وہ کوئی ہنر اپنے حریف میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

مولد و مدفن ٭ آپ کی پیدائش کوفہ میں اور وفات بغداد میں ہوئی ہے۔ علمی پایہ کے لحاظ سے کوفہ ہمیشہ ممتاز شہر رہا ہے علامہ کوثری نے نصب الرایہ کے مقدمہ میں اس کی مختصر تاریخ لکھی ہے ہم اس کا خلاصہ یہاں درج کرتے ہیں۔

کوفہ ایک اسلامی شہر ہے جو عہد فاروقی کے ۱۷ھ میں بحکم امیر المومنین تعمیر کیا گیا تھا' اس کے اردگرد فصحاء عرب بسائے گئے اور ان کے تعلیمی نظم و نسق کے لیے سرکاری طور پر حضرت ابن مسعودؓ کو بھیجا گیا۔ ان کی علمی منزلت اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل کوفہ کو یہ لکھا تھا کہ ابن مسعودؓ کی مجھے یہاں خود بھی ضرورت تھی لیکن تمہاری ضرورت کو مقدم سمجھ کر تمہاری تعلیم کے لیے ان کو بھیج رہا ہوں' انہوں نے یہاں بیٹھ کر عہد عثمانؓ کے آخری دور تک لوگوں کو قرآن پاک اور دین کے مسائل کی تعلیم دی۔ ان کی تعلیمی جد و جہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض محدثین کے بیان کے مطابق اس نو آباد شہر میں چار ہزار علماء محدثین پیدا ہو گئے۔ حتیٰ کے جب حضرت علیؓ کوفہ میں داخل ہوئے تو علم کی یہ شان دیکھ کر بے ساختہ بول اٹھے۔ ''اللہ تعالیٰ ابن مسعودؓ کا بھلا کرے انہوں نے تو اس بستی کو علم سے بھر دیا۔'' کوفہ بحالت موجودہ ہی کیا کم تھا کہ اس مدینۃ العلم کی آمد نے اسے اور چار چاند لگا دیئے۔ ایک سعید بن جبیرؒ تنہا یہاں ابن عباسؓ کے علوم کا ایسا نسخہ موجود تھے کہ جب کوفہ والے ان کے پاس کوئی فتویٰ پوچھنے جاتے تو وہ فرماتے کیا تمہارے یہاں سعید بن جبیرؒ موجود نہ تھے یعنی ان کے ہوتے ہوئے یہاں آنے کی ضرورت نہ تھی۔

شعبیؒ کے علم کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابن عمرؓ جب ان کو مغازی پر بحث کرتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے میں ان غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہ چکا ہوں مگر ان کی یادداشت ان کو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔

ابراہیم نخعیؒ کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ اہل نقد کے نزدیک ان کے سب مراسیل صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ابو سعید خدریؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کا زمانہ پایا ہے ابو عمران نے ان کو اپنے زمانہ کے تمام علماء سے افضل کہا ہے۔ ۹۵ھ میں جب ان کی وفات ہوئی تو ابو عمران نے ایک شخص سے کہا آج تم نے سب سے زیادہ فقیہ شخص کو دفن کر دیا' اس نے کہا کیا حسن بصریؒ سے بھی زیادہ انہوں نے کہا ایک حسن بصریؒ سے نہیں بلکہ تمام اہل بصرہ' اہل کوفہ' اہل شام اور اہل حجاز سے بھی۔

شعبیؒ کہا کرتے تھے کہ ابراہیم فقہ کے گہوارہ میں تو پیدا ہی ہوئے تھے اس کے بعد وہ ہمارے پاس آئے اور ہماری وہ حدیثیں جو بے غبار تھیں اپنی فقہ میں شامل کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔

مسروق جو کبار تابعین میں ہیں فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا خلاصہ میں نے ان چھ اشخاص میں دیکھا۔ علی' عبد اللہ بن مسعود' عمر' زید بن ثابت' ابو الدرداء' اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین پھر نظر ڈالی تو ان سب کے علم کا

خلاصہ پہلے دو شخصوں میں پایا - حضرت معاذ بن جبلؓ نے جو زبان رسالت سے اعلم بالحلال والحرام کا تمغہ حاصل کر چکے تھے اپنے خاص شاگرد عمرو بن میمون کو حکم دیا تھا کہ تحصیل علم کے لیے تم حضرت ابن مسعودؓ کی خدمت میں کوفہ جاؤ۔

کوفہ کی علمی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مصر میں آنے والے صحابہ کی تعداد محمد بن ربیع جیزی اور سیوطی تین سو سے زیادہ پیش نہیں کر سکے - اس کے بالمقابل صرف ایک کوفہ میں عجلی پندرہ سو صحابہ کا قیام لکھ رہے ہیں جن میں ستر صحابہؓ بدری تھے، عراق کے بقیہ شہروں میں بسنے والے صحابہ کا ابھی ذکر نہیں ہے - (اور یہ تعداد بھی کم ہے ورنہ جو مقام مرکزی چھاؤنی بنا دیا گیا ہو معلوم نہیں کہ وہاں کتنے اور صحابہ کا گذر ہوا ہوگا) رامہرمزی اپنی کتاب ''الفاصل'' میں قابوس سے نقل فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا یہ کیا بات ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو چھوڑ کر علقمہؒ کے پاس جایا کرتے ہیں - یہ ابن مسعودؓ کے شاگرد تھے - فرمایا اے جانِ پدر! بات یہ ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو خود ان کے پاس مسائل دریافت کرنے کے لیے آتا دیکھتا ہوں - شریح جو یہاں کے قاضی تھے ان کے حق میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد ہے ''اے شریح اٹھو اور فیصلہ کرو کیونکہ تم عرب میں سب سے بڑھ کر قاضی ہو'' ان کے علاوہ تنیئیس اشخاص یہاں اور بھی ایسے موجود تھے جو صحابہ کی موجودگی میں اربابِ فتویٰ سمجھے جاتے تھے۔

اس دور کے بعد دوسرا دور ان حضرات کے تلامذہ کا شروع ہوتا ہے ان کا عدد بھی ہزاروں سے متجاوز تھا امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ دیر جماجم میں حجاج سے جنگ کرنے کے لیے ایک عبدالرحمٰن بن الاشعث کے ساتھ جو جماعت نکلی تھی اس میں چار ہزار کی تعداد صرف قراء تابعین کی تھی - رامہرمزی انس بن سیرین سے نقل کرتے ہیں جب میں کوفہ پہنچا تو اس وقت وہاں چار ہزار حدیث کے طلبہ اور چار سو فقہاء موجود تھے۔[1] نیز عفان بن مسلم سے ناقل ہیں کہ جب ہم کوفہ پہنچے تو ہم نے وہاں صرف چار ماہ اقامت کی - حدیث کا وہاں یہ چرچا تھا کہ اگر ہم ایک لاکھ حدیث لکھنا چاہتے تو لکھ لیتے مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیث ہی پر اکتفاء کیا اور صرف وہی حدیثیں جمع کیں جو جمہور کے نزدیک مسلم تھیں انتہی - اسی لیے مسلم ائمہ و حفاظ کو بھی طلب حدیث کے لیے کوفہ کا سفر کرنا ناگزیر ہو گیا تھا - اگر آج بھی آپ رجال کی کتابیں کھول کر بیٹھیں تو ہزاروں راوی آپ کو کوفہ کے نظر آئیں گے جن کی روایات سے صحیحین اور غیر صحیحین بھری پڑی ہیں - حتیٰ کہ خود امام بخاریؒ فرماتے ہیں میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں حدیث حاصل کرنے کے لیے کتنی بار کوفہ گیا ہوں۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ کو اگر مہبط وحی ہونے کا فخر حاصل تھا تو کوفہ کو ہزاروں صحابہؓ کے مرجع و مسکن ہونے کا بجا فخر حاصل تھا - یہی وجہ ہے کہ محدثین کو دیگر بلادِ اسلامیہ کے ساتھ اہل کوفہ کا تعامل بھی بڑی اہمیت سے نقل کرنا پڑا ہے - یہاں تک کہ امام

---

[1] یہ عفان بن مسلمؒ امام احمدؒ اور بخاریؒ وغیرہ کے شیخ ہیں - علی بن مدینی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی عادت تھی کہ اگر حدیث کے کسی حرف میں ان کو ذرا شبہ پڑ جاتا تو اسے سرے سے ترک کر دیا کرتے تھے - (تقریب) اب اندازہ فرمائیے کہ جب اس سخت شرط کے ساتھ پچاس ہزار حدیثوں کا ذخیرہ ان کو کوفہ میں مل سکتا ہے تو اب حدیث کے لحاظ سے کوفہ کا مرتبہ کیا ہوگا -

[2] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۱۹۴ -

ترمذی نے فقہ کا کوئی باب کم چھوڑا ہے جہاں اعتناء کے ساتھ اہل کوفہ کا مذہب نقل نہ کیا ہو۔

یہ ہے امام ابوحنیفہؒ کا مولد اور ان کا علمی گہوارہ جس کے آغوش میں رہ کر ان کی علمی پرورش ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جو فقہ اس سرزمین میں مدون کی گئی ہو وہ سرمو بھی کتاب و سنت سے تجاوز کر سکتی ہے۔

حلیہ و اخلاق ٭ خطیب بغدادی ابونعیم سے نقل کرتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ خوش رو، خوش لباس، خوشبو پسند کرنے والے، خوش مجلس، نہایت کریم النفس، اور اپنے رفقاء کے بڑے ہمدرد تھے۔ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قد میانہ تھا نہ بہت کوتاہ نہ زیادہ دراز، گفتگو نہایت شیریں، آواز بڑی دلکش اور بڑے قادر الکلام تھے۔ عمر، امام اعظمؒ کے پوتے فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کسی قدر دراز قامت تھے۔ آپ کے رنگ پر گندم گونی غالب تھی، اچھا لباس پہنتے عام طور پر اچھی حالت میں رہتے۔ خوشبو کا اتنا استعمال کرتے تھے کہ آپ کی نقل و حرکت کا اندازہ خوشبو کی مہک سے ہو جاتا تھا۔[1]

آپ ریشم کی تجارت کرتے تھے، قیس بن الربیع بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب مشائخ اور محدثین سے ایک رقم لے کر ان کے لیے بغداد سے سامان خریدتے اور کوفہ لا کر اسے فروخت کر دیتے اور سال بہ سال اس کا نفع اپنے پاس جمع رکھتے اور اس نفع سے محدثین کے خورد و نوش، لباس وغیرہ کی ضروریات مہیا کرتے اس سے جو بچ رہتا وہ ان کے حوالہ کر دیتے اور کہتے کہ اسے اپنی دیگر ضروریات میں صرف کر لو اور خدا کا شکر ادا کرو، میرے شکر کی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے یہ مال اپنے پاس سے تو تم کو دیا نہیں تمہارے ہی مال کا نفع ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ہے کہ اس نے اس کا ذریعہ مجھے بنا دیا ہے۔

حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ اہل مجلس میں سے ایک شخص پر امام صاحب نے خستہ لباس دیکھا اس سے کہا بیٹھ جاؤ۔ جب محفل برخاست ہوگئی اور یہ تنہا رہ گیا تو فرمایا مصلّیٰ اٹھا کر جو اس کے نیچے تم کو ملے وہ لے لو۔ اس نے جانماز اٹھائی تو نیچے ہزار درہم تھے، آپ نے فرمایا یہ لے لو اور اپنا لباس درست کر لو۔ وہ بولا میں خود صاحب وسعت ہوں، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، فرمایا تو پھر اپنا حال ایسا بناؤ کہ تمہیں دیکھ کر تمہارے بھائی کو غم نہ ہو کیا یہ حدیث تم کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر اپنے نعمت و کرم کے آثار دیکھنا پسند کرتا ہے۔

جعفر بن عون بیان کرتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے ایک ریشمین کپڑا آپ سے مانگا آپ نے ایک کپڑا اس کے لیے نکالا تو وہ بولی میں بڑھیا عورت ہوں اور یہ معاملہ امانت کا ہے، مناسب ہے کہ آپ کو جتنے میں پڑا ہے اسی قیمت میں میرے ہاتھ فروخت کر دیجئے فرمایا چار درہم دے دے۔ اس نے کہا بڑھیا کا مذاق نہ بنایئے اور ٹھیک ٹھیک قیمت بتا دیجئے۔ آپ نے فرمایا میں نے دو کپڑے خریدے تھے اور ایک ہی کپڑے سے چار درہم کم میری پوری قیمت وصول ہوگئی تھی۔ اب یہ کپڑا مجھے چار ہی درہم میں بچ رہا ہے۔[2]

ابن مبارک نے سفیان ثوریؒ سے پوچھا۔ ابوحنیفہؒ غیبت کرنے سے بہت دور رہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے دشمن کی غیبت بھی نہیں

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۳۳۰، ۳۳۱۔ [2] خطیب ج ۱۳ ص ۳۶۱ و ۳۶۲۔

کرتے - سفیانؒ نے جواب دیا ابوحنیفہؒ اس سے بالاتر ہیں کہ اپنی نیکیوں پر اپنے دشمن کو مسلط کریں - (کہ وہ قیامت کے دن اپنی غیبت کے بدلہ میں ان کی نیکیاں لے لے)[1]

اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت ہیں - مفصل تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں ان چند واقعات میں امام صاحب کی صرف ہمدردی اور مساوات قابل غور نہیں ہے - دنیا میں سخی اور کریم اور بھی گذرے ہیں دیکھنا تو یہ ہے کہ یہاں آپ نے صرف ہمدردی نہیں کی بلکہ بے منت ہمدردی کرنے کے اصول بھی بتلا دیئے - ہمدردی کا اخفاء' محتاج کی حاجت روائی کرنا پھر اس کو سبک روح رکھنا اور ایسے طریقے نکال لینا جن سے اپنے نفس کو محسن اور محتاج کو ندامت کا خطرہ بھی نہ گذر سکے - سردست اس کی حاجت رفع ہو جائے اور آئندہ کے لیے اس کو سوال کی عادتِ بد بھی نہ پڑنے پائے - یہ ایک قیمتی سبق ہے جو ان چند واقعات سے ہم کو ملتا ہے -

طبقہ امام اعظمؒ ❋ ابن خلکان لکھتا ہے کہ امام صاحبؒ نے چار صحابہؓ کو پایا ہے - انس بن مالکؓ اور عبداللہ بن ابی اوفیٰ کو کوفہ میں سہل بن سعد الساعدی کو مدینہ منورہ میں اور ابوالطفیل عامر بن واثلہ کو مکہ مکرمہ میں - حافظ ذہبی خود امام صاحب سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے انس بن مالکؓ صحابی کو بارہا دیکھا ہے - حافظ ابن حجرؒ ان کے ساتھ اور بہت سے دیگر حفاظِ حدیث نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی رؤیت تسلیم کی ہے - خلاف جو کچھ ہے وہ روایت کے ثبوت وعدم ثبوت میں ہے' ہمارے نزدیک ایک ایسے شخص کے متعلق جو صحابہؓ ہی کے عہد میں پیدا ہوا ہو رؤیت تو درکنار روایت کا دعویٰ بھی بعید نہیں بلکہ بہت ہی قرین قیاس تھا لیکن کیا کیا جائے جن پر امام صاحب کا اولادِ احرار ہونا بھی شاق ہو ان پر آپ کا طبقہ تابعین میں شمار ہونا کیوں شاق نہ ہوتا' اس لیے یہ بھی ایک معرکۃ الآراء مسئلہ بن کر رہ گیا ہے - متوسط قول یہ ہے کہ رویت سے تو انکار نہ کیا جائے اور روایت کا قطعی طور پر دعویٰ نہ کیا جائے - اس کے سوا جو کچھ ہے وہ افراط وتفریط کا میدان ہے -

تحصیل علم ❋ زفر بن ھذیل روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام اعظمؒ سے سنا ہے کہ مجھے علم کلام کا پہلے اتنا شوق تھا کہ میں اس علم میں شہرۂ آفاق ہو گیا تھا - حماد بن ابی سلیمان[2] کا حلقہ درس میرے قریب تھا - ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میرے پاس ایک عورت

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۳۶۳ -

[2] حماد ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص تلامذہ میں تھے - تاریخ اصبہان میں ابوالشیخ ذکر کرتے ہیں کہ ایک دن نخعی نے ان کو ایک درہم کا گوشت لانے کے لیے بازار بھیجا - زنبیل ان کے ہاتھ میں تھی ادھر سے ان کے والد کہیں گھوڑے پر سوار آ رہے تھے یہ صورت دیکھ کر انہوں نے ان کو ڈانٹا اور زنبیل لے کر ہاتھ سے پھینک دی - جب ابراہیم نخعی کی وفات ہوگئی تو حدیث کے طلبہ ان کے والد (مسلم بن یزید) کے دروازہ پر آئے اور دستک دی' یہ چراغ لے کر باہر نکلے تو انہوں نے کہا ہمیں آپ کی ضرورت نہیں - آپ کے فرزند حماد کی ضرورت ہے یہ خفیف ہو کر اندر تشریف لے آئے اور حماد سے کہا جاؤ بھئی باہر جاؤ' اب مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زنبیل کی بدولت ہی نصیب ہوا ہے - ابن عدی نے ''الکامل'' میں نقل کیا ہے کہ حماد فرماتے تھے میں قتادہ' طاؤس اور مجاہد سے ملا ہوں - جب ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے مسائل کا حل کس سے کیا کریں تو انہوں نے حماد ہی کا نام لیا تھا - (مقدمہ زیلعی)

آئی اوراس نے مجھ سے یہ مسئلہ دریافت کیا ایک شخص کی بی بی باندی ہے وہ سنت کے موافق اسے طلاق دینا چاہتا ہے کتنی طلاقیں دے؟ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کیا جواب دوں- میں نے کہا حماد سے پوچھ اور واپس آکر مجھے بھی بتا- وہ حماد کے پاس گئی' انہوں نے فرمایا جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو جماع کرنے سے پہلے اسے صرف ایک طلاق دینا چاہیے- جب دو حیض اور گذر جائیں تو پھر وہ اپنا دوسرا نکاح کرسکتی ہے- اس نے واپس آکر مجھ سے ان کا جواب نقل کیا میں نے اپنے دل میں کہا کہ علم کلام بھلا کس کام کی چیز ہے اور اپنے جوتے اٹھا حماد کی خدمت میں حاضر ہو گیا وہ مسائل بیان کرتے' میں ان کو سنتا اور یاد رکھتا- جب دوسرے دن وہ تشریف لاتے پھر ان کا اعادہ فرماتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ میں نے ان مسائل کو صحیح ضبط کیا ہے اور ان کے دوسرے شاگردوں نے غلطیاں کی ہیں اس لیے انہوں نے فرمایا کہ میرے سامنے صدر مقام پر ابوحنیفہؒ کے سوا اور کوئی شخص نہ بیٹھے- دس سال مسلسل بلکہ ان کی وفات تک میں ان کے ساتھ رہا- حماد کے فرزند کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے والد کسی سفر میں باہر تشریف لے گئے تھے جب واپس تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ اس اثناء میں آپ کو زیادہ یاد کس کی رہی- میرا خیال تھا وہ یہی فرمائیں گے تیری لیکن انہوں نے ابوحنیفہؒ کا نام لیا اور فرمایا کہ اگر مجھے یہ قدرت ہوتی کہ میں ابوحنیفہؒ سے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا-[1]

روایت مذکورہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کی عمر کا ابتدائی حصہ علم کلام میں صرف ہوا ہے اور زمانہ تلمذ سے ہی آپ کی کنیت ابوحنیفہؒ تھی یہ تحقیق نہیں ہوسکا کہ یہ کنیت امام صاحب نے خود اختیار کی تھی یا دوسروں نے آپ کی یہ کنیت مقرر کی تھی- اسی روایت سے امام صاحب کے صحت ذوق' سلامتی فطرت اور قوت حفظ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے- آپ کے صرف درس حدیث کے صدر نشین نہ ہونے سے یہ خیال قائم کر لینا کہ آپ کا حفظ کمزور تھا بہت سطحی نظر ہے-

مآخذ علم ❋ خطیب بغدادی روایت کرتا ہے کہ امیر المؤمنین ابوجعفر نے امام صاحبؒ سے پوچھا آپ نے کن صحابہ کا علم حاصل کیا ہے؟ فرمایا عمر بن الخطاب' علی بن ابی طالب' عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور ان کے شاگردوں کا- فرمایا' آپ نے تو بہت صحیح اور پختہ علم حاصل کیا' یہ ہستیاں بہت مبارک اور بڑی مقدس ہستیاں تھیں- حضرت عمرؓ کی شان تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ میرے بعد اگر کوئی شخص نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے- حضرت علیؓ تو وہ ہیں جن کو آپ نے خود اپنے دست مبارک سے قاضی بنا کر بھیجا تھا- رہ گئے عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ ان کی قرآن دانی اور قرآن فہمی امت میں ضرب المثل ہو چکی ہے اب سوچیے کہ جو علم اتنے جامع اور مضبوط مآخذ سے حاصل کیا گیا ہوگا وہ کتنا عمیق اور کتنا مستحکم ہوسکتا ہے- نفسیاتی طریق پر بھی مسائل حنفیہ کا مرجع یہی اصحاب ہونے چاہئیں کہ کوفہ جو امام اعظمؒ کا مسکن تھا- حضرت عمرؓ ہی کا بسایا اور آباد کیا ہوا تھا پھر جو صحابیؓ اہل کوفہ کی تعلیم و تربیت کے لیے سرکاری طور پر مقرر کیے گئے وہ ابن مسعودؓ ہی تھے- حضرت علیؓ کا تو کوفہ دار الخلافت ہی رہ چکا تھا اس لیے اہل کوفہ کے لیے ان اصحاب میں علمی کشش کے علاوہ ایک فطری کشش بھی موجود

---

[1] تاریخ خطیب ج ۱۳ ص ۳۳۳ ، ۳۳۴-

تھی - کسی مجتہد کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ اس کے استفادہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہر ہر جزئی میں ایک مقلد کی طرح اتباع کرتا ہوگا انتہا درجہ کی ناواقفی ہے بلکہ اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ ان کے زیر تربیت رہ کر اس کا جو علمی مذاق اور انداز طبیعت قائم ہو چکا تھا' وہ ان حضرات ہی سے ملتا جلتا تھا - اس کے اصولِ استنباط' اصولِ فکر' مصالح ومضار پر غور وخوض کا زاویہ نظر سب ان ہی سے متحد تھا - اس لیے دونوں کے مجتہدات اور مسائل میں ایک قسم کی یک رنگی اور یکسانیت پیدا ہو جانا بھی ضروری امر تھا -

اصول وعقائد ✱ یحیٰ بن ضریس کہتے ہیں میں سفیانؒ کے پاس حاضر تھا ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آپ کو امام صاحب پر کیا اعتراض ہے؟ انہوں نے فرمایا اعتراض کیا ہوتا میں نے تو خود انہیں یہ فرماتے سنا ہے کہ میں سب سے پہلے قرآن کو لیتا ہوں اگر کوئی مسئلہ اس میں نہیں ملتا تو پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کرتا ہوں - اگر کتاب اللہ اور حدیث رسول دونوں میں نہیں ملتا تو پھر میں آپ کے صحابہؓ کے اقوال تلاش کرتا ہوں اور ان میں جو زیادہ پسند آتا ہے اسے اختیار کر لیتا ہوں مگر ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتا ہاں جب تابعین کا نمبر آتا ہے تو پھر ان کا اتباع کرنا لازم نہیں سمجھتا جیسا انہوں نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کر لیتا ہوں -[۱]

ابو یوسف روایت کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا خراسان میں دو قسم کے لوگ سب سے بدتر ہیں - جہمیہ اور مشبہہ - ابو یوسفؒ سے دوسری جگہ اس طرح منقول ہے کہ امام صاحب جہم بن صفوان کی مذمت کیا کرتے تھے اور اس کی باتوں پر نکتہ چینی فرماتے تھے - عبدالرحمٰن حمانی کہتے ہیں - میں نے ابو حنیفہؒ کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جہم بن صفوان کافر ہے[۱] یحیٰ بن نصر کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ شیخین کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے تھے ختنین سے محبت رکھتے تھے' تقدیر کے قائل تھے اور اس میں کوئی مین میخ نہیں نکالتے تھے' مسح علی الخفین کرتے تھے اور اپنے زمانہ کے سب سے بڑے اور متقی عالم تھے -[۲] ابو سلیمان جوزجانی اور معطی بن منصور رازی کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ میں کسی نے قرآن کے مخلوق ہونے کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا ہاں بشر مریسی اور ابن ابی داؤد نے اس مسئلہ میں بحث شروع کی اور انہوں ہی نے امام صاحبؒ کے تلامذہ کو بدنام کیا -[۳]

محدثین کی نظروں میں امام اعظمؒ کی ثقاہت ✱ امام ابو داؤدؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ مالکؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے وقت کے امام تھے شافعیؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے وقت کے امام تھے' ابو حنیفہؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے زمانہ کے امام تھے -[۴] امام احمدؒ جب کبھی امام ابو حنیفہؒ کے کوڑے کھانے اور قضاء قبول نہ کرنے کا واقعہ ذکر فرماتے تو رو پڑتے تھے اور امام صاحب کے لیے دعاء رحمت فرماتے -[۵]

حسن بن علی حلوانی شبابہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب کے بارے میں شعبہ اچھا خیال رکھتے تھے علی بن مدینی کہتے ہیں کہ امام صاحب سے ثوری' ابن مبارک' حماد بن زید' ہشیم' وکیع' عباد' جعفر بن عون جیسے اجلہ محدثین نے روایت کی ہے وہ ثقہ ہیں

---

۱ خطیب ج ۱۳ ص ۳۶۸ - ۱ ایضاً ج ۱۳ ص ۳۷۶ - ۲ ایضاً ج ۱۳ ص ۳۷۷ - ۳ ایضاً ج ۱۳ ص ۳۷۸ -

۴ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۶۳ - ۵ تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۶۴ -

ان کی روایت میں کوئی سقم نہیں- یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا اے ابوزکریا (ان کی کنیت ہے) کیا ابوحنیفہؒ حدیث کے بارے میں سچے شمار ہوتے تھے؟ انہوں نے فرمایا نہایت سچے اور بالکل صحیح روایت کرنے والے تھے- ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا گیا' کیا ابوحنیفہ کبھی خلافِ واقع بھی حدیث روایت کرتے تھے؟ فرمایا محدثین' ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کے حق میں بڑی زیادتی کرتے ہیں- ان کی شان اس سے کہیں ارفع واعلیٰ تھی-[1]

خطیب' یحییٰ بن معین سے نقل کرتا ہے کہ ابوحنیفہؒ کے نزدیک حدیث روایت کرنے کے لیے یہ شرط تھی کہ وہ سننے کے بعد سے برابر یاد رہنی چاہیے اگر یاد نہ رہے تو اس کو روایت کرنا درست نہ سمجھتے تھے- ایک مرتبہ امام صاحب کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا تو دوبار فرمایا ثقہ ہیں' ثقہ ہیں- ایک مرتبہ یہ کہا کہ حدیث وفقہ میں ثقہ اور سچے ہیں اور خدا کے دین کے بارے میں بھروسہ کرنے کے قابل ہیں-[2] خارجہ بن مصعب اور ابووہب عابد کہتے ہیں کہ جو شخص مسح علی الخفین کا قائل نہ ہو یا ابوحنیفہؒ پر نکتہ چینی کرے وہ بلاشبہ ناقص العقل ہے-[3] حافظ ابن حجر شافعی نے امام صاحب کے مناقب نقل کر کے یحییٰ بن معین سے اس کے خلاف کوئی نقل پیش نہیں کی اور آخر تذکرہ میں لکھا ہے کہ امام صاحبؒ کے مناقب بہت ہیں اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور جنت فردوس میں ان کو جگہ دے- ذہبی نے مناقب امام پر مستقل ایک تصنیف لکھی ہے-

فقہ حنفی کا امتیاز ٭ اس عنوان پر علامہ کوثری مصری نے زیلعی کے مقدمہ میں ایک مختصر مقالہ سپرد قلم کیا ہے' ہم یہاں اس کا اختصار ہدیہ ناظرین کرتے ہیں-

فقہ حنفی صرف ایک شخصی رائے نہیں بلکہ چالیس علماء کی جماعت شوریٰ کی ترتیب دادہ ہے- امام طحاویؒ اسناد کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب کی یہ جماعت شوریٰ چالیس افراد پر مشتمل تھی جن میں ممتاز ہستیاں یہ تھیں- ابویوسف' زفر بن الہذیل' داؤد الطائی' اسد بن عمرو' یوسف بن خالد السمتی (یہ امام شافعیؒ کے شیوخ میں ہیں) یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدۃ- خطیب نے امام ابویوسفؒ کے تذکرہ میں ان اسماء کا اور اضافہ کیا ہے- عافیہ ازدی' قاسم بن معن' علی بن مہر' حبان' مندل-

اسد بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب کی خدمت میں پہلے ایک مسئلہ کے مختلف مختلف جوابات پیش کیے جاتے پھر جو اس کا سب سے زیادہ تحقیقی جواب ہوتا آپ ارشاد فرماتے اسی طرح ایک ایک مسئلہ تین تین دن زیر بحث رہتا- اس کے بعد کہیں وہ لکھا جاتا تھا- صمیری بیان فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ امام صاحب کے ساتھ مسائل میں بحث وتمحیص کرتے اگر اس وقت قاضی عافیہ بن یزید موجود نہ ہوتے تو آپ فرماتے' ان کے آنے تک ابھی مسئلہ کا فیصلہ ملتوی رکھو جب وہ تشریف لے آتے اور وہ بھی دوسروں کی رائے سے اتفاق کر لیتے تو امام صاحبؒ فرماتے اب اس کو لکھ لو- جب تک مسئلہ تحقیق وتفتیش کے یہ مراحل طے نہ کر لیتا آپ اس کو لکھنے سے منع کرتے- یحییٰ بن معین ''التاریخ والعلل'' میں لکھتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے ایک دن امام ابویوسفؒ سے فرمایا اے یعقوب جو کچھ مجھ سے سنا کرو اسے فوراً ہی نہ لکھ لیا کرو کیونکہ کبھی ایک مسئلہ کے متعلق میری رائے آج کچھ

---

۱ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹- ۲ خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۹ و ۴۲۰- ۳ ایضاً ج ۱۳ ص ۳۶۴ و ۳۶۸-

ہوتی ہے اور کل کچھ ہو جاتی ہے- اس روایت سے موفق مکی کے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ امام صاحب کا مسلک شورائی مسلک ہے- اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اپنے تلامذہ پر اپنے مسائل تسلیم کرنے کے متعلق کبھی جبر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس کی پوری آزادی دی کہ وہ بہت خوشی سے اپنی اپنی رائیں پیش کریں پھر اس پر خوب جرح وقدح ہو' اس کے بعد اگر سمجھ میں آ جائے تو اس کو قبول کر لیں-

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کی مجلس شوریٰ نقلی وعقلی ہر دو لحاظ سے بہت مکمل مجلس تھی- اس میں اگر حفاظ ومحدثین' عربیت وتفسیر کے جاننے والے شامل تھے تو زفر بن ہذیل جیسے میزان عقل پر تولنے والے بھی موجود تھے- ان ہی اہل علم وفہم علماء کے تبادلہ خیالات کا نتیجہ تھا کہ مسئلہ کا ہر پہلو اتنا صاف ہو جاتا تھا اس کے مصالح ومضار سب اس طرح سامنے آ جاتے تھے کہ زمانہ کی ہر ضرورت کی اس میں پوری پوری رعایت ہو جاتی تھی-

خطیب امام ابو یوسفؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کسی شخص نے وکیع سے کہا ابو حنیفہؒ نے اس مسئلہ میں غلطی کی ہے- وکیع نے فرمایا ابو حنیفہ غلطی کیسے کر سکتے ہیں جب کہ ان کے ساتھ ابو یوسفؒ وزفرؒ جیسے قیاس کے ماہر' یحییٰ بن ابی زائدہ' حفص بن غیاث' حبان ومندل جیسے حفاظِ حدیث اور قاسم بن معن جیسے لغت وعربیت کے جاننے والے- داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد ومتقی شامل ہوں- اگر وہ غلطی کھائیں گے تو کیا یہ لوگ ان کی اصلاح نہ کریں گے- دراصل فقہ حنفی کی عام مقبولیت کا منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا مگر اس کا یہی کمال محدثین کی نظروں میں موجب نقصان بن گیا تھا- ظاہر ہے کہ عام محدثین کا طور فکر بالکل اس سے جداگانہ تھا- وہ اس تمام غور وخوض کو رائے کی مداخلت تصور کرتے تھے اور وہ اس میں بڑی حد تک معذور بھی تھے' کیونکہ آئین شریعت کی اس طرح ترتیب وتشکیل کا امت میں یہ پہلا قدم تھا اسے اوپری نظروں سے دیکھا جانا چاہیے تھا- یہ دوسری بات ہے کہ پھر شدہ شدہ دوسرے اماموں کو بھی اسی ترتیب کی ضرورت محسوس ہوئی حتیٰ کہ کوئی امام ایسا نہیں رہا جس کی فقہ بالآخر اسی مرتب شکل پر نہ آ گئی ہو مگر ''البادی اظلم'' کے قاعدہ کے موافق اصحاب[۱] الرائی کا اوّلین مخاطب صرف حنفیہ رہ گئے-

یہ مسئلہ بہت اہم اور طویل الذیل ہے کہ فقہ حنفی کے امتیازی اصول کیا کیا ہیں اور کیا ان کو مداخلت رائے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے- ان تمام کا استقصاء اس مختصر تذکرہ میں نہیں کیا جا سکتا- مثال کے طور پر یہاں ہم صرف ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد آپ فقہ حنفی کی گہرائی معلوم کر سکیں گے اور اس کے بعد یہ یقین کرنا بھی آسان ہو جائے گا کہ محدثین کی فقہ حنفی سے برہمی اور حنفیہ کی معذوری دونوں اپنی اپنی جگہ بجا ہیں' امام شاطبیؒ ابن عبدالبر سے نقل کرتے ہیں کہ بہت سے محدثین امام صاحب پر طعن کرنا اس لیے جائز سمجھتے تھے کہ ان کے نزدیک آپ نے بہت سی صحیح اخبارِ آحاد کو ترک کر دیا تھا- حالانکہ امام

---

[۱] ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن جو امام مالکؒ کے استاد ہیں اپنی اسی خدمت کی وجہ سے ربیعۃ الرائی کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے عبدالعزیز بن ابی سلمۃ کہتے تھے اے اہل عراق تم تو ربیعۃ الرائی کہتے ہو اور خدا کی قسم ہے میں نے ان سے بڑھ کر کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا- ابن سعد فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ اور کثیر الحدیث شخص تھے مگر اس کے باوجود ان کی طرف رائے کی نسبت اتنی مشہور ہو گئی تھی کہ ان کا لقب ہی ربیعۃ الرائی پڑ گیا تھا-

صاحب کا ضابطہ یہ تھا کہ آپ پہلے خبر واحد کا اس باب کی دوسری احادیث کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے۔ قرآن کریم کے بیان سے بھی ان کو ملاتے، اگر وہ قرآن کریم اور ان احادیث کے بیان کے مطابق ہو جاتیں تو ان پر عمل کر لیتے ورنہ انہیں شاذ قرار دیتے اور عمل نہ کرتے ۔[1]،،

انصاف کیجئے کہ ایک آئینی نظر کے لیے آئین سازی کا یہ کتنا صحیح راستہ تھا مگر جن مزاجوں میں معیارِ صحت صرف اسناد ٹھہر گیا ہو وہ اس کا نام صحیح احادیث کا ترک رکھ لیتے تھے۔ اس کی بہت مشہور مثال حدیث مصراۃ ہے حنفیہ پر اس مسئلہ کی وجہ سے ہمیشہ لے دے کی گئی اور یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے محض اپنی رائے سے اس حدیث کو ترک کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر حنفیہ نے تاوان کے وسیع باب میں، اس قسم کا تاوان کہیں نہ دیکھا اور اس لیے یہاں بھی اس باب کے عام ضابطہ ہی پر عمل کر لیا تو کچھ بے جا بھی نہیں کیا۔ بقول حافظ ابوعمرو کون ایسا ہے جس نے ہر باب کی ہر حدیث کو من وعن تسلیم کیا ہو، اپنے استقراء واجتہاد کے بعد جب ایک حدیث کو مختار و معمول بہ بنالیا گیا ہے تو اس کی مخالف حدیث میں سب نے تاویل وتوجیہ جائز قرار دی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حنفیہ نے اکثر مواضع میں اصول کو جزئیات پر قربان نہیں کیا۔ جب کسی بات میں ان کے نزدیک صاحب شریعت سے ایک قاعدہ کلیہ ثابت ہو گیا تو پھر انہوں نے اس کے برخلاف جزئیات کو عموماً قابل تاویل سمجھا ہے۔ مثلاً انسانی حاجت کے لیے بیٹھنے کا ایک آئین یہ ہے کہ قبلہ کو اپنے سامنے یا پشت کی جانب نہ رکھنا چاہیے۔ اس ضابطہ کو حنفیہ نے پہلے منقول اور معقول ہر طریق پر جانچا تولا جب ان کے نزدیک ادب واحترام کا یہ آئین ثابت ہو گیا تو حضرت ابن عمرؓ کے صرف ایک جزئی واقعہ کی بنا پر کہ انہوں نے ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قضاء حاجت کے لیے قبلہ کی جانب پشت کیے ہوئے بیٹھے دیکھا تھا۔ اس ضابطہ کلیہ کی تاویل نہیں کی بلکہ اس واقعہ ہی کی کوئی توجیہ کر لینا زیادہ مناسب سمجھا۔

دوسری مثال نماز میں بات کرنے کا مسئلہ ہے۔ عام طور پر احادیث سے نماز میں بات کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہاں کسی استثناء کی طرف ادنیٰ اشارہ نہیں ملتا صرف ایک ذوالیدین کی حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نماز میں کسی کو سہواً اور کسی کو عمداً کچھ بات چیت کرنے کی نوبت آگئی تھی اس کے باوجود ان کی نمازوں کو فاسد نہیں سمجھا گیا۔ دیگر ائمہ نے اس ایک جزئی واقعہ کی وجہ سے اصل قاعدہ ہی کی تخصیص وتوجیہ شروع کر دی ہے حنفیہ نے یہاں بھی قاعدہ میں کوئی تخصیص نہیں کی بلکہ اس کو بدستور اپنے عموم پر قائم رکھا ہے اور اس ایک واقعہ ہی کی کوئی توجیہ یا تاویل کرنا مناسب خیال کیا ہے۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جہاں حنفیہ نے قاعدہ کلیہ کے مقابلہ میں جزئیات ہی کی تاویل کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ضابطہ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور جزئیات منتشر، اس لیے تاویل کرنے والوں کی صف میں زیادہ پیش پیش حنفیہ ہی نظر آنے لگے اب آپ کو اختیار ہے کہ اس کا نام ترکِ حدیث رکھ لیجئے یا عمل بالحدیث رکھئے۔ اسی قسم کے امتیازات ہیں جن کی بنا پر ہر دور میں امت کا نصف حصہ اسی فقہ پر عمل پیرا رہا ہے اور اسی اصولی نظر کی وجہ سے حنفی فقہ میں اتنی لچک ہے کہ اتنی دوسری فقہ میں نہیں اگر علماء انسانوں کی

---

[1] الموافقات ج ۳ ص ۲۴۔

ضرورت اور دین حنیف کی سہولت دونوں کو پیش نظر رکھتے تو ان کو حنفی کتاب الحیل پر اتنا غصہ نہ آتا اور نہ وہ حنفیہ کو محض رائے کا مقلد قرار دیتے۔

امام اعظمؒ کا علمی پایہ ٭ شداد بن حکیم فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ سے بڑھ کر میں نے کوئی عالم نہیں دیکھا۔ مکی بن ابراہیم نے امام صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ وکیع فرماتے ہیں میں کسی عالم سے نہیں ملا جو ابو حنیفہؒ سے زیادہ فقیہ ہو اور ان سے بہتر نماز پڑھتا ہو۔ نضر بن شمیل کہتے ہیں لوگ علم فقہ سے بے خبر پڑے ہوئے تھے' ابو حنیفہؒ نے آ کر انہیں بیدار کیا ہے۔ یحیٰی بن سعید القطان فرماتے ہیں ہم خدا کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے' واقعی بات یہ ہے کہ ابو حنیفہؒ سے بہتر فقہ ہم نے کسی کی نہیں سنی اور اس لیے ان کے اکثر اقوال ہم نے بھی اختیار کر لیے ہیں۔ یحیٰی بن معینؒ کہتے ہیں کہ فتوے میں یحیٰی بن سعید کوفیوں کا قول اختیار کیا کرتے تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں جسے علم فقہ میں مہارت حاصل کرنا ہو اسے لازم ہے کہ ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کو نہ چھوڑے کیونکہ تمام لوگ فقہ میں ان کے محتاج ہیں۔ یحیٰی بن معین کہتے ہیں کہ فقہ تو بس امام ابو حنیفہؒ ہی کی ہے۔ جعفر بن ربیع کہتے ہیں میں پانچ سال ابو حنیفہؒ کی خدمت میں رہا' ان جیسا خاموش انسان میں نے نہیں دیکھا۔ ہاں جب ان سے فقہ کا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو اس وقت کھل جاتے اور دریا کی طرح بہنے لگتے تھے۔ عبداللہ بن داؤد فرماتے ہیں کہ اہل اسلام پر فرض ہے کہ وہ اپنی نمازوں کے بعد امام ابو حنیفہؒ کے لیے دعا کیا کریں اور ان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے امت کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں اور مسائل فقہ جمع کر کے رکھ دیئے ہیں۔ روح بن عبادہ کہتے ہیں کہ میں ابن جریج کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انہیں امام صاحبؒ کی وفات کی خبر پہنچی۔ انہوں نے فوراً انا للہ کہا اور فرمایا افسوس کیسا عجیب علم جاتا رہا۔ اسی سال ابن جریج کا بھی انتقال ہوا ہے۔[1]

علم فقہ کا انتخاب ٭ جو شخص امام صاحبؒ کے مناظرات و حالات سے ذرا بھی واقف ہے وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ امام صاحب کو جمیع علوم میں پوری دستگاہ حاصل تھی۔ علم کلام سے آپ کی ابجد شروع ہوتی ہے اور حدیث و تفسیر و فقہ تو آپ کا مشغلہ ہی تھا۔ مورخ ابن خلکان آپ کے متعلق یہ لکھتا ہے۔ ''و لم یکن یعاب بشیء سوی قلة العربیة'' یعنی آپ پر قلت عربیت کے سوا اور کوئی نکتہ چینی نہیں کی گئی۔ اس کے اسباب بھی جو کچھ ہیں وہ تحقیق کے بعد کچھ نہیں رہتے لیکن ہم اس سلسلہ میں ان چند اسباب کو ظاہر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جن کی بنا پر امام صاحب نے دیگر علوم کی بجائے علم فقہ کو اپنا دائمی مشغلہ بنا لیا تھا۔ اگر چہ یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ جو شخص حدیث و قرآن نہیں جانتا وہ فقہ سے بھی کوئی مجتہدانہ مذاق نہیں رکھ سکتا۔

ہمارے نزدیک اس موقعہ پر اختیاری اسباب کے ساتھ کچھ قدرتی اسباب بھی ایسے پیدا ہو گئے تھے جن کی وجہ سے فقہ ہی آپ کا سب سے بڑا مشغلہ ہو جانا چاہیے تھا۔ مناقب موفق اور تاریخ خطیب میں مذکور ہے کہ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد علم فقہ کی مہارت کے لحاظ سے جن پر نظریں پڑتی تھیں وہ حماد بن ابی سلیمان مفتی کوفہ تھے جب تک یہ بقید حیات رہے لوگ ان کی وجہ سے

---

[1] خطیب مناقب امام۔

دوسروں سے بے نیاز رہے لیکن جب ان کی وفات ہوگئی تو اب اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی- کہ لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لیے ان کا کوئی دوسرا جانشین ہو ادھر ان کے تلامذہ کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ ان کے محترم استاد کا نام اور ان کا علم کہیں ختم نہ ہو جائے- حماد کے ایک فرزند تھے جو اچھے عالم تھے' ان پر اتفاق ہوگیا کہ انہیں اپنے والد کی مسند پر بٹھا دیا جائے- ابوبکر نہشلی اور ابو بردہ وغیرہ جو ان کے شاگرد تھے اب ان کے پاس آنے جانے لگے لیکن ان حضرات پر شعر وسخن کا ذوق غالب تھا یہ اس جگہ کو نبھا نہ سکے' پھر لوگوں کا خیال ابوبکر نہشلی کی طرف گیا ان سے درخواست کی گئی تو انہوں نے انکار کر دیا- اس کے بعد ابو بردہ کی خدمت میں یہ مسند پیش کی گئی مگر انہوں نے بھی انکار کیا- آخر کار لوگوں نے امام صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ علم فنا ہو جائے اس لیے ان کی درخواست کو منظور کر لیا اور مسند افتاء پر بیٹھ گئے- (مناقب موفق ج اص ا)

واقعہ یہ ہے کہ جب مفتی کوفہ کی مسند پر بیٹھنے کے لیے قدرت نے امام صاحب ہی کو انتخاب کیا ہو تو اس جگہ کوئی دوسرا کیسے بیٹھ سکتا تھا-

یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ امام ابوحنیفہ وہی ہیں جن کے سامنے جب منصب قضاء پیش کیا گیا تو ہر سختی و ذلت برداشت کرنے کے لیے تیار ہو گئے مگر منصب قضا قبول نہ کیا اور یہی ہیں کہ جب ان سے ایک آزاد علمی خدمت کی درخواست کی گئی تو فوراً قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے- بہر حال اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ اتفاقاتِ سماویہ کی بنا پر علم کی جو مسند امام صاحب کے لیے مخصوص ہو چکی تھی وہ علم نبوت ہی کی گہرائیوں میں شناوری کی مسند تھی- اس لیے قدرتی طور پر آپ کا مشغلہ فقہ ہی بن جانا چاہیے تھا-

حافظ ابن عبدالبرؒ، ابو یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے اعمش نے ایک مسئلہ دریافت کیا اس وقت میرے اور ان کے سوا وہاں کوئی اور موجود نہ تھا- میں نے اس کا جواب دیا انہوں نے فرمایا اے یعقوب یہ جواب تم نے کس حدیث سے اخذ کیا ہے؟ میں نے کہا اسی حدیث سے جو آپ نے مجھ سے بیان فرمائی تھی انہوں نے فرمایا یعقوب! یہ حدیث تو مجھے تمہاری پیدائش سے بھی پہلے سے یاد تھی مگر میں آج تک اس کا یہ مطلب نہ سمجھ سکا تھا-[1]

اسی قسم کا ایک واقعہ اعمش اور امام صاحب کے درمیان بھی پیش آیا ہے- عبیداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں اعمش کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا ایک شخص ان کے پاس آیا اور ایک مسئلہ دریافت کیا وہ اس کا جواب نہ دے سکے دیکھا تو وہاں ابوحنیفہؒ بھی بیٹھے ہوئے تھے فرمایا اے نعمانؒ اس کے متعلق تم کچھ بولو انہوں نے فرمایا اس کا جواب یہ ہے- اعمشؒ نے فرمایا کہاں سے کہتے ہو؟ امام صاحبؒ نے فرمایا اسی حدیث سے جو آپ نے ہم سے روایت کی تھی- اس پر اعمش نے کہا **نحن الصيادلة و انتم الا طباء** (تم لوگ اطباء ہو اور بھئی ہم تو عطار ہیں) یعنی عطار کے پاس صرف دواؤں کا سٹاک ہوتا ہے وہ اس کی ترکیب وخواص نہیں جانتا' اطباء ان کے اثرات اور ترکیب بھی جانتے ہیں-[2]

---

[1] خطیب ج ۱۳ص ۳۴۲- [2] جامع بیان العلم ج ۲ص ۱۳۰ و ۱۳۱-

خطیب بغدادی امام ابو یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ان سے اعمشؒ نے پوچھا کہ آپ کے استاد نے عبداللہ کا یہ مسئلہ کیوں ترک کر دیا کہ باندی کے آزاد ہونے سے اس پر طلاق ہو جاتی ہے' انہوں نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کی اسی حدیث کی بناء پر جو آپ نے ان سے بواسطہ ابراہیم واسود کے نقل فرمائی تھی کہ بریرہ جب آزاد ہوئیں تو ان کی آزادی طلاق نہیں سمجھی گئی بلکہ ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے پہلے نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں اس پر اعمش نے کہا بے شبہ ابو حنیفہؒ نہایت سمجھ دار شخص ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ اعمش کو امام صاحبؒ کا یہ استنباط بہت پسند آیا تھا۔[1]

امام ترمذیؒ اپنی جامع میں غسل میت کے مسئلہ کی تحقیق کرنے کے بعد فرماتے ہیں **و کذلک قال الفقهاء و هم اعلم بمعانی الحدیث** ۔ فقہاء نے اس حدیث کا یہی مطلب بیان کیا ہے اور حدیث کے مطالب یہی لوگ زیادہ سمجھتے ہیں۔

ان روایات سے ظاہر ہے کہ حدیث وفقہ دو علیحدہ چیزیں نہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ محدث کے نزدیک الفاظِ حدیث کا حفظ مقدم ہوتا ہے اور فقیہ کے نزدیک ان کے معانی کا فہم مقدم۔

نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ امام صاحب نے شغل فقہ صرف اُمت کے نفع کی خاطر اختیار فرمایا تھا اور بجا اختیار فرمایا تھا۔ الفاظ حدیث تو محفوظ ہو ہی چکے تھے اب جس خدمت کی ضرورت تھی وہ استخراج و استنباطِ مسائل اور ان کی آئینی تشکیل و ترتیب ہی کی تھی۔ محدثین ہزاروں موجود تھے لیکن فقہ کا یہ مقام خالی پڑا ہوا تھا اس لیے امام صاحب نے اس خالی گوشہ کو پر کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ امام صاحب فن حدیث وقرآن سے ناآشنا تھے۔ ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ محدثین اگر الفاظِ حدیث کے ذمہ دار ہیں تو فقہاء اس کے صحیح استعمال کے جاننے والے ہیں وہ عطار ہیں تو یہ اطباء فقہ کا تمام تار و پود قرآن و حدیث سے ہی قائم ہے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ کبار ائمہ کی قلت روایت کو ان کی علم حدیث سے بے بضاعتی کی دلیل سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ شریعت کا ماٴخذ کتاب وسنت ہی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی شرعی مسائل کے استنباط و ترتیب کا ارادہ کرے گا اس کے لیے کتاب و سنت کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ امام صاحب کی قلت روایت کا مبنیٰ اس علم سے بے بضاعتی نہ تھی بلکہ درحقیقت روایت و تحمل کے وہ شرائط تھے جن کا معیار آپ نے عام محدثین سے بہت بلند قائم کیا تھا۔ اس لیے آپ کے لیے روایت کا میدان بھی زیادہ وسیع نہیں رہا تھا۔ امام صاحب کے علم حدیث میں ماہر اور مجتہد ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ محدثین کے درمیان آپ کی فقہ ہمیشہ بنظر اعتبار دیکھی گئی ہے ایک طرف جہاں امام احمدؒ و امام شافعیؒ کا مسلک نقل کیا گیا ہے اسی کے پہلو بہ پہلو امام صاحب کا مسلک بھی نقل کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ محدثین کے نزدیک آپ کی فقہ بھی اسی درجہ پر معتبر تھی جیسا کہ دیگر فقہاء محدثین کی' خلاصہ یہ کہ ردوقبول کے اعتبار سے اس کا زیر بحث رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ کی فقہ بھی دیگر محدثین کی فقہ کی صف میں

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۳۴۱۔

رہنے کے قابل تھی - یہ دوسری بات ہے کہ اگر ایک جماعت اسے قبول کرتی رہی تو دوسری جماعت ترک کرتی رہی -[۱]

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کی صحیح مراد اور اس میں مسائل کے مآخذ امام صاحب سے زیادہ جاننے والا میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا بعض مرتبہ میں آپ کی رائے چھوڑ کر کسی حدیث کے ظاہر پہلو کو اختیار کر لیتا تو بعد میں مجھے تنبہ ہوتا کہ حدیث کی صحیح مراد سمجھنے میں امام صاحب کی نظر مجھ سے زیادہ گہری تھی -[۲]

اسرائیل جو مسلم ائمہ حدیث میں ہیں امام صاحب کی مدح میں بطریق تعجب فرماتے ہیں نعمان کیا خوب شخص ہیں جو احادیث مسائل فقہیہ سے متعلق ہیں وہ ان کو کیسی محفوظ ہیں اور کس خوب صورتی سے وہ ان سے مسائل فقہ استنباط فرماتے ہیں - یہی وجہ تھی کہ محدثین میں وکیع اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے اشخاص امام اعظم کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیتے تھے حافظ ابن عبدالبر، یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں -

و کان (وکیع) یفتی برأی ابی حنیفة و کان یحفظ حدیثه کله و کان قد سمع من ابی حنیفة حدیثا کثیرا.[۳]	وکیع امام صاحب کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے اور آپ کی روایت کردہ تمام حدیثیں یاد کیا کرتے تھے اور انہوں نے آپ سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں -

امام صاحب کے اساتذہ محدثین کی جو تعداد علماء نے لکھی ہے وہ ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن چونکہ دیگر محدثین کی طرح خود امام نے باضابطہ روایت حدیث کے حلقے قائم نہیں کیے اور ترویج فقہ کو ترجیح دی' اس لیے بعد کے زمانہ میں آپ کی شانِ محدثیت نظری بن کر رہ گئی -

محدثین کو امام صاحبؒ سے وجہ نکارت ✽ تاریخ کا یہ بھی ایک تعجب خیز ورق ہے کہ وہ ایک طرف تو امام صاحب کی تعریف و توصیف میں بکھری جاتی ہے' وہ جلی حروف میں یہ لکھ جاتی ہے کہ آپ عہد صحابہ میں پیدا ہوئے - ورع و تقویٰ' جود و سخا' علم و فضل' خرد و عقل کے تمام کمالات آپ میں جمع تھے - ائمہ میں امام اعظمؒ آپ کا لقب تھا - محدثین و علماء کا ایک جم غفیر ہمیشہ آپ کے زمرۂ مقلدین میں شامل رہا اور اُمت مرحومہ کا نصف سے زیادہ حصہ اب بھی آپ کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے اسی کے ساتھ وہ دوسرے ہی ورق پر دیانت و عقل کا کوئی عیب ایسا اٹھا کر نہیں رکھتی جو آپ کی ذات میں لگا نہیں دیتی -

خطیب بغدادی نے پورے سو صفحات پر امام صاحب کا تذکرہ لکھا ہے - پہلے امام صاحب کے مناقب میں صفحہ کے صفحہ رنگ دیئے ہیں اس کے بعد پورے ۵۴ صفحات پر آپ کی ذات میں وہ وہ نکتہ چینیاں نقل کی ہیں جو دنیا کے پردہ پر کبھی کسی بدتر سے بدتر کافر پر بھی نہیں کی جا سکتیں - ایک متوسط عقل کا انسان اس متناقض بیانات کو پڑھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کوئی انسان بھی ایسے دو متضاد صفات کا حامل نہیں ہو سکتا یا اس کے مناقب کی یہ تمام داستان فرضی ہے یا پھر عیوب کی یہ طویل فہرست صرف مخترع حکایات اور صریح بہتان ہے - مؤرخ ابن خلکان نے خطیب کے اس غلط طرز پر حسب ذیل الفاظ میں تنقید کی ہے -

---

۱ مقدمہ ص ۳۱۲ - ۲ خطیب ج ۱۳ ص ۳۴۰ - ۳ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹ -

و قد ذكر الخطيب في تاريخه منها شيئا كثير اثم اعقب ذلك بذكر ما كان الا ليق تركه و الا ضراب عنه فمثل هذا الامام لا يشك في دينه و لا في ورعه و لا في حفظه ولم يكن يعاب بشيء سوى قلة العربية. (ج ۲ ص ١٦٥)

یعنی خطیب نے اپنی تاریخ میں آپ کے مناقب کا بہت سا حصہ ذکر کیا ہے اس کے بعد ایسی ناگفتنی باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر نہ کرنا اور ان سے اعراض کرنا مناسب تھا کیونکہ امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جیسے شخص کے متعلق نہ دیانت میں شبہ کیا جا سکتا ہے، نہ حفظ و ورع میں آپ پر کوئی نکتہ چینی بجز قلت عربیت کے اور نہیں کی گئی۔

حافظ ابن عبد البرؒ مالکی کا کلام یہاں نہایت منصفانہ ہے کیونکہ تنقید کا یہ شاخسانہ صرف ایک امام صاحب کی ذات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اور ائمہ تک بھی پھیلتا چلا گیا ہے۔ اگر ذرا نظر کو اور وسیع کیجئے تو پھر صحابہ کا استثناء بھی مشکل نظر آتا ہے۔ غصہ اور مسرت انسانی فطرت ہے۔ ان دونوں حالتوں میں انسان کے الفاظ کا صحیح توازن قائم نہیں رہا کرتا اسی لیے غصہ کے حال میں فیصلہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے یہ صرف ایک نبی کی شان ہے جس کے منہ سے غضب و رضا کے دونوں حالوں میں جچے تلے الفاظ ہی نکلتے ہیں اب اگر انسانوں کے صرف ان جذباتی پہلوؤں سے تاریخ مرتب کر لی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پھر صحابہؓ کے الفاظ صحابہؓ کے متعلق اور ائمہ کے ائمہ کے متعلق بھی ایسے مل سکتے ہیں جن کے بعد امت کا یہ مقدس گروہ بھی زیر تنقید آ سکتا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے امام شعبی کا کیسا بصیرت افروز مقولہ نقل کیا ہے۔

قال الشعبي حدثنا هم بغضب اصحاب محمد (صلى الله عليه وسلم) فاتخذوه دينا[1]

شعبیؒ فرماتے ہیں ہم نے تو لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے باہمی غصہ کی حکایات نقل کی تھیں انہوں نے اٹھا کر انہیں عقائد کی فہرست میں داخل کر لیا ہے۔

اس کے سوا دوسری مشکل یہ ہے کہ محدثین کے جو مبہم الفاظ آج کتب میں مدون نظر آتے ہیں کسے فرصت ہے کہ ان کے اصل معنی سمجھنے کی کوشش کرے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے کہ ایک مرتبہ امام صاحب اعمش کی عیادت کے لیے گئے۔ اعمش نے کچھ روکھا پن دکھلایا اور امام صاحب کے متعلق کچھ غصہ کے الفاظ کہے۔ اس اخلاق پر اعمشؒ کا یہ رویہ آپ کو ناگوار گذرا اور گذرنا چاہیے تھا۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو فرمایا کہ اعمش نہ تو رمضان کے روزے رکھتا ہے اور نہ کبھی جنابت سے غسل کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی امام دین پر ان الفاظ کو کتنا ہی چسپاں کیجئے مگر چسپاں نہیں ہو سکتے اگر کہیں ان الفاظ کی تشریح ہمارے سامنے نہ ہوتی تو معلوم نہیں کہ اس مقولہ سے ہمارے خیالات کتنا کچھ پریشان ہو جاتے لیکن جب ان الفاظ کی مراد ہاتھ آ گئی تو آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہوا کہ ائمہ غصہ کے حال میں بھی ایک دوسرے کے متعلق عوام کی طرح بے سروپا کلمات منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ چنانچہ اسی واقعہ میں جب فضل بن موسیٰ سے اس کا مطلب دریافت کیا گیا (اس واقعہ میں وہ امام صاحب کے ساتھ ساتھ تھے) تو

---

[1] الروض الباسم ج ا ص ۱۴۸۔

انہوں نے فرمایا کہ اعمش التقاء ختانین سے غسل کے قائل نہ تھے بلکہ جمہور کے خلاف اسی مسئلہ پر عمل کرتے تھے جس پر کبھی ابتداء اسلام میں عمل کیا گیا تھا یعنی انزال کے بغیر غسل واجب نہیں ہوتا - اسی طرح بعض صحابہ کا مذہب یہ تھا کہ طلوع فجر کے بعد روشنی پھیلنے تک سحری کھانا درست ہے' ان دو مسئلوں کے لحاظ سے امام صاحب کی یہ دونوں باتیں بھی درست تھیں اور اعمش کا عمل بھی اپنے مختار کے مطابق درست تھا -[1]

اگر اسی طرح امام کے حق میں بھی بہت سے مشہور مقولوں کی مرادیں تلاش کی جائیں تو ہاتھ آ سکتی ہیں اور اس کے بعد اصل بات بھی اتنی قابل اعتراض نہیں رہتی جیسا کہ الفاظ کی سطح سے معلوم ہوتی تھی - کتب تذکرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے محدثین کی ناراضگی کا بڑا سبب صرف اختلاف مذاق تھا نہ کہ اختلاف مسائل امام صاحب کے دور تک عام مذاق یہ تھا کہ مسائل کے متعلق بہت ہی محدود پیمانہ پر غور و خوض کیا جاتا تھا' صرف پیش آمدہ واقعات کا شرعی حکم وہ بھی بڑی احتیاط کے ساتھ معلوم کر لیا جاتا اس کے بعد مسئلہ کی فرضی صورتوں سے بحث کرنا ایک لایعنی مشغلہ سمجھا جاتا تھا - خطیب بغدادی نے یہاں ایک بہت دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے -

نضر بن محمدؒ روایت کرتے ہیں کہ قتادہ کوفہ آئے اور ابو بردہ کے گھر اترے' ایک دن باہر نکلے تو لوگوں کی بھیڑ ان کے ارد گرد جمع ہو گئی - قتادہ نے قسم کھا کر کہا آج جو شخص بھی حلال و حرام کا کوئی مسئلہ مجھ سے دریافت کرے گا میں اس کا ضرور جواب دوں گا - امام ابوحنیفہؒ کھڑے ہو گئے اور سوال کیا اے ابوالخطاب (ان کی کنیت ہے) آپ اس عورت کے متعلق کیا فرماتے ہیں جس کا شوہر چند سال غائب رہا اس نے یہ یقین کر کے کہ اس کا انتقال ہو گیا ہے اپنا دوسرا نکاح کر لیا اس کے بعد اس کا پہلا شوہر بھی آ گیا اب آپ اس کے مہر کے متعلق فرمائیے کیا فرماتے ہیں اور جو بھیڑ ان کو گھیرے کھڑی تھی ان سے مخاطب ہو کر کہا اگر اس مسئلہ کے جواب میں یہ کوئی حدیث روایت کریں گے تو وہ غلط روایت کریں گے اور اگر اپنی رائے سے فتوی دیں گے تو وہ بھی غلط ہو گا - قتادہ بولے کیا خوب! کیا یہ واقعہ پیش آ چکا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا نہیں انہوں نے کہا پھر جو مسئلہ ابھی تک پیش نہیں آیا اس کا جواب مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو؟ امام صاحب نے فرمایا کہ ہم حادثہ پیش آنے سے قبل اس کے لیے تیاری کرتے ہیں تاکہ جب پیش آ جائے تو اس سے نجات کی راہ معلوم رہے - قتادہ ناراض ہو کر بولے خدا کی قسم ہے حلال و حرام کا کوئی مسئلہ اب میں تم سے بیان نہیں کروں گا - ہاں کچھ تفسیر کے متعلق پوچھنا ہو تو پوچھو' اس پر امام صاحب نے ایک تفسیری سوال کیا قتادہ اس پر بھی لاجواب ہوئے اور ناراض ہو گئے - آخر کار غصہ ہو کر اندر تشریف لے گئے -[2]

ابوعمرو نے سلف کے اس مذاق کی شہادت پر بہت سے واقعات لکھے ہیں اور بے شبہ علم و تقویٰ کے اس دور میں مناسب بھی یہی تھا لیکن جب مقدر یہ ہوا کہ علم کا بازار سرد پڑ جائے' ورع و تقویٰ کی جگہ جہل و فریب لے لے ادھر روزمرہ نئے سے نئے واقعات پیش آنے لگے تو اس سے پہلے کہ جہلا شریعت میں دست اندازی شروع کر دیں یہ بھی مقدر ہو گیا کہ شریعت کی ترتیب و

---

[1] دیکھو جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۷ - [2] خطیب ج ۱۳ ص ۳۴۸ -

تہذیب ایسے ائمہ کے ہاتھوں ہو جائے جنہوں نے صحابہؓ و تابعین کے دور میں پرورش پائی ہو' انصاف کیجئے اگر قتادہ کے زمانہ کی یہ احتیاط اسی طرح آئندہ بھی چلی جاتی تو کیا شرعی مسائل اسی ضبط و صحت کے ساتھ جمع ہو جاتے جیسا کہ اب جمع ہوئے - درحقیقت یہ امام صاحب کی بڑی انجام بینی اور امت کی بروقت دستگیری تھی کہ آپ نے ان کے سامنے شریعت کو ایک مرتب آئین بنا کر رکھ دیا' اسی لیے عبداللہ بن داؤد فرماتے تھے کہ امت پر آپ کا یہ حق ہے کہ وہ آپ کے لیے نمازوں کے بعد دعائیں کیا کریں - یہ خدمت اپنی جگہ خواہ کتنی ہی ضروری اور بروقت سہی مگر واقعہ یہ ہے کہ تھی محدثین کے مذاق کے خلاف - جس دور میں آثار و مرفوعات کو علیحدہ علیحدہ ضبط کرنا بھی عام دستور نہ ہوا اس دور میں صرف ابوابِ فقہیہ کی اونچی اونچی تعمیریں کھڑا کر دینا کب قابل برداشت ہو سکتا تھا - یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب مسائل منصوصہ سے آپ ذرا قدم اِدھر اُدھر ہٹائیں گے تو آپ کو اجتہاد سے کام لینا ہو گا - ایسے دور میں جہاں خاموشی کے ساتھ عمل کرنے کے علاوہ ایک قدم اِدھر اُدھر اٹھانا بھی قابل اعتراض نظر آتا ہو' احادیث و آیات کے اشارات' دلالات اور اقتضاء سے ہزاروں مسائل اخذ کر کر کے ان کو احادیث سے ایک علیحدہ شکل دے دینا کب گوارا کیا جا سکتا تھا - آخر جب آپ کا دور گذر گیا تو بعد کے علماء کے سامنے صرف پہلے علماء کی ان ناگواریوں کی نقل باقی رہ گئی - پھر استادی و شاگردی کے تعلقات نے حقائق کو ایسا پوشیدہ کر دیا کہ جس نے جہم کو کافر کہا تھا اُسے خود جہمی اور کافر کہا گیا - جس نے کتاب و سنت کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کرنے کی وصیت کی تھی اسی پر کتاب و سنت کی مخالفت کرنے کی تہمت رکھی گئی ہاں اگر خوش قسمتی سے ماحول کے تاثرات سے نکل کر کسی اللہ کے بندہ نے تحقیق کی نظر ڈالی تو بہت جلد اس کی آنکھوں سے یہ حجاب اٹھ گیا اور اس نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا ورنہ تاریخ ان ہی افواہوں پر چلتی رہی جو استادی و شاگردی کے انسلاک سے علماء کے حلقوں میں گشت لگا رہی تھی

واقعہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کی زندگی میں اس کے متعلق مختلف خیالات قائم ہو سکتے ہیں اور فیصلہ کی راہ آسانی سے نہیں نکل سکتی' بہت سی زبانیں اس کی موافقت اور بہت سی اس کی مخالفت میں بولتی ہیں تو اس کی وفات کے بعد جب کہ اس کی شخصیت بھی سامنے نہیں رہتی فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہو گا - اسماء الرجال کے فن میں تاریخ کی اس تاریکی کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ایک معتدل مزاج انسان کے لیے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل بھی نہیں رہا لیکن تاریخ کی جو نقول اوراق میں درج ہو چکی ہیں' اس سے ہر خیال کا انسان اگر مزاجی اعتدال نہیں رکھتا تو اپنے خیال کے موافق فائدہ اٹھانا اپنا فرض سمجھتا ہے اور اس لیے اسماء الرجال کی پیدا کردہ روشنی تاریخ کی پھیلائی ہوئی تاریکی کے دور کرنے میں بسا اوقات ناکام ہو کر رہ جاتی ہے - یہی وجہ ہے کہ جب آپ امام صاحب پر جرح کرنے والوں کی صف پر نظر ڈالیں گے تو ان میں زیادہ تر آپ کو وہی افراد نظر آئیں گے جو آپ کے عہد حیات کے بعد پیدا ہوئے ہیں یا نرے محدث ہیں' فقاہت سے زیادہ بہرہ ور نہیں صرف سنی ہوئی خبریں ان تک پہنچیں اور وقتی ماحول کی وجہ سے باور کر لی گئیں - یوں تو امام صاحب کے تلامذہ کا دائرہ بھی کچھ مختصر نہ تھا ایک ابوالمحاسن شافعی کی تحریر کی بنا پر ان کی جو تعداد نام و نسب کی قید کے ساتھ ثابت ہوتی ہے وہ نو سو آٹھ تک پہنچتی ہے لیکن ان میں اکثر شاگرد بسلسلہ فقہ تھے کاش آپ کا درسِ حدیث کا حلقہ بھی اسی پیمانہ پر قائم ہو جاتا تو شاید امام کی تاریخ کا نقشہ آج آپ کو کچھ دوسرا نظر آتا - چنانچہ جس حنفی نے بھی اس شغل کو قائم

رکھا ہے اس کے ساتھ تاریخ زیادہ بے دردی کا سلوک نہیں کرسکی-

ذیل کے ایک ہی واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ افواہ کیا ہوتی ہے اور جب حقیقت سامنے آجاتی ہے تو پھر اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے-

عبداللہ بن المبارکؒ کہتے ہیں کہ میں شام میں امام اوزاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے مجھ سے پوچھا اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی شخص پیدا ہوا ہے جس کی کنیت ابوحنیفہ ہے؟ یہ سن کر میں گھر واپس آیا اور تین دن لگ کر امام صاحب کے عمدہ عمدہ مسائل انتخاب کیے- تیسرے دن اپنے ہاتھ میں کتاب لے کر آیا یہ اپنی مسجد کے امام و مؤذن تھے انہوں نے دریافت کیا یہ کیا کتاب ہے میں نے ان کے حوالہ کر دی- اس میں وہ مسئلے بھی ان کی نظر سے گذرے جن کے شروع میں میں نے یہ لکھ دیا تھا ''اور نعمان اس کے متعلق یہ فرماتے ہیں'' اذان دے کر جب کھڑے کھڑے وہ کتاب کا ابتدائی حصہ دیکھ چکے تو کتاب اٹھا کر اپنی آستین میں رکھ لی، اور اقامت کہہ کر نماز پڑھی پھر نکالی اور پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ ختم کر دی پھر مجھ سے پوچھا اے خراسانی یہ نعمان کون شخص ہیں؟ میں نے عرض کیا ایک شیخ ہیں، ان سے عراق میں میری ملاقات ہوئی تھی، فرمایا یہ تو بڑے پایہ کے شیخ ہیں جاؤ ان سے اور علم سیکھو- اب میں نے کہا جی یہ تو وہی ابوحنیفہؒ ہیں جن کے پاس جانے سے بھی آپ نے مجھے منع کیا تھا- اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ امام صاحبؒ کے متعلق انہوں نے سن کیا رکھا تھا اور جب حقیقت سامنے آئی تو بات کیا نکلی اس لیے خارجی شہادات اور واقعات سے آنکھیں بند کر کے صرف کالے کالے حروف سے تاریخ مرتب کرنا کوئی صحیح عمل نہیں ہے- اس کے علاوہ انسان میں حسد و تنافس کا بھی ایک کمزور پہلو موجود ہے اس کی بدولت بہت سے تاریخی حقائق پوشیدہ ہو کر رہ گئے ہیں- سوء اتفاق سے یہاں یہ سب باتیں جمع ہوگئی ہیں-

عبداللہ بن المبارکؒ فرماتے ہیں، میں نے حسن بن عمارہؒ کو امام ابوحنیفہؒ کے گھوڑے کی رکاب پکڑے ہوئے دیکھا، وہ امام صاحبؒ کی توصیف کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ لوگ آپ کے متعلق صرف از راہِ حسد چہ میگوئیاں کرتے ہیں- حافظ ابن ابی داؤدؒ کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے والے دو ہی قسم کے لوگ ہیں یا حاسد یا ان کی شان سے ناواقف، میرے نزدیک ان دونوں میں ناواقف شخص پھر غنیمت ہے- وکیع کہتے ہیں کہ میں امام صاحبؒ کے پاس آیا دیکھا تو سر جھکائے کچھ فکرمند سے بیٹھے ہیں- مجھ سے پوچھا کدھر سے آرہے ہو میں نے کہا قاضی شریک کے پاس سے- آپ نے سر اٹھا کر یہ اشعار پڑھے-

ان یحمدونی فانی غیر لائمھم	اگر لوگ مجھ پر حسد کرتے ہیں تو کریں میں تو انہیں کچھ ملامت نہیں کروں گا-
قبلی من الناس اھل الفضل قد حسدوا	کیونکہ اہل فضل پر مجھ سے پہلے بھی لوگ حسد کرتے آئے ہیں-
فدام لی و لھم ما بی و ما بھم	میرا اور ان کا ہمیشہ یہی شیوہ رہے گا-
و مات اکثرنا غیظا بما یجد	اور ہم میں اکثر لوگ حسد کر کر کے مر گئے ہیں-

وکیع کہتے ہیں شاید امام صاحبؒ کو ان کی طرف سے کوئی بات پہنچی ہوگی اس لیے انہوں نے یہ اشعار پڑھے-

جعفر بن الحسن ابوعمر کے شیخ کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کو خواب میں دیکھا تو ان سے دریافت کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے

ساتھ کیا معاملہ کیا - فرمایا بخش دیا - میں نے کہا علم وفضل کے طفیل میں، کہا بھئی فتوی تو مفتی کے لیے بڑی ذمہ داری کی چیز ہے - میں نے کہا پھر - فرمایا لوگوں کی ان ناحق نکتہ چینیوں کے طفیل میں جو لوگ مجھ پر کیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ مجھ میں نہ تھیں - (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۶۶)

ابوعمر تحریر فرماتے ہیں کہ اصحاب حدیث نے امام صاحب کے حق میں بڑی زیادتی کی ہے اور حد سے بہت تجاوز کیا ہے آپ پر جو زیادہ سے زیادہ نکتہ چینی کی گئی ہے وہ صرف ان دو باتوں پر، ایک آثار کے مقابلہ میں رائے اور قیاس کا اعتبار کرنا، دوسری ارجاء کی نسبت حالانکہ جس جگہ امام صاحب نے کسی اثر کو ترک کیا ہے کسی نہ کسی موزوں تاویل سے کیا ہے - اس کی نوبت بھی ان کو اس لیے آئی ہے کہ انہوں نے مسائل میں بیشتر اپنے اہل بلد کا اعتبار کیا ہے جیسے ابراہیم نخعی اور ابن مسعودؓ کے تلامذہ اس سلسلہ میں مسائل کی صورتیں فرض کرنے پھر اپنی رائے سے ان کے جوابات دینے اس پر اس کو مستحسن سمجھنے میں آپ نے اور آپ کے تلامذہ نے بھی افراط سے کام لیا ہے ان وجوہ سے سلف میں ان سے مخالفت پیدا ہوگئی ورنہ میرے نزدیک اہل علم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جسے کسی حدیث کے اختیار کرنے کے بعد کسی نہ کسی حدیث کا ترک یا تاویل یا دعویٰ نسخ کرنا لازم نہ آیا ہو - فرق صرف یہ ہے کہ دوسروں کو ایسا موقعہ کم پیش آیا ہے اور امام صاحبؒ کو زیادہ - اس پر ان کے ساتھ حسد اور بہتان کی مصیبت مزید براں ہے - لیث بن سعد کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کے ستر مسئلے مجھے ایسے معلوم ہیں جو سنت کے خلاف ہیں امام مالکؒ نے صرف اپنی رائے سے نکالے ہیں اس بارے میں ان سے خط وکتابت بھی کر چکا ہوں - ابوعمر کہتے ہیں علماء امت میں یہ حق تو کسی کو حاصل نہیں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث صحت کو پہنچ جائے تو وہ اس کی سند میں طعن یا اسی درجہ کی حدیث سے دعویٰ نسخ یا اس کے مقابلہ میں امت کا اجماع پیش کیے بغیر اس کو ترک کردے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی عدالت ہی ساقط ہو جاتی ہے چہ جائیکہ اس کو دین کا امام مانا جائے - اس کے بعد لکھتے ہیں کہ امام صاحبؒ سے روایت کرنے والوں اور آپ کو ثقہ کہنے والوں کی تعداد اُن سے زیادہ ہے جنہوں نے آپ پر نکتہ چینی کی ہے پھر جنہوں نے نکتہ چینی کی بھی ہے تو وہ صرف ان ہی دو باتوں پر کی ہے جو ابھی مذکور ہوئیں پھر تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ بزرگی و برتری کا یہ بھی ایک معیار ہے کہ اس کے متعلق لوگ افراط و تفریط کی دوراہوں پر نکل جائیں جیسا کہ حضرت علیؓ - یہاں بھی ایک جماعت افراط اور دوسری تفریط میں مبتلا نظر آتی ہے -[1] آخر میں حافظ ابوعمر بطور[2] قاعدہ تحریر فرماتے ہیں کہ جس شخص کی عدالت صحت کے درجہ کو پہنچ چکی ہو، علم کے ساتھ اس کا مشغلہ ثابت ہو چکا ہو - کبائر سے وہ احتراز کرتا ہو، مروت اور ہمدردی اس کا شعار ہو، اس کی بھلائیاں زیادہ ہوں اور برائیاں کم تو ایسے شخص کے بارے میں بے سروپا الزامات ہرگز قابل قبول نہیں ہوں گے[3] سچ تو یہ ہے کہ مخلوق نے جب اپنی زبان خالق سے بند نہیں کی تو اب ہمہ وشما سے اس کی توقع فضول ہے - حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار دعا کی اے پروردگار بنی اسرائیل کی زبان سے میرا پیچھا چھڑا دے وحی آئی جب میں نے مخلوق کی زبان اپنے نفس سے بند نہیں کی تو تم سے کیسے بند کردوں -[4]

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۸ و ۱۴۹ - [2] اس قاعدہ کی پوری تفصیل کے لیے طبقات شافعیہ میں احمد بن صالح مصری اور حاکم کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے انہوں نے اس کے ہر گوشہ پر تفصیلی بحث کردی ہے اور اس مجمل ضابطہ میں جن جن قید وشرط کی ضرورت تھی سب ذکر کردی ہیں -
[3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۶۲ - [4] ایضاً ج ۲ ص ۱۶۱ -

امام مالک بن انس بن مالکؒ

ولادت ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ

آپ امت میں امام دارالہجرت کے لقب سے مشہور ہیں، دراز قامت، فربہ جسم، زردی مائل سفید رنگ، کشادہ چشم، بلند ناک اور خوب صورت تھے۔ آپ کی پیشانی کی طرف سر پر بال کم تھے۔ ریش مبارک دراز اور گھنی تھی، مونچھ منڈانے کو مثلہ فرماتے تھے۔ صرف لب کا بالائی حصہ ترشوا لیتے تھے اور دونوں طرف کے بال چھوڑتے تھے اس بارے میں حضرت عمرؓ کی تقلید فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں متفکر ہوتے تو اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی مونچھوں کے دوطرفہ بال دراز تھے۔ آپ خوش پوشاک تھے۔ آپ کا نسب غیمان بن خثیل پر پہنچتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں اس کو بصیغہ تصغیر خاء معجمہ کے ساتھ ضبط کیا ہے اور دارقطنی نے جیم کے ساتھ، خثیل، عمرو بن الحارث کے فرزند تھے اور حارث کا لقب ذواصبح تھا۔ اسی لحاظ سے آپ کو اصبحی کہتے ہیں[1]۔

آپ تبع تابعین کے طبقہ میں تھے۔ آپ کے شیوخ اور تلامذہ کا کیا پوچھنا۔ نووی تہذیب الاسماء میں لکھتے ہیں کہ امام کے شیوخ کی تعداد نوسو تھی جن میں تین سو تابعین اور چھ سو تبع تابعین تھے۔ سفیانؒ فرماتے تھے۔ رجال کی چھان بین کرنے والا مالکؒ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ مالکؒ کو جب حدیث کے کسی ٹکڑے میں شک پڑ جاتا تھا تو پوری کی پوری حدیث ترک کر دیتے تھے۔ وہب بن خالد کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے درمیان احادیث نبویہ کے بارے میں قابل اطمینان شخص مالک سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ترمذی صحیح اسناد کے ساتھ ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ دور دور کا سفر کریں گے لیکن ''عالم مدینہ'' سے بڑھ کر عالم انہیں کہیں میسر نہ آئے گا۔'' سفیان بن عیینہ کے نزدیک اس حدیث کا مصداق امام مالکؒ تھے۔ خلف بن عمر کہتے ہیں، میں امام مالکؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ مدینہ کے قاری ابن کثیرؒ نے امام مالکؒ کو ایک پرچہ دیا، امام نے اسے پڑھا اور اپنی جانماز کے نیچے رکھ لیا جب وہ کھڑے ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی چلنے لگا فرمایا بیٹھ جاؤ اور وہ پرچہ مجھے دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں یہ خواب لکھا ہوا تھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد جمع ہیں اور آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ میں نے اس منبر کے نیچے ایک بہت بڑا خزانہ دفن کیا ہے اور مالکؒ سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں تقسیم کر دیں گے اس لیے مالکؒ کے پاس جاؤ، لوگ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے بتاؤ مالکؒ تقسیم کریں گے یا نہیں؟ کسی نے جواب دیا جس بات کا مالکؒ کو حکم دیا گیا ہے وہ ضرور اسے پورا کریں گے۔ اس خواب سے مالک پر گریہ طاری ہو گیا اور اتنا روئے کہ میں تو انہیں روتا ہی چھوڑ آیا۔

عبدالرحمٰن بن مہدی کہتے ہیں کہ ہم مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھے ایک شخص آیا اور بولا میں چھ ماہ کی مسافت سے ایک

---

[1] بستان المحدثین۔

1 مسئلہ پوچھنے کے لیے آیا ہوں فرمایا کہو کیا ہے؟ اس نے بیان کیا آپ نے فرمایا مجھے اچھی طرح معلوم نہیں وہ حیران ہو کر بولا اچھا تو اپنے شہر والوں سے کیا کہوں، فرمایا کہہ دینا کہ مالکؒ نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ آپ کی ہمشیرہ سے پوچھا گیا مالکؒ گھر میں کیا کرتے ہیں؟ فرمایا تلاوت قرآن۔ آپ کی محفل ایسی بارعب تھی کہ بادشاہوں اور سلاطین کو تاب سخن نہ تھی ایک خاموشی کا عالم رہا کرتا تھا۔[1]

محدثین کے نزدیک اصح الاسانید میں بحث ہے۔ مشہور یہ ہے کہ جس کے راوی مالک نافع سے اور نافع ابن عمرؓ سے ہوں وہ اسناد سب سے صحیح ہے۔ امام زہریؒ جو آپ کے شیوخ میں شامل تھے وہ بھی آپ سے مستفید تھے۔ لیث، ابن مبارکؒ امام شافعیؒ اور امام محمدؒ جیسے مشاہیر آپ کے زمرۂ تلامذہ میں داخل تھے۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے، اگر مالکؒ وسفیان نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہو جاتا۔ آپ کے حفظ کا یہ عالم تھا کہ جو بات ایک مرتبہ سن لیتے پھر کبھی نہ بھولتے حدیث روایت کرنے کے لیے جب بیٹھتے تو پہلے وضو کرتے، اچھی پوشاک پہنتے، خوشبو لگاتے، ریش مبارک میں کنگھی کرتے۔ لوگوں نے اس تجمل کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی توقیر کرتا ہوں۔

عبداللہ بن المبارکؒ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام مالکؒ نے درسِ حدیث شروع کیا تو اثناء درس میں آپ کا رنگ بار بار متغیر ہو ہو جاتا تھا مگر آپ نے نہ درس حدیث بند کیا نہ آپ سے حدیث کی روایت کرنے میں کسی قسم کی لغزش واقع ہوئی۔ فارغ ہونے کے بعد میں نے مزاج مبارک دریافت کیا تو فرمایا کہ اثناء درس میں تقریباً دس بار بچھو نے ڈنک مارا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ صبر اپنی شجاعت و استقامت جتانے کے لیے نہیں کیا بلکہ صرف حدیث پیغمبر کی تعظیم کے لیے کیا ہے۔[2]

یافعی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک سے عشق تھا حتیٰ کہ آپ اپنے ضعف و پیری کے باوجود مدینہ میں سوار نہ ہوتے اور فرمایا کرتے تھے کہ جس شہر میں آپ کا جسد مبارک مدفون ہو اس میں میں ہرگز سوار ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ ہارون رشید مدینہ طیبہ آیا اس کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ امام مالکؒ نے کتاب مؤطا تالیف فرمائی ہے اور آپ لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ہارون الرشید نے اپنے وزیر جعفر برمکی کو آپ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ سلام عرض کردے اور یہ عرض کردے کہ آپ مؤطا لا کر مجھے سنا دیں برمکی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور امیر المؤمنین کا سلام پہنچا کر اس کی درخواست پیش کی۔ امام نے جواب دیا میرا ان سے سلام کہنا اور کہہ دینا کہ علم خود کسی کے پاس نہیں آیا کرتا لوگ اس کے پاس آیا کرتے ہیں۔ جعفر واپس آیا اور امام مالکؒ کا فرمان عرض کر دیا۔ اتنے میں امام عالی مقام بھی خود تشریف لے آئے اور سلام کر کے بیٹھ گئے۔ رشید نے کہا میں نے آپ کے پاس ایک پیغام بھیجا تھا آپ نے میرا حکم نہیں مانا۔ امام مالکؒ نے سند کے ساتھ وہ روایت سنائی جس میں زید فرماتے ہیں کہ نزولِ وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زانوئے مبارک میرے زانو پر تھا صرف کلمہ غیر اولی

---

[1] تہذیب الاسماء۔ [2] بستان المحدثین۔

الضرر نازل ہوا تھا کہ اس کے وزن سے میرا زانو چور چور ہو جانے کے قریب ہو گیا تھا- اس کے بعد فرمایا کہ جس قرآن کا ایک حرف حضرت جبرائیل علیہ السلام پچاس ہزار سال[۱] کی مسافت سے لے کر آئے ہوں کیا میرے لیے زیبا نہیں کہ میں بھی اس کی عزت واحترام کروں- اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت و بادشاہت سے نوازا ہے اگر سب سے پہلے آپ ہی اس علم کی مٹی خراب کریں گے تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں آپ کی عزت برباد نہ کر دے' یہ سن کر وہ مؤطا سننے کے لیے آپ کے ساتھ ہو گیا- امام مالکؒ نے اپنے ساتھ اس کو مسند پر بٹھا لیا- جب مؤطا پڑھنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا آپ ہی مجھے پڑھ کر سنایئے- امام نے فرمایا عرصہ ہوا میں خود پڑھ کر سنانا چھوڑ چکا ہوں اس نے کہا اچھا تو اور لوگوں کو باہر ہی نکال دیجئے تاکہ میں خود آپ کو سنا دوں- امام نے فرمایا علم کی خاصیت یہ ہے کہ اگر خاص لوگوں کی رعایت سے عام لوگوں کو اس سے محروم کر دیا جاتا ہے تو پھر خواص کو بھی اس سے نفع نہیں ہوتا- اس کے بعد آپ نے معن بن عیسیٰ کو حکم دیا کہ وہ قراءت شروع کر دیں جب انہوں نے قراءت شروع کی تو امام نے ہارون سے کہا اے امیر المؤمنین! اس شہر میں اہل علم کا دستور یہ ہے کہ وہ علم کے لیے تواضع کرنا پسند کرتے ہیں' ہارون یہ سن کر مسند سے اتر آیا اور سامنے آ بیٹھا اور مؤطا سننے لگا-

ایک مرتبہ جعفر بن سلیمان سے کسی نے شکایت کر دی کہ امام صاحب آپ کی خلافت کے مخالف ہیں اس نے آپ کے ستر کوڑے لگانے کا حکم دے دیا- اس کے بعد آپ کی عزت اور بڑھتی گئی گویا یہ کوڑے آپ کا زیور بن گئے- منصور جب مدینہ آیا تو اس نے انتقام لینے کا ارادہ کیا امام مالکؒ نے قسم کھا کر فرمایا میں تو اس کا ایک ایک کوڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی خاطر معاف کر چکا ہوں- مؤرخین کہتے ہیں کہ یہ سزا آپ کو اس جرم میں دی گئی تھی کہ آپ نے کوئی فتویٰ ان کی غرض کے موافق نہیں دیا تھا-[۲]

ذہبی کا بیان ہے کہ پانچ باتیں جیسی امام مالکؒ کے حق میں جمع ہو گئی ہیں میرے علم میں کسی اور شخص میں جمع نہیں ہوئیں- (۱) اتنی دراز عمر اور ایسی عالی مسند- (۲) ایسی عمدہ فہم اور اتنا وسیع علم- (۳) آپ کے حجت اور صحیح الروایت ہونے پر ائمہ کا اتفاق- (۴) آپ کی عدالت' اتباع سنت اور دین داری پر محدثین کا اتفاق (۵) فقہ اور فتویٰ میں آپ کی مسلمہ مہارت-[۳]

ائمہ اربعہ میں صرف ایک آپ ہیں جن کی تصنیف فن حدیث کے متعلق امت کے ہاتھ میں موجود ہے بقیہ جو تصانیف دوسرے ائمہ کی طرف منسوب ہیں وہ ان کے شاگردوں کی جمع کردہ ہیں حتیٰ کہ مسند امام احمدؒ بھی گو اس کی تسوید خود امام موصوف نے کی ہے- مگر اس کی موجودہ ترتیب خود امام کی نہیں ہے-[۴] ہارون الرشید کے نام بیس صفحات پر آپ کا جو خط ہے قابل دید ہے افسوس ہے کہ یہاں اس کا خلاصہ بھی درج نہیں کیا جا سکتا اور جو خود ہی خلاصہ ہو اس کا خلاصہ اور کیا کیا جا سکتا ہے- مطرف بن عبداللہ منجملہ آپ کے نصیحت آمیز کلمات کو نقل کرتے ہیں کہ بیکار اور غلط باتوں کے پاس پھٹکنا بربادی ہے' غلط بات زبان پر لانا سچائی سے

---

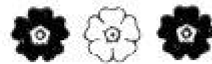
[۱] حضرت استاد مرحوم فرماتے تھے کہ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کی مسافت کا پچاس ہزار سال کی مدت ہونا ائمہ کے درمیان بھی مشہور تھا- [۲] شذرات الذھب- [۳] تذکرۃ الحفاظ- [۴] بستان المحدثین-

دوری کی بنیاد ہے- اگر انسان کا دین ومروت بگڑنے لگے تو دنیا بہت بھی جمع ہو جائے پھر بھی کسی کام کی ہے- ابن وہب کہتے ہیں کہ مالکؒ کہا کرتے تھے کہ علم آئندہ اور گھٹے گا بڑھے گا نہیں اور ہمیشہ انبیاء علیہم السلام اور کتب سماویہ کے نزول کے بعد گھٹا ہی کرتا ہے-سلف میں علمِ ہدایت کے علوم ہی کا نام تھا- اس لحاظ سے اس مقولہ کے صدق میں کیا تردد ہے-[1]

قعنبی نقل کرتے ہیں کہ میں مرض الوفات میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا سلام کر کے بیٹھ گیا دیکھا تو امام رو رہے تھے- میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کیسے نہ روؤں اور مجھ سے زیادہ رونے کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے میری آرزو ہے کہ جو مسئلہ بھی میں نے اپنی رائے سے بتایا ہے ہر مسئلہ کے بدلہ میرے ایک کوڑا مارا جائے- کاش! میں نے اپنی رائے سے ایک مسئلہ بھی نہ بتایا ہوتا مجھے گنجائش تھی کہ اس کے جو جوابات مجھ سے پہلے دیئے جا چکے تھے ان ہی پر سکوت کر لیتا- ماہ ربیع الاوّل میں آپ کا انتقال ہوا اور جس تمنا میں عمر گذاری تھی آخر وہ پوری ہی ہوئی یعنی دیارِ حبیب کی خاک پاک نے ہمیشہ کے لیے آپ کو اپنی آغوش میں لے لیا آپ سرزمین مدینہ ہی میں آسودۂ خواب ہیں-

فقہ مالکی ✻ امام مالکؒ کی فقہ میں اہل مدینہ کے تعامل کو خاص اہمیت حاصل ہے ان کے نزدیک مدینہ مہبط وحی ہے- اس کا تعامل حجت ہونا چاہیے- حافظ ابوعمر دراوردی سے نقل کرتے ہیں کہ امام مالکؒ جب یہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر کا عمل اسی مسئلہ پر دیکھا ہے تو اس سے ان کی مراد ربیعۃ بن ابی عبدالرحمٰن اور ابن ہرمز ہوتے ہیں-[2]

فقہ مالکی کا زیادہ چرچا اہل مغرب اور اندلس میں ہے- ابن خلدون اس کی وجہ یہ لکھتا ہے کہ اہل مغرب اور اندلس کا سفر اکثر حجاز ہی کی جانب ہوا کرتا تھا اس زمانہ میں مدینہ طیبہ علم کا گہوارہ بن رہا تھا- یہیں سے نکل کر علم عراق پہنچا ہے ان کے راستہ میں عراق نہ پڑتا تھا اس لیے ان کے علم کا ماخذ صرف علماء مدینہ تھے علماء مدینہ میں امام مالکؒ کا رتبہ معلوم ہے اس لیے مغرب اور اندلس کے اصحاب کا علم امام مالکؒ اور ان کے بعد ان کے تلامذہ میں منحصر ہو گیا تھا ان ہی کے وہ مقلد تھے اور جن کا علم انہیں نہیں پہنچا ان کے وہ مقلد بھی نہیں تھے-



---

[1] تذکرہ- [2] جامع بیان العلم ج۳ ص ۱۴۹-

الشافعیؒ الامام

ولادت ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ

آپ کی کنیت ابوعبداللہ اسم مبارک محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع ہے۔نسباً آپ قریشی ہیں آنحضرت کے جداعلیٰ عبدمناف میں آپ کا نسب مل جاتا ہے۔

بیت المقدس سے دو مرحلہ کے فاصلہ پر غزہ یا عسقلان میں آپ کی ولادت ہوئی' دو سال کی عمر میں آپ کے والدین آپ کو مکہ مکرمہ لے آئے تھے۔نہایت تنگ دستی میں آپ کی پرورش ہوئی یہاں تک کہ علمی یادداشتوں کے لکھنے کے لیے جب آپ کو کاغذ بھی میسر نہ آتا تو جانوروں کی ہڈیوں پر لکھ لیتے آپ کی عمر کا ابتدائی حصہ شعر' تاریخ' ادب وغیرہ کی تحصیل میں گذرا' فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں منیٰ میں تھا کہ پشت کی جانب سے مجھے ایک آواز آئی ''علیک بالفقہ'' فقہ سیکھ۔اسبابِ ظاہر میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مسلم بن خالد زنجی سے آپ کی ملاقات ہوئی' انہوں نے فرمایا صاحبزادہ کس ملک کے باشندہ ہو؟ میں نے کہا مکہ مکرمہ کا۔فرمایا مکان کس محلّہ میں ہے؟ میں نے کہا خیف میں۔پھر پوچھا کس قبیلہ کے ہو؟ میں نے کہا عبدمناف کی اولاد فرمایا بہت خوب بہت خوب' اللہ تعالیٰ نے تمہیں دونوں جہان کا شرف بخشا ہے۔اچھا یہ تھا کہ اپنی اس فہم و ذکاوت کو علم فقہ میں خرچ کرتے۔یہ سن کر آپ نے ان کی شاگردی قبول کی ان کے بعد پھر امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔اس وقت آپ مؤطا حفظ کر چکے تھے اور آپ کی عمر کل تیرہ سال کی تھی۔مؤطا میں شریک ہوگئے۔جب قراءت کا وقت آیا تو آپ نے برزبان قراءت شروع کی۔امام مالکؒ کو اس پر تعجب ہوا' اور آپ کی قراءت کو بہت پسند فرمایا جب یہ ختم کرنے کا ارادہ کرنے لگے تو فرمایا اور پڑھو اور پڑھو۔امام مالکؒ نے ان کے حق میں فرمایا تھا کہ تم تقویٰ اپنا اشعار رکھنا ایک زمانہ آئے گا کہ تم بڑے شخص ہوگے۔ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں ایک نور ودیعت رکھا ہے معصیت کرکے اسے ضائع نہ کرنا اس کے بعد آپ عراق تشریف لے گئے۔پندرہ سال کی عمر میں آپ کے شیخ مسلم بن خالد نے آپ کو فتویٰ نویسی کی اجازت دے دی تھی۔حدیث وتفسیر' فقہ وادب وعربیت کی جملہ خصوصیات کے ساتھ آپ بڑے تیرانداز بھی تھے' دس میں ایک تیر بھی نشانہ سے خطا نہ کرتا تھا۔

نووی مقدمہ شرح مہذب میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی کے فرمانے پر امام شافعیؒ نے اصول فقہ میں ''الرسالہ'' تصنیف فرمایا تھا (اسی وجہ سے آپ کو اصولِ فقہ کا مؤسس کہتے ہیں)۔

فقہ میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ صحیح احادیث کو لیتے اور ضعیف کو ترک کردیتے تھے کسی اور مذہب میں فقہ کی تعمیر اس معیار پر نہیں کی گئی۔عبادات کے مسائل میں آپ احتیاط کا پہلو اختیار فرمایا کرتے تھے' آپ کی تصنیف ''کتاب الأم'' اور ''الرسالہ'' دونوں طبع ہوکر آج امت کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

ان تمام فضائل وکمالات کے باوجود نکتہ چینی سے آپ بھی خالی نہیں رہے حتیٰ کہ یحییٰ بن معین جیسے شخص سے آپ کے متعلق

ایسے کلمات منقول ہیں جن کو سن کر آخر کار امام احمد کو یہ کہنا پڑا۔

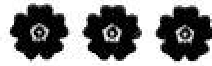
و من این یعرف یحییٰ الشافعی .... و من جهل شیئا عاداه۔

بھلا یحییٰ بن معین امام شافعیؒ کو کیا جانیں اور جو شخص کسی کو جانتا نہیں وہ اس سے خفاء ہی رہتا ہے۔

حافظ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ یحییٰ بن معین سے متعدد طریقوں سے ثابت ہے کہ وہ امام شافعیؒ میں کلام کرتے تھے یہاں تک کہ امام احمدؒ نے ان کو اس سے روکا اور فرمایا کہ تمہاری ان دو آنکھوں نے بھی اس جیسا شخص نہ دیکھا ہوگا۔[1]

تمام علم و فضل کے ساتھ سخی اس درجہ تھے کہ حمیدی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ صنعاء سے تشریف لائے تھے۔ اس وقت آپ کے پاس دس ہزار دینار تھے۔ آپ کا خیمہ مکہ مکرمہ سے باہر لگا ہوا تھا لوگ ملاقات کے لیے آتے تھے اور آپ ان کو دینار تقسیم کرتے یہاں تک کہ بیٹھے بیٹھے آپ نے وہ تمام رقم لوگوں پر تقسیم کر ڈالی۔

ابن خلکان ربیع بن سلیمان مرادی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے وفات کے بعد امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا ان سے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ امام شافعیؒ نے فرمایا مجھے ایک سنہری کرسی پر بٹھا کر میرے اوپر تازہ بتازہ موتیوں کی بکھیر کی۔ ۱۹۵ھ میں بغداد گئے تھے دو سال وہاں قیام فرمایا پھر مکہ مکرمہ آئے۔ ۱۹۸ھ میں پھر بغداد تشریف لے گئے۔ چند ماہ قیام فرما کر ۱۹۹ھ میں مصر آئے پھر وفات تک یہیں رہے۔ جمعہ کے دن انتقال ہوا اور بعد عصر مدفون ہوئے قبر مبارک قرافہ صغریٰ میں مخلوقِ خدا کے لیے زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔



---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۶۰۔

ابوعبداللہ احمد بن حنبل الشیبانی الامام

ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ

ابن خلکان لکھتا ہے کہ آپ کی پیدائش بغداد میں ہوئی اور وہیں آپ کی وفات بھی ہوئی آپ کا مزارِ مبارک بابِ حرب میں واقع ہے یہ جگہ حرب بن عبداللہ کی طرف منسوب ہے- عباس بن محمد دوری کہتے ہیں کہ آپ عرب کے مشہور خاندان بنی ذہل بن شیبان بن ثعلبہ سے متعلق تھے- خطیب[1] بغدادی کہتا ہے یہ عباس دوری کی غلطی ہے- آپ کا خاندان بنی شیبان بن ذہل بن ثعلبہ تھا یہ ذہل بن ثعلبہ رشتہ میں ذہل بن شیبان کا چچا ہے- آپ کے دو بیٹے تھے- صالح اور عبداللہ اسی دوسرے بیٹے کے نام پر ابو عبداللہ آپ کی کنیت تھی- آپ نہایت خوب صورت تھے- قد میانہ تھا' ہلکا سرخ خضاب لگاتے تھے- ریش مبارک میں کچھ بال سیاہ تھے- سفید رنگ کے موٹے کپڑے پہنتے تھے- آپ کا عام لباس ازار اور عمامہ تھا اپنے زمانہ کے متفق علیہ امام تھے- قتیبہ آپ کو اور اسحاق بن راہویہ کو امام الدنیا کہا کرتے تھے- اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ امام احمد اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان اس کی حجت ہیں- علی بن مدینی فرمایا کرتے تھے- اللہ تعالیٰ نے اس دین کو دو شخصوں کے ذریعہ سے عزت نصیب فرمائی ہے تیسرا مجھے کوئی اور شخص ایسا معلوم نہیں ہے' پہلے شخص ظہور ارتداد کے وقت ابوبکر صدیق تھے اور دوسرے فتنہ خلق قرآن کے زمانہ میں امام احمد تھے- اسمٰعیل بن خلیل فرماتے تھے کہ اگر امام احمد بنی اسرائیل میں پیدا ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے معجزوں میں ایک معجزہ شمار ہوتے-

خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ طلب علم کے لیے امام احمدؒ نے کوفہ' بصرہ' حرمین شریفین یمن اور شام وغیرہ کا سفر کیا ہے- شیخ تاج الدین سبکی نے امام شافعیؒ ، امام ابویوسفؒ ، وکیع بن الجراحؒ ، یحییٰ بن ابی زائدہؒ وغیرہم کو آپ کے اساتذہ اور ائمہ ستہ میں بخاری و مسلم و ابوداؤد کو تلامذہ کی فہرست میں شمار کیا ہے- ابن خلکان لکھتا ہے کہ آپ امام شافعیؒ کے مخصوص تلامذہ میں تھے جب تک امام شافعیؒ بغداد میں رہے آپ ان کی خدمت سے کبھی جدا نہ ہوئے جب امام شافعیؒ بغداد چھوڑ کر مصر جانے لگے تو چلتے وقت فرمایا میں نے بغداد میں ان جیسا متقی اور فقیہ شخص کسی اور کو نہیں چھوڑا-

ربیع بن سلیمان کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو مجھ سے فرمایا میرا ایک خط امام احمدؒ کو پہنچا دو اور اس کا جواب مجھے لا دو- میں خط لے کر بغداد پہنچا صبح کی نماز میں امام احمدؒ سے ملاقات ہوئی جب محراب سے اٹھے تو میں نے خط پیش کیا اور عرض کیا یہ امام شافعیؒ کا خط ہے- امام احمدؒ نے دریافت فرمایا تم نے اس کو دیکھا تو نہیں' میں نے عرض کیا نہیں- اس کے بعد آپ نے مُہر توڑی اور پڑھا تو آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں' میں نے پوچھا اے ابوعبداللہ خیر ہے فرمائیے تو کیا لکھا ہے- فرمایا لکھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا فرماتے تھے کہ ابوعبداللہ کو میرا اسلام کہہ دو اور کہہ دو کہ اس کا امتحان ہوگا اور خلق قرآن کے قائل ہونے پر اسے مجبور کیا جائے گا وہ اس کو منظور نہ کریں اللہ تعالیٰ اس کے صلہ میں تا قیامت ان کا

---

[1] خطیب ج۴ ص۴۱۳-

علم و نام روشن رکھے گا- ربیع کہتے ہیں میں نے کہا اے ابوعبداللہ بشارت مبارک ہو' فوراً امام احمدؒ نے اپنی دو قمیصوں میں نیچے والی قمیص جو جسم سے متصل تھی اتار کر مجھے انعام میں دے دی- میں اس کا جواب لے کر مصر آیا اور امام شافعیؒ کی خدمت میں پیش کر دیا- امام شافعیؒ نے دریافت فرمایا بولو بشارت کے صلہ میں کیا انعام لائے ہو' میں نے کہا امام کا اتارا ہوا کرتا ہے فرمایا کہ یہ تکلیف تو میں تجھے نہیں دے سکتا کہ وہ قمیص ہی مجھے دے دو البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اسے پانی میں بھگو کر نچوڑ اور وہ پانی مجھے دے دے تاکہ میں اسی کو تبرک رکھوں- (طبقات)

اس واقعہ سے امام احمدؒ کی منقبت کے علاوہ یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ پہلے محدثین و علماء کے درمیان کیسے تعلقات ہوئے ہیں ان کی جو کچھ جنگ تھی وہ صرف ایک اللہ کے نام پر تھی- اس امتحان کی مفصل روئداد شیخ تاج الدین سبکی نے طبقاتِ شافعیہ میں بیان کی ہے- قتیبہ بن سعید' امام احمد اور وکیع کے ایک مذاکرہ کا حال نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام احمد دروازہ کی چوکھٹ پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور سلمہ سے سفیان کی جو روایات ہیں ان کا تذکرہ ہونے لگا- دونوں آپس میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ تمام رات یونہی کھڑے کھڑے کٹ گئی اور کسی کو خبر نہ ہوئی صبح ہونے لگی تو آپ کی باندی حاضر ہوئی اور کہا کہ زہرہ ستارہ نکل چکا ہے-

آپ کی مشہور تصنیفات میں مسند احمد سب سے زیادہ قابل ذکر ہے- حنبل بن اسحاق آپ کے بھتیجے کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے ہم سے کہا ہے کہ یہ کتاب میں نے سات لاکھ سے زیادہ احادیث کے ذخیرہ سے منتخب کی ہے اور اس لیے منتخب کی ہے کہ مسلمانوں کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے لیے ایک معیار بن جائے جو حدیث اس میں مل جائے اسے حجت سمجھا جائے جو نہ ملے اسے حجت نہ سمجھا جائے- ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کو دس لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں- آپ کی وفات کے بعد جب آپ کی کتابوں کا تخمینہ لگایا گیا تو دس اونٹوں کے بوجھ سے زیادہ تھا اور وہ سب آپ کو زبانی محفوظ تھیں- جمعہ کے دن آپ کا انتقال ہوا- آپ کے جنازہ پر نمازیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ متوکل بادشاہ کے حکم سے جب نمازیوں کے قیام کی جگہ ناپی گئی تو پیمائش کے حساب سے وہ دو لاکھ پچاس ہزار آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی- ورکانی' امام احمدؒ کا پڑوسی بیان کرتا ہے کہ آپ کی وفات کے دن بیس ہزار یہود و نصاریٰ اور مجوس مسلمان ہوئے تھے لیکن ذہبی نے اس حکایت کو تسلیم نہیں کیا اور منکر کہا ہے- احمد بن محمد کندی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو خواب میں دیکھا- پوچھا اے ابوعبداللہ' اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا- فرمایا بخش دیا اور مجھ سے کہا اے احمد ہمارے ہی لیے تم نے کوڑے کھائے تھے- میں نے عرض کیا اے پروردگار جی ہاں- ارشاد ہوا تو اے احمد لے میرا دیدار دیکھ لے- راقم الحروف کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں نے بھی اس کی راہ میں مصیبتیں جھیلی ہیں' ان کے نامہ اعمال میں وہی ان کا سب سے زیادہ وزنی عمل ثابت ہوئی ہیں- چنانچہ اسی قسم کا ایک خواب آپ امام اعظمؒ کے حالات میں بھی ملاحظہ کر چکے ہیں-

فقہ حنبلی کے پانچ زرّیں اصول ⁕ (۱) جب کسی مسئلہ کے متعلق صریح نص موجود ہو تو پھر کسی کے اختلاف کی پرواہ نہ کی جائے اسی لیے امام احمدؒ کے نزدیک مبتوتہ عورت کے لیے نفقہ و سکنیٰ دونوں واجب ہیں کیونکہ اس بارے میں فاطمہ بنت قیس کی صریح

حدیث موجود ہے- حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اگر چہ اپنے زمانہ میں ان کے قول کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن امام احمدؒ نے حدیث کی صحت کے بعد ان کے خلاف کی کوئی پرواہ نہیں کی- اسی طرح ان کا مذہب یہ تھا کہ حج کو فسخ کر کے عمرہ بنایا جا سکتا ہے- دوسرے ائمہ اور اکثر صحابہؓ اس کے منکر تھے لیکن چونکہ اس کے متعلق حدیث ثابت ہو چکی ہے اس لیے یہاں بھی امام نے کسی کے اختلاف کی رعایت نہیں کی-

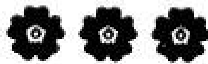
(۲) جب کسی مسئلہ میں صحابی کا فتویٰ معلوم ہو جائے اور اس کے مخالف کسی صحابی کا قول معلوم نہ ہو سکے تو پھر وہی مختار ہونا چاہیے- ایسے مقام پر امام احمد بنظر احتیاط اجماع کا لفظ استعمال نہیں فرمایا کرتے تھے بلکہ یہ فرما دیتے تھے کہ مجھے اس کے خلاف کسی کا قول معلوم نہیں- حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فتاویٰ صحابہ کی اہمیت حدیث مرسل سے بھی زیادہ تھی- اسحاق بن ابراہیم نے امام احمد سے پوچھا آپ کو صحیح مرسل حدیث زیادہ محبوب ہے یا صحابی کا صحیح اثر؟ فرمایا صحابی کا صحیح اثر-

(۳) جس مسئلہ میں صحابہ کا اختلاف ہو اس میں جس کا قول کتاب وسنت کے قریب نظر آئے اسی کو اختیار کر لینا چاہیے- اگر یہ ترجیح ثابت نہ ہو سکے تو پھر صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے مختلف اقوال نقل کر دینے چاہئیں اور کسی ایک قول پر جزم نہ کرنا چاہیے-

(۴) اگر کسی مسئلہ میں ضعیف یا مرسل حدیث موجود ہو تو اس کو بھی قیاس پر مقدم رکھا جائے گا بشرطیکہ اس مسئلہ کے متعلق کوئی اور حدیث یا قولِ صحابی یا اجماعِ مخالف نہ ہو- امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہاں ضعیف سے منکر یا باطل مراد نہیں بلکہ حسن لغیرہ مراد ہے- ان کے نزدیک حدیث کی دو ہی قسمیں تھیں صحیح وضعیف اور حدیث حسن صحیح میں داخل تھی- حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ اصول اجمالی طور پر دوسرے ائمہ کے نزدیک بھی مسلم ہیں اسی لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے نماز میں قہقہہ نواقض وضو میں شمار کیا ہے حالانکہ یہ قیاس کے مخالف ہے لیکن اس کے متعلق ایک ضعیف حدیث موجود ہے لہٰذا اس کے مقابلہ میں قیاس ترک کر دیا گیا ہے-

(۵) قیاس اس وقت جائز ہو سکتا ہے جب کسی مسئلہ کے متعلق منقول سامان نہ مل سکے اور وہ بھی بقدر ضرورت-[1]

ضرورت تھی کہ ان اصولِ خمسہ کی تشریح کی جاتی اس کے بعد امام صاحبؒ کے اصول سے مقابلہ کر کے یہ بتایا جاتا کہ کن کن گوشوں میں ان کو اختلاف ہے اور کیوں ہے اور دلائل کی روشنی میں اقرب کیا ہے- مگر اس مختصر تذکرہ میں یہ مباحث کب سما سکتے ہیں پھر ائمہ کے اصولوں پر تبصرہ کرنا مجھ جیسے بے بضاعت کا کام نہیں علماء کی طرف مراجعت کی جائے-



---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۳ تا ۲۵-

الامام القاضی یعقوب ابو یوسفؒ

ولادت ۱۱۳ھ وفات ۱۸۲ھ

کوفہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ایک غریب آدمی تھے- خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ ان کے والد نے ان کو امام صاحب کی خدمت میں حاضری سے روکا اور کہا ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تو صاحب استطاعت شخص ہیں اور تم ہو تنگدست یہ سن کر انہوں نے امام صاحب کی خدمت میں جانا چھوڑ دیا- ادھر امام صاحب نے جب مجھے نہ دیکھا تو میری تلاش شروع کی- میں پھر حاضر ہونے لگا- غیر حاضری کے بعد جب آپ کے درس میں پہلے دن پہنچا تو آپ نے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا- میں نے کہا معاشی ضروریات اور والد کی حکم برداری- یہ کہہ کر میں بیٹھ گیا جب لوگ رخصت ہوگئے تو آپ نے مجھے ایک تھیلی عنایت فرمائی اور فرمایا اسے خرچ کرو اور سبق میں پابندی سے آیا کرو جب صرف ہو جائیں پھر مجھ سے کہہ دینا- میں نے دیکھا تو اس میں سو درہم تھے اس کے بعد ہمیشہ کچھ دنوں بعد ہی آپ سو درہم دے دیا کرتے مجھے خود کبھی یہ کہنے کی نوبت نہیں آئی کہ اب میرے پاس خرچ نہیں رہا ہے- ہلال بن یحییٰ فرماتے ہیں تفسیر و مغازی اور تاریخ عرب کے حافظ تھے اور فقہ تو آپ کے علوم کا ایک ادنیٰ جزء تھا-

حافظ ذہبیؒ نے آپ کو حفاظِ حدیث میں شمار کیا ہے اور منجملہ دیگر ائمہ حدیث کے امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کو آپ کے تلامذہ میں لکھا ہے- علی بن جعد فرماتے ہیں کہ میں نے ابو یوسفؒ کو فرماتے سنا ہے جو شخص یہ کہے کہ میرا ایمان جبرئیل علیہ السلام جیسا ایمان ہے وہ بدعتی ہے اور آپ کے پر حکمت مقولوں میں یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ تھوڑا علم بھی اس وقت تک تم کو نہیں آ سکتا جب تک تم اپنے آپ کو ہمہ تن اس کے حوالہ نہ کر دو- بشر بن ولید کہتے ہیں میں نے ابو یوسفؒ سے سنا ہے، جو اندھا دھند حدیثوں کے پیچھے پڑا وہ جھوٹ میں مبتلا ہوا، جس نے کیمیا کے ذریعہ سے مال طلب کیا وہ فقیر بنا اور جس نے کلام کے ذریعہ سے دین کے عقائد حاصل کرنے کی کوشش کی وہ زندیق بنا- آپ اپنے زمانہ قضاء میں دو دو سو رکعت یومیہ ادا فرمایا کرتے تھے- ان کے تذکرہ کے خاتمہ پر ذہبیؒ نے ماعز بن مالک کی حدیث ابو یوسفؒ اور ابو حنیفہؒ کی سند سے نقل کر کے لکھا ہے **هذا اسناده متصل عال**- اس کی اسناد متصل اور عالی ہے-

ابن خلکان لکھتا ہے **ولم یختلف یحییٰ بن معین و احمد بن حنبل و علی بن المدینی فی ثقته فی النقل**- یعنی نقل کے بارے میں یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل اور علی بن مدینی کو آپ کی ثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں تھا- اس مقولہ کو خطیب نے اپنی تاریخ میں بھی نقل کیا ہے-

ابن خلکان فرماتے ہیں یہ پہلے شخص تھے جن کو قاضی القضاۃ کا خطاب دیا گیا تھا- ابن عماد حنبلی لکھتا ہے کہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں اپنے زمانہ میں مشرق و مغرب میں ابو یوسف پہلے شخص تھے جن کو قاضی القضاۃ کا لقب دیا گیا تھا- آپ امام صاحب کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں ۱۷ سال آپ کے ساتھ رہے سب سے پہلے حنفی اصولِ فقہ کو انہوں ہی نے مرتب فرمایا آپ کی وفات

کے بعد معروف کرخیؒ نے خواب میں جنت میں ایک بہت عمدہ محل دیکھا، پوچھا یہ کس کا ہے؟ کہا گیا ابو یوسفؒ قاضی کا - انہوں نے تعجب سے کہا ایسا محل ان کو کس خدمت کے صلہ میں ملا جواب ملا، لوگوں کو تعلیم دینے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرنے کے صلہ میں -[۱]

اپنی وفات کے وقت حسرت سے فرمایا کرتے تھے کاش میں اپنے اسی فقر کے حال میں مرجاتا اور قضاء قبول نہ کرتا - لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے جان بوجھ کر کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا اور نہ بادشاہ و رعایا میں سے فیصلہ کے باب میں کسی کی رعایت کی خطیب بغدادی نے اپنی عادت کے موافق یہاں بھی امام ابو یوسفؒ کی توصیف میں پہلے تو خوب کشادہ دلی سے نقول پیش کی ہیں پھر ایک طومار اس کے خلاف لکھ مارا ہے اور لطف یہ کہ اس متناقض بیان پر دلائل کی روشنی میں کوئی محاکمہ بھی نہیں کیا - ابن خلکان یہاں بھی امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مناقب نقل کر کے لکھتا ہے کہ خطیب نے بڑے بڑے ائمہ حدیث سے ان کے متعلق ایسے کلمات نقل کیے جن کو کان سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے - اکثر علماء آپ کو قابل تعظیم اور افضل سمجھتے تھے اس لیے ہم ان کا ذکر نہیں کرتے -

امام محمد بن الحسنؒ

ولادت ۱۳۵ھ وفات ۱۸۹ھ

آپ امام صاحب کے مشہور تلامذہ ہیں - امام صاحبؒ کے بعد امام ابو یوسفؒ سے تکمیل کی ہے - امام مالکؒ کی زبان سے آپ نے مؤطا سنا ہے اور تین سال مسلسل آپ کی خدمت میں رہے ہیں - امام شافعیؒ جیسا امام وقت آپ کے تلامذہ میں شمار ہوتا ہے - ابن عماد حنبلی لکھتا ہے کہ آپ کی شان میں امام شافعیؒ کے تعریفی کلمات تواتر کی حد تک پہنچ گئے ہیں - فرماتے ہیں کہ امام محمد بن الحسنؒ سے زیادہ حلال و حرام، علل حدیث، ناسخ و منسوخ کا جاننے والا میرے علم میں کوئی اور شخص نہیں اگر لوگوں میں انصاف ہوتا تو وہ یقین کرتے کہ محمد بن الحسنؒ جیسا انہوں نے کوئی شخص اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا - میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا ہے اگر وہ نہ ہوتے تو جو علم مجھ پر کھلا ہے نہ کھلتا -[۲]

امام احمدؒ سے دریافت کیا گیا یہ باریک باریک مسائل آپ کے پاس کہاں سے آئے؟ فرمایا امام محمدؒ کی کتابوں سے ابو عبیدہؒ کہتے ہیں کہ امام محمدؒ سے بڑھ کر قرآن کا عالم میں نے کوئی اور شخص نہیں دیکھا - مشہور ہے کہ آپ نے نو سو نوے کتابیں تصنیف کی ہیں اور وہ سب علوم دینیہ میں ہیں -[۳]

ابن عماد حنبلی حافظ ابن عبد البرؒ سے امام شافعیؒ کے تذکرہ میں نقل کرتے ہیں ایک مرتبہ امام شافعیؒ علوی خاندان کے نو اشخاص کے ساتھ گرفتار کر کے بغداد لائے گئے - رشید اس وقت مقام رقہ میں تھا اس لیے یہ لوگ بغداد سے رقہ آئے اور اس کے سامنے

---

[۱] شذرات الذہب - [۲] شذرات الذہب - [۳] الفوائد البہیۃ -

پیش کیے گئے وہاں رقہ کے قاضی محمد بن الحسنؒ موجود تھے یہ امام شافعیؒ کے محبّ تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ ہارون رشید کی خلافت پر طعن کے الزام میں گرفتار ہو کر آ رہے ہیں تو بہت بے چین ہوئے کیا کریں اور برابر اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ کب پیش ہوتے ہیں پیشی کے بعد اور لوگ تو قتل کر دیئے گئے' ایک علوی نوجوان اور امام شافعی بچ گئے - جب اس نوجوان کی باری آئی تو اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی بات کا دعویٰ کرتا لیکن اس کے بھی قتل کا حکم دے دیا گیا - اس نے کہا اگر آپ مجھے قتل ہی کرتے ہیں تو ذرا اتنی مہلت دیجئے کہ میں اپنی بوڑھی ماں کو خط لکھ دوں اسے میرے حال کا کچھ پتہ نہیں ہے آخر اس کے بھی قتل کا حکم دے دیا گیا - اس کے بعد پھر میرا نمبر آیا مجھ سے بھی ہارون رشید نے وہی بات دریافت کی جو اس علوی سے دریافت کی تھی - میں بولا اے امیر المؤمنین میں تو علوی ہی نہیں ہوں - زبردستی ان کے ساتھ گرفتار کر کے لایا گیا ہوں - میں بنی عبد المطلب میں ہوں اور اسی کے ساتھ کچھ علم سے شد بد بھی رکھتا ہوں آپ کے یہ قاضی صاحب بھی ان سب باتوں سے واقف ہیں - ہارون رشید نے کہا اچھا آپ محمد بن ادریس ہیں؟ میں نے کہا اے امیر المؤمنین جی ہاں - اس نے کہا محمد بن الحسنؒ نے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا - اس کے بعد محمد بن الحسنؒ کی طرف مخاطب ہو کر کہا اے محمدؒ یہ کیا کہتے ہیں - کیا واقعہ یونہی ہے انہوں نے کہا بے شک ایسا ہی ہے اور یہ بھی کہ علم کے باب میں ان کا پایہ بہت بلند ہے جو شکایت ان کی کی گئی ہے ان کی شان سے بہت دور ہے - اس نے کہا اچھا اب تو آپ انھیں اپنے ہمراہ لیتے جایئے میں ان کے معاملہ میں ذرا غور کر لوں - امام محمدؒ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور اس طرح وہی میری گلو خلاصی کا سبب ہوئے - اب اس تاریخی شہادت کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امام محمدؒ نے ہارون کے دربار میں ان کی خود شکایت کی ہوگی -

امام محمدؒ اور کسائی نحوی کی وفات ایک ہی تاریخ میں ہوئی ہے - اس وقت رشید نے افسوس سے کہا تھا آج ہم مقام ری میں عربیت اور فقہ کے دونوں اماموں کو ایک ساتھ دفن کر آئے -[1]

شیخ الاسلام ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ

ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ

امام بخاریؒ کا شجرۂ نسب ❊ امام بخاریؒ کا شجرۂ نسب یہ ہے محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ[2] البخاری الجعفی - امام بخاریؒ کے جد اعلیٰ بردزبہ مجوسی مذہب تھے اور اسی دین پر ان کا انتقال ہوا ہے - مغیرہ ان کے فرزند یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے - عرب میں یہ دستور تھا کہ جس کے ہاتھ پر مسلمان ہوا کرتے تھے اس کے ساتھ ان کا ایک خاص ربط بھی قائم ہو جاتا

---

۱ شذرات الذہب -

۲ عام طور پر مؤرخین وشارحین نے اس لفظ کو اسی طرح ضبط کیا ہے اور اس کے معنی کسان لکھے ہیں - لیکن روس کے ایک مشہور عالم سے میری مکاتبت ہوئی تو انہوں نے اس لفظ کی صحیح تعریب بزدازبہ قرار دی یعنی دال کے بعد الف اور زائد ہے اور اس کے معنی صیقل و ماہر کے بتائے - یہ تصریف ونحو کے بہت بڑے عالم ہیں اور ان بلاد کی زبانوں سے بھی پورے طور پر واقف ہیں اس لیے ان کی تحقیق قابل اعتماد ہے -

تھا جس کو وہ ولاء سے تعبیر کرتے تھے اور جیسا کہ عتق و مخالفت کے حدود ان کے یہاں وسیع تھے اسی طرح اس ولاء کی شاخیں بھی دور تک پھیلتی چلی جاتی تھیں حتیٰ کہ اسی ولاء کے رشتہ سے وہ اپنی نسبتیں قائم کر لیتے تھے۔ امام بخاریؒ کو بھی جعفی اسی رشتہ ولاء کے لحاظ سے کہا جاتا ہے ورنہ خود امام اس خاندان سے نہ تھے لیکن ان کے جداعلیٰ چونکہ یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے اس لیے وہ جعفی کہلائے ان کے بعد پھر ان کے فرزند اسفل بھی اسی نسبت کے لحاظ سے جعفی کہے گئے۔

تاریخ ولادت ووفات ٭ نماز جمعہ کے بعد ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو علوم نبوت کا یہ آفتاب نواحی بخاریٰ سے طلوع ہوا اور عید الفطر ۲۵۶ھ سنیچر کی شب میں سمرقند کے قریب قریہ خرتنگ میں جا کر روپوش ہو گیا اور نماز ظہر کے بعد تدفین عمل میں آئی[۱] آپ نے اپنے بعد کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔

بچپن میں ردِ بصر کا واقعہ ٭ دنیا میں آ کر ابھی اچھی طرح آنکھیں کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ بصارت زائل ہو گئی۔ ان کی والدہ کو سخت صدمہ ہوا۔ بارگاہِ ایزدی میں روئیں، عجز و انکسار کے ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں، آخر ماں کی دعا تھی دراستجابت وا ہو گیا اور خواب میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے ان کی بے چین و مضطرب والدہ کو بشارت دی کہ جا تیری دعاء قبول ہو گئی اور تیرے نورِ نظر کو پھر نورِ بصر عطا کر دیا گیا۔ صبح کو اٹھتی ہیں تو دیکھتی ہیں کہ بیٹے کی آنکھوں کی بینائی لوٹ آئی۔[۲]

قوتِ حافظہ ٭ خطیب[۳] بغدادی نے امام بخاریؒ کے طلب حدیث کے حالات خود ان کی زبانی اس طرح نقل کیے ہیں کہ مجھے بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے حفظ حدیث کے لیے بنایا تھا ابھی میری عمر دس سال ہی کی تھی کہ میں محدثِ عصر داخلی کے حلقہ درس میں شریک ہوا کرتا تھا ایک دن ان کی زبان سے یہ سند نکلی "سفیان عن ابی الزبیر عن ابراھیم" میں نے فوراً ٹوکا اور عرض کیا کہ ابو الزبیر تو ابراہیم سے روایت نہیں کرتے۔ داخلی نے مجھے جھڑک دیا۔ میں نے پھر گذارش کی کہ ذرا اپنی اصل کتاب کی تو مراجعت کیجئے انہوں نے اصل کتاب جا کر دیکھی اور واپس آ کر مجھ سے کہا کہو میاں لڑکے پھر یہ سند ہے کس طرح؟ میں نے کہا کہ ابراہیم سے روایت کرنے والے زبیر ہیں اور یہ عدی کے فرزند ہیں ابو الزبیر نہیں۔ داخلی نے اسی وقت قلم اٹھا کر اپنے نسخہ کی اصلاح کر لی اور فرمایا جو تم نے کہا وہی درست تھا۔ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی جب ان کی عمر سولہ سال کی ہو گئی تو انہوں نے عبداللہ بن المبارک اور وکیع کی جمع کی ہوئی حدیثیں یاد کر لیں۔ اور اٹھارہ سال کی عمر میں ایک تصنیف صحابہ و تابعین کے فیصلے اور ان کے مختلف اقوال کے بارے میں مرتب کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے قریب چاندنی راتوں میں کتاب التاریخ تصنیف کی۔

حاشد بن اسمٰعیل بیان کرتے ہیں[۴] مشایخ بخاریٰ کی خدمت میں امام بخاریٰ ہمارے ساتھ بھی جایا کرتے تھے اس وقت یہ بہت نوعمر تھے مگر یہ کچھ لکھا نہ کرتے تھے۔ ہم ان کو بہت ملامت کرتے کہ جب تم کچھ لکھتے ہی نہیں تو خواہ مخواہ درس میں شریک کیوں ہوتے ہو؟ سولہ دن کے بعد انہوں نے تنگ آ کر فرمایا کہ تمہاری ملامت کی حد ہو گئی ہے۔ اچھا اب لاؤ دکھلاؤ تم نے کیا لکھا ہے۔ ہم

۱۔ تاریخ خطیب ج۲ ص۶۔ ۲۔ خطیب ج۲ ص۱۰۔ ۳۔ ایضاً ج۲ ص۶ و ۷۔ ۴۔ خطیب ج۲ ص۱۴۔

اس وقت تک پندرہ ہزار حدیثیں لکھ چکے تھے وہ سامنے رکھ دیں - امام بخاریؒ نے وہ تمام حدیثیں برزبان اس طرح فرفر سنا دیں کہ ہمیں ان کی یادداشت سے اپنے اپنے نسخوں کی تصحیح کرنا پڑی -

امام بخاری کی اس خداداد ذکاوت و حفظ کا ہر طرف شہرہ ہو چکا تھا اس لیے جہاں جہاں جاتے اس سے آگے آگے ان کا نام پہنچ جاتا تھا - جب یہ تشریف لاتے تو عجب عجب انداز پر ان کے لیے مجالس امتحان مرتب ہوتیں اور ہر مجلس کے خاتمہ پر اہل مجلس کو یہ کہنا پڑتا کہ امام بخاری کے متعلق اب تک جو کچھ مبالغہ آمیز تعریفی کلمات ان کے کانوں میں پڑے تھے وہ بھی ناتمام تھے امام بخاریؒ کی شانِ رفیع اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہی ہے' ان کی طفلانہ صورت اور یہ بزرگانہ علم دیکھ دیکھ کر دنیا حیرت میں مبتلا تھی -

بصرہ میں ایک مجلس امتحان کا تذکرہ ✻ ایک مرتبہ بصرہ میں داخل ہوئے تو اسی وقت امام بخاری' امام بخاری' کا شورغل مچ گیا - ہزاروں نظار' فقہاء و محدثین جمع ہو گئے اور ان تشنگانِ علم نے فوراً مجلس استفادہ آراستہ کرنے کا بندوبست کیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر باادب اپنی درخواست پیش کی - امام ہمام نے فرمایا میں ابھی بہت نوعمر ہوں اور تم مجھ سے ایسی فرمائش کرتے ہو اچھا تو لو میں خود تمہارے شہر ہی کی ایسی حدیثیں تمہارے سامنے بیان کروں گا کہ انہیں سن کر تم بھی جدید فائدہ حاصل کرو گے یہ کہہ کر حدیث "المرء مع من احب" سنائی اور فرمایا کہ میں اس حدیث کو سالم سے بواسطہ منصور نقل کر رہا ہوں اور تمہارے شہر میں یہ روایت سالم کے علاوہ دوسرے اور اشخاص سے روایت کی جاتی ہے اس لیے تم کو یہ نفع ہوگا کہ اپنی سندوں کے ساتھ اس طریق کو بھی شامل کر لو تا کہ اور موجب تقویت ہو' پوری مجلس میں امام بخاری نے صرف اسی قسم کی حدیثیں سنائیں جو ان کے شہر میں مشہور تھیں لیکن جب امام بخاریؒ نے ان کو روایت کیا تو ان کے لیے اس میں استفادے کا کوئی نہ کوئی جدید پہلو موجود تھا -

بڑے بڑے اساتذہ و محدثین نے ان کے سامنے ایسے زمانہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا جب کہ ان کے قرطاس وجہ[1] پر آثارِ شباب کا ایک خط بھی نمودار نہ ہوا تھا - اپنے زمانہ کے مشاہیر جیسے ابوزرعہ' ابوحاتم' ترمذی' محمد بن نصر' ابن خزیمہ اور امام مسلم صحیح مسلم کے علاوہ ان سے روایت کرتے تھے -

امام بخاریؒ کی جلالت قدر ✻ ابراہیم خواص کہتے ہیں[2] کہ میں نے ابوزرعہ کو امام بخاریؒ کے سامنے بچوں کی طرح علل حدیث دریافت کرتے ہوئے دیکھا ہے - دارمی جو عمر[3] میں امام بخاریؒ سے بڑے تھے اور جن کے امام بخاری بھی خود معتقد تھے فرمایا کرتے تھے کہ ہم سب میں بڑے عالم' سب سے بڑے فقیہ اور علم کے لیے سب سے زیادہ جفاکش امام بخاریؒ ہیں - ایک مرتبہ ایک حدیث کے متعلق ان سے پوچھا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ امام بخاریؒ اس کو صحیح فرماتے تھے تو دارمی نے بیساختہ یہ الفاظ کہے:

''بخاری فن حدیث میں مجھ سے کہیں زیادہ بصیرت رکھتے ہیں - خدا کی مخلوق میں سب سے بڑھ کر عقل مند ہیں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو انہوں نے خوب ہی سمجھا ہے - جب قرآن پڑھنے بیٹھتے ہیں تو ہمہ تن اس کے معنی سمجھنے میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس کے امثال اور حلال و حرام کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ کیا کہنا'' -[4]

---

[1] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۱۵ - [2] طبقات الحفاظ ج ۲ ص ۸ - [3] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۱۹۹ - [4] مقدمہ بخاری -

مطالعہ حدیث میں شب بیداری ⁂ محمد بن ابی حاتم وراق بخاری اور محمد بن یوسف فربری (صاحب نسخہ) اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ امام بخاریؒ ایک رات میں پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ اٹھ اٹھ کر چراغ روشن کرتے حدیث کا مطالعہ کرتے اور پھر سو جاتے۔[1]

تالیف بخاری کا سبب ⁂ صحیح بخاری کی تصنیف کا واقعہ خود ان سے اس طرح منقول ہے کہ ایک دن یہ اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں حاضر تھے کہ امام اسحٰق رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کاش تم حدیث کی کوئی ایسی کتاب جمع کرتے جس میں صرف صحیح صحیح حدیثیں ہوتیں یہ بات سب نے سنی مگر دل میں اسی کے اتری جس کے نصیب میں یہ سعادت روز ازل سے مقدر ہو چکی تھی۔ اس مجلس کے بعد ہی امام بخاری اس خدمت کے لیے کھڑے ہو گئے اور اس سلسلہ میں یہ خواب دیکھا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا پنکھا جھل رہا ہوں اور مکھیاں اُڑا رہا ہوں۔ فن تعبیر کے ماہرین سے جب اس کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے کہا کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے کذب وافتراء کی مکھیاں اڑاؤ گے۔[2]

تالیف بخاری میں حیرت انگیز شرائط کا التزام ⁂ غرض امام بخاریؒ نے کمر ہمت کس لی اور ان چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو ان کے حافظہ میں محفوظ تھیں، سخت سے سخت شرط کے مطابق حدیثیں انتخاب کرنا شروع کر دیں۔ صرف ذکاوت و حفظ ہی کا زور خرچ نہیں کیا بلکہ خلوصِ نیت، تقویٰ وطہارت کے آخری مرحلے بھی ختم کر ڈالے[3] یعنی جب کوئی حدیث لکھنے کا ارادہ کرتے تو پہلے غسل فرماتے، دو رکعت نماز نفل ادا کرتے پھر کہیں کتاب میں ایک حدیث درج کرتے۔ اسی طرح جب فقہی وحدیثی اشارات کے لیے تراجم وابواب قائم کرتے اس وقت بھی یہی عمل کرتے۔ عبدالقدوس بن ہمام اپنے چند مشائخ سے ناقل ہیں کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب تراجم ''ریاض الجنہ'' میں بیٹھ کر لکھے ہیں اس جانکاہی اور ریاضت کے ساتھ سولہ[4] سال کی مدت میں یہ عظیم الشان اور عدیم النظیر کتاب مکمل ہوئی اور صفحۂ ہستی پر ایک ایسی تصنیف وجود میں آ گئی جس کا لقب ہی تردد کے بغیر ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' قرار پایا۔ امت کے لاکھوں اور کروڑوں محدثین وعلماء نے سخت سے سخت کسوٹی پر اس کو کسا، بہت کچھ سعی وکوشش کے بعد وقف وارسال کی چہ میگوئیاں ضرور کی گئیں مگر جو لقب اس تصنیف کا مشہور ہو چکا تھا وہ پتھر کی لکیر تھا، نہ مٹنا تھا نہ مٹا۔

خلوصِ نیت کے آثارِ برکت ⁂ اس میں برکت کا یہ عالم ہوا کہ نوے ہزار اشخاص نے اس کتاب کو بلا واسطہ امام بخاریؒ سے سنا، اس کی ۵۳ شرحیں لکھی گئیں جن میں بعض بعض شرح چودہ چودہ ضخیم جلدوں کی ہے ۲۲ مستخرج لکھے گئے۔ محدثین کو چھوڑ کر نحویوں اور صرفیوں نے بھی اعراب وتصریف کی جو خدمت بن پڑی کی حتیٰ کہ جب متون وتراجم اعراب ونسخ کی تمام خدمتیں ختم ہو گئیں تو خدمت بخاری کی فہرست میں نام درج کرانے والے مشتاقوں نے قرآن کریم کی طرح اس کے حروف تہجی[5] ہی شمار کر ڈالے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے جو کام اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے کیا جاتا ہے اس کے آثار قبولیت دنیا میں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ بخاری شریف کی علمی خصوصیات کے متعلق اگر کچھ لکھا جائے تو بغیر کسی مبالغہ کے اس کے لیے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔

---

[1] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۱۳ و ۱۴۔ [2] ایضاً ج ۳ ص ۸۔ [3] ایضاً ج ۲ ص ۹۔ [4] خطیب ج ۲ ص ۱۴۔

[5] حضرت استاد مرحوم فرماتے تھے کہ یہ نسخہ میں نے خود دیکھا ہے بلکہ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ میرے پاس موجود ہے۔

عوام کا تو ذکر ہی کیا بعض خواص کے ذہن میں بھی اتنا ہی ہے کہ یہ کتاب صحیح حدیثوں کا مجموعہ ہے لیکن جن کو کتاب بخاری پر کافی غور و مطالعہ کا وقت ملا ہے۔ انہیں یہ کتاب اصول وعقائد' عبادات و معاملات' غزوات وسیر' اسلامی معاشرت وتمدن' سیاست وسلطنت کی ایک مختصر انسائیکلوپیڈیا نظر آتی ہے۔

خودداری ✲ امام بخاریؒ کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ عمر بن حفص اشتر کہتے ہیں۔ بصرہ میں ہم اور وہ ساتھ ہی علم کی تحصیل کرتے تھے۔ ایک دن امام بخاریؒ درس میں نہ آئے' ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس تن پوشی کے لیے کپڑے نہیں ہیں لیکن امام نے اس مرحلہ پر بھی اپنی فطری غیرت کی قربانی برداشت نہ کی۔ اور اپنے بے تکلف رفقاء سے بھی اس راز کو راز ہی کے درجہ میں رکھا۔ ان کا یہ حال دیکھ کر فوراً کپڑے مہیا کیے گئے اس کے بعد امام بخاریؒ پھر اسی طرح پابندی کے ساتھ درس گاہ میں آنے لگے۔[1]

ایک مرتبہ خالد بن احمد امیر بخاری نے درخواست کی کہ وہ ان کی مجلس میں آ کر اپنی تصنیف جامع اور تاریخ اس کو سنا دیں۔ امام نے اس سے صاف انکار کر دیا تو دوسرے درجہ پر اس نے اس کے لیے مجبور کیا کہ شہزادوں ہی کے لیے ایک مجلس ایسی مخصوص کر دیں جس میں ان کے سوا کوئی دوسرا شریک نہ ہو سکے۔ مگر امام بخاریؒ نے علم نبوی کی دولت کی تقسیم میں یہ تخصیص بھی گوارا نہ کی۔ آخر یہ ناگواریاں اتنی بڑھتی گئیں کہ امام بخاریؒ کو اپنا وطن مالوف چھوڑ دینا پڑا۔[2]

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم دربدر مارے مارے پھر کر ہزاروں مصائب جھیل کر' حاصل کیا اور جب اس بے بہا خزانہ کو اپنے سینہ میں جمع کر لیا تو اپنے مورث اقدس کی طرح ہر خاص و عام کے سامنے اس کو بے منت لٹا دیا' اس کی خود عزت کی' دنیا کی نظروں میں اس کا احترام قائم کیا اور اسی کے احترام کی خاطر وطن سے بے وطن ہوئے' جان دے دی مگر علم کی آن بان اسی طرح قائم رکھی۔

سانحہ وفات ✲ تذکروں میں لکھا ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ چند صحابہ کے ساتھ کھڑے کسی کا انتظار فرما رہے ہیں انہوں نے باادب سلام عرض کیا آپ نے جوابِ سلام دیا۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہؐ کس کا انتظار ہے؟ فرمایا محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ آ رہے ہیں' ان کے انتظار میں ہوں جب امام بخاریؒ کی وفات کی خبر ان کو پہنچی' انہوں نے حساب لگایا تو ان کی وفات کا ٹھیک وہی وقت نکلا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں منتظر دیکھا تھا۔[3] خرتنگ میں دفن ہوئے۔

آپ کی قبر سے مشک وعنبر سے زیادہ عمدہ خوشبو چھوٹی یہ عجیب ماجرا دیکھ کر لوگ ٹوٹ پڑے اور اس مٹی کو تبرک سمجھ کر لوٹ لوٹ کر لے جانے لگے۔ حتیٰ کہ مزار مبارک کا نشان باقی رکھنے کے لیے اس کا انتظام کرنا پڑا کہ اس کی مٹی لوگ نہ لے جا سکیں لوگوں کو اس مٹی کی خوشبو پر تعجب ہوگا لیکن ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہے۔[4]

جمال ہمنشیں درمن اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

---

[1] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۱۳۔ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۳۔ [3] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۳۴۔ [4] مقدمہ فتح الباری۔

ابومحمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن الفضل بن بہرام الدارمی

ولادت ۱۸۱ھ وفات ۲۵۵ھ

جس سال عبداللہ بن المبارک کی وفات ہوئی ہے اسی سال حافظ دارمی کی ولادت ہوئی ہے' دیانت' علم' اجتہاد' اور عبادت میں ضرب المثل تھے- حدیث کی تلاش میں بلادِ اسلامیہ کا دُور دُور تک سفر کیا ہے- ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ دارمی اپنے زمانہ کے امام تھے- مسلم صاحب صحیح' ترمذی' ابوداوٗد صاحب سنن اور امام احمدؒ کے فرزند جیسے ائمہ حدیث ان کی تلانذہ کی فہرست میں داخل ہیں- حافظ ذہبیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ- امام نسائی نے بھی سنن صغریٰ کے علاوہ ان سے روایت کی ہے- امام احمدؒ کے فرزند اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ خراسان میں چار شخص حافظ حدیث ہیں- ابوزرعہ رازی- محمد بن اسمٰعیل بخاری' عبداللہ ابن عبدالرحمٰن دارمی- حسن بن شجاع بلخی-

مسند دارمی آپ کی مشہور تصنیف ہے اس کو مسند کہنا محدثین کی اصطلاح کے خلاف ہے اس کتاب میں ثلاثیات سب کتابوں سے زیادہ ہیں- مجموعہ کتاب تین ہزار پانچ سوستاون حدیثوں پر مشتمل ہے- عرفہ کے دن آپ کی وفات ہوئی اور عیدالضحیٰ جمعہ کے دن مدفون ہوئے- امام بخاریؒ کو جب ان کے وفات کی خبر پہنچی تو انتہائی صدمہ سے سر جھکالیا' آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بے ساختہ آپ کی زبان سے یہ حسرت آمیز شعر نکل گیا حالانکہ بجز ان اشعار کے جو حدیث میں روایت کیے گئے ہیں آپ کبھی کوئی شعر نہیں پڑھتے تھے-

ان تبق تفجع بالا حبة کلها	اگر تو زندہ رہے گا تو تمام دوستوں کی مفارقت کا درد تجھ ہی کو اٹھانا پڑے گا-
و فناء نفسک لا اباک افجع	مگر تیری موت کا سانحہ ان سب سے دردناک ہے-

اسی سنہ میں نیشاپور کے مشہور محدث عبدالرحمٰن اور واسط کے محمد بن حرب نسائی اور دمشق کے موسیٰ بن عامر اور گروہِ کرامیہ کے بانی محمد بن کرام کی وفات ہوئی ہے[1]

ابوداوٗد سلیمان بن الاشعث السجستانی

ولادت ۲۰۲ھ وفات ۲۷۵ھ

سجستانی کی تحقیق میں یہاں مؤرخ ابن خلکان نے ایک مشہور غلطی کی ہے- وہ لکھتے ہیں کہ یہ بصرہ میں ایک قریہ کا نام ہے- تاج الدین سبکی فرماتے ہیں کہ یہ ان کا وہم ہے- صحیح یہ ہے کہ سیستان قندھار و چشت کے قریب ایک مقام ہے یہ نسبت اسی کی طرف ہے اور سجزی کی نسبت بھی اسی کی طرف ہے انہوں نے مصر و شام' حجاز و عراق اور خراسان وغیرہ بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے-

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵ و بستان المحدثین-

حفظ واتقان، روایت وعبادت، تقویٰ وصلاح میں یگانہ روزگار تھے- حاکم کہا کرتے تھے کہ ابوداؤد کسی پس وپیش کے بغیر اپنے زمانہ کے امام تھے- موسیٰ بن ابراہیم جو ان کے معاصر تھے فرمایا کرتے تھے کہ ابوداؤد دنیا میں حدیث کے لیے اور آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں- ابراہیم بن حربی کا مقولہ ہے کہ علم حدیث ابوداؤد کے لیے اس طرح نرم کر دیا گیا تھا جیسا حضرت داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا- حافظ سلفی نے بھی اس مضمون کو دہرایا ہے اور اس کو نظم کر دیا ہے- ترمذی ونسائی جیسے ائمہ حدیث ان کے تلامذہ میں شمار ہیں- یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود امام احمد تو ان کے اساتذہ میں ہیں لیکن امام احمدؒ کے بعض استادوں نے ان سے روایت کی ہے بلکہ امام احمدؒ نے بھی عتیرہ کی حدیث ان سے روایت کی ہے-

سنن ابی داؤد ان کی مشہور تصنیف ہے اس میں ۴۸۰۰ حدیثیں حسن وصحیح جمع کی ہیں- اور اپنے نزدیک کوئی ایسی حدیث درج نہیں کہ جو قابل حجت نہ ہو- ابوداؤد نے جب اس کتاب کو امام احمدؒ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے بہت پسند فرمایا- ان کے فقہی مسلک میں اختلاف ہے- ابن خلکان نے لکھا ہے کہ شیخ ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں انہیں حنبلیوں میں شمار کیا ہے- حافظ ذہبی کے بیان سے بھی یہی قیاس ہوتا ہے- وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ابوداؤدؒ اپنے عام طور، طریق میں امام احمدؒ کے قدم بقدم تھے اور امام احمد وکیع کے اور وکیع سفیان کے اور سفیان منصور کے اور منصور ابراہیم کے اور ابراہیم علقمہ کے اور علقمہ ابن مسعودؓ کے اور ابن مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے-

لباس میں آپ کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ اپنے قمیص کی ایک آستین فراخ اور دوسری تنگ رکھا کرتے تھے، جب آپ سے سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا ایک آستین تو اس لیے کشادہ رکھتا ہوں کہ اس میں اپنی کتاب کے کچھ اجزاء رکھ لوں دوسری آستین کشادہ رکھنا اسراف میں داخل سمجھتا ہوں- آپ کا مرقد مبارک بصرہ میں ہے-[1]

حجۃ الاسلام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری النیشابوری

ولادت ۲۰۶ھ وفات ۲۶۱ھ

حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں مشہور یہ ہے کہ ان کی ولادت ۲۰۴ھ میں ہوئی ہے لیکن مؤرخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ میں نے کسی حافظ کو ان کے سنہ ولادت کی تصریح کرتے نہیں دیکھا- البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۲۰۰ھ کے بعد ہے- میرے شیخ حافظ ابن الصلاح ضرور کچھ تصریح فرماتے تھے مگر جہاں تک میرا گمان ہے ان کے نزدیک سن ولادت ۲۰۲ھ تھا اور اس کا اصل مآخذ حاکم کی ایک تصنیف تھی لیکن جب مجھے اصل کتاب دستیاب ہوگئی اور وہ نسخہ میری ملکیت میں آ گیا تو اس میں سنہ ولادت کی بجائے صرف سنہ وفات ۲۶۱ھ لکھا ہوا تھا- ہاں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ ان کی عمر ۵۵ سال کی ہوئی ہے اس حساب سے ان کی ولادت ۲۰۶ھ میں ثابت ہوتی ہے-

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۲ و ابن خلکان ج ا ص ۲۱۴ و بستان المحدثین-

ابو الحسین کنیت' عساکر الدین لقب اور مسلم ان کا اسم گرامی تھا- بنی قشیر عرب کے مشہور قبیلہ کی طرف منسوب تھے- نیشاپور خراسان میں ایک بہت خوب صورت اور بڑا شہر ہے اس لحاظ سے نیشاپوری بھی کہے جاتے تھے- ابو زرعہ اور ابو حاتم نے ان کی امامت حدیث کی گواہی دی ہے- ابو حاتم رازی اور ابن خزیمہ ان سے روایت کرنے والوں کی فہرست میں داخل ہیں- امام ترمذیؒ نے بھی ان سے ایک روایت کی ہے- بہت کثیر التصانیف شخص تھے- صحیح مسلم ان کی تصانیف میں اس پایہ کی کتاب ہے کہ بعض مغاربہ نے اس کے متعلق یہ الفاظ تک کہہ دیئے ہیں کہ آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح کتاب نہیں یہ دعویٰ اپنی جگہ جیسا کچھ بھی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی یہ تصنیف فن حدیث کے بہت سے عجائبات پر مشتمل ہے- سرد اسانید' متون کا حسن سیاق' تلخیص طرق اور ضبط انتشار میں صحیح بخاری پر بھی فائق ہے-

ابن عقدہ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی اکثر روایات اہل شام سے بطرق مناولہ ہیں یعنی ان کی کتابوں سے لی گئی ہیں خود ان کے مؤلفین سے نہیں سنی گئیں اس لیے ان کے راویوں میں کبھی کبھی امام بخاریؒ سے غلطی واقع ہو جاتی ہے ایک ہی راوی کہیں اپنی کنیت اور کہیں اپنے نام سے مذکور ہوتا ہے امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اس کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں- یہ مغالطہ امام مسلم کو پیش نہیں آتا- نیز حدیث میں امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تصرفات مثلاً تقدیم و تاخیر حذف و اختصار کی وجہ سے بعض مرتبہ تعقید پیدا ہو جاتی ہے ہر چند کہ خود بخاری ہی کے دوسرے طرق دیکھ کر وہ صاف بھی ہو جاتی ہے لیکن امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ طریقہ ہی اختیار نہیں کیا بلکہ متون حدیث کو موتیوں کی لڑی کی طرح اس طرح مرتب روایت کیا ہے کہ تعقید کی بجائے اس کے معانی اور چمکتے چلے جاتے ہیں-

خطیب بغدادی ان کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ انہوں نے حدیث کی تلاش میں عراق' حجاز' مصر شام وغیرہ کا سفر کیا ہے- قتیبہ' اسحاق بن راہویہ' امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جیسے ائمہ اور اجلہ محدثین سے علم حاصل کیا ہے- ابتداء میں امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے کچھ مانوس نہ تھے لیکن جب امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ آخر عمر میں نیشاپور پہنچے اور امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان کی محیر العقول حدیث کی معرفت اپنی آنکھوں سے دیکھی تو ان کے تمام پہلے خیالات' عقیدت اور جذبات محبت سے بدل گئے- امام کی آنکھوں کو بوسہ دیا اور قدموں کو بوسہ دینے کی خواہش ظاہر کی- استاد الاساتذین سید المحدثین طبیب الحدیث فی علله کے محبت بھرے خطابات سے یاد کیا- خلق قرآن کے مسئلہ میں محمد بن یحییٰ ذہلی اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف جب حد سے بڑھ گیا حتیٰ کہ ذہلی نے یہ اعلان کر دیا کہ جو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مشرب پر ہو وہ ہمارے حلقہ درس میں شریک نہ ہو تو یہ سن کر اکثر لوگ امام بخاریؒ سے کٹ گئے- لیکن ایک امام مسلم تھے جو علوم بخاری سے کچھ ایسے مخمور ہو چکے تھے کہ انہیں کسی دوسرے محدث کے علوم میں اب کوئی ذائقہ ہی نہ آتا تھا فوراً چادر سنبھال' عمامہ سر پر رکھ' ذہلی کی مجلس اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے علوم کا جو ذخیرہ اب تک حاصل کیا تھا وہ بھی ایک خادم کے سر پر رکھ کر ان کے مکان پر واپس کر دیا اور امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مقابلہ میں

[1] (تاریخ خطیب ج ۱۳ص ۱۰۰ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۱۵۰ و ابن خلکان ج ۲ص ۹۱)

اپنے استاد محمد بن یحییٰ ذھلی کو ہمیشہ کے لیے خیر آباد کہہ دیا-

ان کی وفات کے بعد ابو حاتم رازی نے ان کو خواب میں دیکھا حال پوچھا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو میرے لیے مباح کر دیا ہے جہاں چاہتا ہوں پھرتا ہوں- ابو علی زاغونی کو ایک ثقہ شخص نے خواب میں دیکھا اور ان سے پوچھا کس عمل سے آپ کی نجات ہوئی انہوں نے صحیح مسلم کے چند اجزاء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ان اجزاء کی بدولت-

ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی

ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ھ

شیخ تقی الدینؒ فرماتے ہیں کہ ترمذی تاء کے کسرہ کے ساتھ قریب قریب متواتر ہے- نہر جیحون کے کنارہ پر ایک قدیم شہر ہے- لفظ ماوراء النہر میں نہر سے بیشتر یہی نہر مراد لی گئی ہے- یہ امام بخاریؒ کے سب سے مشہور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں- خود امام بخاریؒ سے ان کے حق میں بہت سے کلماتِ تعریف منقول ہیں- محدثین ان کو امام بخاریؒ کا خلیفہ کہتے ہیں' ان کے افتخار کے لیے یہ کافی ہے کہ خود امام بخاریؒ نے بھی ان سے روایت کی ہے- مسلم' ابوداؤد اور ان کے شیوخ سے بھی روایت کرتے ہیں- کوفہ' بصرہ' رے' خراسان اور حجاز میں طلب حدیث کے لیے سالہا سال سفر کرتے رہے ہیں- ان کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک شیخ کی روایات کے دو جزء انہوں نے نقل کیے تھے مگر اب تک ان کو پڑھ کر سنانے کا موقعہ نہ ملا تھا- مکہ مکرمہ کے راستہ میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہو گئی- ترمذی نے نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان سے ان اجزاء کے قراءت کی درخواست پیش کی- شیخ نے قبول فرمایا اور کہا ان اجزاء کو نکال لو' میں پڑھتا ہوں تم مقابلہ کرتے جاؤ- امام ترمذی نے تلاش کیا تو اتفاقاً وہ اجزاء ان کے ساتھ نہ تھے- ترمذی بہت گھبرائے لیکن اس وقت ان کی سمجھ میں سوائے اس کے اور کچھ نہ آیا کہ دو اجزاء سادے کاغذ کے ہاتھ میں لے کر فرضی طور پر سننے میں مشغول ہو جائیں- شیخ نے قراءت شروع کی اتفاقاً ان کی نظر کاغذات پر پڑ گئی تو سادے نظر آئے- شیخ کو طیش آیا اور فرمایا کیا میرا مذاق بناتے ہو ترمذی نے مجبوراً جو واقعہ تھا صاف عرض کر دیا اور کہا اگرچہ وہ اجزاء میرے ساتھ نہیں ہیں لیکن مجھے لکھے ہوئے سے زیادہ محفوظ ہیں- شیخ نے فرمایا اچھا ذرا پڑھ کر تو سناؤ- ترمذی نے وہ تمام حدیثیں پڑھ کر سنا دیں- شیخ بہت متعجب ہوئے اور فرمایا یقین نہیں آتا کہ صرف میرے ایک بار پڑھنے سے یہ سب حدیثیں تم کو محفوظ ہو گئی ہوں گی- ترمذی نے عرض کیا اچھا اب امتحان کر لیجئے- شیخ نے خاص اپنی چالیس حدیثیں اور پڑھیں ترمذی نے فوراً ان کو بھی اس صحت کے ساتھ سنا دیا کہ کہیں ایک جگہ غلطی نہیں ہوئی- اس ایک واقعہ کے علاوہ ان کے حفظ کے اور بہت سے واقعات مشہور ہیں-

جامع ترمذی ان کی بہت مشہور اور مقبول تصنیف ہے- مجموعی حدیثی فوائد کے لحاظ سے اس کتاب کو تمام کتابوں پر فوقیت دی گئی ہے- عراقیین و حجازیین دونوں کے مسائل پر علیحدہ علیحدہ باب قائم کرتے ہیں' ہر باب کے تحت میں اگرچہ حدیث کا ذخیرہ تفصیلاً تو زیادہ پیش نہیں کرتے لیکن اس باب میں جتنے صحابہ کی حدیثیں ان کے زیر نظر ہوتی ہیں سب کی طرف صحابہؓ کے نام گنوا کر اشارات کر جاتے ہیں- رواۃ کی جرح و تعدیل مشہور اسماء کی کنیتیں اور مشہور کنیتوں کے اسماء سلف کا تعامل' ائمہ کے مذاہب پر تقریباً ہر باب

میں تنبیہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے اگر چہ یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے مختصر ہے لیکن فوائد کے لحاظ سے بہت بڑی کتاب ہے- ترمذی سے پہلے بھی گو حدیث کی ثلاثی تقسیم کا پتہ ملتا ہے مگر حسن وصحیح کو ہر جگہ اتنا روشن کرنے والے یہی پہلے شخص ہیں- امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں دو حدیثوں کے علاوہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس پر امت میں کسی نہ کسی کا عمل نہ ہو-[۱]

حفظ واتقان، علم وفہم کے ساتھ بہت خدا ترس بھی تھے- اللہ تعالیٰ کا خوف وخشیت ان پر اتنا غالب تھا کہ روتے روتے آخر کار اُن کی بینائی جاتی رہی تھی-

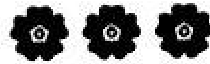
ان کی کنیت ابو عیسیٰ تھی- ابوداوٗد میں اس کنیت کی ممانعت منقول ہے- شارحین حدیث نے اس کی مختلف توجیہات نقل کی ہیں- شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے بستان المحدثین میں عام شارحین کے علاوہ ایک جدید توجیہ کی ہے مراجعت کی جائے-[۲]

ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی ابن ماجۃ الربعی

ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ

لفظ ماجہ جیم کی تخفیف کے ساتھ ہے صحیح یہ ہے کہ یہ ان کی والدہ کا نام تھا-

ابویعلی خلیلی فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ متفق علیہ ثقہ تھے- فن حدیث وتفسیر کے علاوہ علم تاریخ کے بھی بڑے عالم تھے ان کا قول قابل حجت تھا- حدیث کی تلاش میں انہوں نے کوفہ، بصرہ، عراق، شام، مکہ مکرمہ اور مصر وغیرہ کا سفر کیا ہے- سنن ابن ماجہ حدیث میں ان کی مشہور تصنیف ہے- یہ کتاب چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے- ابن ماجہ فرماتے ہیں کہ تصنیف کرنے کے بعد جب یہ کتاب میں نے حافظ ابوزرعہ کے سامنے پیش کی تو انہوں نے فرمایا کہ اس کتاب میں تیس سے زیادہ ضعیف حدیثیں نہیں ہیں- حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ اگر چند کمزور حدیثیں اس میں نہ ہوتیں تو یہ کتاب بہت عمدہ ہوتی-[۳]



---

۱ حضرت استادؒ فرماتے تھے کہ ترمذی کی اس تصریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث پر عمل کرنے کے لیے صرف سند کی قوت درکار نہیں ورنہ ترمذی کی بہت سی وہ حدیثیں جن پر خود انہوں نے ضعف کا حکم لگایا ہے معمول بہ کیسے ہوسکتی ہیں-

۲ تذکرۃ ج ۲ ص ۱۸۷ وابن خلکان ج ا ص ۴۸۴- بستان المحدثین-

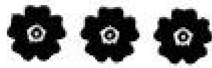
۳ تذکرۃ ج ۲ ص ۱۸۹ وابن خلکان ج ا ص ۴۸۴-

ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی

نساء خراسان میں ایک مشہور شہر ہے- اس کی طرف نسبت میں نسوی بھی کہا جاتا ہے- بہت بڑے حافظ حدیث تھے- ذہبی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ سے پوچھا مسلم زیادہ حفظ رکھتے ہیں یا نسائی فرمایا نسائی[1] پھر میں نے اپنے والد سے یہی سوال کیا انہوں نے بھی یہی جواب دیا-

ابن ظاہر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سعد بن علی زنجانی سے میں نے ایک شخص کا حال دریافت کیا انہوں نے اس کو ثقہ فرمایا- میں نے کہا نسائی تو اس کو ضعیف کہتے تھے فرمایا عزیز من راویوں کے متعلق نسائی کی شرائط بخاری و مسلم سے بھی زیادہ سخت تھیں- ابن الحداد شافعی فرماتے ہیں کہ میں اپنے اور اللہ کے مابین نسائی کو واسطہ بنا چکا ہوں- طلب حدیث کے لیے انہوں نے حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ کا سفر کیا تھا- بڑے بڑے شیوخ سے ملاقات کی تھی- سب سے پہلے یہ قتیبہ بن سعد کے پاس گئے ہیں اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی اور ایک سال دو ماہ ان کی خدمت میں قیام کیا ہے- کہتے ہیں کہ فروع میں یہ شافعی مسلک پر تھے- ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے- پہلے انہوں نے سنن کبریٰ تصنیف فرمائی تھی- امیر وقت نے ان سے پوچھا کہ اس کتاب میں جتنی حدیثیں آپ نے جمع کی ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں- فرمایا نہیں حسن بھی ہیں- اس نے کہا میرے لیے ایک ایسا مجموعہ مرتب فرما دیجئے جس میں صرف صحیح حدیثیں ہوں- اس کے بعد امام نے سنن صغریٰ[2] تالیف کی جس کو مجتبیٰ بھی کہا جاتا ہے- ان کی وفات کا واقعہ یہ ہے کہ جب یہ حضرت علیؓ اور اہل بیت کے مناقب لکھ کر فارغ ہو گئے تو انہوں نے چاہا کہ ان کو دمشق کی جامع مسجد میں پڑھ کر سنائیں تاکہ بنوامیہؓ کی سلطنت کے اثر سے عوام میں ناصبیت کی طرف جو رجحان پیدا ہو گیا تھا اس کی اصلاح ہو جائے- ابھی اس کا تھوڑا سا حصہ ہی پڑھنے پائے تھے کہ ایک شخص نے پوچھا امیر معاویہؓ کے فضائل کے متعلق بھی آپ نے کچھ لکھا ہے؟ نسائی نے جواب دیا اگر وہ برابر سرابر چھوٹ جائیں تو بسا غنیمت ہے مناقب تو ان کے کہاں ہیں- پھر کیا تھا لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور شیعہ، شیعہ، کہہ کر اتنا مارا کہ نیم جان کر دیا، خادم انہیں اُٹھا کر گھر لے آئے- امام نسائی نے فرمایا مجھے ابھی مکہ مکرمہ پہنچاؤ تاکہ میرا آخر وقت وہیں ہو کہتے ہیں کہ جب امام مکہ مکرمہ پہنچے تو ان کا انتقال ہو گیا اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کیے گئے-

(تذکرہ ج ۲ ص ۲۴۱ والطبقات ج ۲ ص ۸۳ وابن خلکان ج ۱ ص ۲۱)



---

[1] واضح رہے کہ جو سوال و جواب یہاں مذکورہ ہے وہ خود امام مسلم و نسائی کے متعلق ہے ان کی تصنیفات کے متعلق نہیں ہے مسلم کی کتاب نسائی سے بلاشبہ زیادہ صحیح ہے-

[2] واضح رہے کہ بعض مرتبہ شارحین سنن نسائی کا حوالہ دیتے ہیں اور وہ حدیث سنن صغریٰ میں نہیں ملتی ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا سہو ہے حالانکہ ان کی مراد سنن کبریٰ ہوتی ہے-

احمد بن محمد ابو جعفر الطحاوی الامام

ولادت ۲۳۷ھ وفات ۳۲۱ھ

ابوجعفر ان کی کنیت ہے اور طحا مصر میں ایک قریہ ہے اسی کی طرف یہ منسوب ہیں۔ ابو اسحٰق شیرازی طبقات میں تحریر فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں حنفیہ کی سیادت کا ان پر خاتمہ تھا۔ ذہبیؒ نے ان کو علامہ اور حافظ کے لقب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ تصانیف عجیبہ کے مالک تھے۔ ابن یونس نے ان کے حق میں ثقہ، ثبت، فقیہ اور عاقل کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

مزنی ان کے ماموں تھے اور ان ہی کی زیر تربیت انہوں نے ابتداء میں تعلیم حاصل کی ہے اور اسی لیے شافعی مسلک رکھتے تھے ایک دن کسی بات پر ناراض ہو کر مزنی نے ان سے فرمایا خدا کی قسم تجھ سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ یہ سن کر امام طحاویؒ کو بہت غیرت آئی اور وہاں سے اٹھ کر قاضی ابن ابی عمران حنفی کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور حنفی مذہب میں ایسی مہارت پیدا کی کہ اپنے زمانہ میں تو کیا بعد کے زمانوں میں بھی حنفیوں کے مقتدا کہلائے۔ امام طحاویؒ کے انتقال مسلک کے سلسلہ میں عام طور پر اس واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ صرف اتنی سی بات کسی شاگرد کو اپنے استاد کا مسلک چھوڑنے کا سبب نہیں بن سکتی، اس کا اصل سبب خود امام طحاویؒ کی زبانی ہی کیوں نہ معلوم کیا جائے۔

مؤرخ ابن خلکان نقل کرتا ہے کہ امام طحاوی سے پوچھا گیا آپ نے اپنے ماموں کے خلاف حنفی مسلک کیوں اختیار فرمایا۔ امام نے جواب دیا اس لیے کہ میں اپنے ماموں کو اکثر حنفی مسلک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے دیکھا کرتا تھا اس لیے میں نے بھی اس مسلک کو اختیار کر لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ وجہ البتہ معقول ہو سکتی ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ اس ارادہ کا ظہور امام مزنی کی اس ناراضگی پر ہوا ہو۔

امام طحاویؒ بہت کثیر التصانیف شخص ہیں[1] اختلاف العلماء اور شروط کے موضوع پر ان کے علاوہ کسی نے کم قلم اٹھایا ہے۔ تاریخ کبیر، احکام القرآن، معانی الآثار ان کی بہت مشہور تصنیفیں ہیں۔ حافظ ابن حزم اندلسی تو طحاوی کی تصانیف کو موطا مالک پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ ہمارے نزدیک اگر ان کا یہ حکم احادیث کی نشست اور مسائل کی فقہی تقریر کے لحاظ سے ہو تو صحیح ہے ورنہ اگر صحت اسانید و متون کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مقولہ ابن حزمؒ کی جلالت شان کے کسی طرح موزوں نہیں۔ امام طحاویؒ جب مختصر الطحاوی تالیف کر چکے تو فرمایا۔ کاش ابو ابراہیم (مزنی کی کنیت ہے) آج زندہ ہوتے تو ان کو اپنی قسم کا کفارہ دینا پڑتا۔

جس سال امام طحاویؒ کی وفات ہوئی..... اسی سال علم حدیث کے بہت سے چراغ گل ہوئے..... مصر میں طحاوی کے شیخ، ابوبکر احمد بن عبد الوارث ہرات میں، ابو علی احمد بن محمد، اصبہان میں، ابو علی الحسن، بغداد میں، ابو عثمان سعید بن محمد، اور ابو علی جبائی کے فرزند اور شیخ المعتزلہ ابو ہاشم وغیرہم۔

امام طحاویؒ کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے۔ ابن خلکان کہتے ہیں کہ صحیح ۲۲۹ھ ہے۔[2]

---

[1] حضرت استاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مالکیہ نے ان کی تصانیف سے جس قدر استفادہ کیا ہے افسوس ہے کہ اتنا خود حنفیہ نے استفادہ نہیں کیا۔ اگر کاش معانی الآثار کی پوری خدمت کر دی جائے تو وہ رتبہ میں ابوداؤد سے کم نہ ہو گی۔ [2] تذکرہ ج ۳ ص ۲۸ و ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۔

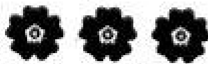
ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی

ولادت ۲٦۰ھ وفات ۳٦۰ھ

ملک شام موضع عکاء میں ان کی ولادت ہوئی ہے-طبرانی طبریہ کی طرف منسوب ہے ابن خلکان لکھتا ہے کہ طبرستان کی طرف نسبت طبری آتی ہے-طلب علم کے لیے حرمین شریفین، یمن، شام، کوفہ، بصرہ، مصر، بغداد اور اصفہان وغیرہ کا سفر کیا ہے آپ کے والد بزرگوار کو علم حدیث سے بڑا شغف تھا- بڑے بڑے اساتذہ کی خدمت میں انہیں خود لے جایا کرتے تھے-تحصیل علم میں انہوں نے بڑی بڑی مشقتیں جھیلی ہیں-تیس سال مسلسل بوریئے پر سوئے ہیں-وسعت علم میں اپنے زمانہ میں ضرب المثل تھے-

ابوالعباس احمد بن منصور کہتے ہیں کہ میں نے طبرانی سے تین لاکھ حدیثیں لکھی ہیں-ان کی اکثر تصانیف اس وقت ناپید ہیں حافظ ابن مندہ نے ان سب کا ذکر کیا ہے-کتاب المسالک، کتاب عشرۃ النساء، کتاب النوادر کتاب دلائل النبوۃ کے سوا انہوں نے ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے اور حدیث میں تین معجم بھی لکھے ہیں جن کے حوالہ جات اکثر شروحِ حدیث میں ملتے ہیں-ابن عمید مشہور ادیب اور وزیر تھا اس کا گمان تھا کہ علم وسلطنت کے دونوں عہدے میرے پاس ہیں آج مجھ سے زیادہ عزت کس کو حاصل ہو سکتی ہے-

ایک مرتبہ ابوبکر جعابی اور ابوالقاسم طبرانی کے درمیان ابن عمید کے سامنے ایک مکالمہ ہوا- دورانِ گفتگو میں ابوبکر کا پلہ ذکاوت میں اور ابوالقاسم کا کثرت محفوظات میں بھاری نظر آرہا تھا- اتفاقاً اثناء گفتگو میں ابوبکر نے کہا کہ ایک حدیث میرے پاس ایسی ہے جو اس وقت دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے پھر یہ سند پڑھی **حدثنا ابو حنیفہ ثنا سلیمان بن ایوب ابوالقاسم** -اس پر طبرانی نے کہا آپ جانتے بھی ہیں سلیمان بن ایوب کون ہیں وہ خود میں ہی تو ہوں اور یہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ میرے شاگرد ہیں اب آپ اس روایت کو ابوحنیفہ کی بجائے براہ راست مجھ سے ہی روایت کیا کیجئے تاکہ ایک واسطہ اور گھٹ جائے اور آپ کی سند عالی ہو جائے- یہ سن کر ابوبکر کو بڑی خفت ہوئی -ابن عمید کہتے ہیں کہ اس وقت طبرانی کا اعزاز دیکھ کر مجھے ان پر رشک ہونے لگا- کاش کہ میں آج طبرانی ہوتا اور وزیر نہ ہوتا کہ فتح وظفر کا یہ علمی تمغہ مجھے نصیب ہوتا- شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ رشک بھی ابن عمید میں وزارت کے بقیہ اثرات کا نتیجہ تھا ورنہ علماء ربانیین پر ایسے امور کچھ اثرانداز نہیں ہوتے- آخر عمر میں قرامطہ نے ان پر جادو کردیا تھا اور اس کے اثر سے ان کی بصارت زائل ہوگئی تھی- حافظ ابونعیم اصبہانی نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی -[1]



---

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۱۱۸ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱۵-

ابوالحسن علی بن عمر الدار قطنی

ولادت ۳۰۶ھ وفات ۳۸۵ھ

دارقطن بغداد میں ایک بڑا محلّہ ہے وہی ان کا مسکن تھا- طلب حدیث کے لیے انہوں نے کوفہ، بصرہ، شام، واسط، مصر اور دیگر بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے-مشہور شافعی المذہب تھے- حاکم، عبدالغنی منذری تمام رازی صاحب فوائد اور ابونعیم صاحب الحلیہ جیسے ائمہ حدیث ان کے زمرہ تلامذہ میں شامل تھے-فن علل و اسماء الرجال میں استاد مانے جاتے تھے اور اپنا نظیر نہ رکھتے تھے- خطیب و حاکم وغیرہ کو آپ کے اس تفوق کا اعتراف تھا-فنون حدیث کے علاوہ فن قراءت ونحو میں بھی آپ کو کافی دست گاہ تھی- قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اپنے زمانہ شباب میں اسمٰعیل صفار کی مجلس املاء میں بیٹھے ہوئے کچھ تحریر فرمارہے تھے حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اس طرح تو تمہارا سماع معتبر نہیں ہوسکتا- ایک طرف لکھنے میں مشغول ہو اور دوسری طرف حدیث بھی سن رہے ہو- دارقطنی نے کہا اچھا جناب کو یاد ہے کہ اب تک شیخ نے کتنی حدیثیں املاء کرائی ہیں انہوں نے کہا نہیں- دارقطنی نے فرمایا اٹھارہ حدیثیں- پھر ان تمام حدیثوں کو بالترتیب حفظ پڑھ کر سنا دیا یہ دیکھ کر اہل مجلس حیران رہ گئے-

ابوالحسن بیضاوی ایک شخص کو اپنے ہمراہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ شخص بڑی دور دراز سے علم حدیث طلب کرنے کے لیے آیا ہے برائے مہربانی چند حدیثیں اس کو بھی املاء کرا دیجئے- دارقطنی نے پہلے تو عذر کیا جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو از راہِ ظرافت بیس سند کے ساتھ یہی ایک حدیث روایت کی-

نعم الشیء الهدية امام الحاجة. اپنی حاجت ظاہر کرنے سے قبل کچھ ہدیہ پیش کرنا بہت اچھا ادب ہے-

دوسرے دن وہ شخص مناسب ہدیہ لے کر حاضر ہوا- آپ نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور سترہ سندوں کے ساتھ حدیث کا یہ متن املاء کرایا-

اذا اتاكم كريم قوم فاكرموه. جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز شخص آئے تو اس کی توقیر کیا کرو-

آپ کی علمی ظرافتوں میں سے ایک واقعہ یہ بھی مشہور ہے کہ ایک دن آپ نماز میں مشغول تھے اور کوئی شخص غلطی سے نسیر کو بشیر پڑھ رہا تھا- دارقطنی نے سبحان اللہ! کہا تا کہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائے مگر وہ نہ ہوا اور اب کی بار یسیر یاء کے ساتھ پڑھنے لگا- جب دارقطنی نے دیکھا کہ یہ کسی طرح اصلاح پر نہیں آتا تو بآواز بلند ﴿**نون و القلم و ما یسطرون**﴾ پڑھنا شروع کر دیا تا کہ وہ سمجھ جائے کہ اس راوی کا نام نون کے ساتھ ہے- اسی طرح ایک شخص عمرو بن شعیب کو عمرو بن سعید پڑھ رہا تھا، یہاں بھی دارقطنی نے سبحان اللہ کہا جب وہ اداء کرنے میں اٹکنے لگا تو دارقطنی نے یہ آیت تلاوت کی ﴿**یا شعیب اصلوتک تامرک**﴾.

حافظ ابونصر ماکولا کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں فرشتوں سے دارقطنی کا حال پوچھ رہا ہوں انہوں نے مجھے یہ جواب دیا ہے کہ جنت میں ان کا لقب امام ہے-

مقبرۂ باب حرب میں معروف کرخیؒ کے پاس آپ کا مزارِ مبارک بنا ہوا ہے-[1]

---

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۱۸۶ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳۱-

ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم

ولادت ۳۲۱ھ وفات ۴۰۵ھ

حاکم نیشاپور کے باشندہ تھے اور ابن البیع کی کنیت سے مشہور تھے۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ بیوپاری لڑکا ہے۔ چونکہ یہ قاضی تھے اس لیے حاکم ان کا لقب پڑ گیا تھا۔ طہمان ان کے جد تھے اس مناسبت سے ان کو طہمانی بھی کہہ دیتے تھے۔ بچپن میں ہی ان کو علم حدیث کا شوق تھا' ان کے والد اور ماموں کو بھی علم حدیث سے بڑا شغف تھا۔ حدیث کی تلاش میں انہوں نے خراساں' ماوراء النہر اور دیگر بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے ان کے شیوخ کی تعداد دو ہزار تھی جن میں ایک ہزار صرف نیشاپور کے شیوخ تھے۔ ابوذر ہروی صاحب روایت بخاری ابویعلیٰ' ابوالقاسم قشیری اور بیہقی وغیرہ جیسے ائمہ حدیث ان سے روایت کرنے والوں کی صف میں داخل ہیں۔ ابوحازم نقل کرتے ہیں کہ حاکم نے آبِ زمزم پی کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعاء مانگی تھی کہ مجھے حسن تصنیف مرحمت ہو' ان کے زمانہ میں تین حافظ حدیث اور تھے' ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ ان کے مابین فیصلہ یہ کیا گیا ہے کہ علل حدیث کی معرفت میں تو دارقطنی ممتاز تھے۔ ابن مندہ کثرت احادیث میں' عبدالغنی منذری انساب میں اور حاکم حسن تصنیف میں۔

خطیب نے ان کو ثقہ کہنے کے باوجود ان میں شیعیت کی نکتہ چینی کی ہے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ سلف میں جو شخص حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دیتا تھا وہ شیعیت سے متہم ہو جاتا تھا۔ رفض اور شیعیت میں بہت فرق تھا۔ طبقات الشافعیہ میں بہت تفصیل کے ساتھ ان کی براءت پر کلام کیا ہے اور اس کا سب سے کھلا ثبوت خود ان کی تصنیف سے یہ پیش کیا ہے کہ حاکم نے مستدرک میں شیخین کی خلافت پر ایک نص صریح پیش کی ہے اسی طرح حضرت عثمانؓ کی فضیلت کے متعلق بھی ایک حدیث روایت کی ہے اور ان دونوں حدیثوں کو صحیح کہا ہے حالانکہ دونوں کی سند میں کلام کرنے کی بہت گنجائش ہے اسی لیے حافظ ذہبی نے حاکم کی تصحیح پر تعقب کیا ہے۔ حاکم کی صفائی کے لیے اس سے زیادہ کھلا ہوا ثبوت اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے ان کی تصانیف بہت ہیں۔ ابن خلکان نے ان کی تعداد ڈیڑھ ہزار لکھی ہے۔ کتاب الاکلیل ان کی بہت مفید تصنیف ہے ہر مفسر کو اس کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔

علم حدیث کے علاوہ ان کو دیگر علوم میں بھی کافی مہارت تھی لیکن چونکہ یہ زیادہ مشغلہ حدیث ہی کا رکھتے تھے اس لیے محدث مشہور ہو گئے تھے مستدرک حاکم ان کی بہت مشہور تصنیف ہے اور حال میں طبع بھی ہو گئی ہے حاکم کا خیال ہے کہ اس کی تمام حدیثیں شیخین کی شرط پر ہیں مگر علماء نے ان کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا۔ ذہبی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس کی بعض حدیثیں موضوع بھی ہیں اور اسی ضرورت سے انہوں نے تلخیص المستدرک تصنیف فرمائی ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ حاکم کی تصحیح پر کسی کو اعتماد کرنا درست نہیں ہے جب تک کہ میرے تعقبات نہ دیکھ لے۔ حاکم کے دعویٰ کے بالکل بالمقابل ابوسعید کا دعویٰ ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو از اوّل تا آخر دیکھا ہے اس میں ایک حدیث بھی شیخین کی شرط پر نہیں ہے۔ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابوسعید کا یہ بیان بھی صریح زیادتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی نصف حدیثیں صحیحین یا ان میں سے ایک نہ ایک کی شرط پر ضرور ہیں اور ایک چوتھائی

حصہ ایسا ہے جو اگر چہ شیخین کی شرط پر نہ ہو لیکن صحیح ضرور ہے۔ البتہ کتاب کا بقیہ چوتھائی حصہ کمزور اور منکر احادیث پر مشتمل ہے بلکہ اس میں موضوعات بھی ہیں جن پر تلخیص المستدرک میں تنبیہ کر دی گئی ہے اور ان چند حدیثوں کی وجہ ہی سے مستدرک تمام کی تمام بے رونق ہو گئی ہے۔

طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابو الفضل ہمدانی جس کا لقب بدیع الزماں مشہور ہے' نیشاپور آیا۔ اسے اپنے حافظہ پر بڑا ناز تھا۔ سو سو اشعار ایک مجلس میں سنتا اور ایک ہی بار سن کر اس کو اس طرح محفوظ ہو جاتے کہ اوّل سے آخر تک پھر آخر سے اوّل تک بالترتیب ان کو سنا جاتا۔ جب اس کے سامنے حفاظِ حدیث کا ذکر آیا تو اس نے اپنے حفظ کے مقابلہ میں ان کو ہیچ سمجھا۔ حاکم کو یہ خبر ملی تو انہوں نے حدیث کا ایک جزء اس کے پاس بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ ایک ہفتہ کی مہلت ہے یاد کر کے سنا دو۔ ایک ہفتہ بعد وہ اجزاء اس نے واپس کر دیئے اور کہا کہ ان مختلف الفاظ' مختلف مضامین اور راویوں کے غیر مرتبط ذخیرہ کو بھلا کون یاد کر سکتا ہے حاکم نے کہا تو اب اپنی حیثیت پہچانو اور آئندہ شیخی کبھی مت بگھارو۔

ان کی وفات اچانک واقع ہوئی ایک دن غسل کے لیے حمام میں تشریف لے گئے جب غسل سے فارغ ہوئے اور لنگی باندھ لی تو ابھی قمیص پہننے نہیں پائے تھے کہ ایک آہ کھینچی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔[1]

ابو محمد علی بن احمد بن حزم الاندلسی

ولادت ۳۸۴ھ وفات ۴۵۷ھ

یہ فارسی النسل تھے۔ قرطبہ میں ان کی ولادت ہوئی ہے فقیہ' مجتہد اور صاحب تصانیف شخص تھے۔ حفظ نہایت قوی تھا اور انتہا درجہ کے ذکی تھے۔ علوم کی وسعت بے نہایت تھی۔ پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے پھر داوٗد ظاہری کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ قیاس کے سرے سے منکر تھے۔ فن منطق محمد بن حسن مذحجی سے حاصل کیا تھا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اسماء الٰہیہ کے متعلق میں نے ان کی ایک تصنیف دیکھی اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کس غضب کے حافظ اور ذکی تھے۔ صاعد بن احمد فرماتے ہیں کہ ابن حزم مختلف زبانوں کی مہارت رکھتے تھے اور علوم اسلامیہ کے علاوہ بلاغت اور شاعری وغیرہ میں تمام اہل اندلس پر فائق تھے۔ ان کے فرزند بیان کرتے ہیں کہ میرے والد کی تصنیفات کے اسّی ہزار ورق میرے پاس موجود ہیں۔ حمیدی کہتے ہیں ابو محمد حافظ حدیث اور مجتہد ہونے کے سوا دیگر علوم میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے اور اسی کے ساتھ باعمل بھی تھے۔ ہم نے ان جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس میں سرعت حفظ' ذکاوت' تدین اور شرافت مزاج کے سب اوصاف بیک وقت جمع ہوں۔ فی البدیہ اشعار کہنے میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کی تصانیف میں کتاب الاحکام' المحلی والمجلی اور الفصل فی الملل والنحل وغیرہ دنیا کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

---

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۲۲۷ والطبقات ج ۳ ص ۶۴ وابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۴ دبستان۔

شیخ عز الدین بن عبدالسلام فرماتے تھے کہ جتنا علم میں نے محلی ابن حزم اور مغنی ابن قدامہ میں دیکھا ہے اتنا کسی اور کتاب میں نہیں دیکھا۔ ذہبی نے بھی ان کی جلالت قدر کو تسلیم کیا ہے۔ ان تمام اوصاف کے باوجود ان میں ایک خطرناک کمزوری بھی تھی۔ اپنی رائے پر انتہا درجہ جمود اور اپنے مخالف کی سخت الفاظ میں تجہیل و تحمیق حتیٰ کہ ائمہ ومحدثین کی بھی نہایت درشت اور نازیبا لہجہ میں تردید کرتے تھے۔

ابن خلکان ابوالعباس سے ناقل ہیں کہ حجاج کی تلوار اور ان کی زبان ہم وزن مشہور تھی اور اسی وجہ سے ان کو جلاء وطن کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ انہوں نے مداواۃ النفوس میں خود یہ تحریر فرمائی ہے کہ میری تلی بڑھ گئی تھی اور اس لیے میرے مزاج میں اتنا تغیر پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے خود اس پر تعجب ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مقدمہ ابن الصلاح کی تلخیص میں حافظ ذہبی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور حافظ ابن حجرؒ نے ترمذی کے تذکرہ میں یہ تصریح کی ہے کہ ابن حزم اپنی علمی وسعت کے باوجود ترمذی اور ان کی تصنیف سے ناواقف تھے۔[1]

ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی

ولادت ۳۸۴ھ وفات ۴۵۸ھ

شافعیہ کے بہت بڑے اور مشہور محدث ہیں۔ حاکم ابوطاہر، ابن فورک متکلم اور ابوعلی رودباری صوفی اور ابوعبدالرحمٰن سلمی صوفی وغیرہم سے علوم حاصل کیے تھے۔ طلب علوم کے لیے کوفہ، بغداد، خراسان، حجاز اور دیگر بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ بہت کثیر التصانیف محدث تھے۔ ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد ایک ہزار تک شمار کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے علم میں بڑی برکت مرحمت فرمائی تھی۔

ذہبی فرماتے ہیں کہ یہ پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے نصوص شافعی جمع کی ہیں سبکی نے اس پر تعقب کیا ہے اور طبقات میں لکھا ہے کہ ان کو پہلا شخص کہنے کی بجائے آخری شخص کہا جائے تو صحیح ہے ان کے قلم سے ایسی ایسی تصانیف نکلی ہیں جن کی نظیر سابقین میں بھی خال خال ملتی ہے۔ کتاب الاسماء والصفات کی نسبت سبکی فرماتے ہیں کہ اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ دلائل النبوۃ، مناقب الشافعی، دعوات الکبیر، شعب الایمان کو سبکی نے قسم کھا کر بے نظیر کہا ہے۔ سنن کبریٰ۔ سنن صغریٰ، خلافیات، کتاب الزہد، اربعین کبریٰ وصغریٰ، کتاب الاسرار بھی ان کی تصانیف میں بہت بلند پایہ تصنیف ہیں۔

امام الحرمین فرماتے تھے کہ ہر شافعی مذہب والے پر امام شافعیؒ کا احسان ہے لیکن ایک بیہقی ہیں جن کا احسان خود امام شافعیؒ پر ہے۔ کیونکہ ان کی فقہ کو اس طرح مضبوط و مدلل طور پر مدون کرنے اور اس کے رائج کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔

معرفۃ السنن والآثار کی تصنیف کے دوران میں متعدد اشخاص نے امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں اس

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۳۲۱ و ابن خلکان ج ص ۳۴۰ و تہذیب التہذیب۔

کتاب کے چند اجزاء ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ آج فقیہ احمد کی کتاب کے سات اجزاء ہم نے پڑھے ہیں- ان تمام فضائل و کمالات کے باوجود یہ تعجبات میں سے ہے کہ جامع ترمذی، نسائی اور سنن ابن ماجہ ان کے پاس نہ تھیں- اس لیے ان ہرسہ کتابوں کی احادیث کی انہیں اطلاع نہ تھی-

شہر نیشاپور میں ان کی وفات ہوئی، پھر ان کا تابوت خسروجرد جو بیہقی کا سب سے بڑا شہر تھا منتقل کر کے لایا گیا اور یہیں آپ کو ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کر دیا گیا-[1]

نور الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الھیثمی

ولادت ۷۳۵ھ وفات ۸۰۷ھ

قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی اور بچپن سے لے کر وفات تک حضر و سفر میں شیخ زین الدین عراقی کے ساتھ رہے- حرمین شریفین، بیت المقدس، دمشق، بعلبک، حمص، حلب اور طرابلس وغیرہ کے تمام سفر عراقی کے ہمراہ کیے- حتیٰ کہ ایسی حدیثوں کی تعداد بہت ہی کم ہے جو انہوں نے کسی شیخ سے تنہا حاصل کی ہیں- عراقی کو ان پر بڑا اعتماد تھا اپنی صاحبزادی کو ان سے منسوب کر دیا تھا اور یہی ان کے بعد ان کے جانشین قرار دیئے گئے تھے-

مصری علماء میں ابوالفتح میدومی، ابن ملوک، ابن قطروانی اور شامیوں میں ابن الخباز، ابن الحموی اور ابن قیم ضیائیہ وغیرہم کے سامنے زانوئے تلمذ کیا تھا- مجمع الزوائد[2] ان کی مشہورترین تصنیف ہے اس کتاب میں تینوں معجم، مسند امام احمد، بزار، اور ابویعلی کے زوائد جمع کی ہیں- راویوں پر جرح وقدح اور روایات پر صحیح وضعیف کا تفصیلی حکم بیان کیا ہے- ابن حبان اور عجلی کی کتاب الثقات جمع کر کے حروف معجم پر اور کتاب الحلیہ کو ابواب کی شکل پر مرتب کر دیا ہے-

ان علمی خدمات کی وجہ سے متونِ حدیث ان کو بہت حاضر تھے- نہایت نرم مزاج، سلیم الفطرت اور اہل خیر محدث تھے- حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجمع الزوائد کا تقریباً نصف حصہ ان کے سامنے پڑھا ہے اور اس کے علاوہ بھی بعض کتابیں پڑھ کر سنائی ہیں- حافظ بھی جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ان کے بعد دوسرا کوئی حافظ ان کی ٹکر کا پیدا نہیں ہوا ان کی حدیثی مہارت کے قائل تھے- ایک مرتبہ انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ مجمع الزوائد میں جو معمولی وہم پیش آ گئے ہیں ان کو تلاش کر کے جمع کر دیں لیکن حافظ نور الدین کی ناگواری کی خاطر یہ ارادہ ملتوی کر دیا تھا- قاہرہ میں آپ کی وفات ہوئی اور باب البرقوقیہ کے باہر مدفون ہوئے-[3]

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۹ و الطبقات ج ۳ ص ۳-

[2] یہ کتاب دس ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے-

[3] شذرات الذہب ج ۷ ص ۷۰ و البدر الطالع ج ا ص ۴۴۱ و الضوء اللامع ج ۵ ص ۲۰۰-

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کِتَابُ التَّوۡحِیۡد

اِنَّ مَعۡرِفَةَ اللّٰہِ تَعَالٰی مِمَّا فَطَرَ عَلَیۡہِ الۡاِنۡسَانَ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَ اِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ وَ اَشۡہَدَہُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰی ۚۛ شَہِدۡنَا ۚۛ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ ہٰذَا غٰفِلِیۡنَ۔ اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَ کُنَّا ذُرِّیَّۃً مِّنۡۢ بَعۡدِہِمۡ ۚ اَفَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ۔

(الاعراف : ۱۸۲-۱۸۳)

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اعتراف انسانی فطرت کی آواز ہے

اور وہ وقت یاد کیجئے جبکہ آپ کے پروردگار نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو اپنی جانوں پر گواہ بنایا' کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں' انھوں نے جواب دیا بیشک ہے' ہم گواہی دیتے ہیں (یہ اس لئے کیا) کہ کبھی قیامت کے دن عذر کرنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی' یا یہ کہنے لگو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادوں نے کیا' ہم ان کے بعد ان کی اولاد تھے (تو مجبوراً اسی راستے پر چلے) تو کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک کرتا ہے جو ہم سے پہلے غلط کاروں نے کیا تھا-[1]

---

[1] تمام ادیانِ سماویہ اور عقائد حقہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے- مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے- جب تک یہ اعتقاد نہ ہو مذہبی میدان میں عقل وفکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی' عقل سلیم اور روحی والہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں- پس ضروری تھا کہ یہ تخم ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبدء منتہیٰ اور تمام ہدایات ربانیہ کا وجود مجمل کہنا چاہیے- عام فیاضی کے ساتھ نوع انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تا کہ ہر آدمی عقل وفہم اور روحی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان وتوحید کے درجہ تک پہنچا سکے- اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداءً یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس سب سے زیادہ اساسی وجوہری عقدہ کا حل ناخن عقل وفکر کے سپرد کر دیا جاتا تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ جاتا جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے- جیسا کہ تجربہ شاہد ہے کہ فکر واستدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف پر منتہی ہوتی ہیں- اس لیے قدرت نے جہاں غور وفکر کی قوت' اور نور روحی والہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی وہیں اس اساسی عقیدہ کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بہرہ ور کیا جس کے اجمال میں کل آسمانی مذاہب وہدایات کی تفصیل موجود تھی اور جس کے بدون مذہب کی عمارت کا ستون کھڑا نہیں رہ سکتا تھا- آج یہ اسی ازلی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدہ پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے اور جن معدود افراد نے کسی روحانی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز بلند کی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی اسی طرح جھوٹے ثابت ہوئے جیسا کہ ایک بخار کا مریض لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ وبدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے- بہر حال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر طبقہ کا خدا کی ربوبیت کبریٰ پر عام اتفاق اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ عقیدہ عقول وافکار کی دوادوش سے پہلے ہی فاطر حقیقی کی طرف سے اولادِ آدم کو بلاواسطہ تلقین فرمادیا گیا تھا ورنہ فکر واستدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہو جانا تقریباً ناممکن تھا- بلاشبہ ہم کو یاد نہیں کہ یہ تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی تاہم جس طرح ایک انشاء پرداز کو یقین ہوتا ہے کہ ضرور اس کو ابتداءً ہم

= میں کسی نے الفاظ بولنے سکھلائے جس سے ترقی کر کے آج وہ اس رتبہ کو پہنچا ہے گو اس کی تفاصیل اس کے ذہن میں اس وقت متحضر نہ ہوں- اسی طرح بنی نوع کا ہر دور میں عقیدۂ ربوبیت پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز ان کی فطرت ہی میں کسی مربی و معلم کی طرف سے ودیعت رکھ دی گئی ہے- اسی ازلی اور فطری تعلیم نے ہر انسان کو خدا کی محبت کے سامنے ملزم کر دیا ہے- اب ہر منکر کے مقابلہ میں خدا کی یہی حجت قاطعہ جس میں فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جاسکتی ہے-[۱]

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کہیں ارقام فرماتے ہیں کہ کسی فن کے مبادی کی تعلیم کی اصل غایت و غرض خود ان مبادی کے یادداشت یا اس کی تعلیم کے شمائل و خصائص کا تحفظ نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد متعلم و مستفیض میں ایک ایسی استعداد پیدا کر دینا ہے جو آئندہ تحصیل علوم کے لیے بطور ایک بنیاد و اساس کارآمد ہو' مثلاً الف و باء کی تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اصل نقوش یا زمانہ تعلیم یا اس کا خاص معلم یادر ہے بلکہ اس ابتدائی تعلیم کا مقصد صرف ملکہ حرف شناسی ہے خواہ پھر تمام علوم و فنون میں پیر جانے کے بعد ذہن کبھی ادھر متوجہ نہ ہو کہ یہ سب کرشمہ کسی استاد شفیق کا مرہون منت تھا- اگر زمانہ کم سنی میں تعلیمی دور شروع ہو جاتا ہے تو بہت کم کسی کو یاد رہ سکتا ہے کہ اس نے قاعدہ کب اور کس طرح اور کس ماحول میں پڑھا تھا بلکہ بسا اوقات اس استاد کا خیال بھی نہیں رہتا مگر اس تعلیم کا اثر (یعنی حرف شناسی) ہمیشہ باقی رہتا ہے- اسی طرح عہد ''بلٰی'' کی غایت و غرض اس ابتدائی سبق یا اس ماحول کی یادداشت نہیں بلکہ فطرت میں ایک ایسی صلاحیت پیدا کر دینا ہے جس کے بعد ہر بدوی و شہری' تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ' مسلم و کافر کے دل میں غیر شعوری طور پر اس مافوق الفہم مسئلہ کے مان لینے کا خود بخود داعیہ پیدا ہو جائے اور جب کبھی کوئی داخلی یا خارجی معمولی سی تحریک بھی ہو تو اس کی طرف فطرت انسانی کو ایک غیر معمولی انجذاب و کشش محسوس ہونے لگے (یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی آمد کے بعد جتنی شدت سے رسالت کا انکار کیا گیا ہے اتنا وجود باری کا نہیں کیا گیا) اس بنا پر یہ سوال ہی وارد نہیں ہوتا کہ جب عہد بلٰی ہم کو یاد ہی نہیں رہا تو پھر اس عہد کا فائدہ کیا نکلا-

امام شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر عالم ارواح کا عہد اس عالم اجسام میں یاد نہ رہا تو تعجب کیا ہے جب کہ معلوم نہیں کہ اس کی صورت مثالیہ کتنی بار بنی اور بگڑی' کتنے آباء و امہات میں منتقل ہوئی' پھر نطفہ' علقہ اور مضغہ کے کتنے قالب بدلائی' پھر کتنے اجزاء کا اس میں اور اضافہ کیا گیا' پھر نہ معلوم کہ کتنے زمانہ بعد احسن الخالقین کے کرشمہ سازی کی شہادت دینے کے لیے مساحت وجود میں آئی- اگر ان ارتقائی مراتب کی ایک کڑی بھی فراموشی کے لیے معقول سبب بن سکتی ہے تو جو انسان ایک غیر محدود مدت سے اس گرداب میں پڑا چکر ہی کھا تا رہا ہے- اس کی عہد ''بلٰی'' کی فراموشی اتنی قابل الزام نہیں ہے با ایں ہمہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سہل بن عبداللہ تستریؒ سے منقول ہے کہ ان کو اتنی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی اپنا قدیم عہد یاد تھا-[۲]

معلوم نہیں کہ خدائے قدوس کے کتنے بندے اور ہوں گے جنہیں تصفیہ روح کے بعد اپنا قدیم عہد یاد آ گیا ہوگا- مگر مزاج سلف میں نہ اس سوال کی اہمیت تھی نہ اس کے جواب کی ضرورت- اس لیے ذخیرۂ نقل کسی لمبی فہرست پیش کرنے سے خاموش ہے-

سلسلہ اشہاد کی تفاصیل میں احادیث موقوفہ و مرفوعہ کا ایک صحیح ذخیرہ موجود ہے- معتزلہ کے نزدیک صرف انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور فطرت انسانی میں اقرار ربوبیت کی صلاحیت ہی اس سوال و جواب کی حقیقت ہے اس لیے اس آیت میں انہیں تو کوئی اشکال نہیں- البتہ محدثین کا قدم کچھ اس سے آگے ہے- یہاں تفسیر ابن کثیر کا مطالعہ کیجئے انہوں نے اس مقام کو خوب مرتب و مہذب کر دیا ہے-

---

۱ مختصر فوائد حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی-

۲ دیکھو الیواقیت والجواہر ج ا ص ۱۰۱-

(۱) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یُقَالُ لِلرَّجُلِ مِنْ اَھْلِ النَّارِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ أَرَاَیْتَ لَوْکَانَ مَا عَلَی الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ أَکُنْتَ مُفْتَدِیًا بِہٖ' قَالَ فَیَقُوْلُ نَعَمْ قَالَ فَیَقُوْلُ قَدْ اَرَدْتُ مِنْکَ اَھْوَنَ مِنْ ذٰلِکَ قَدْ اَخَذْتُ عَلَیْکَ فِیْ ظَھْرِ اٰدَمَ اَنْ لَا تُشْرِکَ بِیْ شَیْئًا فَاَبَیْتَ اِلَّا اَنْ تُشْرِکَ بِیْ۔

(رواہ احمد و الشیخان و غیرھم)

(۱) انس بن مالکؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک دوزخی شخص سے کہا جائے گا بتلا اگر (تیرے پاس آج) تمام زمین کا مال ہوتا تو کیا تو وہ سب اس عذاب کے فدیہ میں دے دیتا وہ عرض کرے گا ضرور' باری تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ میں نے تو تجھ سے اس سے بہت ہلکا مطالبہ کیا تھا (یعنی) جب تو آدمؑ کی پشت میں تھا تو تجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میرا کسی کو شریک مت ٹھہرانا مگر تو نہ مانا اور شریک ٹھیرا کر رہا۔ (اس حدیث کو امام احمد اور شیخین وغیرہ نے روایت کیا ہے۔)

(۲) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ فَاَبَوَاہُ یُھَوِّدَانِہٖ اَوْ یُنَصِّرَانِہٖ اَوْ یُمَجِّسَانِہٖ کَمَا تُنْتَجُ الْبَھِیْمَۃُ بَھِیْمَۃً جَمْعَاءَ ھَلْ تُحِسُّوْنَ فِیْھَا مِنْ جَدْعَاءَ ثُمَّ یَقُوْلُ اَبُوْھُرَیْرَۃَؓ وَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ ﴿فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ﴾۔ (الروم: ۳۰) ۔ (رواہ الاربعۃ)

(۲) حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ہر بچہ اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں جیسا کہ چوپائے صحیح وسالم بچہ جنتے ہیں' کیا تم اس میں کوئی ناک' کان کٹا دیکھتے ہو۔ اس کے بعد حضرت ابوہریرہؓ فرماتے کہ اگر چاہو تو اس کی تصدیق قرآن کریم میں پڑھ لو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں' دین قیم (صحیح دین) یہی ہے (اس حدیث کو چار کتابوں میں روایت کیا ہے)

---

(۲) ✻ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ہر نوع کے لیے کچھ ظاہری و باطنی خصوصیات علیحدہ مقرر فرمائی ہیں جن کی وجہ سے ان انواع میں باہمی امتیاز قائم ہے۔ مثلاً طیور کے لیے' پَر' پنجے' چونچ چوپایوں کے لیے جسم پر بال ایک بچھا ہوا قامت اور ایک مخصوص انداز کے پاؤں پھر ہر ہر نوع کے لیے مخصوص مخصوص رنگ جدا جدا مقدار وصورت مقرر کی ہے۔ یہ تو ان کی ظاہری خصوصیات ہوئیں اب اسی طرح ان کی کچھ باطنی خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کا مخصوص پھولوں سے عرق نکال کر کیمیاوی طریق پر شہد تیار کرنا۔ بعض پرندوں کا اس نزاکت سے گھونسلہ بنانا کہ عقل انسانی بھی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائے۔ جب سے عالم پیدا ہوا ہے شہد کی مکھی سے لے کر ایک ہاتھی تک اپنی اپنی ظاہری و باطنی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس لیے یہ خصوصیات ان کی فطرت کہلاتی ہے۔

اب حضرتِ انسان پر ذرا غور کیجئے۔ اس میں بھی نوعی طور پر کچھ ظاہری و باطنی خصوصیات ہیں جو ان ہی خصوصیات کو لیے ہوئے ہر دور زندگی میں مشترک طور پر نظر آتی ہیں۔ یہی اس کی فطرت کہلاتی ہیں۔ مثلاً اس کی ظاہری خصوصیات یہ ہیں کہ اس کے جسم پر نہ پرندوں کے سے پَر ہیں' نہ حیوانات کے سے بال ایک مخصوص انداز کا سیدھا اور صاف قامت ہے' ایک مخصوص قسم کا دلکش رنگ اور ایک مخصوص انداز کی دلربا صورت' اس کی باطنی خصوصیات' اس کی عقل وہ عقل ہے جس میں اپنے خالق کی معرفت کی طلب' اس کی عبادت کا جذبہ' اس کی رضامندی کی تڑپ ہے۔ پیدائش عالم سے لے کر اگر نوع انسانی پر غور کرو گے تو جس طرح دیگر حیوانات اپنے ان باطنی خصوصیات ﷲ ....

النهى عن الخوض فى ذات الله تعالىٰ

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک میں کھود کرید کرنے کی ممانعت

(۳) عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ یَاْتِی الشَّیْطَانُ اَحَدَکُمْ فَیَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ کَذَا. مَنْ خَلَقَ کَذَا. حَتّٰی یَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ رَبَّکَ فَاِذَا بَلَغَ ذٰلِکَ فَلْیَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَ لْیَنْتَهِ. (رواه الثلاثة)

(۳) ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان تمہارے پاس آتا ہے اور کہتا ہے یہ چیز کس نے پیدا کی؟ یہ چیز کس نے بنائی؟ یہاں تک کہ کہتا ہے اچھا تو تمہارے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہاں تک نوبت پہنچے تو خدا کی پناہ لینا چاہیے اور اس کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ ختم کر دینا چاہیے (اس حدیث کو تین کتابوں میں روایت کیا ہے)

☜ .... میں متفق نظر آتے ہیں اسی طرح نسل انسانی اس مطالبہ میں اختلاف نہیں رکھتی- اس لیے یہ اس کی فطرت کہلانا چاہیے- جمہور عالم کو مذہبی تلاش اسی فطری آواز کے ماتحت ہے- ہاں کبھی بیرونی اسباب اور اس کے ماحول کے اثرات اسے اتنا متاثر کر دیتے ہیں کہ اس میں خالق کی تلاش نہیں رہتی اور اگر رہتی بھی ہے تو طبیعت غلط راستہ کی طرف بھٹکنے لگتی ہے- مگر ان اثرات کو فطرت نہیں کہا جا سکتا- خلافِ فطرت کہا جائے گا جیسا کہ بھوک لگنا' مذکر کا مؤنث کی طرف میلان' اسباب زینت سے اپنے نفس کو آراستہ کرنا' یہ انسان کی فطرت ہے مگر جب یہودیت ونصرانیت کا بھوت اس کی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے تو رہبانیت کی زندگی اسے محبوب نظر آنے لگتی ہے- گرسنگی اور عزوبت (نکاح نہ کرنا) کی زندگی مرغوب بن جاتی ہے یہ فطرت نہیں خلافِ فطرت ہے- فابواہ یہودانہ کی یہی شرح سمجھنا چاہیے- (حجۃ اللہ البالغہ ج ص ۶،۳۰۹،۷ و۱۶۶ و ۱۶۷)

مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ حدیث میں فطرت سے مراد بھی عہد ربوبیت ہے-

(۳) ✻ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں مداخل شیطان پر طویل بحث کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ وہ کیا کیا ہیں' کن کن راستوں سے شیطان آتا ہے اور کن کن وساوس میں مبتلا کرتا ہے' ان تمام تفصیلات کو تو یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا- البتہ حدیث کی شرح کے لیے اتنا لکھنا ضروری ہے کہ اس کے بہکانے کا ایک راستہ یہ ہے کہ پہلے وہ دماغ میں سوالات کا ایک مرتب سلسلہ قائم کر دیتا ہے اور نہایت سادگی کے ساتھ اس ضمن میں ایک غلط کلیہ ذہن نشین کر دیتا ہے جس میں بظاہر کوئی سقم نظر نہیں آتا-

دیکھو یہ کتنی سیدھی اور سچی بات ہے کہ مخلوق کے دائرہ میں جس طرف نظر اٹھاؤ خالق کا سوال بجا ہی بجا نظر آئے گا' اس لیے یہ بدیہی ہوگا کہ جو چیز ہے اس کا کوئی خالق ضرور ہے- اس قاعدہ کو کلیہ تسلیم کرنے کے لیے اس مشاہدہ سے زیادہ سہل طریقہ اور کیا تھا مگر اس کے بعد اب دھوکا یہ ہے کہ اللہ کو مخلوق کے دائرہ میں شامل کر کے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ جب کلیۃً ہر چیز کے لیے خالق ہونا مسلم ہو گیا تو پھر اللہ کے لیے بھی کوئی خالق ہونا چاہیے- گو یہ سوال غلط در غلط تھا کیونکہ اللہ اسی کو کہتے ہیں جو سب کا خالق ہو اور وہ کسی کی مخلوق نہ ہو پھر اس کے متعلق خالق کا سوال کرنا متناقض سوال ہے' مگر وسوسہ ایسی ہی باطل حقیقت کا نام ہوتا ہے- بسا اوقات خود انسان کا ضمیر بھی اس پر نفرین کرتا ہے مگر دل ہے کہ تذبذب میں ڈوبا چلا جاتا ہے- مصیبت یہ ہو جاتی ہے کہ جب ایک مسلسل اور مرتب مشاہدہ کے بعد دل میں ایک بات اثر کر جاتی ہے تو اس کی تردید کے لیے جب تک اسی درجہ کا مرتب و مسلسل مشاہدہ میسر نہ ہو اطمینان نصیب نہیں ہوتا مگر یہاں سوائے ایک اللہ کے اور کوئی ایسا ملتا ہی نہیں جس کا خالق کوئی نہ ہو اس لیے ذہن اندر ہی اندر اپنے قدیم تاثر کے ماتحت خالق کے لیے خالق کا مطالبہ کرتا ہی رہتا ہے- عقل گو ہزار دفعہ اسے سمجھاتی ہے مگر اپنی آنکھوں کا مشاہدہ ہر دفعہ اسے ناسمجھ بنا دیتا ہے-

ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے شبہات پر اگر غور کرو گے تو اس کا حاصل بھی اتنا ہی پاؤ گے یعنی مصنوعات کے سطحی ☜ ....

(۴) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اِنَّ اُمَّتَکَ لَا یَزَالُوْنَ یَقُوْلُوْنَ مَا کَذَا مَا کَذَا. حَتّٰی یَقُوْلُوْا ھٰذَا اللّٰہُ. خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰہَ. (رواہ الشیخان)

(۴) انس بن مالکؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک حدیث قدسی ارشاد فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (اے پیغمبر) آپ کی امت برابر یہ کہتی رہے گی یہ کیسے ہوا' یہ کیسے ہوا' یہاں تک کہ یہ کہے گی خدا نے تو ساری مخلوق کو پیدا کیا پھر خدا کو کس نے پیدا کیا- اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے-

(۵) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اے

☜ .... مطالعہ سے پہلے ایک قاعدہ ذہن نشین کرلیا جاتا ہے- اگر واقعات نے اپنی خاموش زبان سے اس کی تردید نہ کی تو پھر اس کا نام فلسفہ بن جاتا ہے اور اسی فلسفہ کی بناء پر الٰہیات کے بلند پایہ حقائق اور عالم غیب کے برتر از عقول اسرار کا نہایت دلیری سے انکار کردیا جاتا ہے اور اس طرح دنیا ہے کہ صانع کو مصنوع پر' عالم غیب کو عالم شہود پر قیاس کر کر کے اپنی بے عقلی کا ہر دن ایک نیا ثبوت دیتی رہتی ہے مگر شیطان ہے کہ ہر روز نئے نئے فلسفہ کے نام سے اسے دماغوں میں اتارتا رہتا ہے اور نئی نئی گمراہی کے سامان مرتب کرتا رہتا ہے- شریعت نے راہ مختصر کردی اور متنبہ کردیا کہ اللہ کی ذات پاک عقل کی جولانگاہ نہیں بن سکتی اوس کی ذات وصفات عقل کی سرحد سے بلند تر ہیں- جہاں دعوت غور وفکر ہے وہ دائرۂ مخلوق ہے خالق نہیں- بیرون از قیاس ہمیشہ قیاس سے باہر رہے گا- خدا تعالیٰ کا خالق ہونا بدیہی ہے یہاں یقین ومعرفت کا راستہ صرف وہ وجدان ہے جو ہر شخص اپنے دل میں بلاغور وفکر محسوس کرتا ہے- بشرطیکہ شکوک وشبہات سے اس کو مکدر نہ کیا جائے اس فطری سوز کے ساتھ اگر ساز انفس وآفاق کی آواز سنو تو اس کے ہر تار سے ایک ہی نغمہ سنو گے اور وہ خدا کی خالقیت کا اقرار ہوگا پھر مخلوق کا ہر ذرہ اس کے وجود کی ایک بدیہی دلیل نظر آئے گا اور اس طرح خدا کی ذات کا تم کو وہ یقین میسر آجائے گا جہاں وساوس خود بخود دفنا ہو جائیں گے- بدیہیات میں جس قدر دلائل کی آڑ لی جاتی ہے اسی قدر اور الجھاؤ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے- وجدانیات اور مشاہدات ہمیشہ وجدان اور مشاہدہ سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں- ذات پاک کا مشاہدہ تو ہو نہیں سکتا اس لیے یہاں یقین کی راہ آفاق وانفس میں غور وتفکر سے کھلتی ہے-

وسوسہ ہے کیا؟ انسان کی خود اپنے ہی نفس کی تراشیدہ باتیں' یہاں جو متکلم ہے وہی مخاطب ہے' جو مسیحا ہے وہی بیمار ہے' اس لیے وسوسہ کو کتنا ہی ختم کیجئے ختم نہیں ہوتا- اگر مخاطب کوئی دوسرا ہوتا تو دلائل وبراہین سے اس کا منہ بند کیا جا سکتا' یہاں تو دل ہی دل میں یکے بعد دیگرے لایعنی سوالات کا ایک سلسلہ زلف مسلسل کی طرح کھنچتا چلا جاتا ہے اس لیے معالج حقیقی نے مناظرہ کی راہ نہیں بتلائی کہ یہ اور شکوک وشبہات کی راہ ہے بلکہ ایسی چار باتوں کا امر فرمایا ہے جن میں سے ہر ایک اس نادیدہ دشمن پر فتح حاصل کرنے کا ایک مستقل سامان ہے- (۱) اپنے آقائے حقیقی کی پناہ کہ جو اس کی پناہ لیتا ہے اسے پناہ مل جاتی ہے (۲) تذلیل خصم بقول شخصے جواب جاہلاں باشد خموشی' پہلی حدیث کا مفہوم یہی ہے (۳) ذکر اللہ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّیْطَانِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (الاعراف: ۲۰۱) (۴) تجدید ایمان- مبادا کہ وساوس کی رو نے کہیں ایمان زخمی کردیا ہو تو اس کی تلافی ہو جائے جیسا کہ صحیح مسلم کے لفظ میں ہے لیکن اگر وساوس اپنی حد سے گذر کر کچھ دلائل کے ساتھ دل میں گھر کر چکے ہیں تو پھر ان کی توڑ کے لیے دلائل سے بھی مقابلہ کرنا ہوگا اب یہ وسوسہ نہیں عقیدہ کہلائیں گے-

(۵) * یہ واضح رہنا چاہیے کہ جاہلوں سے مناظرہ کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت نہیں بلکہ ان کی سنت اعراض کرنا ہے- قرآن کریم میں ہے ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ﴾ (الحجر: ۹۴) جو آپ کو حکم ملے اس کو دوٹوک بیان کردیجئے اور کافروں سے اعراض فرمائیے- معاند سے مناظرہ کرنا اپنے وقت کی اضاعت اور اس کی درشت فطرت کو اور ضد پر آمادہ کرنا ہے اس لیے ابو ہریرہؓ نے یہاں اعراض ☜ ....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُوْنَ يَسْئَلُوْنَكَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ قَالَ فَبَيْنَا اَنَا فِي الْمَسْجِدِ اِذْ جَآءَ نِيْ نَاسٌ مِنَ الْاَعْرَابِ فَقَالُوْا يَا اَبَاهُرَيْرَةَ هٰذَا اللّٰهُ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ قَالَ فَاَخَذَ حَصًى بِكَفِّهٖ فَرَمَا هُمْ بِهٖ ثُمَّ قَالَ قُوْمُوْا قُوْمُوْا صَدَقَ خَلِيْلِيْ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (رواہ مسلم)

ابو ہریرہؓ لوگ تجھ سے برابر سوالات کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ سوال کریں گے یہ تو اللہ ہے (جس نے مخلوق بنائی) تو اللہ کو کس نے بنایا ہے- ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا دفعۃً چند گنوار میرے پاس آئے اور بولے اے ابو ہریرہؓ یہ تو اللہ ہے (جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے) پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ ابوسلمہ راوی حدیث کہتا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے اپنی مٹھی میں کنکریاں لے کر ان پر پھینکیں اور فرمایا اٹھو اٹھو میرے پیارے رسولؐ نے سچ فرمایا تھا- (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

(۶) عَنْهُ قَالَ جَآءَ نَاسٌ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلُوْهُ اِنَّا نَجِدُ فِيْ اَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ اَحَدُنَا اَنْ يَّتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ وَ قَدْ وَ جَدْتُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذٰلِكَ صَرِيْحُ الْاِيْمَانِ. وَ فِيْ رِوَايَةٍ مَحْضُ الْاِيْمَانِ. (رواہ مسلم)

(۶) ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ ہم اپنے دلوں میں ایسے خطرات محسوس کرتے ہیں کہ انہیں زبان سے ادا کرنا پہاڑ معلوم ہوتا ہے آپ نے جواب دیا کہ کیا تمہیں یہ ناگواری ہوتی ہے؟ وہ بولے جی ہاں' آپ نے فرمایا پھر یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے اور ایک روایت میں ہے خالص ایمان ہے- (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

(۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَآءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّيْ اُحَدِّثُ نَفْسِيْ

(۷) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہا میرے دل میں ایسی باتیں

.... کرنا ہی مناسب سمجھا- نیز وسوسہ غیر اختیاری چیز ہوتی ہے- بعض مرتبہ بحث کے الجھاؤ میں خود اپنے دل میں وساوس گذرنے لگتے ہیں اس لیے سلف ہمیشہ ایسی جھاڑیوں میں گھستے ہوئے ڈرا کرتے تھے- جہاں ان کے یقین میں شک وتردد کا کانٹا بھی لگنے کا اندیشہ ہوتا تھا-

(۶) * بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ خود وساوس ہی ایمان کی علامت ہیں جیسا کہ چوری ہونا مال داری کی نشانی ہے' نہ مال ہوتا نہ چور آتے' اسی طرح نہ یہاں ایمان ہوتا نہ وساوس آتے-

اسی لیے بندہ جتنا تقرب کی راہ چلتا ہے اتنا ہی وساوس اسے اور گھیرتے ہیں- حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ وساوس جس قدر نماز میں آتے ہیں اتنا عام حالات میں نہیں آتے ادھر شیطان اپنی سعی میں لگا رہتا ہے ادھر بندہ اپنے مولیٰ کی پناہ لے کر اسے دفع کیا کرتا ہے جتنا وہ اس کے ایمان کو گندہ کرنے کی فکر کرتا ہے اتنا ہی یہ اپنی اظہار بیزاری کر کے اسے پاک وصاف کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وساوس ندارد ہو جاتے ہیں اور اس کا ایمان صاف وخالص رہ جاتا ہے- حدیث میں صریح ایمان اور خالص ایمان کی شرح یہ ہے- (کتاب الایمان ص ۱۱۳)

(۷) * آپ کے جواب کی دو شرح کی گئی ہیں- پہلی شرح اس پر موقوف ہے کہ "امرہ" میں ضمیر کا مرجع شیطان قرار دیا جائے اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے خدا کا شکر اس بات پر ادا فرمایا کہ اس نے شیطان کو وسوسہ ڈالنے سے زیادہ پر قدرت ہی نہیں دی' دوسری شرح میں ضمیر کا مرجع خود یہ شخص ہے اور اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس شخص کا معاملہ صرف وسوسہ کی حد تک رہ گیا اور اس ....

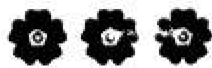
بِالشَّیْءِ لَاَنْ اَکُوْنَ حُمَمَۃً اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ اَتَکَلَّمَ بِہٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ رَدَّ اَمْرَہٗ اِلَی الْوَسْوَسَۃِ. (رواہ ابوداؤد)

پیدا ہوتی ہیں کہ مجھے (جل کر) کوئلہ ہو جانا ان کے ادا کرنے سے زیادہ پسند ہے- آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس کے معاملہ کو اس نے صرف وسوسہ کی حد تک رکھا- (اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

؎ .....سے آگے تجاوز نہ کر سکا- حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ جب خالق کے لیے خالق کا تسلسل دماغ میں پیدا ہونے لگے تو اس کے دفع کرنے کے لیے آپ نے یہ کلمات پڑھنا تعلیم فرمائے ہیں- ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ (الحدید:۳) ابوزمیل نے ابن عباسؓ سے عرض کیا کہ میرے سینہ میں ایک بات کھٹکتی ہے فرمایا کیا ہے؟ انہوں نے کہا زبان پر نہیں لا سکتا فرمایا کہ اس قسم کے وساوس سے کس کو چھٹکارا ہے- جب ایسی بات پیش آئے تو کلمات مذکورہ بالا پڑھ لیا کرو- ان کلمات کا حاصل یہ ہے کہ علل میں تسلسل عقلاً محال ہے اس لیے مخلوقات کا سلسلہ ضرور کہیں جا کر خالق پر ختم ہونا چاہئے- پھر جس سے پہلے اور جس کے بعد کوئی نہ ہو وہی اوّل و آخر خدا کی ذات ہے اس کے لیے پھر خالق کا تصور کرنا موجب تسلسل ہے- شیطان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو آنکھوں سے نظر آئیں یہ شیطان الانس ہیں- دوم جو آنکھوں سے نظر نہ آئیں یہ شیطان الجن ہیں- جو آنکھوں سے نظر آئیں ان کے شر سے حفاظت کی صورت اعراض و درگزر کرنا یا معقول جواب دینا ہے جیسا کہ ابو ہریرہؓ نے کیا تھا- دوسری قسم کا علاج استعاذہ اور خدا سے پناہ مانگنا ہے- ان دونوں صورتوں کو کسی شاعر نے نظم کر دیا ہے ؎

فما هوا لا الاستعاذة ضارعا
او الدفع بالحسنى هما خير مطلوب
فهذ ادواء الداء من شر ما يرى
و ذاك دواء الداء من شر محجوب
(زاد المعاد ج ۲ ص ۴۸)

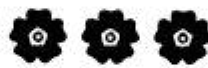
دو باتیں (وسوسہ کا) بہترین علاج ہیں ایک تضرع کے ساتھ استعاذہ کرنا- دوم معقول پیرایہ میں جواب دینا-
پہلی بات تو اس شیطان کے شر کا علاج ہے جو آنکھوں سے نہیں نظر آتا
اور دوسری بات اس شیطان کا جو آنکھوں سے نظر آتا ہے-
(یعنی بہکانے والے انسان)



اِسۡمُ اللّٰہِ الۡاَعۡظَمُ

اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم

اسماء دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن میں صرف ذات ملحوظ ہوتی ہے ان کا مقصد صرف اس ذات کا تعارف ہوتا ہے' براہ راست ان کی صفات کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں ہوتا' دوسرے وہ جن میں خاص کسی نہ کسی صفت کا لحاظ ہوتا ہے' ان اسماء سے اس ذات کی کسی خاص صفت ہی کا تعارف ہوتا ہے اور بس پہلی قسم اسم ذات اور دوسری اسم صفت کہلاتی ہے' خدا کا ذاتی نام یا ''اللہ'' ہے[1] یا ''رحمٰن'' بقیہ جتنے نام ہیں اس کے صفاتی نام ہیں- ذات میں چونکہ جملہ صفات کا وجود لپٹا ہوا ہوتا ہے اس لیے اسماء میں اسم اعظم[2] شاید وہی اسم ہوسکتا ہے جس کو اسم ذات کہا جائے اس لحاظ سے اسم اعظم یا ''اللہ'' یا ''رحمٰن'' ہونا چاہیے- رحمٰن گو اسم صفت ہے مگر بارگاہ الوہیت میں رحمت کا اتنا غلبہ ہے کہ اس کی ذات ہی گویا عین رحمت ہے اس لیے بنی سرائیل میں ''رحمٰن'' خدا کے اسم ذات کی جگہ مستعمل تھا- شریعت اسماعیلیہ میں جو اصل اسم ذات تھا وہ خدا کو پکارنے کے لیے بتلا دیا گیا اور اسی لیے جو شریعت آخری شریعت اور سب شرائع کی جامع تھی اس نے بسم اللہ میں ان دونوں ناموں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے- قرآن کریم اور احادیث میں جہاں جہاں نظر ڈالیے وہاں اسماء الٰہیہ میں پہلے لفظ اللہ مذکور ہوتا ہے بقیہ نام اس کے بعد بطور تابع ذکر ہوتے ہیں- یہی حال اسم ''رحمٰن'' کا ہے- جہاں یہ اسم مبارک اور اسماء کے ساتھ مستعمل ہے وہاں اس کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے اس لحاظ سے بسم اللہ میں دو اسم ذاتی ہیں اور ایک اسم صفتی' اس لیے رحمٰن و رحیم کے یکجا جمع کرنے میں جو پر از تکلفات جواب دیئے گئے ہیں احقر کے نزدیک ان کی ضرورت نہیں ہے- صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ شریعت موسویہ چونکہ جلالی شریعت تھی اس لیے ضرورت تھی کہ اس میں خدا کو ہمیشہ ''الرحمٰن'' کہہ کر پکارا جائے' شریعت اسماعیلی جمالی شریعت ہے یہاں اسم ذات وہ رہے گا جو دراصل ذات باری تعالیٰ کے لیے موضوع ہو وہ لفظ اللہ ہے-



---

[1] شیخ اکبر کو اس میں کچھ تردد ہے- دیکھو الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۷۱ و ۷۲-

[2] اسمائے الٰہیہ میں تفاصیل کی بحث دیکھنا ہو تو الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۳۷ ملاحظہ کیجئے-

(۸) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ اَنِّیْ اَشْهَدُ اَنَّکَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ فَقَالَ لَقَدْ سَأَلْتَ اللّٰهَ بِالْاِسْمِ الَّذِیْ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى وَ اِذَا دُعِیَ بِهٖ اَجَابَ. (رواه اصحاب السنن)

(۸) عبداللہ بن بریدہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ دعاء کرتے ہوئے سنا ''اے اللہ میں درخواست پیش کرتا ہوں کہ میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تو ہی ہے تیرے سوا کوئی خدا نہیں' یکتا ہے' بے نیاز ہے' نہ کسی کا باپ ہے' نہ اس کا کوئی بیٹا' نہ اس کا کوئی ہمسر' آپؐ نے فرمایا کہ تو نے خدائے تعالیٰ کو وہ نام لے کر پکارا ہے کہ جب اس نام کے ساتھ اس سے سوال کیا جاتا ہے تو ضرور جواب دیتا ہے اور جب اس کو پکارا جاتا ہے تو ضرور جواب دیتا ہے۔
(اس حدیث کو اصحاب سنن نے روایت کیا ہے)

---

(۸) * مشرکین عرب جو خدائی تنزیہ سے یکسر نابلد تھے ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے تخیل کے مطابق نہایت بے باکی سے یہ سوال کر بیٹھے ''انسب لنا ربک'' ہمیں ذرا اپنے پروردگار کا نسب تو بتلایئے گویا ان کے نزدیک خدائے تعالیٰ بھی انسانوں کی طرح حسب ونسب کے میزان میں تولا جا سکتا تھا۔ ان کے اس جاہلانہ سوال کے جواب میں ایک نہایت مختصر ترین سورت اتری' جس نے خدا کی ذات کا سب سے اعلیٰ اور سب سے پاک تعارف اس طرح پیش کیا کہ وہ یکتا و یگانہ ہے' نہ ذات میں اس کا کوئی شریک ہے نہ صفات میں اس کا کوئی سہیم' یہی احدیت کا مفہوم ہے۔ یہ وہ صفت تھی کہ اس سے زیادہ آسان اور اس سے زیادہ صحیح تعارف کسی اور صفت کے ساتھ مشکل ہے۔ ذات ﴿وحده لاشريک له﴾ کی ایک صفت واحدیت بھی ہے مگر احدیت اس سے کامل تر ہے تمام سورۂ اخلاص اسی کی تفسیر ہے۔ صمدیت اسی احدیت کی تکمیل ہے اور ﴿لم يلد و لم يو لد﴾ اسی کی تشریح۔ ﴿صمد﴾ بے نیاز کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ ایک اور اکیلا ہو کر بھی اپنے کمال میں کسی کا محتاج نہیں۔ والد کی طرح نہیں جو اپنے بیٹے کے لیے محتاج الیہ ہو کر بھی اپنے کمالات کی شہرت و بقاء میں تمام تر اپنے بیٹے کا محتاج ہے اور نہ اس ولد کی طرح ہے جو ایک جہت سے محتاج الیہ بن کر بھی اپنے وجود میں والد کا سرتاسر محتاج ہوتا ہے۔ نسب وہاں قائم ہو سکتا ہے جہاں رشتۂ اشتقاق پیدا ہو سکے۔ جہاں اوپر اور نیچے کی دونوں جانبوں میں رشتۂ اشتقاق نہیں وہاں نسب کا تصور بھی نہیں۔ اصول وفروع سے گذر کر نسب کا دوسرا تخیل شعب و اطراف میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر جس کا کوئی کفو و نظیر بھی نہیں اس کے لیے نسب کا تصور اطراف و جوانب میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ صرف یہ جواب کہ اس کا کوئی نسب نہیں ان کے مذاقِ فطرت کے موافق نہ تھا۔ اس لیے آپ نے پہلے وجودی دو صفتیں ایسی ذہن نشین کر دیں جس کے نتیجہ میں دو سلبی صفتیں پیدا ہو جائیں اور اس کے بعد نسب کا سوال خود بخود ذہنوں سے نکل جائے۔ یہ واضح رہنا چاہیے کہ غنی وصمد میں بڑا فرق ہے۔ صمد اس کو کہتے ہیں جو خود کسی سے برآمد نہ ہو سکے اور نہ کوئی دوسرا اس سے برآمد ہو سکے جیسا کہ والد اور ولد' اس لیے خدا کے نسب کی بجائے (جو ایک ذاتی چیز تھی اس کی) صمدیۃ کو پیش کیا گیا ہے۔ غناء وفقر نسب کی جگہ نہیں آ سکتے' یہ خارجی اوصاف وعوارض ہیں۔ نسب ایک رشتہ خون کا نام ہے جس میں جزئیت کا مفہوم کسی نہ کسی پہلو سے ضرور سامنے آتا ہے۔ صمدیت اس رشتہ کے بالمقابل غناء و بے نیازی کا نام ہے یعنی اس ذاتِ پاک میں اس اندرونی اشتقاق کی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ کسی نوعیت سے بھی وہاں نسب کی شرکت کا تصور لایا جا سکے۔ اسماء الہیہ میں بسا اوقات الفاظ کا ترجمہ یکساں نظر آتا ہے مگر اس کے مصداق وصحیح مفہوم میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان مختصر نوٹوں میں ان تمام تفاصیل کی گنجائش نہیں لھ.....

(۹) عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِسْمُ اللّٰهِ الْاَعْظَمُ فِيْ هَاتَيْنِ الْاٰيَتَيْنِ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ وَ فَاتِحَةُ سُوْرَةِ اٰلِ عِمْرَانَ. الٓمّٓ ۝ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ.

(رواه الامام احمد و ابوداؤد و الترمذی)

(۹) اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کا اسم اعظم ان دوآیتوں میں ہے ﴿وَ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَّا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ (البقرۃ:۱۶۳) ''تمہارا خدا ایک ہے' معبود کوئی نہیں مگر وہی ایک اللہ جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے'' اور دوسری آیت سورۂ آل عمران کے شروع میں ہے ﴿الٓمّٓ. اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ (آل عمران:۱) ''الٓمّٓ. اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ سدا رہنے والا اور تمام مخلوق کی ہستی قائم رکھنے والا ہے۔ (اس حدیث کو امام احمدؒ ابوداؤدؒ اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۰) عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّهُ كَانَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا فِي الْمَسْجِدِ وَ رَجُلٌ يُصَلِّيْ ثُمَّ دَعَا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ

(۱۰) انسؓ سے روایت ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں بیٹھے تھے ایک آدمی نماز پڑھ رہا تھا (نماز سے فارغ ہوکر) اس نے یہ دعا کی ''اے اللہ میں یہ درخواست پیش کرتا ہوں کہ تعریف صرف تیرے

﴾..... ہے- یہاں یہ تشریح صرف اس مقصد کے پیش نظر ہے کہ ابتداء کتاب میں خدائے تعالیٰ کے مختصر تعارف کے ساتھ ان اسماء کی مقبولیت ومحبوبیت کی وجہ بھی کچھ نہ کچھ ذہن نشین ہو جائے- ﴿لم یولد﴾ اور خود جنا نہیں گیا- شیخ اکبرؒ یہاں ایک لطیفہ لکھتے ہیں کہ عقل انسانی غور وفکر اور ترتیب مقدمات کے بعد جو نتیجہ بھی نکالتی ہے وہ اس کا مولود اور پیدا کیا ہوا ہوتا ہے- یہاں خدائے تعالیٰ کی صفات میں یہ پہلی صفت ہے کہ وہ کسی کا مولود نہیں- اب بھلا اس عاقل کو خدا کی ذات کی کیا معرفت ہے جس کی معرفت خود اپنی تراشیدہ اور اپنی ہی پیداوار ہے-
(الیواقت والجواہر ج ا ص ۵۰)

(۹) ✽ خدا کی ایک نمایاں صفت ''حی'' بھی ہے مگر وہ ایسا ''حی'' نہیں جس پر موت آ سکے اونگھ یا نیند کا گذر ہو سکے- بلکہ ایسا ''حی'' جس کے وجود کے ساتھ تمام عالم کا رشتہ حیوٰۃ قائم ہو' ایسا ''حی'' کہ اگر وہ نہ ہو تو عالم کی حیوٰۃ اور حیوٰۃ سے پہلے اس کا وجود مٹ جائے- عالم میں جن کو ''حی'' کہا جاتا ہے ان کی طرح نہیں کہ اپنے قیام وجود میں ہر لحظ دوسرے کا محتاج ہو بلکہ ایسا ''حی'' جس کی حیوٰۃ دوسروں کے لیے منشاء حیوٰۃ بنے اسی وجہ سے اس کا دوسرا نام قیوم ہے اسی کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے-

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَ لَئِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ﴾ (الفاطر:۴۱)

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تھام رکھا ہے کہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں' اور اگر ٹلنے لگیں تو اس کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھام سکے-

آیت الکرسی میں اسی لیے ''الحی'' کے بعد ''القیوم'' پھر اس کے بعد ''لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ'' کا لفظ رکھا گیا ہے- یہ نہایت اہمیت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اسماء الٰہیہ میں سے جس جس نام کا ذکر ہے پھر جو ترتیب ان اسماء میں رکھی گئی ہے وہ اپنی جگہ بڑے اسرار کی حامل ہوتی ہے محض اسماء شماری منظور نہیں ہوتی' پہلی حدیث میں ''احدیۃ'' و ''صمدیۃ'' اور یہاں ''الحی القیوم'' کے ارتباط کا کوئی شمہ بیان کر دیا گیا ہے- تفسیر ہمارا موضوع نہیں کہ زیادہ بسط کیا جائے-

(۱۰) ✽ جس طرح خدا کی ذات مبارک ہے اسی طرح اس کے اسماء بھی مبارک ہیں اس لیے اس کے نام کی برکتوں سے دعائیں ﴿....

اَسْأَلُکَ بِاَنَّ لَکَ الْحَمْدُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ یَا ذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ دَعَا اللّٰهَ بِاسْمِهِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ اِذَا دُعِیَ بِهٖ اَجَابَ وَ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰی.

(رواہ ابوداؤد و الترمذی)

لیے ہے' خدا کوئی نہیں مگر تو' زبردست محسن ہے- زمین و آسمان کو بلا کسی نمونہ کے پیدا کرنے والا ہے' اے جلال و اکرام والے' اے نا قابل فناء اور مخلوق کی ہستی قائم رکھنے والے' (یہ سن کر) آپؐ نے فرمایا کہ اس نے اللہ کا وہ نام لے کر دعا کی ہے کہ جب وہ اس نام کے ساتھ پکارا جاتا ہے تو جواب دیتا ہے اور جب اس سے مانگا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے-

(اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے-)

(۱۱) وَ عَنْ سَعْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ دَعْوَةُ ذِی النُّوْنِ اِذَا دَعَا رَبَّهٗ وَ هُوَ فِیْ بَطْنِ الْحُوْتِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ لَمْ یَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُّسْلِمٌ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا اسْتَجَابَ لَهٗ.

(رواہ احمد و الترمذی)

(۱۱) سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ذوالنونؑ نے جب اپنے پروردگار کو مچھلی کے پیٹ میں پکارا تھا تو یوں پکارا تھا- لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ (الخ) سوا تیرے کوئی معبود نہیں تیری ذات پاک ہے' بے شک میں ظلم کرنے والوں میں سے تھا- کوئی مسلمان کسی حاجت میں خدائے تعالیٰ کو ان کلمات سے یاد نہیں کرتا مگر وہ ضرور اس کی سنتا ہے-

(اس حدیث کو احمد' ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۲) وَ عَنْ بُرَیْدَةَؓ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ الْمَسْجِدَ عِشَآءً فَاِذَا رَجُلٌ یَقْرَأُ وَ یَرْفَعُ صَوْتَهٗ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَقُوْلُ هٰذَا مُرَاءٍ قَالَ بَلْ مُؤْمِنٌ مُنِیْبٌ قَالَ وَ اَبُوْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیُّ یَقْرَأُ وَ یَرْفَعُ صَوْتَهٗ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَسَمَّعُ لِقِرَاءَتِهٖ ثُمَّ جَلَسَ وَ اَبُوْ مُوْسٰی یَدْعُوْ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُشْهِدُکَ

(۱۲) بریدہؓ فرماتے ہیں کہ عشاء کے وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں گیا- کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بلند آواز سے قراءت کر رہا ہے میں نے عرض کیا آپ اس کے متعلق کیا خیال فرماتے ہیں' کیا یہ ریا کار ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ وہ اپنے خدا کی طرف جھکنے والا مرد مؤمن ہے' راوی کہتا ہے کہ یہ زور سے پڑھنے والے شخص ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قراءت بغور کان لگا کر سننے لگے' پھر ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دعا کرنے کے لیے بیٹھے تو بولے اے اللہ! میں تجھ ہی کو گواہ بناتا ہوں کہ اللہ بس تو ہی ہے' یکتا بے نیاز ہے' نہ کسی کو جنا' نہ کسی نے

☜ .... قبول ہوتی ہیں جب وہ ان کے وسیلہ سے پکارا جاتا ہے تو ہر پکار کی اجابت کرتا ہے ''بسم اللہ'' میں لفظ اسم اسی لیے اضافہ کیا گیا ہے کہ ہر کام کے شروع میں اس کے نام کی برکت ڈھونڈی جائے- ﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ (العلق: ۱) پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کی برکت سے جس نے آپ کو پیدا کیا-

(۱۲) * عرب میں مواخاۃ صرف لفظی بات نہ تھی بلکہ یہ تعاون و ہمدردی کا ایک بڑا رشتہ تھا جو ان کے نزدیک خونی رشتہ سے کم نہ تھا' یہاں یہ رشتہ صرف اتنی بات پر قائم ہو رہا ہے کہ بریدہؓ نے انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک بشارت سنائی تھی' بشر کے ساتھ سلوک کرنا ان کا عام دستور تھا' جب اس وقت کچھ اور سلوک ممکن نہ ہوا تو انہوں نے عقد مواخاۃ ہی قائم کر لیا- ان چھوٹی چھوٹی ☜ ....

اَنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَحَدًا صَمَدًا لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ وَ لَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَقَدْ سَأَلَ اللّٰہَ بِاسْمِہِ الَّذِیْ اِذَا سُئِلَ بِہٖ اَعْطٰی وَ اِذَا دُعِیَ بِہٖ اَجَابَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اُخْبِرُہٗ بِمَا سَمِعْتُ مِنْکَ قَالَ نَعَمْ فَاَخْبَرْتُہٗ بِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِیْ اَنْتَ الْیَوْمَ لِیْ اَخٌ صَدِیْقٌ حَدَّثْتَنِیْ بِحَدِیْثِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ. (رواہ رزین)

اس کو جنا' نہ اس کا کوئی نظیر و ہمسر' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے خدا کا وہ نام لے کر سوال کیا ہے کہ جب وہ اس نام سے سوال کیا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے اور جب پکارا جاتا ہے تو ضرور جواب دیتا ہے- میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ بات جو میں نے آپ سے سنی ہے کیا ان سے بھی کہہ دوں؟ آپؐ نے فرمایا کہہ دو- میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ خوشخبری ان کو سنا دی- انہوں نے کہا آج کے بعد تم میرے سچے بھائی ہو کیونکہ تم نے مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ خوشخبری سنائی ہے-

(اس حدیث کو زرین نے روایت کیا ہے)

اَسْمَاءُ اللّٰہِ الْحُسْنٰی

اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی. وَ لِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا. وَ قَالَ تَعَالٰی. ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی﴾ (بنی اسرائیل: ۱۱۰)

خدا کے لیے اسماء حسنیٰ ہیں انہیں سے اس کو پکارا کرو- دوسری جگہ ارشاد ہے- اے پیغمبر! (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہہ دیجئے تم خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر جس نام سے بھی پکارو یہ سب اس کے حسن و خوبی کے نام ہیں-

(۱۳) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ ؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ

(۱۳) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

ﷺ.... باتوں سے اس کا اندازہ لگائیے کہ ان کے قلب میں اسلام اور بانی اسلام کے لیے جذبات کیا تھے-

اذا دعی بہ اجاب و اذا سئل بہ اعطی - ان دونوں جملوں میں فرق ہے پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا مردِ مؤمن کی پکار کا جواب دیتا ہے- کفار کی طرح نہیں کہ اس کا جواب تک نہیں آتا- "وَ مَا دُعَاءُ الْکَافِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلَالٍ" کافروں کی پکار رائیگاں ہے-

سوال' خاص حاجت کی طلب کو کہتے ہیں' دعاء عام ہے' اجابت دعاء سے مقصد داعی کا شرف اور اس کی قدر و منزلت بتلانا ہے- اس کی حاجت روائی' یہ ضمنی فائدہ ہے- جیسے کہ پکارنے کا مقصد بھی سوال نہیں بلکہ اس کی یاد ہے- اپنی حاجت پیش کرنا یہ ضمنی غرض ہے- اس لیے پہلا جملہ دوسرے سے ابلغ ہے-

(۱۳) ٭ شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ بارگاہ الٰہی میں ادب یہ ہے کہ وہاں بجائے لفظ صفت اسم کا اطلاق کیا جائے اسی لیے قرآن کریم میں اللہ کے لیے اسماء کا تو ذکر کیا گیا ہے مگر صفات کا نام نہیں لیا گیا حالانکہ وہ اسماء بہ حقیقت اس کی صفات ہی ہیں[1] کاش اگر شیخ اکبرؒ کے اس ادب کا لحاظ رہتا تو شاید عین و غیرہ کے جو نزاعات لفظ صفت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں اتنے طویل نہ کھینچتے - (ب) شیخ اکبرؒ نے یہ ﷺ....

[1] الیواقیت والجواہر ج اص ۷۷-

عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَ تِسْعِیْنَ اِسْمًا مَنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ یُحِبُّ — ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے ننانوے نام ہیں جو انہیں یاد کر لے وہ جنت میں داخل ہوگا - اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا ہے اور اس لیے وہ طاق عدد کو پسند

ﷺ ....تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ اسماء الٰہیہ توقیفی ہیں جو نام جس طرح شریعت میں استعمال کیا گیا ہے اس سے تجاوز کرنا درست نہیں اس لیے خدائے تعالیٰ کو ''حی'' کہا جائے گا مگر ذو حیوۃ نہیں کہا جائے گا - اسی طرح جہاں کسی صفت کی نسبت بطریق فعل وارد ہے اس کو بھی بدلا نہیں جاسکتا جیسا کہ ''اللہ یستھزئ بھم'' اس لحاظ سے خدائے تعالیٰ پر ''مستھزئ'' کا اطلاق جائز نہ ہوگا - (ج) خدائے تعالیٰ کے جتنے اسماء ہیں سب حسن وخوبی کے اسماء ہیں اس لیے ''و ھو خادعھم'' کی وجہ سے خدائے تعالیٰ کو ''خادع'' نہیں کہا جا سکتا - مفسرین نے تو اس کے جوابات اور دیئے ہیں مگر شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ ان آیات کو تلاوت کرتے ہوئے چاہیے کہ ایک انسان بحر ندامت میں غرق ہو جائے کیونکہ یہاں ہماری تفہیم وفہمائش کے لیے قرآن کریم نے تنزل کر کے بارگاہ صمدیت میں ایسے الفاظ استعمال کر لیے ہیں جو اس کی شایان شان نہ تھے - مگر کیا کیجئے کہ عالم انسانیت اپنے قصور ونقصان کی وجہ سے عالم تجرد کے بہت سے مخاطبات کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا اس لیے جب ناقص رتبہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا تو پھر کامل ہی کو کچھ تنزل اختیار کرنا پڑتا ہے - جاہل ان الفاظ کو پڑھتا اور اعتراض کرتا ہے اور عاقل فرط ندامت سے گڑ جاتا ہے' اس کا اعتقاد ان الفاظ کو سن کر ڈگمگانے لگتا ہے اور اس کی عقیدت دونی دونی بڑھتی جاتی ہے[1] (د) شیخ اکبرؒ نے تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ گو بلحاظ لغت بعض اسماء الٰہیہ کا اطلاق انسانوں پر بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ ''نافع'' و ''وکیل'' و ''نور'' مگر شرعاً وعقلاً بطریق اسم اعظم ممنوع قرار دیا جائے گا اور اگر بالفرض کہیں اطلاق ہوگا تو اس کے اصل معنی سے ذہول ضروری ہوگا - مثلاً ''مؤمن'' ایمان دار ہونے کی جہت سے درست ہوسکتا ہے مگر جس لحاظ سے خدا پر مؤمن کا اطلاق کیا گیا ہے وہ قطعاً حرام ہے[2] اس لیے جو اسماء خدائے تعالیٰ کی بارگاہ کے لیے عرف عام یا خاص میں مشہور ہو چکے ہیں ان کا استعمال دائرہ انسان میں ممنوع رہنا چاہیے -

(ہ) عام شارحین نے لفظ احصار کی مراد صرف زبانی یاد کر لینا قرار دی ہے مگر ارباب حقائق لکھتے ہیں کہ مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے آگے ان اسماء کے ساتھ تخلق وتشبہ حاصل کرنا بھی ہے - خدائے تعالیٰ بار بار اپنے اسماء حسنیٰ کا ذکر کر کے چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق میں بھی اپنے اپنے مبلغ پرواز کے موافق ان کی جلوہ نمائی کا جذبہ پیدا ہو تا کہ عالم انسانیت ان اسماء کی تجلیات کی بدولت قعر اسفل السافلین سے نکل کر سطح اعلیٰ علیین پر فروکش ہو سکے وہ اگر رب العالمین ہے تو یہ بھی اپنی مقدرت واستطاعت کے بقدر کمزوروں کی تربیت سے غافل نہ رہے وہ اگر ارحم الراحمین ہے تو یہ بھی رأفت ورحمت کا نمونہ دکھاتا رہے اور اسی طرح صفات مختصہ کے علاوہ ہر ہر صفت کا مظہر بننے کی سعی میں لگا رہے تا کہ خلافت اپنے صحیح معنی میں نمودار ہو اور ان اللہ خلق ادم علی صورتہ کا رمز طشت از بام ہو جائے - شارحین حدیث نے ہر ہر اسم کے ساتھ تخلق کی شرح کر دی ہے تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں - (و) خدائے تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں اور ابھی بہت سے وہ بھی ہیں جو ہمیں بتائے نہیں گئے - حدیث کے الفاظ او استاثرت بھا فی علم الغیب عندک یا او علمته احدا من خلقک سے اسی طرف اشارہ نکلتا ہے (یعنی وہ اسماء جو تو نے صرف اپنے ہی علم کے لیے مخصوص رکھے ہیں یا وہ جن کو تو نے اپنی مخلوق میں کسی کو بتائے ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات کے تعارف کی دو ہی صورتیں ہیں یا وہ خود یا اس کی صفات - عالم امکان میں مشاہدہ کی طاقت نہ تھی اس لیے یہاں مشاہدۂ ذات تو ممکن نہ ہوا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم کو بھی آخر ''لن ترانی'' کا زخم کھانا ہی پڑا اس لیے صورت صرف ﷺ ....

[1] الیواقیت والجواہر ج ا ص ۷۶ - [2] ایضاً ص ۷۲ -

الْوِتْرَ. (رواہ الشیخان و الترمذی) کرتا ہے- اس حدیث کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے-

لله .... اسماء وصفات کے ذریعہ تعارف کی باقی ہے اس لیے ضروری ہوا کہ اسماء الٰہیہ بتلا دیئے جائیں اور اتنے بتلا دیئے جائیں کہ ایک معرفت ذات کا متلاشی اس راہ سے گذر کر درِ مقصود تک بسہولت رسائی حاصل کر لے- اسی لیے قرآن کریم کا اسلوبِ بیان یہ ہے کہ وہ جگہ جگہ اسماء صفاتی استعمال کرتا ہے پھر اپنے ماقبل و مابعد میں ان صفات کے مظاہر بطریق استشہاد پیش کرتا جاتا ہے تاکہ پہلے ان صفات کی عظمت ذہن نشین ہو' اور انسانی قصورِ ادراک و الفاظ کی وجہ سے ان کے بلند حقائق فہمی میں جو کوتاہی و خامی باقی رہ جائے وہ ان کے مظاہر کو دیکھ کر پوری ہوتی رہے اگر وہ اس کی عزت وقہر کا تذکرہ کرتا ہے تو بتلا دیتا ہے کہ یہ وہ عزت وقہر نہیں جس کی اس کے تصور میں سمائی ہو یا اگر جود و مہر کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ سمجھا دیتا ہے کہ یہ اس نوع کا جود و مہر نہیں کہ وہاں تک عقل کی رسائی ہو اس کے اسماء وصفات اصل مقاصد نہیں بلکہ ذات کی معرفت کا صرف ایک راستہ ہیں جن میں سے گذر کر ذات پاک کی جھلک نظر آتی رہتی ہے اگر ان اسماء وصفات کا توسط نہ ہوتا تو داغ مہجوری عالم امکان کے لیے ہمیشہ نقد وقت رہتا ذات پاک اپنی بے نیازی میں اور ممکن اپنے ادراک کے عجز وقصور میں ہمیشہ سرگرداں نظر آتا' یہ ذات اقدس کی بڑی فیاضی تھی کہ اس نے اپنی معرفت کے لیے حجابِ صفات ڈال دیا ہے کہ جو مشتاق اس ذات مستجمع صفات کا نظارہ کرنا چاہے وہ اس حجاب میں آج بھی نظارہ کرسکتا ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل هر که دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

سورۂ ملک کو پڑھیے اس کی ابتداء ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ (الملک: ۱) سے ہوتی ہے اس میں خدائی ملک کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کی وسعت کے وہ حدود بتلائے گئے ہیں جو انسانی دسترس سے وراء الوراء ہیں اس ضمن میں ایک ملک والے کے لیے جو اسماء و صفات درکار ہیں ان کو موقعہ بموقعہ ایسا چسپاں کیا گیا ہے کہ گویا وہ آیت اسی اسم کی حقیقت کی تشریح و تفہیم کے لیے اتری ہے اسی لیے علماء معانی نے اعجازِ آیات کو قرآن کا ایک اعجاز قرار دیا ہے-

بہر حال اگر اس تخیل و استحضار کے ساتھ آپ سورۂ ملک پڑھیں تو ابھی آپ آخر سورت تک پہنچنے نہیں پائیں گے کہ الٰہی جبروت و ملکوت کا ایک قاہرانہ تسلط آپ کے دل و دماغ پر مستولی ہو جائے گا- استواء علی العرش اور سبع سماوات و ارضین عرش و کرسی کا تذکرہ بھی اس لیے نہیں ہے کہ خدا کے لیے کسی بڑے مکان کا تصور قائم کیا جائے بلکہ اس لیے ہے کہ ایک عاجز مخلوق کو ایک نادیدہ ذات کا تعارف ہو تو کیسے ہو اس لیے اس کی پرواز کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند تخیل کو اس کے سامنے رکھا گیا ہے تاکہ وہ خدائی عظمت و جلال کی بلند سے بلند رفعتوں کو عبور کرنے کے قابل ہو جائے' یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ الفاظ بلا مصداق ہیں یہ تو معتزلہ کا مذہب ہے' ہرگز نہیں قرآن شاعرانہ خیال بندی سے بہت دور ہے وہ اسی لیے شعر کی مذمت کرتا ہے کہ اس میں حقیقت نہیں ہوتی اور یہاں صرف حقیقت ہی حقیقت ہے بلکہ عالم قدس نے درحقیقت ان اشیاء کو پیدا فرمایا ہے اور ان کی حقیقتیں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ذات پاک کا تصور پھر اس سے وراء الوراء ہے یہاں شیخ اکبرؒ کے الفاظ کس قدر قیمتی ہیں وہ فرماتے ہیں-

ذلک لان صور المعتقدات و المعقولات هی جسور یعبر علیها بالعلم ای یعلم ان وراء هذه المظاهرا مراً لا یصح ان یعلم و لا یشهد و لیس و راء ذلک المعلوم الذی لا یشهد و

معتقدات اور معقولات کی صورتوں میں خدائی تجلیات اس لئے ہوتی ہیں کہ وہ علم انسانی کی رسائی کے لیے ایک گذرگاہ اور پل بن سکیں جن سے عبور کر کے یہ علم حاصل ہو جائے کہ ان تجلیات کے پس پردہ کوئی ایسی باکمال ذات موجود ہے جو ہمارے احاطہ علم و مشاہدہ سے لله ....؟

(۱۴) وَ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى تِسْعَةً وَ تِسْعِيْنَ اِسْمًا مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ. هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ

(۱۴) ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو انہیں یاد کرے وہ جنت میں جائے گا - وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' نہایت مہربان' بہت رحم والا' وہ بادشاہ ہے' پاک ہے' ہر نقص وآفت سے سالم ہے' امان دینے والا' پناہ میں لینے والا ہے زبردست دباؤ والا ہے' صاحب عظمت بنانے والا' نکال کھڑا کرنے والا'

☜ .... لا یعلم حقیقه ما یعلم اصلا۔[۱] وراء الوراء ہے بس ہم اتنا ہی جان سکتے ہیں کہ اسے جان نہیں سکتے -

کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نار یا نور دیکھا اور حقیقتاً دیکھا ''انا ربک فاخلع نعلیک'' کی آواز سنی اور حقیقتاً سنی' مگر یہ سب سماں اس لیے باندھا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس ذریعہ سے یہ فطری علم حاصل ہو جائے کہ اس نار کے پس پردہ کوئی نور اعظم ہے اور حقیقتاً ہے جس کے لیے یہ نار اس وقت تجلی گاہ بن رہی ہے جیسا کہ ایک انسان خواب میں خدائے عز وجل کو دیکھتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ آج رات میں نے حقیقتاً خدا کو دیکھا ہے یہاں بھی دراصل اس کے معتقدات کی صورت ہی ہوتی ہے جس میں سے گذر کر اس کے دماغ میں صرف ایک یہ علم آجاتا ہے کہ اس نے خدا کو دیکھا ہے ورنہ خود وہ صورت خدا نہیں ہوتی - احادیث میں جہاں جہاں محشر میں رویت باری تعالیٰ کا ذکر ہے وہ بھی تجلیات ہیں جو ہر ہر محل کے مناسب اہل محشر کے سامنے ہوں گی مشاہدہ تجلیات کا ہوگا اور اس ضمن میں علم' ماوراء تجلیات کا ہوتا رہے گا اور یہ علم اسی طرح حدسی وفطری ہوگا جیسا کہ ایک ناواقف شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھتا اور کہتا ہے کہ میں نے آج شب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے حالانکہ بسا اوقات جو صورت وہ دیکھتا ہے وہ حلیہ مبارک سے مطابقت بھی نہیں رکھتی - پس جس طرح عالم رؤیا کی یہ صورتیں کسی ذات کی معرفت کے لیے جسور (پل اور راستہ) بن جاتی ہیں' اسی طرح تجلیاتِ خدائی معرفت کا ذریعہ ہوتی ہیں - جو مشہور ہوتا ہے وہ مخلوق ہے اور جو معلوم ہوتا ہے وہ غیر مخلوق ہے اس لیے نہ ان الفاظ میں تاویل کی ضرورت ہے - اور نہ ذات پاک کے لیے تجسیم وتشبیہ کی حاجت [۲] [۳]-

کیف الوصول الی سعاد و دونها قلل الجبال و دونهن حتوف.

سعاد (محبوبہ کا نام ہے) تک رسائی ہو تو کیسے ہو کہ اس سے پہلے بلند پہاڑیاں ہیں اور ان سے پہلے ایک موت نہیں بہت سی موتیں ہیں (نہ ان سے گذرنا ممکن نہ وصل سعاد ممکن)

(۱۴) ٭ خدائے تعالیٰ کے یہ اسماء دو حال سے خالی نہیں ہیں یا ذات پاک کی تنزیہ وتقدیس' عظمت وجلال کا مظہر ہیں تو انہیں صفاتِ ذات کہا جاتا ہے اگر ان کا عالم مخلوق سے بھی تعلق ہے تو ان کا نام صفات افعال ہے - اس لحاظ سے اسماء دو قسم کے رہ جاتے ہیں صفاتِ ذات وصفاتِ ☜ ....

---

[۱] الیواقیت والجواہر ج۱ ص۴۹ -

[۲] حدیث ایک جدید اور عمیق فن ہے اس لیے یہاں ہم حدیث فہمی کے لیے کچھ مزید تشریحات کرتے جاتے ہیں تاکہ شروع سے اس کے سمجھنے کا ایک سلیقہ آجائے یہ اس طرح نہیں ہوگا کہ آپ ایک مرتبہ سن لیں اور بس بلکہ پے در پے جب مختلف احادیث آپ کے سامنے آتی رہیں گی اور ہر جگہ آپ اس حقیقت سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے رہیں گے تو اس مشاقی کے بعد پھر کہیں آپ کا دل ودماغ اس کی حقیقت تک پہنچ سکے گا - یہ مضمون اربابِ حقائق سے لیا گیا ہے مگر اس کی طرف رہنمائی کا احسان صرف حضرت استاذؒ کا ہے -

[۳] دیکھو الیواقیت ص ۹۷' ۹۹' ۱۱۰' ۱۱۱' ۱۱۹ -

الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ
الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ الْقَهَّارُ الْوَهَّابُ
الرَّزَّاقُ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ
الْخَافِضُ الرَّافِعُ الْمُعِزُّ الْمُذِلُّ السَّمِيْعُ
الْبَصِيْرُ الْحَكَمُ الْعَدْلُ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ

صورت پہنانے والا' بہت بخشش والا بہت غلبہ والا' بہت دینے والا' روزی
دینے والا' فیصلہ کرنے والا' جاننے والا' تنگی اور فراخی کرنے والا' پست و بلند
کرنے والا' عزت و ذلت بخشنے والا' سننے والا' دیکھنے والا' اٹل فیصلہ والا'
منصف' بھید جاننے والا' خبردار' بردبار' عظمت والا' مغفرت کرنے والا'
تھوڑے عمل پر بہت دینے والا' بلند' بڑائی والا' حفاظت کرنے والا' حصہ

؎ .... افعال[1] ہر اسم کی تحقیق بہت تفصیل طلب ہے ترجمہ میں اس کی طرف کچھ اشارات موجود ہیں- شارحین حدیث اور اربابِ حقائق نے اس پر مبسوط کلام کیا ہے-

(الرحمن الرحیم) اگر اس کے معنی ارادۂ رحمت کے ہوں تو صفت ذات ہے اور اگر بالفعل رحمت کرنے والا ہوں تو صفت فعل ہے (الملک) اگر اس کا ترجمہ ملک والا ہو تو صفت ذات ہے اور اگر اپنی ملکیت میں ایجاد و اعدام کا تصرف کرنے والا ہو تو صفت فعل ہے (القدوس) شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ تنزیہ کے لیے عیب کا تصور میں آنا ضروری ہے اس لیے تنزیہ یہ ہے کہ جو عیوب خدا کے لیے کسی ذہن میں آئے یا آسکتے ہیں ان سے اس کی برتری و پاکی بیان کرنا اور تقدیس کا تعلق خود صفاتِ کمالیہ سے ہے اس لیے تقدیس تنزیہ سے اکمل ہے- عیوب سے پاکی اور صفاتِ کمالیہ کی پاکی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہی تنزیہ و تقدیس میں فرق سمجھنا چاہیے[2] یہ صفت ذات ہے- (الخالق الخ) کسی چیز کو معدوم سے موجود کرنا خلق ہے- پھر اس میں سے بقدرِ ضرورت علیحدہ کر لینا ''برء'' ہے اس کے بعد حسب ارادہ اس کا تسویت و ترتیب یہ تصویر ہے- موجودات میں کاٹ تراش اور اس کی تصویر بندہ بھی کرتا ہے مگر معدومات میں یہ تینوں صفتیں اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہیں- پہلے وہی اس کا خالق ہوتا ہے پھر وہی باری و مصور بنتا ہے- (الغفار) مخلوق کی پردہ پوشی اور بلامواخذہ گناہوں کی مغفرت کرنے والا- (البدیع) انسان کسی چیز کے بنانے سے پہلے اس کے نقشہ کا محتاج ہوتا ہے- یہ نقشہ خواہ کہیں پہلے موجود ہو یا اس کا ذہن تیار کرے لیکن خدا کی ذاتِ پاک اس کی محتاج نہیں جب اس کے علم سے کوئی چیز باہری نہیں تو پھر نقشہ کی تلاش اس کی بارگاہ میں متصور بھی نہیں- [3]

اسلام میں خدا کا تصور

یہ تو سچ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی ہستی ہے اور ضرور ہے مگر کیسی ہے؟ اس ادراک سے عقل انسانی عاجز و درماندہ ہے- متاخرین فلاسفہ و حکماء نے بزورِ عقل مقام معرفت تک رسائی چاہی تو تجرید و تنزیہ کی راہ پر اتنے دور نکل گئے کہ آخر میں سوائے عدم محض کے ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا وہ یہی سوچتے رہے کہ **لا کیف و لا این و لا وضع و لا اضافة و لا عرض و لا جوهر و لا کم** وہ کیسا' کہاں' کتنا' کس طرح' کس طرف' خود قائم یا دوسرے وجود کے ساتھ قائم' ان سب سوالات سے بیرون اور بالاتر ہستی ہے- اسی پر بس نہیں- ان کا قدم تنزیہ ذرا اور آگے بڑھا تو صفات کا وجود بھی ہستیٔ باری تعالیٰ کے لیے انہیں مادیت کی طرح ایک عیب نظر آیا لہٰذا اس کی بھی نفی کر بیٹھے- آخر ان تمام اعلیٰ سے اعلیٰ تنزیہات کا میدان جہاں جا کر ختم ہوا وہ یہ تصور تھا کہ خدا یہ نہیں' یہ بھی نہیں' مگر پھر ہے کیا اس کے جواب میں ''یہ نہیں''، تسلی بخش نہیں ہے- یہاں اثباتی پہلو درکار ہے' انسان موجود ہے محدود اور ذو جہت ہے' صرف مجرد نہیں مادی بھی ہے اس کا تصور کسی ایسے موجود کا ؎ ....

---

[1] دیکھو الیواقیت ص ۷۱- [2] ایضاً ص ۵۴- [3] ایضاً ص ٦۸-

الْحَلِيْمُ الْعَظِيْمُ الْغَفُوْرُ الشَّكُوْرُ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ الْحَفِيْظُ الْمُقِيْتُ الْحَسِيْبُ الْجَلِيْلُ الْكَرِيْمُ الرَّقِيْبُ الْمُجِيْبُ الْوَاسِعُ الْحَكِيْمُ الْوَدُوْدُ الْمَجِيْدُ الْبَاعِثُ الشَّهِيْدُ الْحَقُّ الْوَكِيْلُ الْقَوِيُّ الْمَتِيْنُ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ الْمُحْصِي الْمُبْدِئُ الْمُعِيْدُ الْمُحْيِ الْمُمِيْتُ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الْقَادِرُ الْمُقْتَدِرُ

بانٹ کر دینے والا' حساب کرنے والا' بزرگی والا' بے مانگے بخشش والا' نگراں' جواب دینے والا' وسعت والا' حکمت والا' بڑی محبت والا' مجد و شرف والا' اٹھانے والا' گواہ' ثابت' کارساز' زورآور' مضبوط' دوست و مددگار' تعریف کا مستحق' ہر چیز کی شمار رکھنے والا' عدم سے وجود میں لانے والا' معدوم کو پھر موجود کرنے والا' زندہ کرنے والا' مارنے والا' سدا زندہ' **مخلوق** کی ہستی تھامنے والا' ہر کمال بالفعل رکھنے والا' شرف والا' یکتا' یگانہ' بے نیاز' قدرت والا' ہر شے پر قبضہ والا' آگے کرنے والا اور پیچھے کرنے والا' سب سے پہلے اور سب سے بعد باقی رہنے والا' سب پر عیاں' نگاہوں سے اوجھل'

ﷺ .... متلاشی ہے جسے وہ خوف و ہراس میں پکارے تو پکار سکے' عیش و راحت میں یاد کرنا چاہے تو یاد کر سکے' جتنا یہ اس کا متلاشی ہو اس سے زیادہ وہ اس کا منتظر ہو' یہ گرنے لگے تو وہ سہارا دے' یہ بھوکا ہو تو کھانا کھلائے' یہ پیاسا ہو تو وہ پانی پلائے' یہ بیمار ہو تو وہ شفا دے اور اگر یہ سو جائے تو وہ اس کی نگہداشت و محافظت رکھے خلاصہ یہ کہ اس کے ماضی و حال و مستقبل کے تینوں زمانوں کی زندگیاں اسی کی نظر تربیت و رحمت کے نیچے پھولتی پھلتی رہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِo وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ وَ اِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ. وَ الَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ وَ الَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ. (الشعراء : ۷۸-۸۱)

(جہان کا پروردگار) وہ ہے جس نے مجھ کو بنایا تو اب وہی مجھے راہ دکھلاتا ہے' وہ جو مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفاء دیتا ہے اور وہ جو مجھ کو مارے گا تو وہی زندہ کرے گا۔ اور وہ جو مجھے توقع ہے کہ انصاف کے دن میری تقصیر بخشے گا۔

اسی عالم حیرت و سراسیمگی میں جب اس کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی تو اس نے گنگا و جمنا پر نظر ڈالی' اپنا رشتہ حیوٰۃ اس کی عام دامن فیض سے کچھ نہ کچھ وابستہ پایا اس کے پانی نے کھیتوں کو سیراب کیا اور ایک من گیہوں کے عوض سینکڑوں من گیہوں کے ڈھیر اس کے لیے مہیا کر دیئے جب بھوک کے حال میں سامان غذا اس راستہ سے پہنچتا نظر آیا تو اس نے تلاش ربوبیت کی مقدس پیاس کو اس کے گدلے پانی سے ہی بجھانے کا ارادہ کر لیا۔ اگر کسی اور بلند فطرت نے بہت تیر مارا تو اس کی نظر شمس و قمر اور کرۂ فلک کے ان نورانی اجسام پر جا پہنچی جن کے حسن صورت نے آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا اور جن کے جود و سخا نے کرۂ ارضی کو مالا مال بنا دیا تھا۔ ابر و بارش' رنگ و روپ' غذا و نما' نور و ظلمت کا سارا کارخانہ ان کے ساتھ وابستہ دیکھ کر اس کو پورا یقین ہو رہا تھا کہ ہو نہ ہو میری تشنگی فطرت کے بجھنے کا سامان یہاں ہے کہ اچانک ایک اور بلند تخیل اس کے سامنے آیا اور یکا یک اس نے اس تمام سامان تسلی کو اسباب تشنگی بنا دیا اور وہ یہ تھا کہ جو خود ڈوبنے اور طلوع ہونے میں سرگرداں نظر آ رہا ہے وہ تمام مخلوق کے لیے مرکز توجہ بننے کی اہلیت نہیں رکھ سکتا۔

غرض تنزیہ میں اتنا اونچا اڑ کر اور مادیت میں اتنا گر کر "خدا کی ہستی کیسی ہے؟" اس سوال کا جواب پھر بھی کچھ نہ مل سکا۔ یہ سوال اسی طرح لا جواب رکھا ہوا تھا کہ ملت حنفیہ کے مؤسس نے راہ حقیقت کا سراغ نکال لیا اور تمام عالم کے سامنے نہایت فیاضی کے ساتھ اس کو ان الفاظ میں پیش کر دیا ﷺ ....

الْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ الْاَوَّلُ الْاٰخِرُ الظَّاهِرُ الْبَاطِنُ الْوَالِيُ الْمُتَعَالِيُ الْبَرُّ التَّوَّابُ الْمُنْتَقِمُ الْعَفُوُّ الرَّؤُفُ مَالِكُ الْمُلْكِ ذُو الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ الْمُقْسِطُ الْجَامِعُ الْغَنِيُّ الْمُغْنِي

ہر چیز کا ذمہ دار، بہت بلند، بڑا محسن، توبہ کی توفیق بخشنے والا اور قبول کرنے والا، بدلہ لینے والا، معاف کرنے والا، بڑی رحمت والا، سارے ملک کا مالک، جلال و بخشش والا، انصاف والا، جمع کرنے والا، سب سے بے نیاز، دوسروں کو غنی بنانے والا روکنے والا، نقصان پہنچانے والا، نفع پہنچانے والا، خود بخود ظاہر، ہدایت دینے والا،

لہ .... ﴿فَلَمَّا اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ. اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ (الانعام:٧٨-٧٩)

(جب آسمان کا ایک ایک بادشاہ اور شہزادہ تاریکی میں روپوش ہو چکا تو وہ بولا) اے قوم میں ان سے بیزار ہوں جنہیں تم شریک مانتے ہو، میں اپنا رخ ایسی ذات کی طرف کر چکا جس نے آسمانوں اور زمین سب کو پیدا کیا ہے اور میں شریک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

گویا اثباتی پہلو میں یہاں ایسے وجود کو سامنے رکھا جس کی طرف سارے وجود منتہی ہیں اور سلبی پہلو میں صرف اجمالاً شرکت کے حدود کی نفی پر کفایت کی گویا اس بیان میں اب خدا ایک موجود کو بتلایا گیا اور موجود بھی وہ جس نے تمام مخلوق کو خلعت وجود سے سرفراز فرمایا۔ آگے چل کر ہر شخص نے بمقدار عقل وفہم یہ خود فیصلہ کر لیا کہ صفات ثبوتیہ تابع وجود ہیں لہٰذا جس کا وجود ذاتی اور حقیقی ہوگا اس میں صفات ثبوتیہ بھی لامحالہ حقیقیہ ہوں گی اور جب مخلوق اپنے وجود، ہستی میں ہی اس کی محتاج ہوگی تو ضرور اپنے صفات میں بھی اسی کی محتاج نظر آئے گی جب اس تلاش میں اس نے اپنی صفات پر نظر ڈالی تو حیوۃ، قدرت، ارادہ، کلام، علم، سمع وبصر کے آثار دیکھے، ان کی حقیقت کو برتا اور سمجھا، ان کی کمالیت کو سمجھا بوجھا تو اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جو ہستی وجود کی اصل ہو اس میں ان صفات کا ہونا لازمی ہے اس لیے اس نے صاف کہہ دیا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا. (مریم:٤٢)

جب ابراہیم نے اپنے والد سے کہا اے والد! آپ اس کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ کچھ آپ کے کام آئے۔

اس کے بعد جب اس نے اپنے اطراف وجوانب پر نظر ڈالی تو وہ بھی کسی کی رعنائیوں کی آرائش گاہ نظر آیا، اس نے کان لگائے تو بلبل خوشنوا کی داستانوں نے اس کے دل ودماغ کو مسخر کر لیا، آنکھیں کھولیں تو گلہائے رنگ رنگ نے اپنا گرویدہ بنا لیا غرض حس وحواس عقل وہوش جہاں تک پہنچے کوئی میدان بھی اس پراز کمال وجمال ہستی کے اثرات سے خالی نہ ملا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے گوش وبصر کے محسوسات کی تکذیب کر دیتا اور عقل وحواس کو معطل کر کے خدا کا تصور صرف ایک سلبی صورت میں اختیار کر لیتا جس کو تنزیہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اگر ذرا تنزیہ سے قدم پیچھے پڑتا ہے تو تشبیہ کا نقص لازم آتا ہے۔ قرآن کریم نے اس عقدہ کو حل کیا اور بتلایا کہ خدا کی ہستی اس تنزیہ اور اس تشبیہ کے درمیان ہے اس کے لیے صفات، نعوت، شئون ہیں مگر ایسی نہیں جن کا خیال ووہم ادراک کر سکیں۔ لہٰذا ان تمام صفات کے ساتھ اسے یاد کیے جاؤ، جن سے کہ خود اس نے اپنے آپ کو یاد کیا ہے مگر کسی مثال وشبیہ کو اپنے گوشہ خیال میں گذرنے نہ دو۔ اور اس اعلیٰ تنزیہ اور خیالی تشبیہ کے درمیان اپنے رب کا تصور کرتے رہو۔

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ:١١)[1] کوئی چیز اس کی مانند نہیں (مگر) وہ سننے والا اور جاننے والا ہے تنزیہ

---

[1] اس آیت کے بعض نادر دقائق کے لیے دیکھیے الیواقیت والجواہر ج اص ٦٥۔ یہاں ان مباحث کا ذکر کرنا مخاطبین کے لیے مشکلات کا موجب ہے۔

الْمَانِعُ الضَّارُّ النَّافِعُ النُّوْرُ الْهَادِي الْبَدِيْعُ الْبَاقِي الْوَارِثُ الرَّشِيْدُ الصَّبُوْرُ. (رواه الترمذي و ابن حبان و الحاكم)

بلانمونہ بنانے والا' ہمیشہ رہنے والا' تمام مخلوقات کے فنا کے بعد ان کے مال کا مالک' درست راہ بتلانے والا' ضبط کرنے والا۔

(اس حدیث کو ترمذی' ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے)

قال الشيخ الا كبر التنزيه ميل و التشبيه ميل و الاعتدال ما بين هذين الخ. [1]

اور تشبیہ دونوں میں ایک طرف جھکنا ہے' اعتدال ان دونوں کے درمیان میں ہے۔

قال الشيخ الا كبر اعلم ان جميع المشاهدين للحق لا يخرجون عن هاتين النسبتين و هما نسبة التنزيه لله تعالى و نسبة التنزل للخيال بضرب من التشبيه فاما نسبة التنزيه فهي تجلية تعالى في نحو ليس كمثله شيء و اما نسبة التنزل للخيال فهي تجلية في قوله تعالى و هو السميع البصير. [2]

شیخ اکبر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ خدائی تجلیات کا مشاہدہ کرنے والے دونسبتوں سے خالی نہیں ہوتے۔ ایک طرف خدائی تنزیہ کی نسبت دوسری طرف عالم خیال میں تشبیہات کی انعکاسی نسبت پہلی نسبت کو لیس کمثلہ شیء میں اور دوسری کو وھو السمیع البصیر میں بیان فرمایا گیا ہے۔

الغرض اسلام نے انسان کی کمزور فطرت کے سامان تسلی کے لیے اس حد تک عالم خیال میں تشبیہ[3] کی وسعت دے دی ہے[4] جہاں تک کہ تنزیہ کے حدود باطل نہ ہونے پائیں' نماز میں رخ کرنے کے لیے بیت اللہ بنا دیا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی فہمائش کر دی ہے کہ خدا کا وہ مسکن نہیں ہے بادشاہت[5] اور ملوکیت کا تصور جمانے کے لیے عرش کا ذکر آ گیا ہے مگر یہ وجودی تصور بھی ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تنزیہ کے خلاف ہو جائے۔ اسی تنزیہ و تشبیہ کے درمیان آپ احادیث کے باب کو پڑھ جائیے پورے مزے اور پورے ذائقہ کے ساتھ پڑھ جائیے اور جھجکیے مت' بشرطیکہ ہر موقعہ پر تنزیہ بھی کیے جائیے۔ خدا کا صحیح تصور۔ اس کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا کرنے کا یہی ایک راستہ ہے اگر ان الفاظ سے باہر آپ خدا کو تلاش کریں گے تو اس تصور میں آپ کے لیے کوئی جاذبیت نہ ہوگی اور اگر ان الفاظ کی صورت اور مفہوم کا کوئی فرضی نقشہ تجویز کریں گے تو وہ عین تشبیہ ہو جائے گی نہ وہ خدائی سرحد تھی نہ یہ خدائی سرحد ہے عملی طور پر سب سے آسان اور صحیح راستہ تو یہ ہے' عقلی طور پر بحث و جدل کی راہ دوسری ہے' خدا کا تصور اس سے زیادہ صاف اور بلند اب تک نہ کوئی بتلا سکا نہ بتلا سکتا ہے اس سے زیادہ بحث کرنا ممکن کو اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہے اور لا حاصل بھی ہے ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

---

[1] ایضاً ص ۴۷۔
[2] ایضاً ص ۹۹۔
[3] یہ واضح رہنا چاہیے کہ شیخ اکبرؒ کے نزدیک عالم خیال ایک واقعی عالم ہے اس کے مستقل احکام ہیں۔ ہماری اصطلاح میں خیال صرف ایک بے بنیاد بات کا نام ہوتا ہے۔ دیکھو الیواقیت ج ۱ ص ۵۴۔
[4] ایضاً ص ۴۶۔
[5] ایضاً ص ۹۳۔

بَابٌ فِیْ عَظْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی وَ کِبْرِیَائِهٖ وَ کَمَالِ قُدْرَتِهٖ وَ افْتِقَارِ الْخَلْقِ اِلَیْهِ

اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال اس کی کبریاء وکمال قدرت اور مخلوقات کی سرتاسر احتیاج کا بیان

(۱۵) وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَامَ فِیْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِاَرْبَعٍ فَقَالَ. اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَا یَنَامُ وَ لَا یَنْبَغِیْ لَهٗ اَنْ یَّنَامَ یَخْفِضُ الْقِسْطَ وَ یَرْفَعُهٗ یُرْفَعُ اِلَیْهِ عَمَلُ اللَّیْلِ بِالنَّهَارِ وَ عَمَلُ النَّهَارِ بِاللَّیْلِ.

(رواہ احمد و مسلم و ابن ماجۃ)

(۱۵) ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان کھڑے ہوکر چار باتیں بیان فرمائیں (۱) خدائے قدوس **سوتا نہیں اور نہ یہ اس کے شایان شان ہے' میزان[1] عدل کو جھکاتا ہے اور** اونچا کرتا ہے رات کے کام دن میں اور دن کے کام رات میں اس کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔

(اس حدیث کو امام احمد و مسلم اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

(۱۶) وَ عَنْهُ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ مِنْ طَرِیْقٍ اٰخَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَنَامُ وَ لَا یَنْبَغِیْ لَهٗ اَنْ یَّنَامَ یَخْفِضُ الْقِسْطَ وَ یَرْفَعُهٗ حِجَابُهُ النَّارُ لَوْ

(۱۶) ابو موسیٰ اشعریؓ دوسرے طریقہ پر یوں روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے باری تعالیٰ نہ سوتا ہے اور نہ سونا اس کی شان کے مناسب ہے' میزان عدل کو پست کرتا ہے اور بلند کرتا ہے (اس کے اور مخلوق کے درمیان) خود اس کا نور اس کا حجاب ہے' اگر وہ یہ حجاب اٹھا

---

(۱۵) * میزان عدل' دنیا میں مخلوق کی روزی اور آخرت میں ان کے اعمال کی مقدار کے لیے مقرر کی گئی ہے' اعمال و رزق کی قلت و کثرت دونوں جہان میں اسی کے قبضہ قدرت میں ہے کسی کے اچھے عمل زیادہ ہوں گے اور کسی کے کم' کسی کو روزی فراخ ملتی ہے اور کسی کو تنگ مگر اس حقیقت کے باوجود جدو جہد کا حکم دونوں جگہ موجود ہے گویا تم سعی کے مکلف ہو اور قدرت دینے کی مختار ہے۔

رفع اعمال یہ اس نظم کا ایک شعبہ ہے جس پر بساط عالم کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ خدا کے معصوم فرشتے مقرر ہیں' عصر و صبح کی نمازوں میں ان کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے اور اس درمیان میں جو اچھے اور برے کام مخلوق کرتی ہے وہ ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ عالم تکوین کے گوشہ گوشہ میں نظم موجود ہے دنیا اس کے عمیق اسرار دریافت کرنے کے درپے ہے اس کے انکار یا ابطال کے درپے نہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر عالم غیب کا کوئی نظم آپ کے سامنے مذکور ہو تو آپ اس کے انکار یا اس سے آگے بڑھ کر استہزاء کے لیے آمادہ ہوں۔

(۱۶) * یہاں اصل روایت میں نار کا لفظ ہے اور صحیح مسلم میں اس کی بجائے نور کا لفظ مذکور ہے چونکہ حقیقت کے لحاظ سے یہاں نور و نار میں چنداں فرق نہیں ہے اس لیے ہم نے اس کا عام فہم ترجمہ تو رہی کر دیا ہے' ابو عبیدہؒ نے لفظ نار ہی کی مناسبت سے قرآن کی آیت تلاوت فرمائی ہے یعنی جب حضرت موسیٰ کو صورت نار میں تجلی ہوئی تو معلوم ہوا کہ ذات پاک کا حجاب نار تھا جس کے پس پردہ اس کی تجلی ہو رہی تھی۔ اس بابرکت نار اور بابرکت ماحول سے کسی نافہم کو یہ دھوکا نہ لگے کہ معاذ اللہ خدا کی ذات پاک کہیں حقیقتاً آگ میں حلول کر آئی تھی۔ اس لیے فرمایا کہ وہ خود اس آگ اور سارے جہان کا پالنے والا ہے وہ جسم و جہت' حدوث و حلول کے آثار سے پاک و برتر ہے۔ حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کا حجاب مخلوق کی طرح باہر سے نہیں یہاں خود اس کے عظمت و جلال کے انوار ہی اس کا حجاب ہیں جس طرح کہ خود آفتاب کی کرنیں اور حسین کا حسن کبھی کبھی اس کے دیدار کے لیے حجاب بن جاتا ہے' اسی طرح یہاں خود اس کی عظمت و جلال کے انوار ہی اس کا حجاب بن رہے ہیں۔ عقول انسانی نے بار بار شوخی کی اور چاہا کہ بے حجاب نظارہ کریں مگر ہمیشہ خیرہ و متحیر ناکام واپس لوٹیں.....

كَشَفَهَا لَا حَرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْهِهٖ كُلَّ شَيْءٍ اَدْرَكَهٗ بَصَرُهٗ ثُمَّ قَرَأَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ ﴿فَلَمَّا جَآءَ هَا نُوْدِيَ اَنْ بُوْرِكَ مَنْ فِي النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (النمل:۸)

(رواہ احمد و مسلم و ابن ماجۃ)

دے تو اس کی ذات کے انوار جہاں تک نظر جائے سب کو پھونک ڈالیں' اس کی تائید میں ابوعبیدہؓ نے یہ آیت پڑھی ﴿فلما جاء﴾ الخ جب موسیٰ آگ کے نزدیک پہنچے تو آواز آئی آگ میں جو تجلی ہے وہ مبارک اور جو ہستیاں اس کے اردگرد ہیں وہ مبارک اور پاک ہے اللہ کی ذات جو سب جہان کا پروردگار ہے۔ (اس حدیث کو احمدؒ' مسلم اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

(۱۷) عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ قَالَ نُوْرَانِيٌّ اَرَاهُ. (رواہ مسلم)

(۱۷) ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کیا آپ نے اپنے پروردگار کو (شب معراج میں) دیکھا تھا آپ نے جواب دیا ''نورانی دیکھا تھا'' (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

(۱۸) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا اَهْلُ الْجَنَّةِ فِيْ نَعِيْمِهِمْ اِذْ سَطَعَ لَهُمْ نُوْرٌ فَرَفَعُوْا رُءُوْسَهُمْ فَاِذَا الرَّبُّ قَدْ

(۱۸) جابرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں جب کہ جنتی جنت کی نعمتوں میں مشغول ہوں گے' اچانک ان کے سامنے ایک نور بلند ہوگا وہ سر اٹھائیں گے' کیا دیکھیں گے کہ پروردگار عالم ان پر جلوہ فرما ہے اور فرما رہا ہے

.... آئیں۔ اب اس عالم میں بے حجاب دیدار کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ خود اس حجاب کو اٹھا دے تو اس پر اس کو تو قدرت ہے مگر ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کی تاب لاسکیں۔ ارباب عقول کا حصہ یہاں صرف اعتقاد عظمت ہے اور ارباب کشوف کا ذوق و وجدان ۔ آنکہ چشد داند۔

(۱۷) * اس روایت کے الفاظ میں اختلاف ہے کوئی ''نورانی اراہ'' پڑھتا ہے۔ ہم نے ''نورانی'' کے لفظ کو ترجیح دی ہے کیونکہ بعض روایات میں ''رأیت نورا'' کا لفظ بھی موجود ہے ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے اگر ''نورانی اراہ'' پڑھا جائے تو ترجمہ ہوگا کہ وہ نور تھا میں اسے نظر جما کر بھلا کیسے دیکھ پاتا' اس بناء پر بھی بارگاہ الٰہی میں نور ہی کا اطلاق ثابت ہوگا۔ شب معراج میں رویت کی بحث یہاں نہیں ہے اس پر اپنے محل میں گفتگو کی جائے گی۔ قرآن و حدیث خدائی بارگاہ کا جہاں ذکر کرتے ہیں ماحول میں نور ہی نور کا پتہ دیتے ہیں۔ کیوں نہ ہو جب کہ اسماء الٰہیہ میں اس کا ایک اسم ہی ''النور'' ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ (النور:۳۵) آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ ہی کا نور و جمال روشن ہے۔ مادیات کا عالم سرتا سر ظلمت و تاریکی ہے اور مجردات کا سرتا سر نور' یہ نور جس قدر لطیف اور قوی ہوتا جاتا ہے اسی قدر ادراک نظر و بصر سے باہر ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جو ذات پاک کہ تجرد کے انتہائی مراتب میں ہے وہ تمام دنیا کے ادراک نظر و بصر سے بھی باہر ہے۔ ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ﴾ (الانعام:۱۰۳) خدا کو کسی کی بصر نہیں پاسکتی۔

احادیث میں عالم مجردات کا جہاں تذکرہ ہے وہاں اس کو نور ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کو اس نور پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ نور آفتاب سے نور بصر زیادہ اہم ہے اور نور بصر سے نور عقل زیادہ اہم پھر جو ان میں جس قدر اہم اور قوی ہے اسی قدر غیر محسوس ہے جب مادیات میں یہ نسبت ہے تو اس سے مجردات کا اندازہ کر لیجئے۔

(۱۸) * والدہ اولاد' حاکم و محکوم' احباب و اعزہ کے سلام کی لذت سے تمام دنیا آشنا ہے۔ خالق کے سلام سے لطف اندوزی صرف اہل جنت کا حصہ ہے' یہ تشریف و تکریم کی انتہاء ہے۔ جو ذات کہ نور حقیقی ہے اس کے احتجاب کے بعد نور کا بقاء ایسا ہی ہے جیسا کہ غروب آفتاب کے بعد روشنی کا۔

اَشْرَفَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَوْقِهِمْ فَقَالَ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْجَنَّةِ قَالَ وَ ذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ قَالَ فَنَظَرَ اِلَيْهِمْ فَيَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ فَلَا يَلْتَفِتُوْنَ اِلٰى شَيْءٍ مِنْ نَعِيْمِهِمْ مَا دَامُوْا يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ حَتّٰى يَحْتَجِبَ عَنْهُمْ وَ يَبْقٰى نُوْرُهٗ. (رواه ابن ماجة)

اے اہل جنت السلام علیکم' قرآن کریم کی آیت ﴿سلام قولا من رب رحیم﴾ (یٰسین:۵۸) (سلام کہا جائے گا پروردگار مہربان کی طرف سے) کا یہی مطلب ہے' وہ انہیں دیکھے گا اور یہ اسے دیکھا کریں گے اور (دیدار الٰہی میں ایسے مستغرق ہو جائیں گے کہ) جب تک ادھر نظر رہے گی جنت کی کسی نعمت کی طرف التفات تک نہ کریں گے یہاں تک کہ دیدار ختم ہو جائے گا اور صرف اس کا نور باقی رہ جائے گا۔ (اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

(۱۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اِسْرَافِيْلَ مُنْذُ يَوْمَ خَلَقَهٗ صَآفًّا قَدَمَيْهِ لَا يَرْفَعُ بَصَرَهٗ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ الرَّبِّ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى سَبْعُوْنَ نُوْرًا مَا مِنْهَا مِنْ نُوْرٍ يَدْنُوْ مِنْهُ اِلَّا احْتَرَقَ. (رواه الترمذی و صححه)

(۱۹) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب سے اسرافیلؑ (صاحب صور فرشتہ) کو پیدا فرمایا ہے وہ دونوں پاؤں برابر کیے کھڑا ہے' نظر اوپر نہیں اٹھاتا' اس کے اور پروردگار کے درمیان نور کے ستر پردے ہیں' ہر پردہ ایسا ہے کہ اگر اس کے قریب بھی جائے تو خاک ہو جائے۔

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے۔)

(۲۰) عَنْ زُرَارَةَ بْنِ اَوْفٰیؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِجِبْرَئِيْلَ هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ فَانْتَفَضَ جِبْرَئِيْلُ وَ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهٗ سَبْعِيْنَ حِجَابًا مِّنْ نُوْرٍ لَوْ دَنَوْتُ مِنْ بَعْضِهَا لَاحْتَرَقْتُ. (هكذا فی المصابيح و رواه ابو نعيم فی الحلية عن انس الا انه لم يذكر فانتفض)

(۲۰) زرارہ بن اوفیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا "تم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟" یہ سن کر وہ کانپ اٹھے اور بولے اے محمدؐ! میرے اور اس کے درمیان تو نور کے ستر پردے ہیں اگر میں کسی ایک کے نزدیک بھی پہنچ جاؤں تو جل جاؤں۔ اس حدیث کو مصابیح میں ایسا ہی روایت کیا ہے لیکن ابونعیم نے اپنی کتاب الحلیۃ میں بجائے زرارہؓ کے انسؓ سے روایت کیا ہے اور جبرئیل علیہ السلام کے کانپنے کا ذکر نہیں کیا۔

(۱۹) * اس حدیث میں حجاب کا عدد ستر مذکور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں صرف کثرت مراد ہو' جیسا کہ اردو میں بھی یہ عدد صرف کثرت کے لیے مستعمل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عام مخلوق اور خاص نورانی مخلوق کے درمیان حجاب کا کچھ فرق بھی ملحوظ ہو بہر حال نفس حجاب کا ثبوت یہاں بھی ہے۔

(۲۰) * جبرائیل علیہ السلام جیسے ملک معظم بھی سراپردۂ عظمت وجلال سے دور دور گھوم رہے ہیں وہ ذات ایک اور صرف ایک ہی ذات تھی جس کے لیے سب حجابات اٹھا کر اعلان کر دیا گیا تھا کہ آؤ اور اپنے پروردگار کے جمال کا بے پردہ نظارہ کر لو' سبحان اللہ وہ بندہ بھی کتنا مقرب بندہ ہوگا جس کے لیے وہ سارے حجابات اٹھا دیئے گئے جن میں سے جبرئیل جیسے ملک مقرب کے لیے ایک بھی نہ اٹھ سکا۔

(۲۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَمِیْنُ اللّٰهِ مَلْأٰی لَا یَغِیْضُهَا نَفَقَةٌ سَحَّآءَ اللَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ قَالَ اَرَأَیْتُکُمْ مَآ اَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ فَاِنَّهٗ لَمْ یَغِضْ مَا فِیْ یَمِیْنِهٖ قَالَ وَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ بِیَدِهِ الْاُخْرٰی الْمِیْزَانُ یَخْفِضُ وَ یَرْفَعُ.

(رواه احمد و الشیخان و البیهقی و الاربعة)

(۲۱) حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا کا دست مبارک ہمیشہ پر ہے فیاضی کرنے سے خشک نہیں ہوتا' شب و روز انعامات کی بارشیں برساتا رہتا ہے آپؐ نے فرمایا کہ جب سے اس نے آسمان وزمین بنایا ہے بھلا کتنا خرچ کیا ہوگا اس پر بھی اس کے دست مبارک میں کوئی کمی نہیں آئی اور آپ نے فرمایا کہ (پہلے) اس کے عرش اور پانی کے درمیان کچھ نہ تھا (پھر بعد میں مخلوق پیدا ہوئی) خدائے تعالیٰ کے دوسرے ہاتھ میں میزان عدل ہے اسے پست کرتا ہے اور بلند کرتا ہے۔

(اس حدیث کو امام احمد اور شیخین اور سنن اربعہ وغیرہم نے روایت کیا ہے)

---

(۲۱) * یہ خدائے قدوس کے خزائن اور اس کی فیاضی کی تفہیم ہے تاکہ اس کی محتاج مخلوق میں اس کی طرف ایک فطری انجذاب پیدا ہو جائے- اس کا عرش جہاں تھا اب بھی وہاں ہے لیکن پہلے درمیان میں کوئی اور مخلوق نہ تھی پانی ہی پانی تھا اب آسمان وزمین بن گئے اس لیے اس کے نیچے بجائے پانی کے آسمان کہا جائے گا- جامع ترمذی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سماوات پر اب بھی ایک سمندر ہے اور اس سمندر پر عرش عظیم ہے- اگر محدثین اس روایت کو صحیح مان لیں تو پھر یہاں پانی سے یہ پانی مراد لے لینا اچھا ہے- حدیث میں اس کو بحر سے تعبیر کیا گیا ہے مگر یہ وہ بحر نہیں ہے جس کی حقیقت ہم کو معلوم ہو- بہرکیف حدیث میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ پہلے عرش پانی پر رکھا ہوا تھا پھر کہیں اور اٹھا کر رکھا گیا ہے- بلکہ صرف اس کا بیان ہے کہ پہلے اس کے نیچے کیا تھا- اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ پانی یہی پانی ہو بلکہ ممکن ہے کہ جس کو جامع ترمذی کی روایت میں بحر کہا گیا ہے وہ پانی مراد ہو- یہاں حدیث میں دست قدرت کے ایک ہاتھ کو یمین یعنی مبارک کہا گیا ہے دوسرے ہاتھ کو اخریٰ سے تعبیر کیا گیا' یسار کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا- بلکہ مشکوٰۃ میں یہ تصریح ہے کلتا یدی الرحمن' یمین رحمن ہر جہت سے پاک ہے- اس لیے اس کے دونوں ہاتھ یمین و مبارک ہیں وہاں دایاں یا بایاں نہیں بعض رواۃ نے اخریٰ کی بجائے یسریٰ کا لفظ کہہ دیا ہے' یہ یقیناً راویوں کا تصرف اور روایت بالمعنی ہے- واللہ تعالیٰ اعلم-

عالم غیب کے حقائق ادا کرنے کے لیے جب نطاق الفاظ تنگ ہونے لگتا ہے تو عقول انسانیہ اسے معاف نہیں کرتیں یا پھر اپنے اوراک کے مطابق اس کی شکل وصورت اختراع کرنے لگتی ہیں ورنہ سرے سے انکار کے لیے آمادہ ہو جاتی ہیں- شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی عجیب بات ہے کہ انسان بیرون عقل وفکر کو اپنے میزان عقل وفکر میں تولنا چاہتا ہے حالانکہ اس کو اپنی عقل کا قصور معلوم پھر اپنی قوتِ حافظہ ومخیلہ کا قصور معلوم' اس پر قوۃ واہمہ کا تصادم معلوم اس کے باوجود جب اس کے سامنے معاملات ربانیہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اپنی ہی عقل وفکر کی تقلید کرنے لگتا ہے کیا اس کا یہ فرض نہ تھا کہ جو خدائے تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق بتلایا ہے اسے وہ بےچون وچرا مان لیتا اور اپنے اس کفر کی تقلید نہ کرتا جو اسی کے خیال کا مقلد ہے' اور جس کا خیال اس کے حواس کا مقلد-

(الیواقیت ص ۹۸-۹۹)

(۲۲) و عنہ عن النبیّ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم قال یقبض اللّٰہ الارض یوم القیامۃ و یطوی السمآء بیمینہ ثمّ یقول انا الملک این ملوک الارض.

(رواہ احمد و الشیخان و غیرھم)

(۲۲) ابو ہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا قیامت کے دن خدائے قدوس اپنے دست مبارک میں زمین کو لے گا اور آسمانوں کو لپیٹ کر فرمائے گا کہ میں ہی بادشاہ ہوں اب زمین کے بادشاہ کدھر ہیں۔

(اس حدیث کو امام احمد اور شیخین نے روایت کیا ہے)

(۲۳) و عن ابی ذرؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم انّی اریٰ مالا ترون و اسمع ما لا تسمعون اطّت السّماء و حقّ لھا ان تئطّ ما فیھا موضع اربع اصابع الّا علیہ ملکٌ ساجدٌ لو علمتم ما اعلم لضحکتم قلیلًا و لبکیتم کثیرًا و لا تلذّذتم بالنّسآء علی الفرشات و لخرجتم علی اعلی الصّعدات تجأرون الی اللّٰہ تعالٰی قال ابو ذرٍّ و اللّٰہ لو ددت انّی شجرۃٌ تعضد.

(رواہ احمد و الترمذی و ابن ماجۃ)

(۲۳) ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ باتیں سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے' آسمان چر چرآواز کر رہا ہے اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے کیونکہ اس میں چار انگشت برابر بھی کوئی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ سجدہ میں پڑا نہ ہو اگر تم وہ باتیں جانتے جو میں جانتا ہوں تو رویا بہت کرتے اور ہنستے کم اور اپنے بستروں پر اپنی بیویوں سے لطف اندوز نہ ہوتے اور خدا کی طرف شور مچاتے ہوئے جنگلوں میں نکل جاتے۔ ابو ذرؓ فرماتے ہیں' اے کاش! میں ایک درخت ہوتا (جو جڑ سے کاٹ دیا جاتا۔ (کہ حساب کا خطرہ نہ رہتا)

(اس حدیث کو امام احمد' ابن ماجہ' اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

---

(۲۲) ✻ زمین کے لیے لفظ قبض اور آسمانوں کے لیے طی (لپٹنا) کا لفظ قرآن نے بھی استعمال کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین میں طی کی صلاحیت نہیں اور آسمان کا مادہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں لپٹنے کی صلاحیت ہے۔ موجودہ سائنس اگر آج افلاک کے وجود کی منکر ہے تو ابھی جلدی نہ کیجئے شاید کہ بہت جلد دوسرے حقائق کی طرح اسے یہاں بھی رجوع کرنا پڑے۔ حدیث کا حاصل عنوان باب سے ظاہر ہے۔

(۲۳) ✻ جو بات یہاں شروع میں بطور مقدمہ ارشاد ہوئی ہے وہ تمام عالم غیب پر ایمان و ایقان کی روح ہے یعنی عالم غیب ایک ایسا عالم ہے جو ہمارے حواس کے ادراک سے بالاتر ہے اس لیے رسول اس عالم کی جو چیز بھی دیکھتا یا سنتا ہے وہ سب کچھ ہمارے لیے اسی کے اعتماد پر قابل تسلیم ہونا چاہیے یہ عقلی بحث وتمحیص کا میدان نہیں سماع ومشاہدہ کا مقام ہے۔ یہ رسول کا ہی ظرف ہے کہ وہ اس عالم کے خوف ناک سے خوف ناک مناظر کو دیکھتا اور تحمل کر لیتا ہے۔ ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسا صحابی اس جہان کا ایک مجمل سا حال صرف سن پاتا ہے تو اپنی موت کو حیوٰۃ پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عالم غیب عوام کی نظروں سے کیوں پوشیدہ رکھا گیا ہے معلوم ہوا کہ نہ ہر علم ہر مخاطب کے قابل ہے نہ ہر تماشہ ہر ایک کے دیکھنے کے لائق پھر جب رسول جیسا قلب وبصر تمہیں میسر نہیں تو اس سے جھگڑو مت اور جو وہ کہتا ہے بس اسے مان لو۔

(۲۴) وَ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ یَا عِبَادِیْ کُلُّکُمْ مُذْنِبٌ اِلَّا مَنْ عَافَیْتُ فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ اَغْفِرْلَکُمْ وَ مَنْ عَلِمَ اَنِّیْ اَقْدِرُ عَلَی الْمَغْفِرَۃِ فَاسْتَغْفَرَنِیْ بِقُدْرَتِیْ غَفَرْتُ لَہٗ وَ لَا اُبَالِیْ وَ کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ ھَدَیْتُ فَاسْتَھْدُوْنِیْ اَھْدِکُمْ وَ کُلُّکُمْ فَقِیْرٌ اِلَّا مَنْ اَغْنَیْتُ فَاسْأَلُوْنِیْ اُغْنِکُمْ وَ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَ اٰخِرَکُمْ (وَ فِیْ رِوَایَۃٍ وَ اِنْسَکُمْ وَ جِنَّکُمْ وَ صَغِیْرَکُمْ وَ کَبِیْرَکُمْ وَ ذَکَرَکُمْ وَ اُنْثَاکُمْ) وَ حَیَّکُمْ وَ مَیِّتَکُمْ وَ رَطْبَکُمْ وَ یَابِسَکُمْ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَشْقٰی قَلْبِ مِنْ قُلُوْبِ عِبَادِیْ مَا نَقَصَ فِیْ مُلْکِیْ جَنَاحَ بَعُوْضَۃٍ وَ لَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَتْقٰی قَلْبِ عَبْدٍ مِنْ عِبَادِیْ مَا زَادَ فِیْ مُلْکِیْ مِنْ جَنَاحِ بَعُوْضَۃٍ وَ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَ اٰخِرَکُمْ (وَ فِیْ رِوَایَۃٍ وَ اِنْسَکُمْ وَ جِنَّکُمْ وَ صَغِیْرَکُمْ وَ کَبِیْرَکُمْ وَ ذَکَرَکُمْ وَ اُنْثَاکُمْ) وَ حَیَّکُمْ وَ مَیِّتَکُمْ وَ رَطْبَکُمْ وَ یَابِسَکُمْ اجْتَمَعُوْا فَسَأَلَنِیْ کُلُّ سَائِلٍ مِنْھُمْ مَا بَلَغَتْ اُمْنِیَّتُہٗ فَاَعْطَیْتُ کُلَّ سَائِلٍ مِنْھُمْ مَا سَأَلَ مَا نَقَصَنِیْ کَمَا لَوْ اَنَّ اَحَدَکُمْ مَرَّ بِشَفَۃِ الْبَحْرِ فَغَمَسَ فِیْھَا اِبْرَۃً ثُمَّ انْتَزَعَھَا کَذٰلِکَ لَا یَنْقُصُ مِنْ مُلْکِیْ، ذٰلِکَ بِاَنِّیْ جَوَادٌ مَاجِدٌ صَمَدٌ

(۲۴) ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے' اللہ تعالیٰ کہتا ہے' اے میرے بندو! تم سب قصور وار ہو مگر وہ جسے میں بچالوں' تو مجھ سے بخشش طلب کیا کرو میں تمہیں بخش دوں گا جو شخص یہ جانتا ہے کہ مجھے بخشش کی طاقت ہے پھر مجھ سے بخشش مانگتا ہے تو میں اسے بخش دیتا ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا' تم سب گم کردہ راہ ہو مگر وہ جس کو میں راہ دکھلاؤں تو مجھ سے ہدایت مانگا کرو میں تمہیں ہدایت دوں گا' تم سب محتاج ہو مگر وہ جس کو میں بے نیاز کردوں تو مجھ سے مانگو میں تمہیں بے نیاز کردوں گا - اگر تمہارے اگلے پچھلے (اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ انسان اور جن' چھوٹے اور بڑے' مرد اور عورت) زندہ اور مردہ' تر اور خشک' سب مل کر میرے بندوں میں سب سے زیادہ شقی القلب بندہ کی طرح ہو جائیں تو میری سلطنت میں مچھر کے پر کے برابر کوئی کمی نہیں آسکتی اور اگر سب کا دل متقی سے متقی انسان کی طرح ہو جائے تو میری سلطنت میں ایک مچھر کے پر کے برابر زیادتی نہیں ہوسکتی - اگر تمہارے اول و آخر (اور ایک روایت میں انسان و جن' چھوٹے اور بڑے' مرد وعورت) زندہ اور مردہ' تر اور خشک سب جمع ہوں اور ان میں ہر سائل مجھ سے وہ مانگے جو اس کی انتہائی آرزو ہو پھر ان میں ہر ہر سائل کو میں اس کی منہ مانگی مراد دے دوں تو بھی میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ آئے گی جیسا کہ تم میں کوئی شخص سمندر کے کنارے گذرے اور اس میں سوئی ڈبو کر نکال لے (تو سمندر میں کوئی کمی نہیں آتی) اسی طرح میری سلطنت میں کچھ کمی نہیں آتی یہ اس لیے کہ میں سخی ہوں' بزرگی والا ہوں' بے نیاز ہوں' بات میری بخشش اور بات میرا عذاب ہے اور ایک روایت میں ہے' میری بات (میں) میری بخشش ہے اور میری بات

(۲۴) * اس حدیث میں خدا کی توحید وعظمت کی وہ روح پھونکی جارہی ہے کہ اس کے بعد اب کوئی ہاتھ نہ رہے جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف اٹھے کوئی دوسری بارگاہ نہ رہے جس پر حاجت روائی کا گمان کیا جاسکے - عاصی اگر معصیت کرتا ہے تو جان لے کہ اس کی مضرت اسی کے لیے ہے عابد اگر عبادت کرتا ہے تو سمجھ لے کہ اس کا نفع اسی کی ذات تک محدود ہے اس کی بے نیازی کا یہ عالم کہ اگر تمام ☜ ....

عَطَائِیْ کَلَامٌ وَ عَذَابِیْ کَلَامٌ (وَ فِیْ رِوَایَةٍ عَطَائِیْ کَلَامِیْ وَ عَذَابِیْ کَلَامِیْ) اِذَا اَرَدْتُ شَیْئًا فَاِنَّمَا اَقُوْلُ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔

(رواہ احمد و مسلم و الترمذی)

(میں) میرا عذاب ہے (کچھ کرنا نہیں پڑتا) اور جب میں کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو صرف یہ کہہ دیتا ہوں کہ موجود ہو جا وہ موجود ہو جاتی ہے۔

(اس حدیث کو امام احمد اور مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۲۵) (وَ عَنْهُ فِیْ اُخْرٰی) عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْمَا یَرْوِیْ عَنْ رَبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ اِنِّیْ حَرَّمْتُ عَلٰی نَفْسِی الظُّلْمَ وَ عَلٰی عِبَادِیْ اَلَا فَلَا تَظَالَمُوْا، کُلُّ بَنِیْ اٰدَمَ یُخْطِئُ بِاللَّیْلِ وَ النَّهَارِ ثُمَّ یَسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرُلَهٗ وَ لَا اُبَالِیْ، وَ قَالَ یَا بَنِیْ اٰدَمَ کُلُّکُمْ کَانَ ضَالًّا اِلَّا مَنْ هَدَیْتُ وَ کُلُّکُمْ کَانَ عَارِیًا اِلَّا مَنْ کَسَوْتُ وَ کُلُّکُمْ کَانَ جَائِعًا اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُ وَ کُلُّکُمْ کَانَ ظَمْاٰنًا اِلَّا مَنْ سَقَیْتُ فَاسْتَهْدُوْنِیْ اَهْدِکُمْ وَ اسْتَکْسُوْنِیْ اَکْسُکُمْ وَ اسْتَطْعِمُوْنِیْ اُطْعِمْکُمْ وَ اسْتَسْقُوْنِیْ اَسْقِکُمْ یَا عِبَادِیْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَکُمْ وَ اٰخِرَکُمْ (فَذَکَرَ نَحْوَ الْحَدِیْثِ الْمُتَقَدِّمِ وَ فِیْهِ لَمْ یَنْقُصُوْا مِنْ مُلْکِیْ شَیْئًا اِلَّا کَمَا یَنْقُصُ رَاْسُ الْمِخْیَطِ مِنَ الْبَحْرِ۔ (رواہ احمد و مسلم و الترمذی)

(۲۵) ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث قدسی میں روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے نفس پر بھی ظلم کرنا حرام کیا ہے اور اپنے بندوں پر بھی ظلم کرنا حرام کیا ہے تو سن لو کہ ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو، تمام اولاد آدم شب و روز خطا کرتی رہتی ہے پھر مجھ سے معافی مانگتی ہے تو میں اسے معاف کرتا رہتا ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا اور فرمایا کہ اے اولاد آدم تم سب بے راہ تھے مگر وہ جس کو میں نے راہ دکھائی، سب ننگے تھے مگر وہ جس کو میں نے لباس پہنایا، سب بھوکے تھے مگر وہ جس کو میں نے کھانا کھلایا، سب پیاسے تھے مگر وہ جس کو میں نے پانی پلایا تو مجھ سے ہی ہدایت مانگو میں تمہیں ہدایت دوں گا، مجھ سے ہی لباس مانگو، میں تمہیں لباس دوں گا، مجھ سے ہی کھانا مانگو، میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا، مجھ سے ہی پانی مانگو میں تمہیں پانی پلاؤں گا، اے میرے بندو! اگر تمہارا اوّل و آخر (اس کے بعد پہلی حدیث کے قریب مضمون بیان کیا صرف فرق یہ ہے کہ یہاں یہ الفاظ ہیں ''میری سلطنت میں کچھ کمی نہیں پیدا کر سکتے مگر جتنا کہ سوئی کی نوک سمندر کے پانی میں''۔)

(اس حدیث کو امام احمد و مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

لله .... مجرمین کو بخش ڈالے تو پرواہ نہیں فیاضی کی یہ انتہاء کہ اگر ایک ایک کو منہ مانگی مراد دے دے تو اس کے خزانہ غیب میں کوئی نقصان نہیں، سلطنت کی یہ قہرمانی کہ اس کے ارادہ و مراد میں تخلف نہیں دنیا میں بڑے سے بڑا تعاون اسباب و عمل کا گرفتار ہے ان کی یہ شان کہ اسباب و مسببات ان کے حکم کے منتظر ہیں۔ سبحان اللہ اسلام کا خدا کتنا با شوکت و عظمت ہے۔

(۲۵) * ترغیب و تفہیم کی حد ہوگئی کہ ظلم کے بارے میں خالق نے اپنا بھی استثناء نہیں کیا اور اس کی کراہت و حرمت میں اپنے آپ کو بھی اپنی مخلوق کے برابر ٹھیرا لیا۔ مگر مخلوق کی بے حیائی کی بھی انتہاء نہ رہی کہ اس نے اپنے خالق سے آگے بڑھ کر ظلم ہی کو اپنا نصب العین بنا لیا۔

(۲۶) عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَجِلُّوا اللّٰـهَ یَغْفِرْلَکُمْ قَالَ ابْنُ ثَوْبَانَ (اَحَدُ الرُّوَاةِ) یَعْنِیْ اَسْلِمُوْا۔

(رواہ احمد و الطبرانی و ابو یعلی فی سننه)

(۲۶) ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا احترام کرو، وہ تمہیں بخش دے گا، ابن ثوبان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (حدیث کا ایک راوی ہے) کہتا ہے آپ کی مراد یہ تھی کہ اسلام لے آؤ۔

(اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی اور ابویعلی نے روایت کیا ہے)

(۲۷) عَنْ حُذَیْفَةَ بْنِ الْیَمَانِؓ قَالَ قَالَ اَتٰی رَجُلٌ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ رَاَیْتُ فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ لَقِیْتُ بَعْضَ اَهْلِ الْکِتَابِ فَقَالَ نِعْمَ الْقَوْمُ اَنْتُمْ لَوْ لَا اَنَّکُمْ تَقُوْلُوْنَ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شَاءَ مُحَمَّدٌ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَدْ کُنْتُ اَکْرَهُهَا مِنْکُمْ فَقُوْلُوْا مَاشَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ مُحَمَّدٌ۔

(رواہ احمد و الطیالسی)

(۲۷) حذیفہ بن الیمانؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں کسی اہل کتاب سے ملا تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم کیا اچھے لوگ تھے اگر ماشاء اللہ و شاء محمدؐ نہ کہا کرتے (یعنی جو اللہ تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں) آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میں بھی تمہاری اس بات کو ناپسند کیا کرتا تھا لہٰذا (بجائے اس کے) یہ کہا کرو ماشاء اللہ ثم محمدؐ (پہلے جو خدا چاہے اس کے بعد جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں)

(اس حدیث کو امام احمد اور ابوداؤد طیالسی نے روایت کیا ہے)

(۲۸) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَجَعَلْتَنِیْ وَ اللّٰهَ عِدْلًا بَلْ مَاشَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ۔

(رواہ احمد)

(۲۸) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا مَاشَاءَ اللّٰهُ وَ شِئْتَ (جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں) آپ نے اس شخص سے کہا کہ کیا تو نے مجھے اور اللہ تعالیٰ کو برابر کر دیا؟ صرف یہ کہہ جو ایک اللہ چاہے۔

(اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)

---

(۲۶) * معلوم ہوا کہ دیگر مذاہب خدائے تعالیٰ کے احترام کا کتنا ہی دعویٰ کریں مگر اس کا صحیح احترام اب صرف اسلام قبول کرنے میں ہے۔

(۲۷) * عربی زبان میں واؤ شرکت کے لیے آتا ہے اور ثم تراخی و تاخیر کے لیے اس لیے عقیدہ خواہ کچھ بھی ہو مگر بارگاہ خداوندی کی عظمت چاہتی ہے کہ اس کی صفات میں عبارتی شرکت کا بھی شائبہ نہ آنے پائے۔ جہاں عبارتی ادب اتنا ہے وہاں عقیدہ کا ادب کتنا ہوگا۔ حدیث تو یہ کہتی ہے مگر آپ سوچئے کہ آپ کیا کر رہے ہیں، اسلام کی توحید کیا ہے اور آپ کا عمل کہاں ہے۔

(۲۸) * یعنی خدا اور رسول کا احترام الگ الگ پہچانو اور ہر ایک کے حقوق کو خلط ملط نہ کرو، خدا کا احترام یہ ہے کہ جہاں وہ ہے وہاں کوئی نہیں۔ حقیقۃً شرکت تو درکنار وہاں لفظی شرکت و مساوات بھی مکروہ عمل ہے۔

(۲۹) وَ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا قَامَ اِلَی الصَّلَاةِ مِنْ جَوْفِ اللَّیْلِ یَقُوْلُ اللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَنْ فِیْهِنَّ وَ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیَّامُ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَنْ فِیْهِنَّ وَ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَنْ فِیْهِنَّ وَ لَکَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَ قَوْلُکَ الْحَقُّ وَ وَعْدُکَ الْحَقُّ وَ لِقَاؤُکَ حَقٌّ وَ الْجَنَّةُ حَقٌّ وَ النَّارُ حَقٌّ وَ السَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَکَ اَسْلَمْتُ وَ بِکَ اٰمَنْتُ وَ عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَ اِلَیْکَ اَنَبْتُ وَ بِکَ خَاصَمْتُ وَ اِلَیْکَ حَاکَمْتُ فَاغْفِرْلِیْ مَاقَدَّمْتُ وَ اَخَّرْتُ وَ اَسْرَرْتُ وَ اَعْلَنْتُ اَنْتَ اِلٰهِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ.
(رواه احمد و الشیخان و مالك و الثلاثة)

(۲۹) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب شب میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو کہتے اے اللہ تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں زمین وآسمان اور جومخلوق اس میں ہے سب کا نور تو ہے اور تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں- زمین وآسمان اور جومخلوق اس میں ہے سب کا وجود قائم رکھنے والا تو ہے اور تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں-تو سچا اور تیرا قول سچا ہے تیرا وعدہ سچا اور تیرا ملنا سچا ہے' جنت حق ہے' دوزخ حق ہے' قیامت کی آمد حق ہے' اے اللہ! میں تیرا ہی مطیع ہوا' تجھ پر ہی ایمان لایا' تجھ پر ہی بھروسہ کیا' تیری ہی طرف متوجہ ہوا' تیری ہی طاقت سے اپنے دشمن کا مقابلہ کیا' تیری ہی طرف فیصلہ کے لیے آیا' میرے گناہ جو میں کر چکا اور جو بعد میں کیے' جو پوشیدہ کیے اور جو کھلے طور پر کیے' سب بخش دے تو میرا معبود ہے' سوائے تیرے میرا کوئی اور معبود نہیں-
(اس حدیث کو امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ' شیخین' امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور سنن ثلاثہ نے روایت کیا ہے)

باب فی صفاته عزوجل و تنزیهه عن کل نقص

خدائے تعالیٰ عزوجل کی تنزیہی صفات

(۳۰) عَنْ اُبَیِّ بْنِ کَعْبٍؓ اَنَّ الْمُشْرِکِیْنَ قَالُوْا لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا مُحَمَّدُ اُنْسُبْ لَنَا رَبَّکَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَ لَمْ یُوْلَدْ وَ لَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ﴾(الاخلاص) (رواه احمد)

(۳۰) ابی بن کعبؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مشرکین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے محمدؐ! ہمیں اپنے پروردگار کا نسب تو بتلائیے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی - قل هو الله الخ آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ہے بے نیاز' نہ کسی کو اس نے جنا نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے- (اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے)

---

(۲۹) * حقیقت یہ ہے کہ ادعیہ واذکار کو لوگ غور سے نہیں پڑھتے - حالانکہ اسلام میں خدائی عظمت کا ٹھیک ٹھیک پتہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کا صحیح سراغ اسی نیم شب کے نالہ وبکا میں ملتا ہے ایک دعا میں جو تین تین بار و لک الحمد کہہ جاتا ہو ایک نماز میں جو ہر بار رکوع سے اٹھ کر ربنا و لک الحمد کہتا ہو سوچو کہ اس کے قلب میں اپنے خالق کے لیے کتنا جذبہ حمد پنہاں ہوگا پھر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہو تو اور کیا ہو-اللهم صل و سلم و بارک علیه ما دارت الملوان-

(۳۱) عَنْ اَبِی هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ کَذَّبَنِی عَبْدِی وَ لَمْ یَکُنْ لَهٗ ذٰلِکَ وَ شَتَمَنِی وَ لَمْ یَکُنْ لَهٗ ذٰلِکَ تَکْذِیْبُهٗ اِیَّایَ (وَفِی رِوَایَةٍ فَاَمَّا تَکْذِیْبُهٗ اِیَّایَ) اَنْ یَّقُوْلَ فَلَنْ یُّعِیْدَ نَا کَمَا بَدَأَنَا، وَ اَمَّا شَتْمُهٗ اِیَّایَ یَقُوْلُ اتَّخَذَ اللّٰہُ وَ لَدًا وَ اَنَا الصَّمَدُ الَّذِی لَمْ اَلِدْ وَ لَمْ اُوْلَدْ وَ لَمْ یَکُنْ لِّی کُفُوًا اَحَدٌ.........

(رواہ احمد و الشیخان و ابوداؤد و النسائی)

(۳۱) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے ابن آدم نے میری تکذیب کی اور یہ اس کو مناسب نہ تھا اور مجھے برا بھلا کہا حالانکہ یہ اس کے لیے موزوں نہ تھا- اس کا میری تکذیب کرنا (ایک روایت میں یوں ہے کہ بہر حال اس کا مجھے جھٹلانا تو) یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اس نے جیسا ہمیں پہلے پیدا کیا تھا ایسے ہی پھر زندہ نہیں کرے گا اور اس کا برا بھلا کہنا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے میں نے کسی کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے حالانکہ میں بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا ہے نہ کسی نے مجھ کو اور نہ میرا کوئی نظیر و ہمسر ہے-

(اس حدیث کو امام احمد شیخین اور نسائی نے روایت کیا ہے)

(۳۲) وَ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ یُؤْذِنِی ابْنُ اٰدَمَ یَسُبُّ الدَّهْرَ وَ اَنَا الدَّهْرُ بِیَدِی الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّیْلَ وَ النَّهَارَ.

(رواہ احمد و الشیخان وغیرهم)

(۳۲) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ابن آدم مجھے تکلیف دینا چاہتا ہے، دہر اور زمانہ کو برائیاں لگاتا ہے حالانکہ زمانہ (کچھ نہیں وہ) تو میں ہی ہوں، سب تصرفات میرے قبضہ میں ہیں، شب و روز کی گردش میرے ہی حکم سے ہوتی ہے- (اس حدیث کو احمد، شیخین وغیرہم نے روایت کیا ہے)

---

(۳۱) * بہت سے الفاظ صرف اعتقادیات کی نجاستوں سے ہی ملوث نہیں ہوتے بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی گرے ہوئے ہوتے ہیں- شریعت اسلام ہر ایک کو ذوقِ فطرت کے مطابق متاثر کرنا چاہتی ہے اگر کوئی عقائد کی تطہیر و تنزیہ کا مذاق نہیں رکھتا تو کم از کم اخلاقی لحاظ سے اس کو معقول کرنا چاہتی ہے اور سمجھاتی ہے کہ جو الفاظ تم اپنے منہ سے نکالتے ہو یہ صرف عقائد شرکیہ ہی نہیں بلکہ سب وشتم اور خدائے پاک کے تکذیب کے بھی الفاظ ہیں تم کہتے ہو کہ قیامت نہیں آئے گی مگر اس کلمہ کی شناعت صرف ایک عقیدہ کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس خدا نے تمہیں دوبارہ پھر زندہ کرنے کا ذکر کیا ہے گویا اس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے، تم کہتے ہو کہ اس کے بیٹا ہے مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے کسی کو جنا ہے تو اس کو بھی کسی نے جنا ہوگا اور یہاں جب سلسلہ ولادت ہے تو اس کے لیے بیوی کا ہونا بھی ضروری ہے- سوچو کہ جو ذات مادیات کی ہر ظلمت سے بالاتر ہے اس کے لیے مادیات کے اس نازل تر تخیل کا قائم کرنا اخلاق سے کتنی گری ہوئی بات ہے- ایک درشت خو مگر سادہ فطرت رکھنے والے کے لیے کیا خوب طریقہ تفہیم ہے-

(۳۲) * اسلامی ادب کی یہ انتہائی نزاکت ہے کہ ایک انسان جب اپنی عام بات چیت میں ایسے محاورات استعمال کر بیٹھتا ہے جس کی زد بارگاہ صمدیت پر پڑ سکتی ہے تو وہ ان کو عام بول چال میں لانا بھی پسند نہیں کرتا اور خدائی عظمت کو ہر وقت و ہر لحظہ ا تنا دل نشین کر دینا چاہتا ہے کہ غفلت کے حال میں بھی ہر چھوٹے بڑے تصرف کی نسبتیں سب ایک ہی ذات کی طرف رکھی جائیں بالخصوص جب کہ اس کے سامنے وہ لوگ بھی موجود ہوں جو زمانیات کو زمانہ ہی کے تاثیر کا نتیجہ قرار دیتے ہوں اس وقت اگر ایک توحید کا قائل بھی کسی استعارہ و مجاز میں لله ....

(۳۳) عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی یَسْمَعُہٗ مِنَ اللّٰہِ یَدْعُوْنَ لَہُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْھِمْ وَ یَرْزُقُھُمْ۔ (متفق علیہ)

(۳۳) ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خدائے تعالیٰ سے زیادہ تکلیف دہ کلمات سن کر تحمل کرنے والا کوئی نہیں، مشرکین اس کے لیے بیٹا تجویز کرتے ہیں، وہ اس پر بھی انہیں عافیت بخشتا اور روزی پہنچاتا رہتا ہے۔ (اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے)

☆.... یہی تعبیر اختیار کرلے تو پھر ایک اسلامی اور دھری میں کیا فرق باقی رہے گا۔ اب سوچو کہ جو مذہب تمہارے الفاظ کو بھی شرک سے اتنا دور رکھنا چاہتا ہے وہ تمہارے قلب و دماغ کو کتنا دور رکھنا چاہتا ہوگا۔ دل و دماغ پر معانی کا انعکاس الفاظ ہی کے واسطہ سے ہوتا ہے اس لیے عام بول چال میں بھی غفلت کرنا مناسب نہیں ہے ہمارے دور میں محض وقتی دلچسپی کے لیے شریعت کے عقائد و اعمال کا استہزاء کوئی بات نہیں رہی یہ غلط طریقہ ہے اس کا نتیجہ یہ ہوکر رہے گا کہ ایک دن ان کی وقعت حقیقۃً دلوں سے نکل جائے گی اور یہ وقتی خوش مذاقی دائمی بد مذاقی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

(۳۳) * خدائی ذات پاک کسی کی ایذاءدہی سے بالاتر ہے۔ مگر جب اس کی بنائی ہوئی مخلوق اپنی جانب سے ایذاءدہی کے سامان تیار کرلیتی ہے تو وہ اس کی اطلاع دے دیتا ہے کہ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں۔ مگر اس کے جواب میں عافیت و رزق فرماتا رہتا ہے اگر اس کے سوا دوسرے جواب کا ارادہ کرلے تو سب دنیا ویران ہوجائے، ہماری پستی اور اس کی بلندی، ہماری تنگ ظرفی اور اس کی فراخ حوصلگی، ہماری بغاوت اور اس کے تحمل کا یہ نقشہ قیامت تک یونہی جاری رہے گا۔ اسلام چاہتا ہے کہ فردائے قیامت میں اپنے حلقہ بگوشوں کو اس رسوائی سے بچالے۔

باب فی سعة رحمة اللّٰہ تعالٰی

اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت

انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا پہلا تعارف اگرچہ صفت ربوبیت کے ذریعہ سے قائم ہوا ہے مگر ربوبیت کی اصل روح رحمت ہی ہے اس لیے سورۂ فاتحہ میں رب العالمین کے بعد رحمٰن و رحیم کی صفت کا ذکر ہے اگر رحمت نہ ہوتی تو یہ تربیت بھی ہوتی بلکہ تمام جہان کی پیدائش ہی اسی رحمت کا ثمرہ ہے۔ رحمت ہی کا یہ جوش تھا کہ بلا مطالبہ بلا استحقاق محض عدم کو لباس وجود عطا کیا مگر رحمت کا اقتضاء صرف معدوم کو موجود اور معصوم کو بخش کر پورا نہیں ہوتا تھا اس لیے رحمٰن نے بالقصد نور و ظلمت سے ایک مرکب مخلوق بنائی تاکہ وہ گناہ کرے اور جب وہ بھولے سے بھی استغفار کے لیے ہاتھ اٹھائے تو رحمت کو بخشش کا بہانہ مل جائے یہ گناہ کر کر کے شرمندہ ہوا کرے وہ معاف کر کر کے فخر کیا کرے، فلاسفہ و معتزلہ کو صرف عادل خدا درکار ہے مگر ہم گنہگاروں کو وہ عادل درکار ہے جس کے غصہ پر اس کی رحمت غالب ہو، یہ عجیب بات ہے کہ گنہگاروں کو رحمٰن کی اتنی تلاش نہیں، جتنی رحمٰن کو گنہگاروں کی اور یہی وجہ ہے کہ معصومین موجود تھے مگر گنہگاروں کی جگہ پھر خالی تھی، رحمت کا جوش چاہتا تھا کہ ان کو بخشے جن پر فرد جرم لگ چکی ہو، جب اسے کوئی ایسا نہ ملا تو اس نے ایک مخلوق اسی صفت کی پیدا فرمائی مگر جب یہ مخلوق پیدا ہوئی تو ان میں سے بہتوں نے رحمٰن کا دروازہ چھوڑ دیا رحمت بلاتی رہ گئی اور انہوں نے منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا مگر جب عمر بھر روگردانی کے بعد بھی سمجھ آ گئی تو رحمت نے پھر گلے لگانے سے کسی کو انکار نہ کیا اور گذشتہ سب گستاخیوں پر قلم عفو کھینچنے کا اعلان کردیا۔ صفت قہر و غضب پوری تمامیت و کمال کے باوجود اپنے مستحقین پر اترنے کے لیے بھی مشیت کا انتظار کرتی ہے مگر صفت رحمت ہے کہ ہر چیز کو بلاتفریق محیط ہے رحمتی ☆....

....

لـه ... وسعت کل شیء عالم کا کوئی گوشہ نہیں جسے صفت رحمت سے کوئی نہ کوئی حصہ نہ ملا ہو اسی اعتبار سے عرش پر اسم رحمٰن کی تجلی ہے تا کہ تمام مخلوق رحمت کے نیچے بسر کرے اور اسی لیے جو نوشتہ کہ عرش رحمٰن کی زینت بنا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ان رحمت رحمتی سبقت غضبی-
اس سبقت و غلبہ کے اظہار کے لیے رحمت کی کچھ کرشمہ سازیاں میدانِ محشر میں نظر آئیں گی انہیں پڑھ کر خدا کی صفت قہر و غضب سے مطمئن نہ ہونا چاہیے رحمت کی سبقت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں صفت غضب نہیں' گناہوں کی باز پرس' مظلوموں کی دادرسی نہیں' ظالموں کی بیداری' متکبروں کے غرور' مفسدین کے بگاڑ کا کوئی حساب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک انسان سو قتل کر کے اور ایک کافر عمر بھر کی بغاوت کے بعد بھی رحمت کی طرف متوجہ ہونا چاہے تو رحمت پھر حساب نہیں لگائے گی اور ان جیسے مجرمین کے لیے بھی اس میں وسعت نظر آئے گی-لیکن کوئی مجرم اگر صفت رحمت کا خود سہارا نہیں ڈھونڈھتا تو پھر اسے خدائی غضب کی پکڑ سے مامون نہ رہنا چاہیے-
شیخ اکبرؒ نے سہل تستریؒ اور ابلیس کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے کہ ایک دن ابلیس نے ان سے کہا جب قرآن ﴿ رحمتی وسعت کل شیء ﴾ کہتا ہے (یعنی میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے) تو پھر کس دلیل سے تم مجھے رحمت سے نکال سکتے ہو کیا میں شئے نہیں' سہل کہتے ہیں یہ اعتراض سن کر میں حیران رہ گیا اور دل ہی دل میں بار بار آیت کے سیاق و سباق پر غور کرنے لگا دفعۃً مجھے خیال آیا کہ اس کے آگے ہی اس کا جواب موجود ہے-فسأ کتبھا للذین یتقون (میں اپنی رحمت ان کے لیے لکھ دوں گا جو متقی ہیں) میں نے بڑی خوشی خوشی کہا اے ملعون مگر اس رحمت کو اللہ تعالیٰ نے چند قیود کے ساتھ مقید کیا ہے چونکہ تجھ میں وہ صفات نہیں اس لیے تو رحمت کا مستحق بھی نہیں' یہ جواب سن کر ابلیس ہتک آمیز لہجہ میں مسکرا پڑا اور بولا اے سہل میرا خیال تمہارے متعلق یہ نہ تھا کہ تم اور صفاتِ الٰہیہ سے اتنے جاہل ہو گے تقیید تو تمہاری صفت ہے خدائے تعالیٰ کی جو صفت بھی ہے وہ قیود کے داغ سے مبرا و منزہ ہے' وہاں اطلاق ہی اطلاق ہے' سہلؒ کہتے ہیں اس کا یہ اعتراض سن کر میرا منہ خشک ہو گیا اور مجھے کوئی جواب نہ آیا-[1]
حضرت استاد قدس سرہ فرماتے تھے کہ آیت میں صرف خدائی رحمت کی وسعت کا بیان کیا گیا ہے جو از خود اس میں نہ آئے یہ اس کا قصور ہے رحمت کی وسعت کا نہیں-اگر ایک مکان میں سو آدمیوں کی گنجائش ہے مگر اس مکان میں آنے والے صرف پچاس ہی آدمی ہوں تو اس میں مکان کی وسعت کا قصور نہیں یہ نہ آنے والوں کی کوتاہی ہے' شیطان اور اس سے بڑھ کر متمرد کے لیے بھی رحمت میں ہر وقت گنجائش ہے مگر وہ خود ہی اگر نہ آئے تو یہ اس کی بدنصیبی ہے-انلزمکموھا و انتم لھا کارھون-

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَأَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوةَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ. (اعراف:۱۵۶)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے-میری رحمت میں ہر چیز کی سمائی ہے تو اس کو ہم ان کے لیے لکھ دیں گے جو پرہیزگار ہیں' زکوٰۃ دیتے ہیں اور ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں-

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ قَالَ تَعَالٰی قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ. (الزمر:۵۳)

کہہ دیجئے! اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جان پر زیادتی کی ہے' اللہ کی مہربانی سے آس مت توڑو' بے شک اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ سب گناہ بخش سکتا ہے وہی گناہ بخشنے والا اور مہربان ہے-

---

[1] الیواقیت والجواہر ج ا ص ۵۶-

(۳۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الْخَلْقَ کَتَبَ فِیْ کِتَابِهٖ فَهُوَ عِنْدَهٗ فَوْقَ الْعَرْشِ اِنَّ رَحْمَتِیْ تَغْلِبُ غَضَبِیْ.

(۳۴) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے' جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر لیا تو لوحِ محفوظ میں یہ لکھ دیا' میری رحمت میرے غصہ سے بڑھی ہوئی ہے یہ تحریر اس کے سامنے عرش پر موجود ہے۔

(۳۵) وَ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ یَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الْعُقُوْبَةِ مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهٖ اَحَدٌ وَ لَوْ یَعْلَمُ الْکَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهٖ اَحَدٌ.

(۳۵) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اگر مؤمن جانتا اللہ تعالیٰ کا عذاب کتنا ہے تو اس کی جنت کی کوئی طمع نہ رکھتا اور اگر کافر جانتا خدا کی رحمت کتنی ہے تو اس کی جنت سے کوئی مایوس نہ رہتا۔

(۳۶) وَ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ فَاَمْسَکَ عِنْدَهٗ تِسْعَةً وَ تِسْعِیْنَ وَ اَنْزَلَ فِی الْاَرْضِ جُزْءًا وَّاحِدًا فَمِنْ ذَالِکَ الْجُزْءِ تَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰی تَرْفَعَ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْیَةَ اَنْ تُصِیْبَهٗ.

(۳۶) ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصہ کیے' ننانوے حصہ تو اپنے لیے محفوظ رکھے ہیں اور صرف ایک حصہ زمین والوں کو بخشا ہے' یہی ایک حصہ ہے جس سے مخلوق باہم ایک دوسرے کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتی ہے یہاں تک کہ جانور اپنا پاؤں اپنے بچے سے ہٹا لیتا ہے اس خوف سے کہ کہیں اس پر جا نہ پڑے۔

---

(۳۴) * کارخانہ عالم تمام کا تمام اسباب ومسببات کا محکوم ہے اس لیے احادیث میں اگر کہیں کتاب و کتابت کا ذکر آجاتا ہے تو اس کو نہ مجاز واستعارہ بنانے کی ضرورت ہے نہ کسی اور تاویل یا تامل کی۔ ہاں اس جسارت و دلیری کی بھی ضرورت نہیں کہ عالم غیب کو عالم شہادت پر قیاس کر کے کاغذ' قلم' دوات کے جو آلات یہاں درکار ہیں وہی عالم بالا میں تصور کر لیے جائیں ؎

غیب را ابر و بہارے دیگر است

رحمت کی سبقت کا یہ مطلب ہے کہ نزول قہر کے لیے سبب درکار ہے مگر رحمت کو سبب کا انتظار نہیں اس لیے رحمت ہمیشہ غضب سے بڑھی رہتی ہے۔ یہ کتبہ اس لیے عرش پر رکھا گیا ہے کہ اس کے نیچے بسنے والی مخلوق مطمئن رہے کہ اس کے مقدمہ کی ساعت آئین رحمت کے ماتحت ہوگی صفت انتقام یا صرف صفت عدل کے ماتحت نہیں۔

(۳۶) * خدائی صفاتِ کمالیہ کا یہ کمال ہے کہ ہر ایک اپنی جگہ اتنی کامل ہے کہ ایک کا نظارہ دوسرے کے تصور سے غافل بنا دیتا ہے مگر خدا کی ذات کا یہ کمال ہے کہ اس کی ہر شان ہر وقت یکساں ظہور کرتی رہتی ہے وہ عین رحمت کے حال میں غضب اور عین غضب کے حال میں رحمت کرتا رہتا ہے۔

﴿نَبِّئْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ○ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴾ (الحجر: ۴۹-۵۰)

(میرے بندوں کو بتا دیجئے کہ غفور رحیم صرف میں ہوں اور میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے)

(۳۷) وَ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ اَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَ احِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ وَ الْبَهَائِمِ وَ الْهَوَامِّ فَبِهَا يَتَعَاطَفُوْنَ وَ بِهَا يَتَرَا حَمُوْنَ وَ بِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰى وَ لَدِهَا وَ اَخَّرَهَا اللّٰهُ تِسْعًا وَ تِسْعِيْنَ رَحْمَةً يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (متفق علیه و فی روایة مسلم فی اخره قال فاذا کان یوم القیامة اکملها بهذه الوحمة. (روی هذه الاربعة الشیخان و الترمذی)

(۳۷) ابو ہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کے لیے سو رحمتیں ہیں جس میں سے اس نے جن و انس، جانور اور موذیات میں رحمت کا صرف ایک حصہ اُتارا ہے، اسی ایک حصہ کی وجہ سے وہ باہم ایک دوسرے کی طرف جھکتے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اسی ایک حصہ کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچہ سے الفت رکھتا ہے (بقیہ) رحمت کے ننانوے حصوں کو اس نے قیامت کے دن کے لیے رکھ چھوڑا ہے کہ ان سے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا اور مسلم میں ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ان ننانوے حصوں کو رحمت کے اس ایک حصہ سے پورا کر کے (پوری سو کی سو رحمتوں سے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا - ان چار حدیثوں کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۳۸) عَنْ جُنْدُبٍؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ وَ اللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لِفُلَانٍ وَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَتَاَلّٰى عَلَيَّ اَلَّا اَغْفِرَ لِفُلَانٍ فَاِنِّيْ قَدْ غَفَرْتُ لِفُلَانٍ وَ اَحْبَطْتُ عَمَلَكَ اَوْ كَمَا قَالَ وَ فِيْ رِوَايَةٍ لَا يَسْتُرُ اللّٰهُ عَلٰى عَبْدٍ فِي الدُّنْيَا اِلَّا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواہ مسلم)

(۳۸) جندبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے خدا کی قسم کھا کر کہا وہ فلاں شخص کو نہیں بخشے گا، خدائے تعالیٰ نے فرمایا یہ کون ہے جو مجھ پر قسم کھا رہا ہے کہ میں فلاں کو نہیں بخشوں گا (جا) میں نے فلاں کو بخشا اور تیرے عمل اکارت کیے (راوی کو تردد ہے کہ یہ یا اس کے مشابہ کوئی اور جملہ فرمایا) اور ایک روایت میں یہ ہے جس بندہ کی اللہ تعالیٰ دنیا میں پردہ پوشی فرمالے (امید ہے کہ) آخرت میں بھی ضرور اس کی پردہ پوشی کرے گا - (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

---

(۳۷) * غیر محدود رحمت کے تصور سے انسان عاجز ہے اور اس کو سمجھانا یہ ہے کہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی رحمت اور تنہا خدا کی اس رحمت میں جو یوم حساب میں ظاہر ہوگی کیا تفاوت ہے، اس تفاوت کے ذہن نشین کرنے کے لیے یہ ایک فرضی حساب بیان کیا گیا ہے تاکہ فکر انسانی کو غیر محدود رحمت کے اندازہ کرنے کا راستہ مل جائے ورنہ غیر محدود کو نہ سو میں تقسیم کیا جا سکتا ہے نہ دو سو میں - حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ درجات جنت سو ہیں اور جنت میں جانا چونکہ بلا رحمت الٰہیہ ہو نہیں سکتا اس لیے ہر درجہ کے مقابلہ میں رحمت کا ایک جزء بتلا دیا گیا ہے - حدیث نمبر ۳۷ میں اسی کی توضیح و تفہیم مقصود ہے -

(۳۸) * مسند امام احمد میں اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں دو دوست تھے ایک عبادت گذار دوسرا گنہگار تھا - یہ اس گنہگار سے کہا کرتا گناہ مت کیا کر وہ جواب دیتا تجھے کیا پڑی ہے میں جانوں اور میرا رب اس نے ایک دن اسے کوئی بڑا گناہ کرتے دیکھا تو پھر اس کو روکا اس نے کہا تو مجھ پر کوئی داروغہ تو مقرر نہیں ہے اسے غصہ آیا اور خدا کی قسم کھا کر کہا جا خدا تیری مغفرت نہیں کرے گا اور نہ تجھے اپنی جنت میں داخل کرے گا - اسی وقت اللہ تعالیٰ نے موت کا فرشتہ بھیجا اس نے دونوں کی روح قبض کر لی، جب اس کے دربار میں دونوں کی پیشی ہوئی تو پہلے گنہگار کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ جا تو میری رحمت سے جنت میں چلا جا - پھر اس سے کہا تیری طاقت ہے کہ تو ......

(۳۹) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ قَالَ قَدِمَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ بِسَبْيٍ فَاِذَا امْرَأَةٌ مِنَ السَّبْيِ تَبْتَغِيْ اِذَا وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ اَخَذَتْهُ فَالْصَقَتْهُ بِبَطْنِهَا وَ اَرْضَعَتْهُ فَقَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَرَوْنَ هٰذِهِ الْمَرْأَةَ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ؟ قُلْنَا لَا وَاللّٰهِ وَهِيَ تَقْدِرُ اَنْ لَا تَطْرَحَهُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ هٰذِهٖ بِوَلَدِهَا. (رواہ الشیخان)

(۳۹) عمر بن الخطابؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے' ان میں ایک عورت پر نظر پڑی جو اپنا بچہ تلاش کرتی پھرتی تھی جونہی کہ اس کو بچہ مل گیا اسی وقت اس نے اٹھا کر اپنے سینہ سے لگا لیا اور دودھ پلانے لگی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے مخاطب ہوکر فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنے اس بچہ کو آگ میں ڈال سکتی ہے ہم نے عرض کیا خدا کی قسم نہیں بالخصوص جب کہ اس کو آگ میں نہ ڈالنے کی قدرت بھی ہے (کوئی مجبوری نہیں) اس پر آپ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر زیادہ پیار ہے بہ نسبت اس عورت کے اپنے بچہ پر۔
(اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے)

(۴۰) عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ اَزِيْدُ وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ

(۴۰) ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا اللہ تعالیٰ کہتا ہے جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا بدلہ ملے گا اور میں اس پر بھی اضافہ کروں گا اور جو برائی کرے گا اس کو صرف ایک برائی کا بدلہ ملے گا اور امکان یہ بھی ہے کہ میں اسے معاف کردوں' جو

ﷲ .... میرے بندہ پر میری رحمت روک دے؟ وہ بولا ''اے رب ہرگز نہیں'' حکم دیا ''اسے دوزخ میں لے جاؤ'' اس حدیث میں اس کی صفت قدرت کا مظاہرہ ہے یعنی وہ چاہے تو ایک گنہگار کو صرف اپنی رحمت سے بخش دے اور چاہے تو ایک نیکوکار کو ادنیٰ سی بات پر گرفت فرما لے۔ احادیث میں لفظ ''لا ابالی'' اس کی اسی شان بے نیازی کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں اس نکتہ نواز کو گنہگار کی اعتماد رحمت کی ادا پسند آگئی اور عابد کی خدائی رحمت پر اس وثوق کے ساتھ اپنی جانب سے بندش ناگوار گذری اس لیے نتیجہ پلٹ گیا۔ مخلوق کو چاہیے کہ خالق کے عذاب وثواب کی تقسیم میں کسی حال دخل انداز نہ ہو' ہم عمل کے مخاطب ہیں اور جزاء کا وہ مختار ہے۔

(۳۹) * اس کے ساتھ حدیث نمبر ۴۸ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ دونوں جگہ آنکھوں کے سامنے مخلوق کی محبت وشفقت کا انتہائی جوش نظر آرہا ہے' انسانی فطرت شناس چاہتا ہے کہ اسی تاثر کے حال میں اس کو وہ رحمت یاد دلائے جس کو صرف سمجھانے کے لیے اس سے سو گنا زیادہ کہا گیا ہے اور اس طرح خدا کی رحمت کی عظمت اتنی ذہن نشین کردے کہ یہ مخلوق کی رحمتیں نظروں میں ہیچ ہو جائیں۔ اسلامی عقائد صرف علوم نہیں بلکہ فطرت کے تاثرات اور ان کے نقش ونگار ہیں' خدائی رحمت کا ہمیں صرف علم درکار نہیں بلکہ وہ یقین درکار ہے جس کے بعد بے ساختہ قلب میں اس کی طرف ایک انجذاب محسوس ہونے لگے۔

(۴۰) * قرب وبعد کو حدود میں محصور تصور کرنے والا انسان جب ان قیود سے بالاتر ہستی کے قرب وبعد کا ذکر سنتا ہے تو اس کو بھی بالشتوں اور گزوں سے ناپنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ جو ان حدود سے آزاد ہے اس کے لیے ان حدود کا تصور کیوں کیا جائے۔ انسان خواب کے عالم میں بہت کچھ دیکھتا ہے مگر نہیں بتلا سکتا کہ اس کو اس جہان سے تحت وفوق یا قرب وبعد میں سے کون سی نسبت حاصل ہے وہ دیکھتا ہے کہ وہ اسی جیسے وسیع جہان میں پھر رہا ہے حالانکہ وہ سارا جہان اس میں ہے اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس ﷲ ....

فجزآءُ سیّئۃٍ مّثلُھا اوْ اغفِرُ وَ مَنْ تقرّبَ منّیْ شبرًا تقرّبتُ منہُ ذِراعًا وَ مَنْ تقرّبَ منّیْ ذِراعًا تقرّبتُ منہُ باعًا وَ مَنْ اتانِیْ یمشِیْ اتیتُہُ ھرولۃً و منْ لقِینِیْ بقُرابِ الْارْضِ خطیئۃً لا یُشرِکُ بِیْ شیئًا لقِیتُہُ بمثلِھا مغفِرۃً. رواہ مسلم و الترمذی و لفظہ قال اللہ تعالی یا ابنَ ادمَ انّکَ ما دعوْتنِیْ و رجوْتنِیْ غفرتُ لکَ علٰی ما کانَ فِیکَ وَ لا اُبالِیْ یا ابنَ ادمَ لوْ بلغتْ ذُنُوْبُکَ عنانَ السّمآءِ ثُمّ استغفرْتنِیْ غفرتُ لکَ وَ لا اُبالِیْ یا ابنَ ادمَ انّکَ لوْ اتیْتنِیْ بقُرابِ الارْضِ خطایا ثُمّ لقِیتنِیْ لا تُشرِکُ بِیْ شیئًا لاتیتُکَ بقُرابِھا مغفِرۃً.

میری طرف ایک بالشت قریب آئے گا میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب آؤں گا اور جو مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہوگا میں اس کے دو ہاتھ قریب ہوں گا اور جو میری طرف ٹہلتا ہوا آئے گا میں اس کی طرف لپکتا ہوا آؤں گا جو مجھ سے زمین کے برابر گناہ کر کے ملے گا میں اس سے اتنی ہی بڑی مغفرت لے کر ملوں گا - بشرطیکہ اس نے میرا کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہو- اس حدیث کو مسلم ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی کے الفاظ یہ ہیں' اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے اے ابن آدم! جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے امید لگائے رکھے گا میں تجھے بخشتا رہوں گا خواہ تیرے عمل کیسے بھی ہوں اور میں بے نیاز ہوں اے ابن آدم! اگر تیرے گناہوں کا ڈھیر آسمان تک پہنچ جائے پھر تو مجھ سے معافی مانگنا چاہے تو میں تیرے پاس اتنی ہی مغفرت لے کر آؤں گا بشرطیکہ تو نے کسی کو میرا شریک نہ ٹھیرایا ہو اور میں بے نیاز ہوں اے ابن آدم! اگر تو زمین کے برابر خطاؤں کا بوجھ لے کر میرے پاس آئے اور مجھ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ تو نے شرک نہ کیا ہو تو میں اسی کے برابر تیرے پاس مغفرت لے کر آؤں گا-

☜..... میں ہے اس سے کتنا قریب ہے کتنا بعید ہے- شریعت الفاظ کی تنگی کی وجہ سے ہماری تفہیم کے لیے ایک مؤثر انداز بیان اختیار کرتی ہے ہم اس کی صورت ڈھالنے میں مشغول ہو جاتے ہیں- یہاں حدیث کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ جتنا بندہ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس سے زیادہ رحمت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے- مادی کا قرب مادی سے بے شک مکانی ہے مگر مجرد کا مجرد سے یا مادی کا مجرد سے یا مجرد کا مادی سے مکانی قرب نہیں با ایں ہمہ آخری تین قسموں میں جو قرب ہے وہ پہلی قسم سے کہیں زیادہ ہے باپ اور بیٹے میں بعد مسافت کے باوجود جو قرب ہے وہ دو اجنبی شخصوں میں ایک جگہ بیٹھ کر بھی نہیں- اسی لحاظ سے نبی کو جو قرب و محبت مؤمنوں کی جانوں سے حاصل ہوتا ہے وہ خود ان کو اپنی جانوں سے حاصل نہیں ہوتا- قرب مکانی کا رشتہ بہت ضعیف و کمتر رشتہ ہے' قرب کی ہر تعبیر کو زمان و مکان کی قیود میں محدود کر دینا بڑی کوتاہی ہے' خدا ایک مطیع و فرمانبردار بندہ سے بہت قریب ہے اور اتنا قریب ہے کہ اس کی رگ جاں بھی اتنی قریب نہیں مگر وہ قرب نہیں جو مادی کا مادی سے ہوتا ہے بلکہ وہ جو مجرد کو مادی سے ہو سکتا ہے- اسی طرح وہ عاصی و نافرمان سے بہت بعید ہے مگر وہ بعد نہیں جس کا حدود و نہایات سے اندازہ کیا جا سکے غرض کہ اگر وہ قریب ہے تو اتنا کہ اس سے زیادہ کوئی قریب نہیں اور بعید ہے تو ایسا کہ اس سے زیادہ کوئی بعید نہیں مگر دونوں صورتوں میں اس کا قرب و بعد وہی ہے جو ایک مجرد کو مادی سے ہو سکتا ہے نہ وہ جو مادی کو مادی سے شیخ اکبر فرماتے ہیں ؎

و من عجبی انی احن الیھم　　و اسأل عنھم دائما و ھم معی
و تبکیھم عینی و ھم فی سوادھا　　و تشتاقھم روحی و ھم بین اضلعی[1]

☜.....

[1] الیواقیت والجواہر ص ۶۰ -

(۴۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَ مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَ مَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا

(۴۱) ابوہریرۃؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے' میرا بندہ میرا تقرب کسی اور عمل سے جو مجھے پسند ہوا تنا حاصل نہیں کرتا جتنا کہ اس عمل سے جو میں نے اس پر فرض کیا ہے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا رہتا ہے تا آنکہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا وہ کان ہو جاتا

☜..... ''یعنی مجھے اپنے حال پر تعجب ہے کہ میں کیوں ان کا مشتاق رہتا ہوں اور ان کے متعلق ہمیشہ کیوں دریافت کرتا پھرتا ہوں جب کہ وہ ہمہ وقت میرے ساتھ ہیں اور اس پر کہ میری آنکھیں ان کے لیے کیوں رویا کرتی ہیں' جب کہ وہ اس کی پتلی میں موجود ہیں اور میری جان ان کے لیے کیوں مشتاق رہتی ہے حالانکہ وہ میرے دل میں جلوہ فگن ہیں۔''

یہ تحیر و تعجب اس وقت تک دور نہیں ہوگا جب تک یہ مادی ترقی کر کے عالم تجرد کے کچھ قریب نہ ہو جائے' جب قریب ہو جائے گا تو پھر بھی اتنا ہی سمجھ سکے گا کہ اس کا تحیر بجا تھا' درست تھا لیکن جب ہر شخص اس مرتبہ عروج کا اہل نہیں تو وراء الوراء ذات خود تنزل کر کے اپنے لیے وہی الفاظ استعمال کرنا جائز سمجھ لیتی ہے جو مادی کے لیے استعمال ہو سکتے ہیں اس کے ساتھ یہ تنبیہ کر دی جاتی ہے کہ محض ان الفاظ سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔ مگر اس نازک مرحلہ پر پہنچ کر انسانی عقل محدود الفاظ اور غیر محدود ذات کا توازن قائم نہیں رکھ سکتی اور پھر یا تشبیہ کی حد میں داخل ہو جاتی ہے اور یا تنزیہ کے ان حدود تک پہنچ جاتی ہے جہاں قرب و بُعد کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا۔ اسلام عبد و معبود کے درمیان جن علائق کا پتہ دیتا ہے اگر ہم ان کا تصور چھوڑ دیں تو پھر خدا کی ذات میں ہمارے لیے کوئی کشش نہیں رہتی اور اگر انہیں مادیت کے سانچے میں ڈھال لیں تو کفر بنتا ہے اس لیے یا تو اسی طرح اس پر ایمان لاؤ اور اگر اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہو تو عملی قدم بڑھاؤ اور اس کا یہ قرب و بُعد دیدۂ باطن سے اسی طرح دیکھ لو جیسا کہ دیدۂ ظاہر سے محسوسات کا مشاہدہ کر لیتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

(۴۱) ✽ دو انسانوں کے درمیان مراحل محبت طے کرتے کرتے بسا اوقات ایسے اثرات نظر آنے لگتے ہیں جنہیں ایک اجنبی شخص بھی دیکھ کر یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ ضرور ان دو شخصوں میں کوئی ایسا تاثر و مغلوبیت کا تعلق ہے جس نے ان کے ظاہر کو بھی مسخر کر لیا ہے وہ دیکھتا ہے کہ نشست و برخاست کے اوضاع و اطوار سے گذر کر ان کے خط و خال میں بھی صفت ہمرنگی پیدا ہو گئی ہے' جب آرزو کے اتحاد' ارادہ کے اتحاد' جذبات کے اتحاد کے ساتھ ظاہر کا یہ اتحاد بھی نظر آنے لگتا ہے تو اس اتحاد کی صحیح ترجمانی کے لیے لفظ اتحاد کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں ملتا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ——— تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

متنبی کہتا ہے ؎

ما الخل الا من أود بقلبه ——— و أری بطرف لا یری بسوائه

فارسی و عربی کے شعراء نے آثار محبت کے ادائیگی کے لیے جس مناسب تعبیر کا انتخاب کیا ہے وہ لفظ اتحاد ہے مگر ان الفاظ سے یہاں کسی کو بھی یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا کہ اس اتحاد کی وجہ سے ان کی حقیقی اثنینیۃ باقی نہیں رہتی پھر جب مخلوق کے دائرہ میں ان الفاظ سے یہ کھلی ہوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوتی تو خالق و مخلوق کے درمیان کسی تعبیری توسع سے عقیدہ کی غلط فہمی کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ جب ایک بندہ راہ عبدیت پر گامزن ہوتا ہے اور فرائض و نوافل کے سبب عجز و نیاز کے قدم اٹھاتا چلا جاتا ہے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اب ☜....

اَحۡبَبۡتُہٗ کُنۡتُ سَمۡعَہُ الَّذِیۡ یَسۡمَعُ بِہٖ وَ بَصَرَہُ الَّذِیۡ یُبۡصِرُبِہٖ وَ یَدَہُ الَّتِیۡ یَبۡطِشُ بِھَا وَ رِجۡلَہُ الَّتِیۡ یَمۡشِیۡ بِھَا وَ اِنۡ سَأَلَنِیۡ لَاُعۡطِیَنَّہٗ وَ لَئِنِ اسۡتَعَاذَنِیۡ لَاُعِیۡذَنَّہٗ وَ مَا تَرَدَّدۡتُ عَنۡ شَیۡءٍ

ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور وہ ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ کام کرتا ہے اور وہ پاؤں جن سے وہ چلتا ہے اب اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرے گا تو میں اسے دوں گا اور اگر میری پناہ میں آنا چاہے گا تو میں اپنی پناہ میں لے لوں گا' اور مجھے کسی کام کرنے میں جو مجھے کرنا ہے

☜ ....اس کے ظاہر و باطن کو سلطان الوہیت نے پورا پورا مسخر کر لیا ہے اگر وہ سنتا ہے تو وہی سنتا ہے جسے خدا نے سننے کا امر کیا ہے اگر دیکھتا اور بولتا ہے تو وہی دیکھتا اور بولتا ہے جس کی اسے اجازت دی گئی ہے اگر وہ اپنا ہاتھ یا قدم اٹھاتا ہے تو وہیں اٹھاتا ہے جہاں اس کے مولیٰ نے اس کے لیے اٹھانا پسند کیا ہے اس کے سوا نہ وہ کچھ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے نہ اور کوئی ادنیٰ جنبش کرتا ہے تو اس ربط محبت کے اظہار کے لیے لامحالہ وہی الفاظ اختیار کرنے پڑتے ہیں جو اس موقعہ و محل کے لیے مانوس ہیں پھر جس طرح وہاں ان الفاظ کا کھلا ہوا مطلب صرف اس رشتہ محبت کی ترجمانی ہے- اسی طرح یہاں بھی ان الفاظ کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ اب یہ بندہ وادیٔ محبت طے کرتا ہوا اپنے مولیٰ کی رضا و تسلیم میں فنا ہو چکا ہے اور اوامر شریعت کا اس طرح مطیع و منقاد ہو گیا ہے جیسا کہ ایک شائستہ گھوڑا اپنے سوار کے اشارات کا' نہ اس گھوڑے کی حس و حرکت اپنی ہے نہ اس بندہ کی نقل و حرکت اپنی' دیکھنے میں تو یہ خود ٹھہرتا اور حرکت کرتا ہے اور حقیقت میں اس کی حس و حرکت اس کے مالک ہی کی ہے اس کے جوارح اس کے ارادہ کے مظاہر بنے ہوئے ہیں جب مخلوق کی قوت ارادی اس درجہ فنا ہو جاتی ہے کہ اس کا حرکت و سکون دوسرے کے ارادہ کے تابع ہو جائے تو پھر اس کا حکم اسی صاحب ارادہ کے تابع ہو جاتا ہے- کتا جیسا خبیث جانور معلم ہو کر جب اپنی قوت ارادی فناء کر دیتا ہے اور ہمہ تن اپنے مالک کی رضاء کے تابع ہو جاتا ہے تو شریعت نے اس کے جوارح کا اپنا کوئی حکم باقی نہیں رکھا بلکہ جو اس کے مالک کا حکم ہے اس کا بھی وہی حکم رکھ دیا ہے اسی لیے اگر وہ کتا مسلمان کا ہے تو اس کا شکار حلال ہے اور اگر کافر کا ہے تو اس کا شکار حرام ہے- اس کا مطلب یہ ہے کہ اس درجہ فنائیت کے بعد اب یہ شکار اس کتے کا ہے ہی نہیں بلکہ اس کے مالک کا ہے اگر وہ مسلمان تھا تو یہ بھی حلال ہے اسی طرح جب بندہ اپنے ارادات کو فنا کر دیتا ہے تو پھر یہ اطلاق درست ہو جاتا ہے کہ اس کے سمع و بصر مشیت ایزدی کا مظہر بن گئے ہیں آپ نے دیکھا کہ فناء ارادہ کے اس مرحلہ پر پہنچ کر کس طرح ایک کتا اپنے مالک کا حکم اختیار کر لیتا ہے مگر جب ایک انسان شریعت کی متابعت کی بجائے اس سے ٹکرانے لگتا ہے تو پھر اس کا حکم جانور سے بدتر ہو جاتا ہے-

اس مضمون کو یہاں پوری احتیاط سے ادا کیا گیا ہے اور اسی لیے یہ نہیں فرمایا کہ ''کنت ھو انا'' یعنی اتحاد ذات کی بجائے صرف اس کے ان ظاہری حواس کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کے افعال کے لیے محرک بنتے ہیں- جہاں تک غور و تجربہ سے معلوم ہو سکا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت میں مجاز و استعارہ کی وہ سب شائستہ تعبیرات جائز رکھی گئی ہیں جو عربی زبان میں کسی غلط فہمی کا موجب نہ ہوں اور جن تعبیرات و مجازات سے کوئی ادنیٰ ابہام بھی پیدا ہو سکتا تھا ان سے تمام تر احتراز کیا گیا ہے- شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہاں سمع و بصر وغیرہ قویٰ حسیہ کا ذکر کیا گیا ہے- قویٰ باطنیہ جیسا کہ فکر و خیال حفظ و وہم ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا یعنی یوں نہیں فرمایا گیا کہ میں اس کا فکر و وہم بن جاتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ حواس ظاہرہ اپنے ادراکات میں براہ راست خدا تعالیٰ کے محتاج ہیں اور قوائے باطنیہ بھی گو اس کی احتیاج سے باہر نہیں مگر یہاں برائے نام حواس ظاہرہ کا توسط بھی موجود ہے ان قوتوں کا دائرہ تصرف وہی ادراکات ہیں جو حواس ظاہرہ کے ذریعہ ان کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں- گویا انسانی حواس میں حواس ظاہرہ بلاواسطہ خدا کے محتاج ہیں اور حواس باطنہ حواس ظاہرہ کے واسطہ سے' اس لیے تا امکان مجاز و استعارہ میں بھی اس پہلو سے احتراز کیا گیا جہاں غیر کی طرف احتیاج کی بو آ سکتی ہے-[1] ☜....

[1] الیواقیت والجواہر ج ا ص ۵۹-

اَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِیْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَهُ الْمَوْتَ وَ اَنَا اَکْرَهُ مَسَاءَ تَهُ وَ لَا بُدَّلَهُ مِنْهُ. (رواہ البخاری)

اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا کہ مومن کی روح قبض کرنے میں اسے موت پسند نہیں ہوتی اور مجھے اس کا دل گیر ہونا گوارا نہیں ہوتا اور موت اس کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔ (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

؎ .... ہمارے نزدیک یہ نکتہ سنجی ایک بڑے محقق کے اندازۂ علم کے موافق ہے ورنہ سہل یہ ہے کہ اس جیسے مقام کے لیے حواس باطنہ کا تذکرہ گو بلحاظ قیاس درست ہو مگر عام محاورہ نہیں ہے اس لیے اگر کنت سمعه و بصره کی بجائے کنت فکره و وهمه کہہ دیا جاتا تو شاید یہاں حقیقت کا ابہام پیدا ہونے لگتا اس لیے ایسی ہی تعبیر کا استعمال کرنا مناسب تھا جو مجازی معنی میں اتنی متعارف ہو کہ اس کے استعمال میں حقیقت کی طرف انتقال ذہنی کا کوئی شبہ نہ ہو سکے اور اس طرح ان تشبیہی الفاظ میں حقیقی تنزیہ کو کوئی ٹھیس نہ لگے۔ بدقسمتی سے جب قرآن و حدیث کے تراجم اردو زبان میں کیے جاتے ہیں تو زبان کے محاورات کی ناواقفی کی وجہ سے بلاوجہ دماغوں میں شک وتردد کی گرد اُڑنے لگتی ہے جس کو دبانے کے لیے پھر بلاوجہ اور طول دینا پڑتا ہے ورنہ اس حدیث کا مضمون اتنا صاف و واضح ہے کہ کسی سوال و جواب کی ضرورت ہی نہیں یہاں اہل علم غور کرلیں کہ اس حدیث میں ان اللّٰه خلق ادم علی صورته کا کتنا پتہ ملتا ہے مگر عقائد صحیح اور علم راسخ ہوتا تو اس کی توضیح کرنے میں بھی مضائقہ نہ تھا مگر اب خاموش ہونا پڑتا ہے۔ ''قلم ایں جا رسید و سر بشکست''

حدیث میں دوسرا مشکل لفظ تردد ہے کیونکہ خدا کی بارگاہ میں تردد کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں مگر یہاں ایک عمیق حقیقت ہے جس کے سمجھانے کے لیے اس کے سوا کوئی اور لفظ بھی نہیں اور وہ ایک معاملہ ہے جو انسان کی موت کے سلسلہ میں خالق کی جانب سے پیش آتا ہے ظاہر ہے کہ موت فطرتِ انسان کے لیے ایک تلخ گھونٹ ہے جو اپنے اختیار سے پسند نہیں کیا جا سکتا رحمت چاہتی ہے کہ اس کے لیے اسے تیار کردے اور اتنا تیار کردے کہ وہ اسے لقاء رب کی شیرینی سمجھ کر بشوق و رغبت خود پینے کی خواہش کرنے لگے یہ کیونکر ہو اس کے لیے وہ اسباب پیدا کرتی ہے یعنی موت سے قبل مصائب کا ہجوم‘ تجارت میں نقصان‘ دوستوں کی بے وفائی‘ عزیزوں کی بے رخی‘ اولاد کی سرکشی جیسے صبر آزما واقعات پے در پے رونما ہوتے رہتے ہیں ادھر اس کا دل دنیا سے سرد ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آنے سے پہلے کہ دنیا اس سے جبراً چھڑائی جائے خوشی خوشی از خود ترک کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عین عیش و راحت اور پورے لذت واطمینان کی ساعات میں اسے موت آجاتی مگر رحمت عبد مؤمن کی موت اس طرح نہیں چاہتی کہ فرشتہ اس کو لقاء رب کی دعوت دیتا رہے اور وہ حیوٰۃ دنیا کو ترجیح دیتا رہے۔ بندہ کی فطری حرص زندگی اور رحمت کے اسباب نفرت کی ان تمہیدوں کا صحیح نقشہ کھینچنے کے لیے تردد کے لفظ سے زیادہ پیارا کوئی اور لفظ نہیں ہے یعنی اگر کوئی دور سے بیٹھ کر بندہ کو موت پر رضامند کرنے کے لیے ان ترددات کو دیکھے تو یہی سمجھے کہ شاید قدرت کو اس کی موت کے لیے بڑا اہتمام کرنا پڑ رہا ہے یہ موت پسند نہیں کرتا وہ اسے دلگیر کرنا پسند نہیں کرتا اس لیے بڑے لطائف الحیل سے گویا اس کو تیار کیا جارہا ہے یہ سب سماں کیوں باندھا جاتا ہے صرف مؤمن کی تشریف و تکریم کے لیے‘ قدرت اگر چاہے تو بلا کسی ادنیٰ پس و پیش کے ایک آن میں روح قبض کرے مگر اس صورت میں اس کی قدرت و اختیار کا ہی مظاہرہ ہوگا جو بلاشبہ ہے‘ مؤمن کی تشریف و تکریم کیا ظاہر ہوگی جو ہر طرح محتاج ہی محتاج ہے اس اعزاز و اکرام کی خاطر یہاں بلا کسی ادنیٰ تردد کے وہ سماں باندھا جاتا ہے جس کو‘ بجز لفظ تردد کسی اور طرح تعبیر نہیں کیا جا سکتا اسی کو شیخ اکبرؒ نے فرمایا تھا کہ جب الفاظ کے دائرے حقائق غیب کی صحیح ترجمانی سے تنگی کرنے لگتے ہیں تو وہ خود تنزل کر کے اپنی بارگاہ کے لیے ان الفاظ و تعبیرات کی اجازت دے دیتے ہیں جن کا استعمال ان کی بارگاہ میں سرتاسر گستاخی تھا۔

اس تمام قیل وقال سے قطع نظر کر کے سمجھو کہ یہاں اصل مقصد یہ بتلانا ہے کہ اسلام کا خدا تمام تر استغناء و جلال کے باوجود اپنی مخلوق سے لاپرواہ نہیں اور اسی لیے اسلام کے خدائی تصور میں مخلوق کے لیے جتنی جاذبیت و کشش ہے اتنی کسی دوسرے مذہب کے خدائی تصور میں نہیں۔ و للّٰه المثل الاعلیٰ۔

(۴۲) وَ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا يَحْكِيْ عَنْ رَّبِّهٖ عَزَّوَجَلَّ قَالَ اَذْنَبَ عَبْدٌ ذَنْبًا. فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ فَقَالَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى اَذْنَبَ عَبْدِيْ ذَنْبًافَعَلِمَ اَنَّ لَهٗ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَ يَأْخُذُ بِالذَّنْبِ ثُمَّ عَادَ فَاَذْنَبَ فَقَالَ اَيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ فَقَالَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى عَبْدِيْ اَذْنَبَ ذَنْبًا فَعَلِمَ اَنَّ لَهٗ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَ يَاْ خُذُ بِالذَّنْبِ ثُمَّ عَادَ فَاَذْنَبَ فَقَالَ اَيْ رَبِّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ فَقَالَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى اَذْنَبَ عَبْدِيْ ذَنْبًا فَعَلِمَ اَنَّ لَهٗ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَ يَأْخُذُ بِالذَّنْبِ اِعْمَلْ مَا شِئْتَ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكَ.

(۴۲) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث قدسی میں روایت کرتے ہیں کہ ایک بندہ نے گناہ کیا اور کہا اے اللہ! میرا گناہ بخش دے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے گناہ کیا اور اتنا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار بھی ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ اس کی کچھ مدت بعد پھر گناہ کرتا اور کہتا ہے کہ اے رب! میرا گناہ بخش دے حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے گناہ کیا اور اتنا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جو گناہ بخشتا اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ پھر کچھ مدت بعد وہ بندہ گناہ کرتا اور کہتا ہے کہ اے رب! میرا گناہ بخش دے حق تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے گناہ کیا اور یہ سمجھا کہ کوئی اس کا پروردگار ہے جو گناہ بخشتا اور اس پر گرفت کرتا ہے۔
(اگر تیری انابت کا یہی طور ہے) تو اب جو چاہے کر میں نے تجھے بخش دیا۔

(۴۳) وَ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ لَمْ يَعْمَلْ حَسَنَةً قَطُّ لِاَهْلِهٖ اِذَا مَاتَ فَحَرِّقُوْهُ ثُمَّ اَذْرُوْا نِصْفَهٗ فِي الْبَرِّ وَ نِصْفَهٗ فِي الْبَحْرِفَوَ اللّٰهِ لَئِنْ قَدَرَ اللّٰهُ

(۴۳) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص نے جس نے کبھی کوئی نیک عمل نہ کیا تھا اپنے گھر والوں سے یہ وصیت کی کہ دیکھو جب اس کی وفات ہو جائے تو اسے جلانا پھر اس کی نصف خاک جنگل میں اڑا دینا اور نصف دریا میں بہا دینا۔ خدا کی قسم! اگر کہیں حق تعالیٰ نے اس کو جمع کر لیا تو

(۴۲) ٭ یعنی خدا کی رحمت پر اعتماد اور اس کی قدرت پر پورا یقین رکھنے کی دو صفتیں نزول مغفرت کا سب سے بڑا سامان ہیں۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب　　تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

حدیث انا عند ظن عبدی بی کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی خدائے تعالیٰ کا اپنے بندہ سے معاملہ اس کے اعتماد و وثوق کے بقدر ہوتا ہے اگر اس کو یہ یقین ہے کہ گناہوں پر گرفت یا چشم پوشی کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے اس حسن عقیدت کا خلاف کرنا پسند نہیں کرتا اور اس کے لیے مغفرت کا اعلان کر دیتا ہے۔ ''جو چاہے کرو'' یہ لفظ تہدید و تخویف، اعزاز و تشریف کے دونوں مقام پر بولا جاتا ہے اور دونوں جگہ اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ قرینہ مقام کے مناسب یا صرف تخویف مراد ہوتی ہے یا تشریف۔ قرآن کریم میں ﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ﴾ (فصلت: ۴۰) اور ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکہف: ۲۹) اسی محاورہ پر استعمال ہوا ہے۔ محاورات میں منطق چلانا نہیں چاہیے۔

(۴۳) ٭ یہاں اس گنہگار نے شدت خوف و مایوسی کے عالم میں عذابِ الٰہی سے نجات کا ایک غلط راستہ تجویز کیا تھا اور اس اضطراب میں جو بے مصداق کلمات ایک جاہل کے منہ سے نکل سکتے ہیں نکال دیئے تھے جب قدرت نے ان پر علمی گرفت نہیں کی تو آپ بلاوجہ کیوں اس لئے ....

عَلَيْهِ لَيُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا لَا يُعَذِّبُهُ اَحَدًا مِنَ الْعَالَمِيْنَ فَلَمَّا مَاتَ الرَّجُلُ فَعَلُوْا مَا اَمَرَهُمْ فَأَمَرَ اللّٰهُ الْبَرَّ فَجَمَعَ مَا فِيْهِ وَاَمَرَ الْبَحْرَ فَجَمَعَ مَا فِيْهِ ثُمَّ قَالَ لِمَا فَعَلْتَ هٰذَا قَالَ مِنْ خَشْيَتِكَ يَا رَبِّ وَ اَنْتَ اَعْلَمُ فَغَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ.

ایسا عذاب دے گا کہ تمام جہان میں ایسا عذاب کسی کو نہ دے گا- اس شخص کا انتقال ہو گیا اور گھر والوں نے اس کی وصیت پوری کر دی- حق تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا (کہ اس کے اجزاء پریشان کو جمع کرے) اس نے سب جمع کر دیئے اور (اسی طرح) سمندر کو حکم دیا تو اس نے بھی اس کے جو اجزاء اس میں تھے جمع کر دیئے اس کے بعد فرمایا (بول) تو نے یہ حرکت کیوں کی تھی؟ اس نے عرض کیا' اے پروردگار! صرف تیرے خوف وڈر سے اور تو خود خوب واقف و دانا ہے- اس پر حق تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی-

(۴۴) عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍ اَنَّ نَبِیَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَ تِسْعِيْنَ نَفْسًا فَسَأَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰى رَاهِبٍ فَأَتَاهُ فَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ تِسْعَةً وَ تِسْعِيْنَ نَفْسًا فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ لَا فَقَتَلَهٗ فَكَمَّلَ بِهٖ مِائَةً ثُمَّ سَأَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰى رَجُلٍ عَالِمٍ فَأَتَاهُ فَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ مِائَةَ نَفْسٍ فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ نَعَمْ وَ مَنْ يَحُوْلُ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ التَّوْبَةِ اِنْطَلِقْ اِلٰى اَرْضِ كَذَا وَ

(۴۴) ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلی امتوں میں ایک شخص تھا اس نے ننانوے قتل کیے اور اپنے شہر کے سب سے بڑے عالم کو دریافت کیا تو اس کو ایک درویش کا پتہ بتایا گیا وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اس نے ننانوے قتل کیے ہیں' کیا اب بھی اس کے لیے توبہ کی کوئی صورت ہے؟ اس نے جواب دیا ''نہیں'' اس نے اسے بھی قتل کر ڈالا اور پورے سو کر دیئے' پھر کسی بڑے عالم کو دریافت کیا تو کسی اور عالم کا پتہ بتایا گیا وہ اس کے پاس پہنچا اور کہا کہ اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے' اس نے کہا اس کے اور اس کی توبہ کے درمیان بھلا کون حائل ہو سکتا ہے' فلاں فلاں بستی میں چلا

﴾.... پر گرفت کرتے ہیں ایک جاہل کے الفاظ سے اس کے عقائد کا اندازہ لگانا نہ چاہیے اس کی عبارت ہمیشہ قاصر' اس کے الفاظ ہمیشہ ناتمام ہوتے ہیں- غلط عمل ہمیشہ غلط ہے اور کسی وقت قابل تحسین نہیں مگر نیت اگر اچھی ہو تو جہالت کی بعض معذوریوں میں رحمت اسے نبھا لیتی ہے اس لیے یہاں اس شخص کی مغفرت اس کے عمل کا نتیجہ سمجھنا نہ چاہیے بلکہ یہ کرشمہ رحمت ہے- رحمت کے ساتھ جب پوری قدرت' پورا اختیار حاصل ہو تو اس قسم کے کرشموں کا ظہور ضروری ہے- احادیث میں لفظ ''لا أبـالـي'' مجھے پرواہ نہیں اسی انداز استغناء کی طرف اشارہ ہے خدائی قدرت کے ساتھ اگر رحمت کا غلبہ ہو تو بڑے سے بڑا گناہ بے وزن ہو جاتا ہے اور اگر نقمت و عدل کا رجحان ہو تو بڑی سے بڑی عبادت بے وزن ہے- ضعیف انسان کی سرتاسر ناقص عبادت کا وزن ہی کیا ہو سکتا ہے اس میں تمام وزن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شرف قبولیت میسر آ جائے-

(۴۴) * ایک بے گناہ قتل پر دائمی عذاب آئین عدل ہے اور سو بے گناہ قتل پر اغماض آئین فضل یہ قادر مختار کی مرضی اور وقت کی بات ہے کہ جس آئین پر چاہے عمل کر لے- اس حدیث کے ایک طریق میں تھوڑا سا جزء اور مذکور ہے اور وہ یہ کہ جب فرشتوں نے زمین کی پیمائش شروع کر دی تو اس کو حکم ہوا کہ جس طرف اس قاتل کا رخ تھا اس طرف ذرا قریب ہو جائے اور جس طرف اس کی پشت تھی اس طرف ذرا بعید ہو جائے- جب انہوں نے پیمائش کی تو جس جانب اس کا رخ تھا ایک بالشت زمین بڑھی ہوئی نکلی- گویا قدرت نے ان دو متضاد آئین میں یہاں خود توفیق کی یہ صورت تجویز کر لی کہ اس کا فضل صورت عدل میں نمودار ہو- اس لیے زمین کی ناپ تول تو اس لیے رہی کہ ﴾....

كَذَا فَاِنَّ بِهَا اُنَاسًا يَعْبُدُوْنَ اللّٰهَ فَاعْبُدِاللّٰهَ مَعَهُمْ وَ لَا تَرْجِعْ اِلٰى اَرْضِكَ فَاِنَّهَا اَرْضُ سَوْءٍ فَانْطَلَقَ حَتّٰى اِذَا نَصَفَ الطَّرِيْقَ اَتَاهُ الْمَوْتُ فَاخْتَصَمَتْ فِيْهِ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ وَ مَلَائِكَةُ الْعَذَابِ فَقَالَتْ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ جَاءَ تَائِبًا مُقْبِلًا بِقَلْبِهِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى وَ قَالَتْ مَلَائِكَةُ الْعَذَابِ اِنَّهُ لَمْ يَعْمَلْ خَيْرًا قَطُّ فَاَتَاهُمْ مَلَكٌ فِيْ صُوْرَةِ اٰدَمِيٍّ فَجَعَلُوْهُ بَيْنَهُمْ فَقَالَ قِيْسُوْا مَا بَيْنَ الْاَرْضَيْنِ فَاِلٰى اَيِّهِمَا كَانَ اَدْنٰى فَهُوَ لَهٗ فَقَاسُوْهُ فَوَجَدُوْهُ اَدْنٰى اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ اَرَادَ فَقَبَضَتْهُ مَلَائِكَةُ الرَّحْمَةِ. (روى هذه الثلاثة الشيخان)

جا‘ جہاں خدائے تعالیٰ کے عبادت گذار بندے رہتے ہیں تو بھی جا کر ان کے ساتھ عبادت کر اور اپنے وطن کی طرف واپس مت لوٹ کہ وہ معصیت کی زمین ہے وہ چلا‘ جب نصف راستہ پر پہنچا تو اس کی موت آ گئی‘ یہاں عذاب و رحمت کے فرشتوں میں حجت ہونے لگی رحمت کے فرشتوں نے کہا یہ توبہ کر کے خدا کی طرف دلی توجہ سے آ رہا تھا اور عذاب کے فرشتوں نے کہا اس نے اپنی گذشتہ زندگی میں کبھی کوئی نیک کام کیا ہی نہ تھا - اسی درمیان میں ان کے پاس انسانی صورت میں ایک فرشتہ آیا انہوں نے اس کو اپنا پنچ بنا لیا اس نے کہا اچھا دونوں زمینوں کا فاصلہ ناپو جس طرف وہ زیادہ قریب نکلے ادھر ہی کا سمجھا جائے ناپا تو وہ ادھر زیادہ قریب نکلا جدھر اس نے جانے کا ارادہ کر لیا تھا - اس لیے رحمت کے فرشتوں نے اسے قبض لیا - (ان تینوں حدیثوں کو شیخین نے روایت کیا ہے)

(۴۵) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ حَدِيْثًا اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِ مَرَّاتٍ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ كَانَ الْكِفْلُ مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ لَا يَتَوَرَّعُ مِنْ ذَنْبٍ عَمِلَهٗ فَاَتَتْهُ امْرَأَةٌ فَاَعْطَاهَا سِتِّيْنَ دِيْنَارًا عَلٰى اَنْ يَطَأَهَا فَلَمَّا قَعَدَ مِنْهَا مَقْعَدَ الرَّجُلِ مِنِ امْرَأَتِهٖ اَرْعَدَتْ وَ بَكَتْ فَقَالَ مَا يُبْكِيْكِ

(۴۵) ابن عمرؓ کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حدیث سات مرتبہ سے زیادہ فرماتے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ کفل بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا (یہ وہ رسول نہیں ہے جن کا قرآن کریم میں ذکر ہے) کسی گناہ سے پرہیز نہ رکھتا تھا - ایک مرتبہ ایک عورت اس کے پاس آئی‘ اس نے ساٹھ دینار اس شرط پر اس کو دیئے کہ اس سے زنا کرے‘ جب وہ اس جگہ بیٹھ گیا جہاں مرد اس خیال سے عورت کے سامنے بیٹھا کرتا ہے تو وہ کانپ اٹھی اور رو پڑی‘ اس نے پوچھا کیوں روتی ہے؟ کیا میں نے تجھے کچھ

☜ .... عدل کی صورت محفوظ رکھی جائے - صرف ایک بالشت بھر زمین کی زیادتی پر غلبہ رحمت اس لیے ہوا کہ آئین فضل کا مظاہرہ ہو جائے - ہمارے اس بیان سے صرف ایک بالشت بڑھنے کا نکتہ بھی حل ہو گیا ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہو گیا ہوگا کہ عدل و فضل کی باگ صرف اختیار قدرت میں ہے اس لیے صفت عدل پر نظر کر کے مایوسی یا اس کے فضل پر بھروسہ کر کے بے خوفی دونوں راہیں صواب نہیں - یدعون ربھم خوفا وطمعا - اپنے رب کو اس طرح پکارنا چاہیے کہ اس کے قہر کا خوف اور اس کے مہر کی طمع ہر وقت لگی رہے -

(۴۵) * بعض عمل اپنے عزم و خلوص کی وجہ سے مقبولیت کا وہ رتبہ حاصل کر لیتے ہیں کہ ان کا تنہا وجود مغفرت کا سامان بن جاتا ہے - یہ صرف انسانی عمل کا کمال نہیں بلکہ رحمت کی قدردانی کی بات ہے یہ کفل کتنا ہی بدکار رہی مگر اس موقعہ پر خدائی خوف کا جو نقشہ اس نے پیش کیا شاید ہی کوئی عمر بھر کا نیک مشکل سے پیش کر سکتا ہے اس کا ایسے گناہ سے اس طرح اٹھ کھڑا ہونا جہاں انسان کی کمزور فطرت لغزش کھائے بغیر نہیں رہ سکتی پھر آئندہ کے لیے خدا کی نافرمانی سے احتراز کا عزم کر لینا ایسی پسندیدہ ادا تھی کہ اس ایک ہی ادا پر رحمت نے اس کی ☜ ....

اا کرھتک؟ قالت لا و لکنہ عمل ما عملتہ قط و ما حملنی علیہ الا الحاجۃ فقال تفعلین انت ھذا و ما فعلتہ اذھبی فھی لک و قال لا و اللہ لا اعصی اللہ بعدھا ابدا فمات من لیلتہ فاصبح مکتوبا علی بابہ ان اللہ قد غفر للکفل. (رواہ الترمذی)

مجبور کیا ہے؟ وہ بولی نہیں لیکن یہ کام کبھی میں نے اپنی عمر بھر نہیں کیا تھا مگر اب صرف اپنی حاجت روائی کی مجبوری سے کرنا پڑتا ہے اس نے کہا اچھا کبھی تو نے یہ کام نہیں کیا؟ اور اب مجبوراً کرتی ہے' جا یہ دینار میں نے تجھے یونہی بخشے اور قسم کھائی کہ آج کے بعد میں کبھی خدائے تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا (اتفاق) کہ اسی شب میں اس کا انتقال ہوگیا صبح کو اس کے دروازہ پر یہ نوشتہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے کفل کو بخش دیا۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۴۶) عن ثوبان رضی اللہ تعالٰی عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان العبد لیلتمس مرضاۃ اللہ فلا یزال بذلک فیقول اللہ عزوجل لجبریل ان فلانا عبدی یلتمس ان یرضینی الا و ان رحمتی علیہ فیقول جبریل رحمۃ اللہ علی فلان و یقولھا حملۃ العرش و یقولھا من حولھم حتی یقولھا اھل السموات السبع ثم تھبط لہ الی الارض. (رواہ احمد)

(۴۶) ثوبانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش رکھتا ہے اور اس تلاش میں لگا ہی رہتا ہے تو اللہ عزوجل جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں فلاں میرا بندہ مجھے راضی کرنے کی تلاش میں ہے تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری رحمت اس کے لیے ہوچکی' یہ سن کر جبرئیل علیہ السلام آواز لگاتے ہیں کہ فلاں شخص پر خدا کی رحمت ہے اس کے بعد حاملین عرش یہی نداء دیتے ہیں پھر آس پاس کے فرشتے یہی کہتے ہیں یہاں تک کہ ساتوں آسمان والے یہی کہتے ہیں اس کے بعد اس کے لیے اہل زمین (کے قلوب) میں رحمت پیدا ہوجاتی ہے۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)

(۴۷) عن عامر الرامؓ قال بینا نحن عندہ یعنی عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذ اقبل رجل علیہ کساء و فی یدہ شیء قد

(۴۷) عامر رام رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم آپؐ کی خدمت میں (راوی تفسیر کرتا ہے) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے ایک شخص آیا اس پر ایک کملی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی

لے ....ساری عمر کی سیہ کاریوں سے اغماض کرلیا اور بنی اسرائیل کی سنت کے مطابق اس کی مغفرت کا لکھا ہوا اعلان لوگوں نے دیکھ لیا۔ بنی اسمٰعیل میں یہ سنت منسوخ ہوگئی۔ کہ اب امت کے بہت سے سیہ کاروں کی پردہ مندی منظور نہیں۔

(۴۶) * اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مقبولیت ونفرت اسباب کا ثمرہ نہیں خالق کی قبولیت ونفرت کا نتیجہ ہے اسی لیے مثل مشہور ہے صدائے خلق کو نقارۂ خدا سمجھو.

قرآن کریم نے یہ اصول ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

﴿ان الذین امنوا و عملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمن ودا﴾ (مریم : ۹۶)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے رحمٰن ضرور محبت پیدا کرے گا۔''

(۴۷) * یہ انبیاء علیہم السلام کا انداز تعلیم ہے کہ بچوں کے کھیل تماشہ میں یہاں ذات وصفات کے عمیق مسائل ایسے پرتاثیر طریقہ پر ذہن لے ....

اِلْتَفَّ عَلَيْهِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَرْتُ بِغَيْضَةِ شَجَرٍ فَسَمِعْتُ فِيْهَا اَصْوَاتَ فِرَاخِ طَائِرٍ فَاَخَذْتُهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ فِيْ كِسَائِيْ فَجَاءَتْ اُمُّهُنَّ فَاسْتَدَارَتْ عَلٰى رَأْسِيْ فَكَشَفْتُ لَهَا عَنْهُنَّ فَوَقَعَتْ عَلَيْهِنَّ فَلَفَفْتُهُنَّ بِكِسَائِيْ فَهُنَّ اُولَاءِ مَعِيْ قَالَ ضَعْهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ وَ اَبَتْ اُمُّهُنَّ اِلَّا لُزُوْمَهُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَعْجَبُوْنَ لِرُحْمِ اُمِّ الْاَفْرَاخِ فِرَاخَهَا فَوَالَّذِيْ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ لَلّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ اُمِّ الْاَفْرَاخِ بِفِرَاخِهَا اِرْجِعْ بِهِنَّ حَتّٰى تَضَعَهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَخَذْتَهُنَّ وَ اُمُّهُنَّ مَعَهُنَّ فَرَجَعَ بِهِنَّ. (رواہ ابو داؤد)

جو اس میں لپیٹ رکھی تھی اس نے کہا یا رسول اللہ! میں جھاڑیوں میں گذرا تو مجھے پرندوں کے بچوں کے بولنے کی آواز آئی میں نے ان کو پکڑ لیا اور اپنی کملی میں رکھ لیا' ان کی ماں آئی اور میرے سر پر گھومنے لگی میں نے کملی بچوں کے اوپر سے ہٹا دی وہ بچوں پر آ پڑی میں نے سب کو لپیٹ لیا اور وہ سب میرے ساتھ یہ موجود ہیں' آپ نے فرمایا: ان کو نیچے رکھ دو' میں نے رکھ دیا' ان کی ماں ان سے پھر جدا نہ ہوئی' آپ نے فرمایا: کیا تم اس ماں پر اپنے بچوں کی اس محبت سے تعجب کر رہے ہو' اس ذات کی قسم جس نے مجھے بھیجا ہے جتنی اس کو اپنے بچوں سے محبت ہے' خدائے عز و جل کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت ہے- جاؤ اور جہاں سے تم نے ان بچوں کو پکڑا ہے وہیں رکھ آؤ اور ان کی ماں کو بھی ان کے ساتھ لے جاؤ وہ شخص ان سب کو لے کر واپس چلا گیا-

(اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

(۴۸) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَؓ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ غَزَوَاتِهٖ فَمَرَّ بِقَوْمٍ فَقَالَ مَنِ الْقَوْمُ قَالُوْا نَحْنُ الْمُسْلِمُوْنَ وَ امْرَأَةٌ تَحْضِبُ بِقِدْرِهَا وَ مَعَهَا ابْنٌ لَهَا فَاِذَا ارْتَفَعَ وَ هَجٌ تَنَحَّتْ بِهٖ فَاَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ بِاَبِيْ اَنْتَ وَ اُمِّيْ اَلَيْسَ اللّٰهُ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ قَالَ بَلٰى قَالَتْ اَلَيْسَ اللّٰهُ اَرْحَمَ بِعِبَادِهٖ مِنَ الْاُمِّ بِوَلَدِهَا قَالَ بَلٰى قَالَتْ اِنَّ

(۴۸) عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے آپؐ کا ایک قوم پر گذر ہوا تو آپؐ نے ان سے دریافت کیا کون لوگ ہو؟ وہ بولے مسلمان' ان میں ایک عورت اپنی ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہی تھی- اس کے ساتھ اس کا بچہ تھا جب آگ کی لپٹ اٹھتی اپنے بچہ کو ایک طرف ہٹا لیتی وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بولی ''رسول اللہؐ آپ ہی ہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ''میں ہی ہوں'' وہ بولی میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں کیا خدا ارحم الراحمین نہیں؟ آپ نے فرمایا بے شک ہے- اس نے کہا کیا خدا اپنے بندوں پر زیادہ مہربان نہیں بہ نسبت ایک ماں باپ کے اپنے بچوں پر؟ فرمایا بے شک ہے' اس نے کہا

☜ .... نشین کر دیئے جاتے ہیں کہ پھر وہ فطرت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور کسی غور و خوض تکلف و تصنع کے محتاج نہیں رہتے جس طرح ماں کی محبت ایک بدیہی اور یقینی حقیقت ہے وہ خدا کی محبت کا ایسا ہی یقین پیدا کر دیتے ہیں اور اسی لیے ایمانی عقائد میں وہ کیف و سرور اور لذت و مسرت محسوس ہونے لگتا ہے جو فطری احساسات میں ہوا کرتا ہے-

(۴۸) * اس عورت کے سوال پر خدا کی بے نہایت رحمت کا نقشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ گیا اور آپ پر گریہ رحمت طاری ہو گیا- اس تاثر اور بے خودی کے عالم میں اس کو آپ نے اتنا ہی مختصر جواب دے دیا کہ خدا کی رحمت نے تو کسی کو اپنے دامن سے ☜ ....

اَلْاُمَّ لا تُلْقِیْ وَ لَدَھَا فِی النَّارِ فَاَکَبَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَبْکِیْ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَہٗ اِلَیْھَا فَقَالَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُعَذِّبُ مِنْ عِبَادِہٖ اِلَّا الْمَارِدَ الْمُتَمَرِّدَ الَّذِیْ یَتَمَرَّدُ عَلَی اللّٰہِ وَ اَبٰی اَنْ یَّقُوْلَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ. (رواہ ابن ماجہ)

ایک ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈال سکتی - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنا سر مبارک جھکا لیا اور رو پڑے پھر سر اٹھایا اور فرمایا خدا اپنے بندوں میں کسی کو عذاب نہیں دے گا مگر صرف اس سرکش کو جس کی سرکشی خدا کے ساتھ بھی قائم ہے جو لا الٰہ الا اللہ کہنے کو تیار نہیں ہوتا -

(اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

(۴۹) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَا اُحِبُّ اَنَّ لِیَ الدُّنْیَا بِھٰذِہِ الْاٰیَۃِ ﴿یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا. الْاٰیَۃَ﴾ (الزمر: ۵۸) فَقَالَ رَجُلٌ فَمَنْ اَشْرَکَ فَسَکَتَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اَلَا وَ مَنْ اَشْرَکَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (رواہ احمد)

(۴۹) ثوبانؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے اگر اس آیت کے بدلہ میں مجھے تمام دنیا مل جائے تو بھی مجھے پسند نہیں ﴿یا عبادی﴾ الخ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے امید نہ توڑو' الخ - ایک شخص نے عرض کیا اچھا کیا وہ شخص بھی جس نے کہ شرک کیا ہے؟ آپ خاموش رہے پھر فرمایا سن لے جس نے شرک کیا ہے وہ بھی تین بار فرمایا -

(اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)

.... باہر نہیں رکھا مگر کیا کیا جائے کہ اس کی بعض سرکش مخلوق نے خود ہی اس کے دامن میں آنے سے انکار کر دیا -

(۴۹) ٭ بغوی معالم السنن میں ابن عباسؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحشی قاتل حمزہؓ کو جب دعوت اسلام دی تو اس نے کہلا بھیجا کہ میں نے تو قتل' زنا' شرک سب کچھ کیا ہے اور قرآن یہ کہتا ہے - ﴿وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا یُضَاعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ﴾ (الفرقان: ۶۸ - ۶۹) (جس نے یہ گناہ کیے انہیں اس کا صلہ مل کر رہے گا اور اس کو دوگنا عذاب ہوگا) پھر میں اسلام میں داخل ہو کر کیا کروں گا -

آپؐ نے کہلا بھیجا کہ قرآن میں یہ استثناء بھی تو ہے ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ (الفرقان: ۷۰) (مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیے) اس نے جواب میں عرض کیا کہ یہ کٹھن شرط ہے شاید ایمان اور عمل صالح کے معیار پر میں پورا نہ اتر سکوں اگر قرآن میں کوئی اور آیت ہو تو ارشاد فرمائیے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَ یَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء: ۴۸) (اللہ یہ تو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخش دے گا) وحشی نے کہا کہ اب بھی معاملہ صاف نہیں ہوا مجھے معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت ایزدی کیا ہے کوئی اطمینان بخش ضمانت دیجئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی ﴿قُلْ یَا عِبَادِیَ ..... الخ﴾ (الزمر: ۵۸) وحشی نے کہا جی ہاں بے شک یہ نجات کی صاف ضمانت ہے اور اسلام قبول کر لیا - حاضرین نے سوال کیا یا رسول اللہؐ یہ بشارت ان کے لیے مخصوص ہے یا سب کے لیے ہے؟ آپؐ نے فرمایا سب کے لیے -

خدا کی یہ شان مغفرت سن کر کسی نے مشرک کی مغفرت کا سوال کیا آپ نے یہی جواب دیا کہ مشرک کے لیے بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں وہ بھی توبہ کرے اور اس عام رحمت میں آ جائے - بعض شارحین کو توبہ سے شرک کی مغفرت بدیہی بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اس سوال و جواب میں اور بہت سی توجیہات کی ہیں ہمارے نزدیک جس دور میں زنا و سرقہ جیسے معاصی کی معافی کا تصور مشکل ہو اس ....

(۵۰) عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ ؓ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ ﴿يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ (الزمر:۵۸) وَ لَا يُبَالِيْ. (رواہ احمد و الترمذی)

(۵۰) اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے سنا ہے ﴿یا عبادی﴾ الخ اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے' خدا کی رحمت سے امید نہ توڑو' خدا کی یہ شان ہے کہ وہ سب گناہ بخش سکتا ہے اور کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

(اس حدیث کو احمد و ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۵۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ صَلٰوةٍ وَ قُمْنَا مَعَهٗ فَقَالَ اَعْرَابِيٌّ وَ هُوَ فِي الصَّلٰوةِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَ مُحَمَّدًا وَلَا تَرْحَمْ مَعَنَا اَحَدًا فَلَمَّا سَلَّمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِلْاَعْرَابِيِّ لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَ اسِعًا. (رواہ البخاری وغیرہ)

(۵۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے ہم بھی آپؐ کے ساتھ کھڑے ہو گئے تو ایک دہقانی نے نماز میں کہا اے اللہ! صرف میرے اوپر اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رحم کر' ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم مت کر۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو اس دہقانی سے فرمایا تو نے تو بڑی وسیع چیز کو تنگ کر دیا۔

(اس حدیث کو بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے)

باب حق اللّٰہ علی العباد

بندوں پر خدائے تعالیٰ کا کیا حق ہے

(۵۲) عَنْ مُعَاذٍ ؓ قَالَ كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حِمَارٍ يُقَالُ لَهٗ عُفَيْرٌ فَقَالَ يَا مُعَاذُ تَدْرِيْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ وَ مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ قُلْتُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَ حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَلَّا يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ

(۵۲) معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک گدھے پر سوار تھے جس کو عفیر کہا جاتا تھا میں آپؐ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا آپؐ نے آواز دی اے معاذ! (بعض روایات میں تین بار آواز دینے کا ذکر ہے تاکہ یہ خوب متوجہ ہو جائیں) جانتے ہو بندوں پر خدا کا اور خدا پر بندوں کا کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا اللہ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی بندگی کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ جو اس کا شریک نہ ٹھہرائے اس کو

.... میں شرک کی مغفرت کا تصور مشکل نظر آئے تو کیا بعید ہے۔ یہ ہدایت اسلامی دور کی بات ہے نہ کہ عہد جاہلیت کی۔ ابو ذر کی حدیث میں ابھی آنے والا ہے کہ زنا و سرقہ کی مغفرت پر انہیں کتنا تعجب تھا۔

(۵۱) * اس ان پڑھ نو مسلم کی سمجھ میں بھلا خدا کی رحمت کی وسعت کا تصور کہاں آ سکتا تھا یہی اس کے بڑے خلوص کی بات تھی کہ اس نے اس نعمت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت گوارا کر لی مگر اس سے زیادہ شرکت وہ برداشت نہ کر سکا کہ اس بیچارہ کے خیال کے موافق شرکاء کی تعداد جتنی بڑھتی جائے گی اس کا حصہ اتنا ہی گھٹتا جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا گھبرا مت رحمت تو اتنی ہے کہ سب پر چھا جائے پھر تنگ نہ ہو' تو ہی اسے تنگ سمجھ رہا ہے۔ ان الفاظ میں قرآنی لفظ رحمتی وسعت کی طرف اشارہ تھا سبحان اللہ جواب میں کتنی سادگی اور سادگی میں کتنی حقیقت ہے۔

(۵۲) * عفیر۔ مسند احمد میں اس کا نام یعفور ہے۔ عرب میں حیوانات کے نام رکھنے کا بھی دستور تھا جیسا کہ انگریز بھی کتوں کے نام رکھتے ہیں۔ مالک پر مملوک کا آقا پر غلام کا بھلا کیا حق مگر صفت رحمت و جود چاہتی ہے کہ محتاجوں کی خود قرض دار بن جائے اور پھر اس ....

بِہٖ شَیْـئًـا قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَفَلَا اُبَشِّرُ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْھُمْ فَیَتَّکِلُوْا.

(رواھما الشیخان و الترمذی)

عذاب نہ دے- میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اجازت ہو تو یہ خوشخبری اور لوگوں کو بھی سنا دوں؟ فرمایا نہیں کہیں وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ رہیں-

(اس حدیث کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۵۳) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ یَا اَبَاھُرَیْرَۃَ ھَلْ تَدْرِیْ مَا حَقُّ النَّاسِ عَلَی اللّٰہِ وَ مَا حَقُّ اللّٰہِ عَلَی النَّاسِ قُلْتُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ حَقُّ اللّٰہِ عَلَی النَّاسِ اَنْ یَعْبُدُوْہُ وَ لَا یُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَحَقٌّ عَلَیْہِ اَنْ لَّا یُعَذِّبَھُمْ. (رواہ احمد)

(۵۳) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو ہریرہؓ جانتے ہو لوگوں کا خدا پر اور خدا کا لوگوں پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں فرمایا خدا کا حق لوگوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور جب وہ ایسا کریں تو اس پر یہ حق ہے کہ پھر ان کو عذاب نہ دے-

(اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)

(۵۴) عَنْ سُھَیْلِ بْنِ الْبَیْضَاءِ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ فِیْ سَفَرٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ اَنَا رَدِیْفُہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا سُھَیْلُ بْنُ الْبَیْضَاءِ وَ رَفَعَ

(۵۴) سہیل بن بیضاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور میں آپؐ کا ردیف تھا- آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو بار یا تین بار بلند آواز سے پکارا اے سہل بن بیضاء! یہ ہر مرتبہ جواب دیتے رہے (مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کچھ

.... حق کو اس اہتمام سے ادا کرے گویا اس کے ذمہ یہ واقعی واجب حق تھا کمالِ قدرت کے ساتھ اگر کمالِ وجود بھی ہو تو اس کا اقتضاء یہ ہونا چاہیے ورنہ اللہ کی ذات پاک پر کسی کا حق نہیں اسی کا حق سب پر ہے-

(۵۳) * عام طور پر اس بشارت کو سنانے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کو صحابہؓ کے متعلق فرائض چھوڑ بیٹھنے کا کوئی احتمال ہو سکتا تھا- فرض و واجب جن کا شریعت مطالبہ رکھتی ہے بھلا کون ترک کرتا- بلکہ یہاں صرف وہ اعمال مراد ہیں جہاں بندہ رغبت میں سرگرمی اور اطمینان کے حال میں سرد مہری دکھلانے کا خود مختار ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان ایسا کمزور اور بے صبر ہے کہ خوف زیادہ ہو جب عمل سے معطل ہو جاتا ہے اور اگر اطمینان زیادہ ہو تو بھی سست رفتار بن جاتا ہے- رحمت چاہتی ہے کہ ہر حال دے اور اتنا دے جتنا کوئی حریص سے حریص لے سکتا ہے دوزخ سے نجات کوئی شبہ نہیں کہ انسان کے لیے بڑی کامیابی ہے مگر رحمت صرف اس پر راضی نہیں وہ چاہتی ہے کہ اپنے وفاداروں کو اپنے اور خزائن لوٹنے کا موقعہ دے اس لیے مقصود یہ ہے کہ عملی سرگرمی زیادہ سے زیادہ جاری رہے- حدیث نمبر ۴۷ پر غور کیجئے اس میں کلمہ شہادت کے ساتھ نماز، روزہ کا بھی ذکر ہے اور وہاں بھی بشارت پر یہی سوال و جواب مذکور ہیں- معلوم ہوا کہ یہاں نماز، روزہ جیسے فرائض میں سستی کا ذکر نہیں بلکہ ان عباداتِ نافلہ کا ذکر ہے جس میں نفسیاتی تاثرات سے انسان سستی یا چستی دکھلانے کا مختار ہے کوئی شبہ نہیں کہ اگر صدرِ اوّل کے نو مسلموں کو صرف فرائض پر جنت کی بشارت سنا دی جاتی تو ان میں نوافل کی ادائیگی کا جذبہ سست پڑ جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا- حدیث نمبر ۴۸ میں اس کی صاف تصریح ہے کہ جنت میں ایک سے ایک بڑھ کر طبقہ ہے، رحمت کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ سب کو اس کی ترغیب دے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سعی کر کے جنت کا بلند سے بلند مقام حاصل کرے اور صرف نجات پر قناعت کر کے مقاماتِ عالیہ سے محروم نہ رہے- شارحین نے یہاں اور بہت توجیہات کی ہیں مگر ہمارے نزدیک احادیث کی روشنی میں حضرت استاد مرحوم کی صرف یہی ایک توجیہ دل پذیر ہے-

(۵۴) * کفار دوزخ کی حلال خوراک ہیں وہ اسی طرح انہیں کھائے گی جیسا حلال کھانا بے کھٹکے کھایا جاتا ہے مگر مؤمن اس پر حرام کیا گیا ہے اس لیے مؤمن سے اس طرح اجتناب کرے گی جیسا حرام سے اجتناب کرنا چاہیے- ہمارے بیان سے اب اس تعبیر کا حسن ....

صَوْتَهُ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا كُلُّ ذَالِكَ يُجِيْبُهُ سُهَيْلٌ فَسَمِعَ صَوْتُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَظَنُّوْا اَنَّهُ يُرِيْدُهُمْ فَحَبَسَ مَنْ كَانَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ لَحِقَهُ مَنْ كَانَ خَلْفَهُ حَتّٰى اِذَا اجْتَمَعُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ وَ اَوْجَبَ لَهُ الْجَنَّةَ (وَ فِيْ رِوَايَةٍ) اَوْجَبَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ لَهُ بِهَا الْجَنَّةَ وَ اَعْتَقَهُ بِهَا مِنَ النَّارِ. (رواه احمد و الطبرانی)

نہ فرماتے تا کہ وہ خوب متوجہ ہو جائیں اور اس تاخیر میں دوسروں کو بھی سننے کا موقعہ مل جائے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے بھی سن پائی اور خیال کیا کہ غالباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں اس لیے جو لوگ وہاں موجود تھے وہ ٹھہر گئے اور جو پیچھے تھے وہ آ ملے جب سب جمع ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا جو گواہی دے گا کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ' وہ اس کو دوزخ پر حرام کر دے گا اور اسے یقیناً جنت دے گا- اور ایک روایت میں ہے کہ اس شہادت کی وجہ سے یقیناً اس کو جنت دے گا اور دوزخ سے نجات بخشے گا-

(اس حدیث کو احمد' طبرانی نے روایت کیا ہے)

(۵۵) عَنْ اَبِىْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ ؓ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ مَعِيْ نَفَرٌ مِّنْ قَوْمِيْ فَقَالَ اَبْشِرُوْا وَ بَشِّرُوْا مَنْ وَرَاءَ كُمْ اَنَّهُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ صَادِقًا بِهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ فَخَرَجْنَا مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُبَشِّرُ النَّاسَ فَاسْتَقْبَلَنَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) فَرَجَعَ بِنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِذًا يَتَّكِلُ النَّاسُ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

(رواه احمد و الطبرانی)

(۵۵) ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی قوم کے چند افراد کے ساتھ حاضر ہوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں خوشخبری ہو اور جو لوگ تمہارے اُس طرف ہیں ان کو بھی یہ خوشخبری سنا دو کہ جو شخص صدق دل سے گواہی دے گا کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ' وہ جنت میں جائے گا - ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سے یہ خوشخبری سنانے کے لیے نکلے تو سامنے سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ آ رہے تھے وہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پھر واپس لے گئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! لوگ تو اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے- آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ نہ فرمایا اور خاموش ہو گئے-

(اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے)

(۵٦) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ؓ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ

(۵٦) معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

☜ .....آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ یہاں دوزخ مؤمن پر حرام کر دی جائے گی کے بجائے دوزخ پر مؤمن کے حرام ہونے کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی ہے-

(۵٦) * اس حدیث سے اندازہ کرو کہ صحابہ کو احادیث کی تبلیغ کی کس درجہ اہمیت تھی یعنی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مشہور سے مشہور حدیث بھی اپنے سینہ میں لے جانا کتمانِ علم کے برابر سمجھتے تھے- اگر احادیث کی حیثیت تشریعی نہ ہوتی یا کتاب اللہ کے بعد یہ ☜ ....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَشْهَدُاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُخْبِرُبِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْنَ قَالَ اِذًا يَتَّكِلُوْا وَ اَخْبَرَبِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهٖ تَاَثُّمًا.

(رواه الشيخان و الترمذي)

فرمایا ہے جو شخص صدق دل سے گواہی دے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر ہیں وہ یقیناً اس کو دوزخ پر حرام کر دے گا - انہوں نے عرض کیا' کیا یہ خوشخبری میں اور لوگوں کو بھی سنا دوں؟ فرمایا پھر لوگ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے اس لیے معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنی موت کے وقت یہ حدیث بیان کی' مبادا اخفاء حدیث کا گناہ ان کے سر رہ جائے-

(اس حدیث کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۵۷) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ اَنَا مِمَّنْ شَهِدَ مُعَاذًا حِيْنَ حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ يَقُوْلُ اكْشِفُوْا عَنِّيْ سَجْفَ الْقُبَّةِ اُحَدِّثُكُمْ حَدِيْثًا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَمْنَعْنِيْ اَنْ اُحَدِّثَكُمُوْهُ اِلَّا اَنْ تَتَّكِلُوْا سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا مِنْ قَلْبِهٖ اَوْ يَقِيْنًا مِنْ قَلْبِهٖ لَمْ يَدْخُلِ النَّارَ وَ قَالَ مَرَّةً دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ لَمْ تَمَسَّهُ النَّارُ. (رواه احمد)

(۵۷) جابر بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میں معاذ رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت موجود تھا انہوں نے فرمایا میرے سامنے سے ذرا قبّہ کا پردہ ہٹا دو تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سناؤں گا جواب تک صرف اس لیے نہیں سنائی تھی کہ تم اس پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ جاؤ' میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو صاف دل سے (یا دلی یقین کے ساتھ راوی کو لفظ میں تردد ہے) گواہی دے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ' وہ کبھی دوزخ میں نہیں جائے گا اور ایک مرتبہ یہ لفظ فرمائے کہ جنت میں جائے گا اور آگ اسے چھو بھی نہ سکے گی-

(اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)

(۵۸) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَ يُصَلِّي الْخَمْسَ وَ يَصُوْمُ رَمَضَانَ غُفِرَلَهٗ قُلْتُ اَفَلَا اُبَشِّرُهُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ دَعْهُمْ يَعْمَلُوْا.

(رواه احمد)

(۵۸) معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے جو خدا سے ملے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہو' پانچوں نمازیں پڑھی ہوں' رمضان کے روزہ رکھے ہوں وہ بخش دیا جائے گا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت ہو تو یہ خوشخبری مسلمانوں کو سنا دوں؟ فرمایا انہیں عمل میں لگا رہنے دو-

(اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے' از مشکوٰۃ)

.... تشریحات غیر ضروری ہوتیں تو یہ اہتمام کس لیے تھا - نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَ الْهُدٰى﴾ (البقرہ:۱۵۹) (میں) جس طرح کہ آیات قرآنیہ داخل تھیں اسی طرح احادیث نبویہ بھی داخل تھیں اور امت کا فریضہ یہ تھا کہ دین اپنی مجموعی تشریحات کے ساتھ ایک قرن سے دوسرے قرن اور ایک دور سے دوسرے دور تک پہنچایا جائے جو لوگ احادیث سے بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں وہ احادیث سے نہیں خدا کے رسول سے بے نیازی چاہتے ہیں نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا.

(۵۸) * یہ حدیث صرف سابق واقعہ کی مزید تشریح کے لیے نقل کی گئی ہے-

(۵۹) عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ وَ صَلَّى الصَّلٰوةَ وَ حَجَّ الْبَيْتَ لَا اَدْرِىْ اَذَكَرَ الزَّكٰوةَ اَمْ لَا اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اِنْ يَّغْفِرَلَهٗ اِنْ هَاجَرَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مَكَثَ بِاَرْضِهِ الَّتِىْ وُلِدَ بِهَا قَالَ مُعَاذٌ اَلَا اُخْبِرُ بِهَا النَّاسَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَرِ النَّاسَ يَعْمَلُوْنَ فَاِنَّ فِى الْجَنَّةِ مِائَةَ

(۵۹) معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو رمضان کے روزے رکھے، نماز پڑھے، بیت اللہ کا حج کرے، مجھے یاد نہیں کہ آپ نے زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا تھا یا نہیں تو خدا پر حق ہوگا کہ وہ اس کو بخش دے خواہ اس نے خدا کے لیے ہجرت کی ہو یا اسی جگہ پر رہا ہو جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کیا لوگوں کو بھی اس کی اطلاع نہ کردوں؟ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا انہیں عمل کرنے دو کیونکہ جنت کے سو درجے ہیں

---

(۵۹) * بعض مصنفین نے یہ سمجھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر یہ خوشخبری سنانے کی ممانعت اس بنا پر فرمائی تھی کہ اسلام کے تازہ حلقہ بگوش صرف شہادتین پر فوز و فلاح کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں مگر سوال یہ ہے کہ جب ایک بار نماز، روزہ کی فرضیت ان کے سامنے واضح کی جا چکی تھی تو پھر اس غلط فہمی کا موقعہ کیا تھا کیا یہ حدیث نماز، روزہ کی فرضیت کو منسوخ کر رہی تھی۔ حضرت استاد قدس سرہ نے ترمذی کی اس حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ صحابہؓ کے متعلق یہاں اس غلط فہمی کا کوئی احتمال نہ تھا چنانچہ معاذ رضی اللہ عنہ جب اسی روایت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو اس میں شہادتین کے ساتھ بقیہ اور فرائض اسلام کا بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تفصیلی روایت میں آپ کی بشارت جملہ فرائض اسلام کی ادائیگی سے وابستہ ہے تو پھر ان کے ترک کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ترمذی کی اس روایت نے یہ بات بالکل صاف کر دی ہے کہ آپ کا روئے سخن ہرگز فرائض کی جانب نہیں بلکہ ان اعمال کی جانب ہے جن سے نجات کے سوا جنت کے مراتب کا تعلق ہے اسی لیے آپ نے فرمایا کہ جنت کے سو درجے ہیں، نجات تو ہر درجہ [illegible] حاصل ہے مگر آپ کی تمنا یہ ہے کہ امت نجات کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب حاصل کرے ابتداء میں عبادت نفع و ضرر کی وجہ سے ہوتی ہے اس لیے نجات کی بشارت سن کر شب و روز کی اعلیٰ جدوجہد میں سستی پیدا ہو سکتی ہے لیکن جب نفع و نقصان کا سوال پیش نظر نہیں رہتا اور قرب و رضاء کا بلند مقصد سامنے آ جاتا ہے تو پھر انسان اتنا حریص بن جاتا ہے کہ نجات جیسی اہم کامیابی پر بھی قناعت نہیں کرتا اور قرب کی اعلیٰ سے اعلیٰ منزل طے کرنے کے بعد تشنہ اور پیاسا ہی رہتا ہے جس کے سامنے مقصد یہ ہے اس کے لیے تو نجات کی بشارت سے کیا خطرہ لیکن جو ابھی تک صرف نجات کو آخری منزل سمجھ رہا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ فرائض کی ادائیگی پر نجات کی بشارت سن کر یہیں تھک کر بیٹھ رہے اور نوافل کی سرگرمی چھوڑ دے۔ رسولؐ خدا چاہتے ہیں کہ یہ شخص بھی سرگرم عمل رہے تاکہ آپ کی امت کا مبتدی اور منتہی سب نجات کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب میں کامیاب رہیں۔ اس حدیث کو بغور پڑھیے تو بے تکلف یہی مضمون آپ کے ذہن میں آ جائے گا۔

حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنت کی چھت کیا ہے اس کے سب سے اونچے درجہ کا نام کیا ہے اور جنت کی نہروں کا اصل منبع کہاں ہے۔ عالم غیب کی کچھ باتیں ہمیں بتلا دی گئی ہیں تاکہ ایمان لانے کے لیے ان کا تھوڑا سا تصور بھی ہو جائے ورنہ جو عالم کہ مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے اس کی تفصیل میں جانا بلاوجہ دماغ کے لیے ایک پریشانی کا موجب ہے انگلستان کی پوری حقیقت انگلستان دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہے اگر اس کے چمن، روشنیاں اور سڑکوں کا جدید ڈیزائن تفصیلی طور پر بیان کیا جائے تو جو اس طور و انداز سے بالکل ناآشنا ہیں ان کے لیے بلاوجہ یہ ایک ناقابل برداشت بار ہوگا وہ اپنے ملک کے انداز کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور جب اس سے ☜ ....

دَرَجَةٍ مَابَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَ الْاَرْضِ وَ الْفِرْدَوْسُ اَعْلَى الْجَنَّةِ وَ اَوْسَطُهَا وَ فَوْقَ ذَالِكَ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ وَ مِنْهَا تَفَجَّرُ اَنْهَارُ الْجَنَّةِ فَاِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْأَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ.

(رواہ الترمذی)

ہر دو درجوں میں اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ آسمان و زمین میں اور فردوس جنت کا سب سے اعلیٰ اور سب سے بہتر طبقہ ہے اس پر رحمٰن کا عرش ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں پھوٹی ہیں جب تم اللہ سے مانگو تو فردوس مانگو۔

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۶۰) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ قَالَ كُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ مَعَنَا اَبُوْبَكْرٍ وَ عُمَرُ فِیْ نَفَرٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَيْنِ اَظْهُرِنَا فَاَبْطَأَ عَلَيْنَا وَ خَشِيْنَا اَنْ يُقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَ فَزِعْنَا فَقُمْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ اَبْتَغِیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى اَتَيْتُ حَائِطًا لِّلْاَنْصَارِ لِبَنِی النَّجَّارِ فَدُرْتُ بِهٖ هَلْ اَجِدُلَهٗ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ فَاِذَا رَبِيْعٌ يَدْخُلُ فِیْ جَوْفِ حَائِطٍ مِّنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ وَ الرَّبِيْعُ الْجَدْوَلُ قَالَ فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلٰى

(۶۰) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چند صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے (اس وقت) ہمارے ساتھ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے' یکا یک آپ ؐ ہمارے درمیان سے اٹھ کھڑے ہوئے (اور کہیں تشریف لے گئے) جب بہت دیر گذر گئی تو ہمیں تشویش ہوئی کہ ہم سے علیحدہ ہو کر آپ ؐ پر کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔ اس خیال سے ہم سب گھبرا گئے اور سب سے پہلے گھبرانے والوں میں میں تھا میں آپ کو ڈھونڈھنے کے لیے نکلا' قبیلہ بنی النجار کے ایک انصاری کے باغ پر پہنچا اس کا دروازہ تلاش کیا مگر نہ ملا کیا دیکھتا ہوں کہ باہر ایک کنوئیں سے ایک ربیع باغ میں جارہی ہے'' ربیع گول اور نالی کو کہتے ہیں'' ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں میں سکڑ کر اسی میں گھس گیا اور آپ ؐ کی خدمت میں جا پہنچا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ﷺ ....ہٹ کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی جائے گی تو ان کا دماغ الجھے گا۔ شریعت اس بے معنی الجھاؤ میں دماغوں کو مبتلا کرنا چاہتی نہیں جو چیز کل مشاہدہ کے بعد بہت آسانی سے بغیر الجھاؤ نظر آ جانے والی ہے اس کو قبل از وقت کیوں زیر بحث لایا جائے۔ آج عمل کی تفصیل درکار ہے اور کل جزاء کی تفصیل خود بخود سامنے آ جانے والی ہے۔ حکیم وہی ہے جو تفصیل کے موقعہ پر تفصیل اور اجمال کے محل میں اجمال کی رعایت کرے۔ جدید دماغوں کا قبل از وقت آخرت کے تفصیلی نقشوں کا ہم سے مطالبہ کرنا ناانصافی اور جلد بازی ہے۔

(۶۰) * عرب کے دستور کے مطابق یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نعلین مبارک ابو ہریرہؓ کے ساتھ کر دیئے تھے تا کہ اس کی دلیل ہوں کہ آپ ہی نے ان کو بھیجا ہے۔ چونکہ یہاں ابو ہریرہؓ اور چند صحابہؓ کی آمد بڑے اضطراب اور بے چینی کی حالت میں ہوئی تھی اس لیے وقت کی مصلحت اس کی مقتضی ہوئی کہ ان کو ایسی بشارت سنا دی جائے جو اس وقت ان کے اضطراب کے لیے مرہم تسکین بن جائے اور آئندہ کے لیے یہ اثر پیدا کر دے کہ جس ذات پاک کے لیے وہ اتنے مضطرب تھے اگر اس کا دس گنہ اور مضطرب ہوتے جب بھی کم تھا۔ یہ تمام بات چیت وقتی تاثرات کے ماتحت تھی۔ ادھر صحابہ کرامؓ اپنے رسول کی تلاش میں مدہوش تھے ادھر رسول کا پیمانہ محبت ان کی یہ سراسیمگی دیکھ کر چھلک رہا تھا۔ عمر فاروقؓ کو کیا خبر تھی کہ صحابہ کی اس پریشانی پر رسول کی محبت کا سمندر کتنا جوش مار رہا ہے اس لیے اپنے رسول ﷺ ....

رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ. اَبُوْ هُرَيْرَةَ فَقُلْتُ نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ مَاشَانُكَ قُلْتُ كُنْتَ بَيْنَ اَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَاَبْطَاْتَ عَلَيْنَا فَخَشِيْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَكُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَاَتَيْتُ هٰذَا الْحَائِطَ فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ وَ هٰؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَائِيْ فَقَالَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ وَ اَعْطَانِيْ نَعْلَيْهِ فَقَالَ اذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ فَمَنْ لَقِيَكَ مِنْ وَرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ فَكَانَ اَوَّلَ مَنْ لَقِيْتُ عُمَرُ ؓ فَقَالَ مَا هَاتَانِ النَّعْلَانِ يَا اَبَاهُرَيْرَةَ فَقُلْتُ هَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِيْ بِهِمَا مَنْ لَقِيْتُ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ بَشَّرْتُهُ بِالْجَنَّةِ فَضَرَبَ عُمَرُ بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَخَرَرْتُ لِاسْتِيْ فَقَالَ اِرْجِعْ يَا اَبَاهُرَيْرَةَ فَرَجَعْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ وَ رَكِبَنِيْ عُمَرُ وَ اِذَا هُوَ عَلٰى اَثَرِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَكَ يَا اَبَاهُرَيْرَةَ قُلْتُ لَقِيْتُ عُمَرَ فَاَخْبَرْتُهُ بِالَّذِيْ بَعَثْتَنِيْ بِهٖ

ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! میں نے عرض کیا جی یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! فرمایا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا آپ ہم میں تشریف فرما تھے پھر آپ ؐ اُٹھے جب بہت دیر ہوگئی تو ہمیں گھبراہٹ ہوئی، کہیں ہماری غیبت میں آپ ؐ پر کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے سب سے پہلے میں گھبرایا اور اس باغ تک (ڈھونڈتا ہوا) آ گیا (یہاں دروازہ نہ ملا) تو لومڑی کی طرح سکڑ کر (نالی کے راستہ سے) اندر گھس آیا اور بقیہ لوگ بھی میرے پیچھے آ رہے ہیں- آپ نے مجھے اپنے دونوں چپل اٹھا کر دیئے اور فرمایا اے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جاؤ انہیں لے جاؤ اور باغ کے پیچھے جو شخص یقین کے ساتھ یہ گواہی دیتا ہوا مل جائے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ اس کو جنت کی خوشخبری سنا دو (یہ روانہ ہوئے) سب سے پہلے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ملے پوچھا اے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ چپل کیسے ہیں؟ میں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور مجھے اس لیے بھیجا ہے کہ جو مجھے راستہ میں یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہتا ہوا مل جائے اسے جنت کی بشارت سنا دوں اس پر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میری چھاتیوں کے درمیان اس زور سے ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل پیچھے جا پڑا اور بولے ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جاؤ واپس جاؤ میں آپ ؐ کی خدمت میں آیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا- عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خوف میرے سر پر سوار ہی تھا کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے پیچھے وہ آ پہنچے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا ابو ہریرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) خیریت ہے؟ میں نے عرض کیا مجھے راستہ میں عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ملے تو جس کام کے لیے آپ نے مجھے بھیجا تھا میں نے انہیں اس کی خبر کر دی انہوں نے اس زور سے میرے سینہ

ﷺ .... کے مشن کے کامیاب بنانے کا جو بہترین مشورہ اپنی سمجھ میں آ رہا تھا اس کی دھن میں ابو ھریرہؓ کو واپس کر دیا ابھی تک پوری بات کی تحقیق بھی نہ تھی اس لیے پہلے حاضر ہو کر واقعہ کی تحقیق کی جب معاملہ کی حقیقت وہی نکلی جو ابو ہریرہؓ نے سمجھی تھی تو بے تکلف اپنی رائے بارگاہ رسالت میں پیش کر دی- مسئلہ کی کچھ بات نہ تھی، حلال و حرام کا کوئی حکم نہ تھا صرف مصلحت کی بات تھی، وہاں بھی ایک سچے مشیر کی رائے کی قدر دانی کی گئی اور محبت و مصلحت کے دو پہلوؤں میں مصلحت کو ترجیح دے دی گئی-

مخاطب اگر متکلم کا مزاج شناس ہو تو اس کے امر و نہی کے مراتب سمجھ لیتا ہے اور مشورہ دینے کا موقع و محل پہچان لیتا ہے- حدیث کے ﷺ ....

فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَيَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِاسْتِى فَقَالَ ارْجِعْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عُمَرُ مَا حَمَلَكَ عَلٰى مَا فَعَلْتَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ بِأَبِىْ اَنْتَ وَ اُمِّىْ اَبَعَثْتَ اَبَاهُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِىَ يَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهٗ بَشَّرَهٗ بِالْجَنَّةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّىْ اَخْشٰى اَنْ يَّتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُوْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَلِّهِمْ.

(رواہ مسلم)

پر ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل پیچھے جا پڑا اور مجھ سے کہا واپس جاؤ- آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ماں باپ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قربان کیا واقعی آپؐ نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس لیے بھیجا تھا کہ جو دلی یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کی گواہی دیتا ہوا ملے اس کو جنت کی خوش خبری سنا دیں- آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ہاں' عرض کیا ایسا نہ کیجئے مجھے خطرہ ہے کہیں ایسا نہ ہو لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں' انہیں عمل میں لگا رہنے دیجئے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا تو رہنے دو-

(اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

وجوب الایمان برسالة نبینا محمد صلی الله علیه وسلم

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے

(۶۱) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الَّذِىْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَا يَسْمَعُ بِىْ اَحَدٌ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ يَهُوْدِىٌّ وَ لَا نَصْرَانِىٌّ وَ مَاتَ وَ لَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِىْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ.

(رواہ احمد و مسلم)

(۶۱) ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اس امت میں کوئی یہودی ایسا نہیں ہے اور نہ کوئی نصرانی جو میری خبر پائے پھر اس پر ایمان نہ لائے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور (اسی حال پر) مر جائے مگر وہ دوزخیوں میں ہوگا-

(اس حدیث کو امام احمد اور مسلم نے روایت کیا ہے)

وَعَنْ اَبِىْ مُوْسَى الْاَشْعَرِىِّؓ عَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْوَهٗ وَ فِيْهِ لَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ بَدَلَ قَوْلِهٖ اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کے ہم معنی مضمون منقول ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں الا کان من اصحاب النار کے بجائے لم یدخل الجنة (جنت میں نہیں جائے گا) کا لفظ ہے-

---

...... معاملات کو بھی اپنے روزمرہ کے معاملات کے ماتحت حل کر لینا چاہیے بلاوجہ دقیق بنا بنا کر سوال و جواب کی زحمت اٹھانا بیکار ہے-

(۶۱) * آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا سب پر یکساں فرض ہے- یہود و نصاریٰ کا ذکر یہاں خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ اہل کتاب تھے- جب آپؐ پر ایمان لائے بغیر ان کی نجات نہیں ہوسکتی تو جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب بھی نہیں ان کی نجات کیسے ہوسکتی ہے- نیز یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ تھا کہ نجات صرف ان ہی کے لیے ہے اس لیے ان کو خبردار کرنا ضروری تھا کہ یہ خیال غلط ہے-

(۶۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اٰمَنَ بِیْ عَشْرَةٌ مِنْ اَحْبَارِ الْیَهُوْدِ لَاٰمَنَ بِیْ کُلُّ یَهُوْدِیٍّ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ قَالَ کَعْبٌ اِثْنَا عَشَرَ مِصْدَاقُهُمْ فِیْ سُوْرَةِ الْمَائِدَةِ.

(رواہ احمد و البخاری و ابوداؤد)

(۶۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نے ارشاد فرمایا اگر یہود کے دس بڑے علماء مجھ پر ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے-کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں (آپ نے دس نہیں فرمایا) بارہ (فرمایا ہے) جن کا مصداق سورۂ مائدہ میں موجود ہے-

(اس حدیث کوامام احمد بخاری اورابوداؤد نے روایت کیا ہے)

---

(۶۲) * اس حدیث کوامام بخاریؒ نے بھی روایت کیا ہےمگراس کے الفاظ یہ ہیں لو امن بی عشرة من الیهود لامن بی الیهود-اگر مجھ پر دس یہود ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے-ان الفاظ پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے یہود آپ پر ایمان لا چکے تھے مگر اس کے باوجود پھر تمام یہود کا ایمان ثابت نہیں-مسند امام احمد کی اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی مراد مطلق یہود نہ تھی بلکہ خاص ان کے علماء مراد تھے-اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کی اتباع میں یقیناً بقیہ یہود بھی ایمان لے آتے جیسا کہ قبائل عرب بھی اسی کے منتظر تھے کہ قریش اسلام لے آئیں تو ان کی اتباع میں ہم بھی ایمان لے آئیں گے-

حافظ ابن حجرؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے وقت رؤساء یہود میں سے مشاہیر کے حسب ذیل اسماء لکھے ہیں: عبداللہ بن سلام، ابو یاسر بن اخطب، حی بن اخطب، کعب بن الاشرف، رافع بن ابی الحقیق، عبداللہ بن حنیف، فخاص، رفاعہ بن زید، زبیر بن باطیا، کعب بن اسد، شمویل بن زید وغیرہم ان میں صرف عبداللہ بن سلام کا اسلام ثابت ہے-سہیلی نے عبداللہ بن صوریا کا اسلام قبول کرنا بھی تسلیم کیا ہے مگر حافظ کو اس میں کلام ہے-

کعبؓ اور ابوہریرہؓ کے درمیان یہاں یہ اختلاف ہے کہ آنحضرت نے علماء یہود میں دس کا عدد بیان فرمایا ہے یا بارہ کا-کعب کا رجحان دوسری جانب ہے اس کی تائید میں وہ قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں جس میں نقباء یہود کا عدد بارہ ہی مذکور ہے-﴿وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا﴾ (المائدہ:۱۲)

یحییٰ بن سلام فرماتے ہیں کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں، ہوسکتا ہے کہ کعبؓ نے پورا عدد ذکر کیا ہو اور ابوہریرہؓ نے صرف ان کا ذکر کیا ہو جو حلقہ اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے-عبداللہ بن سلام اور مخیریق اسلام قبول کر چکے تھے-[1] بہر حال خلاصہ حدیث یہ ہے کہ اگر کہیں اس وقت یہ دس بارہ احبار کلمہ اسلام قبول کر لیتے تو جو یہود ان کو ارباب کی جگہ سمجھتے تھے تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاتے مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لیے ان کے علماء کو بھی بہت کم اسلام کی توفیق میسر آئی-

بظاہر اسی فطری شقاوت کی وجہ سے جب اس عام ہدایت کے وقت انہیں ایمان نصیب نہ ہوا تو عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد بھی احادیث میں ان کی محرومی ہی کا پتہ ملتا ہے-اس وقت یہ فرقہ اکثر دجال کا متبع ہوگا البتہ عیسائی من حیث القوم اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے اور دنیا کے خاتمہ سے پہلے پہلے وحدت تبع ادیان کا اہم مقصد پورا ہو جائے گا-اسی کی طرف سورۂ نساء کی آیت ﴿وَ اِنْ مِّنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ﴾(النساء:۱۵۹) میں اشارہ کیا گیا ہے-اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ﷺ .....

---

[1] فتح الباری ج ۷ باب اتیان الیهود النبی صلی اللہ علیہ وسلم-

(٦٣) عَنْ رَبَاحِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ حَوَيْطِبٍ قَالَ حَدَّثَتْنِيْ جَدَّتِيْ اَنَّهَا سَمِعَتْ اَبَاهَا يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَا وُضُوْءَ لَهُ وَ لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ تَعَالٰى وَ لَا

(٦٣) رباح بن عبدالرحمٰنؒ روایت کرتے ہیں میری دادی نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں اور جو (شروع میں) خدا کا ذکر نہ کرے اس کا وضو نہیں اور جو مجھ پر ایمان نہ لائے اس کا خدا پر بھی ایمان نہیں اور جو انصار سے محبت نہ کرے اس کا مجھ پر بھی

﴿..... کی طبعی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے گا۔

یہاں غرض صرف یہ ہے کہ اس حدیث کو آیت بالا کے ساتھ ارتباط ہے قرآن کریم بھی اہل کتاب کا عام طور پر ایمان لانا ذکر کرتا ہے مگر اس کو ایک خاص وقت پر معلق کرتا ہے اور حدیث بھی یہاں یہود کے عام ایمان کا ذکر کرتی ہے مگر اس کو ایک خاص شرط سے مقید کرتی ہے اس میں اشارہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کو فنا ہو کر یا اسلام قبول کر کے ایک دن بہر حال آخری دین یعنی اسلام میں داخل ہونا مقدر ہے۔ وحدت قبلہ ظہور پذیر ہو چکی۔ یہ اس وحدت کا مرکزی نقطہ تھا جو آئندہ ظہور پذیر ہونے والی ہے۔ عام نظریں حوادث کا باہمی ارتباط نہیں سمجھتیں، تکوینی نظر میں ان میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔

(٦٣) * حافظ ابن حجر تلخیص الجبیر میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں گو کلام ہے مگر تمام اسنادوں پر نظر کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث بے اصل نہیں۔ ابوبکر بن شیبہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ضرور ارشاد فرمائی ہے۔ اس حدیث میں چار مسئلے ہیں پہلا مسئلہ اجماعی ہے۔ دوسرا مسئلہ گو اختلافی ہو مگر وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سب کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ تیسرا مسئلہ اصول دین میں داخل ہے یعنی ایمان بالرسالۃ' چوتھا مسئلہ فروعی ہے اپنے اپنے محل میں ہر مسئلہ سے بحث کی جائے گی۔ یہاں زیر بحث صرف تیسرا مسئلہ ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ مدار نجات ایمان باللہ اور ایمان بالمغیبات ہے۔ مغیبات سے مراد قیامت' فرشتے جنت' دوزخ وغیرہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ان ہی امور کی تعلیم و تشریح کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ عقول انسانیہ ان امور کے صحیح ادراک سے قاصر ہیں اور اگر بہ ہزار دشواری ادراک کر بھی لیں تو وہ بھی ناتمام ادراک ہوگا اس لئے خدا کی رحمت نے اس کا بوجھ ہم پر نہیں ڈالا بلکہ فلاح و فوز کا راستہ بتلانے کا خود تکفل فرما لیا ہے اس کے بعد ہمارا کام صرف اس بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے چونکہ یہ ایمان انبیاء علیہم السلام کے بغیر میسر آ ہی نہیں سکتا اس لیے ایمان باللہ کے مفہوم میں رسولوں پر ایمان لانا خود بخود داخل ہو جاتا ہے اسی لیے احادیث میں اور کہیں کہیں آیات قرآنیہ میں صرف توحید کو مدار نجات ٹھیرایا گیا ہے' ان سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ صرف توحید موجب نجات ہو سکتی ہے۔ قرآن کریم نے تصنیف کی بجائے خطابت کا اسلوب اختیار کیا ہے اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک خطیب کے انداز بیان کا تصور رکھنا چاہیے وہ جب کسی خاص ماحول میں گفتگو کرتا ہے تو بہت سے امور اس کے ماحول میں اور بہت سے متکلم و مخاطب کے دماغوں میں موجود ہوتے ہیں اور بہت سے اس کے طرز تکلم سے مفہوم ہوتے ہیں اور جب ان سب کو پیش نظر رکھا جاتا ہے تو اس کا کلام سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی یہاں خود رسول خدا کی طرف سے متکلم ہوتا ہے جب وہ بولتا ہے تو خدا تعالیٰ کا ایک ترجمان بن کر بولتا ہے' اس کی ہستی آنکھوں سے نظر آ رہی ہے اس لیے اسے اپنے بیان میں زور ان ہی باتوں پر دینا پڑتا ہے جو غائب اور غیر محسوس ہیں جب وہ امنوا باللّٰہ کا امر کرتا ہے تو یہ جانتا ہے کہ یہ حکم ﴿.....

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ مَنْ يُؤْمِنُ بِیْ وَ لَا يُؤْمِنُ بِیْ مَنْ لَّايُحِبُّ الْاَنْصَارَ. (رواه احمد و الدارقطنی)

ایمان نہیں۔

(اس حدیث کوامام احمد اور دارقطنی نے روایت کیا ہے)

مثل النبی صلی الله علیه وسلم و مثل ماجاء به

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین کی مثال

(۶۴) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ جَاءَتْ مَلَائِكَةٌ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ نَائِمٌ فَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ نَائِمٌ وَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ

(۶۴) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند فرشتے حاضر ہوئے اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سو رہے تھے ان میں سے کسی نے کہا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سوتے ہیں اور

ؐ.... میری آواز پر جو مانے گا۔ اس کو پہلے میرا ماننا لازم ہوگا' مخاطبین کو بھی کوئی ضد ہوتی ہے تو زیادہ تر اسی کی شخصیت سے ہوتی ہے وہ بہت سے مسلمات کا اگرانکار کرتے ہیں تو اس ضد سے کہ اس کے منہ سے نکل رہے ہیں اسی لیے ایمان بالرسول جو بہ حقیقت ایمان باللہ کا ایک ذریعہ تھا اب ایک حیثیت میں رکن رکین اور اصل الاصول بن جاتا ہے۔ جس طرح ایمان میں اللہ اور رسول کے درمیان فرق کی گنجائش نہیں ایک کا منکر دوسرے کا منکر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رسولوں میں بھی باہمی یہی نسبت موجود ہے یعنی ایک کا منکر دوسرے کا منکر ہے یہاں ماضی و حال و مستقبل تینوں زمانے برابر ہیں حتی کہ خود انبیاء علیہم السلام بھی اس وصف میں شریک ہیں۔ اعمال و اقوال کی صداقت ایمان کی صداقت پر موقوف ہے اور ایمان کی صداقت خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے مربوط ہے اس لیے ایمان بالرسول اور رسول کے فرمانے پر دوسرے رسولوں پر ایمان لانا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے اب آیات ذیل کو پڑھئے۔ (۱) ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ (نور: ۶۲) مومن دراصل وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (۲) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ الخ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ (النساء: ۱۵۰، ۱۵۱) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے منکر ہوئے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی پر ایمان لائیں گے اور کسی کا انکار کریں گے الخ یہی لوگ اصلی کافر ہیں۔ (۳) ﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ (النساء: ۱۳۶) جو انکار کرے اللہ تعالیٰ کا اور اس کے فرشتوں کا اور رسولوں اور قیامت کے دن کا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

پہلی آیت میں اللہ اور اس کے رسولوں پر بلا تفریق ایمان لانے کا امر ہے دوسری آیت میں ان کے درمیان فرق کرنے والے کو اصلی کافر کہا گیا ہے اور تیسری آیت میں ایمان میں فرشتوں اور یوم آخر کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اب صرف کسی ایک آیت کو لے کر ایمان کی بحث کا فیصلہ کر ڈالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

(۶۴) * عالم غیب میں تفہیم کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی بیداری کو تین بار مکرر کیا گیا ہے اسی بناء پر انبیاء علیہم السلام کے خواب کو وحی کہا جاتا ہے۔ جب انبیاء علیہم السلام کی نوم کا حال یہ ہے تو ان کی موت کا حال اسی سے قیاس کر لینا چاہیے۔ یعنی کیا وہ موت کے بعد عام ارواح کی طرح بیکار و معطل ہو سکتے ہیں یا ان کا ادراک و شعور' فہم و احساس اپنی جگہ بحال رہتا ہے۔ اس مثال میں یہ ذہن نشین کرنا منظور ہے کہ فوز و فلاح کا راز صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضمر ہے۔ نیز یہ تنبیہ کرنا بھی مقصود ؐ....

الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَ الْقَلْبُ يَقْظَانُ فَقَالُوْا اِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هٰذَا مَثَلًا فَاضْرِبُوْا لَهٗ مَثَلًا فَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ نَائِمٌ وَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَ الْقَلْبُ يَقْظَانُ فَقَالُوْا مَثَلُهٗ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى دَارًا وَ جَعَلَ فِيْهَا مَادُبَةً وَ بَعَثَ دَاعِيًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَ اَكَلَ مِنَ الْمَادُبَةِ وَ مَنْ لَّمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَ لَمْ يَاْكُلْ مِنَ الْمَادُبَةِ فَقَالُوْا اَوِّلُوْهَا لَهٗ يَفْقَهُهَا فَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ نَائِمٌ وَ قَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبُ يَقْظَانُ فَقَالُوا الدَّارُ الْجَنَّةُ وَ الدَّاعِيْ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْ اَطَاعَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ عَصٰى مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ وَ مُحَمَّدٌ فَرَّقَ بَيْنَ النَّاسِ. (متفق عليه)

کسی نے کہا آنکھ سوتی ہے مگر دل جاگتا ہے پھر کہنے لگے تمہاری اس بزرگ ہستی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے ایک مثال ہے' اس مثال کو بیان کرو اس پر کسی نے کہا وہ سوتے ہیں اور کسی نے کہا آنکھ سوتی ہے مگر دل جاگتا ہے- پھر وہ کہنے لگے' ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے مکان بنایا اور اس میں دعوت کا انتظام کیا پھر ایک بلانے والے کو بھیجا- جس نے اس بلانے والے کی بات مانی وہ مکان میں آ گیا اور دعوت کا کھانا بھی کھایا اور جس نے اس بلانے والے کی بات نہ مانی وہ نہ مکان میں آیا' اور نہ طعام دعوت کھایا- پھر انہوں نے کہا اس مثال کی توضیح بھی کرو- تا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو صاف صاف سمجھ لیں تو بعض نے کہا یہ سوتے ہیں اور بعض نے کہا آنکھ سوتی ہے مگر دل بیدار ہے پھر کہنے لگے وہ مکان جنت ہے اور بلانے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں- جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے خدائے عزوجل کی نافرمانی کی- محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں نیک و بد کو جدا جدا تمیز کر دینے والے ہیں-

(یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(۶۵) عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا مَثَلِيْ وَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ كَمَثَلِ رَجُلٍ اَتٰى قَوْمًا فَقَالَ يَا قَوْمِ اِنِّيْ رَاَيْتُ الْجَيْشَ بِعَيْنَيَّ وَ اِنِّيْ اَنَا

(۶۵) ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے میری اور اس دین کی مثال جو خدا نے مجھے دے کر بھیجا ہے اس شخص کی سی ہے جو اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا اے میری قوم میں نے دشمن اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ایک سچا ڈرانے

☜ ..... ہے کہ آپ ؐ کی نافرمانی کر کے خدا کی فرمانبرداری کی ہوس کرنا غلط ہے-
فرق کو بعض نے بصیغہ ماضی کہا ہے اور بعض نے بسکون راء مصدر بمعنی فارق (فرق کرنے والے) پڑھا ہے بہر حال یہ بھی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد ہے کہ مطیع و عاصی' مؤمن و کافر کا گروہ علیحدہ علیحدہ کر دیں-
(۶۵) ٭ عرب میں غارت گری کے لیے بیشتر صبح کا وقت ہی مقرر تھا اس لیے جس کو وہ دعا دیتے یہی دعا دیتے کہ خدا تیری صبح اچھی رکھے- اسی طرح ان کا دستور تھا کہ جب کوئی شخص دشمن دیکھ پاتا تو اپنے کپڑے اتار کر کسی اونچی جگہ ان کو ہلاتا تا کہ یہ وحشت ناک صورت دیکھ کر لوگ دشمن کی آمد کا یقین کر لیں اور دشمن کے پہنچنے سے قبل ہوشیار ہو جائیں چنانچہ اس کی خبر بھی چشم دید اور سچی سمجھی جاتی تھی- اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو ''النذیر العریان'' سے تعبیر فرمایا ہے جن خوش نصیبوں نے آپ کے فرمان کو مان خدا کے ☜ .....

النَّذِيْرُ الْعُرْيَانُ فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ فَاَطَاعَهٗ طَائِفَةٌ مِنْ قَوْمِهٖ فَادْلَجُوْا فَانْطَلَقُوْا عَلٰى مَهْلِهِمْ فَنَجَوْا وَ كَذَّبَتْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ فَاَصْبَحُوْا مَكَانَهُمْ فَصَبَّحَهُمُ الْجَيْشُ فَاَهْلَكَهُمْ وَ اجْتَاحَهُمْ فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ اَطَاعَنِيْ فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِهٖ وَ مَثَلُ مَنْ عَصَانِيْ وَ كَذَّبَ مَا جِئْتُ بِهٖ مِنَ الْحَقِّ. (متفق علیہ)

والا ہوں لہٰذا نجات کی فکر کرو اس پر اس کی قوم میں کسی نے تو اس کا کہنا مانا اور آہستہ آہستہ شروع رات میں ہی چل پڑے اور دشمن سے نجات پا گئے اور کسی نے اس کو جھوٹا سمجھا اور اپنے بستروں پر صبح تک پڑے سوتے رہے دشمن کا لشکر صبح صبح ان پر ٹوٹا اور ان کو تباہ و برباد کر ڈالا بس ٹھیک یہی مثال ہے اس شخص کی جس نے میری بات مان لی اور میرے لائے ہوئے دین کی پیروی کی اور اس شخص کی جس نے میری بات نہ مانی اور اس سچائی کو جھٹلا دیا جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(٦٦) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِيْ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهَا جَعَلَ الْفَرَاشُ وَ هٰذِهِ الدَّوَابُّ الَّتِيْ تَقَعُ فِي النَّارِ يَقَعْنَ فِيْهِ وَ جَعَلَ يَحْجُزُهُنَّ وَ يَغْلِبْنَهٗ فَيَتَقَحَّمْنَ فِيْهَا فَاَنَا اٰخُذُ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَ اَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِيْهَا هٰذِهٖ رِوَايَةُ الْبُخَارِيِّ وَ لِمُسْلِمٍ نَحْوُهَا وَ قَالَ فِيْ اٰخِرِهَا قَالَ فَذٰلِكَ مَثَلِيْ وَ مَثَلُكُمْ اَنَا اٰخُذُ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ هَلُمَّ عَنِ النَّارِ فَتَغْلِبُوْنِيْ تَقَحَّمُوْنَ فِيْهَا. (متفق علیہ)

(٦٦) ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ہے میری مثل اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی جب اس نے ارد گرد کو خوب روشن کر دیا تو پروانے اور یہ کیڑے جو آگ میں گرا کرتے ہیں اس میں گرنے لگے وہ ہے کہ انہیں روک رہا ہے' یہ ہیں کہ اسے عاجز کر کے اس میں گھسے جا رہے ہیں۔ اسی طرح میں بھی ہوں کہ تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں دوزخ سے بچا رہا ہوں اور تم ہو کہ اس میں گھسے جاتے ہو۔ یہ روایت بخاری کی ہے اور مسلم نے بھی اسی کے ہم معنی روایت کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ لفظ ہیں کہ میری اور تمہاری مثل یہ ہے میں تمہاری کمر پکڑے ہوئے (کہہ رہا) ہوں دوزخ سے بچو' دوزخ سے بچو' تم مجھے عاجز کر کے اس میں گھسے جاتے ہو۔

(یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(٦٧) عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى رضی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

(٦٧) ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ

﴿..... عذاب سے نجات پائی اور جنہوں نے آپ کی بات پر کان نہ دھرا اور کفر میں عمر گذار دی اور مر گئے عذاب الٰہی نے انہیں آ پکڑا اور موت ابدی میں دھکیل دیا۔

(٦٦) * دنیا کے ناسمجھ انسانوں اور رسول خدا کی انتہائی محبت و خیر خواہی کا جو نقشہ اس مثال میں کھینچا گیا ہے اس سے زیادہ سچے اور مؤثر انداز میں کھینچنا ناممکن ہے۔ نہ پروانہ کو انجام کا ہوش ہوتا ہے نہ آج دنیائے کفر کو فردائے قیامت کا فکر ہے بے رحمی و نادانی سے ان جان قربان کرنے والوں پر سب سے زیادہ رحم کھانے والا پکار رہا ہے کہ تم آگ میں جا رہے ہو کوئی نصیب والا ہوگا جو اس کی آواز سنے گا۔

(٦٧) * یہاں زمین کی مفصل اقسام اور لوگوں کی مکمل تقسیم پھر ان میں پوری پوری مطابقت بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اجمالاً یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جس طرح دنیا میں بارش کے پانی سے بعض زمین نفع اٹھاتی ہے اور بعض نفع نہیں اٹھاتی اور جو نفع نہیں اٹھاتی یہ اسی کی ﴾.....

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ مِنَ الْهُدٰى وَ الْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ الْمَآءَ فَاَنْبَتَتِ الْكَلَاءَ وَ الْعُشْبَ الْكَثِيْرَ وَ كَانَتْ مِنْهَا اَجَادِبُ اَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَ سَقَوْا وَ زَرَعُوْا وَ اَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً اُخْرٰى اِنَّمَا هِيَ قِيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَ لَا تُنْبِتُ كَلَاءً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ وَ نَفَعَهُ مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَ عَلَّمَ وَ مَثَلُ مَنْ لَّمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا وَ لَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْ اُرْسِلْتُ بِهٖ. (متفق عليه)

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جو ہدایت اور دین کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دے کر بھیجا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی اس زمین کے ایک حصہ نے جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پی لیا گھاس اور سبزہ خوب اُگایا اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے وہ پانی جمع کر لیا تو اس کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں کو نفع پہنچایا انہوں نے خود پانی پیا اور اپنے جانوروں کو پلایا اور کاشت کی لیکن زمین کا ایک حصہ تھا جو چٹیل میدان تھا نہ پانی کو روکے نہ گھاس اُگائے۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے خدا کے دین کی سمجھ حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے اس دین سے اس کو نفع دیا اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو سکھلایا اور اس شخص کی مثال جس نے ادھر سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس ہدایت کو قبول نہ کیا جس کو مجھے دے کر بھیجا گیا تھا۔

(یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(٦٨) عَنْ رَبِيْعَةَ الْجُرَشِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اُتِيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقِيْلَ لَهٗ لِتَنَمْ عَيْنُكَ وَ لْتَسْمَعْ اُذُنُكَ وَ لْيَعْقِلْ قَلْبُكَ قَالَ فَنَامَتْ عَيْنَيَّ وَ سَمِعَتْ اُذُنَايَ وَ عَقَلَ قَلْبِيْ قَالَ فَقِيْلَ لِيْ سَيِّدٌ بَنٰى دَارًا فَصَنَعَ مَأْدُبَةً وَ اَرْسَلَ دَاعِيًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَ اَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَ رَضِيَ عَنْهُ السَّيِّدُ وَ مَنْ لَّمْ يُجِبِ

(٦٨) ربیعہ جرشیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک فرشتہ حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا: چاہیے کہ آپؐ کی آنکھیں سو جائیں (اور کسی طرف نہ دیکھیں) اور آپؐ کے گوش (میری بات) سنیں اور آپؐ کا دل (متوجہ ہو کر) سمجھے آپؐ نے فرمایا کہ میری آنکھیں (تمام محسوسات کی طرف سے) سو گئیں میرے کان سننے کے لیے تیار اور دل سمجھنے کے لیے ہوشیار ہو گیا آپؐ فرماتے ہیں پھر فرشتے نے کہا ایک سردار ہے اس نے ایک گھر بنایا اور دعوت کا انتظام کیا اور ایک بلانے والا بھیجا اب جس نے اس کی دعوت کو سنا اور مانا وہ اس گھر میں آ گیا اور دعوت بھی کھائی سردار اور مالک مکان بھی اس سے خوش ہوا اور جس نے اس بلانے والے

☜..... خرابی کی دلیل ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی کی بارش ہے بعض قلوب اس سے نفع اٹھاتے ہیں، ہدایت کا بیج ان میں اسی طرح پھولنے پھلنے لگتا ہے جیسا کہ اچھی زمین میں کھیتی اور بعض ایسے اوندھے ہوتے ہیں کہ چٹیل میدان کی طرح نہ اس قابل ہوتے ہیں کہ خود کوئی نفع حاصل کریں اور نہ ان میں یہی قابلیت ہوتی ہے کہ اس پانی کو صرف روک لیں کہ کم از کم دوسرے ہی اس سے فائدہ حاصل کر لیں۔ یہ بھی نفع کی ایک صورت تھی۔

(٦٨) ✻ اس باب کی پہلی حدیث میں جنت کو گھر کہا گیا تھا اور یہاں اسلام کو گھر کہا گیا ہے اور جنت کو طعام دعوت قرار دیا گیا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں مثالوں کا مشترک نتیجہ ایک ہی ہے۔ یہاں ہر ہر جزء کی تشبیہ مقصود نہیں ہے۔ نیز اسلام چونکہ جنت میں داخل ہونے کا واحد سبب ہے اس لیے اس کو عین مسبب اور مجازاً گھر کہہ دینا بھی درست ہے۔ بہر حال ان سب مثالوں اور کہاوتوں میں ☜.....

الـدَّاعِـيَ لَـمْ يَـدْخُـلِ الـدَّارَ وَ لَمْ يَـأْ كُلْ مِنَ الْـمَـأْدُبَةِ وَ سَـخِـطَ عَـلَيْـهِ السَّيِّدُ قَالَ فَاللّٰهُ السَّيِّـدُ وَ مُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ وَ الدَّارُ الْاِسْلَامُ وَ الْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ. (رواه الدارمی)

کی بات نہ مانی وہ نہ تو گھر میں آیا اور نہ اس نے دعوت کا کھانا کھایا اور مالک مکان اس پر ناراض ہوا‘ اس کے بعد اس کی توضیح کی کہ مالک مکان تو اللہ ہے اور اس کے منادی اور بلانے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں‘ وہ گھر اسلام کا گھر ہے اور وہ دعوت جنت (اور اس کی نعمتیں) ہیں۔ (اس حدیث کو دارمی نے روایت کیا ہے)

(۶۹) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُسْتَقِيْمًا وَ عَنْ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ فِيْهِمَا اَبْوَابٌ مُفَتَّحَةٌ وَ عَلَى الْاَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُرْخَاةٌ وَ عِنْدَ رَأْسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُوْلُ اسْتَقِيْمُوْا عَلَى الصِّرَاطِ وَ لَا تَعْوَجُّوْا وَ فَوْقَ ذٰلِكَ دَاعٍ يَدْعُوْ كُلَّمَا هَمَّ عَبْدٌ اَنْ يَفْتَحَ شَيْئًا مِنْ تِلْكَ الْاَبْوَابِ قَالَ وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ فَاِنَّكَ اِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ ثُمَّ فَسَّرَهٗ فَاَخْبَرَ اَنَّ الصِّرَاطَ هُوَ الْاِسْلَامُ وَ اَنَّ الْاَبْوَابَ الْمُفَتَّحَةَ مَحَارِمُ اللّٰهِ وَ اَنَّ السُّتُوْرَ

(۶۹) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال بیان فرمائی‘ ایک سیدھی راہ ہے اس کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں‘ ان دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں‘ دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور اس راہ کے سرے پر ایک پکارنے والا پکار رہا ہے (اے چلنے والو) اسی راستہ پر سیدھے چلے جاؤ اور اپنے دائیں بائیں رخ نہ کرو‘ اس پکارنے والے سے پہلے ایک اور پکارنے والا ہے جب بندہ ان دروازوں میں کسی دروازہ کو کھولنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے او کمبخت اسے کھول مت اگر کھولے گا تو اس میں ضرور داخل بھی ہو گا۔ پھر اس مثال کی خود توضیح کی‘ یہ سیدھی راہ تو اسلام ہے اور کھلے ہوئے دروازے خدا کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور اس پر لٹکے ہوئے پردے خدا کی بیان کردہ حدود ہیں اور راہ کے سرے کا داعی قرآن ہے اور اس سے پہلا

ﷺ..... یہی سمجھایا گیا ہے کہ جنت کا گھر بغیر آپ ﷺ کی تصدیق اور پیروی کیے نہیں ملے گا۔

(۶۹) * حدیث کا حاصل یہ ہے کہ محرماتِ شرعیہ میں فطرتِ انسانی کے لیے ایسی کشش ہے کہ جو اس طرف نظر بھی اٹھائے گا وہ ضرور مبتلا ہو کر رہے گا اس لیے سلامتی کی راہ یہ ہے کہ خدا کی قائم کردہ حدود سے دور ہی دور رہے تا کہ محرماتِ شرعیہ کی بو بھی نہ پاس آنے پائے۔ قرآن کریم خدا کا داعی کھلم کھلا پکار رہا ہے اور واعظ اللہ لمة ملکی ہے یعنی وہ داعیہ خیر ہے جو ظاہری فتووں سے پہلے انسان کو خیر و نصیحت کی دعوت دیا کرتا ہے طیبی فرماتے ہیں کہ لٹکے ہوئے پردے وہ امور ہیں جن میں دلائل کے تعارض یا کسی ابہام کی وجہ سے کوئی شبہ رہ جاتا ہے یہاں شرعی ہدایت یہ ہے کہ ان سے دور ہی رہنا چاہیے تا کہ اشتباہ کی احتمالی مضرت سے بھی حفاظت رہے اسی کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ (البقرۃ:۱۸۷) یہ خدا کی حدود ہیں لہٰذا ان کے قریب بھی نہ آؤ۔

ایک ضعیف انسان کے لیے یہ امتحان کم نہیں کہ اس کی پیاسی نظروں کے سامنے رنگین نظارے ہوں اور ان پر صرف ایک پردہ ڈال کر ان کی دید سے اس کو روکا جائے خانہ محرمات کی رنگینی ہی خود ایک بلاء تھی اس پر نظر اٹھانے کی ممانعت یہ دوسری بلا ہے جو اس کے لیے اور موجب اشتیاق بن رہی ہے مگر اس کے ساتھ اگر غور کرو تو بات کچھ مشکل بھی نہیں‘ اندرونی و بیرونی دو دو پہرہ دار ساتھ ہیں جو سمجھاتے جا رہے ہیں۔ نظر فریبی کے سامان گو موجود ہیں مگر ان پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے اگر تمام شریعت کا خلاصہ سمجھنا چاہو تو ایک حرف ہے ﷺ.....

الْـمُرْخَاةُ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَ اَنَّ الدَّاعِیَ عَلٰی رَأْسِ الصِّرَاطِ هُوَ الْقُرْاٰنُ وَ اَنَّ الدَّاعِیَ مِنْ فَوْقِهٖ هُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ فِیْ قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ . (رواه رزین و احمد و البیهقی فی شعب الایمان عن النورس بن سمعان و كذا الترمذی عنه الا انه ذكر احصرمنه)

داعی خدا کا ناصح ہے جو ہر مؤمن کے قلب میں موجود ہے۔

اس حدیث کو رزین و احمد نے روایت کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بجائے نورس بن سمعان سے روایت کیا ہے اور اسی طرح ترمذی نے بھی مگر انہوں نے اس سے ذرا مختصر روایت بیان کی ہے۔

(٧٠) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِیْلُ اللّٰهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ یَمِیْنِهٖ وَ عَنْ شِمَالِهٖ وَ قَالَ هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰی كُلِّ سَبِیْلٍ مِنْهَا شَیْطَانٌ یَدْعُوْ اِلَیْهِ وَ قَرَأَ ﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ الایة. (الانعام:١٥٣)
(رواه احمد و النسائی و الدارمی)

(٧٠) ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ تو اللہ کی طرف جانے والا راستہ ہے پھر اس خط کے دائیں بائیں اور خطوط نکالے اور فرمایا یہ اور راستے ہیں ان میں ہر راستہ پر ایک شیطان ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے اس کے بعد یہ آیت پڑھی ﴿ان هذا﴾ الخ یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہذا اسی پر چلو۔

(اس حدیث کو احمد ونسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے)

لو كان موسٰی حیا ماوسعه الا اتباعه صلی الله علیه وسلم

اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو آج انہیں بھی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کیے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا

(٧١) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْأَلُوْا اَهْلَ

(٧١) جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل کتاب سے دین کی کوئی بات مت پوچھا کرو کیونکہ جو خود گمراہ ہو چکے ہیں وہ

ﷺ ..... یعنی ''ضبط نفس'' عبادات' معاملات' معیشت اور اخلاقیات کے جتنے بھی احکام ہیں وہ اسی ایک حرف کی تفصیلات اور عملی ٹریننگ ہیں۔ جس کو ضبط نفس کی عادت پڑ گئی اس کو شریعت پر عمل کرنا آسان ہو گیا اور جس نے اپنے نفس کو آزادی کا خوگر بنالیا اس نے آسان شریعت کو خود اپنے لیے مشکل بنالیا۔

(٧٠) * یہ حدیث پہلی حدیث کے ہم معنی ہے۔ یہاں اگر شیطانی دعوت کا ذکر ہے تو پہلی حدیث میں واعظ اللہ اور قرآن کریم کی دو دعوتوں کا تذکرہ آچکا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق کی راہ صرف ایک راہ ہے جس میں کوئی ناہمواری' نشیب وفراز نہیں ہے اور گمراہی کی راہیں بہت ہیں اور وہ بھی پُرخم اور پُر پیچ ہیں صرف نفسانی حرص اور طبعی انجذاب ان کو سیدھا دکھلاتا ہے راہ مستقیم پر گامزن ہونے میں اگر کوئی اندرونی اضطراب محسوس ہو تو وہ راہ کی ناہمواری نہیں بلکہ چاروں طرف سے دعوت شیطانی کے اثرات ہیں جتنا ادھر کان لگاؤ گے اس اضطراب میں اضافہ ہوتا رہے گا اور جتنا ان سے غافل رہو گے اسی قدر اپنے قلب میں اطمینان وسکون دیکھو گے۔

(٧١) * یہاں امت کے سامنے ایک اصولی مسئلہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب تمہارے عمل کے لیے ایک شریعت آچکی ہے تو اب پہلی شریعت سے بحث کرنا ہی غلط ہے' ظاہر ہے کہ اگر پہلی شریعت کو قائم رکھنا منظور ہوتا تو ضرور اس کو محفوظ بھی رکھا جاتا لیکن جب اس ﷺ ....

الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ فَإِنَّهُمْ لَنْ يَهْدُوكُمْ وَ قَدْ ضَلُّوا فَإِنَّكُمْ إِمَّا أَنْ تُصَدِّقُوا بِبَاطِلٍ أَوْ تُكَذِّبُوا بِحَقٍّ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ مَا حَلَّ لَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي.

(رواه احمد و ابن ابی شیبه و البزار)

بھلا تمہیں کیا راہ دکھلائیں گے اگر تم ان کی تصدیق کرتے ہو تو احتمال ہے کہ تم کسی غلط بات کی تصدیق کر بیٹھو اور اگر تکذیب کرتے ہو تو ممکن ہے کہ کسی حق بات کی تکذیب کر دو آج وہ زمانہ ہے کہ اگر خود موسیٰ علیہ السلام تم میں زندہ موجود ہوتے تو انہیں بھی سوائے میری پیروی کے تورات کی پیروی کرنا حلال نہ ہوتا۔ (اس حدیث کو امام احمد، ابن ابی شیبہ اور بزار نے روایت کیا ہے)

(۴۷) وَ عَنْهُ أَيْضًا أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكِتَابٍ أَصَابَهُ مِنْ بَعْضِ أَهْلِ الْكِتَابِ فَقَرَأَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَغَضِبَ فَقَالَ أَمُتَهَوِّكُونَ فِيهَا يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ وَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً لَا تَسْأَلُوهُمْ عَنْ شَيْءٍ فَيُخْبِرُوكُمْ بِحَقٍّ فَتُكَذِّبُوا بِهٖ أَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُوا بِهٖ وَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَوْ أَنَّ مُوسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي. (رواه احمد و ابن ماجة عن ابن عباس و ابن حبان عن

(۴۷) جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کتاب لائے جو انہوں نے کسی اہل کتاب سے لی تھی اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تو ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اے ابن الخطاب کیا اپنے دین کے معاملہ میں تم لوگ بھی کچھ حیرت میں مبتلا ہو، اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تمہارے پاس ایک روشن اور صاف شریعت لے کر آیا ہوں اہل کتاب سے دین کی کوئی بات مت پوچھا کرو کہیں وہ تمہیں کوئی سچی بات بتلائیں اور تم اس کی تکذیب کر دو یا غلط بات بتائیں اور اس کی تصدیق کر دو، اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی اس کے سوا گنجائش نہ تھی کہ میری ہی پیروی کرتے۔ اس حدیث کو احمد نے اور ابن ماجہ نے ابن

ﷺ ....کو محفوظ نہیں رکھا گیا تو معلوم ہو گیا کہ آئندہ قدرت کو اس پر عمل درآمد بھی منظور نہ تھا۔ شریعت سماویہ گو سب حق تھیں مگر تحریف کے بعد ان میں بہت سا باطل کا حصہ داخل ہو چکا ہے جو نا معلوم ہے اب اس سے بحث کا حاصل یہی ہے کہ اگر تصدیق کرتے ہو تو باطل کی تصدیق کا احتمال اور تکذیب کرتے ہو تو حق کی تکذیب کا احتمال باقی رہتا ہے اس لیے جب عمل کے لیے ایک راہ موجود ہے تو پھر اس گرداب میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان میں تحریف نہیں ہوئی تو بھی ہر صداقت پر عمل کرنا اسی وقت موجب نجات ہو سکتا ہے جب وہ وقت کی شریعت بھی ہو اگر اس کی بجائے دوسری شریعت آ چکی ہے تو اب پہلی صداقت پر عمل کرنا وقتی شریعت کی توہین ہوگی۔ اگر دین صرف اپنی رائے پر ہوتا تو شریعت کی حاجت نہ تھی اور جب شریعت کی ضرورت تسلیم ہے تو صرف کسی صداقت کا صداقت ہونا نجات کے لیے کافی نہیں جب تک اس کا وقتی شریعت ہونا بھی ثابت نہ ہو جائے ہر صداقت کا شریعت ہونا کوئی لازمی امر نہیں ہاں ہر شریعت کا صداقت پر مبنی ہونا ضروری ہے اس لیے یہ محض ایک بے بنیاد خیال ہے کہ جب سب ادیانِ سماویہ حق ہیں تو ان پر عمل کرنا بھی ہمیشہ نجات کے لیے کافی ہونا چاہیے۔ جس دور میں خود موسیٰ علیہ السلام کو وقت کی صداقت پر عمل کرنا ضروری ہو اس میں ان کی کتاب کا تذکرہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ دراصل اس بحث کا منشاء انکار نسخ ہے ملل سماویہ کا منسوخ ہونا ایک مسلم مسئلہ ہے علماء کو اگر بحث ہے تو دین اسلام کے احکام کے نسخ میں ہے۔ نیز دیگر ادیان سماویہ کے عقائد و اصول کا باقی رہنا بھی دوسری بات ہے۔

جابر وغیرهم و فی الباب عن عبداللہ بن ثابت الانصاری عند احمد و ابن سعد و الحاکم فی الکنی و الطبرانی و البیهقی فی شعب الایمان و عن جابر عند الدارمی)

عباس سے اور ابن حبان نے جابر سے روایت کیا ہے اور یہی مضمون امام احمد نے عبداللہ بن ثابت انصاری سے روایت کیا ہے اور اسی طرح ابن سعد اور حاکم نے کنی میں اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور شعب الایمان میں بیہقی نے روایت کیا ہے اور دارمی نے جابر سے بھی روایت کیا ہے۔

(۷۳) عَنِ الشَّعْبِیِّ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ ثَابِت قَالَ جَاءَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِؓ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ مَرَرْتُ بِاَخٍ لِّیْ مِنْ قُرَیْظَةَ فَکَتَبَ لِیْ جَوَامِعَ مِنَ التَّوْرَاتِ اَلَا اَعْرِضُهَا عَلَیْکَ؟ قَالَ فَتَغَیَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ فَقُلْتُ لَهٗ اَلَا تَرٰی مَا بِوَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ رَضِیْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا قَالَ فَسُرِّیَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ اَصْبَحَ فِیْکُمْ مُوْسٰی ثُمَّ اتَّبَعْتُمُوْهُ وَ تَرَکْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ اِنَّکُمْ حَظِّیْ مِنَ الْاُمَمِ وَ اَنَا حَظُّکُمْ مِنَ النَّبِیِّیْنَ.

(۷۳) شعبیؒ عبداللہ بن ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن الخطابؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قبیلہ بنی قریظہ کے اپنے ایک رفیق کے پاس گذر رہا تھا تو اس نے میرے فائدہ کی غرض سے تورات سے کچھ جامع کلمات لکھ دیئے تھے اجازت ہو تو آپؐ کے سامنے پیش کروں، راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنے لگا۔ عبداللہ کہتے ہیں، میں نے کہا (اے عمرؓ) آپ کے چہرۂ مبارک پر آثارِ ناگواری نہیں دیکھتے؟ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (فوراً متنبہ ہوئے) اور کہنے لگے ہم اللہ کو رب اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان کر راضی ہو چکے ہیں۔ راوی کا بیان ہے یہ کلمات سن کر آپؐ کے چہرہ سے وہ اثر زائل ہو گیا اور آپؐ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر موسیٰ تم میں موجود ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کا اتباع کرو تو گمراہ ہو گے امتوں میں تم میرا حصہ ہو اور نبیوں میں میں تمہارا حصہ ہوں۔

(رواه احمد وعزاه صاحب المشکوة للدارمی و قال صاحب التنقیح رواه ایضا ابن حبان باسناد صحیح و احمد باسناد حسن)

اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے اس روایت کو دارمی کی طرف منسوب کیا ہے۔ صاحب تنقیح کہتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن حبان نے بھی باسناد صحیح روایت کیا ہے اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے باسناد حسن روایت کیا ہے۔

---

(۷۳) * یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے سامنے شریعت موسوی کا متلاشی ہے وہ گویا آپؐ کی نبوت کو چھوڑ کر نبوتِ موسوی کا قائل ہونا چاہتا ہے۔ جس طرح خدا اور اس کے رسولؐ کے درمیان تفریق نہیں ہو سکتی اسی طرح رسول اور اس کی شریعت کے درمیان بھی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ ایمان بالرسالۃ یہ ہے کہ اس کے لائے ہوئے دین کو مانے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ نبوۃ محمدی مان کر شریعت موسویہ کی پیروی کی جائے۔

(۷۴) عَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِؓ اَتٰی رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاتِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ هٰذِهٖ نُسْخَةٌ مِنَ التَّوْرَاةِ فَسَكَتَ فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَغَيَّرُ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ ثَكِلَتْكَ الثَّوَاكِلُ مَا تَرٰى مَا بِوَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنَظَرَ عُمَرُ اِلٰى وَجْهِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ غَضَبِ اللّٰهِ وَ غَضَبِ رَسُوْلِهٖ رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيًّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ بَدَا لَكُمْ

(۷۴) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور بولے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تورات کا نسخہ ہے آپؐ خاموش ہو گئے (یہ ناگواری کی خاموشی تھی) عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے پڑھنے لگے- ادھر آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنے لگا- ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا- اے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تجھے رونے والی عورتیں روئیں آپؐ کے روئے انور پر جو ناگواری کے آثار ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتے- عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چہرہ کی طرف دیکھا تو فوراً یہ کلمات کہے' میں خدا کے غصہ اور اس کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں- ہم اللہ کو رب اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مان کر راضی ہو چکے ہیں آپؐ نے فرمایا- اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگر آج موسیٰ علیہ السلام کا بھی ظہور ہو جائے اور تم مجھے چھوڑ کر ان کے پیچھے چل

---

(۷۴) ✽ ان احادیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا ذکر صرف اس لیے نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دین جملہ ادیان کے لیے ناسخ بن کر آ چکا ہے بلکہ اس لیے بھی ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ اگر انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ملے تو وہ آپؐ پر ایمان بھی لائیں اور آپؐ ہی کے ناصر و معین رہیں- ﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (ال عمران: ۸۱) جب کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے یہ عہد لیا تھا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دوں- پھر تمہارے پاس خدا کا ایک رسول آئے جو تمہارے پاس والی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو تو اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت و مدد کرنا-

اس عہد کی رو سے ہر نبی کا فرض ہے کہ اگر وہ آپؐ کے زمانہ میں آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور آپؐ ہی کا متبع رہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور اسی لیے دنیا میں تشریف لا کر اس فریضہ اتباع کو سب کے سامنے انجام دیں گے- دنیا اس سعی میں ہے کہ بزورِ سائنس مردے زندہ کر دے کسی زندہ کی درازیٔ عمر اور اس کا نزول کیا اس سے زیادہ تعجب خیز ہے ابھی غائبات کے ساتھ جنگ نہ کرو اور صبر کے ساتھ تھوڑا انتظار کرو شاید مادی ترقیات عنقریب تمہارے سامنے وہ وقت لے آئیں جب کہ دنیا کے عجائبات عجائبات نہ رہیں گے (تنبیہ) بعض کتب حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ذکر ہے مگر اس کی سند کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذری اور اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اس کی کوئی سند ہے اور درست بھی ہو تو جس ہستی کی حیوٰۃ اس عالم میں نہیں وہ اس عالم میں تشریف لانے سے پہلے مردہ کہا جا سکتا ہے جیسا کہ عام مردے دوسرے عالم میں زندہ ہوتے ہیں مگر اس جہان میں ان کو مردہ کہا جاتا ہے- دنیا اپنے اپنے احساس اور عالم کے موافق بولتی ہے- یہ شریعت کی اطلاع ہے کہ وہ ﷲ.....

مُوسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْهُ وَ تَرَكْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ وَ لَوْ كَانَ حَيًّا وَ اَدْرَكَ نُبُوَّتِیْ لَا تَبِعَنِیْ. (رواہ الدارمی)

پڑو تو سیدھی راہ سے گمراہ ہو جاؤ گے- اگر وہ زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پاتے تو میرے ہی پیچھے چلتے-

(اس حدیث کو دارمی نے روایت کیا ہے)

من عصی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقد أبی

جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے وہ آپ کا انکار کرتا ہے

(۷۵) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُلُّ اُمَّتِیْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِؐ وَ مَنْ يَّاْبٰی قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی. (رواہ البخاری)

(۷۵) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- ہے میری تمام امت جنت میں جائے گی مگر جو انکار کرے، صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہؐ وہ کون ہے جو آپ کا انکار کرتا ہے آپؐ نے جواب دیا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی اس نے مجھے نہ مانا اور میرا انکار کیا- (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ

کوئی شخص پورا ایمان دار نہیں ہوتا جب تک اس کی خواہشات شریعت کے تابع نہیں ہوتیں

(۷۶) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰی يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهِ. (رواہ فی شرح السنة قال النووی فی اربعینہ ھذا حدیث صحیح رویناہ فی کتاب الحجة باسناد صحیح)

(۷۶) عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں کوئی شخص ایمان دار نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ اس کی خواہش اس دین کی تابع نہ بن جائے جو میں لایا ہوں-
اس حدیث کو شرح السنہ میں روایت کیا ہے- نووی اپنی کتاب اربعین میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور کتاب الحجہ میں ہم نے اس کو صحیح اسناد سے روایت کیا ہے-

---

..... عظیم القدر ہستی جس کے متعلق کسی کا گمان پھانسی کا ہے اور کسی کا قتل کا زندہ صحیح وسلامت موجود ہے اور اپنے وقت پر پھر آنے والی ہے- تفصیلی بحث اپنے محل میں آئے گی-

(۷۵) ٭ انکار دو قسم پر ہے ایک یہ کہ زبان سے انکار کرے ایسا منکر کافر ہے اور کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا دوسرا یہ کہ زبان سے اقرار کرتا ہے مگر اپنے طرزِ عمل میں کھلے منکر کے مشابہ ہے یہ گو اقرار کر رہا ہے مگر جب نافرمانی کرنے میں زبان سے انکار کرنے والے کے برابر ہے تو ایک نظر میں یہ بھی منکر ہے لہٰذا اسے بھی ان منکرین کے ساتھ کچھ دن رہنا ہوگا- گو اپنے قلبی اقرار کی وجہ سے پھر نجات ہو جائے- رسول کے لائے ہوئے دین کو ماننا ایمان ہے اور اس کی اطاعت کرنا اس قلبی ایمان کی علامت ہے- نافرمان اور منکر صورت میں یکساں ہیں-

(۷۶) ٭ ایمان کا کمال یہ ہے کہ متابعت شریعت میں وہ لطف و لذت محسوس ہونے لگے جو طبعی مرغوبات میں محسوس ہوتا ہے، نماز کے وقت نماز اور ماہ رمضان میں روزہ اور نصاب حولی پر زکوٰۃ کی وہ خواہش جو سردی میں گرم کپڑے اور گرمی میں ٹھنڈک حاصل .....

وجوب محبته للنبی صلی الله علیه وسلم اکثر من نفسه و الناس اجمعین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنی جان بلکہ سب جہان سے زیادہ کرنا ضروری ہے

(۷۷) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَلَدِہٖ وَ وَالِدِہٖ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ. (رواہ الشیخان)

(۷۷) انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں کوئی مؤمن نہیں ہے جب تک کہ میں اسے اپنے بیٹے، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔
(اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے)

ﷺ .... کرنے کی ٹھوتی ہے یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ نفس اپنی سرشت چھوڑ کر شریعت کے تابع ہو جائے اسی کا نام نفس مطمئنہ ہے ظاہر ہے کہ جب نفس میں یہ ذوق پیدا ہو جائے گا تو بلاکلفت شریعت پر دائمی عمل میسر آ جائے گا اور اس وقت وہ ایمان حاصل ہوگا جو بڑی حد تک زوال کے خطرہ سے مامون ہوگا۔ صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کا نام ولایت کبریٰ ہے شریعت میں اس کو ایمان کامل کہا جاتا ہے۔

(۷۷) * شیخ بدرالدین عینیؒ لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں۔ کمال، جمال، جود وسخا۔ یہ تینوں اوصاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے زیادہ کسی کی ذات میں موجود نہیں۔ آپؐ کا کمال شریعت مطہرہ سے ظاہر ہے آپؐ کا جمال احادیث شمائل میں موجود ہے۔ آپ کی روحانی وجسمانی بخشش وکرم کا تو کون اندازہ لگا سکتا ہے پھر آپؐ کی محبت تمام مخلوق سے زیادہ کیوں نہ ضروری ہو۔ ماں باپ، بیٹے کی محبت طبعی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت محبتِ عقلی ہے حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ کمال ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آ جائے۔ ایمان کی تفصیلی بحث میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایمان صرف عقائد وعمل کا نام نہیں بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جن سے شدہ شدہ مؤمن کا قلب مزین و رنگین ہو جاتا ہے۔ شفاء میں سیرت محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جنگ احد میں ایک انصاری عورت کا باپ، بھائی، شوہر تینوں شہید ہو گئے۔ جب اسے خبر ملی تو اس نے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بخیر ہیں؟ لوگوں نے کہا ہاں بخیریت ہیں اس نے کہا چلو مجھے دکھلاؤ تاکہ میں خود آپؐ کے روئے انور کو دیکھ لوں۔ جب اس نے آپؐ کو دیکھ لیا تو بولی کل مصیبة بعدک جلل جب آپ زندہ وسلامت ہیں تو اس کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انور ہمیں اپنے مال واولاد اور والدین اور پیاس میں سرد پانی سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ اہل مکہ جب زید بن دثنہ کو قتل کے لیے حرم سے باہر لے چلے تو ابوسفیان بن حرب بولا کہو زید قسم کھا کر بتلاؤ کیا اس وقت تمہیں یہ پسند ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے۔ زید نے قسم کھا کر کہا مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور یہاں آپؐ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے۔ ابوسفیان کہنے لگا میں نے کسی کو اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی اس سے محبت کرتے ہیں۔

قاضی عیاض نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا آپؐ مجھے اپنے اہل و مال سب سے زیادہ محبوب ہیں مجھے آپ کی یاد آتی ہے تو صبر نہیں آتا جب تک یہاں آ کر آپ کو دیکھ نہیں لیتا اب غم یہ ہے کہ وفات کے بعد آپ تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوں گے وہاں میں آپ کو کیسے دیکھا کروں گا اس پر یہ آیت اتر آئی ﴿وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّھَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا﴾ (النساء: ۶۹) ''جو لوگ اللہ ورسول کا کہنا مانتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا کا انعام ہے یعنی نبی، صدیق، شہید اور نیک لوگ اور ان لوگوں کی صحبت ﷺ ....

(۷۸) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ ھَشَّامٍ قَالَ کُنَّا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ ھُوَ اٰخِذٌ بِیَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَہٗ عُمَرُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ لَاَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ اِلَّا مِنْ نَفْسِیْ فَقَالَ لَا وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ

(۷۸) عبداللہ بن ہشام کہتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ میں ہاتھ لیے ہوئے تھے۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ مجھے اپنی جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔ آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب تک تم کو میں اپنی جان سے بھی

﴿.... بڑی غنیمت ہے۔'' آپؐ نے اسے بلا کر یہ آیت سنا دی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں معیت سے مراد صرف جنت میں معیت ہے جہاں ہر وقت حاضر ہو کر آپ کا دیدار ممکن ہوگا۔ خاص آپ کے مقام و منزل میں معیت مراد نہیں روایت ہے کہ عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو صاحب الاذان کہے جاتے تھے اپنے باغ میں کچھ کام کر رہے تھے دفعۃً ان کے فرزند پہنچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سنائی اسی وقت انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور کہا اے اللہ مجھے نابینا کر دے کہ ان آنکھوں سے اب کسی کو نہ دیکھ سکوں۔

یہ اور اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو آپؐ سے ایسی ہی محبت تھی جیسا کہ حدیث میں موجود ہے۔ بدقسمتی سے اگر کسی کو یہ مقام حاصل نہیں تو وہ ان کی محبت میں تاویل نہ کرے جن کو یہ مقام حاصل تھا۔

(۷۸) * یہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صداقت تھی کہ انہوں نے اپنا اندرونی کھوٹ دربار رسالت میں صاف صاف کہہ ڈالا اور یہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال تھا کہ ایک سیکنڈ میں آپ نے ایمان کے تمام ارتقائی مدارج انہیں طے کرا دیئے۔ وہ سینہ جو ابھی اپنی جان کو عزیز تر سمجھ رہا تھا دوسری ساعت آنے نہیں پاتی کہ رسولؐ کی ذات کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھنے لگتا ہے۔ کہنے کو تو یہ دو ہی فقرے ہیں۔ مگر آپ کی فیض صحبت کی یہ برقی تاثیر عقل انسانی کے لیے موجب حیرت بن رہی ہے اب سوچو کہ جہاں سیکنڈوں کی صحبت کے آثار یہ ہوں وہاں ہفتوں، مہینوں اور سالوں کے اثرات کیا ہوں گے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

اس مضمون کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے پہلے اس پر غور کیجئے پھر حدیث کا مطلب سمجھئے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا اٰبَآءَکُمْ وَ اِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَ تِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَ مَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ جِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ وَ اللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ﴾ (توبہ: ۲۳-۲۴)

''اے مؤمنو! اگر تمہارے باپ، بھائی، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھتے ہوں تو انہیں اپنا دوست نہ بناؤ اور جو ایسا کرے گا تو یہی لوگ ظالم ہوں گے اے پیغمبر! آپؐ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ، اولاد، بھائی، بیبیاں، کنبہ، تمہارا مال، جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ ہے، تمہارے رہنے کے مکان جو تمہیں بہت پسند ہیں یہ سب چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو خدا کو کرنا ہے تمہارے سامنے آ جائے۔ خدا فاسقوں پر ہدایت کی راہ نہیں کھولتا۔'' ﴿....

بِيَدِهٖ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْكَ مِنْ نَفْسِكَ فَقَالَ عُمَرُ فَاِنَّكَ الْاٰنَ وَ اللّٰهِ اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ فَقَالَ الْاٰنَ يَا عُمَرُ.

(رواہ البخاری فی الایمان و النذور)

زیادہ محبوب نہ ہوں تم مؤمن نہیں ہو' عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا اچھا اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے آپ نے فرمایا تو اب پکے مؤمن بھی ہو گئے۔

(اس حدیث کو بخاری نے کتاب الایمان والنذور میں روایت کیا ہے)

ﷺ.... آیت بالا میں تفصیل کے ساتھ ان جملہ عواقب کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ جو اسلامی زندگی اختیار کر لینے کے بعد غیر متوقع نہیں ہوتے یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے بھائی اپنے بھائی سے شوہر اپنی بی بی سے علیحدہ ہو جائے کنبہ قبیلہ روٹھ جائے اپنا جمع کیا ہوا مال ہاتھوں سے نکل جائے' چلتی ہوئی تجارت میں روڑا اٹک جائے' اپنے رہائشی اچھے اچھے مکان ترک کرنے پڑ جائیں مگر بتلاؤ ایسے وقت میں تم کس کا ساتھ دو گے اگر کہیں عزیزوں کا ساتھ دیا تو یہ اس کا ثبوت ہوگا کہ جو ایثار و قربانی کا عہد تم نے اپنے خدا سے باندھا تھا وہ غلط تھا پھر جو اس عہد شکنی کی پاداش ہو اس کا انتظار تمہیں کرنا چاہیے۔

اسلام بتلاتا ہے کہ عزیزوں کے بڑے حقوق ہیں اور سب حقوق کی رعایت کرنا انسان کا فرض ہے مگر خدا اور رسول کا حق سب سے مقدم ہے اور اسی لیے جب کسی کے حق کی ادائیگی میں ان کا حق فوت ہو تو پھر ان کا حق مقدم کرنا ہوگا۔ والدین اپنی جگہ بہت بڑے حق دار ہیں مگر خدا اور رسولؐ کا حق ان سے بہت زیادہ ہے اسی لیے آیت کے شروع میں پیرایہ بیان یہی اختیار کیا گیا ہے کہ اگر تمہارے والدین ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور خدا کے حق کو فراموش کرنے لگیں تو پھر تمہارا حق ہوگا کہ تم بھی ان کے حق کو فراموش کر دو۔ اسی لیے دوسری جگہ فرمایا:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ﴾ (مجادلہ: ۲۲)

''یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنے والے ان سے محبت رکھیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے عداوت رکھتے ہیں' اگر چہ یہ لوگ اپنے والد' اولاد' بھائی' اور کنبہ ہی کیوں نہ ہوں۔''

یہاں پر تقریباً ان ہی رشتوں کا پھر ذکر کیا گیا ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا تھا۔ ہر دو آیت میں ولایت' مودت کی ممانعت اس صورت میں ہے جب کہ ان عزیزوں میں خدا اور اس کے رسول کی عداوت اور کفر کو اسلام پر ترجیح دینے کا میلان پایا جائے۔ اور اسی وقت اسلام اپنی محبت کا امتحان لیتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یوں تو بیشتر احادیث قرآن کریم کی تشریحات ہی کا دوسرا نام ہیں مگر بعض مرتبہ کسی حدیث کے الفاظ کسی آیت کے الفاظ سے اس قدر قریب ہوتے ہیں گویا ایک ہی مضمون کی دو تعبیریں ہیں ایسے مقامات پر پہلے قرآن کریم کی آیت کا بغور مطالعہ کر لینا چاہیے پھر اسی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے۔ حضرت انسؓ کی اس حدیث کو ہم نے بارہا پڑھا اور صرف اتنا ہی سمجھا کہ یہ حدیث صرف ایمان کامل کا معیار بتلاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا اور رسول کی محبت سب محبتوں پر غالب ہونا چاہیے۔ لیکن جب آیات بالا پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس حدیث میں ایک اساسی اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے ابتدائی ماحول میں خدا اور رسول پر ایمان لانا والد اور اولاد کے درمیان سب سے بڑا تفرقہ کا سبب تھا بہت ممکن تھا کہ ان رشتوں کی محبت اسلامی سعادت کے حاصل ہونے میں مانع آتی۔ تاریخ اسلامی سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مرتبہ یہی محبتیں اسلامی قربانیوں کے لیے سد راہ بن گئی ہیں گو شاذ و نادر سہی۔ اسی کی طرف آیت ذیل میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ﷺ....

(۷۹) عَنْ اَنَسٍؓ ثَلاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلاوَةَ الْإِيمَانِ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهُ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَ اَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ اِلَّا لِلّٰهِ وَ اَنْ يَكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ. (رواہ الشیخان)

(۷۹) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا (۱) اللہ و رسول اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوں (۲) جب وہ کسی سے محبت کرے تو خدا کے لیے کرے (۳) کفر میں پھر واپس جانا اس کو اتنا ہی برا لگے جیسے کہ آگ میں داخل ہونا۔ (اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے)

ﮩ .... ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ (تغابن : ۱۴)

''اے ایمان والو! تمہاری بیبیوں اور اولاد ان میں ایسے بھی ہیں جو تمہارے لیے باعث فتنہ ہیں ان سے ذرا بچتے رہنا۔''

یہ حدیث بتلاتی ہے کہ اگر باپ کے لیے کبھی ایسا موقع آئے کہ اسلام کی وجہ سے اسے اپنی اولاد چھوڑنی پڑ جائے یا اولاد کو ایسا موقعہ ہو کہ اسے اپنے والدین ترک کرنے پڑیں تو ایمان یہ ہے کہ یہ قربانیاں کر گذرنی چاہئیں۔ یہی غلبہ محبت کے معنی ہیں' اب اسے آپ یہ حب عقلی سے تعبیر کریں یا حب شرعی سے۔ جس ماحول میں اب ہم ہیں وہ اسلامی ماحول ہے یہاں اولاد بھی مسلمان اور والد بھی مسلمان اس لیے اس طرف ذہن ہی نہیں جاتا کہ خدا اور رسول کی محبت کو والدین یا اولاد کی محبت سے کوئی تقابل ہو سکتا ہے بلکہ یہاں تو خدا اور رسول کی محبت اسی طرف اور داعی ہے کہ والدین کی محبت اور زیادہ ہو لیکن جب یہ ماحول نہیں تھا اور اسلام دنیا کو کفر کی تاریکیوں سے نور ہدایت کی طرف نکلنے کی دعوت دے رہا تھا اس وقت خدا رسول کی محبت والد و اولاد کی عداوت کے ہم معنی بنی ہوئی تھی۔ جو خدا سے محبت کرتا اسے اپنے مال و اولاد کو چھوڑنا پڑتا اور جو اپنے مال و اولاد کا ساتھ دیتا اسے خدا اور رسول سے بغاوت کرنا ہوتی۔ ایک درمیانی درجہ یہ ہو سکتا تھا کہ خدا اور رسول کی محبت کے ساتھ دشمنوں کی محبت کو بھی نبھا لیا جائے یہ حدیث اس کمزوری کو دفع کرنا چاہتی ہے اور بتلاتی ہے کہ اسلام یہ ہے کہ تم خدا اور رسول کی محبت پر سب کچھ قربان کر دو اور اس کے مقابلہ پر کسی کا ساتھ نہ دو۔

(۷۹) * اس حدیث میں تیسری بات قرآن کریم کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے ﴿وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ﴾ (الحجرات: ۷) یہ خدا کا انعام ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی ہے اور اس کو خوشنما بنا دیا ہے اور کفر' گناہ' اور نافرمانی کی نفرت پیدا کر دی ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں یہاں ایمان میں فرائض و مستحبات وغیرہ کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی ہے اور اس کے مقابلہ میں کفر فسوق و عصیان کی تفصیل اختیار کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا کہ ایمان کامل فرائض و مستحبات کے مجموعہ کا نام ہے اس لیے ایمان کی محبت یہ ہے کہ بلا تفصیل اس کے تمام احکام کی محبت ہو' اس کے مقابل حالت بعض مرتبہ کفر ہو گی اور بعض مرتبہ صرف فسوق و عصیان کی حد تک رہے گی۔ مؤمن کامل کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف کفر سے نہیں بلکہ فسق و عصیان سے بھی نفرت رکھے۔ یہ تین الفاظ اس لیے رکھے گئے ہیں کہ ہر فسق و عصیان کفر نہیں ہے اور نہ ہر عصیان فسق ہے۔ (کتاب الایمان ص ۱۷)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام اشخاص و افراد سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا۔ ہاں زشت افعال سے نفرت و بیزاری کی ضرور تعلیم دیتا ہے۔ حضرت سید الشہداء کا قاتل اسلام قبول کر کے مسلمانوں کا بھائی بن سکتا ہے اور ایک کاتب وحی مرتد ہو کر زمین و آسمان کا مبغوض بن جاتا ہے اس لیے کفر سے نفرت کرنا اسلام کی تعلیم کا جزء ہے بلکہ آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی محبت اور کفر کی نفرت دونوں باتیں لازم ہیں جسے اسلام سے محبت ہو گی اسے کفر سے نفرت اور جسے کفر سے رغبت ہو گی اسے اسلام سے نفرت ہونا ضروری ہے۔ اسلام یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ خدا کی زمین پر ایک غلط اور ظلم وعدوان کے قانون کی حمایت بھی اسی طرح کی جائے جیسا کہ عدل و انصاف کے آئین کی کی جاتی ﮩ ....

حبّ الرسول لحبّ الله

رسول کی محبت خدا کی محبت کی وجہ سے کرنا چاہیے

(۸۰) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوْكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ وَ اَحِبُّوْنِيْ

(۸۰) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ سے محبت رکھو اس لیے کہ وہ تمہیں طرح طرح کی نعمتیں عطا فرماتا ہے اور مجھ سے محبت رکھو خدا کی محبت کی وجہ سے اور میرے اہل بیت

ﷺ..... ہے اس لیے اسلام وکفر کے درمیان نہ کوئی صلح وآشتی ہوئی ہے نہ ہوسکتی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان کے لیے کافر کے ساتھ ہمیشہ برسر پیکار رہنا ضروری ہے۔ اسلام اشخاص وافراد کے لیے تو سلامتی کا پیغام ہے مگر کفر کے ساتھ کسی علاقہ کا روادار نہیں۔ اس فرق کو سمجھئے تاکہ حدیث میں نمبر۲ بھی خوب روشن ہو جائے یعنی اسلام میں محبت کا معیار بھی اشخاص وافراد نہیں بلکہ خدا اور رسول ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام اور ایمان کامل یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ غالب آجائے کہ پھر تمام عداوت ومحبت کا محور ومرکز یہی بن جائے کسی سے محبت ہو تو ان کے نام پر اور عداوت ہو تو ان کے نام پر۔

(۸۰) * اس حدیث میں خدا کی محبت کا سب سے آسان راستہ یہ بتلایا گیا ہے کہ پہلے تم ان نعمتوں کا مطالعہ کرو جو شب وروز بلا جدوجہد اور بلا کسی استحقاق کے تم کو میسر ہیں خدا کی محبت پیدا ہو جائے گی۔ جب خدا کی محبت تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گی تو رسول کی محبت کا پیدا ہونا لازم ہوگا۔ کیونکہ اس کا رشتہ خدا سے یہی ہے کہ وہ تمہارے اور اس کے درمیان پیغام پہنچانے والا ہے بادشاہوں کے درباروں میں نامہ بروں کی جتنی قدر وقیمت ہوتی ہے راہ محبت میں اس سے کہیں زیادہ ہے اس لیے رسول کی محبت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو بارگاہ محبت کا پیغامبر سمجھو جب دنیا کے ایلچیوں میں اخلاق فاضلہ واوصاف کاملہ ہونا ضروری ہیں تو خدا کے رسولوں میں کیوں ضروری نہ ہوں گے پھر اس جہت سے بھی محبت پیدا ہو جائے گی اسلام میں محبت کا اصل محور ومرکز صرف خدا کی ذات بتلائی گئی ہے اور یہی اس کی امتیازی توحید ہے کہ انسان کے قلبی علائق کے گوشے صرف اسی ایک ذات پاک کے نام پر تقسیم ہوتے ہیں۔ اسی لیے اذان واقامت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسولؐ اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے تاکہ اللہ اکبر کے بعد رسول اللہ کی عظمت ومحبت قلب میں خود بخود جاگزیں ہو جائے اور اسی لیے قرآن کریم میں ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ﴾ (ال عمران: ۳۱) ارشاد فرمایا ہے یعنی اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو۔ گویا اصل محور ومرکز خدا ہی کی محبت ہے اور اس کا صحیح معیار رسول کی اطاعت ہے اب جو شخص خدا کی محبت کا مدعی ہے مگر رسول کی عظمت ومحبت پوری طرح نہیں کرتا' یا رسول کی محبت کا دم بھرتا ہے مگر خدا کی عظمت ومحبت سے خالی ہے وہ سراسر دھوکے میں ہے۔ رسول کی محبت وعظمت اس کا احترام وادب اولین فریضہ ہے اور یہ سب اس لیے ہے کہ وہ اس باعظمت ذات کا رسول ہے جس کی تمام کائنات مخلوق ہے۔ رسول کی صحیح عظمت یہ ہے۔

اپنے خودتراشیدہ خیالات پر رسول کی محبت کرنا صحیح محبت نہیں عیسائی بھی حضرت مسیح سے محبت کرتے ہیں مگر خدا کا رسول سمجھ کر نہیں بلکہ اس کا بیٹا بنا کر کیا تم اس کو صحیح محبت کہو گے اور یہود ان سے بغض ودشمنی رکھتے ہیں مگر انہیں خدا کا دشمن سمجھ کر نہیں کیا تم اسے صحیح دشمنی کہو گے پھر صحیح دوستی اور صحیح دشمنی وہ ہے جو محض اس ایک ذات پاک کے نام پر ہو اس کے سوا محبتیں اور دشمنیاں سب آئین اسلام سے باہر ہیں۔ اس علاقہ کو ذرا اور وسعت دو تو رسول کی اولاد سامنے آتی ہے ان سے محبت اس لیے ضروری ہے کہ رسول کی محبت ضروری ہے گویا ان کی محبت پیدا کرنے کے لیے رسول کی ذات سامنے رکھنا چاہیے تو ان کی محبت آپ سے آپ پیدا ہو جائے گی جیسا کہ رسول کی محبت کے لیے خدا کی ذات ﷺ.....

لِحُبِّ اللّٰهِ وَ اَحِبُّوْ اَهْلَ بَيْتِىْ لِحُبِّىْ.

(رواه الترمذی)

(٨١) عَنْ عَبْدِالْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيْعَةَ اَنَّ الْعَبَّاسَ رضی اللہ عنہ دَخَلَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُغْضَبًا وَ اَنَا عِنْدَهٗ فَقَالَ مَا اَغْضَبَكَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا لَنَا وَ لِقُرَيْشٍ اِذَا تَلَاقَوْا بَيْنَهُمْ تَلَاقَوْا بِوُجُوْهٍ مُبْشَرَةٍ وَ اِذَا لَقُوْنَا لَقُوْنَا بِغَيْرِ ذَالِكَ فَغَضِبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰى احْمَرَّ وَجْهُهٗ ثُمَّ قَالَ وَ الَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ لَا يَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلِ الْاِيْمَانُ حَتّٰى يُحِبُّكُمْ لِلّٰهِ وَ لِرَسُوْلِهٖ ثُمَّ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ مَنْ اٰذٰى عَمِّىْ فَقَدْ اٰذَانِىْ فَاِنَّمَا عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِيْهِ. (رواه الترمذی)

(٨٢) عَنْ اُسَامَةَ رَضِىَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا اِذْ جَاءَ عَلِىٌّ وَ الْعَبَّاسُ رضی اللہ عنہ يَسْتَاْذِنَانِ فَقَالَا لِاُسَامَةَ اسْتَاْذِنْ لَنَا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِىٌّ وَ الْعَبَّاسُ يَسْتَاْذِنَانِ فَقَالَ اَتَدْرِىْ مَاجَاءَ بِهِمَا قُلْتُ لَا قَالَ لٰكِنِّىْ اَدْرِىْ اِئْذَنْ لَهُمَا فَدَخَلَا فَقَالَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

سے محبت رکھو میری محبت کی وجہ سے-

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۱) عبدالمطلب بن ربیعہ سے روایت ہے کہ حضرت عباسؓ غصہ میں بھرے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے میں اس وقت آپؐ کے پاس بیٹھا ہوا تھا آپؐ نے فرمایا اتنا غصہ کیوں ہے؟ فرمایا یارسول اللہؐ ہم میں اور قریش میں بھلا کیا فرق ہے کہ جب وہ باہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بہت خوش خوش ملتے ہیں اور جب ہم سے ملتے ہیں تو اس طرح نہیں ملتے اس پر آپؐ کو اتنا غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا پھر فرمایا اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس وقت تک آدمی کے قلب میں ایمان داخل نہیں ہوسکتا جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کی خاطر تم سے بھی محبت نہ رکھے- اس کے بعد کہا اے لوگو! دیکھو جو میرے چچا کو تکلیف دے گا اس نے مجھے تکلیف دی- آدمی کا چچا اس کے باپ ہی کے برابر ہوتا ہے- (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۲) اسامہؓ سے روایت ہے کہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے اجازت طلب کرنے لگے اور اسامہؓ سے کہا ہمارے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضری کی اجازت لے لو' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! علیؓ اور عباسؓ اجازت چاہتے ہیں آپؐ نے فرمایا بھلا جانتے ہو کیوں آئے ہیں؟ میں نے عرض کیا نہیں فرمایا لیکن میں جانتا ہوں اچھا انہیں آنے کی اجازت دے دو' وہ دونوں آ گئے اور بولے یا رسول اللہؐ ہم آپؐ کے

....کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس طرح اگر چہ محبت کا دائرہ بہت پھیلتا چلا جائے گا مگر اصل مرکزی نقطہ پھر وہی ایک ذات پاک کی محبت رہے گی اب اگر کوئی شخص رسول کی محبت کا دعوی دار ہے مگر اہل بیت کی محبت نہیں رکھتا یا اہل بیت کی محبت کا تو دم بھرتا ہے مگر خدا اور رسول کی محبت کے آثار اس میں نہیں پائے جاتے تو کیا تم اسے صحیح محبت والا کہہ سکتے ہو- رسول کا رشتہ جس طرح اہل بیت کے ساتھ ہے اسی طرح اسؐ جماعت کے ساتھ بھی ہے جس میں اس نے اپنے شب و روز گذارے جنہوں نے اس کے لیے جانیں قربان کر دیں اور اس کی رفاقت میں تمام علاقے ختم کر دینے میں تامل نہ کیا پس اگر کوئی شخص اس جاں نثار جماعت سے بغض رکھے تو کیا تم اسے رسول کا محبّ کہو گے اللہ تعالیٰ ہمیں غلو سے بچائے اور صحیح محبت کی توفیق بخشے-

جِئْنَاکَ نَسْأَلُکَ اَیُّ اَهْلِکَ اَحَبُّ اِلَیْکَ قَالَ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ قَالَ مَاجِئْنَاکَ نَسْأَلُکَ عَنْ اَهْلِکَ قَالَ اَحَبُّ اِلَیَّ مَنْ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ اَنْعَمْتُ عَلَیْهِ اُسَامَةُ بْنُ زَیْدٍ قَالَا ثُمَّ مَنْ قَالَ عَلِیُّ بْنُ اَبِیْ طَالِبٍ فَقَالَ الْعَبَّاسُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ جَعَلْتَ عَمَّکَ اٰخِرَهُمْ قَالَ اِنَّ عَلِیًّا سَبَقَکَ بِالْهِجْرَةِ.

(رواہ الترمذی)

پاس یہ دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کو اپنے گھر میں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے آپؐ نے فرمایا اپنی بیٹی فاطمہؓ سے عرض کیا یارسول اللہؐ ہم ان گھر والوں کے متعلق نہیں پوچھتے فرمایا تو پھر جس پر (اسلام کی توفیق دے کر) اللہ تعالیٰ نے احسان کیا اور (آزاد کر کے) میں نے احسان کیا یعنی اسامہ بن زید' انہوں نے عرض کیا یارسولؐ اللہ پھر اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ علی وعباسؓ، بولے یارسولؐ اللہ آپؐ نے تو اپنے چچا کو سب سے آخر نمبر میں ڈال دیا - فرمایا اس لیے کہ علیؓ ہجرت میں تم سے سبقت لے جا چکے ہیں -

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۳) عَنْ عُمَرَؓ اَنَّهُ فَرَضَ لِاُسَامَةَ فِیْ ثَلَاثَةِ اٰلَافٍ وَ خَمْسِمِائَةٍ وَ فَرَضَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فِیْ ثَلَاثَةِ اٰلَافٍ فَقَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لِاَبِیْهِ لِمَ فَضَّلْتَ اُسَامَةَ عَلَیَّ فَوَاللّٰهِ مَا سَبَقَنِیْ اِلٰی مَشْهَدٍ قَالَ لِاَنَّ زَیْدًا کَانَ اَحَبَّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَبِیْکَ وَ کَانَ اُسَامَةُ اَحَبَّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْکَ فَاٰثَرْتُ حِبَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی حِبِّیْ. (رواہ الترمذی)

(۸۳) عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وظیفہ ساڑھے تین ہزار اور اپنے بیٹے کا تین ہزار مقرر کیا تھا اس پر عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اپنے والد سے عرض کیا آپ نے اسامہ کو مجھ پر کن وجوہ کی بناء پر فوقیت دی' خدا کی قسم ہے کسی معرکہ میں وہ مجھ سے آگے نہیں بڑھ سکے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا اس بنا پر کہ اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے والد یعنی زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے والد سے زیادہ پیارے تھے اور خود اسامہ تجھ سے زیادہ پیارے تھے اس لیے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے کو اپنے پیارے پر ترجیح دی - (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

بعض علامات محبة النبی صلی اللہ علیہ وسلم محبة السنه

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی کچھ علامات

محبت سنت

(۸۴) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ قَالَ لِیْ

(۸۴) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے

---

(۸۳) ✻ مرقاۃ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عباسؓ، ابوسفیان' بلال' سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے اور اجازت طلب کی حضرت عمرؓ نے پہلے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اجازت دی - ابوسفیان نے حضرت عباسؓ سے فرمایا آپ دیکھتے ہیں کہ عمرؓ ہمارے غلاموں کو ہم سے بڑھاتے ہیں حضرت عباسؓ نے فرمایا ہم لوگ ہجرت میں پیچھے بھی رہ گئے تھے اس لیے ہماری یہی جزاء ہونا چاہیے - سبحان اللہ یہ اسلام ہے جس کے نزدیک آزاد و غلام کا کوئی فرق نہیں - بڑائی اور چھوٹائی کا مدار اسلامی جانبازی اور قربانی پر ہے -

(۸۴) ✻ عربی زبان میں غش (نصح) کی ضد ہے (نصح) کے معنی خیر خواہی ہیں - قلبی کھوٹ میں کینہ بغض عداوت وغیرہ سب لله ....

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَا بُنَیَّ اِنْ قَدَرْتَ اَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِیَ وَ لَیْسَ فِیْ قَلْبِکَ غِشٌّ لِاَحَدٍ فَا فْعَلْ ثُمَّ قَالَ یَا بُنَیَّ وَ ذٰلِکَ مِنْ سُنَّتِیْ وَ مَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَ مَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیْ فِی الْجَنَّةِ. (رواہ الترمذی)

فرمایا اے فرزند اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ صبح یا شام کسی وقت بھی تمہارے دل میں کسی کے لیے کھوٹ نہ رہے تو کر گذرو کیونکہ صاف سینہ رہنا یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ کو پسند کرتا ہے وہ ضرور میری محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

محبة العرب

عرب کی محبت

(۸۵) عَنْ سَلْمَانَ ؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تُبْغِضْنِیْ فَتُفَارِقَ دِیْنَکَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کَیْفَ اُبْغِضُکَ وَ بِکَ هَدَانَا اللّٰهُ قَالَ تُبْغِضُ الْعَرَبَ فَتُبْغِضُنِیْ.

(رواہ الترمذی و قال ھذا حدیث حسن غریب)

(۸۵) سلمانؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا دیکھو مجھ سے بغض نہ رکھنا ورنہ دین سے بالکل جدا ہو جاؤ گے' انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ بھلا آپؐ سے کیسے بغض رکھ سکتا ہوں' آپؐ ہی کے طفیل میں تو اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہدایت نصیب فرمائی ہے فرمایا عرب سے بغض رکھو گے تو مجھ سے بھی بغض رکھنے لگو گے۔

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

.... داخل ہیں۔ صاف سینہ رہنا اخلاقِ نبوۃ کا جزء ہے اور شریعت میں اس کی بہت تاکید کی گئی ہے اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی ایک کھلی ہوئی علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ آپؐ کے تمام اوضاع واطوار نظروں میں محبوب ہو جائیں' عبادت کرنا ہر انسان کا فرض ہے اور ہر مسلمان اس میں آپؐ کی اتباع کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن اس حدیث میں محبت کا ایک اور بلند معیار بتلایا گیا ہے وہ یہ کہ عبادات کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات ونفسیات وطبعیات بھی نظروں میں قابل اتباع بن جائیں۔ بلکہ وہ غیر اختیاری جذبات جو اپنے مخالف کے لیے قلب میں موجزن ہوتے ہیں اس لیے قلب میں جمنے نہ پائیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے خلاف ہیں۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ آپؐ کی محبت رگ رگ میں سرایت کر چکی ہو ؎

آئین ما است سینہ چوں آئینہ داشتن   کائینہ ہر چہ دید فراموش می کند

جنت میں آپؐ کے ساتھ ہونے کا مطلب ٹھیک اسی منزلہ ومرتبہ میں ہونا نہیں ہے بلکہ زیارت وملاقات کی سہولت مراد ہے۔ جنت تمام کی تمام ایک مکان کی مثال ہے اور اس میں رہنے والے سب ایک ہی جگہ رہنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ علاقہ محبت کا اثر یہ ہے کہ جنت میں ہر شخص کا مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام سے اپنی علاقہ محبت کے بقدر قریب رکھا جائے گا۔

(۸۵) * ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ اسلام میں محبت کا مرکز صرف اللہ کی ذات ہے پھر جہاں تک بھی اس کی شاخیں پھیلتی ہیں سب کا منشا وہی ذات پاک رہتی ہے۔ رسول کی محبت خدا کی محبت کی وجہ سے ہے اور عرب کی محبت اس لیے ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ رسول کا محبوب وطن اور محبوب قوم ہے' محبت اور عداوت دونوں متعدی صفات ہیں' جب محبت پیدا ہوتی ہے تو اپنے اطراف میں بھی پھیلتی ہے یہی حال عداوت کا ہے حتی کہ ایک شخصیت کی وجہ سے تمام جہان نظروں میں محبوب یا دشمن بن جاتا ہے۔ عرب کی محبت اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے تو پھر ان کی دشمنی یقیناً آپؐ سے اندرونی بغض ہی کا نتیجہ ہوگی۔ عرب کے کسی خاص شخص سے اس کی بداعمالی کی وجہ سے عداوت ....

(۸۶) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ لِاَنِّيْ عَرَبِيٌّ وَ الْقُرْاٰنُ عَرَبِيٌّ وَ كَلَامُ اَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ. (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

(۸۶) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے عرب سے تین باتوں کی وجہ سے محبت رکھو اس لیے کہ میں عربی ہوں' اس لیے کہ قرآن عربی ہے اس لیے کہ اہل جنت کی گفتگو عربی زبان میں ہوگی۔
(اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے)

و فى حب العرب احاديث كثيرة بعضها صححه الحاكم و قال الذهبى الحديث ضعيف لا صحيح و لا موضوع تذكرة الموضوعات ص ۱۱۲ - و فى آخر الرقاق من المستدرك و احب العرب من قلبك - قال الذهبى صحيح المستدرك - (ج ٤ ص ۲۳۲)

محبة الصحابة و الانصار و اهل البيت رضوان الله تعالى عليهم اجمعين

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین انصار اور اہل بیت کی محبت

(۸۷) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِيْ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَ مَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ وَ مَنْ اٰذَاهُمْ فَقَدْ اٰذَانِيْ وَ مَنْ اٰذَانِيْ فَقَدْ اٰذَى اللّٰهَ فَيُوْشِكُ اَنْ يَّاْخُذَهٗ. (رواه الترمذى و قال هذا حديث غريب)

(۸۷) عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتاکید فرمایا کہ میرے صحابہؓ کے بارے میں خدا کا خوف رکھنا اور میرے بعد ان کو ہدف ملامت نہ بنانا (یاد رکھو) جو ان سے محبت رکھے گا وہ میری وجہ سے محبت رکھے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ میری وجہ سے بغض رکھے گا' جو ان کو تکلیف دے گا اس نے گویا مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے خدائے تعالیٰ کو تکلیف دینے کا ارادہ کیا تو قریب ہے کہ وہ گرفت کر لے۔
(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

لہ .... عرب کی عداوت نہیں کہلاتی' عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہے اس لحاظ سے ہمیشہ نظروں میں محبوب ہے جیسا کہ اپنی اولاد کہ اس کی محبت کسی صورت بھی جدا ہونے والی نہیں۔ جو بغض بدعملی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس کا سبب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے وہ اور بات ہے۔

حدیث و قرآن کو نہایت سادگی سے سمجھنا چاہیے اس میں قیدیں لگا لگا کر شبہات پیدا کرنا کجروی ہے کسی محترم ہستی کی وجہ سے اس کے وطن اس کی زبان اس کے طور طریق کا احترام نظروں میں سما جانا ایک فطری بات ہے اسی رشتہ کی وجہ سے صحیحین میں انصار کی محبت کو ایمان کی علامت کہا گیا ہے اور اسی نظر سے یہاں عرب کی محبت کا امر فرمایا گیا ہے اب اس وطن و قوم کے حدود کہاں تک ہیں یہ بات اپنے اپنے تعلق اور محبت کی گہرائی اور خارجی تفصیل پر موقوف ہے۔ رسول کی محبت اگر سچ سچ دل میں ہے تو اس کے تقاضے پورے کرنے پڑیں گے۔

(۸۷) ❋ شرح السنہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امت میں میرے صحابہ کی مثال ایسی ہے جیسا کھانے میں نمک کی' بھلا کوئی کھانا بلا نمک درست ہو سکتا ہے۔ حسنؓ فرماتے ہیں کہ ہمارا نمک ہی ختم ہوا تو بتلاؤ ہم کہاں سے درست ہوں۔ (مشکوۃ شریف)

(۸۸) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اَلْاَنْصَارُ لَا يُحِبُّهُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَ لَا يُبْغِضُهُمْ اِلَّا مُنَافِقٌ فَمَنْ اَحَبَّهُمْ اَحَبَّهُ اللّٰهُ وَ مَنْ اَبْغَضَهُمْ اَبْغَضَهُ اللّٰهُ. (متفق علیه)

(۸۸) براءؓ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے انصار سے کوئی محبت نہیں رکھے گا مگر مؤمن اور ان سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق جو ان سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ بھی اس سے بغض رکھے گا۔
(یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(۸۹) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأٰى صِبْيَانًا وَ نِسَاءً مُقْبِلِيْنَ مِنْ عُرُسٍ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اَنْتُمْ مِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ اَللّٰهُمَّ اَنْتُمْ مِنْ اَحَبِّ النَّاسِ اِلَيَّ. يعنى الانصار (متفق علیه)

(۸۹) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بچوں اور عورتوں کو ایک شادی سے واپس آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا۔ سب لوگوں میں تم مجھے بہت ہی محبوب ہو بہت ہی محبوب ہو۔ راوی کہتا ہے کہ یہ خطاب آپ کا انصار کے بچوں اور عورتوں کو تھا۔
(یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(۹۰) عَنِ الْبَرَاءِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ عَلٰى عَاتِقِهٖ يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ. (متفق علیه)
و فى رواية عن ابى هريرة عندهما اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ وَ اَحِبَّ مَنْ يُحِبُّهٗ.

(۹۰) براءؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حضرت حسنؓ آپ کے کاندھے پر ہیں اور ان کے لیے آپؐ یہ دعا فرما رہے ہیں اے اللہ میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور ابو ہریرہؓ کی ایک روایت میں شیخین نے یہ روایت کیا ہے اے اللہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے ان سے بھی محبت فرما۔

---

(۸۸) * احبه الله اور ابغضه الله کو اگر جملہ دعائیہ بنا دیا جائے تو بھی ممکن ہے یعنی خدا ان سے محبت کرے اور خدا ان سے بغض رکھے۔ اس حدیث کی تشریح کتاب الایمان میں کی جا چکی ہے۔

(۸۹) * مہاجرین تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ و خاندان تھے۔ انصار نے غیر ہو کر جو آپؐ کی مدد کی اس میں خدا کے رسول سے محبت کے سوا اور کیا جذبہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے ہر موقعہ پر آپؐ بھی ان سے محبت آمیز کلمات فرما کر ان کی ہمت افزائی فرمایا کرتے اور یہ بتلایا کرتے تھے کہ خدا کے رسول کو ان کی اس جاں نثاری کی کتنی قدر ہے۔

(۹۰) * رسول کی محبت رکھو گے تو خدا کی محبت پیدا ہو جائے گی اور اگر رسول تم سے محبت کرے گا تو تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے اسی لیے قرآن کریم میں فرمایا: ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (ال عمران: ۳۱) اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ سے تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اس آیت میں اتباع رسول کا ثمرہ خدائے تعالیٰ کی محبوبیت قرار دیا گیا ہے۔ یہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ درخواست کی ہے کہ وہ انہیں اپنا محبوب بنا لے۔ اصل یہ ہے کہ محبت میں خدا اور رسول کے درمیان تفریق نہیں ہو سکتی۔ ایک کا محبّ دوسرے کا محبّ ہے اور ایک کا محبوب دوسرے کا محبوب بن کر رہتا ہے۔ پہلے روایت میں گذر چکا ہے کہ اہل بیت کی محبت کا اصل رشتہ خدا کے رسول ہی کی ذات مقدس ہے اسی طرح انصار، صحابہ، عرب کی محبت بھی اسی ایمانی رشتہ سے وابستہ ہے۔

محبة كل ما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحبه

(۹۱) عَنْ عُبَيْدِ بْنِ جُرَيْجٍ اَنَّهُ قَالَ لِا بْنِ عُمَرَ رَأَيْتُکَ تَلْبَسُ النِّعَالَ السبتية قَالَ اِنِّیْ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِیْ لَیْسَ فِیْهَا شَعْرٌ وَ یَتَوَضَّأُ فِیْهَا فَاَنَا اُحِبُّ اَنْ اَلْبَسَهَا.

(رواه الترمذی وغیرہ)

(۹۲) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ اِنَّ خَيَّاطًا دَعَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِطَعَامٍ صَنَعَهُ فَقَالَ اَنَسٌ فَذَهَبْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلٰى ذَالِکَ الطَّعَامِ فَقَرَّبَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُبْزًا مِنْ شَعِيْرٍ وَ مَرَقًا فِيْهِ دُبَّاءٌ وَ قَدِيْدٌ قَالَ اَنَسٌ فَرَأَيْتُ

آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرغوب چیز کا مرغوب ہو جانا

(۹۱) عبید بن جریج رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپؓ ہمیشہ بے بال چمڑے کے چپل پہنا کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی چپل پہنے دیکھا تھا جس پر بال نہ ہوا کرتے تھے اس لیے مجھے بھی ایسے ہی چپل پہننا پسند ہیں۔

(اس حدیث کو ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے)

(۹۲) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کچھ کھانا تیار کیا اور آپؐ کی دعوت کر دی۔ میں بھی آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے پر گیا۔ انہوں نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو کی روٹی اور شوربا پیش کیا جس میں لوکی اور گوشت کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوکی کے ٹکڑے پیالے میں چاروں طرف تلاش کر رہے

---

(۹۲) ٭ عام محبت بھی جب رسوخ پیدا کر لیتی ہے تو نفسیات وطبعیات بلکہ شکل وشباہت پر اس کا اثر پڑنے لگتا ہے۔ جس محبت کا نام ایمان ہے اس میں چونکہ عقیدت بھی شامل ہو جاتی ہے اس لیے اس کی تاثیر بھی کچھ اور ہے۔ شیخ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں۔ ذكر اصحابنا ان من قال كان النبى صلى الله عليه وسلم يحب القرع فقال اخر لا احب القرع يخشى عليه من الكفر. (ج۵ ص ۴۴۶) ہمارے اصحاب نے بیان کیا ہے اگر کوئی شخص کہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوکی پسند فرماتے تھے اور اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص بول اٹھے کہ مجھے تو لوکی پسند نہیں ہے تو اس بے محل انکار پر اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک مرتبہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مؤمن کے لیے امراض میں مبتلا ہونے اور اس پر صبر کے ثواب کا ذکر فرمایا تو ایک شخص نے کہا یا رسول الله وما الاسقام والله ما مرضت قط فقال فقم عنا فلست منا. (ابوداؤد) یارسول اللہ میں تو بیماری کا نام بھی نہیں جانتا اور نہ خدا کی قسم اب تک کبھی بیمار پڑا ہوں۔ آپ نے فرمایا جا ہمارے پاس سے اٹھ جا تیرا ہم سے کوئی واسطہ نہیں یا جیسا صحیح مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکنے کی ممانعت کی ہے ان کے ایک فرزند نے کہا۔ ہمارے زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں ہم تو ضرور روکیں گے اس پر ابن عمرؓ نے اتنا برا بھلا کہا کہ شاید کبھی عمر بھر کسی کو نہ کہا تھا اور مسند امام احمد میں ہے کہ پھر مرتے دم تک ان سے بات نہ کی۔ ان سب مقامات پر بات خواہ کتنی ہی سچی ہو مگر انداز چونکہ گستاخانہ تھا اس لیے دونوں جگہ عتاب ہوا۔ ایسے وقت جب کہ رسول مسلمانوں کے حق میں بیماری کے فضائل بیان کر رہا ہے یہ کہنا کہ ....

النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَتَبَّعُ الدُّبَّاءَ حَوَالِی الصَّحْفَةِ فَلَمْ اَزَلْ اُحِبُّ الدُّبَّاءَ مِنْ یَوْمَئِذٍ. (رواه الشیخان و فی روایة للترمذی) قَالَ اَنَسٌ فَمَا صُنِعَ لِیْ طَعَامٌ اَقْدِرُ عَلٰی اَنْ یُّصْنَعَ فِیْهِ دُبَّاءٌ اِلَّا صُنِعَ.

ہیں بس اس دن سے لوکی مجھے محبوب ہوگئی۔
(اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے)
اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے۔
انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے جس سالن میں بھی میں لوکی ڈلوا سکتا تھا ڈلوا لیتا تھا۔

الزهادة فی الدنیا و ایثار الفقر علی الغنی

دنیا سے بے رغبتی اور فقر کی زندگی کو ترجیح دینا

(۹۳) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مُغَفَّلٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّکَ قَالَ اُنْظُرْ مَا تَقُوْلُ فَقَالَ وَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَاُحِبُّکَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ قَالَ اِنْ کُنْتَ صَادِقًا فَاَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا لَلْفَقْرُ اَسْرَعُ اِلٰی مَنْ یُّحِبُّنِیْ مِنَ

(۹۳) عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا میں آپؐ سے محبت رکھتا ہوں، آپؐ نے فرمایا دیکھ کیا کہتا ہے، اس نے پھر کہا خدا کی قسم میں آپؐ سے محبت رکھتا ہوں تین بار کہا۔ آپؐ نے فرمایا اگر تو سچ بولتا ہے تو پھر فقر کی تکلیفوں کے لیے اپنے واسطے ایک آہنی جھول تیار کر لے کیونکہ فقر مجھ سے محبت رکھنے والے کی طرف اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ آتا ہے جیسا نشیب میں روکا

☜ .... کہ میں تو بیماری کو جانتا بھی نہیں کسے کہتے ہیں یا حدیث رسول سن کر یہ کہنا کہ ہم تو روکیں گے خود رسول اللہ اور حدیث رسول کا صورۃً مقابلہ کرنا ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ چیز کو سن کر فوراً یہ کہنا کہ مجھے تو پسند نہیں انتہائی گستاخی و بدتہذیبی ہے اسی لیے امام ابو یوسفؒ نے تو ایسے شخص کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ اگر حب ایمانی اس درجہ پیدا ہو چکی ہے تو بالیقین آپؐ کے اوضاع و اطوار نفسیات و طبعیات بھی بدل جائیں گے اگر یہ مقام حاصل نہیں ہے تو معارضہ و مقابلہ کرنے کی حاجت بھی کیا ہے اگر آپ کو لوکی مرغوب نہیں ہے نہ سہی، انگریز کی محبت میں آپ نے اپنے لباس و طعام شکل و شباہت کا جو حال بنا ڈالا ہے ایک مرتبہ ذرا اس پر غور کر لیجئے۔ پھر جو حال یہاں آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرغوبات کے متعلق سنا یہی حال مکروہات کا بھی سمجھ لینا چاہیے۔

(۹۳) ✽ (تجفاف) لغت میں اس زرہ یا جھول کو کہتے ہیں جو جنگ میں گھوڑے کی حفاظت کے لیے اس پر ڈال دی جاتی ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعویٰ محبت رکھتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ آپؐ کی ہمرنگ زندگی اختیار کرے۔ اپنا پیٹ کاٹ کر بھوکوں کو کھانا کھلا دے اور خود بھوکا رہ جائے۔ پانی دوسرے پیاسوں کو پلا دے اور خود پیاسا رہ جائے۔ اپنی سواری دوسرے ضرورت مند پیادوں کو دے دے اور خود پیدل چلے۔ غرض اپنا مال و اسباب سب دوسروں کو تقسیم کر ڈالے ان کو غنی بنا دے اور خود فقیر بن جائے۔

حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کے رسول کی محبت رکھنے والے فقیر ہی ہوتے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ دوسروں کی ہمدردی میں وہ اپنی زندگی خود فقیرانہ بنا لیتے ہیں۔ دنیا میں ہر غمزدہ کا غم ان کے لیے موجب غم ہوتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ دوسرے بھوکے ہوں یہ شکم سیر، دوسرے پیاسے ہوں یہ سیراب، دوسرے ننگے پھریں اور یہ لباس فاخرہ پہنیں۔ اب اگر کوئی شخص اتنا وسیع ظرف رکھتا ہے کہ وہ ☜ ....

السَّيْلِ اِلٰى مُنْتَاهُ. (رواہ الترمذی)
وَ قَالَ هٰذَا حَدِيْثٌ حسن غريب و فی حديث ابی سعيد و حسنه اِنَّ الْفَقْرَ اِلٰى مَنْ يُّحِبُّنِىْ مِنْكُمْ اَسْرَعُ مِنَ السَّيْلِ مِنْ اَعْلَى الْوَادِىْ.

پانی - (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)
اور اس کو حسن غریب کہا ہے اور ابو سعیدؓ کی حدیث میں یہ لفظ ہیں بلاشبہ فقر اس شخص کی طرف جو تم میں مجھ سے محبت رکھتا ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ آتا ہے جیسا وادی کی بلندی سے پانی -

ارتكاب المعصية لاينا فی محبة الله و رسوله

گنہگار کو بھی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت ہو سکتی ہے

(الف۹۴) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَجُلًا عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِسْمُهٗ عَبْدُاللّٰهِ وَ كَانَ يُلَقَّبُ حِمَارًا وَ كَانَ يُضْحِكُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَلَدَهٗ فِى الشَّرَابِ

(الف۹۴) عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص تھا اس کا نام عبداللہ اور اس کا لقب حمار تھا - وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شراب پینے کے جرم میں ایک مرتبہ اس کے کوڑے لگانے کا حکم دے چکے تھے - ایک دن پھر اسی شکایت میں وہ دوبارہ گرفتار ہو کر آپؐ کے سامنے پیش ہوا پھر اس کے کوڑے لگائے جانے کا حکم دیا گیا کوڑے لگا دیئے گئے

ﷺ .... اپنی تمام راحت و رفاہیت کو دوسروں پر قربان کر دے تو بے شک اس کو آپ کی محبت کا دعویٰ کرنا چاہیے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سچے مدعی محبت کو مصائب و آلام کی یہ تمام وادیاں عبور کرنی ہونگی اور بخوشی عبور کرنی ہوں گی - اب اگر کوئی باہمت ہے تو آئے اور اس میدان میں قدم رکھے ورنہ وہ اپنے دعوے میں سچا نہیں سمجھا جا سکتا۔

کوتاہ دیدگان ہمہ راحت طلب کنند — عاشق بلا کہ راحت او در بلاءِ تست

اس کے بعد اب اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ اور اولیاء کرام کا تذکرہ پڑھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلام میں دولت درحقیقت غربا کے لیے ہمیشہ ایک رزرو بینک کی حیثیت میں سمجھی گئی ہے -

(الف۹۴) * ہر دور میں کچھ لوگوں کے مزاج میں خوش طبعی کا مضمون ہوتا ہے اور اپنے اسی طبعی مزاج کے مطابق وہ جہاں بیٹھتے ہیں ہنسی کی باتیں کیا کرتے ہیں - اگر اتنی بات اپنے حدود میں رہ کر ہو تو چنداں معیوب بھی نہیں - فتح الباری میں ان کے مذاق کی ایک دلچسپ داستان بھی مذکور ہے ملاحظہ کیجئے - حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خیبر کا ہے - عرب کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی اور اسی لیے اس کی حرمت بھی آہستہ آہستہ نازل ہوئی ہے - اسی درمیان میں بعض آزاد طبائع سے اس میں تساہل ہو گیا ہے مگر اس تساہل کا شرعی نتیجہ پھر بھی انہیں بھگتنا پڑا ہے - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا منشاء یہ ہے کہ اگر کوئی نو آموز 'کمزور فطرت' کسی صبر آزما منظر کو دیکھ کر استقامت نہیں دکھلا سکا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس پر لعنت برسائی جائے اور بجائے دعا کے اس کے لیے اور بددعائیں کی جائیں - یہ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک طرف قلب میں خدا و رسول کی محبت کی تڑپ بھی موجود ہو اور دوسری طرف تقاضائے محبت کے علمی استحضار میں کچھ قصور رہے اور اس لیے اس تڑپ کا پورا پورا اقتضاء پورا نہ ہو سکے - ﷺ ....

فَاُتِیَ بِہٖ یَوْمًا فَاُمِرَبِہٖ فَجُلِدَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ اَللّٰھُمَّ الْعَنْہُ مَا اَکْثَرَ مَا یُؤْتیٰ بِہٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَلْعَنُوْہُ فَوَا للّٰہِ مَا عَلِمْتُ اَنَّہٗ یُحِبُّ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ.

(رواہ البخاری)

اس پر ایک شخص بولا یہ شراب کے مقدمہ میں کتنا کثرت سے گرفتار کر کر کے لایا جاتا ہے (اور باز نہیں آتا) اے خدا تو اس پر لعنت فرما' یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر لعنت مت برساؤ' بخدا میں جانتا ہوں کہ یہ خدا اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔

(اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

ثواب محبة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثمرہ

(۹۴ب) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَتَی السَّاعَۃُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا

(۹۴ب) انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا قیامت کے لیے بھلا تو نے کیا تیار کر رکھا ہے؟ اس نے عرض کیا کچھ نہیں نہ بہت سی نمازیں

.... اسی قسم کے ایک دوسرے واقعہ میں مذکور ہے کہ صحابہؓ نے اس شخص کو اخزاک اللّٰہ (خدا تجھے رسوا کرے) کہہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاتقولوا ھکذا' لاتعینوا علیہ الشیطان (بخاری) اور دوسری روایت میں ہے و لکن قولو اللھم اغفرلہ اللّٰھم ارحمہ (ابوداؤد) یہ کلمات مت کہو اور اس کے مقابلہ میں شیطان کی اعانت مت کرو۔

وہ بھی اس کو شراب پلا کر رسوا کرنا چاہتا تھا۔ تم بھی بددعائیں کر کے اس کا مقصد پورا کرنا چاہتے ہو مناسب یہ ہے کہ اس کے لیے مغفرت اور رحم کی دعا کرو' بالخصوص جب کہ وہ شراب خواری کی پاداش بھگت بھی چکا ہے' امام بخاریؒ نے اس حدیث پر حسب ذیل باب قائم کیا ہے۔ باب مایکرہ من لعن شارب الخمر و انہ لیس بخارج من الملۃ شراب خوار پر لعنت کرنا پسندیدہ نہیں ہے (بالخصوص جب کہ اس پر حد بھی قائم ہو چکی ہو) اور اس وجہ سے وہ خارج از ملت بھی نہیں ہوتا۔ امام بخاریؒ کی غرض کی تفصیل فتح الباری میں دیکھی جائے۔ معتزلہ کے لیے بالخصوص یہ حدیث قابل غور ہے جو مرتکب کبیرہ کو ایمان کے دائرہ سے باہر سمجھتے ہیں۔

(۹۴ب) * حدیث کا آخری جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے۔ از انجملہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں جب کہ صحابہؓ نے ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا تھا جو کسی جماعت سے محبت تو رکھتا ہے مگر ان کے سے عمل نہیں کر سکا۔ آپ نے انہیں یہی جواب دیا تھا المرء مع من احب قیامت میں آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے دنیا میں محبت رکھتا تھا۔ یہاں بھی اسی جملہ کا اعادہ فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی آئین میں محبت کا صلہ معیت ہے اور درحقیقت ایک عاشق کی منتہائے تمنا اس کے سوا اور ہے بھی کیا۔ اسی لیے بعض روایات میں حدیث مذکور کے آخر میں ہے قال انس فما رأیت المسلمین فرحوا بشیء بعد الاسلام فرحھم بھا۔ انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسلام کے بعد صحابہ کو اتنا خوش ہوتے ہوئے کسی بات پر نہیں دیکھا جتنا کہ اس خوشخبری پر۔ صاحب مشکوٰۃ نے بیہقی کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے اس معیت کی مزید تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لو ان عبدین تحابا فی اللّٰہ عزوجل و احد فی المشرق و اخرفی المغرب لجمع اللّٰہ بینھما یوم القیامۃ الخ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دو شخص جن میں ایک مشرق اور دوسرا مغرب کا رہنے والا خدا کے لیے محبت کریں تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ دونوں کو ایک جگہ جمع کر دے گا۔ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں المرء علی دین خلیلہ فلینظر احد کم من یخالل۔ آدمی اپنے دوست ....

اَعْدَدْتَ لَهَا قَالَ مَا اَعْدَدْتُ لَهَا مِنْ كَثِيْرِ صَلٰوةٍ وَ لَا صَوْمٍ وَ لَا صَدَقَةٍ وَ لٰكِنِّيْ اُحِبُّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ قَالَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ.

(رواه البخاری)

ہیں نہ روزے اور نہ صدقے' ہاں ایک بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا تو پھر (قیامت میں) تو ان کے ہی ساتھ ہوگا جن سے تجھے محبت ہے۔

(اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

(۹۵) عَنْ صَفْوَانَ بْنِ قُدَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ هَاجَرْتُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَيْتُهُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَاوِلْنِيْ يَدَكَ اُبَايِعْكَ فَنَاوَلَنِيْ يَدَهُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اُحِبُّكَ قَالَ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ.

(رواه القاضی فی الشفاء)

(۹۵) صفوان بن قدامہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ہجرت کر کے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ لایئے اپنا ہاتھ لایئے میں آپؐ سے بیعت کروں۔ آپؐ نے اپنا دست مبارک بڑھا دیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپؐ سے محبت ہے آپؐ نے فرمایا جس سے محبت ہوگی' آدمی اسی کے ساتھ ہوگا۔

(اس حدیث کو شفا میں روایت کیا ہے)

.... کا دین اختیار کرتا ہے اس لیے خوب دیکھ بھال کر دوستی کرے کس سے کرتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محبت کا ثمرہ صرف اخروی معیت نہیں ہے بلکہ اس معیت کے آثار اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر آخرت کی معیت اسی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ جس طرح محبت کا نتیجہ معیت ہے اسی طرح معیت کا نتیجہ محبت ہے۔ اگر صحیح طور پر کسی کی معیت میسر آ جائے تو اس کی محبت بھی پیدا ہونا لازمی ہے اس لیے جس طرح دوستی کرنے میں احتیاط ضروری ہے اسی طرح معیت میں بھی احتیاط لازم ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر جنس کی معیت اس کی محبت کا موجب بن جائے۔ یہ اصول صرف آخرت کے لیے نہیں دنیوی زندگی کے لیے بھی بہت کارآمد ہیں۔

(۹۵) * احادیث میں محبت کی جزاء معیت بتلائی گئی ہے اور قرآن کریم میں معیت اطاعت کا صلہ قرار دیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحیح محبت اطاعت ہی کا نام ہے۔ دعویٰ محبت اور نافرمانی یہ دو باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ نافرمانی یہ ہے کہ جان بوجھ کر خلاف کرنا' بھول چوک' غلطی' فطری کمزوری' نافرمانی نہیں ہے اسی لیے پہلی صورت میں ندامت نہیں ہوتی اور ان سب صورتوں میں ندامت ہوتی ہے پھر محبت کے بھی مراتب ہیں ہر مرتبہ کا تقاضہ علیحدہ ہے اس کے ثمرات بھی جدا ہیں اور ان مراتب کے بقدر معیت کے بھی مراتب ہیں جس کی محبت جتنی سچی اور زیادہ ہوگی اس کو معیت بھی اسی کے موافق نصیب ہوگی۔

یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے مطیعین کے لیے صالحین سے لے کر انبیاء علیہم السلام کی معیت تک کا وعدہ فرمایا ہے مگر کسی ایک جگہ بھی نبوۃ کا وعدہ نہیں فرمایا صحابہ کرام دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی تھے ان میں صدیق' شہید' صالح بہت ہوئے مگر نبی کوئی نہیں بنا۔ پس معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ رہنے سے نبوت نہیں ملتی یہ صرف خدائے تعالیٰ کے عطا کی بات ہے اور یہ ہم کو بتلا دیا گیا ہے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ منصب کسی کو نہیں ملے گا بلکہ دنیا ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ختم ہو جائے گی۔

(۹۶) عَنْ عَائِشَةَ ؓ كَانَ رَجُلٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ اِلَيْهِ لَا يَطْرِفُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَالُكَ قَالَ بِاَبِيْ اَنْتَ وَ اُمِّيْ اَتَمَتَّعُ بِالنَّظْرِ اِلَيْكَ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ رَفَعَكَ اللّٰهُ بِتَفْضِيْلِكَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى ﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء:٦٩)

(رواه الطبرانی و ابن مردویه کما فی الشفاء)

(۹۶) حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ٹکٹکی لگائے ایک نظر دیکھ رہا تھا پلک تک نہ جھپکاتا تھا آپ نے فرمایا تجھے یہ کیا ہو گیا ہے اس نے کہا میرے ماں باپ آپ ؐ پر قربان آپ کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا ہوں جب قیامت آئے گی اس وقت تو اللہ تعالیٰ آپ ؐ کی فضیلتوں کی وجہ سے آپ کو بلند بلند مراتب مرحمت فرمائے گا (پھر ہم کہاں اور آپ ؐ کہاں) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی حکم برداری کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہی ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی نبی، صدیق، شہداء اور صالحین اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں۔

(اس حدیث کو طبرانی اور ابن مردویہ نے روایت کیا ہے)

توقير النبی صلی اللّٰه علیه وسلم واجلاله

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر و تعظیم کرنا

(۹۷) قَالَ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ ؓ مَا كَانَ اَحَدٌ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ لَا اَجَلَّ فِيْ عَيْنَيَّ وَ مَا كُنْتُ اُطِيْقُ اَنْ اَمْلَاَ عَيْنَيَّ مِنْهُ اِجْلَالًا لَهٗ حَتّٰى لَوْ قِيْلَ لِيْ صِفْهُ مَا اسْتَطَعْتُ اَنْ اَصِفَهٗ.

(رواہ فی الشفاء و شرح المواهب)

(۹۷) عمرو بن العاص ؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے کوئی محبوب نہ تھا اور نہ آپ سے زیادہ میری آنکھوں میں کوئی بزرگ و برتر تھا۔ میں آپ کے جلال و بزرگی کی وجہ سے آپ کو آنکھیں بھر کر نہ دیکھ سکتا تھا حتیٰ کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ کیسے تھے تو میں آپ کی صورت بیان نہیں کر سکتا۔

(اس حدیث کو شفا اور شرح مواہب میں روایت کیا ہے)

---

(۹۷) ٭ محبت و اجلال دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایمان بالرسول یہ ہے کہ رسول کی محبت اتنی ہو کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو سکے اور نظروں میں اس کی عقیدت و بزرگی اتنی ہو کہ دوسرے کے لیے اس میں گنجائش نہ رہے صرف محبت جرأت و گستاخی ہے اور محض جلال و عظمت بے نمک عقیدت ہے۔ محبت میں ادب اور عظمت میں محبت ملحوظ رہے ایمان یہ ہے۔ قرآن کریم اور احادیث کو پڑھو تو دونوں تم کو یہی سکھلائیں گے کہ انسانی فرض یہ ہے کہ وہ خدا اور رسول کی پوری عظمت کرے مگر وہ عظمت نہیں جس میں صرف ادب ہو بلکہ وہ عظمت جس میں شوق بھی شامل ہو۔ مسلمانوں میں ایک فریق نے محبت میں اتنا غلو کیا کہ گستاخ بن گئے یہ جاہل صوفی ہے اور ایک فریق اعتقاد عظمت میں اتنا بڑھا کہ محبت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا یہ ملائے خشک ہے۔ راہ صواب ان دونوں کے درمیان ہے، رہے وہ لوگ جو رسول کو صرف ایک ریفارمر اور لیڈر کی حیثیت تک سمجھتے ہیں وہ نہ اس کی عظمت سے آشنا ہیں نہ محبت سے۔ جس ایمان میں خدا اور رسول کے حق نمک خواری کی معرفت بھی حاصل نہ ہو وہ کیا ایمان ہے اصل ایمان وہ ہے جو عمرو بن العاص نے حدیث مذکور میں بیان کیا ہے بقول شاعر

اشتاقه فاذا بدا   اطرقت من اجلاله ....

(۹۸) عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَخْرُجُ عَلٰى اَصْحَابِهٖ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ هُمْ جُلُوْسٌ فِيْهِمْ اَبُوْبَكْرٍ وَ عُمَرُ فَلَا يَرْفَعُ اَحَدٌ مِّنْهُمْ اِلَيْهِ بَصَرَهٗ اِلَّا اَبُوْبَكْرٍ وَ عُمَرُ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمَا فَاِنَّهُمَا كَانَا يَنْظُرَانِ اِلَيْهِ وَ يَنْظُرُ اِلَيْهِمَا وَ يَتَبَسَّمَانِ اِلَيْهِ وَ يَتَبَسَّمُ اِلَيْهِمَا.

(رواہ الترمذی)

(۹۸) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مہاجرین وانصار مع ابوبکرؓ وعمرؓ کے (جمع ہوتے تھے) آپؐ ان کے پاس باہر تشریف لاتے تو ان میں کوئی ایسا شخص نہ ہوتا جو آپؐ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکتا سوائے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وعمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کہ یہ دونوں صاحبان آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کرتے اور آپؐ انہیں دیکھا کرتے - یہ آپؐ کو دیکھ دیکھ کر مسکرایا کرتے آپؐ بھی انہیں دیکھ دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے-

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۹۹) عَنْ اُسَامَةَ بْنِ شَرِيْكٍؓ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَصْحَابُهٗؓ حَوْلَهٗ كَاَنَّمَا عَلٰى رُؤُسِهِمِ الطَّيْرُ.

(رواہ الاربعۃ و صححہ الترمذی و رواہ الترمذی فی الشمائل فی باب خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایضًا)

(۹۹) اسامہ بن شریک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ آپؐ کے صحابہ آپؐ کے اردگرد (ادباً) اس طرح بے حس وحرکت خاموش بیٹھے ہیں گویا ان کے سروں پر کوئی پرندہ (گھوم رہا) ہے-

(اس حدیث کو چار کتابوں میں روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے)-

---

؎ .... میں اس کے دیدار کا مشتاق رہتا ہوں مگر جب وہ جلوہ نما ہوتا ہے تو مارے اس کے جلال و بزرگی کے میرا سر نیچا ہو جاتا ہے اور دیدار سے پھر محروم رہ جاتا ہوں پس ایمان کو اس اشتیاق واجلال کے درمیان سمجھنا چاہیے-

(۹۸) * خالص محبت میں تکلف کی حدود اٹھ جاتی ہیں مگر ادب کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا - ابوبکرؓ وعمرؓ جب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نشاطِ خاطر کا احساس کر لیتے تو شوق نظارہ کے لیے سب سے پہلے ان کی نظریں بے تاب ہوتیں اور جب ذرا طور بدلے ہوئے دیکھتے تو سب سے پہلے آثار خوف ان ہی پر ظاہر ہوتے - ذوالیدین کے طویل قصہ میں جہاں آپؐ کو نماز کے اندر ایک سہو پیش آ گیا تھا- راوی نے خاص طور پر ان حضرات کا ذکر کر کے کہا ہے فھابا ان یکلماہ. یہ دونوں حضرات بات کرتے ہوئے ڈرے اور انہیں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سہو کے متعلق لب کشائی کرتے ہاں ایک شخص ذوالیدین تھے انہوں نے بادب واقعہ عرض کیا - یہ ادب کے ساتھ الفت اور الفت کے ساتھ ادب کے رموز ہیں- ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی -

(۹۹) * کانما علی رؤسھم الطیر - یہ ایک مثل ہے جو عرب میں انتہائی سکون کے لیے بیان کی جاتی ہے- اصل یہ ہے کہ شکاری جب کسی پرندہ کے شکار کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے اعضاء کو ساکن رکھنے کی انتہائی کوشش کیا کرتا ہے- پھر ہر سکون کے موقعہ پر اس کو بطور مثل استعمال کرنے لگے ہیں-

(۱۰۰) قَالَ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ حِيْنَ وَجَّهَتْهُ قُرَيْشٌ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْقَضِيَّةِ وَرَاٰى مِنْ تَعْظِيْمِ اَصْحَابِهٖ لَهٗ مَارَاٰى اَنَّهٗ لَا يَتَوَضَّأُ اِلَّا ابْتَدَرُوْا وَضُوْئَهٗ وَ كَادُوْا اَنْ يَقْتَتِلُوْا عَلَيْهِ وَ لَا بَصَقَ بُصَاقًا وَ لَا تَنَخَّمَ نُخَامَةً اِلَّا تَلَقَّوْهَا بِاَكُفِّهِمْ فَدَلَكُوْبِهَا وُجُوْهَهُمْ وَ لَا تَسْقُطُ مِنْهُ شَعْرَةٌ اِلَّا ابْتَدَرُوْهَا وَ اِذَا اَمَرَهُمْ بِاَمْرٍ ابْتَدَرُوْا اَمْرَهٗ وَ اِذَا تَكَلَّمَ خَفَضُوْا اَصْوَاتَهٗ عِنْدَهٗ وَ لَا يَحِدُّوْنَ اِلَيْهِ النَّظَرَ تَعْظِيْمًا لَهٗ فَلَمَّا رَجَعَ اِلٰى قُرَيْشٍ قَالَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ اِنِّيْ جِئْتُ كِسْرٰى فِيْ مُلْكِهٖ وَ قَيْصَرَ فِيْ مُلْكِهٖ وَ النَّجَاشِيَّ فِيْ مُلْكِهٖ وَ اِنِّيْ وَ اللّٰهِ مَا رَاَيْتُ مَلِكًا فِيْ قَوْمٍ قَطُّ مِثْلَ مُحَمَّدٍ فِيْ اَصْحَابِهٖ هذا بعض من حديث طويل رواه البخاری و من هذا لما اذنت قريش لعثمان فی الطواف بالبيت حين وجهه فی القضية ابی و قال ما كنت لا فعل حتی يطوف به رسول الله صلی الله عليه وسلم . ذكره اصحاب السير.

(۱۰۰) ساتویں سال جب قریش نے عروہ بن مسعودؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صلح کی گفتگو کرنے کے لیے بھیجا تو اس نے آپؐ کے صحابہ کی حیرت انگیز تعظیم کا جو نقشہ دیکھا وہ ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے- وہ وضو کرتے ہیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وضو کے پانی پر خلقت اس طرف ٹوٹ پڑتی ہے کہ اب ان میں جنگ ہوئی اور جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بلغم یا تھوک گرتا ہے تو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے چہروں اور جسموں پر مل لیتے ہیں جب ان کا کوئی بال گرتا ہے تو جلدی سے اس کو لپک لے جاتے ہیں جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی حکم دیتے ہیں تو اس کو پورا کرنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں' جب بات کرتے ہیں تو ان پر خاموشی چھا جاتی ہے کوئی شخص نظر بھر کر ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا- عروہ جب واپس ہوا تو اس نے کہا اے گروہ قریش میں نے کسریٰ و قیصر اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں' خدا کی قسم کسی بادشاہ کو اپنی رعایا کے درمیان ایسا باعظمت و رعب نہیں دیکھا جیسا اپنے رفقا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو- یہ بخاری کی طویل روایت کا ایک مختصر ٹکڑا ہے- اس واقعہ میں اصحاب سیر نے یہ اور ذکر کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قریش کے پاس بھیجا اور ان سے عمرہ ادا کرنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے کہا اے عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! اگر صرف تم چاہو تو طواف کر سکتے ہو' انہوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف کرنے سے پیشتر میں طواف کرلوں-

(۱۰۱) وَ فِيْ حَدِيْثِ طَلْحَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

(۱۰۱) طلحہؓ کے قصہ میں ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ آپؐ کی ہیبت و عظمت کی وجہ سے آپؐ سے براہ راست سوال کرتے ہوئے

(۱۰۱) * پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے ''ان میں کتنے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے جاں نثاری کا جو عہد کیا تھا سچ کر دکھایا- پھر ان میں سے بعض تو اپنی منت پوری کر گئے اور بعض ایسے ہیں جو ابھی منتظر ہیں-'' یہاں منافقین کی عہد شکنی کے برخلاف مسلمانوں کے عہد پورا کرنے کا ذکر ہے یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ و رسول کو زبان دی تو اسے پورا بھی کر دیا- ان میں سے کچھ تو اپنی منت پوری کر گئے یعنی جہاد میں جان دے چکے جیسے بدر و احد کے شہداء اور کچھ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قربان ہونے کی راہ دیکھ رہے ہیں- یہاں حضرت طلحہؓ کو بھی....

وَسَلَّمَ قَالُوْا لِاَعْرَابِيٍّ جَاهِلٍ سَلْهُ عَمَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ كَانُوْا يَهَابُوْنَهٗ وَ يُوَقِّرُوْنَهٗ فَسَالَهٗ فَاَعْرَضَ عَنْهُ اِذْ طَلَعَ طَلْحَةُ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ فَقَالَ هٰذَا مِمَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ.

(رواہ الترمذی و حسنہ)

ڈرتے تھے اس لیے انہوں نے ایک دیہاتی شخص سے کہا کہ وہ آپؐ سے دریافت کر لے کہ قرآن کریم میں ﴿فمنهم من قضىٰ نحبه﴾ (الاحزاب: ۲۳) کا مصداق کون شخص ہے۔ اس نے آپؐ سے پوچھا مگر آپؐ نے اسے جواب نہ دیا' اس اثناء میں طلحہ آ نکلے تو آپ نے فرمایا یہ وہ شخص ہیں جو آیت بالا کا مصداق ہیں۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۰۲) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الْحَلَّاقُ يَحْلِقُهٗ وَ قَدْ اَطَافَ بِهٖ اَصْحَابُهٗ فَمَا يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَقَعَ شَعْرَةٌ اِلَّا فِيْ يَدِ رَجُلٍ.

(رواہ مسلم فی حدیث طویل)

(۱۰۲) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حجام آپ کا سر مونڈ رہا ہے صحابہ آپؐ کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں اور مقصد صرف یہ ہے کہ جو بال آپؐ کے سر مبارک سے گرے' وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے۔

(اس حدیث کو مسلم میں روایت کیا ہے)

(۱۰۳) فِيْ حَدِيْثِ قَيْلَةَ فَلَمَّا رَاَيْتُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا الْقُرْفُصَاءَ اُرْعِدْتُ مِنَ الْفَرَقِ. (رواہ الترمذی فی الشمائل)

(۱۰۳) قیلہ ایک طویل حدیث میں بیان کرتی ہیں کہ جب میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرفصاء کی شکل پر بیٹھا ہوا دیکھا تو مارے خوف کے میرے جسم پر لرزہ پڑ گیا۔ (اس حدیث کو ترمذی نے شمائل میں روایت کیا ہے)

.... آپ نے ممن قضى نحبه کی فہرست میں شمار کیا گویا اسی زندگی میں ان کو شہید قرار دے دیا۔ جامع ترمذی میں جابرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا جو زمین پر چلتا پھرتا شہید دیکھنا چاہے وہ طلحہؓ کو دیکھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ یہ وہ شخص ہیں جن کا ہاتھ جنگ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں شل ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی جاں نثاری کی وجہ سے ان کو اس فہرست میں شمار کر لیا گیا جو شہید ہو چکے تھے۔

(۱۰۲) * اس حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کے ساتھ تبرک کی اصل بھی ثابت ہوتی ہے۔ خفاجی شرح شفاء میں فرماتے ہیں کہ آپؐ کا حلق کرانا صرف حج و عمرہ میں ثابت ہوتا ہے۔ حجۃ الوداع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مونڈنے اور ناخن تراشنے والے کا نام معمر بن عبداللہ عدوی ہے۔ ابن اثیر نے ان کا نام خراش بن امیہ لکھا ہے۔ اور جنہوں نے مقام جعرانہ میں سر مبارک مونڈا ہے ان کا نام ابو ہند ہے۔[1]

(۱۰۳) * قرفصاء ایک خاص قسم کی سرسری اور نہایت معمولی نشست ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی رانیں پیٹ سے لگا لی جائیں اور ہاتھوں کو پنڈلیوں سے باندھ کر سرین کے بل بیٹھ جائے یہ ایک عامیانہ اور غریبوں کی نشست ہے جس کی نظروں میں کسی کی ہیبت و عظمت سما جاتی ہے وہ جس انداز میں بھی دیکھے ہیبت زدہ ہو جاتا ہے یا یوں کہیے کہ خدائی ہیبت ہر حال میں اپنا اثر دکھلاتی ہے یہاں تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی۔

---

[1] نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۳۹۔

(۱۰۴) عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَؓ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَعُوْنَ بَابَهٗ بِالْاَ ظَافِيْرِ. (رواه الحاكم و البيهقى)

(۱۰۴) مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ (ضرورت کے وقت) آپ کا دروازہ ناخنوں سے کھٹکھٹایا کرتے تھے۔ (حاکم وبیہقی)

(۱۰۵) عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍؓ قَالَ لَقَدْ كُنْتُ اُرِيْدُ اَنْ اَسْأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْاَمْرِ فَاُؤَخِّرُ سَنَتَيْنِ مِنْ هَيْبَةٍ. (رواه ابو يعلى و صححه)

(۱۰۵) براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہتا تو مارے خوف کے دو دو سال تک نہ پوچھ سکتا تھا۔
(اس حدیث کو ابویعلی نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے)

النهى عن رفع الصوت فوق صوت النبى صلى الله عليه وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بلند آواز سے بولنے کی ممانعت

(۱۰۶) عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ اَخْبَرَنِى ابْنُ اَبِىْ مُلَيْكَةَ اَنَّ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ اَخْبَرَهُمْ اَنَّهٗ قَدِمَ رَكْبٌ مِنْ بَنِىْ تَمِيْمٍ عَلَى النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ اَمِّرِ الْقَعْقَاعَ بْنَ مَعْبَدٍ وَ قَالَ عُمَرُ اَمِّرِ الْاَقْرَعَ بْنَ حَابِسٍ فَقَالَ اَبُوْبَكْرٍ مَا اَرَدْتَّ اِلٰى اَوْ اِلَّا خِلَافِىْ فَقَالَ عُمَرُ مَا اَرَدْتُّ خِلَافَكَ فَتَمَارَيَا حَتّٰى ارْتَفَعَتْ اَصْوَاتُهُمَا فَنَزَلَ فِىْ ذٰلِكَ ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ﴾ (الحجرات:۱) حَتّٰى انْقَضَتِ الْاٰيَةُ. (رواه البخارى)
و فى رواية نافع فما كان عمر يسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم بعد هذه الاية حتى

(۱۰۶) ابن جریج رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ عبداللہ بن زبیرؓ نے ان سے بیان کیا' بنوتمیم کا ایک قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو ابوبکرؓ بولے قعقاع بن معبد کو ان کا امیر بنا دیجئے - عمرؓ بولے اقرع بن حابسؓ کو بنا دیجئے - ابوبکرؓ نے فرمایا تم نے تو بس میری مخالفت ہی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ عمرؓ نے فرمایا کہ میں آپ کی مخالفت نہیں کرتا (بلکہ میری رائے یہی ہے) دونوں میں جھگڑا بڑھ گیا حتیٰ کہ ان کی آوازیں بلند ہوگئیں اس پر یہ آیت اتر آئی۔ اے لوگو جو ایمان لا چکے ہو خدا اور اس کے رسول کے سامنے ان سے آگے نہ بڑھا کرو (بلکہ ہر بات میں ان کے فیصلہ کا انتظار کیا کرو) آخر آیت تک اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ نافع جو اس حدیث کے دوسرے طریقہ میں ایک راوی ہیں' روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد عمر اتنی آہستہ گفتگو کرنے لگے کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دوبارہ دریافت نہ کرتے کچھ سمجھ میں نہ آتا کیا فرماتے ہیں۔ فتح الباری

---

(۱۰۴) * اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا دروازہ لکڑی کا تھا۔ خفاجی نے یہاں کچھ جوابدہی کی ہے ہمارے نزدیک دروازے کی دیوار کے کھٹکے پر بھی حدیث کے الفاظ صادق آ سکتے ہیں عرف میں دروازہ کی دیوار کو بھی دروازہ کہہ دیا جاتا ہے اس لیے کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کا دروازہ لکڑی کا ہو بلکہ اگر دروازہ پر پردہ پڑا ہوا ہو جب بھی یہ حدیث بلاتکلف صادق آ سکتی ہے۔

(۱۰۵) * یہ اختلاف حالات اور اشخاص کی بات ہے اسے کلیہ بنانا نہیں چاہیے۔

يستفهمه و فى الفتح عن ابى بكر قلت يا رسول الله اليت ان لا اكلمك الا كاخى الا سرار.

میں ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ اس آیت کے بعد میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے قسم کھالی ہے کہ اب میں آپؐ سے اس طرح آہستہ بات کیا کروں گا جیسے کوئی اپنا راز آہستہ آہستہ کہتا ہے۔

(۱۰۷) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ كَانَ ثَابِتُ بْنُ قَيْسِ بْنِ شَمَّاسٍ خَطِيْبَ الْاَنْصَارِ فَلَمَّا نَزَلَتْ ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾(الحجرات:۲) اِلٰى اٰخِرِ الاٰية جَلَسَ ثَابِتٌ فِيْ بَيْتِهٖ وَ احْتَبَسَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَعْدَ بْنَ مُعَاذٍ فَقَالَ مَا شَاْنُ ثَابِتٍ اَيَشْتَكِيْ فَاَتَاهُ سَعْدٌ فَذَكَرَ لَهٗ قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ثَابِتٌ اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ وَ قَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّيْ مِنْ اَرْفَعِكُمْ صَوْتًا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَنَا مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَذَكَرَ ذٰلِكَ سَعْدٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلْ هُوَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ. (رواہ مسلم و البخاری مثلہ)

(۱۰۷) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ انصار کے خطیب تھے جب یہ آیت نازل ہوئی - اے ایمان والو! اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند مت کرو- (آخر آیت تک) تو ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے گھر بیٹھ رہے اور آپؐ کی خدمت میں آنا جانا بند کر دیا- آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہو ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیسے ہیں؟ کیا بیمار ہیں؟ سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پاس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے کا حال ان سے بیان کیا' ثابت بولے کہ اونچی آواز سے بولنے کی ممانعت نازل ہو چکی ہے اور تم لوگ جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں تم سب میں زیادہ میری ہی آواز بلند ہو جاتی ہے-تو مجھے غم یہ ہے کہ میں کہیں دوزخی نہ ہوں سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آکر یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی آپؐ نے فرمایا کہ وہ دوزخی نہیں بلکہ جنتی شخص ہیں- اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے-اور بخاری نے بھی اسی کے قریب روایت کیا ہے-

(۱۰۷) * سورۂ حجرات کی ابتدائی کئی آیتیں بارگاہ نبوت کا ادب سکھلانے کے لیے اُتری ہیں عرب اپنی سادہ فطرت سے ان دقیق آداب سے اب تک ناآشنا تھے جن کو نبوت کا نازک مقام مقتضی تھا- اسلام نے آ کر جہاں ان کو رفتہ رفتہ بھائی بھائی' ماں باپ اور تمام باہمی رشتوں کے آداب بتلائے- اس کے ساتھ ہی اب وقت آ گیا تھا کہ انہیں خدا اور رسول کے وہ آداب بھی بتلا دیئے جائیں جن سے غفلت اختیار کرنا کئے کرائے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے- ان میں سے ایک ادب یہ تھا کہ رسول کے سامنے اس طرح زور زور سے بے باکانہ گفتگو نہ کی جائے جیسے باہمی ایک دوسرے کے سامنے کی جاتی ہے اور نہ اس طرح اس کو پکارا جائے جیسا کہ آزادانہ ایک دوسرے کو نام لے کر پکارا جاتا ہے- یہ طور وطریق احترام نبوت کے خلاف ہے اور جو نبوت کا احترام نہیں کرتا خطرہ ہے کہ اس کے عمل اکارت نہ ہو جائیں- ثابت بن قیسؓ قدرۃً بلند آواز تھے یہ سن کر ڈر گئے' اور سمجھے کہ بارگاہ نبوت میں یہ گستاخی مجھ سے بارہا سرزد ہو چکی ہے اس لیے میرا اب کہاں ٹھکانا ہوگا- رحمۃ للعالمین کو جب یہ خبر ملی تو ان کی اس اداء پر آپؐ کا دل بھر آیا اور آپ نے اس ادب کی وجہ سے جس سے ان کا قلب معمور تھا ان کو جنت کی بشارت سنا دی- اور ان کی اس بلند آوازی کو جو قدرۃً تھی قابل عفو سمجھا- معلوم ہوا کہ ادب کا اصل ﷺ ....

النهی عن رفع الصوت فی مسجد رسول الله ﷺ بعدو فاته ﷺ

(۱۰۸) عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ كُنْتُ قَائِمًا فِي الْمَسْجِدِ فَحَصَبَنِي رَجُلٌ فَنَظَرْتُ فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ اذْهَبْ فَأْتِنِي بِهٰذَيْنِ فَجِئْتُهُ بِهِمَا قَالَ مَنْ اَنْتُمَا اَوْ مِنْ اَيْنَ اَنْتُمَا قَالَا مِنْ اَهْلِ الطَّائِفِ قَالَ لَوْ كُنْتُمَا مِنْ اَهْلِ الْبَلَدِ لَا وَجَعْتُكُمَا تَرْفَعَانِ اَصْوَاتَكُمَا فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.

(رواه البخاری)

وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت

(۱۰۸) سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں کھڑا ہوا تھا ایک شخص نے میرے کنکری ماری میں نے دیکھا تو وہ عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے انہوں نے فرمایا جاؤ ان دونوں کو میرے پاس لے آؤ' میں انہیں لے آیا فرمایا تم کون لوگ ہو یا یہ فرمایا کہاں کے ہو؟ انہوں نے جواب دیا طائف کے باشندہ ہیں' فرمایا اگر تم مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں اس وقت تمہیں سزا دیتا۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آوازیں بلند کر رہے ہو۔

(اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

رفع الصوت اذا کان عن الازواج فی امرهن اوعن اعرابی جاهل

(۱۰۹) عَنْ سَعْدِ بْنِ وَقَّاصٍ قَالَ اسْتَأْذَنَ عُمَرُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خانگی معاملات میں اہل خانہ کی یا ناواقف بادیہ نشین کی آواز بلند ہو جانا قابل اغماض ہے

(۱۰۹) سعد بن وقاص ؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے اجازت طلب کی اس وقت آپ ؐ کے پاس

ﷺ.... دارومدار قلب پر ہے پھر ظاہر میں اس کے لیے کچھ علامات بھی مقرر ہیں۔ اگر قلب کی گہرائیوں میں ادب موجود ہے تو ظاہر کی فروگذاشت سے اغماض کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب آپ ؐ کے کلام یعنی حدیث شریف کو سن کر اس کا معارضہ و مقابلہ کرنا اس کا مذاق اڑانا تن آسانی اور ہوا پرستی کے لیے اس کی تاویلات کرنا' یہ سب آپ ؐ کی ہی گستاخی کے برابر ہے۔ دنیا اگر کسی شاعر کا احترام کرتی ہے تو اس کے کلام کو بھی بنظر احترام دیکھتی ہے پھر انصاف کرو کہ کیا رسول کا مرتبہ ایک شاعر سے بھی کم ہے۔
اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے اور اپنے رسول کے صحیح احترام و ادب کی توفیق دے۔

(آمین یا رب العالمین)

(۱۰۸) * چونکہ یہ لوگ باہر کے رہنے والے تھے اس لیے ان کو معاف کر دیا گیا۔ اہل مدینہ چونکہ ان آداب سے آشنا ہو چکے تھے اس لیے اگر ان سے ایسی غفلت ہوتی تو قابل اغماض نہ ہوتی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب وفات کے بعد بھی اسی طرح تھا جیسا کہ زمانہ حیوٰۃ میں۔

(۱۰۹) * شارحین بخاری تصریح کرتے ہیں کہ قریشی عورتوں سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں ہیں اور دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گفت وشنید کچھ نفقہ کے متعلق تھی۔ باپ بیٹے' شوہر بی بی' بھائی بھائی' دوست دوست کے آداب علیحدہ ہیں شوہر بی بی کے درمیان بے تکلفی کا بھی ایک تعلق ہے اگر اس بنا پر خانگی معاملات میں انداز بے تکلفی پیدا ہو جائے تو یہ قابل اغماض ہے اسی لیے ﷺ....

وَ عِنْدَهُ نِسَاءٌ مِنْ قُرَيْشٍ يُكَلِّمْنَهُ وَ يَسْتَكْثِرْنَهُ عَالِيَةً اَصْوَاتُهُنَّ فَلَمَّا اسْتَأْذَنَ عُمَرُ قُمْنَ يَبْتَدِرْنَ الْحِجَابَ فَاذِنَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَضْحَكُ فَقَالَ عُمَرُ اَضْحَكَ اللّٰهُ سِنَّكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ عَجِبْتُ مِنْ هٰؤُلَاءِ اللَّاتِيْ كُنَّ عِنْدِيْ فَلَمَّا سَمِعْنَ صَوْتَكَ ابْتَدَرْنَ بِالْحِجَابِ قَالَ عُمَرُ فَاَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كُنْتَ اَحَقَّ اَنْ يَهَبْنَ ثُمَّ قَالَ اَيْ عَدُوَّاتِ اَنْفُسِهِنَّ اَتَهَبْنَنِيْ وَ لَا تَهَبْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَ نَعَمْ اَنْتَ اَفَظُّ وَ اَغْلَظُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ مَا لَقِيَكَ الشَّيْطَانُ قَطُّ سَالِكًا فَجًّا اِلَّا سَلَكَ فَجًّا غَيْرَ فَجِّكَ. (رواه البخاري)

قریش کی چند بیبیاں باتیں کر رہی تھیں اور آپ ؐ سے اپنی مقرر مصارف سے زیادہ کا مطالبہ کر رہی تھیں اس گفت وشنید میں ان کی آوازیں بھی اونچی ہو رہی تھیں جب حضرت عمرؓ نے اجازت مانگی تو فوراً وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور جلدی جلدی پردہ میں جا بیٹھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ کو اندر آنے کی اجازت دے دی (عمرؓ آئے) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے- پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا آپ ؐ کو ہمیشہ خوش رکھے کیا بات ہے- فرمایا مجھے ان عورتوں پر جو ابھی میرے پاس تھیں تعجب ہو رہا ہے (کہ یا تو یہ زور وشور سے گفتگو ہو رہی تھی) تمہاری آواز سنی تو سب جلدی جلدی پردہ میں چلی گئیں- عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ خوف اور ڈر کے زیادہ مستحق تو آپ ؐ تھے اس کے بعد ان کی طرف مخاطب ہو کر بولے اپنی جانوں کی دشمنو! مجھ سے تو ڈرتی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں- انہوں نے کہا بے شک آپ ؐ زبان کے تیز اور مزاج کے سخت بھی ہیں- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نہیں- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کہیں شیطان راستہ چلتے تمہیں مل جاتا ہے تو فوراً تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ لے لیتا ہے-

(اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

(۱۱۰) عَنْ زِرِّ بْنِ حُبَيْشٍ فِي طويل حديث قَالَ اَتَيْتُ صَفْوَانَ بْنَ عَسَّالٍ الْمُرَادِيَّ فَقَالَ لِيْ مَاجَاءَ بِكَ قُلْتُ ابْتِغَاءُ الْعِلْمِ. قَالَ فَقُلْتُ فَهَلْ

(۱۱۰) زر بن حبیش ایک طویل حدیث میں فرماتے ہیں میں صفوان بن عسال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کیسے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا علم کی تلاش میں- میں نے ان

.... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حرکت پر ہنسی آ رہی تھی، آثار ناگواری نہ تھے- ایک ہی بات موقعہ ومحل اور متکلم وسامع کے اعتبار سے مختلف حکم پیدا کر لیتی ہے- یہاں بیبیوں کی بلند آوازی بے ادبی نہیں بلکہ اپنے محبوب تر شوہر کے ساتھ ایک ناز تھا اور آپ کی مسکراہٹ ناز برداری اور کمال خلق تھا- آخر حضرت حسینؓ آپ کے کاندھوں پر بھی سوار ہو جایا کرتے تھے پھر کیا اس کو ادب و بے ادبی سے کوئی تعلق ہے خدا صحیح فہم مرحمت فرمائے-

(۱۱۰) * شائستگی اور ناشائستگی کا تمام دار ومدار آپ کی معیت اور صحبت پر تھا جتنا جو آپ کی صحبت سے دور رہا اتنا ہی اسلامی تہذیب وادب میں پیچھے رہ گیا- یہ شخص تربیت یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی فطری عادت کے مطابق آپ ؐ کو چیخ کر پکار رہا تھا- صاحب مجمع البحار لکھتے ....

حَفِظْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْهَوٰى شَيْئًا قَالَ نَعَمْ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ اَسْفَارِهٖ فَنَادَاهُ رَجُلٌ كَانَ فِيْ اٰخِرِ الْقَوْمِ بِصَوْتٍ جَهْوَرِيٍّ جِلْفٍ جَافٍ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ يَا مُحَمَّدُ فَقَالَ لَهُ الْقَوْمُ مَهْ اِنَّكَ قَدْ نُهِيْتَ عَنْ هٰذَا فَاَجَابَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى نَحْوٍ مِنْ صَوْتِهٖ هَاؤُمْ فَقَالَ الرَّجُلُ يُحِبُّ الْقَوْمَ وَ لَمَّا يَلْحَقْ بِهِمْ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ. (رواه الترمذی فی باب فضل التوبة و الاستغفار و ما ذکر من رحمة الله و قال هذا حدیث حسن صحیح)

سے پوچھا آپ کو کسی سے محبت رکھنے کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یاد ہے فرمایا ہاں ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ ایک گنوار، احمق، اور درشت طبیعت شخص نے کسی آخری گوشہ سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زور سے پکارا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! لوگوں نے اسے روکا اور کہا کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پکارنا (بدتہذیبی ہے) اس کی ممانعت ہو چکی ہے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اسی آواز میں اسے ''ہوت'' کہہ کر جواب دیا اس نے پوچھا ایک شخص کسی جماعت سے محبت رکھتا ہے مگر عمل میں ان کو نہیں پہنچ سکا (اس کے متعلق کیا مسئلہ ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (آخرت میں) آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ (دنیا میں) محبت کرتا تھا۔

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے)

التوجه بالنبی صلی الله علیه وسلم الی الله سبحانه

اللہ تعالیٰ کے دربار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اختیار کرنا

(۱۱۱) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا ضَرِيْرَ الْبَصَرِ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰهَ اَنْ يُّعَافِيَنِيْ فَقَالَ اِنْ

(۱۱۱) عثمان بن حنیف کہتے ہیں کہ ایک شخص کی نظر میں کچھ نقصان تھا وہ آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی آپ ؐ اللہ تعالیٰ سے میری صحت کے لیے دعا فرما دیجئے۔ آپ ؐ نے فرمایا چاہو تو دعا کروں اور چاہو تو صبر کرلو

ﷺ.... ہیں کہ اسی بلند آوازی کے ساتھ آپ ؐ کا جواب دینا اس حکمت پر مبنی تھا کہ اگر یہ اپنی آواز آپ ؐ کی آواز سے پست نہ کر سکا تو آپ ؐ نے اپنی آواز اس کی آواز سے بلند کر دی تا کہ رسول کی آواز پر آواز بلند کرنے کے نتائج بد سے محفوظ رہے اور اس کے اعمال اکارت نہ ہوں۔ ہمارے نزدیک سیدھی اور بے تکلف بات یہ کہ بلند حیثیت متکلم اپنے مخاطب کی خاطر کبھی قصداً تنزل اختیار کر لیتا ہے تا کہ اس کے درمیان راہ افادہ و استفادہ پورے طور پر کھل جائے اگر متکلم اپنی جگہ رہے اور مخاطب اپنی جگہ تو مخاطب بسا اوقات پورے استفادہ پر قادر نہیں ہوتا اس لیے بادشاہوں میں انداز شہنشاہانہ اور گداؤں میں انداز فقیرانہ اختیار کرنا عین حکمت ہے۔ دوم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں معیت سے مراد عام معیت ہے جنت میں رہنے والے سب ایک ہی جگہ رہنے والے ہیں۔ اگرچہ اپنے اپنے رتبہ کے مناسب ان کے منازل و مقامات میں فرق ہو۔ اس محبت کا اثر یہ ہوگا کہ ان کے باہمی منازل نسبتاً قریب قریب کر دیئے جائیں گے یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے ٹھیک اسی کے مقام و منزل میں رہے گا۔ خفاجی شرح شفا میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''جنت میں معیت سے مراد باہمی اجتماع و ملاقات کی سہولت ہے اگرچہ مراتب و منازل میں فرق رہے''۔ (نسیم الریاض ج ۳ ص ۳۵۲)

شِئْتَ دَعَوْتُ وَ اِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّکَ قَالَ فَادْعُهُ قَالَ فَاَمَرَهُ اَنْ يَتَوَضَّأَ فَيُحْسِنُ الْوُضُوْءَ وَ يَدْعُوْا بِهٰذَا الدُّعَاءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ وَ اَتَوَجَّهُ اِلَيْکَ بِنَبِيِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ اِنِّیْ تَوَجَّهْتُ بِکَ اِلٰی رَبِّیْ لِيَقْضِیَ لِیْ فِیْ حَاجَتِیْ هٰذِهٖ اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِیَّ. (رواه الترمذی و قال هذا حديث حسن صحيح غريب)

کیونکہ یہ (رضا بقضاء کا مقام) تمہارے لیے بہتر ہے- اس نے عرض کیا آپ دعاء ہی فرما دیجئے آپ ؐ نے فرمایا اچھا تو اچھی طرح وضو کرو پھر اس طرح دعا کرو' اے اللہ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں اور تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نبی الرحمۃ ہیں تیرے دربار میں وسیلہ اختیار کرتا ہوں- اے نبی میں نے اپنے رب کے دربار میں آپ ؐ کا وسیلہ اس لیے اختیار کیا ہے تاکہ وہ میری یہ ضرورت پوری فرما دے- اے اللہ تو ان کی سفارش میرے حق میں قبول فرما لے- (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح اور غریب ہے)

(۱۱۲) عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِؓ کَانَ اِذَا قُحِطُوْا اِسْتَسْقٰی بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِالْمُطَّلِبِ فَقَالَ اَللّٰهُمَّ اِنَّا کُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْکَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِيْنَا وَ اِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْکَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا فَيُسْقَوْا. (رواه البخاری)

(۱۱۲) انسؓ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوتے تو عمر بن الخطابؓ حضرت عباسؓ کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگتے اور کہتے اے اللہ پہلے ہم تیرے دربار میں اپنے نبی کا وسیلہ اختیار کیا کرتے تھے اور تو بارش برسا دیتا تھا اب ہم اپنے نبی کے چچا کا وسیلہ اختیار کرتے ہیں- تو بارش برسا دے بارش ہو جاتی تھی- (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

الاستشفاع باللّٰه علی احد جهلٌ بعظمة اللّٰه تعالی

اللہ تعالیٰ کی سفارش کسی مخلوق کے سامنے پیش کرنا اس کی عظمت سے ناواقفی اور جہالت کا ثمرہ ہے

(۱۱۳) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍؓ قَالَ اَتٰی رَسُوْلَ

(۱۱۳) جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

(۱۱۲) * حافظ بدرالدین عینی کعب احبار سے روایت کرتے ہیں کہ اپنے نبی کے اہل بیت کے وسیلہ سے بارش مانگنا بنی اسرائیل میں بھی رائج تھا- (ج ۳ ص ۴۳۶)

حافظ سہیلی لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے قبل بھی قریش میں مبارک سمجھے جاتے تھے اور اسی لیے ایک مرتبہ قحط کے موقعہ پر عبدالمطلب نے قریش کے ساتھ جبل ابوقبیس پر چڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگی تھی اور وہ قبول ہو گئی تھی حضرت ابو طالب نے اسی قصہ کی طرف اپنے مشہور قصیدہ میں اشارہ کیا ہے جس کے کچھ اشعار صحیح بخاری میں بھی منقول ہیں- شرح مواہب میں ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ میں قحط پڑا تو لوگ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے- آپ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی چھت اتنی کھول دو کہ آسمان نظر آنے لگے- گویا یہ بھی ایک طور توسل تھا- لوگوں نے ایسا ہی کیا بارش آئی اور اتنی زور سے آئی کہ ہر جگہ سبزہ اگ آیا اور جانوروں کے جسم چربی کی وجہ سے پھٹ پڑے اور وہ سال عام الفتق ہی کے نام سے مشہور ہو گیا-

(۱۱۳) * خطابی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اگرچہ اپنی صحیح میں تو روایت نہیں کیا مگر اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے- یہ بار بار بتلایا جا چکا ہے کہ قرآنی حقائق صرف خیالی اور بے حقیقت نہیں ہوتے کہ ان سے صرف دماغی تفریح مقصود ہو اور نہ پوری وہ .....

اللّٰہِ اَعْرَابِیٌّ وَ قَالَ جُھِدَتِ الْاَنْفُسُ وَ جَاعَ الْعِیَالُ وَ نُہِکَتِ الْاَمْوَالُ وَ ھَلَکَتِ الْاَنْعَامُ فَاسْتَسْقِ اللّٰہَ لَنَا فَاِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِکَ عَلَی اللّٰہِ وَ نَسْتَشْفِعُ بِاللّٰہِ عَلَیْکَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰہِ سُبْحَانَ اللّٰہِ فَمَا زَالَ یُسَبِّحُ حَتّٰی عُرِفَ ذٰلِکَ فِیْ وُجُوْہِ اَصْحَابِہٖ ثُمَّ قَالَ وَیْحَکَ اِنَّہٗ لَا یُسْتَشْفَعُ بِاللّٰہِ عَلٰی اَحَدٍ شَانُ اللّٰہِ اَعْظَمُ مِنْ

خدمت میں ایک دیہاتی شخص آیا اور اس نے کہا لوگوں کی جانیں مشقت میں پڑ گئیں، بچے بھوکے مر گئے، مال تباہ ہو گئے، چوپائے ہلاک ہو گئے، اس لیے اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے بارش کی دعا مانگیے - ہم خدا کے سامنے آپؐ کی سفارش چاہتے ہیں اور آپؐ کے سامنے خدا کی سفارش چاہتے ہیں - آپؐ اس کی اس بے جا بات پر سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے اور اتنی دیر تک تسبیح فرماتے رہے حتیٰ کہ آپؐ کے رفقا کے چہروں پر بھی اس کا اثر محسوس ہونے لگا - اس کے بعد آپؐ نے فرمایا کہ اے بیوقوف! خدا کی سفارش کسی کے سامنے پیش نہیں کی جاتی اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بالا و برتر ہے -

---

﴾..... حقیقت رکھتے ہیں جو انسانی دماغ خود تصور کر لیتا ہے اس کا تصور صرف اس کے محسوسات کے دائرہ تک محدود ہوتا ہے یہ اس کا ظلم ہے کہ جو عالم اس کے دائرہ ادراک سے بالاتر ہے اس کا نقشہ بھی وہ اپنے اسی عالم محسوسات کے مطابق کھینچنا شروع کر دیتا ہے - آسمانوں پر عرش رحمٰن کا وجود ایک حقیقت ہے قرآن نے بھی اس کا اعلان کیا ہے - اور احادیث میں بھی اس کو بیان کیا گیا ہے ایک فلسفی اور ایک اعرابی دونوں کے سامنے یہ قرآنی حقیقت پیش کی گئی ہے لیکن ایک اعرابی کا دائرہ محسوسات چونکہ بہت محدود اور سطحی ہوتا ہے -

اس لیے اس کے سامنے طریقہ تفہیم یہی ہے کہ اسی کے محسوسات کے مطابق اس کو سمجھایا جائے - اونٹ' سوار' کجاوہ' نئے کجاوہ کی آواز' وزنی سوار سے کجاوہ کی چرچراہٹ - یہی اس کا دائرہ محسوسات ہے ایک وراء الوراء اور مجرد ہستی کی عظمت و بزرگی ذہن نشین کرنے کے لیے یہ مادی مثال اس کے سامنے رکھی گئی ہے تاکہ وہ اپنے مالوف مشاہدات سے ایک مافوق الادراک حقیقت سمجھنے کے قابل ہو جائے - اب اگر اس طرز بیان سے خدا کی ذات پاک کو کوئی ان حدود میں محدود سمجھنے لگے تو یہ اس کی نافہمی ہے اور اگر عرش اور ماوراء عرش کو صرف ایک فرضی یا دل خوش کن افسانہ قرار دے دے تو یہ بھی اس کا ظلم و کجروی ہے - راہ صواب یہ ہے کہ ان حقائق پر ایمان رکھا جائے اور اس کی صورت کشی سے اجتناب کیا جائے - دوسری بات جو ایمان بالرسول کے سلسلہ میں سب سے زیادہ جاننا ضروری ہے یہ ہے کہ انسان کی کمزوریوں میں سے یہ بھی ایک کمزوری ہے کہ وہ یا تو رسول کا انکار کرتا ہے اور اگر اس کا اقرار کرتا ہے تو اس کی ہستی کبھی تو خدائی ہستی میں مدغم کر دیتا ہے اور کبھی اس کی حیثیت سے بھی نیچے گرا دیتا ہے - یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا مرکزی نقطہ یہی تھا - یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار کیا اور نصاریٰ نے ان کی ہستی کو خدا کی ہستی میں لپیٹ ڈالا اس لیے خاتم النبیین کو ہر موقعہ پر اپنی امت کو تنبیہ کرنا پڑی ہے تاکہ یہ امت اس گمراہی کا پھر اعادہ نہ کرے - یہاں اس اعرابی نے بھی خدا اور رسول کا رشتہ دوستی یا اسی قسم کا کوئی اور رشتہ سمجھا تھا جس میں ایک دوسرے سے سفارش کا حق ہوتا ہے اسی لیے اس نے اپنے پرواز خیال کے مطابق خدا کی سفارش رسول کی بارگاہ میں پیش کی تاکہ رسول کی پوری توجہ اپنی درخواست کی جانب مبذول کرے مگر رسول نے اس کو سمجھایا کہ خدا کی ذات اتنی اعلیٰ وارفع ہے کہ اس کے لیے کسی بڑے سے بڑے کے سامنے سفارش کا تخیل قائم کرنا اس کی شان عظمت کے منافی ہے سب رسول اسی کے دربار کے سفارشی ہیں اور وہ بھی اس کی اجازت کے بعد - یہ اصلاح صرف زبانی نہ تھی بلکہ اس استحضار عظمت کے ساتھ تھی کہ حاضرین کے چہروں پر بھی اس کا اثر نمایاں ہو رہا تھا گویا تعلیم وہ تھی اور تزکیہ یہ تھا - ﴾.....

ذٰلِکَ وَ یُحَکَ اَتَدْرِیْ مَا اللّٰهُ اِنَّ عَرْشَهٗ عَلٰی سَمٰوٰاتِهٖ هٰکَذَا وَ قَالَ بِاِصْبَعِهٖ مِثْلَ الْقُبَّةِ عَلَیْهِ وَ اِنَّهٗ لَیَاطُّ بِهٖ اَطِیْطَ الرَّحْلِ بِالرَّاکِبِ. (رواہ ابو داؤد).

تو جانتا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کس قدر بلند ہے اس کا عرش آسمانوں پر اس طرح قائم ہے اور اس کا نقشہ آپ نے اپنی انگلیوں سے قبہ کی شکل پر بنا کر دکھلایا اور وہ اس کی عظمت سے اس طرح چر چر کر رہا ہے جیسا نیا کجاوہ سوار کے بوجھ سے چر چر کرتا ہے۔ (اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

کان النبی صلی الله علیه وسلم نبیا و اٰدم بین الروح و الجسد

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوۃ سے اس وقت سرفراز ہو چکے تھے جب کہ حضرت آدمؑ میں نفخ روح بھی نہ ہوا تھا

(۱۱۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ

(۱۱۴) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ آپؐ

.... رسول کی صداقت کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ جب اس کے حدود عظمت خدائی حدود سے ٹکرانے لگتے ہیں تو وہ اس کو اتنی ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے جتنا کہ اپنی توہین کو ایک متوازن سے متوازن طبع انسان اپنی حیثیت سے زیادہ تعریف سن لیتا ہے اور اس پر مسرور بھی ہوسکتا ہے مگر رسول اپنے ادب و احترام' اہانت و حقارت کے دونوں حدود اتنے محفوظ رکھتا ہے کہ گویا یہاں بھی اسے اپنا حظ نفس مقصود نہیں بلکہ خدائی حدود کا تحفظ منظور ہے۔ اگر اس کے منہ پر اسے کوئی یا خیر البریہ کہہ کر پکارتا ہے تو اسے شرم آجاتی ہے' اور وہ گردن جھکا کر کہہ دیتا ہے کہ یہ کلمہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ بلاشبہ وہ سب سے افضل ہے اور جہان کا سید و سردار ہے مگر جب اس کے سامنے اسے انت سیدنا کہا جاتا ہے تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکل جاتا ہے کہ السید ہو اللہ گویا اگر وہ اپنی تعریف سن سکتا ہے تو صرف ایک حقیقت اور واقعہ کی حد تک اور اگر اپنی مذمت سے ناخوش ہوتا ہے تو صرف اس لیے کہ اس منصب رسالت کی توہین ہے غرض دونوں جانبوں میں اس کا غصہ و مسرت خدا ہی کی عظمت کی خاطر ہوتا ہے' سوچو کہ ایسا انسان کیسا پاک انسان ہوگا جو اپنے نفس کے لیے کسی بات کا طالب نہیں اس کی تمام سعی و کوشش یہ ہے کہ وہ خدا کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں قائم کر جائے اور بس۔ جو لوگ رسول کو خدائی عظمت دے کر خوش کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت اس کی ناراضگی خرید رہے ہیں اور جو محروم القسمت رسول کا ادب بھی نہیں جانتے وہ دراصل اپنے خدا کا غصہ مول لے رہے ہیں ؎

محمد از تو می خواہم خدا را — خدایا از تو می خواہم محمدؐ

(۱۱۴) * حافظ سخاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے مشہور الفاظ ''کنت نبیا و ادم بین الماء و الطین''، ہمیں کسی حدیث کی کتاب میں نہیں مل سکے۔ حافظ سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ان کا صاف طور پر انکار کر دیا ہے البتہ اس کا مضمون قابل تسلیم سمجھا ہے۔ خفاجی شرح شفا میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے دو تین باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) آپؐ کا عالم ارواح میں نبوت سے حقیقۃً سرفراز ہونا۔ (۲) جس طرح صفتِ وجود میں آپؐ کی ذات سب سے مقدم تھی اسی طرح صفت نبوت میں بھی آپؐ کا سب سے مقدم ہونا اس مضمون کی پوری توضیح کے لیے اس تفصیل کا نقل کرنا ضروری ہے جو حافظ تقی الدین سبکی نے آیت میثاق کی تفسیر میں لکھی ہے۔

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَا اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّ حِکْمَةٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ﴾ (آل عمران : ۸۱)

''اور وہ وقت یاد دلایئے جب کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا تھا کہ ہم جو تمہیں کتاب و حکمت دیں پھر خدا کا کوئی رسول ....

ﷺ .... تمہارے پاس آئے اور جو کتاب تمہارے ساتھ ہو اس کی تصدیق کرے تو (دیکھو) ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا۔''

حافظ موصوف نے اس آیت کی شرح میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس کا نام ''التعظیم و المنۃ'' فی معنی قولہ تعالیٰ (لتومنن بہ و لتنصرنہ) رکھا ہے۔[1] وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں انبیاء علیہم السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اسی نمونہ کا عہد لیا گیا تھا جیسا کہ امتوں سے نبیوں کے لیے یا رعایا سے خلفاء کے لیے اطاعت و نصرت کا عہد لیا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان آپ کا منصب عالی وہ تھا جو امتوں میں انبیاء علیہم السلام کا منصب ہوتا ہے اس لیے اور انبیاء تو صرف نبی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی الانبیاء ہیں۔ یہ حقیقت اگرچہ عالم اجسام میں صاف طور پر عیاں نہیں ہو سکی مگر عالم ارواح اور اس عالم سے ماوراء عالم میں جہاں بھی دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آپ کا اجتماع ہو گیا ہے' ظاہر ہو گئی ہے۔ پہلی بار یہ اجتماع شب معراج میں ہوا تھا جب کہ نماز کے لیے امام کی تلاش ہو رہی تھی۔ اس وقت تمام انبیاء علیہم السلام کی صفوں میں امامت کی مستحق آپ ہی کی ذات گرامی ٹھہری۔ گویا امت میں امامت کا جو حق کہ نبی کا ہوتا ہے وہی حق انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرار پایا۔ دوسرا اجتماع محشر میں ہوگا وہاں بھی سب انبیاء آپ ہی کے زیر لواء اور آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے جیسا کہ ہر امت اپنے اپنے نبی کے جھنڈے کے نیچے ہوگی تیسری بار شفاعت کا مرحلہ ہے یہاں بھی سب کی خطیب و امام آپ ہی کی ذات مبارک ہوگی۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جو منصب نبوت آپ کو اس امت کے لیے حاصل ہے وہی منصب آپ کو بلحاظ انبیاء بھی حاصل ہے البتہ اس کا ظہور ان کے ساتھ اجتماع پر موقوف ہے۔ عالم کی تاریخ میں یہ اجتماع کل تین جگہ ثابت ہوتا ہے اور تینوں جگہ آپ کا یہ منصب عالی ظاہر ہوا ہے۔ مگر اس عالم میں بھی انبیاء علیہم السلام کا آپ کے ساتھ اجتماع ہو جاتا تو یہ حقیقت یہاں بھی آشکارا ہو جاتی۔ چنانچہ آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو ان کا تعلق آپ کی شریعت کے ساتھ وہی ہوگا جو تمام امت کا ہے اور اسی لیے اس اتباع سے ان کی نبوت میں کوئی ادنیٰ شائبہ نقصان بھی لازم نہ آئے گا۔ اسی طرح اگر آپ گذشتہ انبیاء کے زمانہ میں تشریف لے آتے تو وہ بھی اپنی اپنی رسالت پر باقی رہتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہی فرماتے اور اس اتباع کی وجہ سے ان کی رسالت میں بھی کوئی نقص لازم نہ آتا۔

رہا مختلف شریعتوں کا معاملہ تو جس طرح مختلف نبوتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ماتحت ہیں اسی طرح مختلف شریعتیں مختلف زمانوں' اور امتوں کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعتیں ہیں۔ پس یہود و نصاریٰ کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت تورات و انجیل تھی اور امت محمدیہ کے لحاظ سے آپ کی شریعت قرآن شریف ہے اگر زمانوں اور اشخاص کے اعتبار سے احکام مختلف ہو جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تحقیق سے دو حدیثوں کی مراد روشن ہو گئی۔ (۱) بعثت الی الناس کافۃ ۔ میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ عام طور پر عموم بعثت کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ آپ قیامت تک سب انسانوں کے لیے رسول ہیں' لیکن اس تحقیق سے ظاہر ہو گیا کہ آپ کی نبوت کا تعلق صرف مستقبل سے نہیں بلکہ ماضی و مستقبل دونوں سے ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ ﷺ .....

---

[1] یوسف بن اسمٰعیل نبہانی نے جواہر البحار میں اس رسالہ کو بجنسہٖ نقل کیا ہے۔ خفاجی نے صرف اس کے منتشر ٹکڑے لیے ہیں۔

الرُّوحِ وَ الْجَسَدِ. جسم کے درمیان تھے۔ (یعنی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی)

(رواہ الترمذیؒ و قال هذا حدیث حسن) (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے)

...... علیہ وسلم تک سب رسول آپؐ کی نبوت کے ماتحت ہیں اگر چہ ماتحتی کی نوعیت بدلی ہوئی ہو۔

(۲) حدیث کنت نبیا و ادم بین الماء و الطین۔ اس حدیث کی مراد صرف یہ سمجھی جاتی تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ کو آپؐ کی نبوت کا علم حاصل تھا مگر اس میں آپؐ کی کیا خصوصیت ہے۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں کا علم بھی اللہ تعالیٰ کو اسی طرح حاصل تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا۔

اس تحقیق کی بناء پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت آدم علیہ السلام میں نفخ روح سے پہلے نبوت سے نوازا جا چکا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے کسی کمال کے افاضہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی وہ عالم وجود میں آنے کے بعد کمال کا افاضہ کرتی ہے اور کبھی وجود سے پہلے عالم ارواح ہی میں اس کمال سے نواز دیتی ہے جس کا ظہور قالب انسانی میں مقدر ہو چکا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کمال کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو یکساں ہوتا ہے۔ ہاں مخلوق کو پہلی صورت کا علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ وہ کمال اس کے مشاہدہ میں آ جائے۔ اور دوسرے کمال کے علم کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ کوئی مخبر صادق اس کی خبر دے دے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہمیں اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ کمال نبوت آپؐ کو اس وقت حاصل ہو چکا تھا جب کہ حضرت آدم علیہ السلام انسانی صورت پر استوار بھی نہ ہونے پائے تھے اور اسی وقت انبیاء علیہم السلام سے آپؐ کے لیے ایمان ونصرت کا عہد بھی لے لیا گیا تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپؐ کی رسالت عامہ ان کو بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے سب سے پہلے نبی آپؐ ہوئے مگر چونکہ جسدِ عنصری کے لحاظ سے آپ کا ظہور سب سے آخر میں ہوا ہے اس لیے آپؐ آخر الانبیاء بھی کہلائے مگر اس معنی سے نہیں کہ آپؐ کو نبوت سب سے آخر میں ملی ہے۔ بلکہ اسی معنی سے کہ آپؐ کا ظہور سب کے آخر میں ہوا ہے ورنہ منصب نبوت کے لحاظ سے آپ کی ولادت سے قبل اور ولادت کے بعد' چالیس سال کی عمر سے پہلے' اور اس کے بعد' کے زمانہ میں کوئی فرق نہیں ہے اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ اگر ایک شخص اپنی لڑکی کی شادی کے لیے کسی کو وکیل بناتا ہے تو بلاشبہ یہ وکالت صحیح ہے اور اسی وقت سے اس کو تصرف کرنے کا حق بھی حاصل ہے لیکن اس تصرف کا ظہور اس پر موقوف ہے کہ پہلے کہیں اسے کفو ملے تو وہ شادی کرے بعض مرتبہ مدتوں کفو نہیں ملتا اور اس وکالت کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شخص وکالت سے موصوف نہیں یا اس کو اس سے پیشتر حق تصرف حاصل نہیں اسی طرح آپؐ کی نبوت کا معاملہ سمجھنا چاہیے یہاں جسم عنصری کی شرط صرف تصرفات نبوت کے ظہور کے لیے ہے۔ بنفس منصب نبوت کے لیے نہیں اصل یہ ہے کہ کسی حکم کا کسی شرط سے تعلق دو طرح پر ہوتا ہے کبھی فاعل متصرف کے اعتبار سے کبھی محل قابل کے لحاظ سے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لیے جسم عنصری کی شرط فاعل متصرف کی طرف سے نہ تھی کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت سے عالم ارواح ہی میں سرفراز کر دیا تھا جسم ناسوتی کی شرط تھی تو صرف اس لیے تھی کہ مبعوث الیہم میں جسم کے بغیر استفادہ کی قابلیت نہ تھی۔ تصرفات نبوۃ یعنی احکام الٰہیہ کی تبلیغ اس پر موقوف تھی کہ آپؐ جسم عنصری میں تشریف لا کر ان سے خطاب کریں۔ کلام الٰہی انہیں سنائیں اور سمجھائیں اگر مخاطبین میں ان امور کی اس سے قبل صلاحیت ہوتی تو وہ کمالِ نبوت کا اس سے قبل بھی ادراک کر لیتے اس لیے قالبِ انسانی کی شرط یہاں نفسِ نبوت کے لیے نہیں بلکہ قصور مخاطبین کے لحاظ سے تھی۔[۱] ......

[۱] سبکی متوفی ۷۵۶ھ سے پہلے حافظ ابونعیم اصبہانی نے متوفی (۴۳۰) اور شیخ محی الدین بن عربی (متوفی ۶۳۸) نے فتوحات مکیہ کے باب ۱۰ میں ۱۴۷ و باب ۱۲ ص ۱۸۵ و باب ۱۴ ص ۹۴ و باب ۳ ص ۷۷ و ۱۸۲ و باب ۳۱۳ ص ۶۴ میں اور امام رازی نے (متوفی ۶۰۶) اپنی تفسیر میں پھر بعد میں ابن حجر ہیثمی (متوفی ۹۷۳) اور زرقانی (۱۱۲۲) وغیرہم نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

جعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین و ادم بین الماء و الطین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خاتم النبیین بنا دیئے گئے تھے جب کہ حضرت آدم (علیہ السلام) ابھی آب وگل ہی میں تھے

(۱۱۵) عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ عِنْدَ اللّٰهِ

(۱۱۵) عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں خدا کے نزدیک اس وقت خاتم النبیین مقرر ہو

☜ ....خفاجی کو تقی سبکی کی اس رائے سے اختلاف ہے وہ اور انبیاء علیہم السلام کے حق میں آپ کا یہ علاقہ تسلیم نہیں کرتے اور فرماتے ہیں کہ صرف تعظیم و توقیر، عظمت و نصرت کے عہد سے اتنا اہم علاقہ ثابت نہیں ہو سکتا - ہمارے نزدیک اس کے خلاف پر جو وجوہات انہوں نے قائم کیے ہیں اس کا جواب ممکن ہے مگر احتیاط یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بحث سے سکوت اختیار کیا جائے نہ تو اس کا دعویٰ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ اس سے انکار کرنے کی حاجت - آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے صرف آپ کی سیادت و قیادت کا اعتقاد کافی ہے - اب یہ بحث کہ انبیاء علیہم السلام کے لیے بھی یہ سیادت اسی درجہ کی تھی جس درجہ کی اس امت کے لیے غیر ضروری بحث ہے - علامہ خفاجی کو سبکی کی دوسری بحث بلا کسی اختلاف کے تسلیم ہے یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصبِ نبوت سب سے پہلے عالم ارواح ہی میں مرحمت ہو چکا تھا اور اس حدیث کا منشاء صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کی نبوت کا علم تھا یہ ایک بدیہی اور غیر مفید سی بات ہے[1] شیخ اکبرؒ نے اس مضمون کو بڑی رنگینی سے ادا کیا ہے اس کا نقل کرنا موجب طوالت ہے - اہل علم کی ضیافت طبع کے لیے یہاں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں -

الا بابی من کان ملکا و سیدا — سن لو میرے ماں باپ اس پر قربان جو اس وقت بادشاہ اور سردار بن
و ادم بین الماء و الطین و اقف — چکا تھا جب کہ آدم علیہ السلام ابھی آب وگل کے درمیان ہی پڑے
فذاک الرسول الا بطحی محمد — ہوئے تھے - یہ وہی مکی رسول ہیں جن کا نام نامی محمدؐ ہے اور
لہ فی العلی مجد تلید و طارف — جن کو ہر قسم کی نئی پرانی بزرگیاں حاصل ہیں -
اتی بزمان السعد فی اخر المدی — آپؐ کی آمد مدتوں بعد ایک خوش بخت زمانہ میں ہوئی -
و کانت لہ فی کل عصر مواقف — مگر آپؐ کی شہرت ہر دور میں رہی ہے -
اتی لا نکسار الدھر یجبر صدعہ — آئے اور ایک شکستہ حال زمانہ کی اصلاح کرنے کے لیے آئے -
فاثنت علیہ السن و عوارف — اس لیے زبان خلق اور بخششیں آپؐ کی ثناء خواں ہے -
اذا رام امرًا لا یکون خلافہ — جب آپؐ کسی بات کا عزم کر لیتے ہیں تو پھر اس کا خلاف نہیں ہوتا -
و لیس لذاک الامر فی الکون صارف — اور نہ عالم میں اس سے کوئی مانع نظر آتا ہے -

(۱۱۵) ✻ مواہب میں ہے - و اخرج مسلم من حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ عزوجل کتب مقادیر الخلق قبل ان یخلق السموات و الارض بخمسین الف سنة و کتب فی الذکر ان محمدا خاتم النبیین. عبداللہ بن عمرؓ بن العاص صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل - اپنی ہر مخلوق کا اندازہ لکھ دیا تھا اور لوح محفوظ میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ ☜ ....

[1] دیکھو نسیم الریاض ج ۱ - از ص ۳۰۰ تا ۳۰۴ -

مَكْتُوْبٌ خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ وِ اِنَّ اٰدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِيْنَتِهٖ . رواه فی شرح السنة و احمد فی مسنده كما فی المشكوة و البيهقی و الحاكم كما فی المواهب و قال الحاكم صحيح الاسناد و فی شرحه رواه ابن حبان فی صحيحه ايضًا و فی الكنز و فی لفظ لهذا الحديث عند ابن سعد فی ام الكتاب خاتم النبيين الحديث.

چکا تھا جب کہ حضرت آدم علیہ السلام ابھی گارے کی شکل ہی میں پڑے ہوئے تھے۔ (یعنی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی)

اس حدیث کو شرح السنۃ میں اور امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور کنز العمال میں بحوالہ ابن سعد اس حدیث کے لفظ میں بجائے عند اللہ کے امّ الکتاب کا لفظ ہے۔ اب حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ میں لوح محفوظ میں خاتم النبیین لکھا جا چکا تھا۔ گویا ابن سعد کے لفظ کو مسند امام احمد کی شرح سمجھنا چاہیے۔

ﷺ .... وسلم خاتم النبیین ہیں یعنی جب عالم تکوین کی ہر معمولی سے معمولی چیز مقدر ہوئی تو جن کے وجود پر عالم تکوین کی آبادی کا مدار تھا ان کا خاتم النبیین ہونا بھی اسی وقت مقدر ہو چکا تھا۔ اس روایت کا آخری فقرہ اگرچہ صحیح مسلم کے موجودہ نسخوں میں نہیں ملتا مگر جب مصنف مواہب نے اس کو بحوالہ مسلم نقل کیا ہے تو ضرور ان کے نسخہ میں موجود ہوگا۔

واضح رہے کہ اس حدیث کا منشا بھی صرف تحریر و کتابت نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ خلعت ختم نبوت آپؐ کو اس وقت پہنایا جا چکا تھا جب کہ ابوالبشر نے خلعت وجود بھی نہیں پہنا تھا۔ اسی کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہے:

عن ابن عباس فی حديث الشفاعة فياتون عيسى فيقولون اشفع لنا الى ربنا فيقضی بيننا فيقول انی لست هنا كم انی اتخذت و امی الهين من دون الله و لكن ارأيتهم لو ان متاعًا فی و عاء قد ختم عليه اكان يوصل الى مافی الوعاء حتى يفض الخاتم فيقولون لا فيقول فان محمد اصلى الله عليه وسلم قد حضر اليوم و قد غفر له ما تقدم من ذنبه و ما تاخر رواه الطيالسی ص ۳۵۳– و فی لفظ احمد و ابی يعلی ان محمدا صلى الله عليه وسلم خاتم النبيين قد حضر اليوم.

''ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ شفاعت کی طویل حدیث میں روایت کرتے ہیں کہ (قیامت میں شفاعت کے لیے) آخر کار لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے (آپ ہی ہمارے پروردگار سے سفارش کیجئے تاکہ ہمارا حساب لے لے وہ فرمائیں گے میں یہ کام نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس سے شرمندہ ہوں کہ میری اُمتوں نے مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لیا تھا لیکن بتلاؤ اگر کسی برتن کو بند کر کے اس پر مہر لگا دی جائے کیا اس برتن کی چیز اس وقت تک لے سکتے ہو جب تک اس کی مُہر نہ توڑ دو لوگ کہیں گے ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم (جو انبیاء علیہم السلام کے خاتمہ پر مُہر ہیں) آج موجود ہیں ان کی آئندہ و گذشتہ سب لغزشیں معاف ہو چکی ہیں (ان کے پاس جاؤ) مسند احمد اور ابو یعلی کے لفظ یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور آج یہاں موجود ہیں۔ ان الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صرف تقدیر کا ذکر نہیں فرمایا۔ بلکہ اس نوازش الٰہیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ازل میں خلعت ختم نبوۃ پہنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو چکی تھی۔ اس لیے شفاعت کا حق ان ہی کا ہے۔

عرباض کی اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عالم کی ہدایت کے وقت ہی اس کی نہایت آپؐ کے دورۂ نبوت پر مقدر ہو چکی تھی اسی لیے آپؐ نے فرمایا ہے عن بريدة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم بعثت انا و الساعة جميعًا ان ﷺ ...

جعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اول النبین و اخر ھم و کک امتہ اخر الامم و تکون اولھم یوم القیامۃ

آنخضرت ﷺ سب سے پہلے نبی بنادیئے گئے تھے اور سب سے آخر میں تشریف لائے ہیں اور اسی طرح آپ ؐ کی امت بھی سب سے آخر میں آئی ہے اور قیامت کے دن سب سے مقدم ہو جائے گی

(۱۱۶) عَنْ اَنَسٍؓ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ مَرْفُوْعًا قَالَ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی جَعَلْتُ اُمَّتَکَ هُمُ الْاٰخِرُوْنَ وَ هُمُ الْاَوَّلُوْنَ (الی قولہ) جَعَلْتُکَ اَوَّلَ النَّبِیِّیْنَ خَلْقًا وَ اٰخِرَهُمْ (الی قولہ) وَ جَعَلْتُکَ فَاتِحًا وَ خَاتِمًا. (اخرجہ ابو نعیم) (من الخصائص ج ۲ ص ۱۹۷)

(۱۱۶) انسؓ سے ایک طویل حدیث میں مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیری امت کو میں نے سب سے آخر میں بھیجا ہے اور وہ حساب میں سب سے پہلے ہوگی اور میں نے تجھ کو نبیوں میں سب سے پہلے پیدا کیا اور سب سے آخر میں بھیجا ہے تجھ کو میں نے فاتح یعنی دورۂ نبوت شروع کرنے والا بنایا ہے اور تجھ کو ہی اس کا ختم کرنے والا بنایا ہے۔ اس حدیث کو ابونعیم نے روایت کیا ہے۔

(۱۱۷) عَنْ سَلْمَانَؓ فِیْ حَدِیْثِ الشَّفَاعَةِ. یَاْتُوْنَ مُحَمَّدًا فَیَقُوْلُوْنَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اَنْتَ الَّذِیْ فَتَحَ اللّٰهُ بِکَ وَ خَتَمَ وَ غَفَرَ لَکَ مَا تَقَدَّمَ وَ مَا تَاَخَّرَ. (رواہ ابن ابی شیبۃ (فتح الباری ج ۲ ص ۴۷۸)

(۱۱۷) سلمانؓ شفاعت کی حدیث میں روایت کرتے ہیں۔ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے اے اللہ کے نبی آپ ؐ ہی وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے نبوت کو شروع کیا تھا اور جن پر ختم کیا ہے اور آپ ؐ کی آئندہ اور گذشتہ سب لغزشیں معاف کر دی ہیں۔
(اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے)

(۱۱۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ؓ فِیْ حَدِیْثِ الْاِسْرَاءِ قَالُوْا یَا جِبْرَئِیْلُ مَنْ هٰذَا مَعَکَ قَالَ هٰذَا مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ..... الی ان قال. فَقَالَ لَهٗ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی......

(۱۱۸) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ معراج کی حدیث میں روایت فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے جبرئیلؑ سے دریافت کیا تمہارے ساتھ یہ کون ہیں وہ بولے محمد ؐ ہیں جو اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں۔ (جب آپ ؐ کی دربار الٰہی میں رسائی ہوئی) تو ارشاد ہوا (اے محمد ؐ) میں نے پیدائش کے لحاظ سے

ﷺ.... کادت لتسبقی (اخرجہ ابن جریر بحوالۃ مسند احمد)
بریدہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے' میں اور قیامت ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں (اور مبالغہ کے ساتھ فرمایا) وہ تو قریب تھی کہ مجھ سے بھی پہلے آجاتی۔ اور بخاری میں ہے بعثت انا و الساعۃ کھا تین۔ آپ ؐ نے اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میں اور قیامت اس طرح ملے ہوئے بھیجے گئے ہیں یعنی آپ ؐ کے زمانہ نبوت اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبوت حائل نہیں قیامت جب بھی آئے آپ ؐ ہی کے دور نبوت میں آئے گی۔
خلاصہ یہ کہ آپ ؐ کا دنیا کے آخری دور میں آنا اس وقت طے ہو چکا تھا جب کہ حضرت آدم علیہ السلام میں نفخ روح نہ ہوا تھا گویا کہ یہ بات عالم کے وجود سے بھی پہلے ایک طے شدہ بات تھی اب اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔
(۱۱۸) * چونکہ رسولوں کے سلسلہ میں بظاہر سب سے پہلے آنے والے رسول حضرت آدم علیہ السلام تھے اس لیے احادیث میں ﷺ....

جَعَلْتُکَ اَوَّلَ النَّبِیِّیْنَ خَلْقًا وَ اٰخِرَھُمْ بَعْثًا..... وَ جَعَلْتُکَ فَاتِحًا وَ خَاتِمًا.

(رواہ البزار) (مجمع الزوائد ص ۲۷ و ۲۹)

تم کو سب نبیوں سے پہلے اور بلحاظِ بعثت سب سے آخر میں بھیجا ہے- نبوت کا شروع کرنے والا اور ختم کرنے والا تم کو ہی بنایا ہے-

(اس حدیث کو بزار نے روایت کیا ہے)

(۱۱۹) عَنْ اَبِیْ قَتَادَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ مُرْسَلًا اِنَّمَا بُعِثْتُ خَاتِمًا وَ فَاتِحًا وَ اُعْطِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ وَ فَوَاتِحَہٗ. (رواہ البیھقی فی شعب الایمان کنز ج ٦ ص ١٠٦)

(۱۱۹) ابو قتادہؓ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ہے نبوت کا شروع کرنے والا اور اس کا ختم کرنے والا میں ہی بھیجا گیا ہوں اور مجھے جوامع کلم اور فواتح کلم دیئے گئے ہیں یعنی مختصر جملوں میں بڑے بڑے مضامین ادا کرنا- اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے-

(۱۲۰) عَنْ قَتَادَۃَؓ کُنْتُ اَوَّلَ النَّاسِ فِی الْخَلْقِ وَ اٰخِرَھُمْ فِی الْبَعْثِ. (رواہ ابن سعد مرسلا کما فی الکنز ج ٦ ص ١٠٦ و رواہ ابن ابی شیبۃ مسند اعنہ کما فی الدر المنثور ج ٥ ص ١٨٤)

(۱۲۰) قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں سب انسانوں میں بلحاظِ پیدائش پہلا ہوں اور سب انبیاء میں باعتبارِ بعثت پچھلا- اس حدیث کو ابن سعد نے مرسلاً اور ابن ابی شیبہ نے مسنداً روایت کیا ہے-

(۱۲۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ قَوْلِ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیِّیْنَ مِیْثَاقَھُمْ وَ مِنْکَ وَ مِنْ نُّوْحٍ﴾(الاحزاب:۷) الآیہ قَالَ کُنْتُ اَوَّلَ النَّبِیِّیْنَ فِی الْخَلْقِ وَ اٰخِرَھُمْ فِی

(۱۲۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ: ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیِّیْنَ مِیْثَاقَھُمْ وَ مِنْکَ وَ مِنْ نُّوْحٍ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا میں باعتبار پیدائش کے سب سے پہلا اور باعتبار بعثت سب سے آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں-

---

ﷺ..... اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصل اوّلیت یعنی باعتبار خلق و اتصاف نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے- گو بلحاظ وجود عنصری حضرت آدم علیہ السلام کی تشریف آوری سب سے اوّل ہوگئی ہے-

(۱۱۹) ٭ حکیم ترمذی فرماتے ہیں کہ ہر سید و امیر کو بقدر اپنے دائرہ ولایت کے خزائن، حشم و خدم درکار ہوتے ہیں- جو ایک قریہ یا ایک خطہ کا امیر ہوتا ہے اس کے لیے اس کے مناسب اور جو ایک ملک کا امیر ہوتا ہے اس کے لیے اس کے مناسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ تمام جہان کا سید و امیر بنایا گیا ہے اس لیے آپؐ کو اسی کے بقدر سامان ولایت کی ضرورت تھی اسی لیے حدیث میں ارشاد ہے کہ اوتیت خزائن الارض مجھے زمین بھر کے خزانے مرحمت فرما دیئے گے ہیں اور اسی لیے فرمایا اوتیت جوامع الکلم مجھے جامع کلمات مرحمت کیے گئے ہیں بے شک جس کی مملکت تبلیغ تمام جہان ہوں اسے مختصر جملوں میں سمندر کھپانے کی قدرت ملنی چاہیے تا کہ اس کے کچھ جملوں میں سب کچھ آ جائے اور ایک اعرابی و فلفی یکساں طور پر اس سے ہمیشہ مستفید ہوتا رہے اسی بناء پر ترمذی میں ہے کہ ہر نبی کو سات نجیب و رقیب ملے ہیں مجھے چودہ مرحمت ہوئے ہیں- غرض کہ جوامع الکلم بعثت عامہ کے مقتضیات و ضروریات میں داخل ہیں- یہی وجہ ہے کہ جو رسول خاص خاص قوموں کی طرف مبعوث ہوئے ان کو ایسے کلمات جامع مرحمت نہیں ہوئے جوامع الکلم کی تفسیر ہمارے مضمون حجیت حدیث میں زیرعنوان قرآن کی جامعیت ملاحظہ کیجئے-

الْبُعْثِ. (رواہ ابن ابی حاتم و ابن مردویہ و ابو نعیم فی الدلائل و الدیلمی و ابن عساکر و ابن ابی شیبۃ و ابن جریر و ابن سعد (ابن کثیر ج ۸ ص ۸۹ و الدر المنثور ج ۵ ص ۸۴ و الکنز ج ٦ ص ۱۱۳)

اس حدیث کو ابن ابی حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ابن مردویہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ابونعیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے اور دیلمی، ابن عساکرؒ، ابن ابی شیبہؒ، ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ، ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی روایت کیا ہے۔

هذه الامة اٰخر الامم و خيرها و اولها فی الحساب

یہ امت سب اُمتوں میں آخر، سب سے بہتر اور حساب میں سب سے مقدم ہوگی

(۱۲۲) عَنْ قَتَادَةَؓ قَالَ ذُكِرَ لَنَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ وَ هُوَ مُسْنِدٌ ظَهْرَهٗ اِلَى الْكَعْبَةِ نَحْنُ نُكْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعِيْنَ اُمَّةً نَحْنُ اٰخِرُهَا وَ خَيْرُهَا. (رواہ ابن جریر فی تفسیر قولہ کنتم خیر امۃ الآیہ (الدر المنثور ج ۲ ص ٦۴)

(۱۲۲) قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ سے کمر لگائے بیٹھے تھے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم قیامت کے دن ستر امتوں میں سترویں امت ہوں گے جن میں ہم سب سے آخر اور سب سے بہتر ہوں گے۔ (درمنثور)

(۱۲۳) عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حَزْمٍ..... تُكْمَلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُوْنَ اُمَّةً. نَحْنُ اٰخِرُهَا وَ خَيْرُهَا. (رواہ الباوردی) (الکنز ج ٦ ص ۲۳۲)

(۱۲۳) محمد بن حزم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ستر امتیں پوری ہو جائیں گی جن میں ہم سب سے آخر اور سب سے بہتر ہوں گے۔ (کنزالعمال)

(۱۲۴) عَنْ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ يَا يَهُوْدِیُّ اَنْتُمُ الْاَوَّلُوْنَ وَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ

(۱۲۴) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا اے یہودی! تم لوگ ہم سے پہلے ہو اور ہم گو تم سے آخر میں ہیں مگر قیامت کے دن حساب میں تم سے پہلے

---

(۱۲۲) * ان جملہ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فاتح نبوۃ اور خاتم نبوۃ دونوں قرار دیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ ازل میں آپؐ کی نبوۃ اور ختم نبوۃ صرف تقدیر کے معنی میں نہ تھی تقدیر تو سب کے لیے یکساں ہے بلکہ اس منصب سے سرفرازی کے لحاظ سے ہے۔ آپؐ کی آخریت جس طرح خارج میں تھی اسی طرح آپؐ کی اوّلیت بھی سمجھنا چاہیے۔ اور جس طرح آپؐ کی اوّلیت تھی یعنی آپؐ سے پیشتر کوئی رسول نہ تھا اسی طرح آپؐ کی آخریت سمجھنا چاہیے یعنی آپؐ کے بعد بھی کسی قسم کا کوئی رسول نہیں ہوگا۔

(۱۲۳) * یہ معلوم نہیں ہے کہ یہاں ستر کا عدد کس مناسبت سے ذکر کیا گیا ہے۔ جب کوئی متکلم کوئی خاص عدد ذکر کرتا ہے تو اس کے ذہن میں اس عدد کا کوئی خاص معیار ہوتا ہے جب تک اس کا وہ معیار اور اعتبار ذہنی معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک اس عدد پر بحث کرنا کجروی ہے ایک ہی مقدار کو پیسوں کے لحاظ سے ۶۴ اور آنوں کے اعتبار سے ۱۶ اور روپیہ کے لحاظ سے ایک کہا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہاں ۷۰ کے عدد میں کس خاص بات کی رعایت کی گئی ہے۔

يَـوْمَ الْقِيَامَةِ. اخرجه ابن راهويه فى مسنده و ابن ابى شيبة فى المصنف.

(الخصائص ج ۲ ص ۲۰۹)

ہوں گے۔

اس حدیث کو ابن راہویہ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے۔

(۱۲۵) عَـنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ مَـرْفُوْعًا تُكْمَلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُوْنَ اُمَّةً نَحْنُ اٰخِـرُهَـا وَ خَيْرُهَا. (رواه ابن ماجة و الدارمی كذافی الكنز ج ٦ ص ٢٣٢. و رواه الترمذی و قال هذا حديث حسن المشكوة ص ٥٨٤)

(۱۲۵) بھز بن حکیم اپنے باپ حکیم اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ستر امتیں پوری ہو جائیں گی۔ ہم ان سب سے آخر اور سب سے بہتر ہوں گے۔

(اس حدیث کو ابن ماجہ' دارمی اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۲۶) عَـنِ ابْـنِ عَبَّـاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَـلَّـى الـلّٰـهُ عَـلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ اٰخِرُ الْاُمَمِ وَ اَوَّلُ مَـنْ يُـحَاسَبُ. اَيْنَ الْاُمَّةُ الْاُمِّيَّةُ وَ نَبِيُّهَا فَـنَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ. (رواه ابن ماجه الكنز ج٦ ص ٢٣٠)

(۱۲۶) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم سب سے آخری امت ہیں اور قیامت میں سب سے پہلے ہمارا حساب ہوگا۔ پکارا جائے گا امت امیہ اور اس کا نبی کہاں ہیں؟ اس لیے گو ہم سب سے آخر میں ہیں مگر (قیامت کے دن) سب سے پہلے ہو جائیں گے۔ اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے

(۱۲۷) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ ؓ قَـالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَـامَةِ بَيْـدَ اَنَّهُمْ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا وَ اُوْتِيْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ. (رواه الشيخان و النسائی' الكنز ج ٦ ص ٢٣٠ - و مثله عند ابی نعيم فی الدلائل ص ٩)

(۱۲۷) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم سب سے آخر ہیں اور قیامت میں سب سے پہلے ہو جائیں گے صرف اتنی بات ہے کہ پہلی امتوں کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی ہے اور ہمیں ان کے بعد ملی ہے۔

(اس حدیث کو شیخین اور نسائی نے روایت کیا ہے)

(۱۲۸) عَـنْ حُـذَيْفَةَ ؓ مِثْـلَـهٗ وَ لَـفْـظُـهٗ نَحْنُ الْاٰخِــرُوْنَ مِنْ اَهْـلِ الـدُّنْيَـا وَ الْاَوَّلُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواه مسلم)

(۱۲۸) حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہی مضمون مروی ہے اس کے لفظ یہ ہیں کہ ہم دنیا میں سب سے آخری امت ہیں اور قیامت میں سب سے پہلے ہوں گے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

---

(۱۲۸) * انجیل متی کے باب ۱۹ میں آیت ۲۷ سے لے کر ۳۰ تک امت محمدیہؐ کے اس وصف کی طرف اشارہ موجود ہے۔
''پطرس نے جواب میں اس سے کہا کہ دیکھ ہم تو سب کو چھوڑ کر تیرے پیچھے ہوئے ہیں پس ہم کو کیا ملے گا؟ یسوع نے ان سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو گئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے اور جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں' یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا۔ اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔ لیکن بہت سے اوّل آخر ہو جائیں ﷺ ....

مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اٰخر مساجد الانبیاء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد انبیاء علیہ السلام کی مسجدوں میں آخری مسجد ہے

(۱۲۹) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ اِبْرَاھِیْمَ بْنِ قَارِظٍ اَشْھَدُ اَنِّیْ سَمِعْتُ اَبَاھُرَیْرَۃَؓ یَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاِنِّیْ اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَ مَسْجِدِیْ اٰخِرُ الْمَسَاجِدِ. (رواہ مسلم و النسائی و لفظہ خاتم الانبیاء و خاتم المساجد)

(۱۲۹) عبداللہ بن ابراہیم بن قارظ کہتے ہیں- میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں سب انبیاء کے آخر میں ہوں اور میری مسجد بھی اب آخری مسجد ہے-[1]

اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور نسائی کے لفظ میں آخر کے بجائے دونوں جگہ خاتم کا لفظ ہے-

(۱۳۰) عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ الْبَاھِلِیِّؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ اَنَا اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَ اَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ. (رواہ ابن ماجۃ فی باب فتنۃ الدجال و ابن خزیمۃ و الحاکم و اضیاء. منتخب الکنز ج ٦ ص ٤١)

(۱۳۰) ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک طویل حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ میں انبیاء میں آخر ہوں اور تم امتوں میں آخر ہو- اس حدیث کو ابن ماجہ نے فتنہ دجال کے باب میں روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ حاکم اور ضیاء الدین نے روایت کیا ہے-

(۱۳۱) عَنْ عَائِشَۃَؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ وَ مَسْجِدِیْ خَاتَمُ مَسَاجِدِ الْاَنْبِیَاءِ. (رواہ الدیلمی و ابن النجار و البزار. الکنز)

(۱۳۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں انبیاء علیہم السلام میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد انبیاء کی مسجدوں میں آخری مسجد ہے-
(اس حدیث کو دیلمی، ابن النجار اور بزار نے روایت کیا ہے)

﴿...گے اور آخر اوّل، الخ-"

ان الفاظ میں قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی طرف بھی اشارہ ہے- ﴿قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَاؤُکُمْ وَ اَبْنَاؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ..... الآیۃ﴾ (التوبۃ : ٢٤)

(۱۳۰) ٭ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی ہوتو اس امت کے بعد کوئی دوسری امت ہوگی مگر چونکہ عالم کا فناء مقدر ہو چکا ہے اس لیے نہ کوئی اور نبی آئے گا نہ کوئی نئی امت، یہ نبی بھی آخری نبی ہے اور اس لیے- امت بھی آخری امت ہے-

(۱۳۱) ٭ اس حدیث سے مسلم کی حدیث کی شرح ہوگئی اور معلوم ہوگیا کہ آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام کے ناموں سے دنیا میں مسجدیں تعمیر ہوئیں اب آئندہ چونکہ کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے اس لیے کوئی نئی مسجد بھی کسی رسول کے نام سے تعمیر نہ ہو گی بلکہ یہ مسجد نبوی ہی انبیاء علیہم السلام کی مسجدوں میں آخری مسجد رہے گی-

---

[1] آپ کی مسجد کے آخری مسجد ہونے کی شرح اوپر حدیث نمبر ۱۳۱ میں آرہی ہے-

قال الرب تبارک و تعالی لیلۃ الاسراء انہ جعلہ خاتم النبیین

(۱۳۲) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا اُسْرِیَ لِیْ اِلَی السَّمَاءِ قَرَّبَنِیْ رَبِّیْ تَعَالٰی حَتّٰی کَانَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَہٗ کَقَابِ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی قَالَ یَا حَبِیْبِیْ یَا مُحَمَّدُ قُلْتُ لَبَّیْکَ یَا رَبِّ قَالَ ھَلْ غَمَّکَ اِنْ جَعَلْتُکَ اٰخِرَ النَّبِیِّیْنَ قُلْتُ لَا یَا رَبِّ قَالَ حَبِیْبِیْ ھَلْ غَمَّ اُمَّتَکَ اِنْ جَعَلْتُھُمْ اٰخِرَ الْاُمَمِ قُلْتُ یَا رَبِّ لَا قَالَ اَبْلِغْ عَنِّی السَّلَامَ وَ اَخْبِرْھُمْ اِنِّیْ جَعَلْتُھُمْ اٰخِرَ الْاُمَمِ. (رواہ الخطیب و الدیلمی. الکنز ج ٦ ص ١١٢)

شب معراج میں پروردگار عالم کا راز و نیاز کے طور پر کہنا کہ اس نے آپ کو خاتم النبیین بنایا ہے

(۱۳۲) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شب معراج میں مجھے آسمان پر لے گئے تو میرے پروردگار نے مجھے قریب بلایا اور بہت قریب بلایا - اور کہا اے میرے حبیب' اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! میں نے کہا حاضر ہوں اے پروردگار - ارشاد ہوا اگر ہم تمہیں آخر النبیین بنا دیں تو تم ناخوش تو نہ ہو گے - میں نے عرض کیا اے پروردگار نہیں - پھر ارشاد ہوا اگر تمہاری امت کو آخری امت بنا دیں تو وہ ناخوش تو نہ ہوگی - میں نے عرض کیا نہیں اے پروردگار - ارشاد ہوا کہ اچھا تو اپنی امت کو میرا اسلام کہنا اور انہیں بتلا دینا کہ میں نے انہیں آخری امت بنا دیا ہے -

(کنز العمال)

قال الرب لاٰدم ان ابنہ احمدؐ ھو الاول و الاٰخر

(۱۳۳) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اٰدَمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَخْبَرَ بِبَنِیْہِ فَجَعَلَ یَرٰی فَضَائِلَ بَعْضِھِمْ عَلٰی بَعْضٍ فَرَاٰی نُوْرًا سَاطِعًا فِیْ اَسْفَلِھِمْ قَالَ یَا رَبِّ مَنْ ھٰذَا قَالَ ھٰذَا اِبْنُکَ اَحْمَدُ ھُوَ الْاَوَّلُ وَ ھُوَ الْاٰخِرُ وَ ھُوَ شَافِعٌ وَ اَوَّلُ مُشَفَّعٍ.

(رواہ ابن عساکر کما فی الکنز)

حضرت آدمؑ سے حق تعالیٰ کا ارشاد کہ ان کے فرزند احمد و محمد ﷺ سب سے پہلے اور آخری نبی ہیں

(۱۳۳) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو انہیں ان کی اولاد بھی بتلائی - آدم علیہ السلام انہیں دیکھنے لگے کہ بعض بعض پر فضیلت رکھتے ہیں' ان سب کے آخر میں ایک بلند نور دیکھا تو عرض کیا اے میرے پروردگار یہ کون ہیں' ارشاد ہوا یہ تمہارے فرزند احمدؐ ہیں' یہی سب سے پہلے نبی ہیں اور یہی سب سے آخر ہیں' یہی قیامت میں سب سے پہلے شفاعت کریں گے اور ان ہی کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی -

(اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے)

قال جبرئیل لاٰدم ان محمدا ﷺ اٰخر و لدک من الانبیاءؑ

(۱۳۴) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

حضرت آدم سے جبرئیلؑ کا ارشاد کہ محمد ﷺ انبیاء میں آپ کے سب سے آخری بیٹے ہیں

(۱۳۴) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱۳۴) * اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان ابتداء عالم میں بھی ہوئی ہے - ضرورت ہے کہ اس حدیث کے طرق جمع کیے جائیں ....

3

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا نَزَلَ اٰدَمُ بِالْهِنْدِ وَ اسْتَوْحَشَ فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ فَنَادٰى بِاَذَانِ اللّٰهُ اَكْبَرُ اللّٰهُ اَكْبَرُ مَرَّتَيْنِ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مَرَّتَيْنِ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ مَرَّتَيْنِ قَالَ اٰدَمُ لِجِبْرِيْلَ مَنْ مُحَمَّدٌ قَالَ اٰخِرُ وُلْدِكَ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ. (رواه ابن عساکر الکنز ج ٦ ص ١١٤ و الخصائص ج ١ ص ٨)

نے فرمایا ہے آدم علیہ السلام جب ہندوستان میں نازل ہوئے (اور تنہائی کی وجہ سے) گھبرائے تو جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور اذان کہی اللہ اکبر اللہ اکبر دو مرتبہ اشھد ان لا الہ الا اللہ دو مرتبہ اشھد ان محمدا رسول اللہ دو مرتبہ (جب حضرت آدم علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سنا تو) فرمایا کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام نے کہا انبیاء علیہم السلام میں آپ کے سب سے آخری بیٹے ہیں۔

(اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے)

قال جبريل للنبي ﷺ انك خاتم النبيين كما ان ادم صفي الله

آنحضرت ﷺ سے حضرت جبرئیل کا فرمان کہ جس طرح حضرت آدمؑ کا لقب صفی اللہ تھا آپؐ کا لقب خاتم النبیین ہے

(۱۳۵) عَنْ سَلْمَانَ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ قَالَ جِبْرِيْلُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَبَّكَ يَقُوْلُ اِنْ كُنْتُ اصْطَفَيْتُ اٰدَمَ فَقَدْ خَتَمْتُ بِكَ الْاَنْبِيَاءَ وَ مَا خَلَقْتُ خَلْقًا اَكْرَمَ مِنْكَ عَلَيَّ. (خصائص ج ٢ ص ١٩٣)

(۱۳۵) سلمانؓ سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ کا پروردگار کہتا ہے اگر میں نے آدمؑ کو صفی اللہ کا خطاب دیا ہے تو آپؐ پر تمام انبیاءؑ کو ختم کر کے (خاتم النبیین کا خطاب دیا ہے) اور میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز ہو۔

مكتوب بين كتفي ادم محمد رسول الله خاتم النبيين

حضرت آدم کے دونوں شانوں کے درمیان یہ لکھا ہوا تھا محمد رسول اللہ خاتم النبیین ہیں

(۱۳۶) عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ بَيْنَ كَتِفَيْ اٰدَمَ مَكْتُوْبٌ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ. (رواه ابن عساکر، خصائص ج ١ ص ٧)

(۱۳۶) جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان یہ لکھا ہوا تھا ''محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم النبیین'' ہیں۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔

لله .... جائیں تاکہ اس کے تفصیلی کلمات کا پتہ بھی مل جائے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ اذان کا ایک نفع دفع وحشت بھی ہے سوم یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی جائے نزول ہندوستان میں کوئی جگہ ہے اگر یہ حدیث صحت کو پہنچ جائے تو تاریخی لحاظ سے یہ ایک بڑی حقیقت کا انکشاف ہوگا۔ ہم نے اس حدیث کو یہاں صرف آخری جزء کی وجہ سے نقل کیا ہے۔

(۱۳۵) * اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپؐ کا نبیوں میں آخر ہونا صرف ایک زمانی تاخر نہیں ہے بلکہ خدا کے نزدیک وہ خاص فضیلت ہے جو دیگر انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات کے بالمقابل میں آپؐ کو مرحمت ہوئی ہے۔ عالم کا تدریجی ارتقاء بھی اسی کو مقتضی تھا کہ اس کی آخری کڑی سب میں کامل و برتر ہو۔ اس لیے آخری نبی وہی ہونا چاہیے جو سب میں کامل اور سب سے اکرم ہو۔

(۱۳۶) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر نبوۃ بھی دونوں شانوں کے درمیان تھی مگر دجال کا کفر اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہوگا یعنی مُہر نبوۃ کا مقام دونوں شانوں کے درمیان اور مُہر دجل و کفر کا محل پیشانی منتخب ہوا ہے۔ اس کی حکمتیں بھی علماء نے لکھی ہیں۔

الشهادة بختم النبوة جزء من الايمان كالشهادة بكلمة التوحيد

عقیدۂ ختم نبوۃ کلمہ شہادت کی طرح ایمان کا جزء ہے

(۱۳۷) عَنْ زَيْدِ بْنِ حَارِثَةَ رضی اللہ عنہ فِيْ قِصَّةٍ طَوِيْلَةٍ لَهُ حِيْنَ جَاءَتْ عَشِيْرَتُهُ يَطْلُبُوْنَهُ مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ مَا اَسْلَمَ فَقَالُوْا لَهُ امْضِ مَعَنَا يَا زَيْدُ فَقَالَ مَا اُرِيْدُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَدَلاً وَ لَا غَيْرَهُ اَحَدًا فَقَالُوْا مُحَمَّدُ اِنَّا مُعْطُوْكَ بِهٰذَا الْغُلَامِ دِيَاتٍ فَسَمِّ مَا شِئْتَ فَاِنَّا حَامِلُوْهُ اِلَيْكَ فَقَالَ اَسْأَلُكُمْ اَنْ تَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنِّيْ خَاتَمُ اَنْبِيَائِهِ وَ رُسُلِهِ وَ اُرْسِلُهُ مَعَكُمْ الحديث. اخرجه الحاكم مفصلا في المستدرك. (ج ۳ ص ۲۱۴)

(۱۳۷) زید بن حارثہؓ اپنے ایک طویل قصہ میں ذکر کرتے ہیں کہ جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر مسلمان ہو گیا تو میرا قبیلہ مجھے تلاش کرتا ہوا آپؐ کے پاس آیا اور مجھ سے کہا اے زید ہمارے ساتھ چلو' زید بولے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدلہ میں کسی کو پسند نہیں کرسکتا اور نہ آپؐ کے سوا کسی دوسرے کا ارادہ رکھتا ہوں' انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس لڑکے کے عوض میں ہم آپؐ کو بہت سا مال دے سکتے ہیں جو آپؐ چاہیں بتا دیجئے ہم اسے ادا کر دیں گے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا میں تو تم سے صرف ایک چیز مانگتا ہوں وہ یہ کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ اور اس کی کہ میں اس کے سب نبیوں اور رسولوں میں آخری نبی اور رسول ہوں۔ بس میں اس لڑکے کو ابھی تمہارے ساتھ بھیجے دیتا ہوں۔ (مستدرک)

ختم النبوة من خصائص النبي صلى الله عليه وسلم

ختم نبوۃ انبیاء علیہم السلام میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طغرۂ امتیاز ہے

(۱۳۸) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى

(۱۳۸) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

(۱۳۷) ✽ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح خدا کی توحید پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح اپنی ختم نبوۃ پر بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان آپؐ کی ختم نبوۃ پر ایمان لائے بغیر حاصل ہی نہیں ہوسکتا قرآن کریم میں وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ کے ساتھ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کا لفظ اسی لیے رکھا گیا ہے کہ آپ صرف رسول اللہ نہیں ہیں بلکہ خاتم النبیین بھی ہیں۔ اس کے برخلاف آپؐ سے پیشتر جتنے رسول ہوئے وہ صرف رسول اللہ تھے اسی لیے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم النبیین ہے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص لقب ہے اور آپؐ نے ہی اس کا دعویٰ کیا ہے اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کا یہ لقب بطور مدح نہیں بلکہ بہ حیثیت عقیدہ کے ایک عقیدہ ہے۔ خاتم الشعراء اور خاتم المحدثین کی طرح صرف ایک محاورہ نہیں۔

(۱۳۸) ✽ اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند خصوصیات شمار کی گئی ہیں یہ خصوصیات صرف چھ تک محدود نہیں بلکہ بہت ہیں۔ حافظ سیوطیؒ نے اسی موضوع پر دو ضخیم جلدوں کی ایک کتاب لکھ دی ہے جو خصائص الکبریٰ کے نام سے مشہور ہے۔ مفہوم عدد علماء کے نزدیک معتبر نہیں۔ یہ متکلم کے وقتی استحضار اور اس کے ذہنی اعتبار کی بات ہوتی ہے۔ یہاں ۵ و ۶ خصوصیتیں زیر بحث ہیں بقیہ خصوصیات پر اپنی اپنی جگہ بحث آئے گی خصوصیت (۵) کا مطلب علماء کے نزدیک یہ ہے کہ آپؐ کی بعثت آپؐ کے زمانہ سے لے کر قیامت تک کے لیے ہے....

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُضِّلْتُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ اُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَ اُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَ جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَ طَهُوْرًا وَ اُرْسِلْتُ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَّ خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ.

(رواه مسلم و البخاری)

مجھے انبیاء علیہ السلام پر چھ فضیلتیں دی گئی ہیں (۱) مجھے مختصر کلمات معانی کثیرہ کے حامل دیئے گئے ہیں (۲) دشمن پر رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے (۳) میرے لیے مالِ غنیمت حلال کیا گیا ہے۔ (۴) تمام زمین میرے لیے مسجد اور پاک کرنے کا آلہ بنا دی گئی ہے (۵) تمام مخلوق کی طرف مجھے بھیجا گیا ہے۔ (۶) انبیاء کا سلسلہ میری ذات پر ختم کر دیا گیا ہے۔

(اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

خاتم النبوة كان دليلاً على كونه خاتم النبيين

مُہر نبوۃ خود اس کی دلیل تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں

(۱۳۹) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ وَ هُوَ خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ. (رواه الترمذی فی شمائله)

(۱۳۹) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ ؐ کے دونوں شانوں کے درمیان مُہر نبوۃ تھی۔ کیونکہ آپ ؐ خاتم النبیین تھے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

دعوى النبى صلى الله عليه وسلم انه خاتم النبيين و اخرهم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرنا کہ خاتم النبیین اور آخری نبی میں ہوں

(۱۴۰) عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنِّىْ

(۱۴۰) عرباض بن ساریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں عبد اللہ ہوں۔ (اللہ کا بندہ) اور میں خاتم

﴿ .... ہے۔لیکن شیخ تقی الدین سبکی فرماتے ہیں کہ آپ ؐ کی بعثت آپ ؐ سے پیشتر اور آپ ؐ کے بعد دونوں زمانوں کو شامل ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والی دنیا سب آپ ؐ کی بعثت کے ماتحت ہے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ خاتم النبیین آپ ؐ کی ایک خصوصیت تھی صرف تعریفی لقب نہ تھا جو مجازاً دوسروں پر بھی اطلاق ہوسکتا۔

(۱۳۹) ٭ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ کی اس معنوی خصوصیت کو حسی شکل میں بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کتب سابقہ میں مُہر نبوۃ آپ ؐ کی ایک علامت بتلائی گئی تھی۔ اسی لیے بعض طالبین حق نے منجملہ اور علامات کے آپ ؐ کی مُہر نبوۃ کو بھی تلاش کیا ہے۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاتم النبیین آپ ؐ کا شاعرانہ لقب نہ تھا بلکہ مُہر نبوۃ اور آخری نبی ہونے کی وجہ سے آپ ؐ کو خاتم النبیین کہا جاتا تھا۔

(۱۴۰) ٭ حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتوی نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف معنیٰ ترکیبی کے لحاظ سے ''عبد اللہ'' نہیں ہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام میں ''عبد اللہ'' آپ کا لقب بھی تھا۔ قرآن کریم میں ''عبد اللہ'' بطور لقب صرف آپ ؐ کی ذات پر اطلاق ہوا ہے ''فلما قام "عبدالله" كادوا يكونون عليه لبدا'' جب ''عبد اللہ'' (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو قریب تھا کہ وہ تہ بہ تہ ہو کر آپ ؐ پر ٹوٹ پڑتے۔'' حدیث میں ہے کہ آپ ؐ کو اختیار دیا گیا تھا اگر چاہیں رسالت کے ساتھ ملوکیت پسند کر لیں۔ جیسا کہ سلیمان علیہ السلام تھے یا چاہیں تو عبدیت اختیار کر لیں۔ آپ ؐ نے عبدیت کو ہی پسند فرما لیا اس کے بعد آپ کی نشست و برخاست، طعام و شراب سب میں عبدیت کا پہلو غالب تھا۔ دعاء تشہد میں بھی عبده و رسوله تعلیم کیا گیا ہے یعنی عبدیت کو مقدم رکھا گیا ہے حتیٰ کہ ایک شخص نے اس ترتیب کو بدل کر جب رسوله و عبده کہا تو آپ ؐ نے اس کی اصلاح فرمائی اور کہا کہ وہی عبده و رسوله کہو شیخ اکبرؒ تحریر فرماتے ہیں ﴾ ....

عَبْدُاللّٰهِ وَ خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ. (رواه البيهقى و الحاكم و صححه (كذا فى الدر المنثور ج ٥ ص ٢٠٧)

النبیین ہوں (آخری نبی)

(اس حدیث کو بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے)

(۱۴۱) عَنْ اَبِیْ سَعِيْدٍؓ مَرْفُوْعًا اِنِّیْ خَاتِمُ اَلْفِ نَبِیٍّ اَوْ اَكْثَرَ.

(رواه فى المستدرك الكنز ج٦ ص ١٢١)

(۱۴۱) ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں- میں ایک ہزار نبی یا اس سے زیادہ کے آخر میں آیا ہوں-

(اس حدیث کو مستدرک میں روایت کیا ہے)

(۱۴۲) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا اَبَا ذَرٍّ اَوَّلُ الْاَنْبِيَاءِ اٰدَمُ وَ اٰخِرُهُمْ مُحَمَّدٌ. (رواه ابن حبان فى صحيحه و ابو نعيم فى الحليه و ابن عساكر و الحكيم الترمذى (الكنز ج ٦ ص ١٣٠) و اخرجه ابن حبان فى تاريخه فى السنة العاشرة ص ٦٩ مخطوط)

(۱۴۲) ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوذر انبیاء علیہم السلام میں سب سے پہلے نبی حضرت آدم اور سب کے آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں-

اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور ابونعیم نے الحلیہ میں اور ابن عساکر اور حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے نیز ابن حبان نے اپنی تاریخ میں ۱۰ھ کے احوال میں اس کو روایت کیا ہے- (از قلمی نسخہ)

وصية النبی ﷺ انه لا نبی بعده

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(۱۴۳) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ يَقُوْلُ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا

(۱۴۳) ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے (اور اس طرح تقریر فرمائی) جیسے کوئی رخصت

..... ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ پر یہ مقام عبدیت سوئی کے ناکے کے برابر منکشف ہوا تھا تو میں اس کی بھی تاب نہ لا سکا اور قریب تھا کہ جل جاتا- اسی طرح آپؐ کا دوسرا لقب خاتم النبیین ہے- پہلا لقب آپؐ کی ذاتی صفت اور دوسرا بلحاظ انبیاء علیہم السلام ہے- آپؐ سے پہلے کسی رسول نے یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ دوسرے رسولوں کی آمد کی بشارت دی ہے اگر یہ لقب صرف شاعرانہ مبالغہ ہوتا تو آپؐ سے پہلے انبیاء پر بھی اس کا اطلاق درست ہوتا- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرنا بتلاتا ہے کہ پہلے صحف میں کسی خاتم النبیین کی بشارت موجود تھی آپؐ بتلا رہے ہیں کہ اس کا مصداق میں ہوں-

(۱۴۱) ٭ مشکوٰۃ میں ایک حدیث میں انبیاء علیہم السلام کا عدد ایک لاکھ چوبیس ہزار مذکور ہے چونکہ یہاں راوی نے اَوْ اَكْثَرَ کا لفظ کہہ دیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اصل عدد محفوظ نہیں رہا اس لیے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے- اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس حدیث میں ہزار کے عدد سے کسی خاص شان کے نبی مراد لیے گئے ہوں-

(۱۴۲) ٭ انبیاء علیہم السلام کے اول و آخر کی اس تحدید سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی شخص جس کو نبی کہہ کر پکارا جائے نہیں ہوگا- پہلے آدم علیہ السلام ہیں اور آخری آپؐ اور بس- نیز اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی نبوۃ کی تصریح بھی موجود ہے اسی طرح مشکوٰۃ میں ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ حضرت آدمؑ نبی تھے تو آپؐ نے فرمایا نعم نبی مکلم ہاں خدا کے نبی تھے- خدا تعالیٰ ان سے باتیں کرتا تھا-

كَالْمُوَدِّعِ فَقَالَ اَنَا النَّبِيُّ الْاُمِّيُّ ثَلَاثًا وَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (الی قولہ) فَاسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا مَا دُمْتُ فِيْكُمْ فَاِذَا ذُهِبَ بِيْ فَعَلَيْكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَحِلُّوْا حَلَالَهٗ وَ حَرِّمُوْا حَرَامَهٗ.

(رواہ احمد فی مسندہ (تفسیر ابن کثیر ج ۸ ص ۹۱)

ہونے والا تقریر کیا کرتا ہے- آپؐ نے فرمایا کہ ''نبی امی'' (جن کی آمد کی خبر تھی وہ) میں ہی ہوں اور میرے بعد اب کوئی نبی نہ ہوگا- (اسی تقریر میں یہ بھی فرمایا) جب تک میں تمہارے اندر موجود ہوں میرے احکام سنو اور ان کی اتباع کرتے رہو اور جب مجھے دنیا سے اٹھالیا جائے تو تم کتاب اللہ کو مضبوط پکڑے رہنا جو اس میں حلال ہے اس کو حلال اور جو حرام ہے اس کو حرام سمجھتے رہنا- اس حدیث کو احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے-

(۱۴۴) عَنْ اَبِيْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ خُطْبَةِ يَوْمِ حَجَّةِ الْوَدَاعِ اَيُّهَا النَّاسُ اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَ لَا اُمَّةَ بَعْدَكُمْ فَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَصَلُّوْا خَمْسَكُمْ وَ صُوْمُوْا شَهْرَكُمْ وَ اَدُّوْا زَكٰوةَ اَمْوَالِكُمْ طَيِّبَةً بِهَا اَنْفُسُكُمْ وَ اَطِيْعُوْا وُلَاةَ اُمُوْرِكُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ. (منتخب الکنز علی ہامش مسند احمد ج ۲ ص ۲۹۱)

(۱۴۴) ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا اے لوگو! نہ تو میرے بعد اب کوئی نبی ہوگا اور نہ تمہارے بعد کوئی امت- بس اپنے رب کی عبادت کرتے رہو اور اپنی پانچ نمازیں پڑھتے رہو اور رمضان کے روزے رکھے جاؤ- اور اپنے مالوں کی زکوۃ خوشی خوشی دیئے جاؤ' اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرتے رہو تو اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے-

(۱۴۵) عَنْ اَبِيْ قَبِيْلَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَ لَا اُمَّةَ بَعْدَكُمْ فَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَ اَقِيْمُوْا خَمْسَكُمْ وَ صُوْمُوْا شَهْرَكُمْ وَ اَطِيْعُوْا وُلَاةَ اَمْرِكُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّةَ رَبِّكُمْ. (رواہ الطبرانی و البغوی کذافی الکنز)

(۱۴۵) ابوقبیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے بعد اب کوئی نبی نہیں ہوگا اور تمہارے بعد اب کوئی امت نہیں آئے گی پس تم اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو' اپنی پانچ نمازیں ٹھیک ٹھیک پڑھتے رہو' ماہ رمضان کے روزے رکھتے رہو' اور اپنے حکام کی اطاعت کیے جاؤ' اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے-

(۱۴۶) عَنِ الضَّحَّاكِ بْنِ نَوْفَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَ لَا اُمَّةَ بَعْدَ اُمَّتِيْ.

(رواہ البیہقی فی کتاب الرؤیا)

(۱۴۶) ضحاک بن نوفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا- میرے بعد اب کوئی نبی نہ ہوگا اور میری امت کے بعد کوئی امت نہیں ہوگی-

(اس حدیث کو بیہقی نے کتاب الرؤیا میں روایت کیا ہے)

---

(۱۴۴) * مطلب یہ ہے کہ نجات اب صرف ان فرائض اسلام پر عمل کرنے میں منحصر ہوگئی ہے اگر پہلے زمانہ کی طرح آئندہ کوئی رسول آنے والا ہوتا تو اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہوتا- اب ایمان کا معاملہ تو مکمل ہو چکا ہے صرف عمل کا مرحلہ باقی ہے وہ بھی اتنا مختصر ہے کہ بس فرائض کے یہ چند قدم ہیں انہیں طے کرو اور آگے جنت ہے-

تصدیق ماھان عامل الروم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا نبی بعدہ

(۱۴۷) عَنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيْدِ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ اَنَّهٗ سَأَلَهٗ مَاهَانَ عَامِلُ مَلِكِ الرُّوْمِ عَلَى الشَّامِ هَلْ كَانَ رَسُوْلُكُمْ اَخْبَرَ اَنَّهٗ يَأْتِيْ بَعْدَهٗ رَسُوْلٌ قَالَ وَ لٰكِنْ اَخْبَرَ اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ وَ اَخْبَرَ اَنَّ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ قَدْ بَشَّرَ بِهٖ قَوْمَهٗ قَالَ الرُّوْمِيُّ وَ اَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ. (خصائص ج ۲ ص ۲۸۴)

ملک روم کے گورنر کی تصدیق کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(۱۴۷) خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک طویل حدیث میں کہا کہ ماہان نے جو شام پر شاہِ روم کا عامل تھا ان سے دریافت کیا' کیا تمہارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم سے یہ کہا ہے کہ ان کے بعد کوئی اور رسول آئے گا؟ انہوں نے کہا نہیں بلکہ یہ خبر دی ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا - اور یہ بھی کہا کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام نے ان کی آمد کی بشارت اپنی قوم کو دی تھی - ماہان رومی نے کہا کہ میں بھی اس پر گواہی دینے والوں میں ہوں -

شھادۃ الضب انہ رسول اللہ و خاتم النبیّین

(۱۴۸) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِؓ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ فَقَالَ الْاَعْرَابِيُّ لَا اٰمَنْتُ بِكَ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِكَ هٰذَا الضَّبُّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَنَا يَاضَبُّ فَقَالَ الضَّبُّ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ يَفْهَمُهُ الْقَوْمُ جَمِيْعًا لَبَّيْكَ

گوہ کی شہادت کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں

(۱۴۸) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک طویل قصہ میں روایت فرماتے ہیں (کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دیہاتی آدمی کو اسلام کی دعوت دی) اس نے کہا جب تک یہ گوہ ایمان نہ لائے میں آپؐ پر ایمان نہیں لا سکتا - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا اے گوہ بتلا میں کون ہوں؟ گوہ نے نہایت فصیح عربی میں جواب دیا جسے سب حاضرین نے سمجھا

---

(۱۴۷) * حضرت ابوعبیدہؓ جب یرموک پہنچے تو روم کے لشکر کے سردار نے ان کے پاس ایک قاصد بھیجا اس نے کہا کہ میں ماہان گورنر کے پاس سے آیا ہوں - انہوں نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی جماعت میں سے ایک عقل مند شخص ہمارے پاس بھیج دیں تاکہ ہم اس سے گفتگو کرلیں حضرت ابوعبیدہؓ نے اس کام کے لیے خالد بن ولیدؓ کو منتخب فرمایا اور انہوں نے وہ گفتگو کی جو اوپر مذکور ہے - اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلی بشارات میں نبی منتظر کی ایک علامت یہ بھی تھی کہ اس کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اس لیے دوسری باتوں کے ساتھ اس کی تحقیق بھی کی جاتی تھی کہ اور انبیاء کی طرح آپؐ نے کسی نبی کی آمد کی خبر تو نہیں دی -

(۱۴۸) * حیوانات کی گفتگو اور ان کی شہادت دینا اگر بطور عادت و فطرت نقل کی جائے تو بے شک تعجب کرنا چاہیے اگر بطریق معجزہ منقول ہو تو اس پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے انبیاء علیہم السلام کے معجزات تمام خارقِ عادات ہی ہوتے ہیں اور ان میں بہت سے تواتر سے بھی ثابت ہیں لہٰذا صرف اس وجہ سے حدیث کا انکار نہیں کیا جا سکتا ہاں اگر اس کا روایتی پہلو ناقابل اعتبار ہوتا تو بے شک ایک بات ہو سکتی تھی - مگر اس کا روایتی پہلو بھی اتنا مخدوش نہیں ہے - یہاں حیوان کی شہادت میں لفظ رسول اللہ کے ساتھ خاتم النبیین کا لفظ ایسا ہی ہے جیسا کہ آیت قرآنی میں یہ دونوں لفظ یکجا رکھے گئے ہیں - اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا صحیح اور ﷲ ....

وَسَعْدَيْكَ يَا رَسُوْلَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ قَالَ مَنْ تَعْبُدُ فَقَالَ الَّذِیْ فِی السَّمَاءِ عَرْشُهُ وَ فِی الْاَرْضِ سُلْطَانُهُ وَ فِی الْبَحْرِ سَبِيْلُهُ وَ فِی الْجَنَّةِ رَحْمَتُهُ وَ فِی النَّارِ عَذَابُهُ قَالَ فَمَنْ اَنَا قَالَ اَنْتَ رَسُوْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ. الحديث. اخرجه الطبرانی فی الاوسط و الصغير و ابن عدی و الحاکم فی المعجزات و البيهقی و ابو نعيم و ابن عساکر و ليس فی اسناده من ينظر فی حاله سوی محمد بن علی بن الوليد البصری السلمی شيخ الطبرانی و ابن عدی و قال السيوطی فی الخصائص قلت لحديث عمر طريق اخر ليس فيه محمد بن علی بن الوليد اخرجه ابو نعيم وروی عن عائشة و ابی هريرة و علی رضی الله تعالی عنهم مثله کما فی الخصائص (ج ٢ ص ٦٥)

اے رب العالمین کے رسول میں حاضر ہوں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فرمان بردار ہوں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا بتلا تو کس کے نام کی تسبیح کرتی ہے؟ وہ بولی جس کا عرش آسمان پر ہے اور جس کا حکم زمین پر نافذ ہے، جس نے سمندر میں راستے بنادیئے جس کی رحمت کا مظہر جنت، جس کے عذاب کا مظہر دوزخ ہے۔ آپؐ نے فرمایا میں کون ہوں؟ اس نے جواب دیا، آپؐ جہاں کے پروردگار کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم اوسط اور معجم صغیر میں اور ابن عدی نے اور حاکم نے معجزات اور بیہقی، ابونعیم اور ابن عساکر نے روایت کیا ہے اور اس کے راویوں میں سوائے محمد بن علی بن الولید کے کوئی راوی ایسا نہیں ہے جس کے معاملہ میں غور کرنے کی ضرورت ہو، یہ طبرانی اور ابن عدی کے شیخ ہیں۔ سیوطی خصائص الکبریٰ میں فرماتے ہیں۔ کہ حدیث عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے ایک اور طریقہ بھی ہے جس میں یہ راوی نہیں ہے ابونعیم نے ان کو بیان کیا ہے نیز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی اسی کے ہم معنی مضمون مروی ہے۔

شهادة زيد بن خارجة بعد وفاته انه صلی الله عليه وسلم لا نبی بعده

وفات کے بعد زید بن خارجہ کی شہادت کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(١٤٩) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ قَالَ كَانَ زَيْدُ بْنُ

(۱۴۹) نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زید بن

﴾ .... پورا مفہوم اسی وقت ادا ہوتا ہے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بھی سمجھا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنا اور خاتم النبیین نہ کہنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کے صرف ایک جزء ہی کو ادا کرتا ہے اور وہ بھی مشترک جزء کو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب عالی کا ممتاز جزء خاتم النبیین ہے لیکن چونکہ یہ دونوں حیثیتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع تھیں اور اس طرح جمع تھیں گویا ایک ذات کے دو عنوان ہیں اس لیے عام طور پر صرف اقرار رسالت ختم نبوۃ کے اقرار کے لیے کافی سمجھا گیا تھا جیسا کہ کلمہ توحید کا۔ اس کا اقرار گو رسالت کے اقرار سے ایک جداگانہ شئے ہے مگر جو توحید کہ آپؐ کی حکم برداری میں تسلیم کی جائے وہ اقرار بالرسالت کے ہم معنی تھی اس لیے بعض احادیث میں صرف کلمہ توحید کی شہادت کو مدار نجات قرار دے دیا گیا ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور ختم نبوت کا مسئلہ سمجھنا چاہیے۔

(۱۴۹) * کرامت کے طور پر میت کا بولنا بھی کچھ تعجب کی بات نہیں تھی مگر راوی نے اس کی ایک اور توجیہ بھی کردی ہے اور وہ یہ ﴿ ....

خَارِجَةَ مِنْ سَرَاةِ الْاَنْصَارِ فَبَيْنَمَا هُوَ يَمْشِيْ فِيْ طَرِيْقٍ مِنْ طُرُقِ الْمَدِيْنَةِ بَيْنَ الظُّهْرِ وَ الْعَصْرِ اِذْخَرَّ فَتُوُفِّيَ فَاُعْلِمَتْ بِهِ الْاَنْصَارُ فَاَتَوْهُ فَاحْتَمَلُوْهُ اِلٰى بَيْتِهٖ وَ سَجُّوْهُ كِسَاءً وَ بُرْدَيْنِ وَ فِي الْبَيْتِ نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءِ الْاَنْصَارِ يَبْكِيْنَ عَلَيْهِ وَ رِجَالٌ مِنْ رِجَالِهِمْ فَمَكَثَ عَلٰى حَالِهٖ حَتّٰى اِذَا كَانَ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَ الْعِشَاءِ اِذْ سَمِعُوْا صَوْتَ قَائِلٍ يَقُوْلُ اَنْصِتُوْا اَنْصِتُوْا فَنَظَرُوْا فَاِذَا الصَّوْتُ مِنْ تَحْتِ الثِّيَابِ فَحَسَرُوْا عَنْ وَجْهِهٖ وَ صَدْرِهٖ فَاِذَا الْقَائِلُ يَقُوْلُ عَلٰى لِسَانِهٖ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ النَّبِيُّ الْاُمِّيُّ خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتَابِ الْاَوَّلِ صَدَقَ صَدَقَ.

خارجہ انصار کے سرداروں میں تھے ایک دن وہ ظہر وعصر کے درمیان مدینہ کے کسی راستہ پر جارہے تھے کہ یکایک گرے اور فوراً وفات ہوگئی انصار کو اس واقعہ کی خبر ہوئی وہ آئے اور انہیں اٹھا کر گھر لے گئے اور ایک کمبل اور دو چادروں سے ان کو ڈھانک دیا- گھر میں انصار کی کچھ عورتیں اور مرد اُن پر رورہے تھے یہ گریہ وزاری ہوتا رہا حتیٰ کہ جب مغرب وعشاء کا درمیان ہوا تو دفعتہً ایک غیبی آواز آئی ''خاموش رہو' خاموش رہو' اِدھر اُدھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ آواز ان کپڑوں کے نیچے سے ہی آرہی ہے جس میں میت ہے لوگوں نے ان کا منہ اور سینہ کھولا' کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی غیبی شخص ان کی زبان سے یہ کہہ رہا ہے ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' نبی' امی' خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں' ان کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہوگا - یہ تورات وانجیل میں موجود ہے- سچ ہے سچ ہے-

كان النبى صلى الله عليه وسلم رسولا الى اهل زمانه و من بعد هم سواء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ اور بعد میں آنے والے سب انسانوں کے لیے یکساں رسولؐ ہیں

(۱۵۰) عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَنْ اُدْرِكَ حَيًّا وَ مَنْ يُوْلَدُ بَعْدِيْ. (رواه ابن سعد. الكنز ج ٦ ص ١٠١ و الخصائص ج ٢ ص ١٨٨)

(۱۵۰) حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرسلاً روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں ان کا بھی رسول ہوں جو اب زندہ ہیں اور ان کا بھی جو میرے بعد پیدا ہوں گے-

(اس حدیث کو ابن سعد نے روایت کیا ہے)

ﷺ ....کہ یہاں بولنے والا دراصل کوئی فرشتہ تھا میت کی زبان ان کلمات کی ادائیگی کے لیے صرف ایک واسطہ کا کام دے رہی تھی- جمادات وحیوانات کے ان خارق عادت شہادات سے مقصود یہ ہے کہ بنی آدم کی فطرت زیادہ سے زیادہ متاثر ہوکر نصیحت وعبرت حاصل کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لیے اور زیادہ مستعد ہوجائے-

(۱۵۰) * بعثتِ عام اور ختم نبوۃ کو بڑا گہرا ربط ہے اسی لیے پہلی حدیث میں دونوں خصوصیتوں کو ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے اگر آپؐ کی بعثت عام نہ ہوتی اور نبوۃ ختم ہوجاتی تو آنے والی امت بلا رسول رہ جاتی یہ بجائے نعمت کے اور ایک زحمت ہوتی اس لیے جب نبوۃ کا ختم ہونا مقدر ہوا تو آپؐ کی بعثت کا دامن قیامت تک کے انسانوں پر پھیلا دیا گیا تاکہ رہتی دنیا تک تمام انسان اس کامل واکمل رسالت کے نیچے آجائیں اور کسی دوسرے رسولؐ کے محتاج نہ رہیں اور اگر آپؐ کی بعثت تو عام ہوتی مگر نبوۃ ختم نہ ہوتی تو اب آئندہ اگر کوئی کامل رسولؐ آتا اور آپ کی بجائے اس کی اتباع لازم ہوتی تو آپؐ کا نقصان ثابت ہوتا اور اگر کوئی ناقص رسولؐ آتا تو کامل کے ہوتے ہوئے ناقص کے دامن میں آنا بجائے رحمت کے زحمت بن جاتا (العیاذ باللہ) اس لیے بعثت عامہ کے بعد نبوۃ کا ختم ہونا ضروری اور لازم ہوگیا-

توضیح النبی ﷺ ختم النبوۃ بمثال

(۱۵۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ مَثَلِیْ وَ مَثَلَ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بَیْتًا فَاَحْسَنَهٗ وَاَجْمَلَهٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِیَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِهٖ وَ یَعْجَبُوْنَ لَهٗ وَ یَقُوْلُوْنَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ وَ اَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ. رواہ الشیخان و احمد و النسائی و الترمذی و فی بعض الفاظه فَكُنْتُ اَنَا سَدَدْتُ مَوْضِعَ اللَّبِنَةِ وَ خُتِمَ بِیَ الْبُنْیَانُ وَ خُتِمَ بِیَ الرُّسُلُ. (رواہ ابن عساکر کما فی الکنز)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ختم نبوۃ کو ایک مثال دے کر واضح کرنا

(۱۵۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اسے خوب آراستہ و پیراستہ کیا مگر اس کے ایک گوشہ میں صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی لوگ آ آ کر اس کے ارد گرد گھومنے لگے اور تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی (تاکہ یہ عیب بھی نہ رہتا) اس کے بعض الفاظ میں یہ ہے کہ میں نے آ کر اس اینٹ کی جگہ کو پر کر دیا ہے اور اب قصر نبوۃ میری آمد سے مکمل ہو گیا ہے اور مجھ پر تمام رسول ختم کر دیئے گئے۔

(کنز العمال)

(۱۵۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ وَ مَثَلُ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی دَارًا فَاَكْمَلَهَا فَاَحْسَنَهَا اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَكَانَ مَنْ دَخَلَهَا فَنَظَرَ اِلَیْهَا قَالَ مَا اَحْسَنَهَا اِلَّا مَوْضِعَ اللَّبِنَةِ فَخُتِمَ بِیَ الْاَنْبِیَاءُ.

(رواہ الشیخان و الترمذی و ابن ابی حاتم)

(۱۵۲) جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا اور خوب عمدہ اور مکمل بنایا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی جو شخص اس میں داخل ہوتا اور اسے دیکھتا تو کہتا تمام گھر کس قدر خوب صورت ہے مگر یہ ایک اینٹ کی جگہ (وہ اینٹ میں ہوں) اور انبیاء مجھ پر ختم کر دیئے گئے ہیں۔

(اس حدیث کو شیخین، ترمذی، ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے)

(۱۵۳) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ وَ مَثَلُ النَّبِیِّیْنَ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی دَارًا فَاَتَمَّهَا اِلَّا لَبِنَةً وَاحِدَةً فَجِئْتُ اَنَا وَ اَتْمَمْتُ تِلْكَ اللَّبِنَةَ. (رواہ مسلم و احمد)

(۱۵۳) ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ تعالیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میری اور نبیوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے گھر بنایا اور اس کو پورا بنا دیا مگر ایک اینٹ کی جگہ رہنے دی، میں آیا اور اس اینٹ کو بھی پورا کر دیا۔

(اس حدیث کو مسلم و احمد نے روایت کیا ہے)

(۱۵۴) عَنْ اُبَیِّ بْنِ كَعْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی

(۱۵۴) ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی

---

(۱۵۴) ⁕ ان تشبیہات کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اس قصر میں جو ہر طرح مکمل ہو چکا ہے اب کسی اور اینٹ کی کوئی گنجائش نہیں رہی اسی طرح میری آمد کے بعد اب کسی اور نبی کے آنے کا احتمال نہیں رہا، یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ختم نبوۃ کے اس موٹے سے ☜ ....

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلِي فِي النَّبِيِّيْنَ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى دَارًا فَاَحْسَنَهَا وَ اَكْمَلَهَا وَ تَرَكَ مِنْهَا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوْفُوْنَ بِالْبِنَاءِ وَ يَعْجَبُوْنَ مِنْهُ وَ يَقُوْلُوْنَ لَوْتَمَّ مَوْضِعُ تِلْكَ اللَّبِنَةِ وَ اَنَا فِي النَّبِيِّيْنَ مَوْضِعُ تِلْكَ اللَّبِنَةِ. (رواه الترمذي و قال هذا حديث حسن صحيح غريب)

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نبیوں میں میری مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے گھر بنایا اور نہایت خوشنما مکمل اور آراستہ بنایا لیکن اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی لوگ اس محل کے ارد گرد گھومتے اور اُسے تعجب سے دیکھ دیکھ کر کہتے ہیں کاش اس اینٹ کی جگہ بھی پوری ہو جاتی - تو میں نبیوں میں ایسا ہی ہوں جیسے یہ اینٹ اس محل میں۔

(اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

لانبی بعد النبی صلی الله علیه وسلم و ان کان من غیر تشریع

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں خواہ غیر تشریعی نبی ہو

(۱۵۵) عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (رواه البخاري و مسلم في غزوة تبوك) وَ فِيْ لفظ مسلم خَلَّفَهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فِيْ بَعْضِ مَغَازِيْهِ فَقَالَ لَهُ عَلِيٌّ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَلَّفْتَنِيْ مَعَ النِّسَاءِ وَ الصِّبْيَانِ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا تَرْضٰى اَنْ تَكُوْنَ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَانُبُوَّةَ بَعْدِيْ وَ فِيْ لَفْظ اٰخر عنده اِلَّا اَنَّكَ لَسْتَ نَبِيًّا.

(۱۵۵) سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تمہیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو حضرت موسیٰ علیہما السلام سے تھی' اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا - اس حدیث کو بخاری و مسلم نے غزوۂ تبوک کے بیان میں روایت کیا ہے اور مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگ کے موقعہ پر حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ نہ لیا تو حضرت علیؓ نے آپؐ کی خدمت میں (حسرت سے) عرض کیا یا رسول اللہؐ مجھے آپؐ عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟ آپؐ نے (ان کی تسلی کے لیے) فرمایا کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہ نسبت حاصل ہو جو ہارونؑ کو حضرت موسیٰ سے حاصل تھی مگر فرق یہ ہے کہ میرے بعد نبوۃ باقی نہیں اور مسلم کے دوسرے لفظ یہ ہیں مگر تم نبی نہیں ہو۔

(۱۵۶) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ لَمَّا اَرَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى

(۱۵۶) جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ ارادہ کیا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ساتھ نہ لے جائیں تو انہوں

؀ ....مسئلہ کو پیرایہ بہ پیرایہ' طریقہ بہ طریقہ آخر کیوں اتنا سمجھا رہے ہیں - آپ کا آخری نبی ہونا کوئی دقیق مسئلہ نہیں جس کے لیے اتنی تفہیم کی حاجت ہو پھر یہ اہمیت کیوں ہے؟ اس کا جواب آپ کو ان احادیث کے مطالعہ کے بعد خود واضح ہو جائے گا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدعیین نبوت کے متعلق پیشگوئی کی گئی ہے۔

(۱۵۶) ان دونوں حدیثوں میں حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام کی ذات سے تشبیہ دینا مقصود نہیں اسی لیے انت بمنزلة ؀ ....

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يُخَلِّفَ قَالَ لَهُ عَلِيٌّ مَا يَقُوْلُ النَّاسُ فِي اِذَا خَلَّفْتَنِي قَالَ فَقَالَ اَمَا تَرضى اَنْ تَكُوْنَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَا يَكُوْنُ بَعْدِيْ نَبِيٌّ.

(رواه احمد و ابن ماجة و الترمذی)

نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ مجھے (اپنے ہمراہ نہ لے جائیں گے اور) پیچھے چھوڑ جائیں گے تو بھلا لوگ میرے متعلق کیا کیا باتیں کہیں گے - راوی کہتا ہے کہ آپ نے فرمایا کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میری تمہاری وہ نسبت رہے جو ہارون و موسیٰ کی تھی اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا -

(اس حدیث کو احمد' ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۵۷) عَنْ زَيْدِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (يَا عَلِي) وَالَّذِيْ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ مَا اخْتَرْتُكَ اِلَّا لِنَفْسِيْ وَ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ. (رواه احمد و ابن عساكر الكنز)

(۱۵۷) زید بن اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علی اس ذات کی قسم ہے جس نے مجھے دین حق دے کر بھیجا ہے میں نے تم کو صرف اپنے لیے پسند کیا ہے اور تمہیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ علیہما السلام سے حاصل تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا - (الکنز)

(۱۵۸) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ وَجِعْتُ وَجْعًا فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَقَامَنِيْ فِيْ مَقَامِهِ وَ قَامَ يُصَلِّيْ وَ اَلْقٰى عَلَيَّ طَرَفَ ثَوْبِهِ ثُمَّ قَالَ بَرِئْتَ يَا ابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ فَلَا بَأْسَ

(۱۵۸) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے درد اٹھا - میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور خود نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور اپنے لباس کا ایک کنارہ میرے اوپر ڈال دیا پھر فرمایا اے علی (رضی اللہ تعالیٰ

ﷺ .... ھارون نہیں فرمایا بلکہ اس نسبت اور علاقہ سے تشبیہ مقصود ہے جو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے درمیان تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی غیبت کے زمانہ میں اپنی قوم کو نگرانی کے لیے اپنے بھائی حضرت ہارون کا انتخاب کیا تھا' اسی طرح اپنی غیبت میں میں تمہارا انتخاب کرتا ہوں - اتنا فرق ضرور ہے کہ وہ نبی تھے تم نبی نہیں ہو - حضرت ہارون کو چونکہ نبوت کے ساتھ خلافت ملی تھی اس لیے اس مجمل تعبیر سے یہ وہم پیدا ہوسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت بھی کہیں خلافت نبوۃ نہ ہو اس لیے اس احتمال کو بھی برداشت نہیں کیا گیا اور اس کو صاف صاف طور پر صاف کر دیا گیا ہے تا کہ آنے والی امت محض الفاظ کے ابہام سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو' یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر حضرت علیؓ کو نبوت ملتی تو وہ یقیناً آپ کے اتباع ہی کی بدولت ہوتی مگر جب اس احتمال کی بھی نفی کر دی گئی تو اب تو سط یا بلا توسط کسی نبوۃ کا احتمال باقی نہیں رہا - اگرچہ نبوت کا کسی نبی کے اتباع سے ملنا خود ایسا مسئلہ ہے جس کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل نہیں ہے اور اسی لیے دنیا کی تاریخ میں کوئی نبی ایسا نہیں بتلایا جا سکتا جو کسی نبی کے اتباع کے صلہ میں انعامی طور پر نبی بنا دیا گیا ہو یہ محض دماغی اختراع اور خود ساختہ خیال ہے -

(۱۵۷) * یہی مضمون ابو سعید خدریؓ، حبشی بن جنادہؓ، عقیل بن ابی طالبؓ، اور ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے - دیکھو کنز العمال -

(۱۵۸) * حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے نبوت کی دعا فرمائی تھی اور وہ قبول ہوگئی تھی - ﴿**واجعل لی وزیرا من اھلی ھارون اخی اشدد به ازری و اشرکه فی امری**﴾ (طٰہٰ : ۲۹ - ۳۲) ''اور میرے خاندان میں میرے بھائی ہارون کو میرا مددگار بنا دے ان کے ذریعہ سے میری کمر مضبوط فرما اور میرا شریک کار بنا دے -'' اس دعا کے بموجب ان کو نبی بنا دیا گیا تھا - آنحضرت ﷺ ....

عَلَيْكَ مَا سَأَلْتُ اللّٰهَ شَيْئًا اِلَّا سَأَلْتُ لَكَ مِثْلَهُ وَ لَا سَأَلْتُ اللّٰهَ شَيْئًا اِلَّا اَعْطَانِيْهِ غَيْرَ اَنَّهُ قِيْلَ لِيْ اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ فَقُمْتُ كَاَنِّيْ مَا اشْتَكَيْتُ. (رواه ابن جرير و ابن شاهين في السنة و الطبراني في الاوسط و ابو نعيم في فضائل الصحابة. كذافي الكنز)

عنہ) تم شفایاب ہو گئے اب تم میں کوئی مرض نہیں رہا- میں نے جو دعا اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے کی ہے، وہی تمہارے لیے مانگی ہے اور جو دعا میں نے مانگی ہے وہ اس نے قبول فرمائی ہے بجز اس کے کہ مجھ سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا- حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے کبھی بیمار ہی نہ ہوا تھا-

(کنز العمال)

لا يبقى من النبوة شئى الا المبشرات

آنحضرت ﷺ کے بعد نبوۃ کا کوئی جزء باقی نہیں رہا صرف اچھے خواب باقی ہیں

(۱۵۹) عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ لَا يَبْقٰى بَعْدَهُ مِنَ النُّبُوَّةِ شَيْءٌ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

(۱۵۹) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا ہے میرے بعد نبوۃ کا کوئی جزء باقی نہیں رہا- صرف مبشرات باقی ہیں- صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے پوچھا

.... صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ عالم تقدیر میں یہ طے پاچکا تھا کہ اب کوئی نبی نہ ہوگا اس لیے یہ نامناسب تھا کہ دعاء کے بعد آپؐ کو عالم تقدیر کے اس فیصلہ کی اطلاع دی جاتی اس لیے اس سے قبل کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپؐ حضرت علیؓ کے لیے نبوت کی دعا فرماتے یہ کہہ دیا گیا کہ آپ کی ہر دعاء قبول ہوگی مگر نبوت کے لیے آپ دعاء ہی نہ فرمائیے-

غور فرمائیے کہ حدیث مذکور میں موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے ایک معمولی تشبیہ کے اثرات کتنی دور دور تک پھیل رہے ہیں اور ہر گوشہ میں ختم نبوت کا عقیدہ کس کس طرح نظر آتا چلا جارہا ہے گویا یہ ایک بنیاد ہے اور بقیہ تمام تفریعات اسی عقیدہ پر قائم ہیں اگر کہیں ذرا بھی اس بنیاد کو ٹھیس لگتی نظر آتی ہے تو فوراً صفائی کے ساتھ اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے اور معمولی سے ابہام کو بھی برداشت نہیں کیا جاتا- تعجب ہے کہ جہاں نبوت و رسالت کی صریح پیشگوئیوں کی بجائے اتنی گنجائش بھی نہ ہو، وہاں نبوت کے دروازے نہیں بلکہ پھاٹک کھول دیئے جائیں- یہ دوسری بات ہے کہ جب اس میں سے گذرنے والوں کی تعداد دریافت کی جائے تو بمشکل ایک شخص کا نام پیش کیا جائے- اور اس میں بھی ابھی تک یہ بحث جاری ہو کہ وہ امام تھا یا مجدد یا نبی و رسول اور اگر معتقدین کا حال چھوڑ کر کہیں خود اس کے دعاوی کو دیکھا جائے تو ایک صحیح الفہم شخص یہ اندازہ کر ہی نہ سکے کہ اتنے مختلف دعاوی کبھی ایک زبان سے ادا بھی ہو سکتے ہیں- واللہ المستعان-

(۱۵۹) * انبیاء علیہم السلام کی صفت انذار بھی ہے اور تبشیر بھی- اسی لیے قرآن کریم میں فرمایا: رسلاً مبشرین و منذرین- اس لحاظ سے رؤیا صالحہ کی بھی دو قسمیں ہونا چاہئیں مبشرات اور منذرات مگر چونکہ رؤیاء صالحہ کا غالب حصہ مبشرات پر مشتمل ہوتا ہے اس لیے رؤیا صالحہ کی تفسیر میں صرف مبشرات کا لفظ فرمایا گیا ہے- نیز جامع ترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ آیت ﴿لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ (یونس: ٦٤) میں بشریٰ سے مراد رؤیا صالحہ ہیں- اس بناء پر بھی رویاء صالحہ کا عنوان مبشرات بن گیا ہے- بہر حال یہ ضروری نہیں ہے کہ سچے خواب ہمیشہ خوشی و مسرت کے متعلق ہوں- رنج و غم کے متعلق بھی ہو سکتے ہیں مگر رؤیاء صالحہ میں یہ حصہ مغلوب ہوتا ہے اور بشارت کا حصہ غالب اس کے برعکس شیطانی خواب بیشتر خوفناک ہوتے ہیں اور مسرت و خوشی کے شاذ و نادر کیونکہ شیطان کا مقصود ہی ....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ مَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمُسْلِمُ اَوْتُرٰى لَهٗ . (کذافی الکنز والحدیث مروی فی الصحاح بتعیر یسیر)

یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مبشرات کیا چیز ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھے خواب جو مسلمان خود دیکھے یا اس کے لیے کوئی دوسرا دیکھے- (کنز العمال)

ذهبت النبوة و الرؤيا ليست بنبوة

نبوۃ بالکل ختم ہوگئی اور صرف خواب نبوۃ نہیں ہیں

(۱۶۰) عَنْ اُمِّ كُرْزٍ قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَهَبَتِ النُّبُوَّةُ وَ بَقِيَتِ

(۱۶۰) ام کرز روایت فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے نبوۃ تو ختم ہوئی ہاں صرف مبشرات باقی ہیں- اس حدیث کو

☆.... تخریج مسلم ہے- صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے ایک مرفوع روایت ہے- الرؤیا الحسنة من الرجل الصالح جزء من ستة و اربعین جزء من النبوة. نیک آدمی کا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہوتا ہے- اس روایت سے معلوم ہوا کہ حدیث مذکور میں مسلم سے ہر فاسق و فاجر مراد نہیں بلکہ صالح اور نیک شخص مراد ہے-

اس لیے فاسق یا کافر کا خواب اگر سچا بھی ہو تو نبوۃ کا جزء نہیں کہا جا سکتا- اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نیک آدمی کبھی شیطانی خواب دیکھتا ہی نہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو شخص بیداری میں انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتا ہے' صدق و اخلاص' امانت و دیانت داری اس کا شیوہ ہے اندر باہر دوست و دشمن کسی کے ساتھ جھوٹ بولنا روا نہیں رکھتا- اس کی فطرت پر صدق و سچائی کا پورا نقش قائم ہو چکا ہے وہ سونے کے بعد بھی شیطانی تسلط وحکومت کے ماتحت نہیں آتا- اس لیے اس کا جو خواب ہوتا ہے وہ اکثر خدا کی طرف سے ہوتا ہے اگر گاہے ماہے اس کے خلاف ہو تو شاذ و نادر ہے- اس کے برخلاف جو شخص بحالت بیداری میں جھوٹ و دغا بازی کا عادی ہے وہ سونے کے حال میں بھی شیطان ہی کے زیر حکومت رہتا ہے اس کے خواب بھی اکثر شیطانی اتصال و تصرف کا ثمرہ ہوتے ہیں- صحیح بخاری میں روایت ہے کہ **الرؤیا الصالحة من الله و الحلم من الشیطان.** اچھے خواب (جو مؤمن صالح کا نصیب ہے خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے) خلاصہ یہ کہ انسان بحالتِ خواب اپنے بیداری کے حالات کے تابع رہتا ہے- مشہور ہے کہ بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں- اگر اتنی بات آپ کے نزدیک معقول ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ جس طرح انسان حالت نوم میں بیداری کے حال کے تابع ہوتا ہے اسی طرح موت کے بعد اپنی حیوۃ کے حالات کے تابع رہے گا- **من کان فی هذه اعمی فهو فی الاخرة اعمی** جو اس دنیا کی زندگی میں اندھا بنا رہا وہ آخر میں بھی اندھا اٹھے گا- یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ حدیث میں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر سچا خواب نبوۃ کا جزء ہے بلکہ اس کا خواب نبوۃ کا جزء قرار دیا گیا ہے جو شریعت کی اصطلاح میں صالح کہا جا سکے- قرطبی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ صالح سے مراد وہ شخص ہے جو عبادات و عادات میں انبیاء علیہم السلام کے قدم بقدم ہو- کاہن اور نجومی بھی غیب کی خبریں دیتے ہیں مگر وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتیں اس کا نام اطلاع علی الغیب نہیں اس کے اسباب پر اپنی جگہ مفصل بحث موجود ہے- اطلاع علی الغیب نبوۃ کا خاصہ ہے اس کی ابتداء اچھے اور سچے خواب ہیں اور اس کی انتہا وحی نبوت یعنی بحالت بیداری خدائے تعالیٰ یا فرشتہ کے ساتھ مکالمہ- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبوۃ سے پیشتر سچے سچے خواب دیکھا کرتے تھے ۶ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کے بعد وحی کا دور شروع ہو گیا جس کی مدت تئیس سال ہے بعض علماء نے یہ دیکھ کر کہ ۶ ماہ ۲۳ سال کا چھیالیسواں جزء ہیں یہ کہہ دیا ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں رؤیا مؤمن کو اسی لیے نبوۃ کا چھیالیسواں جزء کہا گیا ہے- حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس پر طویل گفتگو کی ہے- (اس پر سوال و جواب علماء کے دائرہ کی بحث ہے) باقی رہی یہ بحث کہ اگر مبشرات نبوۃ کا جزء ہیں تو کیا ان کو کوئی مختصر نبوۃ کہا جا سکتا ہے اس پر آئندہ حدیث کے نوٹ میں کلام کیا جائے گا-

اَلْمُبَشِّرَاتُ .(اخرجه احمد و ابن ماجة و صححه ابن خزيمة و ابن حبان)

امام احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

(۱۶۱) عَنْ اَنَسٍ رفعه اَنَّ الرِسَالَةَ وَ النُّبُوَّةَ قَدْ انْقَطَعَتْ فَلَانَبِيَّ وَ لَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَ لٰكِنْ

(۱۶۱) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ رسالت اور نبوۃ دونوں ختم ہو گئیں اب میرے بعد نہ کوئی نبی

---

(۱۶۱) ✽ قرآن و حدیث اس پر متفق ہیں کہ نبوۃ ختم ہو چکی ہے۔ تشریعی ہو یا غیر تشریعی۔ نبوۃ کی کوئی قسم اب باقی نہیں رہی۔ ہاں اس کے کمالات و برکات باقی رہنا چاہئیں اور وہ باقی بھی ہیں۔ نبوۃ سے قبل عالم کا ظاہر و باطن تیرہ و تاریک ہوتا ہے۔ جب آفتاب نبوت طلوع کرتا ہے تو عالم کا گوشہ گوشہ اس کے انوار سے منور ہو جاتا ہے۔ ظاہر میں ظلم و فساد کی بجائے رشد و صلاح کی حکومت ہو جاتی ہے۔ انسانی عادات میں افراط و تفریط، عجلت و جلد بازی کی بجائے متانت و بردباری، وقار و میانہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔ باطن کا رشتہ شیطان سے یکسر کٹ جاتا ہے اور عالم بالا سے ایسا رشتہ قائم ہو جاتا ہے کہ اس میں مغیبات کے انعکاس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ان ہی کا نام اجزاء نبوۃ یا آثار و برکات نبوۃ ہے ان اوصاف کے وجود سے کوئی شخص نبی نہیں بنتا ہاں نبی سے مستفیض کہا جا سکتا ہے۔ رؤیاء صالحہ یعنی اچھے خواب دیکھنا باطن کے اسی تاثر کی نشانی ہے اور عادات کا انقلاب ظاہر کے تاثر کی احادیث میں ایک طرف رؤیاء صالحہ کو نبوۃ کا چھیالیسواں جزء کہا گیا ہے دوسری طرف بعض بلند اخلاق کو چھبیسواں جزء قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے التوءدة و الاقتصاد و حسن السمت من ستة و عشرين جزء من النبوة. بردباری و متانت، میانہ روی اور اچھی روش نبوۃ کا چھبیسواں جزء ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اخلاق کی وجہ سے کسی کو نبی نہیں کہا جا سکتا۔ جب چھبیسویں جزء کو نبوۃ نہیں کہا جاتا تو چھیالیسویں جزء کو نبوۃ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ رؤیاء صالحہ کو صرف تشبیہی لحاظ سے نبوۃ کا جزء کہا گیا ہے ابن التین کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو غیب کی خبریں وحی کے ذریعہ سے دی جاتی ہیں اب یہ سلسلہ تو منقطع ہوا خواب کا سلسلہ باقی ہے۔ اس اعتبار سے رؤیاء کو اجزاء نبوت میں شمار کیا گیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس حدیث کے کسی طریقہ میں رؤیا کو رسالۃ کا جزء نہیں کہا گیا ہر جگہ نبوت کا جزء کہا گیا ہے رسالۃ کا زیادہ تعلق احکام سے ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ جو خواب نبوۃ کا چھیالیسواں جزء ہے وہ ہر شخص کا خواب نہیں بلکہ خود نبی کا خواب ہے مگر یہ جواب مخدوش ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ جزء ہمیشہ اپنے کل کے مغایر ہوتا ہے یہی کلمات جو مجموعی طور پر اذان کہے جاتے ہیں علیحدہ علیحدہ اذان نہیں کہلاتے۔ عناصر اربعہ انسان کے اجزاء ہیں مگر ان میں سے کسی کو انسان نہیں کہا جاتا مثلاً آپ انسان کا ۴/۱ حصہ ہے مگر انسان نہیں تو رؤیا صالحہ نبوۃ کا چھیالیسواں جزء ہو کر نبوۃ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ رؤیاء صالحہ نبوۃ کے حقیقۃً اجزاء نہیں ہیں۔ کیونکہ نبوۃ کسی ایسی حقیقت مرکبہ کا نام نہیں جس کا تجزیہ و تحلیل ممکن ہو وہ ایک منصب ہے جس کا تعلق صرف خدائی اصطفاء واجتباء پر موقوف ہے ہاں اس کے کچھ لوازم و خصائص ہیں جو اس کی ماہیت کا جزء نہیں ہوتے۔ ان خصائص و خصائل ہی کو مجازاً اجزاء کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ تنقیح بھی ہمیں اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ اصطلاح میں خصائص و اجزاء میں فرق ہے ورنہ اہل عرف کے نزدیک یہ تدقیقات قطعاً غیر ضروری ہیں۔ ان کے نزدیک عوارض مختلفہ اور ذاتیات و اجزاء میں کوئی فرق نہیں۔

امام بخاریؒ کی دقت نظر مشہور ہے انہوں نے یہاں بھی ایک جدت طرازی سے کام لیا ہے۔ پہلے ترجمۃ الباب میں یہ حدیث نقل کی ہے۔ ''اچھا خواب نبوۃ کا چھیالیسواں جزء ہے۔'' اس کے بعد یہ حدیث روایت کی ہے کہ ''اچھے خواب خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور برے شیطان کی طرف سے۔'' شارحین کو بحث ہے کہ اس حدیث کو بظاہر باب سے کوئی مناسبت نہیں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہاں امام بخاریؒ رؤیاء صالحہ کے جزء نبوۃ ہونے کی ایک لطیف حکمت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ انما كانت جزء من اجزاء النبوة لانها من الله ﷻ....

بَقِيَتِ الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوْا وَ مَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ رُؤْيَا الْمُسْلِمِيْنَ جُزْءٌ مِنْ اَجْزَاءِ النُّبُوَّةِ.

(ابو یعلیٰ فتح الباری)

ہوگا نہ رسول، لیکن مبشرات باقی ہیں- صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے پوچھا مبشرات کیا چیز ہیں؟ فرمایا مسلمانوں کے خواب- یہ اجزاء نبوۃ کا ایک جزء ہیں- (ابو یعلی)

الالهام و التحديث مع الملائكة ليس بنبوة

الہام اور فرشتوں کے ساتھ باتیں کرنا بھی نبوت نہیں ہے

(۱۶۲) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ كَانَ فِيْمَا قَبْلَكُمْ مِنَ الْاُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ يَكُنْ فِىْ اُمَّتِىْ اَحَدٌ

(۱۶۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم سے پہلی امتوں میں محدث ہوا کرتے تھے- اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے اور بعض

.... تعالی بخلاف التی من الشیطان فانها لیست من اجزاء النبوة . (ج ۱۴ ص ۳۱۴) یعنی رؤیاء صالحہ کو اجزاء نبوۃ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اس کے برخلاف وہ خواب جو شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اجزاء نبوت نہیں ہیں- بظاہر امام بخاریؒ کی مراد یہ ہے کہ جس طرح حالتِ بیداری میں وحی دو قسم پر ہے ایک وحی نبوت جو خدا کی طرف سے ہوتی ہے دوسری ایحاء شیطان- ان الشیاطین لیوحون الی اولیائهم . اسی طرح خواب کی بھی دو قسمیں ہیں ایک من اللہ دوسرے من الشیطان جو رؤیا من اللہ ہیں ان کا رشتہ نبوۃ سے ہے وہ بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور جو من الشیطان ہے اس کا تعلق وحی شیطان سے ہے- حدیث نے بھی اس مشتبہ حقیقت کا فرق واضح کیا ہے یعنی جو خواب من اللہ ہیں ان کا نام رؤیا رکھا ہے اور جو شیطان کے تصرف سے ہیں ان کا نام حلم رکھا ہے غالباً اسی لیے سورۂ یوسف میں فرمایا: ﴿وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعَالِمِيْنَ﴾ (یوسف: ۴۴) یعنی انبیاء کو 'احلام' شیطانی خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں دیا جاتا- ہاں ''رؤیا'' عالم قدس کی ایک حقیقت ہے- ان کی تعبیر کا علم شانِ نبوۃ کے مناسب ہے- اور احلام بے حقیقت شے ہے- ان سے انبیاء علیہم السلام کا کوئی واسطہ نہیں خلاصہ کلام یہ کہ رؤیاء صالحہ نبوۃ نہیں بلکہ نبوۃ کا حقیقی جزء بھی نہیں اس لیے ان احادیث میں پہلا عنوان بدل کر نبوۃ کو بالکل ختم کہا گیا ہے اور رؤیاء صالحہ کو جداگانہ ایک چیز قرار دیا گیا ہے- اصطلاحِ نحو کے مطابق پہلی حدیث میں استثناء کو منقطع کہا جائے گا یا اجزاء سے خصائص و آثار مراد ہوں گے- اگر سب کچھ تسلیم کر لیا جائے تو نبوۃ کے اس جزء میں کسی بڑے رتبہ یا کمال یا دعویٰ کی شرط نہیں بلکہ ہر مرد صالح کا اس میں حصہ ہے-

(۱۶۲) * محدث اور مکلم دونوں لفظ بصیغہ اسم مفعول ہیں- صحیح مسلم کے بعض طرق میں محدّثون کے بجائے ''ملهمون'' اور مسند حمیدی میں حضرت عائشہؓ کی حدیث میں "الملهم بالصواب" کا لفظ ہے اور ابن عیینہ کے شاگردوں نے اس کی تفسیر میں 'مفهمون' کا لفظ نقل کیا ہے- ابو سعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا محدث کیسا ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں کہ فرشتے ان کی زبان سے بولتے ہیں- علماء نے اس کی مختلف تفصیلات کی ہیں- اکثر حضرات فرماتے ہیں کہ هو الرجل الصادق الظن یہ وہ شخص ہے جس کا خیال اکثر صحیح ہو- و هو من القى فى روعه شئى من الملاء الاعلى فيكون كالذى حدثه غيره . یہ شخص وہ ہے جس کے قلب میں ملائکہ مقربین کی جانب سے کوئی بات اس طرح ڈالی جائے گویا اس سے کسی نے کہہ دی ہے- کوئی کہتا ہے کہ محدّث اسے کہتے ہیں جس کی زبان سے صدق و صواب بلاقصد نکلے- کسی نے تحدیث کا ترجمہ فراست کیا ہے- علماء محققین میں سے حضرت شاہ ولی اللہؒ ....

2 فَاِنَّهٗ عُمَرُ. وَ فِیْ رِوَایَةٍ لَقَدْ کَانَ فِیْمَا قَبْلَکُمْ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ رِجَالٌ یُکَلَّمُوْنَ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّکُوْنُوْا اَنْبِیَاءَ فَاِنْ یَکُنْ فِیْ اُمَّتِیْ مِنْهُمْ اَحَدٌ فَعُمَرُ. (متفق علیه)

روایات میں ہے کہ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں کچھ لوگ ایسے ہوا کرتے تھے جن سے غیبی طور پر باتیں کی جاتی تھیں مگر وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی شخص ایسا ہے تو وہ عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے۔ (متفق علیہ)

(۱۶۳) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ لَمْ یُبْعَثْ نَبِیٌّ قَطُّ اِلَّا کَانَ فِیْ اُمَّتِهٖ مَنْ یُحَدَّثُ وَ اِنْ یَکُنْ فِیْ اُمَّتِیْ مِنْهُمْ اَحَدٌ فَهُوَ عُمَرُ. (رواہ ابن عساکر. کنز)

(۱۶۳) ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا گیا جس کی امت میں کوئی نہ کوئی محدّث نہ ہو، اگر میری امت میں کوئی محدّث ہے تو وہ عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے۔ (کنز)

(۱۶۴) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا کَانَ نَبِیٌّ اِلَّا کَانَ فِیْ اُمَّتِهٖ مُعَلَّمٌ اَوْ مُعَلَّمَانِ فَاِنْ یَّکُنْ فِیْ اُمَّتِیْ مِنْهُمْ اَحَدٌ فَهُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ. (خصائص الکبریٰ ج ۱ ص ۱۳۹)

(۱۶۴) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا کوئی نبی نہیں گذرا جس کی امت میں ایک دو معلم (محدّث) نہ گذرے ہوں، اگر میری امت میں کوئی معلم ہے تو وہ عمر بن الخطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ہے۔

۞ .... وغیرہ نے بھی اس پر کافی کلام کیا ہے۔ ہمارے نزدیک تمام علماء نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات کو پیش نظر رکھا ہے۔ پھر ان کی ایک ایک خصوصیت کو اپنے خیال کے مطابق چنا ہے اور اس کو محدث کی تعریف میں شامل کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک مناسب یہ ہے کہ ان سب اوصاف کو یکجائی طور پر محدث کی تعریف میں داخل کر لینا چاہیے یہ حقیقت حدیث سے تجاوز کر کے قرآن تک پہنچ گئی ہے چنانچہ آیت ﴿وَ مَا اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِیٍّ﴾ (الحج:۵۲) میں ابن عباس وَ لَا مُحَدَّثٍ کا لفظ اور پڑھا کرتے تھے قرآن کریم میں محدث کو نبی کے بالمقابل رکھا گیا ہے اسی لیے حدیث میں بھی من غیر ان یکونوا انبیاء سے ان کے نبی نہ ہونے کی تصریح کر دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی اگر حضرت عمرؓ کے متعلق اس حدیث کو پیش نظر رکھا جائے؟ لو کان بعدی نبی لکان عمرؓ اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو عمرؓ ہوتا۔ تو یہ بات اور زیادہ صاف ہو جاتی ہے کہ محدّث اور مکلم نبی نہیں ہوتا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا محدّث ہونا اور نبی نہ ہونا دونوں باتیں حدیث سے ثابت ہیں خلاصہ یہ ہے کہ صرف ملائکۃ اللّٰہ کا کسی سے ہم کلام ہونا یا صدق و صواب اس کی زبان پر جاری ہو جانا نبوۃ نہیں ہے۔ جیسا کہ صرف غیب کی خبریں دینا نبوۃ نہیں یا جیسا کہ سچے خواب دیکھنا نبوۃ نہیں ہے۔ یہ سب باتیں انبیاء اور غیر انبیاء بلکہ مسلم و کافر میں بھی پائی جا سکتی ہیں۔ اولیاء کے مکالمات کو الہام کہتے ہیں اور نبی کے مکالمات کو وحی یہ صرف اصطلاحی فرق ہے اس سے پوری حقیقت نہیں نکھرتی۔ اسی طرح قطعیت و ظنیت کے فرق سے بھی ان کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی یہ صرف صاحب وحی جانتا ہے کہ وحی یہ ہے اور الہام یہ۔ یہاں بھی علماء نے احادیث میں وحی کے لوازم و خصائص تلاش کر کے بہت کچھ لکھا ہے مگر انصاف یہ ہے کہ نبوۃ و وحی کی حقیقت سوائے نبی کے دوسرا نہیں سمجھ سکتا جب اشیاء خارجہ کے متعلق علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان کی حدود حقیقی یا تو غیر ممکن ہیں ورنہ دشوار ضرور ہیں تو روحانیات کے صحیح حدود کیسے ممکن ہیں۔ (دیکھو فتح الباری فضائل عمر)

4

سياسة الامة و اصلاح ما فيها من تغيير الدين ليس بنبوة

امت کا انتظام اوران کے دینی تحریفات کی اصلاح کرنا بھی نبوۃ نہیں

(۱۶۵) عَنْ اَبِیْ حَازِمٍ قَالَ قَاعدتُ اَبَاهُرَیْرَةَ خَمْسَ سِنِیْنَ فَسَمِعْتُهُ یُحَدِّثُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِیَاءُ کُلَّمَا هَلَکَ نَبِیٌّ

(۱۶۵) ابو حازم کہتے ہیں کہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پانچ سال رہا ہوں میں نے انہیں یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کا انتظام خود ان کے انبیاء فرمایا کرتے تھے۔ جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی دوسرا اس کا جانشین آ جاتا

---

(۱۶۵) * حافظ ابن حجرؒ انبیاء بنی اسرائیل کی سیاست کی تشریح میں لکھتے ہیں انهم كانوا اذا ظهر فيهم فساد بعث الله لهم نبيا يقيم لهم امرهم و يزيل ما غير و امن احكام التورات. یعنی بنی اسرائیل میں جب کوئی فساد رونما ہوتا تو اللہ تعالیٰ کسی نبی کو ان میں بھیج دیتا جو ان کی اصلاح کرتا۔ اور شریعت تورات میں ان کی تحریفات کو دور کر دیتا۔ امت محمدیہ میں یہ خدمات خلفاء کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اچھے خواب دیکھنا' الہام اور فرشتوں کے ساتھ مکالمہ کرنا' امت کا دینی اور دنیوی نظم و نسق قائم رکھنا یہ سب محدثین اور خلفاء کے وظائف ہیں' منصب نبوت اب ختم ہو گیا۔ اور یہ وظائف نبوۃ امت محمدیہ کے خلفاء کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ اس سے امت محمدیہ کے کمالات اور عظمت کا اندازہ کرنا چاہیے کہ جن خدمات کے لیے پہلے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے تھے اب اس امت کے علماء و خلفاء انہیں انجام دیا کریں گے۔

سوچو کہ امت محمدیہ کی ہتک عزت اس میں ہے کہ اسے نااہل قرار دے کر اس میں نبی پیدا کیا جائے یا اس میں کہ اس کے خلفاء وہ خدمات انجام دیں جو پہلے کبھی انبیاء علیہم السلام ادا فرمایا کرتے تھے۔ ابن عساکر نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لی النبوة و لکم الخلافة. نبوۃ صرف میرے لیے ہے اور تمہارے لیے خلافت ہے (کنز العمال ج ۶ ص ۱۸۰) اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم کر کے اپنا اور امت کا حصہ علیحدہ علیحدہ بیان کر دیا ہے۔ اچھے خواب میں ہماری شرکت ہے۔ الہام' اور فرشتوں سے بات چیت میں ہماری شرکت ہے۔ امت کا نظم ان کی تحریفات کی اصلاح ہمارا حصہ ہے مگر نبوت میں ہماری کوئی شرکت نہیں اسی لیے حضرت علیؓ سے حضرت ہارون علیہ السلام کو تشبیہ دیتے ہوئے یہ صاف فرما دیا گیا تھا کہ تم میرے جانشین ضرور ہو مگر نبی نہیں ہو' نبوت میرا حق ہے اور خلافت تمہارا۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کون وہ کہ جب بولتے تھے تو وحی ان کی موافقت میں بولتی تھی محدث ہو سکتے ہیں مگر یہ بات ان سے بھی صاف کہہ دی گئی تھی کہ نبوت میرا حق ہے اور محدثیت تمہارا۔ حالانکہ ان کے خواب ان کے الہام' ان کی امت کی نگہداشت و حفاظت اس کی سفارش کر رہی تھیں کہ اگر اس امت میں کوئی ہلکی سے ہلکی نبوت بھی جاری ہوتو وہ ان کو دے دی جائے۔ شب ہجرت میں حضرت علیؓ آپؐ کے بستر پر ساری رات آپؐ کی جگہ قربان ہونے کے شوق میں پڑے ہوئے ہیں' صدیق اکبرؓ راہ کے ہر ہر خطرناک موقع پر سر بکف حاضر ہیں مگر فنافی الرسول کے سمندر کے ان شناوروں کا چھوٹا سا چھوٹا موتی بھی ہاتھ نہ آیا بلکہ اگر کسی کے متعلق سیاق کلام میں نبوت کا کوئی ادنیٰ احتمال بھی پیدا ہوتا نظر آیا تو اس کو بڑی صفائی سے دور کر دیا گیا حتی کہ کسی کے لیے لفظ نبی کی کوئی بھی گنجائش نہیں دی گئی۔ اس لیے یہاں ظلی و بروزی نبوت کی بحث کرنا بھی بالکل بے معنی ہے۔ یہ بحث اس وقت قابل توجہ ہو سکتی ہے جب کہ شریعت میں کہیں امت کے کاملین پر نبی کا اطلاق درست تسلیم کیا جائے لیکن جب بالتفصیل لا نبی بعدی میرے بعد کوئی ....

خَلَفَهُ نَبِیٌّ وَ اِنَّهُ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَ سَیَكُوْنُ خُلَفَاءُ فَیَكْثُرُوْنَ قَالُوْا مَا تَامُرُنَا قَالَ فُوْابَیْعَةَ الْاَوَّلِ فَالْاَوَّلِ اَعْطُوْهُمْ حَقَّهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ. (رواه البخاری و مسلم و احمد و ابن ماجة و ابن جریر و ابن ابی شیبة)

لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہاں خلفاء ہوں گے اور وہ بہت ہوں گے- صحابہ نے عرض کیا پھر ان کے متعلق ہمیں کیا حکم ہے- فرمایا جو پہلا خلیفہ ہو اس کی بیعت پوری کرنا تم تو ان کا حق ادا کرتے رہنا اور اس نگرانی کی باز پرس جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہے وہ خود فرمائے گا-

(بخاری و مسلم و احمد و غیرہم)

لو کان بعد النبی صلی الله علیه وسلم نبی لکان عمرؓ

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہوتا تو حضرت عمرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوتے

(۱۶۶) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ

(۱۶۶) عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنخضرت

لله .... نبی نہیں- کہہ دیا گیا ہے تو اب ہمیں بلاوجہ ظلی و بروزی کی تقسیم کی دردسری اٹھانے کی حاجت نہیں ہے اس کے ماسوا یہ بھی قابل غور ہے کہ جب تاریخ نبوت میں صرف دو ہی قسم کی نبوتیں ملتی ہیں- تشریعی' غیر تشریعی' اور یہ دونوں براہ راست نبوتیں ہیں تو نبوت کی اب ایک اور تیسری قسم تراشنا تاریخ نبوت کے خلاف ہے اس کے لیے بہت زبردست شرعی ثبوت درکار ہیں- پورے وثوق و تحدی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن و حدیث میں ایک آیت اور کوئی ایک حدیث بھی دستیاب نہیں ہو سکتی جس میں آنے والی امت کو انبیاء کہا گیا ہو- پھر خاتم النبیین کے عموم میں محض اپنی اختراعی تقسیم کی وجہ سے تخصیص پیدا کرنا قرآن دانی کا ثبوت نہیں بلکہ کھلی ہوئی تحریف ہے-

(۱۶۶) * حضرت علیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت اخوت حاصل تھی اس کے باوجود وہ نبی نہیں بن سکے- نسبت اخوت سے بڑھ کر ابنیت کی نسبت ہے گمان ہو سکتا تھا کہ آپ کا کوئی فرزند ہوتا تو شاید وہ نبی ہو جاتا مگر ان کے متعلق بھی حدیث میں یہ ارشاد ملتا ہے لو عاش ابراهیم لکان صدیقا نبیا اگر ابراہیم جیتا تو صدیق نبی ہوتا- یعنی جس نے ختم نبوة مقدر فرمائی تھی اس نے ان کے لیے عالم تقدیر میں اتنی عمر بھی نہیں لکھی کہ ان کی علوم استعداد ظاہر ہو اور ختم نبوت سے ٹکرائے- اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ آپؐ کے بعد نبوت باقی ہے ورنہ حضرت ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے نبی ہو سکتے تھے-

یہاں شیخ محی الدین نووی تو اپنی مشہور کتاب تہذیب الاسماء میں حضرت ابراہیم کا تذکرہ کرتے ہوئے اس حدیث کے متعلق یہ لکھ گئے ہیں اما ماروی عن بعض المتقدمین لو عاش ابراهیم لکان نبیا فباطل و جسارة علی الکلام فی المغیبات و مجازفة و هجوم علی عظیم من الزلات و الله المستعان. (ج ۱ ص ۱۰۳) بعض متقدمین سے حضرت ابراہیم کی نبوت کے متعلق جو حدیث مروی ہے وہ بالکل بے اصل اور غیب کے معاملات میں بڑی دلیری اور رائکل کے تیر اور بڑی لغزش ہے- لیکن حافظ ابن حجر باب من سمی باسم الانبیاء کے ذیل میں اسی کے ہم معنی اور چند احادیث نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں فهذه عدة احادیث صحیحة عن هولاء الصحابة انهم اطلقوا ذلک فلا ادری ما الذی حمل النووی..... علی استنکار ذلک ان چند صحابہؓ سے کئی حدیثیں اس مضمون کی ثابت ہیں جن میں حضرت ابراہیم کی زندگی کی تقدیر پر ان کے نبی ہونے کا ذکر موجود ہے پھر معلوم نہیں کہ نووی کو اس کے انکار کی کیا وجہ پیش آئی [1] اس لیے اس حدیث میں پس و پیش کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں ہے- جن حضرات کو اس حدیث میں تشویش ااحق ہے....

---

[1] فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۷۶-

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَ بَعْدِیْ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب (رضی

.... ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث آئینہ خاتم النبیین کے بظاہر مخالف معلوم ہوتی ہے اس لیے قرآن کے قطعی آیت کے بالمقابل قابل قبول نہیں ہوسکتی - ہمارے نزدیک ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے - بات یہ ہے کہ آیت خاتم النبیین کا تعلق عالم کے ان نبوتوں کے ساتھ ہے جو اپنی جگہ ایک حقیقت ثابتہ ہیں اس کے برخلاف حضرت ابراہیمؑ کی نبوت صرف فرضی ہے فرضی بات چونکہ محض ایک اعتبار ذہنی کا نام ہے اس لیے اسے عالم کے واقعی نبوتوں کے ساتھ کوئی تعارض نہیں ہوسکتا - اس کی ایک منطقی مثال یہ ہے ان کان زید حمارا کان ناھقا - اگر زید گدھا ہوتا تو وہ گدھے ہی کی طرح بولتا - یہ بات اپنی جگہ درست ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ زید انسان ہے اور اس لیے وہ گدھے کی آواز نہیں بولتا - یہ واقعہ بھی اپنی جگہ درست ہے ہاں اگر زید کی انسانیت کے ساتھ ہی ساتھ اس کی حماریت کو مان لیا جائے تو اب یقیناً تعارض پیدا ہو جائے گا کیونکہ بیک وقت وہ ناطق اور ناہق دونوں نہیں ہوسکتا - اسی طرح ختم نبوۃ اپنی جگہ ایک حقیقت ثابتہ ہے اگر حضرت ابراہیمؑ کی نبوت اسی درجہ میں مان لی جائے تو یقیناً تعارض پیدا ہو جائے گا ورنہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست رہیں گی - ختم نبوۃ خارج میں' اور نبوۃ ابراہیمؑ فرضی طور پر - اصل یہ ہے کہ جب کوئی متکلم کسی بات کا کوئی پہلو واقعات عالم کے برخلاف فرض کرتا ہے تو اس فرض سے اس کا کچھ مقصد ہوتا ہے پہلے اس کے اس مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور صرف ایک فرضی پہلو کی وجہ سے اس کے تمام پہلوؤں کی فرضی تفصیلات میں جانا نہیں چاہیے - ظاہر ہے کہ جب عالم میں واقعات کی ایک ترتیب پہلے سے موجود ہے اب اگر اس ترتیب کے خلاف کوئی امر فرض کیا جائے اور اس کو واقعات کی اسی مرتب صف میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً اس مرتب سلسلہ میں اختلال و بدنظمی پیدا ہو جائے گی - یہاں واقعہ تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے - آپ کے فرزند بھی انتقال فرما گئے ہیں - عالم کے ان دونوں واقعات میں کوئی تعارض نہیں کوئی اختلاف نہیں - اب اگر صرف آپ کی عظمت شان اور ان کا جوہر استعداد سمجھانے کے لیے فرضی طور پر یہ کہہ دیا جائے کہ وہ جیتے تو نبی ہوتے تو اس میں بھی کوئی اشکال کی بات نہیں لیکن اسی فرضی نبوت کو اگر عالم کے ان واقعات کے ساتھ رکھ دو جو بلا فرض کیے ہوئے موجود ہیں تو یقیناً وہ خارجی ترتیب بگڑ جائے گی - اب غور طلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی فرضی نبوۃ کی وجہ سے ختم نبوۃ کے واقعی عقیدہ کو فرضی کہہ دیا جائے یا اس کو واقعی اور اس کو فرضی کہہ دیا جائے مقصود قائل سے یہ کتنا بعید ہوگا کہ وہ تو اپنی ختم نبوۃ کے ساتھ ایک ہستی کا اور اعتقاد عظمت قائم کرنا چاہتا ہے - آپ ختم نبوۃ کا انکار کرکے اسی کا احترام ختم کرنا چاہتے ہیں وہ ایک فرضی نبوۃ کا تصور آپ کے سامنے لاتا ہے آپ اسے واقعی بنا کر ختم نبوۃ کا عقیدہ ہی فرضی بنائے دیتے ہیں اچھا آپ کے بقول مان لیجئے کہ حضرت ابراہیمؑ اگر زندہ رہتے تو نبی ہوتے - آئیے دیکھیں کہ جن کی فطرت ابراہیمی فطرت سے بہت ہی ملتی جلتی تھی اور وہ زندہ بھی رہے پھر کیا نبی بنے؟ ترمذی کی حدیث آپ کے سامنے ہے - عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فطرت کو نبوت سے جتنی مناسبت ہے وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ظاہر ہے یہ زندہ بھی رہے مگر نبی نہ بنے - اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ کسی مستعد نبوت کے نبی نہ ہونے کی اصل وجہ صرف اس کی موت نہیں ہے ورنہ جہاں یہ وجہ نہ تھی وہاں نبوت مل جانا چاہیے تھی - غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی منصب پر تقرر کے لیے ذاتی استعداد و صلاحیت کے علاوہ دو باتوں کی اور بھی ضرورت ہے - عمر (Age) ہر شعبہ میں عمر کی بحث ضروری سمجھی جاتی ہے - دوم تقرر کی جگہ (Vacancy) خالی ہونا بھی شرط ہے - حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں نبی نہیں ہوئے اگر اس کی وجہ یہ ہوتی کہ ان حضرات میں اتنی لیاقت و استعداد ہی نہ تھی تو یقیناً یہ اس امت کا نقصان شمار ہوتا لیکن اگر کوئی (Vacancy) تقرر کی جگہ ہی نہیں ہے تو اس میں امت کا کوئی قصور نہیں نکلتا - یہ بات حکومت کے نظم ونسق کے متعلق ہے کہ وہ کسی عہدہ پر کتنے اشخاص ....

نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ. اللہ تعالیٰ عنہ) ہوتے -

(رواہ الترمذی، و الخطیب عن مالك و الطبرانی عن عصمة بن مالك كما فی الكنز ج ٦ ص ١٤٦)

ﷺ .... کا تقرر کرنا چاہتی ہے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی نبوت نہیں ملی، کیوں نہیں ملی ؟ کیا اس لیے کہ خاتم الانبیا علیہم السلام کے اس جگر پارہ میں استعداد کا کوئی نقصان تھا نہیں اس لیے کہ ان میں عمر (Age) کی کمی تھی - خلاصہ یہ ہے کہ نبی کی ذریت اس کا قبیلہ بلکہ اس کی عام امت میں بھی استعداد نبوت تو موجود ہے - انسانی بلند سے بلند کمال اسے حاصل ہو سکتے ہیں اس لیے ختم نبوت کا کوئی شخص یہ مطلب تو نہ سمجھے کہ یہ امت کمالات سے محروم ہوگئی ہے بلکہ تمام تر کمالات اور پوری لیاقت کے باوجود چونکہ اب کوئی (Vacancy) نہیں رہی - اس لیے اس منصب پر کسی کا تقرر نہیں ہو سکتا - حضرت ابراہیمؑ کے معاملہ میں تقرر کی جگہ ہونے نہ ہونے کی بحث سے پہلے عمر کی بحث حائل ہوگئی تھی اس لیے ان کے حق میں (Vacancy) کی بحث دوسرے نمبر کی بحث تھی - حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معاملہ میں عمر کی بحث نہ تھی تو منصب نبوۃ ختم ہونے کا مرحلہ سامنے آ گیا - بہر صورت ان مختلف اسباب و وجوہ کے باوجود جو واقعہ تھا وہ اپنی جگہ واقعہ رہا یعنی ختم نبوۃ بلا تخصیص اپنے پورے عموم پر باقی رہی اور یہ بعد کی بحثیں اب صرف ذہنی رہ گئیں کہ فلاں کو نبوت کیوں نہیں ملی ؟ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد درحقیقت نبوت جاری تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ پیہم سعی کے بعد بھی کسی ایک کو نبوت نہ مل سکی - اگر حضرت ابراہیمؑ کے لیے کوئی عذر در پیش تھا تو کیا تمام کے تمام صحابہ معذور ہو گئے تھے ؟ پھر حضرت ابراہیمؑ کے معاملہ میں ان کی حیوۃ کا عذر اس لیے نہیں ہے کہ دراصل نبوت سے وہی ایک بات مانع تھی بلکہ یہاں اس بات کو بتلانا مقصود ہے جو خاص ان کے حق میں نبوت سے مانع آ گئی - اگر یہ کہا جاتا کہ ابراہیمؑ اگر جیتے تو بھی نبی نہ ہوتے تو ممکن تھا کوئی شخص اسے ان کی قصورِ استعداد و لیاقت پر محمول کر لیتا - حالانکہ یہاں لیاقت و استعداد میں کوئی کمی نہ تھی اس لیے ایسے پیرایہ بیان سے احتراز کر کے وہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے جو ان کی لیاقت پر روشنی ڈالے - یہاں ملا علی قاریؒ بلاوجہ حضرت ابراہیمؑ کی فرضی نبوت کے اور دوسرے فرضی پہلوؤں کی تفصیلات میں بھی پڑ گئے ہیں یعنی انہوں نے یہ بحث شروع کر دی ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے اور فرض کر لو کہ نبی ہو جاتے تو آخر کس قسم کے نبی ہوتے ؟ تشریعی یا غیر تشریعی یہ سب بحثیں ہمارے نزدیک بے محل ہیں - حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فرضی نبوت کا پہلو یہاں صرف ایک خاص مقصد کے پیش نظر ذکر کیا گیا ہے - اس کی بقیہ تفصیلات میں جانا قطعاً غیر ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ نبوت بتلاتی ہے کہ نبوت افراد و اشخاص سے منتقل ہو کر ذریت ابراہیم علیہ السلام میں پھر ذریۃ ابراہیمؑ سے ذریۃ اسماعیل میں منتقل ہوئی - اب اگر نبوۃ آئندہ جاری رہتی تو اس کو طبعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریۃ میں منتقل ہونا چاہیے تھا اگرچہ یہ لزوم نہ عقلی ہے نہ نقلی - لیکن صرف نبوت کی تاریخ کی مناسبت یہ چاہتی ہے کہ اگر آئندہ نبوۃ منتقل ہوتو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند مبارک کی طرف منتقل ہو - اس استعداد و مناسبت کے اظہار کے لیے یہ فرمایا گیا تھا کہ اگر ابراہیم زندہ رہتے تو نبی ہوتے ان مقاصد کے پیش نظر یہ کہنا کہ اگر آپ جیتے جب بھی نبی نہ ہوتے بالکل بے معنی بات تھی یہ اس وقت مناسب تھا - جب کہ آپ کو ختم نبوۃ کا مسئلہ بیان کرنا مقصود ہوتا یہاں تو یہ بتلانا مقصود تھا کہ تاریخ نبوت جس بات کو چاہ رہی تھی اس کا اقتضاء یہاں پورا ہے - خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند گرامی کے متعلق جتنی بلندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ اس سے آگے ہیں چونکہ انتقال نبوت کا یہ مخصوص تخیل حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں قائم کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لیے ان کا جوہر استعداد بتلانے کے لیے دوسرا عنوان اختیار کیا گیا اور وہاں ختم نبوت ہی پر زور دیا گیا یعنی اگر کہیں نبوت ختم نہ ہوتی تو یہ اپنے کمالات و لیاقت کے لحاظ سے اس کے اہل تھے کہ انہیں منصب نبوت سے سرفراز کر دیا جاتا جنہیں موارد کلام سمجھنے کا سلیقہ حاصل تھا انہوں نے ﷺ ....

من زعم بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ نبی فھو کذاب

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ نبی ہے وہ پرلے درجہ کا جھوٹا ہے

(۱۶۷) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ سَیَکُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ کَذَّابُوْنَ ثَلٰثُوْنَ کُلُّھُمْ یَزْعُمُ اَنَّہٗ نَبِیٌّ وَ اَنَا خَاتِمُ النَّبِیِّیْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ. (رواہ مسلم)

(۱۶۷) ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آئندہ میری امت میں تیس سخت جھوٹے پیدا ہوں گے ان میں ہر ایک اپنے متعلق گمان کرے گا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں سب نبیوں کے آخر میں آیا ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ (مسلم)

.... اس فرق کو خوب سمجھ لیا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اس حدیث سے یہ نہیں سمجھے کہ آپ کے بعد نبوت جاری ہے بلکہ انہوں نے اس کو یوں حل کرلیا کہ جب عالم تقدیر میں ختم نبوۃ مقدر ہوچکی تھی تو اس کے مناسب یہی تھا کہ عالم تکوین میں حضرت ابراہیمؑ کو عمر نبوت نہ دی جائے تاکہ جوان ہو کر پھر آپ کا نبی ہونا مناسب ہو اور آپ کا جوہر استعداد سمجھانے کے لیے آپ کی حیوۃ فرض کر کے یہ کہلا دیا جائے کہ آپ کی فطرت تو نبی کی فطرت تھی مگر چونکہ زمانہ نبوت باقی نہ تھا اس لیے عمر نبوۃ مقدر نہ ہوئی۔

خلاصہ یہ کہ یہاں ختم نبوت کا مسئلہ چھیڑنا مقصود نہیں تھا اگر آپ کو اس بحث میں پڑنا ہے تو پہلے اس پر بھی غور کیجئے کہ مشیت ایزدی نے حضرت ابراہیم کی حیوۃ کا آخر ارادہ کیوں نہیں کیا؟ عطاء فرماتے ہیں۔ان اللہ لما حکم ان لا نبی بعدہ لم یعطہ و لد اذکر ایصیر رجلا ۔[1] جب اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر فرمایا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہو تو آپ کو کوئی ایسی نرینہ اولاد بھی نہ دی جو جوانی کی عمر کو پہنچتی ۔ عامر شعبی آیت ما کان محمد الخ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ما کان یعیش لہ فیکم و لد ذکر[2] یہ آپ کی شان (ختم نبوۃ) کے مناسب ہی نہ تھا کہ آپ کی کوئی نرینہ اولاد زندہ رہتی اسمٰعیل فرماتے ہیں۔قلت لابن ابی اوفی رایت ابراھیم بن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مات صغیر او لو قدر ان یکون بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی عاش ابنہ لکن لانبی بعدہ.[3] میں نے ابن ابی اوفی سے پوچھا آپ نے ابراہیمؑ آپ کے فرزند مبارک کو دیکھا ہے انہوں نے کہا ان کا لڑکپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی مقدر ہوتا تو آپ کے فرزند مبارک جیتے رہتے لیکن آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔عن انسؓ قال لو بقی لکان نبیا و لکن لم یکن لیبقی لان نبیکم اخر الانبیاء.[4] انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اگر جیتے تو نبی ہوتے لیکن وہ کیسے جیتے جب کہ آپ نبیوں میں آخری نبی قرار پا چکے تھے۔شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں الا تراہ صلی اللہ علیہ وسلم ما عاش لہ ولدذکر من ظھورہ تشریفا لہ لکونہ سبق فی علم اللہ انہ خاتم النبیین[5]۔کیا تم نہیں دیکھتے کہ صرف آپ کی تشریف وتکریم کے لیے آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی کیونکہ خدا کے علم میں یہ طے پاچکا تھا کہ آپ خاتم النبیین اور آخری نبی ہیں (اگر وہ زندہ رہتے اور نبی نہ ہوتے تو ایک لحاظ سے یہ بھی آپ کی شان کے مناسب نہ تھا اور اگر نبی ہوتے تو یہ آپ کے خاتم النبیین ہونے کے مناسب نہ ہوتا اس لیے ان کے لیے عمر نبوت ہی مقدر نہ ہوئی۔

ان بیانات سے ثابت ہے کہ صحابہ وتابعین اور علماء محققین کے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نبی نہ ہونے کا اصل سبب وہی تھا کہ اب منصب نبوت کے تقرر کے لیے کوئی (Vacancy) جگہ ہی باقی نہیں رہی مگر جو مخصوص عنوان یہاں اختیار کیا گیا ہے اس کی مصلحت اور ہے۔

[1] معالم التنزیل۔ [2] جامع ترمذی۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب۔ [4] مسند احمد،فتح الباری ص ۴۷۶۔ [5] فتوحات باب ۲۸۲ص ۱۷۔۶

(۱۶۸) عَنْ اَبِیْ بَکْرَةَ قَالَ اَکْثَرَ النَّاسُ فِیْ اَمْرِ مُسَیْلَمَةَ الْکَذَّابِ قَبْلَ اَنْ یَّقُوْلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْهِ شَیْئًا ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِی النَّاسِ فَاَثْنٰی عَلَی اللّٰهِ بِمَا هُوَ اَهْلُهٗ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فِیْ شَاْنِ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِیْ قَدْ اَکْثَرْتُمْ فِیْ شَاْنِهٖ فَاِنَّهٗ کَذَّابٌ مِنْ ثَلَاثِیْنَ یَخْرُجُوْنَ قَبْلَ الدَّجَّالِ.

(رواہ الطحاوی فی مشکل الآثار ج ۲ ص ۱۰٤)

(۱۶۸) حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مسیلمہ کذاب کے معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فرمانے سے پیشتر لوگوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ایک دن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خطبہ دیا اور بعد حمد وصلوٰۃ کے فرمایا جس شخص کے بارے میں تم رائے زنی کر رہے ہو وہ ان تمیں جھوٹوں میں ایک جھوٹا ہے جو دجال اکبر سے پہلے آئیں گے۔

(مشکل الآثار)

(۱۶۹) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ الزُّبَیْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ

(۱۶۹) عبداللہ بن الزبیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ تمیں جھوٹے دجال

---

(۱۶۹) * انبیاء علیہم السلام کے بیان میں ان کے اندازۂ علم ویقین کے مطابق ایک طاقت وشوکت ہوتی ہے وہی یہاں ظاہر ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ علم ازلی میں دجالین کی آمد ثابت ہو چکی ہے اس لیے قیامت کے آنے سے پہلے ان کی آمد یقینی امر ہے دنیا کو چاہیے کہ وہ ان کا انتظار کر کے تھک نہ جائے۔ رہی یہ بات کہ اس امت میں دجالوں کی اتنی کثرت کیوں ہے تو جو اور فتنوں کے متعلق جواب دیا جائے گا وہی جواب اس فتنے کے متعلق بھی ہو جائے گا۔ ایک قطعی بات ضرور معلوم ہوتی ہے جب اس امت میں نبوت کا ختم ہونا مقدر رہا تو اس کا مقابلہ بھی شیطانی طاقتوں کے لیے ضروری ہو گیا خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ دنیا کے آخری دور میں پھر ایک ایسی عام وحدت پیدا کر دے جیسی آغاز عالم میں ایک مرتبہ ظاہر ہو چکی ہے نسل انسانی ایک ہی باپ کی اولاد تھی جیسا روز اول وہ ایک ہی زمین پر تھی۔ آخر میں پھر اس کا ایک ہی کلمہ ایک ہی قبیلہ اور ایک ہی دین ہو جائے۔ درمیان میں نبوتوں اور رسالتوں کے تفاوت سے شریعت اور منہاج کا جو تفاوت پیدا ہو گیا تھا وہ سب ختم ہو کر صرف ایک شریعت اسلام باقی رہ جائے اتنی عظیم وحدت کو شکست دینے کے لیے شیطانی لشکروں کو بھاگ دوڑ کرنا ضروری تھا اس لیے اس عام نبوت کے بالمقابل نبوت کا دعویٰ کرنا لازم ہو گیا۔ اس پیشگوئی کا ظہور آپ کے عہد مبارک سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ مسیلمہ اور عنسی آپؐ کے زمانہ میں ہی ظاہر ہوئے اور آپؐ کے حکم کے ماتحت صحابہ نے ان کو کاذب سمجھا اور آخرکار جو دجالین کے ساتھ برتاؤ چاہیے تھا وہی ان کے ساتھ کیا گیا۔ رہی یہ بحث کہ دجالوں کے تمیں ہونے میں ہی کیا حکمت ہے تو حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

"و لیس المراد بالحدیث من ادعی النبوة مطلقا فانهم لا یحصون لکون غالبهم ینشأ لهم ذلک عن جنون و سوداء و انما المراد من قامت له الشوکة."

حدیث مذکور میں مدعین نبوت سے ہر مدعی نبوت مراد نہیں کیونکہ مدعی نبوت تو بے شمار ہیں بیشتر یہ دعویٰ جنون یا سوداویت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں مراد وہ مدعین نبوت ہیں جو باشوکت ہوں گے ان کا مذہب تسلیم کیا جائے گا' ان کے متبعین کی تعداد زیادہ ہوگی۔

نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جس امت میں لاکھوں اور کروڑوں سے متجاوز اولیاء واقطاب گذر گئے ہوں اس میں تمیں دجالوں کا عدد کچھ زیادہ بھی نہیں ہے۔ غور طلب تو یہ ہے کہ اگر آپؐ کے بعد نبوت کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی قسط بھی باقی تھی تو اس کی بشارت کے لیے آخر ایک حدیث بھی کیوں نہیں آئی اور کذابین ودجالین کے متعلق دسیوں حدیثیں کیوں آگئیں؟ پھر حدیث نمبر ۱۶۶ میں ان کے کاذب ہونے کے ....

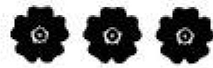
السَّاعَةُ حَتّٰی یَخْرُجَ ثَلٰثُوْنَ کَذَّابًا دَجَّالًا مِنْھُمُ الْمُسَیْلَمَةُ وَ الْعَنَسِیُّ وَ الْمُخْتَارُ. (ابو یعلی فتح الباری)

نہ نکل آئیں جن میں مسیلمہ عنسی اور مختار بھی ہیں۔

ﷺ.....کی وجہ یہ نہیں بتلائی گئی کہ وہ درحقیقت نبی نہ ہوں گے بلکہ یہ قرار دی گئی کہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایک طرف تو احادیث میں ہر قسم کی نبوۃ کی نفی آ رہی ہے۔ ہر مدعی نبوت کو کذاب و دجال کہا جا رہا ہے دوسری طرف کسی حدیث سے ظلی و بروزی کی تقسیم ثابت نہیں ہوتی۔ تاریخ نبوت میں ظلی نبی کوئی نظر نہیں آتا۔ پھر آخر کس دلیل سے نبوت کی ایک تیسری قسم مان کر اس کو جاری قرار دیا جائے؟ یہاں یہ تفتیش بھی ضروری ہے کہ نبوت کی جو قسم بھی تسلیم کی جائے اس کا آغاز کب سے ہوا؟ تاریخی لحاظ سے وہ افراد کون سے تھے؟ جن کو ظلی نبی کہا جا سکتا ہے اور کیا یہ ثابت ہے کہ انہوں نے اپنی نبوت پر ایمان لانے کی امت کو دعوت دی ہو اور کیا کسی ایسے نبی کی امت نے کبھی تصدیق کی ہے؟ اگر ایسا کوئی نبی اب تک نہیں گذرا' اور اگر گذرا ہے تو امت نے ہمیشہ اس کی تکذیب ہی کی ہے تو پھر کس دلیل سے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت اس امت میں نبوت کی کوئی قسم جاری ہے اور اتنی کثرت کے ساتھ جاری ہے کہ ان کی آمد دجالین کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ یہاں انجیل کا بیان بھی حدیث ہی کے موافق ہے۔

''جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں ان کے پھلوں سے تم انہیں پہچان لو گے کیا جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں۔'' (متی باب ۷ — ۱۵و۱۶)

جس قدرت نے اس عالم کو تماشا گاہ اضداد بنایا ہے۔ نور کے مقابلہ میں ظلمت' تری کے مقابلہ میں خشکی' صحت کے مقابلہ میں مرض' بلندی کے مقابلہ میں پستی پیدا فرمائی ہے۔ اسی نے عالم روحانیات میں ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت ملائکہ کے مقابلہ میں شیاطین' انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں دجالین بنائے ہیں۔ پس جس طرح خاتم الرسلؐ کی آمد سب رسولوں کے بعد ہوئی ہے اسی طرح مناسب ہے کہ دجال اکبر کے ظہور سے پہلے جو دجالین آنا ہیں آ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ دجال اکبر یعنی خاتم الدجاجلہ کا ظہور خاتم الرسلؐ کے عہد میں ہی مقدر رہا تاکہ دنیا کے خاتمہ پر ہدایت و ضلالت کی آخری طاقتیں زور آزمائی کر کے ختم ہو جائیں پھر قیامت آ جائے۔ و للہ الحکمة البالغہ۔



خاتم النبیّین

جہان کا سردار آ گیا اب کوئی رسول یا نبی نہیں آئے گا- دنیا اسی کے زیر رسالت و سیادت ختم ہو جائے گی- عالم کی آبادی کا دارومدار اس کی ہدایت پر ہے اور کارخانہ ہدایت تمام کا تمام رسولوں کی ذات سے وابستہ ہے اس لیے عالم کی ابتداء و انتہاء اور رسالت کی ابتداء و انتہاء میں بڑا گہرا ربط ہے- پروردگار عالم نے جب ایک طرف عالم کی بنیاد رکھی تو اسی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف قصر نبوت کی پہلی اینٹ بھی رکھ دی یعنی عالم میں جس کو اپنا خلیفہ بنایا تھا اسی کو قصر نبوت کی خشتِ اوّل قرار دے دیا- اِدھر عالم بتدریج پھیلتا رہا اُدھر قصر نبوت کی تعمیر ہوتی رہی- آخر کار عالم کے لیے جس عروج پر پہنچنا مقدر تھا پہنچ گیا ادھر قصر نبوت بھی اپنے جملہ محاسن اور خوبیوں کے ساتھ مکمل ہو گیا اور اس لیے ضروری ہوا کہ جس طرح عالم کی ابتداء میں رسولوں کی بعثت کی اطلاع دی گئی تھی اس کی انتہاء پر رسولوں کے خاتمہ کا بھی اعلان کر دیا جائے تا کہ قدیم سنت کے مطابق آئندہ اب کوئی شخص رسول کی آمد کا انتظار نہ کرے-

يَا بَنِيْ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيَاتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (الاعراف:۳۵)

اے آدم کی اولاد (دیکھو) تمہارے پاس تم میں سے ہی رسول آئیں گے جو میری آیتیں تمہیں پڑھ پڑھ کر سنائیں گے جس نے تقویٰ کی راہ اختیار کی اور نیک رہا تو اس پر نہ گذشتہ کا خوف نہ آئندہ کا غم-

اس اعلان کے مطابق خدا کی زمین پر بہت سے رسول آئے مگر کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم النبیّین ہے بلکہ ہر رسول نے اپنے بعد دوسرا رسول آنے کی بشارت سنائی حتی کہ وہ زمانہ آ گیا جب کہ اسرائیلی سلسلہ کے آخری رسول نے اسماعیلی سلسلہ کے اس رسول کی بشارت دے دی جس کا اسم مبارک احمدؐ تھا- ﴿وَ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ﴾ (الصف:٦)

عالم کے اس منتظر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس مبشر رسول نے دنیا میں آ کر ایک نیا اعلان کیا اور وہ یہ تھا کہ میں اب آخری رسول ہوں، خود عالم کا زمانہ بھی آخر ہے اور ہاتھ کی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں اور قیامت اس طرح قریب قریب ہیں عالم اپنے پورے عروج کو پہنچ چکا ہے- قصر نبوت میں ایک ہی اینٹ کی کسر باقی تھی وہ میری آمد سے پوری ہو گئی ہے دونوں تعمیریں مکمل ہو گئیں ہیں اب صلاح و تقویٰ کا نتیجہ دیکھنے کا زمانہ آتا ہے- قرآن کریم میں آپ ؐ کی ختم نبوت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے-

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (احزاب:۴۰)

یعنی اب تک جتنے رسول آئے وہ صرف رسول اللہ تھے آپ رسول اللہ ہونے کے علاوہ خاتم النبیّین بھی ہیں اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور کے لیے دو باتوں کا تصور ضروری ہے، یہ کہ آپ ؐ رسول اللہ ہیں اور یہ کہ آپ خاتم النبیّین بھی ہیں- آپ کے متعلق صرف رسول اللہ کا تصور آپ کی ذات کا ادھورا اور نا تمام تصور ہے بلکہ ان ہر دو تصورات میں آپ کا امتیازی تصور خاتم النبیّین ہی ہے- ختم نبوت کی اسی اہمیت کی وجہ سے گذشتہ احادیث میں آپ مطالعہ فرما چکے ہیں کہ اس مسئلہ کی نشر و اشاعت نبوتِ آدم علیہ السلام بلکہ وجود آدمؑ سے بھی پہلے لوحِ محفوظ اور عرشِ عظیم پر کر دی گئی تھی اور کاتبِ تقدیر نے حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان آپ ؐ کے اسم مبارک کے ساتھ آپ کی خاتم النبیّین ہونے کی صفت بھی بصورت حروف

نقش کردی تھی- حضرت آدم علیہ السلام نسل انسانی کی بنیاد تھے لوح محفوظ جملہ حوادث عالم کی بنیاد ہے اور عرشِ عظیم ان اصول کے اعلان کا سب سے بلند بورڈ ہے جو دربار الٰہی میں طے شدہ اور ناقابل ترمیم تصور کیے گئے ہیں اس لیے ان مقامات پر اعلان کا یہ مطلب تھا کہ ختم نبوت بھی عالم کے ان بنیادی اور بدیہی مسائل میں داخل ہے جن کا علم سب پر فرض ہے اور جن میں اب کسی تبدیل وترمیم کی گنجائش نہیں- اسی لیے آسمانوں پر فرشتوں نے' زمین پر' حیوانات نے' محشر میں' انبیاء علیہم السلام نے غرض ابتداء سے لے کر انتہا تک عالم بالا سے لے کر عالم اسفل تک ہر ذی شعور اور غیر ذی شعور نے آپ کی ختم نبوت کا نغمہ بلند کیا ہے- جب آپ عالم ناسوت میں جلوہ افروز ہوئے تو آپ کی یہ امتیازی شان مُہر نبوت کی صورت میں بھی نمایاں کر دی گئی تا کہ جس کی آمد کا غلغلہ اب تک عالم میں بلند ہو رہا تھا اس کی شناخت میں کوئی دشواری نہ رہے-[1] خدائے تعالیٰ کی یہ عجب حکمت ہے کہ مُہر نبوت کے ظہور کے لیے آپ کے جسم مبارک میں بھی وہی جگہ منتخب ہوئی جو حضرت آدم علیہ السلام کے جسم مبارک میں منتخب ہوئی تھی-

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا عقیدہ ہر رسول کی دعوت کا جزء اہم رہا ہے اس لیے قیاس کہتا ہے کہ جس رسول کے زمانہ سے قیامت کی آمد مربوط ہے اس کا تذکرہ بھی ان کا فرضِ منصبی رہا ہوگا- گویا ختم نبوۃ کا عقیدہ قیامت کے عقیدہ کے دوش بدوش ہمیشہ تعلیم دیا گیا ہے- شفاء قاضی عیاض اور کنز العمال میں ایک ضعیف اسناد کے ساتھ مروی ہے کہ خدا کے سب رسولوں نے خاتم الانبیاء کی آمد کی بشارت سنائی ہے-

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں-

و قد اخبر الله تبارک و تعالی فی کتابه و رسوله صلی الله علیه وسلم فی السنة المتواترة عنه انه لا نبی بعده لیعلموا ان کل من ادعی هذا المقام فهو کذاب' افاک' دجال' ضالّ.	اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اس کے رسول نے احادیث متواترہ میں ختم نبوت کا اعلان اس لیے فرمایا ہے تا کہ معلوم ہو جائے کہ جو شخص اب اس منصب کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا' افتراء پرداز' دجال اور پرلے درجہ کا گمراہ ہوگا-

علماء محققین لکھتے ہیں کہ ختم نبوت کے اعلان میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ دنیا متنبہ ہو جائے کہ اب یہ پیغمبر آخری پیغمبر ہے اور یہ دین آخری دین ہے جس کو جو حاصل کرنا ہے کر لے- اس کے بعد دنیا کی یہ پیٹھ اجڑنے والی ہے جیسا شام کے وقت ایک دکاندار اعلان کرتا ہے کہ میں اب دکان بڑھاتا ہوں جسے جو سودا لینا ہے لے لے یا جیسا ایک حاکم بوقت رخصت آخری اسپیچ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میری تم سے اب یہ آخری ملاقات ہے جو کہتا ہوں خوب غور سے سن لو' اسی طرح خالق زمین و زماں کو جو آخری

---

[1] قرطبی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ خاتم نبوت کو اسی لیے خاتم نبوت کہا جاتا ہے کہ یہ بھی منجملہ اور علامات کے آپ کی نبوت کی ایک علامت تھی اسی لیے حضرت سلمان فارسیؓ آپ کی غائبانہ تلاش میں جب آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تو نہایت متجسسانہ نظروں سے خاتم نبوت کو تلاش کرنے لگے آپ نے ان کے طور وطریق سے ان کا مقصد پہچان لیا اور چادر مبارک خاتم نبوت سے ہٹا دی پھر کیا تھا سلمانؓ دیکھ کر بے خود ہو گئے اور اسی عالم بے خودی میں اس کو بوسہ دینے لگے اور فوراً حلقہ بگوش اسلام بن گئے- بحیرہ راہب کے قصہ میں بھی موجود ہے کہ اس نے کہا "انی اعرفه بخاتم النبوة" میں خاتم نبوت کی وجہ سے آپ کو پہچانتا ہوں- غرض علماء اہل کتاب کے نزدیک نبی منتظر کی یہ ایک بڑی علامت تھی- دیکھو زرقانی شرح مواہب-

ہدایات دینا تھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت دے دیں اور اعلان کر دیا کہ اب یہ رسول آخری رسول ہے' ایمانیات' اخلاقیات' معیشت' تمدن کے سب اصول مکمل کر دیئے گئے اس لیے یہ دین آخری دین ہے جسے جو عمل کرنا ہے کر لے- حیلہ و حجت کا وقت نہیں رہا' بحث و جدل کی بجائے عمل کی فرصت نکالنی چاہیے وقت تھوڑا رہ گیا ہے اور حساب کی ذمہ داری سر پر ہے-

اب نہ کوئی رسول آئے گا نہ نبی' نہ تشریعی نہ غیر تشریعی' نہ ظلی نہ بروزی مگر اس معنی سے نہیں کہ آئندہ نفوسِ انسانیہ کو کمال و تکمیل سے محروم کر دیا گیا ہے- بلکہ اس معنی سے کہ اب یہ منصب ہی ختم ہو گیا ہے پہلے عالم کی عمر میں بہت وسعت تھی اور اس منصب پر تقرر کی گنجائش بھی کافی تھی اس لیے انبیاء علیہم السلام برابر آتے رہے اب دنیا کی عمر ہی اتنی باقی نہیں رہی کہ اس میں اور تقرر کی گنجائش ہوتی اس لیے اس کے خاتمہ پر آپ کو بھیج کر یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اب نبی نہیں آئیں گے' قیامت آئے گی-

چونکہ سنت الٰہیہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو ختم فرمانے کا ارادہ کرتا ہے تو کامل ہی ختم کرتا ہے ناقص ختم نہیں کرتا- نبوت بھی اب اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی اس لیے مقدر یوں ہوا کہ اس کو بھی ختم کر دیا جائے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت جاری ہو تو لازم آئے گا کہ اس کا خاتمہ نقصان پر ہو ظاہر ہے کہ ایک نہ ایک دن عالم کا فناء ہونا ضروری ہے اس سے قبل کسی نہ کسی نبی کا آخری نبی ہونا بھی عقلاً لازم ہے اب اگر وہ آپؐ سے زیادہ کامل ہو تو اس کے لیے اسلامی عقیدہ میں گنجائش نہیں اور اگر ناقص ہو تو نبوت کا خاتمہ نقصان پر تسلیم کرنا لازم ہوگا-

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب تم فطرت عالم پر غور کرو گے تو تم کو جزو کل میں ایک حرکت نظر آئے گی- ہر حرکت ایک ارتقاء اور کمال کی متلاشی ہوتی ہے- پھر ایک حد پر پہنچ کر یہ حرکت ختم ہو جاتی ہے اور جہاں ختم ہوتی ہے وہی اس کا نقطہ کمال کہا جاتا ہے- انواع پر نظر ڈالیے تو جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات پھر حیوانات سے انسان کی طرف ایک ارتقائی حرکت نظر آ رہی ہے مگر انسان پر پہنچ کر یہ ارتقائی حرکت ختم ہو جاتی ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ انسان تمام انواع میں کامل تر نوع ہے خود انسان کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو وہ بھی نطفہ سے متحرک ہو کر دم و علقہ و مضغہ کے قالب طے کرتا ہوا خلق آخر پر جا کر ٹھہر جاتا ہے اور اسی کو اس کی استعداد فطرت کا آخری کمال کہا جاتا ہے پیدا ہونے کے بعد اس کے اعضاء میں پھر ایک حرکت اور ایک نشو و نما نظر آتا ہے وہ دور شباب پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی کو اس کا زمانہ کمال کہا جاتا ہے نباتات و اشجار کو دیکھئے تو وہ بھی ایک چھوٹی سی گٹھلی سے حرکت کرتے کرتے ایک تناور درخت بن جاتے ہیں- آخر کار اس پر پھل نمودار ہوتے ہیں اور جب پھل نمودار ہو جاتے ہیں تو یہ اس کا کمال سمجھا جاتا ہے اس کمال پر پہنچ کر درخت کا ایک دورِ حیٰوۃ ختم ہوتا ہے آئندہ اپنے دورِ حیٰوۃ کے لیے پھر اس کو بہت سے انہیں ادوار کو دہرانا پڑتا ہے جن میں گذر کر وہ اس منزل تک پہنچا تھا یعنی موسم خزاں آتا ہے اور اس کے ایک دورۂ حیٰوۃ کو ختم کر جاتا ہے- اگر قدرت کو اس کی پھر نشاۃِ ثانیہ منظور نہ ہوتی تو وہ یونہی ہو کہ کر ختم ہو گیا ہوتا مگر چونکہ اس کو ابھی باقی رکھنا منظور ہوتا ہے اس لیے پھر اسے وہی سبز سبز پتیاں' وہی ہری ہری لچک دار ڈالیاں مل جاتی ہیں' پھر اس پر پھول آتے ہیں اور آخر میں پھر پھل نمودار ہو جاتے ہیں اسی طرح جب تک یہ درخت موجود رہتا ہے اپنے ارتقائی مدارج کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دو ہرایا کرتا ہے- جو درخت اپنی ابتدائی کڑیوں کو پھر نہیں دہراتے وہ ایک مرتبہ پھل دے کر اپنی زندگی ختم کر جاتے ہیں جیسا کیلے کا درخت-

اگر یہ سچ ہے تو عالم نبوۃ میں بھی ایک تدریج نمایاں ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمام شریعتوں پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام نبوتیں کسی ایک کمال کی جانب متحرک ہیں- ہر پچھلی شریعت پہلی سے نسبۃً ارتقائی شکل میں نظر آتی ہے اس لیے اس طبعی اصول کے مطابق ضروری ہے کہ یہ حرکت بھی کسی نقطہ پر جا کر ختم ہو جس کو اس کا کمال کہا جائے لیکن جب خود نبوۃ ہمارے ادراک سے بالاتر حقیقت ہے تو اس کے آخری نقطہ کمال کا ادراک بدرجہ اولی ہماری پرواز سے باہر ہونا چاہیے اس لیے ضروری ہوا کہ قدرت خود ہی اس کا تکفل فرمائے اور خود ہی اس کا اعلان کر دے کہ نبوت کا ارتقاء جہاں ختم ہوا ہے وہ مرکزی اور کامل ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہستی ہے اس لیے ...... قرآن کریم میں وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے بعد فرمایا ہے وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو ہر چیز کا علم ہے وہی یہ جانتا ہے کہ نبیوں میں خاتم النّبیّین اور آخری کون ہے یہ بات تمہاری دریافت سے باہر ہے کہ تم معلوم کر سکو کہ اس کے رسولوں کی مجموعی تعداد کتنی ہے ان میں اوّل کون ہے اور آخر کون- اگر اسے عالم کا بقا اور منظور ہوتا تو شاید وہ آپؐ کی آمد ابھی کچھ دن کے لیے اور مؤخر کر دیتا لیکن چونکہ دنیا کی اجل مقدر پوری ہو چکی تھی اس لیے ضروری تھا کہ نبوت کی آخری اینٹ بھی لگا دی جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ قصر نبوۃ کی بھی تکمیل ہوگئی ہے- نبوت نے اپنا مقصد پالیا ہے- آپؐ کے بعد اب کوئی رسول نہیں آئے گا کیونکہ اگر کوئی رسول آئے تو یا وہ آپ سے افضل ہوگا یا مفضول- اگر افضل ہو تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبوت نے ابھی تک اپنے اس کمال کو نہیں پایا جس کے لیے وہ متحرک ہوئی تھی اور اگر مفضول ہو تو کمال کے بعد پھر یہ نزولی حرکت اسی وقت مناسب ہو سکتی ہے جب کہ عالم کی پھر نشأۃ ثانیہ تسلیم کی جائے- قرآن کریم سے ثابت ہے کہ نبوت اب اپنے ارتقائی کمال کو پہنچ چکی ہے اب کوئی اور کمال منتظر اس کے لیے باقی نہیں رہا اس لیے اس فطری اصول کے مطابق اسے ختم ہو جانا چاہیے-

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ:۳) یعنی تمہارا دین کمال کو پہنچ چکا ہے اب ناقص نہ ہوگا- خدا کی نعمت پوری ہو چکی ہے اب آئندہ اس سے زیادہ اس کے تمام کی توقع غلط ہے اور نظر ربوبیۃ اب ہمیشہ کے لیے دین اسلام کو پسند کر چکی ہے اس لیے کوئی دین اس کا ناسخ بھی نہیں آئے گا- عربی زبان میں کمال و تمام دونوں لفظ نقصان کے مقابل ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ کمال اوصاف خارجیہ کے نقصان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور تمام اجزاء کے لحاظ سے مثلاً اگر انسان کا ایک ہاتھ نہ ہو وہ ناقص ہے یعنی ناتمام انسان کہا جائے گا- خواہ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو اور اگر اس کے اعضاء پورے ہیں مگر صورت اچھی نہیں- اخلاق نادرست ہیں خصائل درشت و ناہموار ہیں تو اس کو بجائے ناتمام کے نامکمل انسان کہا جائے گا- آیت بالا میں یہاں دونوں لفظوں کو جمع کر کے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ دین اسلام اب ہر پہلو سے مکمل ہو چکا ہے نہ اس میں اجزاء کا نقصان باقی ہے نہ اوصاف کا- اس لیے اب اس کی حرکت ارتقائی ختم ہوگئی ہے- اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ آپؐ کا آخری نبی ہونا صرف ایک تاخر زمانی نہیں ہے- کسی شخصیت کا صرف آخر میں آنا فضیلت کی کوئی دلیل نہیں ہوتی بلکہ سنۃ اللہ چونکہ یہ ہے کہ ہر شے کا خاتمہ کمال پر کیا جائے اس لیے یہاں آپؐ کا تاخر زمانی آپؐ کے انتہائی کمال کی دلیل ہے- اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر نبوۃ سے ایک بلیغ تشبیہ دے کر واضح فرما دیا تھا- یہود کو جب خدا کے اس اکمال و اتمام

کی خبر پہنچی تو ان سے رہا نہ گیا اور انہوں نے از راہ حسد کہا اے عمرؓ اگر کہیں یہ آیت ہماری حق میں اترتی ہم تو اس دن کو عید کا دن بنا لیتے - حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں-

هذه اكبر نعم الله على هذه الامة حيث اكمل تعالى لهم دينهم فلا يحتاجون الى دين غيره و لا الى نبى غير نبيهم صلوات الله و سلامه عليه ولذا جعله خاتم الانبياء و بعثه الى الجن و الانس.

اللہ تعالیٰ کا اس امت پر یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے اس امت کا دین کامل کر دیا ہے کہ اب اسے نہ کسی اور دین کی ضرورت رہی نہ کسی اور نبی کی اسی لیے آپ کو خاتم النبیین بنایا ہے اور انسان وجن سب کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے-

معلوم ہوا کہ ختم نبوۃ دینی ارتقاء اور خدائے تعالیٰ کے انتہائی انعام کا اقتضا ہے اور وہ کمال ہے کہ اس سے بڑھ کر امت کے لیے کوئی اور کمال نہیں ہو سکتا حتی کہ یہود کو بھی ہمارے اس کمال پر حسد ہے- پھر حیرت ہے کہ اتنے عظیم الشان کمال کو برعکس محرومی سے کیسے تعبیر کیا جا سکتا ہے-

حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوۃ کا صحیح مفہوم سمجھنے ہی میں چند غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں- شاید اس کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ نبوۃ پہلی امتوں کے لیے ولایت وصدیقیت کی طرح ایک ممکن الحصول کمال تھا- اب یہ امت دوسرے اور مراتب تو حاصل کر سکتی ہے مگر کمالِ نبوۃ کو حاصل نہیں کر سکتی یہ سخت غلط فہمی اور حقیقت نبوت سے قطعی جہالت کی دلیل ہے نبوۃ ان کمالات ہی میں نہیں ہے جو ریاضات ومجاہدات کے صلہ میں بطور انعام کسی وقت بھی بخشا گیا ہو بلکہ ایک الٰہی منصب ہے جس کا تعلق تشریعی ضرورت اور براہ راست خدائے تعالیٰ کی صفت اجتباء واصطفا کے ساتھ ہے وہ جسے چاہتا ہے اس منصب کے لیے چن لیتا ہے- اگر نبوت ان کمالات میں ہوتی جو مجاہدات وریاضات' پاک بازی وحسن نیت کے صلہ میں انعامی طور پر ملتے ہیں تو یقیناً اس کے لیے سب سے موافق زمانہ خود نبی کی موجودگی کا زمانہ ہوتا کیونکہ جتنی عملی جدوجہد' اتباع شریعت کا جتنا جذبہ خود اس کے زمانہ میں ہوتا ہے اس کے بعد نہیں ہوتا مگر نبوت کی تاریخ اس کے برخلاف ہے یعنی جب خدائے تعالیٰ کی زمین شر وفساد' طغیان وسرکشی' تکبر وتمرد سے بھر گئی ہے- صلاح وتقویٰ کا تخم فاسد ہوگیا ہے' رشد وہدایت کے آثار محو ہوگئے ہیں- وہی انبیاء کی آمد کا سب سے زیادہ موزوں زمانہ سمجھا گیا ہے- کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان نہیں کہ نبوت وہ انعام نہیں ہے جو ولایت وصدیقیت کی طرح امتوں میں تقسیم کی جائے بلکہ دنیا کے انتہائی دور ضلالت میں خدا کی صفتِ ہدایت کا ذاتی اقتضاء ہے- ذاتی اقتضاء سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ یہاں کسب واکتساب' ماحول کی مساعدت ونامساعدت کا کوئی دخل نہیں- نبوت کا ماحول تو چاہتا ہے کہ خدائی رحمت کی بجائے خدا کا قہر ٹوٹے مگر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں ایک اسم ہادی بھی ہے یہ اس کا اقتضاء ہے کہ جب ملک کا ملک اور قوم کی قوم اس کا راستہ گم کر دے' اور بھولے سے نہیں بلکہ شرارت وشیطنت کی بناء پر تو وہ اپنی طرف سے پھر ان کی ہدایت کے لیے ایک دروازہ کھول دے-

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب منصب رسالت سے سرفراز کیا گیا ان کا زمانہ انسانی کمالات کے عروج وارتقاء کا زمانہ نہ تھا بلکہ دنیا فطری پستی' دنائت وخست' اور احسان فراموشی کے اس تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی تھی کہ ایک کمزور انسان کو خدائی کا دعویٰ کرتے بھی شرم نہ آتی تھی- حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ انہیں اس دعویٰ کے ابطال کے لیے مامور کیا جائے گا- اچانک کوہ طور کے ایک گوشے سے روحانیت کے بادل اٹھے اور حقیقتِ موسویہ پر اس طرح برسے کہ دم کے دم میں موسیٰ بن

عمران حضرت موسیٰ کلیم اللہ بن گئے - بیوی کے لیے آگ لینے کی فکر میں آئے تھے اور سب بھول بھال کر اب آتش کفر بجھانے کی فکر میں جا رہے ہیں - اس مدعی الوہیت کا مقابلہ کرنا ہے جس کے پاس سلطنت کی ساری مادی طاقتیں جمع ہیں اور اپنے پاس قوت بیان بھی ناقص ہے - اس لیے دبے لہجے میں فرماتے ہیں:

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ○ وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ○ هَارُوْنَ اَخِیْ ○ اشْدُدْ بِهٖ اَزْرِیْ○ وَ اَشْرِكْهُ فِیْ اَمْرِیْ﴾ (طٰهٰ : ۲۶-۲۷)

دوسری جگہ سورہ القصص میں فرمایا:

﴿وَاَخِیْ هَارُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْ اِنِّیْ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ﴾ (القصص:۳۴)

ان دعاؤں کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ میرا سینہ کشادہ فرما اور مجھے ایسا حوصلہ مند بنا دے کہ خلاف طبع معاملات کو خندہ پیشانی سے برداشت کر سکوں اور میرے لیے ایسے سامان فراہم کر کہ یہ عظیم الشان خدمت آسان ہو جائے اور لڑکپن میں زبان جل جانے کی وجہ سے میری گفتگو میں جو لکنت پیدا ہوگئی ہے اس کو دور فرما کہ وہ میری بات تو سمجھ لیں اور میرے گھر میں میرے بھائی کو میرا معین بنا دے کہ وہ میرا کام بٹائیں اور ان کی وجہ سے مجھے سہارا بھی رہے - سورۂ قصص میں اس کی تفصیل اور ہے کہ میرے بھائی مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں انہیں میرے ہمراہ کر دے تاکہ وہ میری اعانت میں میری تصدیق کرتے رہیں مجھے اندیشہ ہے کہ میرے پہلے معاملات کی وجہ سے کہیں وہ سب میری تکذیب نہ کر دیں اس وقت کم از کم ایک ایسا شخص تو میرے ساتھ ہو جو میری تصدیق کر دے اور اگر مناظرہ کی نوبت آ جائے تو ان سے مناظرہ بھی کر لے-

اس دعاء سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ نبوت کو ان کمالات میں سمجھ لینا جو پہلی امتوں کو کسی عبادت و ریاضت کے صلہ میں یا انعام کے طور پر تقسیم کیے گئے ہیں سخت غلط فہمی ہے بلکہ یہ صرف تشریعی ضرورتوں کی تکمیل کا ایک منصب ہے جس میں قدرت اس کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اسی کو اس منصب کے لیے انتخاب کر لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی درخواست میں یہاں حضرت ہارون کی کسی ایسی جد و جہد کا ذکر نہیں کیا جو ان کی نبوت کی سفارش کر سکتی بلکہ ان صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے جو اس منصب کے لیے درکار تھیں-

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کے بعد ذرا اور آگے چلیں تو پھر ضلالت و ہدایت میں یہی کشمکش نظر آتی ہے کبھی ضلالت کے جھکڑ ہدایت کی شمعوں کو گل کر دیتے تھے کبھی نور ہدایت کفر کی تاریکیوں کے ٹکڑے کر ڈالتا تھا حتیٰ کہ دنیا کے آخری دور میں پھر ضلالت کا ابر محیط اٹھا اور اس شان سے اٹھا کہ تمام کرۂ ارضی پر تاریکی چھا گئی کوئی خطہ نہ رہا جہاں آفتاب ہدایت کی کوئی معمولی کرن بھی چمکتی - عالم کا وہ مرکزی نقطہ بھی جس کو ام القریٰ کہا جاتا تھا تیرہ و تاریک ہو گیا اور خانہ خدا پر کفر کا پرچم لہرانے لگا تو اس عام گمراہی کے ماحول میں اسم ہادی کا پھر تقاضہ ہوا کہ اس کے مقابلہ کے لیے ایسی ہی عام ہدایت بھیجے جو خطہ و ملک اور قوم و زمان کی قید سے آزاد ہو - وہ ہدایت بصورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ظاہر ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں کفر نے شکست کھائی، کفر کا پھریرا اتار کر پھینک دیا گیا اور اس کی بجائے خدائی نصرت و فتح کا جھنڈا نصب کر دیا گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب کفر ہمیشہ کے لیے شکست کھا چکا ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ کلمہ توحید مٹ جائے اور ہدایت کے آثار و نشانات اس طرح تباہ و برباد ہو جائیں کہ خدا کی

زمین پھر کسی نبی کو پکارنے لگے- مکہ مکرمہ اب اسلامی دار السلطنت بن گیا ہے اور اسی لیے اب یہاں سے ہجرت کرنا منسوخ ہو گیا ہے شیطان جو سر چشمہ کفر تھا اب مایوس ہو گیا ہے کہ مصلین جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں گے- دین اسلام کامل ہو چکا ہے اس کی روشنی اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے خدائی نعمت پوری ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی اور ہمیشہ کے لیے ایک اسلام ہی پسندیدہ دین ٹھہر چکا ہے اس لیے آئندہ نہ گمراہی اتنا تسلط حاصل کر سکتی ہے کہ ہدایت کو فنا کر دے اس کے تمام چشمے خشک ہو جائیں- اس کی ایک کرن بھی چمکتی نہ رہے اور نہ اس لیے کسی رسول کے آنے کی ضرورت باقی ہے- پھر ختم نبوت درحقیقت اس کا اعلان ہے کہ نورِ نبوت اب تمام عالم کو اس طرح روشن کر چکا ہے کہ کفر کتنا ہی سر پٹکے مگر وہ اس کے بجھائے بجھ نہیں سکتا- خدا کا اقرار، اس کے صفات کی معرفت غیب کا یقین، مجموعہ عالم کا اس طرح جزء بن گیا ہے کہ اگر کہیں اس مرتبہ پھر یہ معرفت ختم ہو گئی تو اس کے ساتھ ہی عالم کی روح بھی نکل جائے گی فضاءِ عالم میں بیماریاں پھیلیں اور صحت عامہ کو خطرہ میں ڈال دیں پھر کوئی ڈاکٹر نہ ملے شفا خانہ نہ ہو تو یقیناً یہ دوہری مصیبت ہے لیکن اگر کسی ملک کی آب و ہوا ہی صاف ہو وہاں کے باشندے شفا خانے اور ڈاکٹر کے محتاج ہی نہ ہوں تو بتلاؤ کہ یہاں بھی کسی شفا خانہ کے قیام کی حاجت ہے؟ کیا ایسی صحت و تندرستی کے ماحول میں بیماروں کے قیام کے لیے مکانات ڈاکٹروں اور شفا خانوں کا وجود مقامی ضروریات میں داخل سمجھا جائے گا اور اگر یہ بھی فرض کر لو کہ اس خطہ کے باشندوں کو علم طب کی باضابطہ تعلیم دی گئی ہو تو کیا یہ شکوہ بجا ہو گا کہ جس طرح فلاں ملک کے لیے ڈاکٹر مقرر کر کے بھیجا گیا ہے ہمارے لیے بھی اسی طرح ڈاکٹر کیوں نہیں بھیجا گیا-

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عام گمراہی کے بعد تشریف لا کر صرف خدائی آیات پڑھ کر ہی نہیں سنائیں بلکہ اس کو سمجھا بھی دیا اور اس پر پریکٹیکل طور سے عمل بھی کرا دیا ہے- اس لیے اب آپ کی اس ہمہ گیر تعلیم کے بعد اوّل تو یہ ممکن ہی نہیں کہ جراثیم کفر اس طرح غالب آ جائیں کہ عالم کی صحتِ عامہ کسی بیرونی ڈاکٹر کی محتاج ہو جائے دوم ان کو اس حد تک اصول طب کی تعلیم بھی دے دی گئی ہے کہ اگر کہیں کفر سر نکالے تو اس کا آئینی علاج وہ خود کر سکتے ہیں- اگر اس پر وہ کاربند نہ ہوں تو یہ ان کا قصور رہے گا- پس یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ ختم نبوت کو کمالات کے ختم کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے- ہمارے اس بیان سے روشن ہو گیا کہ نبوۃ کا ختم ہونا تو خدائی نعمت کے اتمام اور دین کے انتہائی ارتقاء و عروج کی دلیل ہے البتہ کمالات و برکات کا خاتمہ بلاشبہ محرومی اور بڑی محرومی ہے مگر یہ روایات سے ثابت ہے کہ امت مرحومہ کے کمالات تمام امتوں سے زیادہ ہیں اور اتنے زیادہ ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی کو بھی اس امت کے کمالات سن کر تمنا ہو سکتی ہے کہ وہ بھی اس امت کے ایک فرد ہوتے-

خفاجی نسیم الریاض کی شرح میں حضرت انسؓ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی جو شخص احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر کے میرے پاس آئے گا میں اسے دوزخ میں ڈالوں گا انہوں نے عرض کیا یہ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ ارشاد ہوا یہ وہ ہیں جن سے زیادہ مجھے اپنی مخلوق میں کوئی

عزیز نہیں- زمین و آسمان سے قبل ہی میں نے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ ساتھ عرش پر لکھ دیا تھا اور یہ بات طے کر دی تھی کہ جب تک وہ اور ان کی امت جنت میں داخل نہ ہو لیں کوئی اور جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا- موسیٰ علیہ السلام نے اس امت کے اوصاف پوچھے- ارشاد ہوا کہ وہ امت ہر وقت ہماری تعریف کرے گی بلندی پر چڑھے گی تو تعریف کرتی ہوئی پستی میں اترے گی تو تعریف کرتی ہوئی غرض ہر حال میں ہماری حمد و ثناء کرے گی- اپنی کمریں باندھنے والی اپنے اعضاء دھونے والی' دن کی روشنی میں شیر کی طرح (بہادر) اور رات کی تاریکیوں میں درویش صفت ہوگی- ان کا تھوڑا سا عمل میں قبول کروں گا اور کلمہ شہادت پر انہیں جنت میں داخل کروں گا- موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ تو مجھے اسی امت کا نبی بنا دے ارشاد ہوا کہ اس کا نبی تو خود ان ہی میں سے ہوگا- عرض کیا اچھا تو پھر اس نبی کی امت ہی میں بنا دے- ارشاد ہوا کہ تم ان سے پہلے ہو وہ تمہارے بعد آئیں گے البتہ میں اپنے دار جلال میں تمہیں ان کے ساتھ جمع کروں گا- [1]

مسند ابوداؤد طیالسی و احمد اور ابویعلی میں ہے-

کادت هذه الامة ان تکونوا انبیاء کلها. یہ امت مجموعی اعتبار سے بلحاظ کمالات انبیاء ہونے کے قریب ہے-

شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اسی مضمون کو بحوالہ توراۃ و انجیل کعب احبار سے نقل کیا ہے- کنز العمال میں اسی کے ہم معنی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے- جامع ترمذی میں حضرت عمرؓ کے متعلق آپ پڑھ ہی چکے ہیں اگر نبوت باقی ہوتی تو ان کو اس منصب پر فائز کر دیا جاتا- مبشرات الہام' تحدیث مع الملائکہ- نظم و نسق امت بدعت اور تحریف فی الدین کی اصلاح حتیٰ کہ خلافت حقہ کا صحیح قیام یہ سب اس امت کے مناصب و کمالات میں داخل ہیں- کتاب اللہ کی حفاظت' دین کی تکمیل' ایک ایسی مضبوط جماعت کا بقا جو ہمیشہ جادۂ مستقیم پر قائم رہنے والی ہو' اور حسب ضرورت ایسے افراد و جماعات کی بعثت جو پوری ذمہ داری کے ساتھ تحریفات کی اصلاح کرتی رہیں ان سب امور کا خود قدرت ایزدی تکفل فرما چکی ہے- آپ ہی سوچئے کہ اس کے بعد اب کون سا کمال باقی ہے جو پہلی امتوں میں تھا اور اس امت میں نہیں ہے اور جس کے لیے نبوت کی ضرورت ہے بلکہ صحیح بخاری کی حدیث میں تو یہ ہے کہ سیاست امت کی جو خدمت پہلے انبیاء علیہم السلام انجام دیا کرتے تھے اب وہ خدمات اس امت کے خلفاء انجام دیا کریں گے- پس پہلی امتوں کا ایسا کوئی کمال نہیں ہے جو اس امت کو نہ ملا ہو- ہاں اس امت کے بہت سے ایسے خصائص ہیں جن سے پہلی امتیں محروم ہیں- [2]

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ ختم نبوت کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ نبوت کی بندش گویا ختم نبوت کی وجہ سے ہوئی ہے اگر آپؐ تشریف نہ لاتے تو شاید کچھ اور افراد کو نبوت مل جاتی - یہ بھی انتہائی جہل ہے خاتم النبیین کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سلسلہ انبیاء علیہم السلام میں آپؐ سب سے آخری نبی ہیں اس لیے آپؐ کی آمد ہی اس وقت ہوئی ہے جب کہ انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک فرد آ چکا تھا اس لیے آپؐ کی آمد نے نبوت کو بند نہیں کیا بلکہ جب نبوت ختم ہوگئی ہے تو اس کی دلیل بن کر آپ تشریف لائے ہیں اور اسی معنی سے

---

1. خفاجی فرماتے ہیں رواہ ابونعیم فی الحلیۃ وورد بمعناہ من طرق کثیرۃ کما فی الخصائص (نسیم الریاض ج ۱ ص ۲۰۳)

2. اس جگہ اس حدیث کا نوٹ ضرور دیکھ لیا جائے-

آپ کو خاتم النبیّین کہا گیا ہے- اگر علم ازلی میں کچھ اور افراد کے لیے نبوت مقدر ہوتی تو یقیناً آپ کی آمد کا زمانہ بھی ابھی اور مؤخر ہو جاتا- آپ کا لقب خاتم النبیین اسی وقت واقع کے مطابق ہوسکتا ہے جب کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ آئے اگر آپؐ کے بعد بھی کوئی نبی آتا ہے تو آپؐ کو آخری نبی کہنا ایسا ہی ہوگا جیسا درمیانی اولاد کو آخری اولاد کہنا- آپؐ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام خدا کے پہلے رسول تھے' پس جس طرح ان سے پہلے کوئی رسول نہ تھا نہ ظلی نہ بروزی' اسی طرح آپ آخرالنبیّین ہیں آپؐ کے بعد بھی نہ کوئی ظلی نبی ہونا چاہیے نہ بروزی-

تیسری غلطی یہاں سب سے زیادہ فاحش یہ ہے کہ اس پر غور ہی نہیں کیا گیا کہ پہلے ایک نبی کے بعد دوسرا نبی کیوں آتا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی نبوتیں خاص قوم اور خاص زمانہ کے لیے ہوتی تھیں اس لیے ہر نبی کے بعد لامحالہ دوسرے نبی کی ضرورت باقی رہتی تھی لیکن جب وہ نبی آ گیا جس کی نبوت کسی خطہ' کسی قوم اور کسی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں تو اب اس کے بعد نبوت کا سوال ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کی موجودگی کے زمانہ میں' اگر اس وقت یہ سوال بجا تھا تو اب بھی بجا ہے اور اگر اس وقت نامعقول تھا تو اب بھی نامعقول ہے- یہاں ذہن اس طرف جاتا ہی نہیں کہ آپ کا دورۂ نبوت دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ختم نہیں ہوا- پس درحقیقت نبوت تو اب بھی باقی ہے اور وہ نبوت باقی ہے جو تمام نبوتوں سے کامل تر ہے- ہاں نبی کوئی اور باقی نہیں رہا- عجب بات ہے کہ یہاں بقاءِ نبوت ہی ختم نبوت کو مستلزم ہے یعنی آپ کی نبوت کا لقاء اس کو مستلزم ہے کہ کوئی اور نبی نہ ہو- نافہم الٹا یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی ختم نبوت دوسروں کی نبوت کے بقاء کو مستلزم ہے یہ اس وقت تو معقول ہوتا جب کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرف آپؐ کی نبوت بھی ختم ہو جاتی لیکن جب آپؐ کی نبوت باقی ہے تو اب جدید نبوت کا سوال خود بخود ختم ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو صرف خاتم النبیّین نہیں بنایا بلکہ رحمۃ للعالمین بھی بنایا ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ اب خاتم بذاتِ خود تمام جہان کے لیے رحمت بن کر آ گیا ہے- اتنی بڑی رحمت کہ اس کے بعد کسی اور رحمت کی ضرورت نہیں ہوگی- آج تک ہر رسول کے بعد دوسرے رسول کے انکار سے کفر کا خطرہ لگا رہتا تھا خاتم النبیین کی آمد سے یہ کتنی بڑی رحمت ہوئی کہ اس راہ سے اب کفر کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا نہ کسی اور رول کے آنے کا امکان ہے نہ کسی کے انکار سے کفر کا اندیشہ باقی ہے- پہلے ہر امت کی داستانِ اطاعت وعصیان دوسری امتوں کے سامنے رکھی جاتی تھی مگر اس امت مرحومہ کی داستان عمل اب کسی امت کے سامنے نہیں رکھی جائے گی- خلاصہ یہ کہ ختم نبوت ایک رحمت نہیں بلکہ اس کے دامن میں بے شمار رحمتوں اور کمالات کا دریا بہہ رہا ہے اس لیے اس امت کو نبی بننے کی ضرورت نہیں- اب یہ وہ زمانہ ہے جس میں ایک اسرائیلی نبی کے امتی بن کر آنے کا انتظار ہو رہا ہے- کمالاتِ نبوت ختم نہیں- ہاں وہ دور ضلالت وگمراہی ختم ہو گیا ہے جس کے لیے جدید نبوت کی ضرورت پیش آتی ہے- یاد رکھو اب نبی نہیں آئیں گے بلکہ قیامت آئے گی یا وہ جھوٹے نبی آئیں گے جن کو زبان نبوت نے دجال کہا ہے- انجیل میں ہے ''جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں ان کے پھلوں سے تم انہیں پہچان لو گے[۱]''

اس کی طرف سے دل نہ پھرے گا کہ دوستو — وہ ہو چکا ہے جس کا طرفدار ہو چکا

---

[۱] متی باب ۷ آیت ۱۵-۱۶-

صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی التورات

تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض علامات

(۱۷۰) عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ لَقِيْتُ عَبْدَاللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قُلْتُ اَخْبِرْنِىْ عَنْ صِفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِى التَّوْرَاتِ قَالَ اَجَلْ وَ اللّٰهِ اِنَّهُ لَمَوْصُوْفٌ فِى التَّوْرَاتِ بِبَعْضِ صِفَتِهِ فِى الْقُرْاٰنِ يَاَيُّهَا النَّبِىُّ اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَ حِرْزًا لِلْاُمِّيِّيْنَ اَنْتَ عَبْدِىْ وَ رَسُوْلِىْ سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَ لَا غَلِيْظٍ وَ لَا سَخَّابٍ فِى الْاَسْوَاقِ وَ لَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَ لٰكِنْ يَعْفُوْ وَ يَغْفِرُ وَ لَنْ يَقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ يَفْتَحَ بِهَا اَعْيُنًا عُمْيًا وَ اٰذَانًا صُمًّا وَ قُلُوْبًا غُلْفًا ۔ (رواہ البخاری و کذا الدارمی عن عطاء عن ابن سلام)

(۱۷۰) عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات کے متعلق دریافت کیا انہوں نے فرمایا خدا کی قسم تورات میں بھی ان کی علامات قرآن کریم کے قریب قریب ہی مذکور ہیں چنانچہ تورات میں ہے اے نبی ہم نے آپ کو امت پر گواہ خوش خبری سنانے والا' خدا کے عذاب سے ڈرانے والا اور ان پڑھ عربوں کے لیے حفاظت بنا کر بھیجا ہے- آپؐ ہمارے بندہ اور رسول ہیں- آپ کا نام ہم نے متوکل رکھا ہے (خدا پر بھروسہ رکھنے والا) آپؐ زبان دراز نہیں' سخت دل نہیں' بازاروں میں شور مچانے والے بھی نہیں' برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ عفو و درگذر فرماتے ہیں- اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس وقت تک نہیں بلائے گا جب تک آپؐ کے ذریعہ سے اس ملت کو جو ٹیڑھی ہوگئی ہے سیدھا نہ کردے اس طرح پر کہ وہ یہ اقرار کرلیں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور بند آنکھوں سے پردے نہ اٹھادے اور بہرے کانوں کو شنوا نہ بنادے اور نافہم دلوں میں فہم نہ ڈال دے- (اس حدیث کو بخاری اور دارمی نے روایت کیا ہے مگر دارمی نے ابن سلام سے روایت کیا ہے)

(۱۷۱) وَ عَنْ كَعْبٍ يَحْكِىْ عَنِ التَّوْرَاتِ قَالَ نَجِدُ مَكْتُوْبًا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ عَبْدِىَ الْمُخْتَارُ لَا فَظٌّ وَ لَا غَلِيْظٌ وَ لَا سَخَّابٌ فِى الْاَسْوَاقِ وَ لَا يَجْزِىْ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَ لٰكِنْ

(۱۷۱) کعب تورات سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تورات میں ہم یہ لکھا ہوا دیکھتے ہیں محمد رسول اللہ میرے بندہ ہیں جن کو میں نے چن لیا ہے' زبان دراز نہیں' سخت دل نہیں' بازاروں میں شور مچانے والے نہیں برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ عفو و درگذر فرمادیتے ہیں' ان کی جائے پیدائش

---

(۱۷۱) ٭ قرآن کریم نے بھی اوقات صلوٰۃ کو آفتاب کے تغیر سے شروع کیا ہے :

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ (الاسراء:۷۸) آفتاب کے ڈھلنے سے لے کر رات کی تاریکی تک نماز قائم کیجئے- اس آیت کی تفصیل کتاب الصلوٰۃ میں کی جائیگی بہر حال اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب سابقہ میں اس امت کے جو اوصاف بطور شعار مذکور ہیں وہ حسب ذیل ہیں گوان میں مراتب کے لحاظ سے تفاوت ہو- (۱) بروقت نماز ادا کرنا - (۲) پستی اور بلندی کی ہر تبدیلی میں خدا کی تعریف کرنا - (۳) ازار اونچی باندھنا (۴) وضو کرنا - (۵) بلند جگہ اذان دینا - (۶) نماز میں سیدھا اور پاس پاس صف بنا کر کھڑا ہونا (۷) شب میں متوسط آواز کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرنا تیسرا نمبر عرب کی پوشش کے لحاظ سے ہے ورنہ پاجامہ کا حکم بھی یہی ہے- ان ساتوں امور کی تفصیلات اپنے اپنے باب میں آئیں گی- یہاں اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ جو امور خدا کی مقدس کتابوں میں اس قدر.....

يَعْفُوْ وَ يَغْفِرُ مَوْلِدُهٗ بِمَكَّةَ وَ هِجْرَتُهٗ بِطَيْبَةَ وَ مُلْكُهٗ بِالشَّامِ وَ اُمَّتُه الْحَمَّادُوْنَ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِي السَّرَّاءِ وَ الضَّرَّاءِ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ مَنْزِلَةٍ وَ يُكَبِّرُوْنَهٗ عَلٰى كُلِّ شَرَفٍ رُعَاةٌ لِلشَّمْسِ يُصَلُّوْنَ الصَّلٰوةَ اِذَا جَآءَ وَ قْتُهَا يَتَأَزَّرُوْنَ عَلٰى اَنْصَافِهِمْ وَ يَتَوَضَّئُوْنَ عَلٰى اَطْرَافِهِمْ مُنَادِيْهِمْ يُنَادِيْ فِيْ جَوِّ السَّمَاءِ صَفُّهُمْ فِي الْقِتَالِ وَ صَفُّهُمْ فِي الصَّلٰوةِ سَوَاءٌ لَهُمْ بِاللَّيْلِ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ. (هذا لفظ المصابيح و روى الدارمى مع تغيير يسير)

مکہ مکرمہ اور ہجرت کی جگہ مدینہ طیبہ اور ان کا ملک شام تک ہوگا' ان کی امت اللہ تعالیٰ کی ہر وقت ثناء کرنے والی ہوگی نرمی اور گرمی کے ہر حال میں خدا کی تعریف کرے گی- ہر جگہ خدا کی حمد' ہر بلندی پر خدا کی تکبیر کہے گی (اپنے اوقات صلوٰۃ کے لیے) آفتاب (کے تغیرات) کا انتظار کرے گی' جب نماز کا صحیح وقت آجائے گا فوراً نماز ادا کرے گی نصف ساق تک لنگیاں باندھے گی' اپنے ہاتھ پیر دھوئے گی (یعنی وضو) ان کا منادی (مؤذن) فضاء آسمان میں اعلان کرے گا (یعنی اذان بلند جگہ ہوگی) جہاد میں اور نماز میں ان کی صفیں یکساں ہوں گی' شب میں ان کے (تلاوت قرآن کی) آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے مشابہ ہوگی- (یعنی دھیمی دھیمی آئے گی) یہ لفظ مصابیح کے ہیں اور دارمی نے بھی تھوڑے تغیر کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے-

(۱۷۲) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ مَكْتُوْبٌ فِي التَّوْرَاةِ صِفَةُ مُحَمَّدٍ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

(۱۷۲) عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت لکھی ہوئی ہے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ

ﷺ..... امت کے شعار قرار دیے گئے ہیں ان کی نگہداشت کرنا ہر امتی کا فرض ہونا چاہیے ورنہ اپنے شعار کو فنا کر کے اس امت میں ہونے کا دعویٰ بے دلیل رہ جائے گا-

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات اور تشریف آوری ایک ایسی مسلم حقیقت ہے جس کا ذکر انجیل سے لے کر قرآن کریم تک برابر ہوتا چلا آیا ہے- اس پر تفصیلی بحث تو اپنی جگہ آئے گی جو بات یہاں توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اگر درحقیقت ان کی وفات ہوگئی تھی تو تاریخی لحاظ سے ان کی قبر آج تک کیوں لاپتہ رہی- درآنحالیکہ ان کی امت کا تسلسل کہیں درمیان میں نہیں ٹوٹا جو امت اپنے بزرگوں کے قبور کی پرستش کی ہمیشہ سے خوگر رہی ہو وہ اپنے نبی کی قبر کو یک لخت فراموش کر بیٹھے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں ہوسکتا- یہ حق کسی اور شخص کو نہیں ہے کہ وہ اپنی جانب سے ہر لامعلوم قبر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر بنا ڈالے اور صرف اس بے بنیاد دعویٰ پر قرآن کریم کے قطعی بیان کا انکار کردے- یہ غور کرنا چاہیے کہ جو پیشگوئی یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ہے وہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمرؓ کے حق میں بھی موجود ہے- واقعات یہ ہیں کہ یہ حضرات بعد از وفات آپؐ کے پہلو میں حقیقتاً ہی مدفون ہوئے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسی پیشگوئی کا رخ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں کسی اور طرف تبدیل کردیں- اس لیے تسلیم کرنا ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح آپؐ کے قریب مدفون ہوں گے- نیز راویوں کا یہ بیان کرنا کہ ابھی تک بیت عائشہؓ میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے ظاہر کرتا ہے کہ یہ پیشگوئی امت میں ہمیشہ اپنے ظاہر پر محمول رہی ہے اور اسی لیے راوی یہ بتاتا چلا جاتا ہے کہ اس کے پورا ہونے کے لیے بیت عائشہؓ میں ایک کھلی شہادت موجود ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ کتب مقدسہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات میں شمار کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مدفن آپؐ کے پاس ہوگا اس لیے ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سردست زندہ ہوں پھر وفات پائیں اور آپؐ کے پاس دفن ہوں- بہر حال بحث اس پر ختم نہیں ہوتی یہاں حدیث کے مناسب یہ صرف ایک مجمل نوٹ ہے-

وَسَلَّمَ) وَ عِيسَى بْنِ مَرْيَمَ (عليهما الصلوة و السلام) يدفن معه قال ابو مودود و قدبقي في البيت موضع قبر. (رواه الترمذي)

والسلام آپؐ کے پاس دفن کیے جائیں گے۔ ابومودود راوی حدیث کہتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں جہاں آپؐ مدفون ہیں ابھی ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۷۳) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ غُلَامًا يَهُوْدِيًّا كَانَ يَخْدِمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهٗ فَوَجَدَ اَبَاهُ عِنْدَ رَأْسِهٖ يَقْرَأُ التَّوْرَاتَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا يَهُوْدِيُّ اُنْشِدُكَ بِاللّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ التَّوْرَاتَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَجِدُ فِي التَّوْرَاتِ نَعْتِيْ وَ صِفَتِيْ وَ مَخْرَجِيْ قَالَ لَا قَالَ الْفَتٰى بَلٰى وَ اللّٰهِ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَجِدُلَكَ فِي التَّوْرَاتِ نَعْتَكَ وَ صِفَتَكَ وَ مَخْرَجَكَ وَ اِنِّيْ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقِيْمُوْا هٰذَا مِنْ عِنْدِ رَأْسِهٖ وَ لَوُّا اَخَاكُمْ.

(رواه البيهقي في دلائل النبوة)

(۱۷۳) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا وہ بیمار پڑ گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس عیادت کے لیے تشریف لے گئے دیکھا تو اس کا باپ سرہانے بیٹھا ہوا تورات پڑھ رہا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا اے یہودی تجھے اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی کیا میری نعت وصفت اور میری آمد کہیں تجھے تورات میں ملتی ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ لڑکا بولا خدا کی قسم یا رسول اللہ! کیوں نہیں' ہمیں آپؐ کی نعت وصفت اور آپؐ کی آمد کا ذکر سب چیزیں تورات میں ملتی ہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے فرمایا کہ اس یہودی کو اس کے سرہانے سے اٹھا دو اور اپنے بھائی کی تجہیز وتکفین کے تم خود متکفل ہو۔

(اس حدیث کو بیہقی نے دلائل نبوت میں روایت کیا ہے)

(۱۷۴) عَنْ عَلِيٍّ اَنَّ يَهُوْدِيًّا كَانَ يُقَالُ لَهٗ فُلَانٌ حَبْرٌ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

(۱۷۴) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کے متعلق یہ مشہور تھا کہ فلاں یہودی بڑا عالم ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر

---

(۱۷۳) * اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت کے سوا چند اصولی فوائد بھی معلوم ہو گئے۔ (۱) کافر سے خدمت لینا درست ہے (۲) اپنا خادم خواہ یہودی ہی کیوں نہ ہو اس کی بھی عیادت کرنا چاہیے۔ (۳) بچے کا اسلام معتبر ہے۔ (۴) مسلمان کی تجہیز و تکفین مسلمانوں کے ذمہ ہے۔

(۱۷۴) * تورات میں آپؐ کی جو صفات مذکور ہیں اس کا بہت بڑا عنصر آپؐ کی اخلاقیات سے متعلق ہے احادیث سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ آپؐ کی بعثت کا بڑا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل تھی جو انسان' انسانوں کے ساتھ اخلاقیات میں فیل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں انسانی بلندی کا معیار اخلاق کی بلندی پر رکھا گیا ہے اس لیے خواص کو اخلاقیات میں عوام سے اونچا ہونا چاہیے نبی کو اپنے امتی سے بلند ہونا چاہیے اور اسی لیے انبیاء علیہم السلام میں جو سب سے بڑے نبی ہیں وہ اخلاقیات میں بھی سب سے ﴿بقیہ﴾ ...

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَنَانِيْرُ فَتَقَاضَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ يَا يَهُوْدِيُّ مَا عِنْدِيْ مَا اُعْطِيْكَ قَالَ فَاِنِّيْ لَا اُفَارِقُكَ يَا مُحَمَّدُ حَتّٰى تُعْطِيَنِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذًا اَجْلِسُ مَعَكَ فَجَلَسَ مَعَهُ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ وَ الْعَصْرَ وَ الْمَغْرِبَ وَ الْعِشَاءَ الْاٰخِرَةَ وَ الْغَدَاةَ وَ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَدَّدُوْنَهُ وَ يَتَوَعَّدُوْنَهُ فَفَطِنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الَّذِيْ يَصْنَعُوْنَ بِهٖ فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ يَهُوْدِيٌّ يَحْبِسُكَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنَعَنِيْ رَبِّيْ اَنْ اَظْلِمَ مُعَاهِدًا وَغَيْرَهُ فَلَمَّا تَرَجَّلَ النَّهَارُ قَالَ الْيَهُوْدِيُّ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ شَطْرُ مَالِيْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمَا وَ اللّٰهِ مَا فَعَلْتُ بِكَ الَّذِيْ فَعَلْتُ اِلَّا لِاَنْظُرَ اِلٰى نَعْتِكَ فِي التَّوْرَاتِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِاللّٰهِ مَوْلِدُهُ بِمَكَّةَ وَ مُهَاجَرُهُ بِطَيْبَةَ وَ مُلْكُهُ بِالشَّامِ لَيْسَ بِفَظٍّ وَ لَا غَلِيْظٍ وَ لَا سَخَّابٍ فِي الْاَسْوَاقِ وَ لَا مُتَزَيٍّ بِالْفُحْشِ وَ لَا قَوْلِ الْخَنَا اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ هٰذَا مَالِيْ فَاحْكُمْ فِيْهِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ وَ كَانَ الْيَهُوْدِيُّ كَثِيْرُ الْمَالِ.

(رواه البیهقی فی دلائل النبوۃ)

اس کے کچھ دینار قرض تھے اس نے آپؐ پر تقاضہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے یہودی تیرے دینے کے لیے اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے- وہ بولا اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! تو میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس وقت تک جدا نہیں ہوں گا جب تک کہ آپؐ میرا قرض ادا نہ کر دیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا تو میں تمہارے پاس بیٹھ جاتا ہوں یہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس بیٹھ گئے اور ظہر، عصر اور مغرب و عشاء اور صبح کی نمازیں وہیں ادا کیں، آپؐ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین (چپکے چپکے) اسے دھمکیاں دیتے اور ڈراتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی اس حرکت کو محسوس فرمالیا تو صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک یہودی اور آپؐ کو روکے بیٹھا ہے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے پروردگار نے مجھے اس بات سے منع کیا ہے کہ میں معاہد یا کسی اور شخص کا حق دباؤں- جب دن چڑھ گیا تو یہودی نے کہا میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ- اور اس بات کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں لیجئے میرا نصف مال، اللہ کے راستہ میں ہے، خدا کی قسم جو حرکت بھی میں نے آپ کے ساتھ کی تھی وہ صرف اس لیے تھی کہ جو صفت آپؐ کی تورات میں موجود تھی میں اس کو آزما دیکھوں- وہ محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے ان کی پیدائش کی جگہ مکہ مکرمہ اور ہجرت کی مدینہ ہے اور ان کا ملک شام تک ہے وہ سخت زبان نہیں، سخت دل نہیں، بازاروں میں شور مچانے والے نہیں، فحش اور بیہودہ گوئی سے متصف نہیں، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور بلاشبہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں- لیجئے یہ میرا مال حاضر ہے اب آپؐ اس میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں حکم فرمائیں- (راوی کہتا ہے) یہ یہودی بڑا مالدار شخص تھا-

(اس حدیث کو بیہقی نے دلائل نبوۃ میں روایت کیا ہے)

ﷺ.....آگے تھے- حتیٰ کہ ان کی نبوت کا معیار ہی ان کی اخلاقی آزمائش تھی اسی لیے اس یہودی نے اپنے نزدیک آپؐ کے اخلاق کو سب سے سخت کسوٹی پر کس کر دیکھا اور جو رنگ خالص سے خالص سونے کا ہو سکتا تھا وہی آپؐ کے اخلاق کا دیکھ لیا-

الانبياء تنام عيناهم و لا تنام قلوبهم

(١٧٥) عَنْ شَرِيْكِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ يُحَدِّثُنَا عَنْ لَيْلَةِ اُسْرِیَ بِالنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مَسْجِدِ الْكَعْبَةِ جَاءَهٗ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ قَبْلَ اَنْ يُّوْحٰی اِلَيْهِ وَ هُوَ نَائِمٌ فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَقَالَ اَوَّلُهُمْ اَيُّهُمْ هُوَ فَقَالَ اَوْسَطُهُمْ هُوَ خَيْرُهُمْ وَ قَالَ اٰخِرُهُمْ خُذُوْا خَيْرَهُمْ فَكَانَتْ تِلْكَ فَلَمْ يَرَهُمْ حَتّٰی جَاءُوْ اللَّيْلَةَ اُخْرٰی فِيْمَا يَرٰی قَلْبُهٗ وَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَائِمَةٌ عَيْنَاهُ وَ لَا يَنَامُ قَلْبُهٗ وَ كَذٰلِكَ الْاَنْبِيَاءُ تَنَامُ عَيْنَاهُمْ وَ لَا تَنَامُ

انبیاء علیہم السلام کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل بیدار رہتے ہیں

(١٧٥) شریک بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شب کا واقعہ جس میں آپؐ کو مسجد حرام سے (اعجازی طور پر آسمانوں پر) سیر کے لیے لے گئے تھے حضرت انسؓ سے خود سنا ہے وہ ہم سے بیان کرتے تھے کہ وحی آنے سے پیشتر آپؐ کے پاس تین فرشتے آئے اس وقت آپؐ مسجد حرام میں (کچھ اشخاص کے درمیان لیٹے ہوئے) سو رہے تھے ان میں سے پہلے نے کہا بھلا ان میں وہ شخص کون ہیں؟ درمیانی فرشتہ بولا' جو درمیان میں لیٹے ہوئے ہیں' یہی سب میں افضل ہیں- آخری فرشتے نے کہا اچھا تو جو ان سب میں بہتر ہیں ان کو لے چلو- اس شب تو اتنی ہی بات ہو کر رہ گئی- پھر آئندہ کسی شب میں یہی فرشتے آپؐ کے خواب میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ جب سوتے تو صرف آپؐ کی آنکھیں سوتی تھیں دل بیدار رہتا تھا اور تمام انبیاء علیہم السلام کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب سوتے ہیں تو صرف ان کی

(١٧٥) * شریک بن عبداللہ کی یہ روایت گو بخاری شریف میں موجود ہے مگر محدثین نے اس میں بہت سے اوہام شمار کیے ہیں- ازانجملہ یہ کہ اس میں معراج کا واقعہ نزول وحی سے پہلا قرار دیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ واقعہ اسراء جو کہ جمہور کے نزدیک بیداری کا واقعہ تھا خواب کا واقعہ بتایا گیا ہے- ان امور پر اپنی جگہ بحث کی جائے گی- یہاں ہمیں صرف انبیاء علیہم السلام کے قلبی صفت تیقظ کا بیان کرنا منظور ہے- اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفت تمام انبیاء علیہم السلام میں موجود ہوتی ہے پس جہاں آپؐ کے ساتھ خصوصیت کا شبہ ہو وہاں امت کے مقابلہ میں خصوصیت مراد لینا چاہیے نہ کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں- حافظ ابن حجرؒ کا رجحان بھی کچھ اسی طرف ہے- کتاب بدء الخلق میں اس باب کی مراجعت کی جائے- اصل یہ ہے کہ جن قلوب کو اللہ تعالیٰ مہبط وحی بنا لیتا ہے ان کو عالم قدس سے ایک غیر معمولی اتصال میسر آ جاتا ہے- اسی بیداری کا ثمرہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی سمجھے جاتے ہیں اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذبح کرنے کا خواب ہی دیکھا تھا کہ اتنی بڑی قربانی کے لیے تیار ہو گئے- حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی اس حقیقت کو سمجھ کر بول اٹھے یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ - اے باپ جو حکم آپ کو ملا ہے اسے پورا کیجیے- یہاں خواب کی بات کو امرالٰہی فرمایا ہے- اس کے بالمقابل جو دجل و شیطنت کی باطل طاقتیں ہیں ان کو بھی ایک فطری بیداری حاصل ہوتی ہے- وہ بھی پیشگوئیاں کرتے ہیں- مگر عالم قدس سے انہیں کوئی مناسبت نہیں ہوتی بلکہ انہیں شیاطین کے ساتھ اتصال میسر ہوتا ہے- اسی لیے جب ابن صیاد کے حالات کی تحقیق کے لیے آپ تشریف لے گئے تو اس نے بھی اپنی یہی صفت بیان کی کہ صرف میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل بیدار رہتا ہے- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اس کا امتحان لیا اور اس کو سمجھایا کہ عالم قدس سے اس کو کوئی اتصال حاصل نہیں ہے- وہاں ہر بات صاف ستھری اور طے شدہ موجود ہوتی ہے اس کو صرف شیطانوں سے اتصال میسر ہے اسی لیے غیب پر اُسے کوئی دسترس نہیں صرف قیاسات ☜.....

قُلُوْبُهُمْ فَتَوَلَّاهُ جِبْرِيْلُ ثُمَّ عُرِجَ بِهِ اِلَى السَّمَاءِ. (رواه البخاري)

آنکھیں سوتی ہیں ان کے دل بیدار رہتے ہیں- اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ کو اپنی سپردگی میں لیا اور آسمان پر لے گئے- (بخاری)

بصر النبی

نبی کی نظر

(۱۷۶) عَنْ اُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ اَشْرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اُطُمٍ مِنْ اٰطَامِ الْمَدِيْنَةِ فَقَالَ هَلْ تَرَوْنَ مَا اَرٰى قَالُوْا لَا قَالَ فَاِنِّىْ لَاَرَى الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُيُوْتِكُمْ كَوَقْعِ الْمَطَرِ. (متفق عليه)

(۱۷۶) اسامہ بن زیدؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے بلند مقاموں سے کسی مقام پر چڑھے اور فرمایا کیا تم بھی دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں' صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے عرض کیا نہیں آپؐ نے فرمایا کہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں میں فتنے اس طرح برس رہے ہیں جیسے بارش- (متفق علیہ)

(۱۷۷) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍؓ فِىْ قِصَّةِ صَلٰوةِ الْكُسُوْفِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَأَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِىْ مَقَامِكَ هٰذَا ثُمَّ رَأَيْنَاكَ تَكَعْكَعْتَ فَقَالَ اِنِّىْ رَأَيْتُ الْجَنَّةَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْهَا عُنْقُوْدًا وَ لَوْ اَخَذْتُهُ لَاَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا وَ رَأَيْتُ النَّارَ فَلَمْ اَرَ كَالْيَوْمِ مَنْظَرًا قَطُّ اَفْظَعَ وَ رَأَيْتُ اَكْثَرَ اَهْلِهَا النِّسَاءَ قَالُوْا لِمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ بِكُفْرِهِنَّ قِيْلَ يَكْفُرْنَ بِاللّٰهِ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ وَ يَكْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰى اِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ

(۱۷۷) صلوٰۃ کسوف کے قصہ میں عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ ہم نے آپؐ کو دیکھا کہ اسی مقام پر آپؐ نے کسی چیز کے لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا- پھر دیکھا کہ آپؐ پیچھے ہٹ گئے (یہ کیا بات تھی) فرمایا میں نے جنت دیکھی تو یہ ارادہ کیا تھا کہ اس میں سے ایک خوشہ لے لوں' اگر لے لیتا تو جب تک دنیا رہتی تم اس میں سے کھاتے رہتے پھر دوزخ دیکھی تو ایسا خوفناک منظر کبھی نہیں دیکھا جیسا آج دیکھا تھا' میں نے دیکھا کہ اس میں زیادہ تر عورتیں تھیں- انہوں نے عرض کیا' یا رسولؐ اللہ کیوں؟ فرمایا اپنی حق ناشناسی کی وجہ سے' پوچھا گیا کیا خدا کی حق شناس نہیں ہوتیں؟ فرمایا اپنے شوہر کا حق نہیں پہچانتیں اور احسان فراموش ہوتی ہیں اگر کسی کے ساتھ تم عمر بھر بھی احسان کرو گے پھر تمہاری جانب سے کوئی

⇦ .... اور معمولی ادھورے اتے پتے ہیں اس کو انبیاء علیہم السلام کی صفت نبوت کے ہم پلہ سمجھ رکھا ہے اس لیے فرمایا اخسأ **فَلَنْ تعدو قدرك** - (جا بدنصیب تو اپنے رتبہ سے آگے نہیں جا سکتا) انبیاء علیہم السلام کی یہ صفت تیقظ دائمی ہوتی ہے صرف حالت نوم پر منحصر نہیں- اس بیداری کی پوری حقیقت سمجھنا ہمارے ادراک سے باہر بات ہے- الفاظ اس غیبی حقیقت کو پورا ادا نہیں کر سکتے -صوفیاء کرام کی نسبت ''یادداشت'' شاید اس سے کوئی بعید مشابہت رکھتی ہو- و الغیب عند اللہ العظیم-

(۱۷۶) * یہ وہ فتنے تھے جو صحابہ کے درمیان آئندہ پیش آنے والے تھے آپؐ کی نظر دوربین سالوں پہلے انہیں دیکھ رہی تھی-

(۱۷۷) * جنت خود غیر فانی ہے اس کی ہر نعمت بھی غیر فانی ہے اس لیے اگر آپؐ اس کی کوئی چیز لے لیتے تو وہ بھی دائمی اور غیر فانی ہوتی - اس حقیقت کو بتانا بھی منظور تھا اور عالم غیب کو غیب کی حد تک باقی رکھنا بھی مدنظر تھا اس لیے صرف اتنا بتا کر دست مبارک ⇦ ....

ثُمَّ رَأَتْ مِنْکَ شَیْئًا قَالَتْ مَا رَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ. (متفق علیہ)

ادنی کوتاہی دیکھ پائے تو یہی کہہ دیتی ہے کہ ہم نے تمہاری کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں۔ (متفق علیہ)

(۱۷۸) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ وَ اَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ اَطَّتِ السَّمَاءُ وَ حُقَّ لَہٗ اَنْ تَأِطَّ مَا فِیْھَا مَوْضِعُ اَرْبَعِ اَصَابِعَ اِلَّا وَ مَلَکٌ وَ اضِعٌ جَبْھَتَہٗ لِلّٰہِ سَاجِدًا وَ اللّٰہِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِکْتُمْ قَلِیْلًا وَ لَبَکَیْتُمْ

(۱۷۸) ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں وہ وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ وہ آوازیں سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے' آسمان چر چر کر رہا ہے اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے کیونکہ اس میں کہیں چار انگشت برابر بھی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ خدا کے سامنے سجدہ میں نہ پڑا ہوا ہو' خدا کی قسم ہے جو میں جانتا ہوں اگر کہیں تم جان لیتے تو ہنستے بہت کم اور روتے بہت اور اپنے نرم بستروں پر عورتوں

﴿ ....آگے نہ بڑھے۔ اندازہ کیجئے کہ یہ رؤیت کتنی قوی ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام اس جہان میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں۔

(۱۷۸) ✻ اس حدیث میں صفت سمع و بصر اور علم کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں یہ تینوں صفات اتنی کامل ہوتی ہیں کہ عوام میں ان صفات کی کھپت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ان کے مسموعات و مبصرات و معلومات کی دنیا کسی اور کے سامنے پیش کر دی جائے تو اس کا نظام زندگی ہی معطل ہو جائے۔ پھر وہ نہ آرام کی نیند لے سکتا ہے اور نہ بستیوں میں آباد رہ سکتا ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا ہی ظرف ہے کہ وہ قالب انسانی میں رہ کر ان سب امور کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جن کا نشأۃ ملکیہ مشاہدہ کرتی ہے اور پھر نظام انسانیت کو درہم و برہم ہونے نہیں دیتے۔ کمال یہ نہیں کہ انسان فرشتہ بن جائے۔ فرشتے تو پہلے بھی موجود تھے کمال تو یہ ہے کہ انسان انسان رہے پھر اپنی بہیمیت کو قالب روحانیت میں ایسا ڈھال دے کہ یہ مجموعہ' ملکیت کے لیے قابل صد رشک بن جائے۔ یہ ہے وہ انسان جو عام انسانوں کی طرح ایک انسان بھی نہیں اور فرشتہ بھی نہیں بلکہ وہ کامل انسان ہے جس کو ملک پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

انسان کامل کے علمی و عملی کمالات دیکھ کر بندۂ مادیت اس کا تصور نہیں لا سکتا اور اس لیے ان کو اتنا سادہ سے سادہ بنا دیتا ہے کہ ایک طور پر وہ ان کے انکار ہی کے مرادف ہو جاتا ہے جب وہ انسان کامل کی قوت سمع و بصر کا حال سنتا ہے پھر اس نوع کی قوت انسان اسفل میں نہیں دیکھتا تو نہایت سادگی سے اس کو راویوں کی مبالغہ آمیزی اور حاملان مذہب کی خوش عقیدگی پر محمول کر کے ان کو بھی اسی صف میں ملانے کی کوشش کرتا ہے جس میں وہ خود کھڑا ہے گویا اس کے نزدیک سمع و بصر کی طاقت صرف اسی قدر ہے جتنا اس کو خود محسوس ہے دوسری طرف ایک سفیہ عقیدت مند ہے وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوتا کہ راویوں کی بیان کردہ قوتوں ہی پر بس کر دے بلکہ اپنی جانب سے اور ہزار حاشیہ آرائیاں کرتا ہے اور آخر کار وہ بھی ایک بلند حقیقت کو بے حقیقت بنا کر چھوڑتا ہے۔ یہ دونوں راستے افراط و تفریط کے راستے ہیں ہم نہ اس کے مجاز ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق ایک ذرہ برابر بھی اس سے زیادہ کوئی عقیدہ رکھ سکیں جتنا کہ خود انہوں نے ہم کو بتایا ہے اور نہ اس کے حق دار ہیں کہ ان کے ان فضائل و کمالات کو بھی ناقابل تسلیم کہہ دیں جو قدرت نے ان عظیم القدر ہستیوں کو اپنا نشان قدرت دکھانے کے لیے عطا کیے ہیں افسوس کہ انسان خود اپنے نفس کی طاقتوں کو بھی نہیں پہچانتا کاش اگر وہ ان کو پہچان لیتا تو اس کو اپنے رب کی معرفت بھی آسان ہو جاتی۔ ایک ایٹم بم کی طاقت سے دنیا عالم حیرت میں پڑی ہوئی ہے اور ابھی دیکھئے کہ اقوام عالم کی مسلسل ریسرچ اس کی طاقت کا اور کہاں تک پتہ دیتی ہے۔ جنہوں نے عالم روحانیات کا ذائقہ چکھا ہے اور اس کی طاقتوں کا اندازہ لگایا ہے' ان کے نزدیک یہ کمالات ﴿....

كَثِيرًا وَ مَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشِ وَ لَخَرَجْتُمْ اِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُوْنَ اِلَى اللّٰهِ لَوَدِدْتُ اِنِّىْ كُنْتُ شَجَرَةً تُعْضَدُ. (رواه الترمذی فی الزهد. و قدمر فی باب عظمة الله تعالى)

سے لطف اندوز نہ ہو سکتے اور یقیناً اللہ اللہ پکارتے ہوئے جنگلوں میں نکل جاتے' یہ کہہ کر ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میری تمنا ہے کاش کہ میں ایک درخت ہوتا جو کٹ کر نابود ہو جاتا۔

(ترمذی)

النبی قد یریٰ من وراء ظهره

نبی کبھی اپنے پشت کی جانب سے بھی دیکھ لیتا ہے

(۱۷۹) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى

(۱۷۹) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا

﴾.... غلامانِ انبیاء علیہم السلام میں بھی بقدر نصیب تقسیم ہو گئے ہیں۔ کمالات انبیاء علیہم السلام کچھ اور ہیں اگر کہیں ان کو ظاہر کر دیا جائے تو ظاہر پرستوں کے لیے ایک تماشہ ہاتھ آ جائے اور عقیدت مندوں کی عقیدت سرد پڑ جائے۔ بھائی میرے وہ کمالات ان کی صبر و استقامت اخلاص و انابت' اولوالعزمی و شہامت' وقار و کرامت' برد یقین و شلج صدر' اعتماد و انشراح مانند تباشیر فجر' امانت و صدق رأفت و رحمت خلق' طہارتِ ذیل' نظافت حبیب' اخبات الی اللہ و وسائل غیب' خصائل تضرع و تبتل' استدامت حمد و شکر تو ریث علم و عمل' وعدم توریث مال و منال' ترک مالایعنی' حفظِ ملت لسان' متابعت و مطاوعت حق' حظوظ دنیا میں زہادت زخارف دنیا سے بے التفاتی اور نشر و اشاعت دین ہیں۔ وہ کمالات ان کے ظاہر و باطن کی یک رنگی ہے ایسی یک رنگی جس میں سرمو کوئی فرق نہ آئے۔ ان کی پہاڑوں کی طرح استقامت ہے جو بادشاہوں کی تہدید و تخویف سے متزلزل نہ ہو' ان کی وہ بے طمعی ہے جس میں ارباب اموال کی دولت کوئی لچک پیدا نہ کر سکے۔ ان تمام کمالات کے باوجود ان کو نہ کبھی ناز ہو نہ تکبر وہ سرتاپا کمال ہو کر سرتاپا نقائص مخلوق میں بیٹھنا پسند کر لیں خود ایذائیں اٹھائیں کسی کو ایذائیں نہ دیں اور یہ جو کچھ ہو کسی ریاضت و کسب کا مرہون منت نہ ہو بلکہ سب کچھ عطاء رحمانی اور موصیت ربانی ہو ۔

دلبر ما است کہ از حسن خداداد آمد

یہ وہ انسان کامل ہے جس کی طاقتوں کے سامنے تمام عالم ملکوت سر جھکاتا ہے۔ خدا کی تمام کائنات دست بستہ حکم برداری کے لیے حاضر ہے وہ خلیفہ ہے اور سب اس کے زبردست محکوم مگر افسوس یہ ہے کہ ان تمام طاقتوں سے انسان غافل ہے۔ غافل نہیں بلکہ منکر ہے۔ انبیاء علیہم السلام آ کر بھی بتاتے اور دکھاتے ہیں مگر یہ پھر بھی نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے۔ فصبر جميل۔

(۱۷۹) * یہ رؤیت تو اس عالم کی رؤیت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم دوربین اس عالم سے گذر کر کبھی کبھی جنت و دوزخ کا بھی مشاہدہ کر لیتی تھی۔ آپؐ تو آپؐ ہی ہیں آپؐ کے صحابہ تک جنگ کے موقعوں پر کبھی کبھی ملائکہ کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ کسی صحابی کو خدا کا فرشتہ سلام کرتا اور وہ اس کی آواز سن لیتا تھا۔ عمر فاروقؓ مقام نہاوند کی جنگ مدینہ میں بیٹھ کر دیکھتے تھے اور آپ کی یا ''سارية الجبل'' کی آواز آپ کا جرنیل نہاوند میں سن لیتا تھا۔ آج ریڈیو کی ایجاد نے ''صوت'' یعنی آواز کا مسئلہ تو ختم کر دیا ہے۔ اگر ذرا سی وسعت دے کر بصر کے متعلق بھی آپ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں تو چنداں دشوار نہیں ہے۔ اب بھی خوردبین اور دوربین کے ذریعہ سے ہم جن چیزوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں عام آنکھیں ان کا مشاہدہ نہیں کر سکتیں۔ خوردبین سے بیماریوں کے جراثیم چلتے پھرتے نظر آ جاتے ہیں۔ دوربین کے ذریعہ سے سینکڑوں میل کا فاصلہ کس طرح کف دست معلوم ہونے لگتا ہے اگر ارباب روحانیت و تزکیہ کی نظر بھی مادیات میں ڈوبی ہوئی نظروں سے کسی بلند عالم کا مشاہدہ کرتی ہیں تو ہمیں اس کا بھی انکار نہیں کرنا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ بیماری کے باریک جراثیم کی طرح ان کے دیکھنے کا ہمارے پاس کوئی آلہ نہیں ﴾....

اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِيْ هٰهُنَا وَ اللّٰهِ مَا يَخْفٰى عَلَىَّ رُكُوْعُكُمْ وَلَا

تم میرا قبلہ توجہ صرف سامنے کی طرف سمجھتے ہو' خدا کی قسم تمہارا رکوع کرنا اور تمہارا قلبی خوف بھی مجھ پر پوشیدہ نہیں رہتا' میں تمہیں اپنی پشت کی جانب

ﷺ.... ہے- اگر فرض کرلو کہ وہ تیزیٔ نظر ہمیں بھی میسر آ جائے تو ہم بھی خوردبین کے بغیر ان جراثیم کا مشاہدہ کرلیں یہاں انکار یا تاویل کرنا دونوں راستے غلط ہیں- انکار تو اس لیے کہ جو خود دیکھتا ہے نہ دیکھنے والے کو اس کے مشاہدہ کے رد کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں- اسے اپنی قصورِ نظر کا اعتراف کرنا چاہیے نہ کہ ایک قوی النظر شخص کی رؤیت کا انکار- اسی لیے ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ کو اپنا سلام کہلوایا تو آپؐ نے جواب دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا ترٰی مالا نرٰی یعنی آپؐ تو ان کو دیکھ رہے ہیں ہم نہیں دیکھتے- گویا اپنی قصورِ نظر کا اعتراف کیا اور آپ کے مشاہدہ کی تصدیق کی عالم روحانیات کے متعلق قرآن نے بطور کلیہ یہ بیان کیا ہے کہ ہماری ایک ایسی مخلوق ہے جسے تم نہیں دیکھتے اور وہ تمہیں دیکھتی ہے- انه یراکم هو و قبیله من حیث لا ترونهم-

انبیاء علیہم السلام اور ارباب روحانیت کو ایسی حدتِ نظر مرحمت ہو جاتی ہے کہ وہ ان کا بھی مشاہدہ کرنے لگتے ہیں آخر جب عام طور پر نظروں میں قوت بصر کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہے تو اگر انبیاء علیہم السلام کی نظر عام نظروں سے کچھ اور تیز مان لی جائے تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہو سکتی ہے اور تاویل کرنا اس لیے غلط ہے کہ جو شخص خود دیکھتا ہے' اپنے متعلق یہی عقیدہ رکھتا ہے' اور دوسروں کو بھی یہی باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ درحقیقت دیکھتا ہے اور وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو صرف دیکھنے کے لیے مستعمل ہیں اور اس کے خلاف کوئی ادنیٰ ایماء و اشارہ تک نہیں کرتا تو ان کو کشف والہام پر محمول کر لینا یقیناً غلط ہے- بلکہ ایک واقعہ کا انکار ہے- ہمیں اس کا کیا حق ہے کہ اگر ہماری آنکھیں کچھ چیزوں کو نہیں دیکھتیں تو جو آنکھیں انہیں دیکھتی ہیں ہم ان کے لیے بھی تاویلیں تراشنے بیٹھ جائیں- بعض لوگوں نے تو اسی مغالطہ میں تمام جگہ آپؐ کے چشم دید حالات کو صرف کشف کہہ دیا ہے حتیٰ کہ معراج کو بھی ایک قسم کا کشف ہی کہہ ڈالا ہے تعجب ہے کہ خود دیکھنے والا تو اپنے متعلق دیکھنے کا عقیدہ رکھتا ہے اور یہی باور کرانے کی سعی کرتا ہے مگر سننے والا ہے کہ اس کی خیرخواہی میں صرف اس لیے اس کے الفاظ کی تاویل کرنے لگتا ہے اس کی آنکھوں نے اس کو نہیں دیکھا-

بہت سے لوگ چاند نہیں دیکھتے مگر صرف دیکھنے والوں کے اعتماد پر روزہ رکھ لیتے ہیں اور اس بنا پر کہ چونکہ خود انہوں نے نہیں دیکھا روزہ سے انکار نہیں کرتے اور نہ دیکھنے والوں کے لیے کوئی تاویل کرتے ہیں بلکہ اپنا قصورِ نظر ہی سمجھتے ہیں- اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے جم غفیر کے مقابلہ میں مخلوق کو چاہیے کہ وہ اپنے قصورِ نظر کا اعتراف کرلے نہ یہ کہ ان کے مبصرات و مرئیات کا ہی انکار کر دے- اس تحقیق سے مقصد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی رؤیت کے متعلق کسی صاف اشارہ و ایماء کے بغیر ہم کوئی تاویل نہیں کریں گے اسی طرح رؤیت کو صرف مخصوص ایک جسم کے حصہ میں منحصر سمجھ لینا بھی غلط ہے- کائنات عالم میں سائنس آئے دن نئے سے نئے عجائبات پیش کرتی رہتی ہے اور وہ بھی اس لیے قابل انکار نہیں سمجھے جاتے کہ پہلے واقعات کے خلاف ہیں بلکہ ہر نئے واقعہ کو قدرت کا ایک نیا شاہکار سمجھا جاتا ہے اگر اس لحاظ سے نبی کی شخصیت بھی کچھ مجموعہ عجائبات مان لی جائے تو اس میں کیا استبعاد ہے- بالخصوص جب کہ اس کی شخصیت اپنے دور کے انسانوں میں ہی نہیں بلکہ عالم کے عالم میں انقلاب برپا کرنے والی ہو- اگر وہ خود بھی قوتوں میں عام قوتوں سے اونچی نظر آئے تو اس کا کیوں انکار کیا جائے-

ہمارے نزدیک نبی اور امتی کی قوت بصریہ میں ایک فرق یہ ہے کہ امتی کی نظر اس عالم میں صرف اسی عالم کی اشیاء تک محدود رہتی ہے جب وہ اس جہاں سے گذر کر برزخ میں جا پہنچتا ہے تو پھر اس کی سیرگاہ عالم برزخ بن جاتا ہے اور جب برزخ سے آخرت کی طرف بڑھ جاتا ہے تو کائنات آخرت اس کے نظر کی جولانگاہ ہو جاتی ہیں- غرض جس عالم میں وہ خود ہوتا ہے اس کی نظر بھی اسی عالم میں محدود رہتی ہے- نبی کی نظر اسی عالم میں تمام عالمین کی سیر کر سکتی ہے وہ اسی عالم میں برزخ اور آخرت کی کائنات کا اس طرح مشاہدہ کر سکتی ﷺ....

خُشُوْعُكُمْ وَ اِنِّیْ لَاَرَا كُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِیْ. (رواه البخاری)

سے بھی دیکھتا رہتا ہوں۔

(اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

علم النبی صلی الله علیه وسلم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم

(۱۸۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اَمَرَهُمْ. اَمَرَهُمْ مِنَ الْاَعْمَالِ بِمَا يُطِيْقُوْنَ قَالُوْا اِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَلَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَ مَا تَأَخَّرَ فَيَغْضَبُ حَتّٰى يُعْرَفَ الْغَضَبُ فِیْ وَجْهِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ اِنَّ اَتْقَاكُمْ وَ اَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ اَنَا. (رواه البخاری فی الایمان)

(۱۸۰) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی بات کا صحابہؓ کو حکم دیتے تو ایسی بات کا حکم دیتے جو ان سے بسہولت ہو سکے وہ (شوق شوق میں) عرض کرتے یارسول اللہ ہم آپ کی طرح تو نہیں، آپؐ کی تو اللہ تعالیٰ نے اگلی پچھلی سب ہی لغزشیں معاف کر دی ہیں اس پر آپؐ کو اتنا غصہ آتا کہ اس کا اثر چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگتا پھر آپؐ فرماتے دیکھو تم سب میں زیادہ پرہیزگار اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا سب میں زیادہ عالم میں ہوں۔ (بخاری)

(۱۸۱) عَنْ عَائِشَةَ صَنَعَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا تَرَخَّصَ فِيْهِ وَ تَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ

(۱۸۱) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) کوئی ایسا عمل کیا جس میں رخصت کا پہلو اختیار کیا،

ﷺ ..... ہے۔ جیسا امتی کی نظر اس عالم میں پہنچ کر کرتی۔ انبیاء علیہم السلام اس جہاں میں بھی اہل جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لیے دنیا میں بھی ان کی قوتوں کے وہ آثار ملتے ہیں جو اہل جنت کے جنت میں منقول ہیں۔

اصل یہ ہے کہ رؤیت کی چار قسمیں ہیں دیکھنے والا اور جس کو وہ دیکھتا ہے دونوں مادی ہوں یا دونوں مجرد یا ایک مادی ہو دوسرا مجرد، ان میں سے ہمارے دائرہ میں صرف پہلی صورت معہود ہے اس لیے ہم نے دیکھنے کا مفہوم اسی میں منحصر سمجھ لیا ہے اور جہاں کہیں اس کے خلاف رؤیت کا لفظ نظر آتا ہے تو ہمارا ذہن فوراً اس کی تاویل ہی کی طرف چلا جاتا ہے۔ حالانکہ رؤیت کا یہ صرف ۱/۴ حصہ تھا بقیہ تین صورتوں میں، مجرد کی مجرد کو اور مجرد کی مادی کو رؤیت بھی قابل تسلیم نظر آتی ہے جہاں عقل چکراتی ہے وہ صرف مادی کی رؤیت مجرد کو ہے۔ یہاں عالم مجردات چونکہ ہمارے مشاہدہ میں نہیں اس لیے جن کے مشاہدہ میں ہے ہم ان کے لیے بھی دیکھنا باور نہیں کرتے یہ قیاس غلط قیاس ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی مادیت اتنی مصفّٰی ومزکی ہوتی ہے کہ ملائکہ کا تجرد ان کے سامنے شرماتا ہے لوہے کی اور شیشہ کی مادیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، عالم تجرد کے شیشہ میں جب تک مادیت کا حجاب قائم نہیں ہوتا وہ کسی کامل کی تجلی گاہ نہیں بنتا۔ اسی مادیت ہی میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خلافت اور فرشتوں کی محرومی کا راز مضمر ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا عنصر مادیت بھی ایسا جوہر دار ہوتا ہے کہ جب کبھی عالم تجرد کی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں تو وہ آئینہ سکندر کی طرح جگمگانے لگتا ہے اس لیے قدرت اگر چاہے تو وہ اسی عالم مادیات میں مجردات کا مشاہدہ کر لیتے ہیں ہاں اگر ماوراء مجردات کا مشاہدہ مطلوب ہو تو انہیں بھی اس عالم کو چھوڑنا پڑتا ہے گویا عالم عنصری میں ان کی مادیت مجردات کے مشابہ ہوتی ہے اس لیے جن امور کا مشاہدہ اہل جنت کے لیے موعود ہے وہ ان کے لیے نقد وقت بن جاتا ہے۔ و الله تعالیٰ اعلم بحقیقة الحال۔

(۱۸۱) * علم دراصل خشیتِ الٰہی کا ہی نام ہے اسی لیے قرآن کریم میں فرمایا ہے ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر: ۲۸) اللہ کی ذات پاک سے ڈرنے والے صرف علماء ہیں۔ خشیت اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی ذات کے استحضار عظمت کے ساتھ ہو، ہر خوف کو ﷺ ....

فَبَلَغَ ذٰلِکَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَ اَثْنٰی عَلَیْهِ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ

بعض لوگوں نے اس عمل کے اختیار کرنے سے احتراز کیا' یہ بات آپ تک پہنچ گئی اسی وقت آپ نے خدا کی حمد وثناء (خطبہ) کے بعد فرمایا لوگوں کا بھی

☜..... خشیت نہیں کہتے عالم اگر ڈرتا ہے تو وہ خدا کی ذات کی عظمت وجلال کا تصور کر کے ڈرتا ہے' غیر عالم کو ان امور کا اتنا علم نہیں ہوتا اس لیے وہ ڈرتا ہے تو صرف اس کے عذاب کا تصور کر کے ڈرتا ہے- اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی وقت کے سب سے زیادہ عالم ہونے کا مطلب یہی ہے کہ خدائے ذات وصفات کا سب سے زیادہ علم اس کو ہوتا ہے اور اس لیے سب میں زیادہ خدا سے ڈرنے والا بھی وہی ہوتا ہے- جس مقصد کے لیے نبی کو بھیجا جاتا ہے وہ مخلوق کی ہدایت ہے اسی لیے تمام علوم ہدایت اس کو مرحمت کیے جاتے ہیں- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس سب سے زیادہ کامل تر ہے اس لیے آپ کو یہ علوم بھی سب میں کامل تر ملے ہیں- اس کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کو اور بھی بہت سے امور کا علم مرحمت ہوتا ہے جو مقصد دعوت وتبلیغ میں ان کے لیے کارآمد ہوں- اسی طرح بعض علوم وہ ہوتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کو قصداً نہیں سکھائے جاتے اور اس لیے نہیں سکھلائے جاتے کہ وہ شایان شان نبوت نہیں ہوتے ارشاد ہوتا ہے ﴿وَ مَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَ مَا یَنْۢبَغِیْ لَهٗ﴾ (یٰس: ۶۹) ہم نے شعر گوئی آپ کو نہیں سکھائی اور یہ آپ کی شایان شان بھی نہیں تھی- گویا نبوت اور شاعری دو متضاد صفتیں ہیں اسی لیے شعر گوئی تو درکنار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شعر خوانی بھی ثابت نہیں ہوتی ایک آدھا شعر پڑھنا منقول ہے اس میں بھی علماء کو بحثیں ہیں- بہر حال کچھ علوم ایسے بھی ہیں جو بتصریح قرآن کریم شان نبوت کے مناسب نہیں سمجھے گئے- معلوم ہوا کہ اصولاً یہ سمجھنا ہی غلط ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو تمام علوم حاصل ہوتے ہیں- اساسی طور پر ان کو وہی علوم سکھائے جاتے ہیں جن کی تبلیغ کے لیے ان کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باوجود اتنے راز و نیاز کے ان علوم کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا جس کا دریا حضرت خضر علیہ السلام کے سامنے بہہ رہا تھا- اتنا ہی نہیں بلکہ ظرف موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں ان علوم کے تحمل کی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی تھی وہ ہر موقعہ پر تلمذانہ صبر دکھانا چاہتے تھے مگر بے تاب ہو کر معترضانہ تنقید کر گذرتے تھے آخر چند یوم کی صحبت بھی نہ نبھا سکے اور اس پر تیار ہو گئے کہ جس کے سامنے کچھ دن استفادہ کے لیے آئے تھے ہمیشہ کے لیے اس کو نداء الفراق سنا دیں- یہی وہ بات تھی جس کو حضرت خضر علیہ السلام نے پہلے دن کہہ دیا تھا- ﴿اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا﴾ (الکھف: ۷۸) اے موسیٰ علیہ السلام تم میرے علوم کا تحمل نہیں رکھتے اس لیے میرے ساتھ رہ بھی نہیں سکتے- وہی ہوا اور حضرت خضر علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بار بار بے صبری دیکھ کر آخر یہ کہہ دینا پڑا هٰذا فراق بینی و بینک. جائیے اب بہت ہو لیا میرا اور آپ کا ساتھ ختم ہوتا ہے اور لیجئے اب ان علوم کی تشریح بھی سنتے جائیے- صحیح بخاری میں ہے کہ عجائبات موسیٰ وخضر علیہما السلام کا تذکرہ کر کے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کاش اگر موسیٰ علیہ السلام کچھ اور صبر سے کام لے لیتے تو ہمیں کچھ اور عجائبات کا حال بھی کھل جاتا-

خلاصہ یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ جو علوم انبیاء علیہم السلام کے دائرہ سے متعلق ہیں وہ صرف علوم ہدایت ہیں- سالم کشتی کے تختہ توڑ دینے' اچھے خاصے کھیلتے ہوئے بچہ کے قتل کر ڈالنے اور ایک ترچھی دیوار کو سیدھا کر کے نااہلوں پر احسان رکھنے کے رموز وحکم ان کے علوم میں داخل نہیں وہ یہ گوارا ہی نہیں کر سکتے کہ کسی محسن کی کشتی کا تختہ اپنے ہاتھوں سے اکھاڑ پھینکیں خواہ اس کا انجام کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو' نہ وہ کسی بچہ کے قتل کی اجازت دے سکتے ہیں- خواہ اس کے والدین کے لیے اس کی حیوٰۃ کتنی ہی مضر کیوں نہ ہو اور نہ وہ آئینی طور پر نااہلوں پر ایسے احسان کی ترغیب دے سکتے ہیں جوان کی جہالت و بے حسی میں اور اضافہ کا موجب بن جائے بس ان کے علم کے متعلق نفی واثبات کی جو بحث ہوگی وہ ان کی نوعیت علم ہی کے دائرہ تک رہے گی- ایک سائنس داں شخص کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سب کچھ پڑھ چکا ہے یہ مطلب نہیں رکھتا کہ اس کو طباعت وکتابت کے علوم بھی حاصل ہیں ایک عالم کی علمی منقبت کا مطلب یہ کبھی نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ زراعت یا تجارت کے علوم بھی جانتا ہے- پس جس طرح ہر اہل فن کو اپنے ہی فن کا علم ☜....

يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْءِ اَصْنَعُهُ فَوَ اللّٰهِ اِنِّيْ لَاَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَ اَشَدُّهُمْ لَهٗ خَشْيَةً.

(رواہ البخاری فی الاعتصام)

کیا حال ہے بھلا اس عمل سے احتراز کرتے ہیں جسے میں کرتا ہوں خدا کی قسم ان سب میں زیادہ خدا کا علم رکھنے والا اور سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا تو میں ہوں۔ (بخاری)

(۱۸۲) عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَ هُمْ يُأَبِّرُوْنَ النَّخْلَ فَقَالَ مَا تَصْنَعُوْنَ قَالُوْا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ لَعَلَّكُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْرًا فَتَرَكُوْهُ فَنَقَصَتْ قَالَ فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهٗ فَقَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيٍ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ.

(رواہ مسلم)

(۱۸۲) رافع بن خدیج ؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو اس وقت لوگوں کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنے کھجوروں کے درختوں کی ''تأبیر'' کیا کرتے تھے' آپ نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا (پھلوں میں زیادتی کے لیے) ہم یہ کام پہلے سے کرتے آئے ہیں' آپ نے فرمایا اگر اب نہ کرو تو شاید بہتر ہو یہ سن کر لوگوں نے تابیر کرنا چھوڑ دیا' پھل کم آنے لگا اس پر لوگوں نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا' آپؐ نے فرمایا دیکھو میں بشر ہوں جب تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کسی بات کا حکم دوں اسے تو فوراً بلا پس و پیش اختیار کرلو اور جب (دنیا کے معاملات میں) کوئی بات اپنی رائے سے کہوں تو میں صرف ایک بشر ہوں۔ (مسلم)

(۱۸۳) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى قَوْمٍ يُلَقِّحُوْنَ فَقَالَ لَوْ لَمْ

(۱۸۳) انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم کی طرف گذرے جو کھجوروں کے درختوں میں ''عمل تلقیح'' کیا کرتی تھی

☜ .... حاصل ہوتا ہے اور اس میں بھی اس کی مہارت کا معیار یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس فن کے ہر معمولی اور غیر معمولی معلومات کا علم رکھتا ہے بلکہ صرف اس کا اجمالی استحضار اس میں ایک ملکۂ رسوخ کا پیدا ہو جانا اس کے غیر معمولی عالم کہلانے کے لیے کافی ہو جاتا ہے بلکہ اس کے ادنیٰ مسائل کا ذہول اس کے لیے عیب شمار نہیں ہوتا اسی طرح خدا کے برگزیدہ نبیوں کا فن ہدایت کا فن ہے وہ جب دنیا میں آتے ہیں تو کبھی اپنے فن کے سوا دوسرے فن میں دخل انداز نہیں ہوتے نہ اس کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ اگر دنیا کو مجبور کرتے ہیں تو اس علم پر عمل کے لیے مجبور کرتے ہیں جو ان کے منصب نبوت سے متعلق ہیں اس کے سوا دوسرے قسم کے علوم کا نہ انہیں دعویٰ ہوتا ہے نہ اس کے فصول و ابواب پر وہ بحث کرتے ہیں اور نہ اس فن کے ماہرین سے الجھنا پسند کرتے ہیں اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں غصہ صرف رخصت پر عمل نہ کرنے پر نہیں ہے بلکہ ان کے اس احتراز اور تنزہ پر ہے جو ایک غلط بنیاد پر ان کے دماغوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ نبی کے مغفور ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اب خدا کی عبادت کا محتاج نہیں رہا بلکہ اس کی عبادت اور بڑھ جاتی ہے اور اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ وہ اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہتا ہے۔ اور ادا کر نہیں سکتا۔ افلا اکون عبد اشکورا کا یہی مطلب ہے۔

(۱۸۳) ٭ عرب میں تأبیر اور تلقیح کا قدیم سے رواج تھا۔ اس عمل کی صورت یہ تھی کہ وہ مذکر نخل کا خوشہ لے کر مؤنث کے ساتھ ملا دیتے تھے اس کے بعد جب پھل آتا تو بہت کثرت سے آتا۔ پہلی حدیث میں آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ خدا کی ذات وصفات کا تم سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں۔ یہاں یہ ارشاد ہے کہ دنیا کے دھندوں کو سب سے زیادہ جاننے والے تم ہو۔ یہ علوم نبوت نہیں ہیں۔ ہر اہل فن کو اپنے فن کا علم حاصل ہونا کمال سمجھا جاتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کے علوم یہ نہیں ہیں کہ دیسی آموں کو قلمی کیسے بنایا جاتا ہے کس زمین میں کیسا کھاد دیا جاتا ہے' کس فصل میں کیا بویا جاتا ہے' ان علوم کو دنیا ان کے آنے سے پہلے بھی جانتی ہے اور ان کے بعد بھی ان میں ہزاروں ترقیاں ☜ ....

تَفعَلُوا لَصَلُحَ قَالَ فَخَرَجَ شِيصًا فَمَرَّ بِهِم فَقَالَ مَا لِنَخلِكُم قَالُوا قُلتَ كَذَا وَ كَذَا قَالَ اَنتُم اَعلَمُ بِاَمرِ دُنيَاكُم.

(رواہ مسلم فی کتاب الفضائل فی باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا)

آپ نے ان سے فرمایا اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو اچھا ہو' راوی کہتا ہے کہ (اس سال) درختوں پر ردی پھل آئے- پھر اس طرف جب آپؐ گذرے تو پوچھا تمہارے درختوں کو کیا ہو گیا' انہوں نے عرض کیا آپؐ نے اس اس طرح ارشاد فرمایا تھا (حسب الامر ہم نے تلقیح نہیں کی) اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اپنی دنیوی زندگی کو تم خود بہتر جانتے ہو- (مسلم)

؂..... کرتی رہتی ہے- آج ہماری دنیا کے علوم جہاں تک پہنچ چکے ہیں ان کا ہر شخص کو تو تصور کرنا بھی مشکل ہے- جنگ کے متعلق محیر العقول ایجادات' زراعت میں بے موسم پیداوار' بجلی اور بھاپ کے انوکھے سے انوکھے کارنامے آنکھوں کے سامنے ہیں- کیا ان علوم میں سے کسی کی طرف صاحب نبوۃ نے تعرض فرمایا ہے- یہاں تمہاری عقول کو آزادی دی گئی ہے- اجتہاد اور جد و جہد کے جتنے مدارج ہیں طے کیے جائیں اور اپنی دنیا کو جتنا مزین کر سکتے ہیں کیے جائیں- ان علوم میں شریعت کوئی دست اندازی نہیں کرتی جب تک کہ آپ اس سے ٹکرائیں نہیں- ہاں جن علوم کے لیے انبیاء علیہم السلام آتے ہیں وہ علوم ہدایت ہیں اور وہ اب اتنے مکمل ہو چکے ہیں کہ ایک نقطہ لگانے کی اس میں گنجائش نہیں رہی' یہ وہ علوم ہیں جن کو دنیا نہ انبیاء علیہم السلام کی آمد سے پہلے جانتی ہے نہ ان کے بعد اس میں ایک شوشہ کا اضافہ کر سکتی ہے وہی ان کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہی ان کا کمال سمجھے جاتے ہیں- ان کے سوا اور علوم کا نہ انہیں دعویٰ ہوتا ہے نہ ان میں دخل اندازی وہ پسند کرتے ہیں- یہاں کسی کو یہ دھوکا نہ لگے کہ ہم نے دنیا کو دین سے علیحدہ کر دیا ہے اور اپنی دنیا کو ہدایاتِ شریعت سے گویا بے نیاز سمجھ لیا ہے- حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا بڑا شعبہ ہمارے دین کا جزء ہے مگر وہ دنیا شریعت میں دین کے نام سے پکاری جاتی ہے- اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام بھی شریک ہوتے ہیں بلکہ اس کے مؤسس اور معلم وہی ہوتے ہیں- دنیا کا دوسرا شعبہ وہ ہے جو دین سے متعلق نہیں' وہ انبیاء علیہم السلام کی دنیا نہیں تمہاری دنیا ہے اسے تم خود جانتے ہو مثلاً زراعت کرنا انسانی زندگی کے لیے کس حد تک مفید ہے اس کے اصول کلیہ کیا ہیں' کب' کس سے' کن شرائط سے کرنا مناسب ہے- تجارت میں ایجاب و قبول' نفع کے حدود' بائع و مشتری کے اختیارات' اختلاف کی صورتوں میں فیصلہ کی راہ جنگ و صلح کے نقض و ابرام کے شرائط وغیرہ وغیرہ یہ سب انبیاء علیہم السلام کی دنیا ہے جسے وہ خود سکھاتے بتاتے ہیں' اس کے اصول و فروع' ابواب و فصول خود قائم کرتے ہیں- اس دنیا کو دین کہا جاتا ہے لیکن ان اصول و کلیات کے بعد زراعت کی یہ تفصیلات کہ اس کے لیے کس کس سامان کے فراہم کرنے کی ضرورت ہے کس کس قسم کے مصنوعات درکار ہیں یہ تمہاری دنیا ہے اسے تم خود جانتے بوجھتے ہو- اسی کی طرف حدیث مذکور میں لفظ "دنیاکم" سے اشارہ فرمایا گیا ہے جس کا حاصل ہے کہ دنیا کا ایک شعبہ خود دین کا جزء ہے- اس کی ہدایات بھی اس کے ذمہ ہیں- اس کا دوسرا شعبہ دین کا جزء نہیں اس کو تمہارے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ تمہاری دنیا ہے تم اس میں خود مختار رہو- ان حدود کو جدا جدا پہچاننے کے لیے ان تفصیلات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے جو شرعی دنیا کے متعلق موجود ہیں ان کو پیش نظر رکھے بغیر صرف چند سطور لکھ کر کوئی ایسا واضح خط قائم نہیں کیا جا سکتا جو دنیا کے ان دونوں شعبوں میں پورا پورا امتیاز پیدا کر دے-

شیخ عبدالعزیزؒ دباغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت مشاہدہ کے سلسلہ میں ضمناً اس حدیث پر بھی گذر گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو کائنات عالم کے ہر ہر ذرہ میں قدرت کی کارفرمائی کا ایسا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے کہ پھر مسببات کا اپنے اسباب کے ساتھ ارتباط صرف برائے بیت نظر آنے لگتا ہے یہ یقین و مشاہدہ ان پر ہمہ وقت مستولی رہتا ہے- اس لیے وہ عالم کی ہر حرکت و سکون کا حقیقی کارساز حق تعالیٰ ہی کو دیکھتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ دیکھتے ہیں جیسا کہ ہم اسباب کو- ایک مومن کو بھی انبیاء علیہم السلام کے طفیل ؂.....

(۱۸۴) عَنْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَائِشٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاَيْتُ رَبِّيْ فِيْ اَحْسَنِ صُوْرَةٍ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى قُلْتُ اَنْتَ اَعْلَمُ قَالَ فَوَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ كَتِفَيَّ فَوَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ تَلَا وَ كَذٰلِكَ نُرِيْ اِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (الانعام:۷۵) رواه الدارمي مرسلا و للترمذي نحوه عنه و عن

(۱۸۴) عبدالرحمٰن بن عائش سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے پروردگار کو ایک بڑے حسین وجمیل انداز میں دیکھا۔ اس نے ارشاد فرمایا (بتائیے) ملائکہ مقربین کس مسئلہ میں گرما گرمی سے گفتگو کر رہے ہیں میں نے عرض کیا آپؐ ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کے بعد پروردگارِ عالم نے اپنا دست قدرت میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دیا اس کی خنکی میں نے اپنے دونوں چھاتیوں کے درمیان محسوس کی اور آسمانوں اور زمین میں جو بات (چیت ہو رہی) تھی وہ سب جان گیا اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی کہ اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی سلطنت دکھلائی تا کہ وہ یقین رکھنے والوں میں ہو جائے۔ ترمذی نے

..... میں اس نوع کا مشاہدہ نصیب ہو جاتا ہے مگر نہ وہ اتنا قوی ہوتا ہے اور نہ دائم آخر بہت جلد اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے پھر اُسے اپنی طبعی کشش کے مطابق اسباب ہی کی کارفرمائی نظر آنے لگتی ہے۔ جس پر پہلا مشاہدہ غالب ہوتا ہے وہ بے شک اسباب کی ضعیف کڑیوں کو کوئی اہمیت نہیں دے گا قدرت بھی اس کے مشاہدہ و یقین کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گی۔ لیکن جس پر یہ مشاہدہ غالب نہیں وہ اسباب ہی کو دیکھ رہا ہے وہ اپنے مشاہدہ کا پابند ہوتا ہے۔ قدرت بھی اس کے مشاہدہ کے مطابق اس سے معاملہ کرتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے مقام میں تھے اس لیے آپؐ نے جو فرمایا درست فرمایا تھا لیکن صحابہ کرام پر چونکہ اس مشاہدہ کا غلبہ نہ تھا اس لیے انہیں اس درجہ کا جزم و یقین بھی حاصل نہ تھا قدرت نے بھی ان کے ساتھ ان کے اندازۂ یقین کے مطابق معاملہ کیا اور آخر درختوں پر پھل کم آیا' اگر وہ یقین کے اسی درجہ پر آ جاتے تو تأبیر کیے بغیر بھی پھل کم نہ ہوتا آپؐ نے یہ محسوس کر کے کہ اس مشاہدہ پر دوام ان کے لیے مشکل ہے۔ جاذب طبعی انہیں اسباب کی طرف ہی مائل کرتا رہے گا انہیں معذور سمجھا اور فرمایا کہ اچھا تو پھر تم اپنی دنیا کو بہتر جانتے ہو۔[1] (ابریز ص ۱۱۸)

(۱۸۴) ✽ محققین کے نزدیک تجلیاتِ الٰہیہ کی رؤیت کو اللہ تعالیٰ کی رؤیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر ایک آگ ہی کی صورت دیکھی تھی لیکن جو آواز اس آگ سے آئی وہ "انا ربک" کی آواز تھی۔ اسی طرح خواب میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت درحقیقت تجلیاتِ الٰہیہ کی رؤیت ہوتی ہے۔ اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ایسے معاملہ کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ پیش آ چکا تھا۔ آسمان و زمین کے عجائبات کا مشاہدہ خلیل اللہ کو بھی کرایا گیا تھا۔ اسی قسم کا ایک مشاہدہ یہاں حبیب اللہ کو بھی کرایا گیا ہے لیکن اس تمام مشاہدہ میں سوال و جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل مقصد ان علوم کا ہی افاضہ کرنا تھا جن کے لیے انبیاء مبعوث ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب آپؐ سے سوال کیا گیا تو جامیٹری اور الجبرے کے کسی فارمولہ کا سوال نہ تھا اور نہ عالم تکوینیات کے کسی باریک مسئلہ کا سوال تھا بلکہ اسی دائرہ کا سوال تھا۔ جو انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہیں۔ رب العزت نے جب ان علوم کا .....

[1] یہ شرح اپنی جگہ گو ایک حقیقت ہے مگر اس حدیث کے جو الفاظ صحیح مسلم میں مختلف راویوں نے بیان کئے ہیں افسوس ہے کہ اس پر وہ پورے طور پر منطبق نہیں ہوتے۔ علماء اور عرفاء ان الفاظ پر غور کرلیں۔ و الله تعالى اعلم بحقيقة الحال.

ابن عباس و معاذ بن جبل و زاد فیه قال یا مُحَمَّدُ هَلْ تَدْرِیْ فِیْمَ یَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلٰی قُلْتُ نَعَمْ فِی الْکَفَّارَاتِ وَ الْکَفَّارَاتُ الْمَکْثُ فِی الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلوٰاتِ وَ الْمَشْیُ عَلَی الْاَقْدَامِ اِلَی الْجَمَاعَاتِ وَ اِبْلَاغُ الْوُضُوْءِ فِی الْمَکَارِہِ فَمَنْ فَعَلَ

حضرت ابن عباس و معاذ بن جبل سے اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ہاتھ رکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر ارشاد فرمایا اے محمدؐ اب بتایئے کہ ملائکہ مقربین کیا گفتگو کر رہے ہیں' میں نے عرض کیا جی ہاں ان اعمال کے متعلق کر رہے ہیں جن سے گناہ بخشے جاتے ہیں وہ اعمال یہ ہیں نمازوں کے بعد دوسری نمازوں کے انتظار میں مسجدوں میں رہنا- پیادہ پا چل کر نماز باجماعت کے لیے جانا تکلیفیں اٹھا کر وضو پورا پورا کرنا (جیسا جاڑوں میں) جس نے یہ عمل کیے اس کی زندگی بھی

؎..... افاضہ چاہا تو اس کے لیے عالم رؤیا میں شفقت و کرم کی ایک نرالی صورت اختیار کی اور اس کے بعد جب پھر سوال ہوا تو وہی پہلا سوال تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں متکلم و مخاطب دونوں کے درمیان جن علوم کا افادہ و استفادہ ہو رہا تھا وہ وہی علوم تھے جو منصب نبوت سے متعلق ہیں- جب بحث صرف الفاظ کے عموم و خصوص پر ختم کر دی جائے اور متکلم و مخاطب کا ماحول دماغ سے نکال دیا جائے تو کبھی صحیح مراد حاصل نہیں ہو سکتی قرآن کریم میں بلقیس کے قصہ میں موجود ہے و اُوْتِیَتْ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ -اسے ہر چیز میں سے ایک حصہ ملا تھا- سیاق و سباق کی رعایت کرنے والے کے نزدیک تو بات صاف ہے وہ جانتا ہے کہ یہاں بلقیس کی صرف عظمت مملکت کا بیان کرنا منظور ہے اور اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو خدم و حشم' ساز و سامان' کسی بادشاہ کو درکار ہوتے ہیں وہ سب اس کو بھی حاصل تھے لیکن اگر صرف الفاظ کے عموم کو دیکھ کر یہ بحث شروع کر دو کہ جب اس کو ہر چیز دی گئی تھی تو ڈاڑھی بھی ضرور دی گئی ہوگی تو یقیناً نتیجہ غلط ہوگا- تورات کے متعلق ارشاد ہے تبیانا لکل شیء اس میں ہر چیز کا بیان ہے- اب اگر یہاں صرف اس عموم پر ہی فیصلہ کرو تو پھر قرآن کی ضرورت کیا رہتی ہے- حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ-

قال قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما ما ترک شیئا یکون فی مقامہ ذلک الی قیام الساعۃ الاحدث بہ حفظہ من حفظہ ونسیہ من نسیہ قد علمہ اصحابی ہو لاء و انہ لیکون منہ الشیء قد نسیتہ فاراہ فاذ کرہ کما یذکر الرجل وجہ الرجل اذا غاب منہ ثم اذا راہ عرفہ. (متفق علیہ)

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ وعظ فرمایا اور قیامت تک جو حوادث شدنی تھے ان میں کوئی واقعہ نہیں چھوڑا جو بیان نہ کر دیا ہو جس نے یاد رکھا یاد رکھا' اور جو بھول گیا بھول گیا' یہ بات میرے یہ سب رفقاء بھی جانتے ہیں- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ مجھے یاد نہیں آتا- جب پیش آجاتا ہے اور میں اسے دیکھتا ہوں تو اس طرح یاد آجاتا ہے جیسے کوئی شخص کسی کو غائبانہ یاد کرے اور یاد نہ آئے' جب دیکھے تو یاد آجائے اور پہچان لے-'' (متفق علیہ)

اس حدیث کو اگر دنیا کے فتنوں پر محمول کیا جائے تو اس کا مضمون بالکل صاف ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس وعظ میں آپ نے قبل از قیامت جو خاص خاص فتنے پیش آنے والے تھے سب بیان فرما دیئے تھے' لیکن اگر نبی اور صحابہؓ کے مخصوص ماحول کو چھوڑ کر لفظی عموم پر اتر آؤ اور 'ماترک شیئا'' کا مفہوم یہ لے لو کہ ہر چھوٹے بڑے واقعات خواہ وہ دنیا کے کسی معاملہ سے متعلق ہوں آپ نے سب بیان کر دیئے تھے- تو پھر یہی حدیث عقل و نقل دونوں کے خلاف ہو جائے گی کیونکہ ایک وعظ میں دنیا بھر کے صرف ایک گھنٹہ بلکہ ایک منٹ کے واقعات بھی تمام نہیں سما سکتے - قیامت تک کے واقعات تو کجا اس قسم کی موشگافیاں اگر ہمارے روزمرہ کے محاورات میں پیدا کر دی جائیں تو یقیناً بات کرنا دوبھر جائے بلکہ نظام عالم درہم برہم ہو جائے- سوچئے اگر ایک ایسے شخص سے جو ایگریکلچر میں پی-ایچ-ڈی کی ڈگری ؎.....

ذَالِکَ عَاشَ بِخَیْرٍ وَ مَاتَ بِخَیْرٍ وَ کَانَ مِنْ خَطِیْئَتِہٖ کَیَوْمٍ وَ لَدَتْہُ اُمُّہٗ وَ قَالَ یَا مُحَمَّدُ اِذَا صَلَّیْتَ فَقُلِ اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَ تَرْکَ الْمُنْکَرَاتِ وَ حُبَّ الْمَسَاکِیْنَ فَاِذَا اَرَدْتَّ بِعِبَادِکَ فِتْنَۃً فَاقْبِضْنِیْ اِلَیْکَ غَیْرَ مَفْتُوْنٍ قَالَ وَ الدَّرَجَاتُ اِفْشَاءُ السَّلَامِ وَ اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَ الصَّلٰوۃُ بِاللَّیْلِ وَ النَّاسُ نِیَامٌ.

مطمئن اور موت بھی مطمئن حال میں ہوگی اور اس کی خطائیں ایسی رہ جائیں گی جیسے ماں سے پیدائش کے دن تھیں (یعنی کچھ نہ رہیں گی) اور نیز یہ فرمایا کہ اے محمد نماز کے بعد یہ کلمات بھی پڑھ لیا کیجئے ۔ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ اے اللہ میں تجھ سے یہ مانگتا ہوں کہ بھلائیاں کروں، برائیاں چھوڑ دوں، مسکینوں سے محبت رکھوں اور جب تو اپنے بندوں کی آزمائش کا ارادہ کرے تو میری آزمائش کیے بغیر مجھے اٹھا لینا اور فرمایا کہ جن اعمال سے درجات بلند ہوتے ہیں وہ یہ ہیں، ہر کس و ناکس کو سلام کرنا، اللہ کی راہ میں کھانا کھلانا اور شب میں اس وقت نماز ادا کرنا جب کہ لوگ پڑے سو رہے ہوں۔

(۱۸۵) اَخْبَرَنِیْ اَنَسُ بْنُ مَالِکٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ حِیْنَ زَاغَتِ الشَّمْسُ فَصَلّٰی لَھُمْ صَلٰوۃَ الظُّھْرِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ

(۱۸۵) انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ آفتاب ڈھلنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو ظہر کی نماز پڑھائی جب سلام پھیر چکے تو منبر پر

☜ ....حاصل کر چکا ہے آپ یہ دریافت کریں کہ کیا وہ تمام کتابیں پڑھ چکا ہے تو یقیناً اس کا جواب اثبات ہی میں ہوگا اب اگر آپ اس پر یہ اعتراض کریں کہ جب تو نے فلسفہ، علم الارض اور علم الاخلاق وغیرہ وغیرہ کی کتابیں نہیں پڑھیں تو پھر تیرا ''تمام'' کا لفظ کہنا جھوٹ ہے اس کا حاصل یہی ہوگا کہ اس پر آپ بات چیت کا دروازہ ہی بند کر دیں۔ اس حدیث میں بھی نبی اور خدا کے مابین تعلیم و تعلم کے ایک محفل کا ذکر ہے اس کے سیاق و سباق سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس مجلس کا خلاصہ ان علوم کا افاضہ تھا جو آسمانوں میں ایک اونچی سوسائٹی کے درمیان زیر بحث تھے۔ اللہ تعالیٰ نے از راہ کرم و تکریم ان علوم کو براہ راست آپ کو سکھا دیا آپ نے یہ کرم فرمایا کہ ان کو صیغہ راز میں نہیں رکھا بلکہ اپنی امت کو بھی پہنچا دیا اور اس طرح ''نبی رحمت'' کی وجہ سے آپ کی امت نے بھی ان علوم کو حاصل کر لیا۔ جس سے عام فرشتے بھی ناآشنا تھے۔ ہمیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اس حدیث میں جتنے امور بتائے گئے تھے بس وہ اتنے ہی تھے۔ نہ اس حسابی ماپ تول کا ہمیں حق ہے ممکن ہے کہ اور بھی بہت سے امور کا انکشاف ہوا ہو، لیکن جن علوم سے منصب نبوت کی عظمت ظاہر ہوتی ہے ان کا جو حصہ ہم تک پہنچا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے اس سے زیادہ کی ہم نفی نہیں کرتے۔ کسی دلیل صریح کے بغیر اس کے اثبات پر تم اصرار مت کرو۔ درحقیقت یہ ایک بڑی گستاخی اور جہالت کی بات ہے کہ ایک حقیر مخلوق خدا اور اس کے رسول کے علوم کا احتساب شروع کر دے۔ ہمیں ہرگز اس کا حق نہیں کہ ہم خدائے تعالیٰ کے تمام علوم اٹھا کر نبی کے دامن میں ڈال دیں اور نہ اس کا کہ اپنی جانب سے کوئی ایسی صاف تقسیم کر دیں جس کے بعد خدا اور اس کے رسول کے علوم میں پورا پورا امتیاز ہو جائے، یہ سب مباحث تفریق بین المسلمین کی بنیاد ہیں۔ ہمارے ایمان کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی ہے اس میں سے وہ جس رسول کو جتنا چاہے دے دیتا ہے اس غیب الغیب میں سے جتنے علوم اس نے ہمارے رسول کو بخشے اتنا حصہ اپنے رسولوں میں کسی کو نہیں بخشا۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ اس سے زیادہ بحث عبث اور لغو ہے۔

(۱۸۵) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر متعلق سوالات کرنے کی ممانعت فرمائی تھی اس پر بھی بعض طبائع سوال سے باز نہ آئیں تو ایک مرتبہ آپ کو اس قدر ناگواری پیش آئی کہ منبر پر کھڑے ہو کر آپ نے یہ اعلان فرما دیا کہ اچھا اب جسے جو پوچھنا ہے پوچھ ہی ☜ .....

عَلَى الْمِنبرِ فَذَكَرَ السَّاعَةَ وَ ذَكَرَ اَنَّ قَبْلَهَا اُمُوْرًا عِظَامًا ثُمَّ قَالَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يَسْأَلَنِىْ عَنْ شَيْءٍ فَلْيَسْأَلْنِىْ عَنْهُ فَوَاللّٰهِ لَا تَسْأَلُوْنَنِىْ عَنْ شَيْءٍ اِلَّا اَخْبَرْتُكُمْ بِهٖ مَادُمْتُ فِىْ مَقَامِىْ هٰذَا قَالَ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ فَاَكْثَرَ النَّاسُ الْبُكَاءَ حِيْنَ سَمِعُوْا ذٰلِكَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَكْثَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّقُوْلَ سَلُوْنِىْ فَقَامَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ فَقَالَ مَنْ اَبِىْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَبُوْكَ حُذَافَةُ فَلَمَّا اَكْثَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّقُوْلَ سَلُوْنِىْ بَرَكَ عُمَرُ فَقَالَ رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا قَالَ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ قَالَ عُمَرُ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ الَّذِىْ

کھڑے ہوئے اور قیامت کا ذکر فرمایا اس ضمن میں یہ بھی ذکر کیا کہ قیامت سے پہلے بڑے بڑے واقعات رونما ہوں گے- اس کے بعد فرمایا جو شخص چاہے وہ مجھ سے جو چاہے پوچھ لے خدا کی قسم جب تک میں اس جگہ کھڑا ہوا ہوں تم مجھ سے جو دریافت کرو گے میں تم کو بتا دوں گا- حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں لوگ یہ سن کر بہت روئے ادھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار فرماتے تھے کہ پوچھو پوچھو آخر عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے والد کون ہیں (ان کے نسب میں لوگ تہمت لگاتے تھے) فرمایا تیرے والد حذافہ ہیں' جب اس کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ اور پوچھو اور پوچھو تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا ہم خدا کو رب اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان کر راضی ہیں- راوی کہتا ہے کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس معذرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے- پھر فرمایا خبردار اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے ابھی ابھی

..... لے- اس ناگواری کا عام لوگوں نے احساس نہ کیا بالآخر حضرت عمرؓ نے بڑھتے ہوئے آثار ناگواری دیکھ کر معذرت کی کہ ہم میں سے خام طبائع کے یہ سوالات اپنی نااہلیت کی بناء پر ہیں ورنہ نہ تو آپ کی رسالت کی آزمائش منظور ہے' نہ دین اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش ہے- نہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہم نے کسی دوسرے کو اپنا رب بنانے کا ارادہ کیا ہے یہ سن کر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ فرو ہو گیا تو آپ نے اپنا ایک بلند مشاہدہ بیان فرمایا جو جنت و جہنم سے متعلق تھا- یہاں جو کچھ آپ نے دیکھا ان ہی آنکھوں سے دیکھا تھا البتہ جنت و نار عالم مثال میں نظر آئیں- یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نبی کی نظر عالم اجسام اور عالم مثال کو یکساں دیکھتی ہے-

امام بخاریؒ نے اس واقعہ کو کتاب العلم میں بھی ذکر کیا ہے مگر کتاب الاعتصام میں ایک ایسی قید مذکور ہے جو اور جگہ مذکور نہیں اور وہ مادمت فی مقامی هذا ہے- یعنی جب تک میں اس جگہ ہوں- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ہر سوال کے جواب کے لیے تیار ہو جانا صرف ایک وقتی کیفیت تھی جیسا کہ سامنے دیوار پر اس وقت جنت اور نار کا تمثل- اس کی علت یہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو رسالت کے ذیل میں قیامت تک کے انسان اور ان کے باپ دادوں کے نام بھی بتا دیئے جاتے ہیں- اگر یہ علوم رسالت ہوتے تو ان کے دریافت کرنے سے آپ کو غصہ ہی کیوں آتا- لیکن ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جب رسول کو زیادہ تنگ کیا جاتا ہے تو کبھی قدرت اس کا تکفل فرما لیتی ہے کہ جو ان سے پوچھا جائے گا اس کا جواب وہ اسی وقت انہیں القا کر دے گی جیسا کہ سیر معراج کے واقعہ میں جب آپ کا بیت مقدس کا سفر مشرکین مکہ کو بعید نظر آیا تو انہوں نے امتحاناً آپ سے مسجد اقصیٰ کے متعلق سوالات شروع کیے حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت آپ کو اتنی بے چینی ہوئی کہ کبھی نہ ہوئی تھی- ظاہر ہے کہ ایک دیکھنے والا ہمہ وقت اتنے غور سے تو دیکھتا نہیں کہ ہر چیز کے سب خط و خال محفوظ کر لے- اب اگر .....

نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَقَدْ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْجَنَّةُ وَ النَّارُ اٰنِفًافِيْ عُرْضِ هٰذَا الْحَائِطِ فَلَمْ اَرَكَا لْيَوْمِ فِي الْخَيْرِ وَ الشَّرِّ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ اَخْبَرَنِيْ عُبَيْدُ اللّٰهِ ابْنُ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ قَالَ قَالَتْ اُمُّ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ حُذَافَةَ بِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حُذَافَةَ مَا سَمِعْتُ بِابْنٍ قَطُّ اَعَقَّ مِنْكَ اٰ اَمِنْتَ اَنْ تَكُوْنَ اُمُّكَ قَدْ قَارَفَتْ بَعْضَ مَا تُقَارِفُ نِسَاءُ اَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ فَتَفْضَحَهَا عَلٰى اَعْيُنِ النَّاسِ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ وَ اللّٰهِ لَوْ اَلْحَقَنِيْ بِعَبْدٍ اَسْوَدَ لَلَحِقْتُهٗ. (رواہ مسلم فی باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم و البخاری فی کتاب الاعتصام)

دیوار کی طرف جنت اور دوزخ مثالی طور پر میرے سامنے پیش کی گئی تھیں میں نے برائی اور بھلائی کا ایسا منظر جیسا آج دیکھا تھا کبھی نہیں دیکھا - ابن شہاب اپنی اسناد سے بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ نے عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا کہ تجھ جیسی نالائق اولاد میں نے نہیں دیکھی تیرے پاس اس کی کیا ضمانت تھی کہ تیری ماں نے زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح کوئی ناشایاں حرکت نہیں کی اگر کہیں ایسا ہوا ہوتا تو آج بھری محفل میں تو نے اپنی ماں کو رسوا کر دیا ہوتا - عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا خدا کی قسم اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کسی حبشی غلام کی بھی اولاد قرار دیتے تو میں اپنے آپ کو اسی کی اولاد سمجھ لیتا - (مسلم و بخاری)

الانبياء اشد الناس بلاء

مخلوق میں سب سے شدید آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے

(۱۸۶) عَنْ سَعْدٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ النَّاسِ اَشَدُّ بَلَاءً قَالَ الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ يُبْتَلَى الرَّجُلُ حَسْبَ دِيْنِهٖ فَاِنْ كَانَ فِيْ دِيْنِهٖ صُلْبًا اشْتَدَّ بَلَاءُهٗ وَ

(۱۸۶) سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش کس کی ہوتی ہے - فرمایا انبیاء کی - اس کے بعد درجہ بدرجہ جو افضل ہو (قاعدہ یہ ہے) کہ آدمی کی آزمائش اس کی دین داری کے اندازہ کے مطابق ہوتی ہے اگر وہ

؎ ....آپؐ ان کے سوالات کے جوابات نہیں دیتے تو منکرین کو مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے اور اگر جواب دیتے ہیں تو اس ارادہ سے آپؐ نے بیت مقدس کو دیکھنا نہ تھا کہ قریش مکہ کو اس کا امتحان بھی دینا ہے - یہ بے چینی آپؐ کے مربی حقیقی نے محسوس کی آپؐ فرماتے ہیں کہ بیت مقدس میرے سامنے کر دیا گیا وہ مجھ سے سوال کرتے جاتے میں بڑی سہولت سے دیکھ دیکھ کر اس کا جواب دیتا جاتا بہر حال اس قسم کی جزئیات بھی رسول کی زندگی میں ملتی ہیں مگر اس کو منصب رسالت و نبوت کا نہ جزء سمجھا جاتا ہے نہ کمال بلکہ حق تعالیٰ کی اس وقت مشیت پر موقوف ہے اگر چاہے تو نااہلوں کی تسلی کے لیے خرق عادت کے طور پر اس قسم کا نقشہ بھی دکھلا دے - یہی حال تمام معجزات کا ہے وہ بھی نبی کی طاقت سے باہر ہوتے ہیں اس کی طاقت سے ظاہر نہیں ہوتے نہ اصولی طور پر معجزات کی ان کو کلی طاقت دی جاتی ہے بلکہ وقت و مصلحت کے لحاظ سے اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو اپنی غیر متناہی طاقت کا ان کے ہاتھوں پر اظہار کر دیتا ہے اور جب نہیں چاہتا نہیں کرتا - اسی لیے کفار کے اعجوبہ نمائیوں کی فرمائشوں کی بھرمار کے جواب میں آپؐ سے یہ کہہ دیا گیا تھا ﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل:۹۳) آپ کہہ دیجئے میرا رب پاک ہے میں تو صرف بشر اور رسول ہوں - اعجوبہ نمائیاں میرا کام نہیں - یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو فتح کے ساتھ شکست بھی کھانی پڑتی ہے - بلکہ عام انسانوں کی طرح بہت سی آزمائشوں میں سے بھی گذرنا پڑتا ہے بلکہ آزمائش کے جو مراحل انہیں طے کرنا پڑتے ہیں وہ کسی اور کو طے کرنا نہیں پڑتے بلکہ ان کی بزرگیوں اور فضیلتوں کا معیار ہی ابتلاء و محن کا یہی لق و دق خارستان ہوتا ہے - یہ آزمائشوں کی پرخار وادیوں میں سے نکل کر اپنی بشریت کا ثبوت دیا کرتے ہیں دنیا اپنی نظریات کے مطابق اسے مختلف رنگ دیا کرتی ہے - من در چہ خیالم و فلک در چہ خیال -

اِنْ کَانَ فِیْ دِیْنِہٖ رِقَّۃٌ ھُوِّنَ عَلَیْہِ فَمَا زَالَ کَذَالِکَ حَتّٰی یَمْشِیْ مَا لَہٗ ذَنْبٌ. (رواہ الترمذی و ابن ماجۃ و الدارمی و قال الترمذی ھذا حدیث حسن صحیح)

اپنے دین میں سخت ہوتا ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر نرم ہوتا ہے تو اس کی آزمائش بھی ہلکی ہوتی ہے آزمائشوں کا یہی دور رہتا ہے حتیٰ کہ اس طرح چلتا پھرتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔

(ترمذی)

(۱۸۷) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَ ھُوَ یُوْعَکُ فَمَسِسْتُہٗ بِیَدِیْ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّکَ لَتُوْعَکُ وَ عْکًا شَدِیْدًافَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَجَلْ اِنِّیْ اُوْعَکُ کَمَا یُوْعَکُ رَجُلَانِ مِنْکُمْ قَالَ فَقُلْتُ ذَالِکَ لِاَنَّ لَکَ اَجْرَیْنِ فَقَالَ اَجَلْ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یُصِیْبُہٗ اَذًی مِنْ مَرَضٍ فَمَا سِوَاہُ اِلَّا حَطَّ اللّٰہُ تَعَالٰی بِہٖ سَیِّئَاتِہٖ کَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَۃُ وَ رَقَھَا. (متفق علیہ)

(۱۸۷) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار چڑھ رہا تھا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کو ہاتھ لگایا (تو بخار بہت تیز تھا) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو تو بخار بہت تیز ہے فرمایا ہاں مجھے اتنا بخار ہے جتنا تم میں دو شخصوں کو ہوتا ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ اس لیے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجر بھی تو دوگنہ ملتا ہے۔ فرمایا ہاں اس کے بعد فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو مرض وغیرہ کی کوئی تکلیف لاحق ہو مگر اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی برائیاں اس طرح ساقط کر دیتا ہے جیسا درخت اپنے پتے۔

(متفق علیہ)

(۱۸۸) عَنْ عَائِشَۃَؓ قَالَتْ مَا رَأَیْتُ اَحَدًا اَلْوَجْعُ عَلَیْہِ اَشَدُّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ. (متفق علیہ)

(۱۸۸) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے بیماری کی تکلیف اتنی سخت کسی پر نہیں دیکھی جتنی آنحضرت ﷺ پر دیکھی تھی۔ (متفق علیہ)

(۱۸۹) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ عُظْمَ الْجَزَاءِ مَعَ عُظْمِ

(۱۸۹) انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثواب کی زیادتی کا مدار آزمائش کی سختی پر ہے جتنی سخت آزمائش اسی قدر

---

(۱۸۹) * ان روایات سے معلوم ہوا کہ ابتلاء اور آزمائش نقص و عیب کی دلیل نہیں بلکہ کمال کی دلیل ہے کوتاہ فہم سمجھتے ہیں کہ مقربین وہ ہیں جو ہر قید سے آزاد ہو جائیں گویا محکومیت سے نکل کر دائرہ حاکمیت میں قدم رکھ دیں۔ سیرت انبیاء علیہم السلام یہ بتاتی ہے کہ یہاں جو سب سے بزرگ ہے وہی سب سے زیادہ پابند ہے۔ جس کے متعلق سب سے زیادہ حاکمیت کا گمان ہے وہی سب سے زیادہ محکومیت و عبدیت کا اقرار کر رہا ہے۔ جس طرح سونے کی حقیقت بھٹی میں کھلتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے صبر و استقامت کے کمالات ابتلاء کی چکی میں پس کر نظر آتے ہیں۔ سونے کا کمال یہ نہیں کہ اس کو کسوٹی پر کسا نہ جائے اگر کسا نہ جائے تو اس کا کمال ظاہر کیسے ہو' کمال یہ ہے کہ جتنا کسا جائے اتنا ہی کھرا ثابت ہوتا جائے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا کمال یہ نہیں کہ انہیں شکست نہ ہو' سردی نہ لگے' گرمی نہ ستائے' فاقہ نہ پہنچے' بیمار نہ پڑیں' خلق خدا کی ایذائیں نہ اٹھائیں۔ کمال یہ ہے کہ جب شکست کھائیں تو ایسے ہی راضی نظر آئیں جیسے کہ فتح کے حال میں نظر آتے تھے جب سردی و گرمی' فاقہ و بیماری کی تکلیفیں جھیلیں تو ماتھے پر شکن نہ پڑے' سب کی ایذائیں اٹھائیں اور کسی کو ایذا نہ دیں۔ ان کی بشریت کا ....

الْبَلاءِ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلاهُمْ فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضٰى وَ مَنْ سَخِطَ فَلَهُ السَّخَطُ. (رواہ الترمذی و ابن ماجه)

زیادہ ثواب- اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈال دیتا ہے- پھر جو راضی رہا اس سے خدا بھی راضی رہتا ہے اور جو ناراض ہوا اس سے خدا بھی ناراض ہو جاتا ہے- (ترمذی و ابن ماجہ)

اسماء النبی صلی الله علیه وسلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارکہ

(۱۹۰) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ لِيْ اَسْمَاءً اَنَا مُحَمَّدٌ وَ اَنَا اَحْمَدُ وَ اَنَا الْمَاحِيْ

(۱۹۰) جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میرے چند نام ہیں' میں محمدؐ ہوں' احمدؐ ہوں' اور ماحیؐ ہوں جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کفر کو محو کرے گا-

---

﷽ .... کی ایک ایک خصلت سخت سے سخت آزمائش میں ڈالی جائے اور وہ ہر آزمائش میں کبریت احمر کی طرح کھری ثابت ہوتی رہے-

﴿وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ﴾ (البقرة: ۱۲٤)

''ابراہیم کے پروردگار نے کئی باتوں میں اس کا امتحان لیا وہ ان سب میں پورا اور پکا نکلا-''

اگر یہ آزمائشیں نہ ہوتیں تو مدعی غیر عاشق اور عاشق غیر مدعی میں فرق کہاں سے نظر آتا- قرآن کریم میں غزوات کی ایک حکمت یہ بھی بتلائی ہے کہ مؤمن خالص اور منافق خالص کا امتیاز نہیں ہوسکتا- جب تک کہ ان کو آب شمشیر پر پرکھا نہ جائے- روزمرہ کی محفلوں میں تو دونوں یکساں نظر آتے ہیں- مسجدوں میں شرکت میں بھی کچھ برابر سرابری ہوتی رہتی ہے- مگر جہاں ایمان و نفاق نکھرتا ہے وہ احد کا میدان ہے- دشمن یوں خوش ہیں کہ مسلمان شکست کھا گئے مسلمان اس پر نازاں ہیں کہ چلو ایک موقعہ تو ایسا ملا جہاں ہماری عاشقی کی لاج رہ گئی ؎

کوتاہ دیدگان ہمہ راحت طلب کنند   عاشق بلا کہ راحت او در بلا ءِ تست

یہ تو خدامانِ انبیاء علیہم السلام کے جذبات ہیں انبیاء علیہم السلام کے صبر و رضا کا حال وہی جانیں-

(۱۹۰) ٭ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر نام آپؐ کی کسی نہ کسی صفت کی جلوہ گاہ ہے صرف ایک علم نہیں جس کا مقصد کسی ذات کا تعارف ہوتا ہے اور بس- یہی وجہ ہے کہ آپ کے اسماء بہت ہیں- عرب میں اسماء کنیتوں اور القاب کے تعدد کا کچھ دستور بھی تھا اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو پہلے گذر چکے ہیں- انبیاء علیہم السلام کی ذات اور ان کے افعال و اقوال خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری' عمداً ہوں یا بھول کر سب حقائق و اسرار کا ایک مجموعہ ہوتے ہیں- اسی طرح ان کے اسماء بھی صرف تعیین شخصیت کے لیے نہیں بلکہ وہ بھی اپنی جگہ ایک گنجینہ معارف ہوتے ہیں- دراصل یہ اسماء ان تمام اوصاف و مبادی کے ترجمان ہوتے ہیں- جو دست قدرت نے ازل سے ان میں ودیعت رکھے ہیں اگر ان کو رحیم کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ وہ درحقیقت پیکر رحمت ہوتے ہیں اگر ان کو ماحی کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ وہ حقیقۃً آثار کفر کو مضمحل و کمزور بنا کر فنا کے قریب کر دیتے ہیں- اگر کسی کو عاقب کہا جاتا ہے تو اس لیے کہ وہ درحقیقت آخر میں آنے والا ہوتا ہے- غرض جتنی پر از حقیقت و اسرار ان کی ذات ہوتی ہے اسی قدر حقیقت سے لبریز ان کے اسماء ہوتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارکہ کو آپ صرف ناموں کا ایک ڈھیر نہ سمجھیں اور نہ ایسا بے حقیقت تصور کریں جیسا کہ ہر ماں صرف محبت میں اپنے بیٹے کا خوب صورت سے خوب صورت نام رکھ لیتی ہے خواہ اس نام کا اس میں کوئی اثر نہ ہو- وہ سیاہ فام بچے کو چاند کہہ کر پکارتی ہے اور غبی سے غبی لڑکے کا نام ذکی تجویز کر دیتی ہے مگر یہ سب کچھ بے حقیقت ہوتا ہے- کہیں علم کی اصل وضع اگر تعریف ﷽ ....

اَلَّذِیْ یَمْحُو اللّٰہُ بِیَ الْکُفْرَ وَ اَنَا الْحَاشِرُ الَّذِیْ یُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰی قَدَمَیَّ وَ اَنَا الْعَاقِبُ وَ الْعَاقِبُ الَّذِیْ لَیْسَ بَعْدَہٗ نَبِیٌّ. (متفق علیہ)

اور حاشر ہوں وہ حاشر جس کے بعد ہی قیامت میں اور لوگوں کا حشر ہوگا اور عاقبؐ ہوں ۔ عاقب اسے کہتے ہیں جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔ (متفق علیہ)

(۱۹۱) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلَا تَعْجَبُوْنَ کَیْفَ یَصْرِفُ اللّٰہُ عَنِّیْ شَتْمَ قُرَیْشٍ وَ لَعْنَھُمْ یَشْتِمُوْنَ مُذَمَّمًا وَ یَلْعَنُوْنَ مُذَمَّمًا وَ اَنَا مُحَمَّدٌ. (بخاری)

(۱۹۱) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے کیا یہ عجیب اور پر لطف بات بھی دیکھی؟ اللہ تعالیٰ کس خوبی سے قریش کی لعنت ملامت میرے نام پر پڑنے نہیں دیتا وہ مذمم کو برا بھلا کہتے ہیں، مذمم پر لعنتیں برساتے ہیں اور میں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔ (بخاری)

☜ .... شخصیت کے لیے نہ ہوتی تو کذب اور جھوٹ بھی ہو جاتا آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء کو اس نظر سے نہ دیکھیں بلکہ ان کو کمالات محمدؐ کی رنگین چلمنیں سمجھیں، جن میں چھن چھن کر آپؐ کے کمالات نظر آتے رہتے ہیں۔

(۱۹۱) * کفار جلن کے مارے آپؐ کا اسم مبارک بھی زبان پر نہ لا سکتے تھے۔ قدرت نے آپ کا اسم مبارک بھی ایسا خوب صورت رکھا تھا کہ اس کا زبان پر لانا آپؐ کی بے شمار تعریفوں کے قائم مقام ہو جاتا تھا اس لیے محمدؐ کے بجائے وہ آپؐ کو مذمم کہا کرتے (یعنی مذمت کیا گیا) اور جب اپنے دل کے پھپولے پھوڑنا چاہتے تو ''مذمم'' نام لے کر برا بھلا کہتے اس میں خدا کی یہ عجیب حکمت تھی کہ اگر کفار آپؐ کا اصل نام لیتے تو صد ہا تعریفوں سے بڑھ کر ہوتا اور اگر مذمم کہتے تو وہ یوں خوش ہوتے کہ وہ آپؐ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور قدرت یوں ہنستی کہ ان کی تمام بیہودہ گوئیوں کی بوچھار بجائے آپؐ کے ایک فرضی شخص پر جا پڑتی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہم آپؐ کے ان دو ناموں کی قدرے مزید تشریح کر دیں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

احمد و محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بے نظیر تھی، آپؐ کے یہ اسماء بھی بے مثل ہی تھے۔ آپؐ سے پہلے کسی کے ذہن میں ان اسماء کا خطور بھی نہ ہوا تھا حتیٰ کہ جب آپ کی ولادت کا زمانہ نزدیک آ گیا؟ کاہنوں، منجموں اور اہل کتاب نے نام لے لے کر آپؐ کی آمد کی بشارتیں دیں تو لوگوں نے اس نبی منتظر کی طمع میں اپنی اولاد کا نام محمد و احمد رکھنا شروع کر دیا۔ جہاں تک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے جن کے نام محمد و احمد رکھے گئے تھے ان کی کل تعداد چھ تک ہے۔ ساتواں کوئی شخص ثابت نہیں ہوتا۔ سہیلی صرف تین ہی بتلاتے ہیں۔ (۱) محمد بن سفیان بن مجاشع۔ (۲) محمد بن احیحہ بن الحلاج۔ (۳) محمد بن عمران بن ربیعہ۔ سہیلی سے پہلے ابوعبداللہ بن خالویہ کا خیال بھی یہی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ آٹھویں صدی میں جب پھر اس کے درپے ہوئے تو انہوں نے ان کی تعداد بیس تک پہنچا دی اور تکرار و اوہام حذف کرنے کے بعد منقح تعداد پندرہ قرار دی۔ جس میں سب سے زیادہ مشہور محمد بن عدی بن ربیعہ ہیں۔ ان کا واقعہ بغوی، ابن سعد، ابن شاہین اور ابن السکن وغیرہم نے اس طرح بیان کیا ہے:

''کہ خلیفہ بن عبداللہ نے محمد بن عدی سے پوچھا۔ تمہارے والد نے تمہارا نام زمانہ جاہلیت میں محمد کیسے رکھ دیا انہوں نے جواب دیا اس کے متعلق جیسا تم نے مجھ سے پوچھا ہے ایسا ہی میں نے اپنے والد سے پوچھا تھا انہوں نے فرمایا تھا کہ میں قبیلہ بنی تمیم کے

تین اور شخصوں کے ہمراہ ابن حنفیہ غسانی کی ملاقات کے لیے ایک مرتبہ شام کی طرف روانہ ہوا - ہم ایک ایسے چشمہ پر جا کر اترے جو گرجا کے قریب تھا - گرجا کا منتظم ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا ایک نبی مبعوث ہونے والے ہیں تم دوڑ کر ان کو قبول کر لینا' ہم نے کہا ان کا نام اس نے کہا ان کا نام محمدؐ - جب اس سفر سے ہم واپس ہوئے تو اتفاقاً ہم سب کے یہاں لڑکے' پیدا ہوئے اور اس لیے ہم سب نے اپنے اپنے لڑکوں کا نام محمد رکھ دیا -''

اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے اور اشخاص کے نام بھی بہ تفصیل تحریر کیے ہیں دیکھو فتح الباری باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم - حافظ سہیلیؒ فرماتے ہیں کہ توراۃ میں آپؐ کا جو اسم مبارک مذکور ہے وہ احمد ہے - حافظ ابن قیم اس رائے سے متفق نہیں وہ اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ توراۃ میں آپ کی آمد کی پیش گوئی اسم محمد کے ساتھ بھی صاف موجود ہے - اس کے بعد حافظ ابن قیم اسم ''محمد'' کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محمد وہ ہے جس میں بکثرت تعریف کے اوصاف پائے جائیں - محمود بھی اسم مفعول کا صیغہ ہے مگر جو مبالغہ باب تفعیل میں ہوتا ہے وہ ثلاثی مجرد میں نہیں ہوتا اس لیے محمد' محمود سے زیادہ بلیغ ہے - محمد اس کو کہتے ہیں جس کی اتنی تعریف کی جائے جتنی کسی اور بشر کی نہ کی جائے اسی لیے توراۃ میں آپ کا نام محمد ہی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ آپؐ کے اوصاف حمیدہ' آپؐ کی امت اور آپؐ کے دین کے فضائل و کمالات کا اتنی کثرت سے اس میں ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم رسول کو بھی آپؐ کی امت میں ہونے کی آرزو ہونے لگی -

احمد ☆ یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے' اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں مستعمل ہوسکتا ہے - پہلی صورت میں اس کے معنی ہیں ''احمد الحامدین لربه'' یعنی تمام تعریف کرنے والوں میں اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا - دوسری صورت میں اس کے معنی ہیں ''احق الناس و اولاهم بان یحمد'' تمام لوگوں میں سب سے زیادہ تعریف کے قابل اور ثناء کا مستحق - اس بنا پر محمد و احمد میں فرق یہ رہے گا کہ محمد وہ ہے جس کی تعریف اپنے اوصافِ جمیلہ کی وجہ سے سب سے زیادہ کی جائے اور احمد وہ ہے جس کی تعریف سب سے بہتر اور عمدہ کی جائے پس محمد بلحاظِ کمیت ہے اور احمد بلحاظِ کیفیت - دونوں ناموں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؐ اپنے خلق و خصائل کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ سب سے زیادہ اور سب سے کامل تعریف آپؐ کی ہو - اس تحقیق کے بعد ان دونوں مفہوموں کے لحاظ سے سطح عالم پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اسماء جتنی حقیقت اور جتنی صداقت کے ساتھ آپؐ کی ذات مبارک پر چسپاں ہیں اتنے کسی اور پر نہیں - اگر یہاں اسم تفضیل کو اسم مفعول کے معنی میں لیجیے تو خالق سے مخلوق تک انبیاء علیہم السلام سے لے کر جن و ملک تک' حیوانات سے لے کر جمادات تک غرض ہر ذی روح اور غیر ذی روح سب ہی نے آپؐ کی تعریفیں کی ہیں اور آج بھی چالیس کروڑ انسانوں کی زبانیں دن میں نہ معلوم کتنی بار آپؐ کی تعریف کے لیے متحرک رہتی ہیں - حتیٰ کہ کفار میں بھی ایک معقول طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ آپ کا دین تسلیم نہیں کرتا مگر آپ کی دیانت و امانت' عدل و انصاف' صداقت و راست بازی' ہوش و خرد کا ثناء خواں ہے اس لیے اگر اپنے خیال میں آپ ذرا علیحدہ ہو کر ازل سے ابد تک کی دنیا کی طرف کان لگائیں تو جس کی سب سے زیادہ اور سب سے بہتر تعریف آپ کے کان سنیں گے وہ مبارک ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہوگی ؎

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد کہ مرغ ہر چمنے گفت گوئی او دارد

اس لیے محمدؐ یا احمد (بمعنی اسم مفعول) نام کی مستحق جتنی کہ آپؐ کی ذات ہوسکتی ہے اتنی کسی اور کی نہیں ہوسکتی اور اگر احمد کو اسم فاعل کے معنی میں لیجیے تو بھی اس اسم مبارک کی سب سے زیادہ مستحق آپؐ ہی کی ذات پاک ہے کیونکہ جس قدر خدا کی تعریف آپؐ نے کی ہے اتنی کسی بشر نے نہیں کی اور اسی طرح اپنی امت کو بھی موقع بموقعہ خدا کی اتنی حمد سکھائی کہ کتب مقدسہ میں اس امت کا لقب ہی حمادون پڑ گیا - یعنی خدا کی بہت تعریف کرنے والی امت - صحیحین میں ہے کہ محشر میں جب شفاعت کے لیے آپؐ تشریف لے جائیں گے تو آپ پر خدا کی حمد و ثناء کا دروازہ کھولا جائے گا جو اس سے پیشتر کسی پر نہیں کھولا گیا تھا - پس سب انبیاء تو حماد ہیں اور ان حمادون میں آپ احمد ہیں - قاضی عیاضؒ فرماتے

ہیں کہ پہلے آپ احمد تھے پھر محمد ہوئے کیونکہ سب سے پہلے آپ ؐ نے خدا کی تعریف کی پھر آپ ؐ کے بعد مخلوق نے آپ ؐ کی تعریف کی- اسی طرح محشر میں سب سے پہلے آپ ہی خدا کی حمد کریں گے- جب آپ کی سفارش سے حساب شروع ہو جائے گا تو پھر اہل محشر آپ کی حمد کریں گے اس لیے آپ پہلے احمد ہیں اور بعد میں محمد- بلحاظِ وجود بھی پہلے آپ احمد ہیں اور بعد میں محمد- اسی وجہ سے کتب سابقہ میں آپ ؐ کی بشارت اسم احمد سے مذکور ہے اور جب عالم وجود میں تشریف لے آئے تو محمد کے نام سے پکارے گئے- (دیکھو فتح الباری) [1]

خلاصہ یہ کہ احمد بمعنی محمد ہو یا بمعنی احمد الحامدین یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حمد کو ہر پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے اسی بنا پر سورۂ الحمد خاص کر آپ کو ہی مرحمت ہوئی- آپ ؐ کی ہی امت کا لقب حمادون ہوا اور محشر میں لواء الحمد (حمد کا جھنڈا) بھی آپ ؐ کے ہی ہاتھوں میں ہوگا اور آپ ؐ ہی کے مخصوص مقام کا نام مقام محمود ہے- آپ ؐ کی شریعت میں بھی کھانے کے بعد پینے کے بعد' سفر سے واپسی کے بعد غرض بہت سے مختلف مواضع پر خدا کی حمد سکھائی گئی- پھر یہ مختلف اور متنوع تعریفیں جب ہر زمانہ میں بے شمار انسانوں کی زبانوں سے ہوتی ہیں وہ درحقیقت آپ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہیں- اس لیے ان تمام تعریفوں کو بجا طور پر آپ ؐ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے- اس کے بعد اب سوچو کہ جتنی خدا کی تعریف فضاء عالم میں آپ کے ذریعہ سے گونجی کیا کبھی کسی اور کے ذریعہ سے گونجی ہے- اور اسی کے ساتھ جتنی کثرت کے ساتھ خدا کی غیر متناہی مخلوق نے آپ کی تعریفیں کیں اتنی کسی اور شخصیت کی کی ہیں- پس ہر اعتبار سے حمد کی جتنی خصوصیت آپ کی ذات کے ساتھ ثابت ہوتی ہے- اتنی کسی اور ذات کے ساتھ نہیں ہوتی اس لیے احمد ومحمد نام پانے کے لیے بھی آپ ہی کی ذات منتخب ہونی چاہیے- اسی لیے آپ ؐ سے پہلے بھی جس نے یہ نام رکھا' آپ کی اتباع میں رکھا اور بعد میں بھی جس نے اس نام کو اختیار کیا آپ ہی کے اتباع میں کیا- اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَ بَارِکْ عَلَیْہِ.

شیخ اکبرؒ یہاں ایک اور عجیب نکتہ لکھ گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حمد ہمیشہ آخر میں ہوتی ہے- جب ہم کھا پی کر فارغ ہو لیتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں- جب سفر ختم کر کے گھر واپس آتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں- اسی طرح جب دنیا کا طویل وعریض سفر ختم کر کے جنت میں داخل ہوں گے تو خدا کی حمد کریں گے- وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ. (دیکھو روض انف ج ا ص ۱۰۶)

اس دستور کے مطابق مناسب ہے کہ جب سلسلہ رسالت ختم ہو تو یہاں بھی آخر میں خدا کی حمد ہو- اس لیے جو نبی سب سے آخر میں آئے ان کا نام محمد رکھا گیا- بے شک جو ذات پاک کے حسن وخوبی کی تمام رعنائیوں اور زیبائشوں کا مجموعہ ہو اس کے اسماء بھی اسائی حسن وخوبی کا مجموعہ ہونے چاہئیں-

---

[1] حافظ سہیلی ؒ لکھتے ہیں کہ محمد کے وزن میں ہمیشہ تکرار کے معنی ملحوظ رہتے ہیں اس لیے محمد اس کو کہا جائے گا جس کی بار بار تعریف کی جائے اور احمد وہ ہے جو سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں اسماء واقع کے مطابق ہیں یعنی آپ ؐ احمد بھی ہیں اور محمد بھی لیکن پہلے آپ ؐ احمد ہیں پھر محمد ہیں بلکہ احمد ہونے کی وجہ سے ہی آپ ؐ محمد ہوئے آپ ؐ نے پہلے خدا کی تعریف کی اس لیے آپ ؐ احمد ہوئے نبوت سے سرفرازی کے بعد پھر مخلوق نے آپ ؐ کی تعریف کی اس لیے بعد میں محمد ہو گئے محشر میں بھی پہلے آپ خدا کی تعریف کریں گے اس لیے احمد پہلے ہوں گے- پھر شفاعت کے بعد مخلوق آپ ؐ کی تعریف کرے گی- اس لیے بعد میں محمد ہوں گے- غرض ازل سے ابد تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ شانِ احمدی' شانِ محمدی پر مقدم ہے- یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب آپ کے نام کی بشارت سنائی تو اسم احمد ہی کے ساتھ سنائی- حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب امت محمدیہ کے کمالات کا ذکر آیا تو انہوں نے بھی یہی فرمایا اللھم اجعلنی من امۃ احمد. اے اللہ تو مجھے امت احمدؐ میں بنا دے- (اس بیان سے اس کا نکتہ بھی نکل آیا کہ جب آپ کا اسم مبارک محمد تھا تو پھر کتب سابقہ میں آپ کی بشارت میں اسم احمد کیوں ذکر کیا گیا)

یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ حافظ ابن قیمؒ کو حافظ سہیلیؒ کے بیان سے سخت اختلاف ہے وہ اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ تورات میں آپ ؐ کا اسم مبارک محمد بھی موجود ہے- (دیکھو زاد المعاد) شروع بیان میں یہ بحث کی گئی ہے کہ آپ سے پیشتر عرب میں یہ اسماء معہود نہ تھے اب ان تمام تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حکمتِ الٰہیہ نے ان دونوں ناموں کو آپ ؐ ہی کی ذات کے ساتھ کیوں مخصوص کر دیا تھا-

اسلام میں رسول کا تصور

اسلام میں خدا کے تصور کی طرح رسول کا تصور بھی تمام مذاہب سے جداگانہ اور بالاتر تصور ہے۔ یہاں انسانِ کامل کی آخری سرحد اور لاہوت وجبروت کے ابتدائی تصور میں کوئی نقطہ مشترک نہیں نکلتا۔ ایک انسان اپنی فطری اور وہبی استعداد کا ہر کمال بالفعل حاصل کر لینے کے بعد بھی الوہیت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ تصور کے قابل بھی نہیں ہوسکتا اسلام میں اللہ تعالیٰ کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ حلول واتحاد، ولادت و قرابت اور اس طرح کی تمام نسبتوں میں سے کسی نسبت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی معنی سے اس کو احد وصمد کہا جاتا ہے ۔

دور بینان بارگاہ الست　　بیش ازیں پے نہ بردہ اند کہ ہست

رسول واوتار وبروز ٭ اس لیے اسلام میں رسول نہ خدا کا اوتار ہوسکتا ہے کہ خدائی اس میں حلول کر سکے اور نہ خود خدا ہوسکتا ہے کہ ہیکل انسانی میں جلوہ نما ہو رسول کے متعلق خدائی کا تصور عیسائیت کا راستہ ہے اور خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں بروز کرتا ہے براہمہ کا عقیدہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ یہ دونوں تصور اسلام میں بے مصداق، ناممکن اور محال ہیں۔ عام حیوانات کو دیکھئے قدرت نے ان میں بھی ہر ہر نوع کی جدا جدا خصوصیات اور صورتیں بنائی ہیں اور اس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسرے نوع کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی بلکہ ہر نوع اپنے ان ہی قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حد بندی سے اس عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَ لَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ. (یٰس: ۴۰) نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے ہر چیز چکر میں پڑی گردش کھا رہی ہے۔

جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنے دائرہ سے ترقی کر کے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے۔ سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لیے فلسفہ ارتقاء (Evolution) تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی مخلوقات کے کسی کڑی کا عالم قدس سے کوئی اتصال ثابت نہیں ہوتا اس لیے رسول کا تصور اسلام میں بلا کسی ادنیٰ شائبہ تنقیص کے یہ ہے کہ وہ ایک انسان کامل ہوتا ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتب قرب کے باوجود الوہیت کے تصور سے یکسر خالی ہوتا ہے۔

انسانیت رسول کا ایک کمال ہے ٭ رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی برتری سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے۔ اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اور اس لیے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لیے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے۔ جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دل سوزی کرنا بھی نہیں جانتا۔ اور جو فطرت انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قرآن کریم نے جا بجا بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ الخ﴾ (آل عمران: ۱۶۴) یہاں امتنان واحسان کے موقع میں منجملہ اور باتوں کے تین امور کو بالخصوص نمایاں کیا گیا ہے۔ بعثتِ رسول پھر اس انعام کے لیے سرزمین عرب کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر اس رسول کا انسان ہونا۔ حضرت خلیلؑ نے جب بنی اسماعیل میں ایک نبی کے لیے دعا فرمائی تو انہوں نے بھی اس اہم نقطہ کو فراموش نہیں کیا اور اپنی دعا میں فرمایا:

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ. (البقرۃ: ۱۲۹)　　اے ہمارے رب ان میں رسول بھیج جو انہیں میں سے ہو۔

پھر جب اس دعاء مستجاب کے ظہور کا وقت آیا تو دعاء خلیل میں لفظ "منھم" کی استجابت کو مزید تاکید کے ساتھ لفظ من انفسھم سے ذکر کیا گیا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی اس رسول کو انسانوں میں تو بھیجا ہی تھا مگر ان میں بھی جس سے انہیں قریب سے قریب تر علاقہ ہو سکتا تھا ان میں بھیجا ہے انسانوں میں عرب' عربوں میں قریشی اور قریش میں ہاشمی بنایا مگر ان چند در چند خصوصیات کے باوجود پھر وہ ایک انسان ہی رہا - یہی وہ عقیدہ تھا جو ابتداء میں اولاد آدم کو بنیادی طور پر بتا دیا گیا تھا -

يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيَاتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (الاعراف:۳۵)

اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس تم ہی میں کے رسول آئیں جو تمہارے سامنے ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سنائیں تو جو تقویٰ کی راہ اختیار کرے اور نیک رہے تو ان پر نہ کوئی خوف و ہراس ہے اور نہ کوئی غم -

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتداء میں جن باتوں کی اولاد آدمؑ کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک بعثت رسول' دوم رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا - اسی عقیدہ کے مطابق دنیا میں خدا کے بہت سے رسول آئے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے مگر قرآن سے جس قدر اجمالاً معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصب نبوت کے لیے دو انسان منتخب ہوئے تھے پھر افراد و اشخاص کی بجائے خاندانوں کا انتخاب کیا گیا اس کے بعد جب خاندانوں نے انحراف اور کفرانِ نعمت شروع کیا تو بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا - اس درمیان میں دنیا کی مقرر عمر آخر ہونے لگی ادھر رسولوں کی مقرر تعداد بھی پوری ہوگئی اس لئے آخری رسول کو بھیج کر اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور بساطِ عالم لپیٹنے کا اعلان کر دیا گیا -

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرَاهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ. (آل عمران:۳۳،۳۴)

اللہ تعالیٰ نے پسند کیا آدمؑ کو اور نوحؑ کو اور خاندانِ ابراہیمؑ اور خاندانِ عمران کو تمام جہان پر جو ایک دوسرے کی اولاد ہیں -

اس تمام سلسلہ میں جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے کوئی رسول ایسا نہ تھا جو انسان نہ ہوتا ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ نصاریٰ کی نظروں میں کچھ مشتبہ تھا اس کو ذرية بعضها من بعض کہہ کر صاف کر دیا گیا ہے یعنی جب وہ بھی انسانوں ہی کی اولاد تھے تو یقیناً ان کو بھی انسان ہونا چاہیے -

علاوہ اس کے کہ رسول اگر انسان نہ ہوں تو وہ انسانوں کی پوری اصلاح نہیں کر سکتے - نسل انسانی پر یہ ایک بدنما داغ ہوتا کہ اشرف المخلوقات کا مصلح و مربی کسی اور نوع میں پیدا کیا جائے - اس لیے خود رسول اور نوع انسانی کا شرف و کمال یہی تھا کہ رسول انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا -

لفظِ رسول کی تشریح ❋ رسول کا صحیح مقام سمجھنے کے لیے خود لفظ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی اور لفظ نہیں ہے اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لیے فطرت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان خط فاصل ہو سکتی ہیں - اسی لیے خدائے تعالیٰ کے سب رسولوں نے اپنا تعارف اسی لفظ رسول کے ذریعہ پیش کیا ہے اور آخر میں قرآن کریم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف بھی جس لفظ میں پیش کیا وہ یہی لفظ رسول ہے -

(۱) مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ. (الفتح:۲۹) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغمبر ہیں -

(۲) وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ. (آل عمران:۱۴۴) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ تک نہیں رکھتے -

معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پرعظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لیے بھی اس سے زیادہ موزوں کوئی اور کلمہ نہیں ہے- صوفیاء نے بڑے بڑے مجاہدات کے بعد یہاں کچھ خوشنما کلمات استعمال کیے ہیں- وجود کا نقطۂ اول حقیقة الحقائق برزخیۃ الکبریٰ- مگر انصاف یہ ہے کہ ان سب کلمات کے تکرار سے کچھ غلط فہمیاں تو پیدا ہوگئیں لیکن آپ کا صحیح مقام پھر اتنا دریافت نہ ہوسکا جتنا کہ لفظ رسول سے- اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور ومعروف تھا- اس کے لوازم سب کے ذہن نشین تھے' اس کے فرائض وخدمات سب کو معلوم تھے' اس کی شخصیت واحترام سے سب آشنا تھے اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش وکرم کے سوا برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا- اس لیے جب کوئی رسول دنیا میں آتا تو یہی کہہ دیتا کہ میں احکم الحاکمین' ملک الملوک کا ایسا ہی ایک رسول ہوں جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں کے رسول ہوا کرتے ہیں- بس اسی ایک لفظ سے سامعین کے دلوں میں وہ ساری عظمتیں دوڑنے لگتیں' محبت وتوقیر' اطاعت وحکم برداری کے وہ تمام جذبات امنڈنے لگتے جو ایسے رسول کے لیے امنڈنا چاہئیں- اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی نظروں کے سامنے آجاتیں جو ایک بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان فاصل رہنی چاہئیں- اس لیے محبت واطاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جوہر توحید بھی کفر وشرک کی گرد سے کبھی بے آب نہ ہوتا-

رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے ✻ درحقیقت یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی نازک توحید خدا ہی کی اطاعت اور اسی کی محبت کا مطالبہ کرتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے سوا رسول کی محبت واطاعت کا بھی حکم دیتی ہے- قرآن کریم نے بتایا کہ نسبتِ رسالت کے بعد رسول کی ہستی درمیان میں صرف ایک واسطہ ہوتی ہے- پھر اس کی اطاعت ومحبت خدا ہی کی محبت واطاعت ہوجاتی ہے- اسی لیے فرمایا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ. (النساء:۸۰) جو رسول کا کہنا مانے اس نے خدا ہی کا کہنا مانا-

یعنی اصل حکم برداری تو خدا کی چاہیے- ظاہری سطح میں رسول کی اطاعت گو اس کے خلاف نظر آئے مگر حقیقت میں وہ خدا ہی کی حکم برداری ہوتی ہے بلکہ اس کی اطاعت ومحبت کے بغیر' خدا کی محبت واطاعت کا کوئی اور راستہ ہی نہیں اور اس طرح یہ اطاعت ومحبت کتنی ہی پھیلتی چلی جائے مگر اس کا اصل مرکز خدا ہی کی ذات پاک رہتی ہے-

رسول و وکیل ✻ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوگیا کہ رسول خدا نہیں' اس کا اوتار و بروز نہیں اور اس کا بیٹا بھی نہیں- اب یہ سنئے کہ وہ اس کا وکیل ومختار بھی نہیں- عربی میں دوسرے کی خدمت سرانجام دینے کے لیے دو لفظ ہیں (۱) رسول (۲) وکیل- ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لیے ہوتا ہے اپنے لیے نہیں ہوتا مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع اور زیادہ قوی ہے- وکیل اپنے مؤکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کرسکتا ہے اسی لیے خصومت وجواب دہی کا بھی اس کو حق حاصل ہوتا ہے- رسول صرف اس امانت کے پہنچادینے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے-

مثلاً اگر ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنا وکیل ومختار بنا دے تو اس کو حق ہے کہ وہ موقعہ ومحل کے لحاظ سے جو مناسب سمجھے گفتگو کرلے بلکہ چاہے تو اس کے قوانین میں ترمیم وتنسیخ بھی کرڈالے مگر ایک پیغامبر کو اس کے سوا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو پیغام اس کے ذریعہ بھیجا گیا ہے وہ بے کم وکاست اس کو پہنچادے اس لحاظ سے وکیل کی حیثیت گو بلند ہے مگر بلحاظ ذمہ داری سخت بھی بہت ہے- قرآن کریم نے بہت جگہ اس کا اعلان کیا ہے کہ جنہیں ہم بھیجیں گے وہ صرف ہمارے رسول ہوں گے نہ کہ وکیل- بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا خود ہی سب کا وکیل بن گیا ہے تو اب اس کا وکیل کوئی اور کیسے ہوسکتا ہے- دوسرے یہ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اس ذمہ داری کا بار اٹھا سکے جو خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے- پھر اس کی طرف سے وکالت کیسے متصور ہوسکتی ہے-

(۱) اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْل. (الزمر:۶۲) اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی سب کا وکیل وکارساز ہے۔

(۲) وَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ وَكِیْلًا. (النساء:۱۳۲) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے اور سب کے لیے خدا کی ذات کارساز کافی ہے۔

(۳) اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَكِیْلًا. (الاسراء:۲) میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل وکارساز مت بناؤ۔

(۴) قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ. (الانعام:۶۶) آپ کہہ دیجئے کہ میں تم پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا رسول مقرر ہوا ہوں۔

(۵) مَنِ اهْتَدٰی فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ وَ مَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا وَ مَا اَنَا عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ. (یونس:۱۰۸) جو راہ یاب ہوا اپنے فائدہ کے لیے اور جس نے گمراہی اختیار کی اپنا ہی نقصان کیا اور میں تو تم پر وکیل ومختار مقرر نہیں ہوا کہ جوابدہی میرے سر ہو۔

(۶) بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ. (المائدہ:۶۷) جو آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے وہ آپ پہنچا دیجئے۔

(۷) اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ. (الشوریٰ:۴۸) آپ کا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔

(۸) اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ. (الاعراف:۶۲) میں اپنے پروردگار کے پیغامات تمہارے پاس پہنچائے دیتا ہوں۔

(۹) قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ. (یونس:۱۵) آپ کہہ دیجئے کہ یہ میری طاقت نہیں ہے کہ میں قرآن کریم کو اپنی طرف سے بدل ڈالوں، میرے پاس تو جو حکم آئے اس کا تابعدار ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ رسولؐ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احکام الٰہیہ پہنچا دے اور بس۔ شریعت کے ایک شوشہ اور ایک نقطہ بدلنے کا حق اس کو نہیں کسی کی ہدایت وگمراہی کا بار اس پر نہیں اور نہ آخرت میں کسی کے اعمال کا وہ جواب دہ ہے۔ جہاں تک کارخانۂ عالم کی ذمہ داری و کارسازی کا تعلق ہے اس کے ذرہ ذرہ کی کفالت ووکالت خدائے تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے اور رسولوں کی پوزیشن صاف کرنے کے لیے اپنی اور رسولوں کی زبانی یہ بات واضح کر دیا ہے کہ ان کی حیثیت صرف رسالت کی حد تک ہے وکالت کی نہیں ہے تاکہ ہر انسان سوچ سمجھ لے کہ ہدایت وضلالت کی جواب دہی اسے خود براہ راست کرنی ہے جسے رسولوں کی ذات پر ٹالا نہیں جا سکتا۔

وکالت تو بہت دور کی بات ہے اگر کہیں ہر شخص سے خدائے تعالیٰ کا باتیں کرنا خالقیت کے خلاف نہ ہوتا تو شاید اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان رسالت کا واسطہ بھی نہ ہوتا۔ مگر جس طرح دنیا میں بادشاہ اپنی رعایا سے بلاواسطہ کلام نہیں کیا کرتے۔ اسی طرح خدائے تعالیٰ نے بھی اپنی ہر مخلوق سے براہ راست کلام کرنا پسند نہیں فرمایا، بلکہ اس کے لیے کچھ ہستیاں منتخب کر لی ہیں جو اس کی نظر میں اس کے لیے اہل بنائی گئی تھیں پھر ان میں بھی یہ حوصلہ نہیں ہے کہ بے حجابانہ وہ جب چاہیں اس سے باتیں کر لیں اس لیے ان کی برداشت کے بقدر اپنے ہم کلامی کی صورتیں مقرر کر دی ہیں۔

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ. (الشوریٰ:۵۱) کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے باتیں کر سکے مگر اشارہ سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیجے، پھر وہ خدا کے حکم سے جو اسکو منظور ہو اسکا پیغام پہنچا دے۔

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَكُمْ عَلَی الْغَیْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ. (آل عمران:۱۷۹) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو براہ راست غیب کی خبر دیدیا کرے لیکن اس کیلئے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چھانٹ لیتا ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنی غیب کی باتیں کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر ہاں

ارتضیٰ من رسول. (الجن : ۲۶-۲۷)　　جس رسول کو چاہے پسند کر لیتا ہے اور انہیں جو بات بتانا چاہے بتا دیتا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور نہیں رکھا کہ عام لوگوں کو بلا واسطہ غیب کی یقینی خبریں دیا کرے بلکہ اس کام کے لیے وہ رسولوں کا انتخاب کرتا ہے اور ان کے ذریعہ سے پھر تمام مخلوق سے ہم کلام ہوتا ہے اور یہ دستور اس لیے رکھا ہے کہ عام بشر تو درکنار رسول بھی اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ خدائے تعالیٰ سے جس طرح چاہیں بالمشافہ کلام کر سکیں۔ اس لیے ان سے کلام کرنے کی بھی چند صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ متکلم خود ذات پاک ہو مگر سامنے نہ ہو بلکہ پس پردہ ہو۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر کلام۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کرے۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ نبی خود بشریت سے ملکیت کے قریب آ جائے دوم یہ کہ ملک یعنی فرشتہ بشریت کے قریب آ جائے۔ ان دونوں صورتوں میں رسول سے بالواسطہ کلام ہوتا ہے۔ ان سب صورتوں میں چونکہ خدائے تعالیٰ کی ذات پاک رسول کے سامنے نہیں ہوتی اس لیے کلام الٰہی کی شوکت وطاقت رسول کے لیے قابل برداشت ہو جاتی ہے اگر کہیں آمنے سامنے آ کر کلام ہو تو بشریت کی ضعیف تعمیر برباد ہو جائے۔

رسول اور مصلح ریفارمر ❋ جس طرح کہ رسول وکیل ومختار نہیں ہوتا' اسی طرح وہ صرف ایک مصلح وریفارمر بھی نہیں ہوتا۔ رسول اور ریفارمر میں بڑا فرق ہے ایک ریفارمر اور مصلح کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے ان ہی کی طرح وہ تعلیم حاصل کرتا ہے پھر اپنی فطری صلاحیت ودلسوزی کی بنا پر قومی اصلاح کی خدمت انجام دیتا ہے جب اس کی فہم وفراست' ہمدردی ونیک نیتی کے اثرات قوم میں نمایاں ہوتے ہیں تو قوم کی نظروں میں وہ خود بخود ایک مصلح وریفارمر کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے مگر رسولوں کی تربیت صفت اجتباء واصطفاء کے ماتحت ہوتی ہے ان کی ہر نشست وبرخاست ہر قول وفعل کی قدرت خود نگراں ہوتی ہے اور اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو صفت عصمت حاصل ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مناسب عمر پر وہ خود انہیں منصب اصلاح پر فائز کرتی ہے۔ ریفارمر عصمت کا مدعی نہیں ہوتا غلطی کا احتمال اس پر ہر وقت جائز ہے۔

رسول کی دو زندگیاں رسالت سے پہلی اور رسالت کے بعد اس قدر ممتاز ہوتی ہیں گویا بلحاظ ذمہ داری وہ دو انسان ہوتے ہیں۔ رسالت سے پہلے وہ عام انسانوں کی صف میں شامل ہوتا ہے' نہ کوئی دعویٰ کرتا ہے نہ عام انسانوں کے عقائد واعمال سے کوئی ذمہ دارانہ سروکار رکھتا ہے اس کی دعوت میں کوئی تدریج کوئی تمہید نہیں ہوتی وہ خود بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ کل اسے کیا کہنا ہے وہ بالکل خاموش نظر آتا ہے اور جونہی کہ منصب رسالت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس طرح بولتا ہے کہ کسی کا خوف وخطر اس کے آس پاس نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال پر نظر کیجئے یا تو وہ فرعون کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر بھاگ رہے تھے یا رسالت کی دوسری ہی ساعت میں پھر اسی کی طرف واپس جاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں اور وہ بھی کس کام کے لیے؟ اس سرکش کو خدا کے عذاب سے ڈرانے کے لیے جس کے عذاب سے ڈر کر کل خود بھاگ رہے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے یا تو وہ عزلت نشینی تھی کہ غار حراء میں چالیس چالیس دن تک اس کی خبر بھی نہ رہتی تھی کہ دنیا کدھر جا رہی ہے یا اب کوئی بازار نہیں' کوئی مجمع نہیں' کوئی محفل نہیں جہاں دنیا کی اصلاح وخبر گیری کے لیے آپ چیخ نہ رہے ہوں خلاصہ یہ کہ رسول کی زندگی کسب واکتساب' تکلف وتصنع کے تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے' وہ از خود نہ رسول بنتے ہیں نہ بن سکتے ہیں اور نہ خود قوم کسی کو رسول بنا سکتی ہے بلکہ یہ دست قدرت کا براہ راست انتخاب ہوتا ہے جسے چاہے اس منصب کے لیے انتخاب کر لیتا ہے۔

رسول ریاضت سے نہیں بنتے وہ پہلے سے منتخب شدہ ہوتے ہیں ❋ رسالت ایک قسم کی سفارت ہے۔ ہر سفیر کے لیے قابل ہونا تو ضروری ہے مگر ہر قابل انسان کے لیے سفیر ہو جانا ضروری نہیں۔ یہ بادشاہ کی اپنی مصلحت اور صواب دید پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔ خدا کی زمین پر دنیا کے جس قدر رسول آئے آپ سب کی سیرت بالتفصیل مطالعہ کر جایئے ان کی زندگیوں کا ورق

ورق لوٹ جائیے مگر قرآن وحدیث سے کہیں ثابت نہیں ہوگا کہ کسی کو منصب رسالت کسی رسول کی اتباع واطاعت کے صلہ میں ملا ہو- تمام انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ بوقت ضرورت براہِ راست ان کو اس منصب سے نواز دیا جاتا ہے- بلکہ رسول کا خود مفہوم بھی یہ بتاتا ہے کہ یہ گروہ عام انسانوں اور خدائے تعالیٰ کے درمیان پیغامبری کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ ان کے واسطے سے لوگ شریعت پر عمل اور خدا کی عبادت کرنا سیکھیں اس لیے نہیں کہ شریعت پر عمل کر کے یہ خود خدا کے رسول بن جائیں- چنانچہ جب وہ آتے ہیں تو گمراہوں میں راہنما جاہلوں میں عالم، مفسدوں میں مصلح، اور کافروں میں اول مسلم بن کر آتے ہیں- رسالت سے پہلے بھی ان کا دامن شرک وکفر کی تمام نجاستوں سے پاک ہوتا ہے اور جو حرکات ادیان سماویہ میں ناقابل برداشت ہیں وہ نبوت ورسالت سے پہلے بھی ان سے دور ہی دور رہتے ہیں اور اپنی اس بے لوث اور پاک وصاف زندگی کی وجہ سے قوم میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیتے ہیں- ان کی ریاضت وعبادت اس لیے نہیں ہوتی کہ انہیں رسول بننا ہے بلکہ اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی یہ پاک وصاف زندگی قوم کی نظروں میں نمایاں کی جائے اور اس لیے نمایاں کی جائے کہ جب وہ رسالت کا دعویٰ کریں تو خود ان کی یہی زندگی ان کی تصدیق کا بڑا اسامان ہو جائے-

اگر بالفرض رسالت کسب واکتساب کا ثمرہ ہوتی تو رسولوں کی بعثت یا فترت کا مدار عبادت کی سرگرمی یا عبادت میں سردمہری پر ہوتا، حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی جتنی عبادت زیادہ ہوئی اسی قدر رسولوں کی آمد میں تاخیر ہوئی اور جتنی گمراہی وضلالت نے شدت اختیار کی اسی قدر رسولوں کی آمد کا زمانہ قریب تر ہوتا گیا- پھر جب خدا کا کوئی رسول آگیا اس کی زیر قیادت عبادت کر کے ایک بھی رسول نہیں بنا اور جب اس کی تعلیمات کے نقوش مٹنے لگے تو ایسے ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق بھی نہ تھا یا تعلق تھا تو اور نسخ کا تعلق تھا اس لیے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ رسول کسی عبادت وریاضت سے نہیں بنتے بلکہ خود بنے بنائے آتے ہیں- قرآن کریم کے لفظ "یاتینکم رسل منکم"، میں بھی اسی کی طرف اشارہ نکلتا ہے- یعنی اے بنی آدم تم میں کوئی فرد عبادت کر کے خود رسول نہیں بنے گا بلکہ رسول تمہارے پاس اس طرح آئے گا جیسا کہ حکومت کی جانب سے کوئی حاکم مقرر ہو کر آیا کرتا ہے- ڈگریاں بڑی سے بڑی حاصل کی جا سکتی ہیں مگر حکومت کا کوئی عہدہ بلا انتخاب حکومت حاصل نہیں ہوتا ہاں لیاقت واستعداد کے بعد اس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ نظر حکومت اگر اسے انتخاب کرنا چاہے تو کر لے اسی طرح رسالت ونبوت کی کیفیت ہے یہ ایک منصب اور عہدہ ہے نہ کہ انسان کے ممکن الحصول ارتقائی کمالات میں کوئی کمال- ہاں اس منصب کے متعلق کچھ کمالات ہیں جو اس منصب پر موقوف ہیں- اسی لیے حدیث میں ارشاد ہے **لو کان بعدی نبی لکان عمر** یعنی میری امت میں اگر بلحاظ کمال دیکھا جائے تو عمرؓ میں رسالت کی صلاحیت موجود ہے مگر چونکہ منصب نبوۃ پر تقرر کے لیے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی اس لیے نبی نہیں ہیں- اسی طرح فرمایا:

لو عاش ابراھیم لکان صدیقا نبیا. ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جیتے تو صدیق نبی ہوتے-

یعنی ان کا جوہر استعداد بھی نہایت بیش قیمت تھا انسانوں میں نبی بلکہ صدیق نبی بننے کے لائق تھے مگر یہاں ایک اور مانع بھی پیش آ گیا تھا وہ یہ کہ ان کی عمر وفا نہ کر سکی- امت میں ان دو شخصیتوں کے متعلق تو خود زبان نبوۃ سے تصریح آ گئی کہ بلحاظ لیاقت وکمال یہ دونوں منصب نبوۃ کے قابل تھے جن میں سے حضرت ابراہیمؑ کی تو عمر ہی نے وفا نہ کی حضرت عمرؓ کی عمر ہوئی تو تقرر نبوت کا زمانہ نہ رہا تھا ان کے علاوہ خدائے تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ اس امت میں اور کتنے انسان ایسے گذر گئے ہوں گے جو بلحاظ نفسی کمالات انبیاء سے کتنے مشابہ ہوں گے مگر عالم تقدیر میں چونکہ دنیا ہی کا ختم کر دینا ٹھیر چکا تھا اس لیے کوئی اس منصب پر نوازا نہیں گیا اور دنیا کی تاریخ جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے شور مچا مچا کر رسولوں کی آمد آمد پکار رہی تھی- اب یہ کہہ کر خاموش ہو گئی کہ دنیا کا آخری راہنما آ چکا اب اس کے بعد کوئی

رسول نہیں ہوگا- بہر حال تمام رسولوں کی تاریخ سے ہمیں یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاضت وعبادت کے صلہ میں رسول نہیں بنتے بلکہ عین لاعلمی کی حالت میں اچانک خدا کی طرف سے منصب رسالت پر مامور ہو جاتے ہیں-

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو منصبِ نبوت سے سرفراز کیا گیا - ابھی حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت کا کوئی ذکر فکر بھی نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر میرے بھائی میرے شریک کار ہو جائیں تو شاید خدماتِ نبوت کی ادائیگی میں میرے لیے سہولت رہے لیکن منصب نبوت چونکہ براہ راست خدائے تعالیٰ کے اصطفاء پر موقوف ہے اس لیے ان کو اسی ایک بارگاہ میں یہ درخواست پیش کرنی پڑی

وَ اجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ هٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ وَ اَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ. (طٰہٰ: ۲۹-۳۲) میرے بھائی کو میرے گھرانے سے میرا وزیر بنا دے اور ان کے ذریعہ میری کمر مضبوط کرا اور میرا انہیں شریک کار بنا دے-

اگر نبوت اکتسابی ہوتی تو یہاں سفارش کے موقعہ پر ان کے ایسے اوصاف کا ذکر کرنا مناسب ہوتا جو نبوت کا سبب بن سکتے ہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جن اسباب کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں:

وَ اَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ. (القصص: ۳۴) میرا بھائی مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے اسے میری مدد کیلئے میرے ساتھ کر دے وہ میری تصدیق کرے گا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ میری تکذیب نہ کریں-

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست کو منظور کر لیا گیا اور ان کو بھی نبی بنا دیا گیا - سوچئے کہ فصاحت و بیان کو نبوت میں کیا دخل ہے- اس کے برخلاف جب وہ طور جاتے ہوئے انہیں ایک خلیفہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہاں کوئی درخواست بارگاہ رب العزت میں پیش نہیں فرمائی اور براہ راست خود فرما دیا وَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَ اَصْلِحْ وَ لَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ. (الاعراف: ۱۴۲)

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ خلافت و نبوت میں کتنا فرق ہے خلیفہ نبی خود بھی بنا سکتا ہے مگر نبی کسی کو نہیں بنا سکتا ہاں اس کے لیے دعاء کر سکتا ہے- چونکہ حضرت علیؓ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت حاصل تھی' اس لیے گمان ہو سکتا تھا کہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے حق میں نبوت کی دعا کی اور قبول ہوگئی - اسی طرح اگر آپ بھی ان کے لیے دعا فرمائیں تو قبول ہو جائے اس لیے حدیث نمبر ۱۵۷ میں آپ نے پڑھا کہ اس سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں یہ خیال گذرے اور آپ کے دست مبارک دعا کے لیے اٹھ جائیں آپ سے کہہ دیا گیا تم اپنے داماد علیؓ کے لیے جو دعا چاہو مانگ لو مگر ایک نبوت کی دعامت کرنا کیونکہ عالم تقدیر میں یہ طے ہو چکا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور جو بات یہاں طے ہو جاتی ہے وہ پلٹا نہیں کرتی -

یہی صورت شب معراج میں پیش آئی جب تقدیر کو یہ منظور رہا کہ اب آئندہ سلسلہ تخفیف ختم کیا جائے اور پانچ نمازیں امت کے لیے ایک واجب العمل دستور ہو جائے تو پہلے ہی آپ سے کہہ دیا گیا مایبدل القول لدی تا کہ بعد میں مَایُبَدَّلُ الْقَوْلُ کا آئین آپ کے استجابت دعا میں حائل نہ ہو- یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصرار کے باوجود آپ پھر سفارش کے لیے تشریف نہیں لے گئے-

خلاصہ یہ کہ نبوت نہ پہلی امتوں میں کسب کا نتیجہ تھی نہ اب ہے ہاں پہلے منصب نبوت باقی تھا اس لیے دعا و سفارش کا موقعہ بھی تھا اب چونکہ منصب نبوت ہی نہیں رہا اس لیے نبوت کی دعا بھی نہیں کی جا سکتی - ہاں اس کی بجائے خلافت باقی ہے اور وہ تا قیامت جاری رہے گی-

پھر رسول جس طرح کہ خود بنتے نہیں اسی طرح خود بولتے بھی نہیں وہ خدائے تعالیٰ کے ترجمان ہوتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے وہی بولتے ہیں اور اسی لیے ان کا ہر حکم واجب التعمیل مفترض الطاعۃ ہوتا ہے ہر امر میں ان کو حکم و فصیل بنایا' ان کے ہر فیصلہ پر راضی ہو جانا اور اس

طرح راضی ہو جانا کہ اس میں تنگ دلی بھی محسوس نہ ہو مومن کا اولین فرض ہوتا ہے۔ ریفارمر میں یہ خصوصیات نہیں ہوتیں وہ اپنی قومی خدمات کے صلہ میں ریفارمر تسلیم کیا جاتا ہے اس کا حکم صرف اخلاقی حد تک واجب العمل ہوتا ہے اس کے ساتھ نزاع کا حق ہر وقت حاصل ہوتا ہے اس کو خدائی ترجمانی کا کوئی دعویٰ نہیں ہوتا' اس کا تعلق ہماری زندگی کے صرف ایک شعبہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی معاش جسمانی مبدأ و معاد سے اسے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ رسول کا تعلق ہمارے ہر گوشہ حیوۃ سے ہوتا ہے۔ ریفارمر کا کوئی حکم مذہب نہیں کہلاتا۔ رسول کا ہر حکم مذہب کی بنیاد بن جاتا ہے۔ کسی قوم کا ریفارمر و مصلح بننے کے لیے اس کا ہم زبان ہونا شرط نہیں ہے۔ رسول کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس قوم کا رسول ہو اسی کا ہم زبان بھی ہو۔ ﴿وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِہٖ﴾ (ابراھیم:۴) رسول کا ہر علم قطعی ہوتا ہے۔ شک و تردد کا اس میں کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ ریفارمر کی ہر ہدایت زیر احتمال رہ سکتی ہے اس لیے رسول فلاح و کامیابی کا ضامن ہوتا ہے' ریفارمر کامیابی کی ضمانت نہیں لے سکتا۔

رسول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحدت ملی کا ایک مستحکم مرکز ہوتا ہے اس لیے اس کی ذات ایمان و کفر کا محور ہوتی ہے یعنی اس سے وابستگی ایمان اور اس سے علیحدگی کفر کے نام سے موسوم ہوتی ہے ہزاروں اختلافات رسول کی ذات سے وابستگی کے بعد وحدت و اخوت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بہت سی جمعیتیں رسول کے دامن سے علیحدہ ہو کر صفت وحدت سے خالی ہو جاتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا۔ ﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) اور دوسری صورت کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّ قُلُوْبُهُمْ شَتّٰى۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل عرب کے اختلافات کا تصور کیجئے اور نقطہ رسالت پر جمع ہونے کے بعد ان کی شان وحدت کو ملاحظہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ ہزاروں افراد یا تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے یا فرد واحد کی طرح ایسے ایک جان ہو چکے تھے کہ مشرقی مسلمان کی تکلیف سے مغربی مسلمان کو وہی تکلیف محسوس ہوتی تھی جو ایک انسان میں ایک عضو کی تکلیف سے تمام اعضاء کو محسوس ہوتی ہے وہ ابھی ابھی یا تو اینٹوں کے ڈھیر کی طرح میدان میں بکھرے پڑے ہوئے تھے یا ایک ہی ساعت کے بعد ایک مستحکم تعمیر کی شکل میں منظم و مرتب تھے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے مرتبط اور باعث استحکام تھی۔

و عن ابی موسی رضی اللہ تعالی عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المؤمن للمؤمن کا لبنیان یشد بعضہ بعضا ثم شبک بین اصابعہ. (متفق علیہ)

ابوموسیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں ایک مؤمن دوسرے مؤمن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہے ایک دوسرے کو قوت پہنچاتا اور مضبوط رکھتا ہے اس کے بعد آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر اس کا نقشہ دکھایا۔ (متفق علیہ)

عن النعمان بن بشیر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المؤمنون کرجل واحد ان اشتکی عینہ اشتکی کلہ و ان اشتکی رأسہ اشتکی کلہ. (مسلم)

نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام مسلمان شخص واحد کی طرح ہیں اگر اس کی آنکھ درد کرتی ہے تو تمام جسم بیمار پڑ جاتا ہے۔ اگر سر درد کرتا ہے تو تمام جسم بیمار پڑ جاتا ہے۔ (مسلم)

دنیا کی تمام وحدتیں اس حقیقی وحدت کے سامنے ہیچ ہیں۔ وحدت قومی' وحدت ملکی' وحدت وطنی' وحدت قبیلہ وحدت حسب و نسب' کے سوا اور جتنی وحدتیں پیدا ہو سکتی ہیں وہ سب اس کے سامنے لاشئے ہیں جب کبھی اس وحدت حقیقیہ کی دوسری وحدتوں سے ٹکر ہوئی تو دوسری تمام وحدتیں پاش پاش ہو کر مٹ گئیں اور صرف یہی ملت کی ایک مرکزی وحدت باقی رہ گئی۔ ریفارمر کی ذات بھی قوم کی شیرازہ بندی کا بڑا سبب ہے مگر جو وحدت ایک کامیاب سے کامیاب ریفامر کے نام پر پیدا ہوتی ہے وہ اس وحدت حقیقیہ سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ یہ وحدت'

2

نظام ملی اور حیوۃ بشری کے لیے بمنزلہ روح ہے اسی لیے جب یہ وحدت فنا ہونے لگتی ہے تو اس کو سرنو زندہ کرنے کے لیے خدا کے رسول آتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ رسالت کا دروازہ مسدود ہو چکا ہے اس لیے یہ کام خلافت راشدہ کے سپرد کر دیا گیا ہے-شریعت میں خلافت اور امارت اور امامت درجہ بدرجہ اسی وحدت کے تحفظ کے لیے ہیں- اسی لیے جب خلافت سے یہ مقصد حاصل ہونا مفقود ہو جائے تو شریعت نے اس کا نام ملک عضوض رکھا ہے یہ اسی وحدت کی فنا کی طرف اشارہ تھا جو دراصل رسولوں کی ذات سے وابستہ ہوتی ہے-

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبی خلفہ نبی و انہ لا نبی بعدی و سیکون خلفاء فیکثرون الحدیث. (متیفق عیہ)

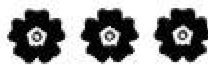
ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کی سیاست کی نگہبانی انبیاء علیہم السلام فرمایا کرتے تھے جب ایک نبی فوت ہو جاتا اس کے قائم مقام دوسرا آ جاتا چونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اس لیے اب عنانِ انتظام خلفا کے ہاتھ میں رہے گی اور وہ بہت ہوں گے-

خلاصہ یہ کہ رسول میں اوتار و بروز و ابنیت کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور محض ایک ریفارمر و مصلح کی حیثیت بھی نہیں ہوتی - نصاریٰ نے رسالت کو ابنیت کے عنوان سے سمجھنے کی کوشش کی وہ بھی غلط راہ پر نکل گئے - براہمہ اور جوگیوں نے اس کو اوتار کا علاقہ بنا دیا وہ بھی عینیت یا حلول کے روگ میں پھنس گئے - نصاریٰ نے رسول کو خدا سے اتنا قریب سمجھا کہ پھر انہیں دوئی قائم رکھنا دشوار ہو گیا اور جدید روشنی میں اس کو خدا سے اتنا دور سمجھا گیا کہ اس کو صرف ایک ریفارمر کی حیثیت دی گئی - یہ دونوں راستے افراط و تفریط کے راستے ہیں اگر اس کی حیثیت رسول کے لفظ ہی سے قائم کی جاتی تو یہ مغالطے پیش نہ آتے اور واضح ہو جاتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اتنا بعید نہیں ہوتا جیسا کہ عام انسان اور اتنا قریب بھی نہیں ہوتا جتنا کہ اوتار و ابن - وہ بعید ہو کر اللہ تعالیٰ سے انتہائی قریب ہوتا ہے اور انتہاء درجہ قرب کے باوجود پھر احد و صمد سے حلول و اتحاد کا کوئی علاقہ نہیں رکھتا - اس کا نام قرب ولایت نہیں یہ قرب رسالت ہے - یہ انسان کے لیے مدارج قرب کی وہ آخری منزل ہے جس کے بعد کوئی منزل نہیں اگر ان دونوں میں فرق سمجھ لیا جاتا تو ایک محب کی زبان سے جو بھی اضطراب میں عاشقانہ کلمات نکل جاتے ہیں نہ نکلتے اور وہ اپنی تمام لن ترانیوں کی بجائے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا

زلاف حمد و نعمت اولیٰ است برخاک ادب خفتن
سجودے می تواں کردن درودے می تواں گفتن

اسی لیے آسمانی مذاہب نے رسول کی اس درمیانی ہستی کے لیے جو جامع سے جامع لفظ اختیار کیا تھا وہ خود لفظ رسول تھا اور اسی لیے اذانوں میں خطبوں میں نمازوں میں جس لفظ کا بار بار اعلان کیا جاتا ہے وہ یہی لفظ رسول ہے - آج دنیا رسول کی معرفت کے لیے خود لفظِ رسول کو ناکافی سمجھتی ہے اور اپنی طفل تسلی کے لیے دوسرے عنوانات تراش تراش کر اپنے ذہن میں رسول کی حیثیت قائم کرنا چاہتی ہے - یاد رکھو یہ کبھی نہیں ہو گا کبھی نہیں ہو گا - رسول کی معرفت تم کو لفظ رسول سے زیادہ صحیح کسی اور لفظ سے حاصل نہیں ہو سکتی -

ہمارے مضمون حجیت حدیث میں رسول کی حیثیت پر قرآن کی روشنی میں بھی کلام کیا گیا ہے مقدمہ دیکھا جائے.



ایمان کی تعریف پر اجمالی نظر

کامل ایمان کی تعریف ٭ شریعت میں ایمان و اسلام صفتِ انقیاد و اطاعت کی اس آخری منزل کا نام ہے جس کے بعد اوامر الٰہیہ اور منہیات شرعیہ کے قبول کرنے سے قلب میں کوئی انحراف باقی نہ رہے۔ مخبر صادق پر وہ اعتماد حاصل ہو جائے کہ پھر دل کی تمام خوش حالی اور روح کا کامل سرور اس کی تصدیق میں منحصر نظر آنے لگے۔ گویا جذبہ وفاداری طلب دلائل کی مہلت نہ لینے دے۔ راہ حق میں ہر نئی قربانی ایک نئی لذت ہو اور ایک ادنیٰ نافرمانی وہ تلخ گھونٹ ہو جائے جو گلے سے اتارے نہ اترے۔

ایمان بالغیب ایمان کی سب سے بڑی صفت ہے ٭

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ . (بقرۃ: ۲ - ۳) (یہ کتاب) راہ دکھانے والی ہے (اللہ) سے ڈرنے والوں کو جو یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا۔

اس آیت میں ان ہی سرفروشوں کی اس سرمستی کا ذکر کیا گیا ہے یعنی یہ وہ جماعت ہے جو محض جذبۂ انقیاد میں دیکھی اور ان دیکھی باتوں کی یکساں تصدیق کر چکی ہے۔ آنکھ اگر دیکھتی اور تصدیق کرتی ہے، کان اگر سنتے اور مان لیتے ہیں تو یہ ان کا فطری اقتضاء ہونا چاہیے لیکن آنکھیں اگر نہیں دیکھتیں، کان اگر نہیں سنتے پھر ان آنکھوں اور کانوں کے اعتماد پر جن کی صداقت پر سارا جہان قربان اعتماد کر لیتے ہیں تو پھر بلاشبہ یہ ان کے ایثار و انقیاد کی آخری دلیل ہوگی، یہی وثوق اور اعتماد ایمان کی روح ہے۔

دلائل کی حقیقت اور اس کا وزن ٭ دلائل کی روشنی بھی کوئی روشنی ہے جو ایک قدم پر اگر چمکتی ہے تو دوسرے ہی قدم پر گل ہو جاتی ہے۔ اگر نبی صاحب وحی ہے اور جو کہتا ہے وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے کہتا ہے تو اس کے اعتماد پر اس کے تمام دین کو تسلیم کر لینا ایک اقتضاء طبعی ہونا چاہیے۔ کسی حقیقت کے مسلم ہو جانے کے بعد بھی دلائل کی تلاش، روشن خیالی نہیں بلکہ ایک مختصر راہ کو اور طویل کر دینا ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد دعوت مناظرہ کے بجائے شروع سے عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر مدار صرف دلائل پر ہو تو دلائل کبھی کبھی ہر دو طرف پیدا ہو جاتے ہیں ماسوا اس کے مطالب کی نزاکت کبھی دلائل کی رسائی سے بالاتر ہوتی ہے۔ پھر مذاق کا تفاوت سمجھ اور فہم کا اختلاف، اس پر وہم انسانی کی مزاحمت، یہ سب وہ موانع ہیں جو اگر نفس تصدیق کے لیے نہ سہی مگر کم از کم عمل کے لیے تو یقیناً سد راہ بن جاتے ہیں اسی لیے قرآن کریم نے صرف اطاعت و انقیاد ہی کی ایک راہ بتلائی ہے۔

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَ مَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا . (الحشر: ۷) جو کچھ رسول تمہارے پاس لے کر آئے اس کو اختیار کر لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

دلائل کا وسیع دائرہ بھی کچھ دور جا کر آخر اسی صفت انقیاد پر ختم ہو جاتا ہے ورنہ ایک مقصد کے حصول کے لیے مقدمات کی اتنی بے شمار کڑیاں درکار ہوں گی کہ اگر سب کا طے کرنا ضروری ٹھہرے تو پھر تمام عمر میں ایک مقصد کا حصول بھی خواب و خیال سمجھ لینا چاہیے۔ بہ نظر انصاف ایک تجربہ کار محقق کا قول خود ایسی محکم دلیل ہوتی ہے جو تنہا ہزار دلائل کا وزن اپنے اندر رکھتی ہے۔ آج بھی ہم اپنے دلائل و براہین کا سلسلہ آخر میں یورپ کے فلاسفروں کی تھیوریوں پر جا کر ختم کر دیتے ہیں اور صرف ان کے اسماء کا حوالہ دے دینا دلائل کی وہ معراج تصور کرتے ہیں جس کے بعد تمام دلائل سے بے نیازی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ یہ تھیوریاں بے دلیل مسلم ہونے کے قابل ہیں

بلکہ اس کی تہ میں یہ علم یقین پہلے حاصل ہوتا ہے کہ یہ تھیوریاں ان فلاسفروں کے نزدیک چونکہ اپنے دلائل سے ثابت شدہ ہیں لہٰذا ان دلائل کا تلاش کرنا اور پھر ان کا دوہرانا محض ایک مسافت کا طویل کرنا ہو جاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور ان کے علوم کا مرتبہ ٭ ٹھیک اسی پر علوم انبیاء کو قیاس کر لینا چاہیے۔ اگرچہ ''چہ نسبت خاک را با عالم پاک'' ان کے علوم بھی اپنی جگہ ایسے دلائل سے ثابت شدہ ہوتے ہیں جہاں باطل کو کہیں سے راہ نہیں ملتی بلکہ وہ علم یقین کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جس کے بعد ان کا لقب برہان مجسم ہو جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا. (النساء : ۱۷۴)

اے لوگو! پہنچ چکی ہے تمہارے پاس ایک سند تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے تم پر واضح روشنی اتاری۔

بندہ کا کمال تفویض و تسلیم ہے ٭ اس لیے انبیاء علیہم السلام کے علوم ان کے اعتماد پر تسلیم کر لینا کورانہ تقلید نہیں بلکہ مجسم ایک برہان اور حجت بینہ کی تقلید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایمان کی تمام قیمت بندہ کی صرف یہ ادا ہے کہ وہ رسول وقت کے سامنے اپنی ساری لن ترانیاں ختم کر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اس کی ایک زبردست قربانی ہے، جسے وہ اپنے ضعیف و ناتواں ہاتھوں سے اپنے رب کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ انسان کی بے صبر فطرت اپنی جیسی مخلوق کو ایسے مقام پر کبھی دیکھنا پسند نہیں کرتی، جہاں بے دلیل سرنگوں ہو جانا تمام انسانوں کے لیے وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہو جائے (یعنی رسول) وہ خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اسی کی اطاعت اپنا فرض تصور کرسکتا ہے۔ اسی لیے مشرکین عرب میں بھی تمام جہالتوں کے باوجود ایک جماعت خدا پرست تھی اور بزعم خود توحید کا انکار نہ کرتی تھی۔

إِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ يَسْتَكْبِرُونَ. (الصفت : ۳۵)

(اور) جب کہا جائے ان سے کہ سوائے اللہ کے کوئی (اور) معبود نہیں تو غرور کرنے لگتے ہیں۔

یہاں لفظ یجحدون اسی لیے ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ اصل دعوت سے انہیں انکار نہ تھا البتہ مسلمانوں کی آواز پر ان کا ہم آہنگ ہو جانا ان کے نزدیک اپنی بڑائی کے خلاف تھا۔

آدم علیہ السلام کو سجدہ کا امر فرمانے کا فلسفہ ٭ عالم کا سب سے پہلا شقی یعنی ابلیس خالق السموات والارضین کی عبادت سے کبھی منکر نہیں ہوا لیکن مشیت ایزدی نے اس کے دعوائے انقیاد کا جب امتحان لیا تو اپنی عبادت کا امر فرما کر نہیں لیا بلکہ ایک مشت خاک کے سامنے سر جھکانے کا امر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ سر جھکا دینا کوئی بڑی بات نہ تھی مگر ہاں دشواری تھی تو یہ تھی کہ ایک ضعیف ہستی کے سامنے سر جھکانا جو مخلوق ہونے میں اس کی برابری کی شریک ہو اس کی آواز فطرت کے برخلاف اور بظاہر ایک بے دلیل بات تھی۔ اس سے رہا نہ گیا اور:

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ. (الاعراف: ۱۲)

میں بہتر ہوں اس سے (کیونکہ) مجھ کو بنایا ہے تو نے آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے۔

شیطان کے معارضہ کی حقیقت ٭ کا نعرہ لگا بیٹھا دلائل کی پیروی کا جو نتیجہ ہوسکتا تھا وہ ہوا اس کا پوشیدہ کبر اور طبعی انحراف چھوٹا اور آخر وہ تسلیم و رضا کی اس منزل میں چل کرنا کام رہ گیا۔ جہاں خیر و شر کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اور چون و چرا کا میدان تنگ ہو جاتا ہے۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ۔ کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

طبعی انحراف و علوم کا خاصہ ٭ طبیعت کے انحراف کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تلاش حق کی تمام توفیق سلب کر دیتا ہے اور وہ نشہ پیدا کر دیتا ہے جس کے بعد اپنی ہوائے نفس کے سامنے دلائل و براہین کی کچھ پار نہیں بستی۔ اطراف و جوانب سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور اس بے شعوری کے عالم میں جو فیصلہ اپنے خیال میں آ جاتا ہے وہ آخری فیصلہ نظر آنے لگتا ہے۔

فضیلت کے لیے صرف مادہ کا شرف کافی نہیں ہے ✻ ابلیس نے صرف عنصر آتش کے شرف پر نظر کی یہ اس کا قصور نظر تھا -عنصر خاک کو ضعیف ترین عنصر سہی مگر کیا ہو نہیں سکتا تھا کہ اس میں بھی کوئی جہت ایسی پیدا ہو جائے جو اسے قوی و برتر عنصر سے بھی افضل بنا دے اگر ابلیس انسان کی صورت کی طرف بھی نظر کر لیتا تو اپنے مادہ کا شرف اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا -عنصر آتش ہزار اشرف سہی مگر یہاں صورت ایک حرف کن[1] نے عطا کی تھی -عنصر خاک پر جو نقش و نگار نظر آئے وہ نقاش ازل کے خود اپنے دست قدرت کا بالواسطہ کمال تھا-

لما خلقت بیدی کی لطیف تفسیر اور شیطان کے معارضہ کا جواب ✻

قال یا ابلیس ما منعک ان تسجد لما خلقت بیدیّ استکبرت ام کنت من العالین. (ص:۷۵)

فرمایا اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا کہ سجدہ کرتا اس کو جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا یہ تو نے غرور کیا یا تو درجہ میں بڑا تھا-

مناظرۂ ابلیس میں نسل انسانی کے لیے ایک عظیم موعظۃ ✻ نصب خلافت سے پہلے ہی یہ سبق تمام نسل انسانی کو دے دیا گیا تھا کہ اسے بھی اپنی اطاعت و انقیاد کا امتحان دینا ہوگا اور کامیابی صرف اس صورت میں متصور ہوگی جب کہ خدائے رب العزت کی رضاء جوئی میں اس کے رسولوں کے لیے بھی بے دلیل وہی جذبہ اطاعت پیدا ہو جائے جو خود اس کے لیے موجزن ہو سکتا ہے-اب یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ رسولوں کی باتوں پر بے دلیل یقین کر لینا کیوں رکن ایمان قرار دیا گیا ہے-

انصار کی محبت علامت ایمان کیوں ہے؟ ✻ حدیث شریف میں انصار کی محبت کو علامات ایمان میں اسی لیے شمار کیا ہے کہ رسول اور اس کے کنبہ وقبیلہ یا ہم وطن کی محبت ہر مسلمان میں طبعی طور پر بھی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے مگر انصار کی محبت جو نہ اس کا ہم قبیلہ تھے نہ ہم وطن اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس لیے کہ انہوں نے رسول کی ایسے آڑے وقت اعانت کی تھی جب کہ اس کے قبیلہ تک نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور بلاشبہ یہ محبت کمال ایمان ہی کا ثمرہ ہو سکتی ہے-محبوب تو نظر عاشق میں سراپا محبوب ہوتا ہے مگر اس میں کمال کیا ہے کہ اس کی ہر ہر ادا عشاق کی دلربائی کا مستقل ایک ایک افسوں ہوتا ہے-

کمال محبت' محبوب کی رضا میں فنا ہو جانا ہے ✻ کمال محبت تو یہ ہے کہ اس کی رضاء میں وہ فنا میسر ہو جائے کہ پھر یگانہ و بیگانہ مکروہ و محبوب کا امتیاز جاتا رہے بلکہ تمام محبت و شفقت' ہمدردی و سلوک تعاون و سازگاری کا وہی ایک محور و مرکز بن جائے- مال و اولاد کا تو ذکر کیا ہے اپنے نفس سے اگر محبت رہ جائے تو وہ بھی اسی کی خاطر ہو-انّ صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للّٰہ ربّ العالمین-

اس کی راہ میں تمام قربانیاں شیریں بن جائیں اور اس کے خلاف میں ساری خوش حالیاں کانٹے نظر آئیں' اس کے نام پر گردنیں اتروا دینا حیوۃ ابدی معلوم ہو اور اپنی قربان گاہ سے ایک قدم پیچھے ہٹنا موت ابدی نظر آئے اور یہ سب کچھ اس تصور میں ہو کہ یہ ساری جاں نثاریاں گو اس قابل نہ سہی کہ محبوب کے لیے قابل نظر ہوں مگر ایک عاشق کی یہ حسرت ہونا چاہیے کہ راہ عشق میں جو قربانی وہ کر سکتا ہے کر گذرے' حضرت بلالؓ و عمارؓ کے سرفروشانہ جذبات پر سیرت نگاروں کو حیرت ہے مگر خود ان کی زبانی اگر دریافت کیا جاتا تو ساقی کوثر کے

---

[1] عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لما خلق اللہ ادم و ذریتہ قالت الملائکۃ یا رب خلقھم یا کلون و یشربون و ینکحون و یرکبون فاجعل لھم الدنیا و لنا الاخرۃ قال اللہ تعالی لا اجعل من خلقتہ بیدی و نفخت فیہ من روحی کمن قلت لہ کن فکان . (شعب الایمان مشکوۃ شریف) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالی علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالی نے آدم اور ان کی ذریت کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے عرض کیا اے پروردگار تو نے ان کو ایسا بنایا ہے کہ یہ کھاتے پیتے' نکاح کرتے اور سوار ہوتے ہیں (ہم ان باتوں سے محروم ہیں) اس لیے دنیا ان کے حصہ میں لگا دے اور آخرت ہمارے حق تعالی نے ارشاد فرمایا کہ جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اپنی طرف سے اس میں روح ڈالی ہے اس کو ان کے برابر نہیں کروں گا جن کو میں نے حرف کن سے بنایا ہے-

ہاتھ سے ان جام پینے والوں سے شاید انہیں شکایت ہوتی جنہیں اس کے ہاتھ سے جام پی کر تکلیف و راحت کا احساس باقی تھا ۔

ازاں افیوں کہ ساقی کردہ بد مست   رفیقاں را نہ سر ماند نہ دستار

ایمان میں اسی منزل کا نام مقام یقین ہے دیکھو حجۃ اللہ صفحہ ۹۱ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ عقل انسانی جب نشہ یقین سے مخمور ہو جاتی ہے تو قلب و نفس بھی اس سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ پھر عالم غیب پر ان کو محسوسات کی طرح یقین نصیب ہو جاتا ہے' فقر و غناء حیوٰۃ و موت کے خرخشہ سے انسان بے نیاز ہو جاتا ہے اسباب کی قید و بند سے رستگاری میسر آ جاتی ہے۔

ایمان مذہب کی روح اور بنیاد ہے ✻ یہ ہے وہ ایمان جس پر مذہب کی تمام بنیاد قائم ہے کوئی عقیدہ اپنے دامن میں خواہ کتنی ہی نزاہت اور رفعتیں کیوں نہ رکھتا ہو مگر اس نور ایمانی کے بغیر نظر شریعت میں وہ صرف ایک ظلمت کدہ اور سرتا سر تاریکی ہے۔ کوئی عمل مجاہدات و ریاضات کے خواہ کتنے ہی مراحل کیوں نہ طے کر چکا ہو مگر بدون اس روح ایمانی کے ایک تن مردہ اور میزان آخرت میں قطعاً بے وزن ہے۔ ﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا﴾ (الكهف: ۱۰۵) (پس ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے) عقائد و اعمال کا تو ذکر کیا ہے کوئی معمولی سی معمولی نیت بھی خواہ کتنی ہی صاف و ستھری کیوں نہ ہو اس سرمایہ ایمان کے بغیر بارگاہ بے نیاز میں کوئی اعتبار نہیں رکھتی' یہ ایمان' عقائد و اعمال اور نیتوں کی وہ واحد روح ہے جس کے بعد کفر کی تو بر تو تاریکیاں چشم زدن میں کافور ہو سکتی ہیں۔ آتش کدۂ جہنم اس کے رو برو سرد ہو سکتا ہے اور گلزار عدن اس کا ایک طے شدہ معاوضہ بن جاتا ہے۔ ایک معمولی سجدہ طاعات صد سالہ کے لیے مایہ رشک اور مٹھی بھر جو کا صدقہ بے شمار تضاعیف (زیادتیاں) کا مستحق نظر آنے لگتا ہے۔ غرض سعادت ابدیہ اسی مبدأ کی خبر ہے اور شقاوت ازلیہ اس سے محرومی کا نشان ہے۔ یہ سب کچھ اس سچی کتاب میں موعود ہے جو غلط گوئی سے بالکل منزہ اور مبالغہ آمیزی سے یکسر مبرا ہے۔

ایمان کی تعریف پر تفصیلی نظر

اشیاء کے وجود کی تین صورتیں ✻ کسی چیز کے وجود کی عالم میں تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) عینی۔

وجودِ لفظی ایک نا تمام وجود ہے ✻ ان ہر سہ اصناف میں لفظی وجود سب سے ضعیف اور کمزور وجود ہے' جو مقاصد و اغراض کسی شئے کے وجود میں ملحوظ ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس وجود پر مرتب نہیں ہوتا۔ اس لیے اگر اس وجود کو عدم کے برابر کہہ دیا جائے تو بے جا نہیں ہے۔ پانی کا لفظی وجود کسی تشنہ کی پیاس نہیں بجھاتا اور نہ روٹی کا صرف زبانی تذکرہ کسی بھوکے کا پیٹ بھرتا ہے۔

وجود عینی لفظی وجود سے قوی ہے ✻ (۲) وجودِ ذہنی گو لفظی وجود سے قوی تر ہے مگر شئے کے تمام آثار و احکام مرتب ہونے کے لیے یہ بھی نا کافی ہے۔

کسی چیز کا وجود عینی ہی اس کا مکمل وجود ہوتا ہے ✻ (۳) وجودِ عینی وہ وجود ہے جو خارج میں کسی کے اعتبار کیے بغیر موجود ہوتا ہے اسی وجود کو درحقیقت وجود کہا جا سکتا ہے بقیہ اصناف اس کے توابع اور فروع ہیں۔ یہی مبدء آثار ہے اور اسی پر شئے کے سب احکام مرتب ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی تر و تازگی' قلب و جگر کی سیرابی' اشجار و ثمار کی سرسبزی یہ سب پانی کے وجودِ عینی ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں' اسی لیے جب کوئی پیاسا پانی مانگتا ہے تو اس کا مقصد پانی کا یہی عینی وجود سمجھا جاتا ہے اور اس کا لفظی یا ذہنی وجود کسی کے خواب و خیال میں نہیں آتا۔ اسی طرح ایمان کے وجود کی بھی تین صورتیں ہیں (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) عینی۔

سابق تمہید کی بنا پر ایمان کا لفظی وجود بیکارِ محض ہونا چاہیے۔ جب کسی تشنہ کے لیے پانی کا صرف لفظی وجود کار آمد نہیں ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے جواب میں ایمان کا صرف لفظی وجود کیا مفید ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں ایک سخت مشکل یہ درپیش ہے کہ عالم بشریت کی

سرتا سرمحتاج ہی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو الفاظ وحروف کا جامہ پہنائے بغیر ادا کر سکے۔ اس کی قلبی ترجمانی کا یہی ایک ناتمام آلہ ہے اگر وہ بھی ناقابل اعتبار ٹھہرے تو عالم انسانی کا تمام کاروبار معطل اور بیکار محض ہو جائے۔ اس لیے چار و ناچار ایمان کا لفظی وجود بھی شریعت میں ایک حد تک قابل اعتبار سمجھا گیا ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللّٰہ. میں اس بات پر مامور ہوں کہ جب تک کفار لا الہ الا اللہ نہ کہیں ان سے جنگ جاری رکھوں۔

اب اسے ایمان کی رفعت اور بلندی کہیے یا اس کی فیاضی سے تعبیر کیجئے کہ محض زبانی کلمہ توحید پر اس نے جان بخشی کا اعلان کر دیا ہے اور کسی کے سرائر اور مکنونات صدر (دل کے راز) سے کوئی بحث نہیں کی۔[1]

اس جگہ یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ اسلام میں تصدیق قلبی کے بغیر صرف زبانی اقرار کر لینا بھی کوئی وزن رکھتا ہے کیونکہ قلبی تصدیق ایمان کا وہ اہم رکن ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی کسی حالت میں قطع نظر کے قابل نہیں سمجھا گیا حتیٰ کہ بحالت اکراہ جب کہ اپنی جان پر بن رہی ہو زبان سے کلمہ کفر ادا کرنے کی صرف اسی شرط سے اجازت دے دی گئی ہے کہ قلب کی گہرائیاں اذعان وایقان سے لبریز اور معمور رہیں۔

اَلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَ قَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ. (النحل:۱۰۶) مگر وہ شخص جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل برقرار ہے۔

جو صورت حدیث میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ اگر زبان اقرار کر لیتی ہے اور دوسری کوئی دلیل جو قلبی انحراف پر دلالت کر سکے ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتی تو اس وقت ہم اس بات کے مامور ہیں کہ اس اقرار ہی کو قلبی تصدیق کی دلیل سمجھیں۔

اسلام جو اخلاقِ عالیہ کا سب سے اول معلم ہے کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان کو بلاوجہ جھوٹا قرار دے یا اس کے متعلق کسی اندرونی کمزوری کی بناء پر اپنے ضمیر کے خلاف بولنے کا تصور لائے۔ دنیا میں ایک بڑے سے بڑا انسان خواہ اخلاق کے کتنے ہی بلند مقام تک کیوں نہ پہنچ چکا ہو کبھی اپنے حریف پر وہ بھی بحالت جنگ اعتماد کا خیال نہیں کر سکتا' یہ اسلام ہے جو یہ دعوت دیتا ہے کہ تم اپنے حریفوں کی زبان پر بھی اعتماد کر لو اور اس تشویش میں نہ پڑو کہ ان کے دلوں میں کیا ہے اگر ان میں کوئی سعید روح ہو گی تو ایک دن وہ خود بخود اپنے اس صدق نما کذب پر نادم ہو گی اور دل بھی زبان کی طرح اسلام کا کلمہ پڑھ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔

ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ نے ایک کافر کو بکریاں چراتے دیکھا۔ دورانِ جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کی گھات میں لگا ہی رہتا ہے۔ صحابہؓ نے ارادہ کیا کہ اس کی بکریاں چھین لیں' اس نے اپنا پانسا کمزور دیکھا اور وہ وقت آ گیا کہ جو اسلام مدت سے اس کے سینہ میں گھوم رہا تھا اب دل میں اتر آئے وہ اسلام لے آیا' مگر اس حال میں دشمن کا اقرار وفاداری' انسان کی کمزور فطرت کب قبول کرتی۔ اس لیے صحابہ کرامؓ نے اس اسلام کو صرف مال کے بچاؤ کا ایک ذریعہ سمجھا اور اس کی بکریاں غنیمت کا مال بنا لی گئیں۔ لیکن اسلام جو اخلاق کے آخری منازل صرف زبانی سکھانے نہیں آیا تھا بلکہ طے کرانے آیا تھا اس کمزوری کو کب برداشت کرتا' اس واقعہ کی اہمیت محسوس کی گئی اور اتنی کی گئی کہ وحی الٰہی کو دخل دینا پڑا اور نہایت تنبیہ آمیز لہجہ میں ارشاد ہوا۔

---

[1] حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ثبوت کا دار و مدار کسی ایسی ہی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے اگر خدا کے رسول کے علم پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً منافقین کا گروہ' کفار میں شمار ہوتا۔ اب اگر ان کو قتل کیا جاتا تو انہیں ناحق یہ بدنام کرنے کا موقعہ ہاتھ آ جاتا کہ آپ اپنے اصحاب و رفقاء کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ اس لیے کلمہ توحید کا زبانی اقرار ہی اسلام قبول کرنے کا معیار قرار دے دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و خاتمہ کا دار و مدار رکھ دیا گیا۔ (کتاب الایمان ص ۱۷۲)

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ (نساء: ۹۴)

اور مت کہو اس شخص کو جو تم سے ''سلام علیک'' کرے کہ تو مسلمان نہیں۔ تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا۔

کتب احادیث میں اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت ہیں' جہاں اسلام کے لفظی وجود یعنی صرف اقرار باللسان کو دنیوی احکام کے لیے کافی سمجھا گیا ہے۔

حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہ اگر دورانِ جنگ میں دشمن میرا ایک بازو کاٹ دے اور جب میرا موقعہ لگے تو وہ جان بچا کر درخت کی آڑ میں آ جائے اور کلمہ شہادت پڑھ لے تو کیا میں اس کے اس مجرمانہ اقدام کے بعد بھی اس کا یہ متہم اسلام قبول کر لوں۔؟ ارشاد ہوا ضرور اور اگر اس کے بعد بھی تم نے اسے قتل کر دیا تو یاد رکھنا تم اب اسی طرح مباح الدم سمجھے جاؤ گے جیسا وہ اپنے اسلام لانے سے قبل مباح الدم تھا۔ (مسلم شریف)

دیکھو! یہاں بھی انسان کی کمزور فطرت کس طرح اپنے حریف کا اسلام متہم کر رہی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کے انتقام میں یہ لفظی اسلام حائل نہ ہونے پائے مگر یہ اسلام ہے جو اپنے ہمنواؤں کے سینکڑوں بازو حریفوں کی ایک زبان پر نثار کر رہا ہے۔ انتقام گو فطری حق سہی مگر اسلام اس نازک ماحول میں یہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ ایک کلمہ حق کے احیاء میں وہ اپنے فطری اور ذاتی حق سے بھی دست بردار ہو سکتا ہے۔

احادیث میں کچھ واقعات ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دشمنوں کی جان و مال کا تکفل' ان کی عزت و احترام کا تحفظ کچھ خاص اس کلمہ کے ادا کرنے ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ صرف اقرار وفاداری کی ضرورت ہے خواہ کسی زبان سے ہو اور کسی عمل سے۔

حضرت خالدؓ مسلمانوں کا ایک دستہ لیے ہوئے مصروف جہاد ہیں' دشمن چاہتا تھا کہ اسلام قبول کر لے مگر ناواقفی اور جہالت کی وجہ سے اسلمنا (ہم نے اسلام قبول کیا) کا لفظ نہ کہہ سکا اور اس کے بجائے صبأنا صبأنا کی صدا بلند کرنے لگا (یہ لفظ عربی زبان میں بددین ہونے کے لیے مستعمل ہے) اسی کمزوری فطرت کی وجہ سے یہاں بھی یہ نازک اسلام قبول نہ ہوا اور آخر اسی حالت میں سب کو موت کا جام پی لینا پڑا۔ رحمۃ للعالمین کو جب اطلاع ملی تو انتہا درجہ مضطرب ہوئے اور اسی اضطراب کے عالم میں دونوں ہاتھ اس تصور میں آسمان کی طرف اٹھ گئے کہ مبادا خدائے تعالیٰ کا قہر ان معصوموں کا انتقام لینے کے لیے کھڑا ہو جائے اور میں بھی اس میں شامل سمجھا جاؤں اس لیے فرمایا اے پروردگار! جو غلطی خالد سے سرزد ہوئی میں اس سے بری ہوں۔ (بخاری شریف)

مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ لفظی وجود گو ضعیف تر بلکہ مرادف عدم ہے پھر اسلام نے اس کا کیوں اعتبار کر لیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اقرار سے مراد یہاں وہی اقرار ہے جسے ضمیر کی صحیح آواز کہا جا سکے ورنہ اسے اقرار ہی نہ کہا جائے گا بلکہ وہ انکار کی صرف ایک اقرار نما صورت ہوگی۔ اسلام کے اس لفظی وجود کو فقہاء کی اصطلاح میں اقرار باللسان کہا جاتا ہے۔

اقرار باللسان ✱ فقہاء کو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا رکھنا چاہیے' ایک جماعت رکن کی حیثیت تجویز کرتی ہے اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک نوع کی تصدیق ہی کا نام ہے فرق ہے تو یہ کہ ایک تصدیق قلب سے ہوتی ہے اور اقرار زبان کی تصدیق ہے' اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن اور دوسری شرط قرار دے دی جائے۔ یہ اور بات ہے کہ تصدیق قلبی رکن اصلی ہے یعنی کسی حالت میں یہاں تساہل برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اقرار رکن زائد یعنی بعض صورتوں میں یہاں اغماض و چشم پوشی کر لینا بھی ممکن ہے جیسا کہ اکراہ میں۔

شیخ ابو منصور ماتریدی شیخ ابوالحسن اشعری' اور امام نسفی کا میلان خاطر اقرار کی شرطیت کی طرف ہے' یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ثبوت

اسلام سے قبل ہی احکام اسلام کا نافذ کر دینا تو غیر معقول ہے اور زبانی اقرار کیے بغیر ہمارے پاس اسلام پر کوئی شہادت نہیں اس لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ نفاذِ احکام اسلامیہ کے لیے اقرار باللسان کو شرط کہا جائے۔

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ اگر اس اقرار کا صرف یہ مقصد ہے تو تنہائی کا اقرار کافی نہ ہونا چاہیے بلکہ کم از کم مسلمانوں کے امیر کے سامنے ہونا چاہیے تاکہ اجراء احکام کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ اس امر پر فریقین کا اتفاق ہے کہ مطالبہ کے بعد زبان سے اقرار کرنا بہرکیف ضروری ہے کیونکہ اب اقرار نہ کرنے کے معنی گویا انکار کرنا ہیں، یہ کفر جحود کہلاتا ہے۔

وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ. (نمل: ۱۴) اور انکار کیا ان (آیات) کا حالانکہ اپنے دل میں اس کا یقین کر چکے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کبھی دل اندر سے یقین کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے مگر زبان پھر بھی انکار سے باز نہیں آتی، اس کا نام اصطلاح میں کفر عناد ہے۔ حضرت استاذ قدس سرہ فرماتے تھے کہ ہمارے فقہاء نے ایمان کی تعریف میں اسی لیے اقرار کا اضافہ کر دیا ہے کہ جو تصدیق قلبی زبانی انکار کے ساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہ رہے اور یہ سمجھا ہے کہ جب زبان کے لیے اقرار کرنا لازم ہو جائے گا تو اب انکار کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس کو دوسری طرح ادا کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب تک اقرار نہ ہو، ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے قلب میں حقیقۃً تصدیق موجود ہے، لہٰذا اگر ایک شخص مطالبہ کے بعد بھی اقرار نہیں کرتا تو ہم اسی پر محمول کریں گے کہ اس کو تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اقرار باللسان ایمان کا جزء قرار دیا جائے۔[1]

ہم کہتے ہیں کہ اگر اقرار کرنا اسی مقصد کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے جو حضرت استاذ مرحوم کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر رکنیت اور شرطیت کا اختلاف بہت بڑھانا نہ چاہیے۔ بلکہ اب مناسب یہ ہے کہ اختلاف کی تنقیح یوں کر دی جائے کہ اقرار کرنا بالاتفاق ضروری ہے مگر ایک فریق نے اس کی اہمیت زیادہ محسوس کر کے رکنیت کا لفظ کہہ دیا ہے اور دوسری جماعت نے گو اہمیت کو تسلیم کیا ہے مگر رکنیت کا لفظ نہیں کہا، پھر اگر پہلے فریق نے رکن کہا ہے تو لفظ زائد کہہ کر اسے ذرا پھیکا بھی کر دیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ یہاں ایک اور مفید تحقیق فرما گئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقرار کے دو معنی آتے ہیں۔ (۱) زبان سے تصدیق کرنا (۲) التزام طاعت اور عہد عمل و فرمان برداری، آیت ذیل میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔[2]

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا. (آل عمران: ۸۱)

اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاءؑ سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم، پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے کہ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا، وہ بولے ہم نے اقرار کیا۔

اس آیت میں اقرار کا لفظ عہد عمل اور التزام طاعت ہی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے کیونکہ یہاں انبیاءؑ سے کسی امر کی صرف تصدیق مطلوب نہیں بلکہ اس کا عہد لیا جا رہا ہے کہ جو رسول تمہارے پاس آئے گا تمہیں اس کی اطاعت کرنا ہوگی اس پر ایمان لانا ہوگا، اس کی نصرت

---

[1] کتاب الایمان ص ۸۸۔ [2] ایضاً ص ۱۶۱۔

کرنی پڑے گی' التزام طاعت کا بھی یہی مفہوم ہے اب اگر اقرار سے یہ معنی مراد لیے جائیں تو ایمان کی تعریف میں صرف اقرار کی قید کافی ہوگی' ورنہ التزام طاعت کے تیسرے رکن کا اور اضافہ کرنا ضروری ہوگا - مزید تفصیل آئندہ آرہی ہے-

ایمان کا وجودِ ذہنی ٭ تصدیق قلبی کو ایمان کا وجودِ ذہنی کہا جاتا ہے یہ تصدیق مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے: (۱) کبھی دلائل و براہین کا قاہرانہ تسلط یقین کرنے کے لیے مجبور کر دیتا ہے- (۲) کبھی انسان از خود دلائل و براہین کا دروازہ جھانک کر علم یقین تک رسائی حاصل کر لیتا ہے- (۳) کبھی بلا وسائل و اسباب بداھۃً یقین میسر آ جاتا ہے- (۴) کبھی نہ دلائل کا شعور ہوتا ہے نہ اور کوئی فطری احساس صرف تقلیدی طور پر ایک اذعان پیدا ہو جاتا ہے- (۵) کبھی شمشیر کی جھنکار حجابِ غفلت اٹھا دیتی ہے اور صداقت اسلام کا عکس پڑنے لگتا ہے (۶) کبھی جان و آبرو کی حفاظت کی طمع قلب کو تصدیق کرنے کے لیے ابھار دیتی ہے-

ان سب صورتوں میں گو اختیاری یا اضطری طور پر تصدیق تو حاصل ہو جاتی ہے مگر ایمان کا وجودِ ذہنی اس وقت تک پھر بھی نہیں ہوتا جب تک کہ قلب اقرارِ وفاداری اور عہد فرمان برداری نہ کرے اسی کا نام انقیادِ باطن ہے یہ علم نہیں ایک عمل قلب ہے اور اختیاری ہے اسی لئے اس پر جزاء و سزا مرتب ہے' اسی کو عقد قلبی سے تعبیر کیا گیا ہے- فقہاء کی عبارات میں ضروری ہے کہ تصدیق سے اسی خاص نوع کا ارادہ کیا جائے یا اقرار سے مراد التزام طاعت لیا جائے ورنہ تصدیق و اقرار کے دو لفظ مل کر بھی ایمان کا پورا مفہوم شرعی ادا کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں- حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب الایمان میں اس جزء پر بہت زور دیا ہے- عام طور پر یہاں اعتراضات تو سینوں میں کھٹک رہے ہیں اور بہت سے قلم جواب کے لیے جنبش کرتے نظر آتے ہیں مگر تشفی بخش جواب صرف حافظ ابن تیمیہؒ کا ہے-

انسان ایک ضعیف مخلوق ہے مگر کبھی ایسی جسارت کر لیتا ہے کہ تصدیق اس کو حاصل ہوتی ہے مگر اقرار پھر نہیں کرتا اور کبھی اس سے بڑھ کر یہ غضب ڈھاتا ہے کہ دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار بھی کر لیتا ہے مگر اس کو اپنا عقیدہ بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا -

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرَهٗ. (عبس:۱۷) انسان مارا جائے کس قدر ناشکر ہے-

ہرقل جیسے عالم کتاب کی تصدیق کا حال اس کے اور ابوسفیان کے مکالمہ سے ظاہر ہے اہل کتاب کی عام طور پر معرفت کا تذکرہ قرآن کریم نے بڑے وزنی الفاظ میں کیا ہے-

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ .(البقرۃ:۱۷) اس رسول کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو-

مگر باایں ہمہ ان کے کفر میں کسی کو مجال شبہ نہیں ہے ابوطالب کی داستان جاں نثاری سے کتب سیر کے صفحات مملو نظر آتے ہیں مگر یہاں بھی جمہور محققین ان کے کفر ہی کی طرف جا رہے ہیں -[۱]

---

[۱] بعض اہل نظر کا یہ خیال ہے کہ جو بے نظیر جاں نثاری جناب ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ظاہر فرمائی تھی وہ یقیناً کبھی خالی جا نہیں سکتی اس لیے ان کا رجحان ان کے اسلام کی طرف ہے قائل کے ان جذباتِ محبت کا ہمیں بہت احترام ہے مگر جن کے احترام کی خاطر یہ سارا احترام ہے کیا کیجئے کہ خود ان سے اس زبردست دعویٰ کی کوئی صحیح سند نہیں ملتی - اعلانِ حق کی ذمہ داری اس موقعہ پر کچھ بسط کی متقاضی ہے- مگر محل کی نزاکت خاموشی سے گذر جانا چاہتی ہے- اس گویائی اور خاموشی کے مابین جو کچھ ایک مصنف کا متحیر قلم لکھ سکتا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ رب العزت کی بلند بارگاہ ہے جہاں کسی کی عداوت و جاں نثاری دونوں سے بے نیازی حاصل ہے-

زمانہ جاہلیت میں عمر فاروقؓ کی شمشیر ایک بدترین ارادہ کے لیے بے نیام ہوتی ہے مگر شانِ بے نیازی ان پر سعادت کا دروازہ کھول دیتی ہے- ادھر جناب ابوطالب کی جاں نثاری دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے مگر شانِ استغناء التفات تک نہیں کرتی اور یہ کہہ کر دروازہ بند کر دیتی ہے کہ **جف القلم بما هو كائن. فريق في الجنة و فريق في السعير.** ﷺ .....

ان سب امور سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تک تصدیق کے ساتھ التزام طاعت اور انقیادِ قلبی نہ ہو ایمان حاصل نہیں ہوتا - ہرقل اور اس جیسے اور اہل کتاب نے تصدیق ضرور کی اور اقرار بھی کیا مگر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنا قدیم مذہب ترک کر کے دین محمدی میں قدم رکھا؟ جناب ابو طالب نے جاں نثاری کا جونقشہ پیش کیا بلاشبہ وہ رہتی دنیا تک تاریخ صفحات کی زینت رہے گا - مگر کیا ایک مرتبہ بھی اس کلمہ کے لیے ان کی زبان متحرک ہوئی جس کے لیے دیر سے رسول خداؐ اصرار فرمارہے تھے -

انقیادِ باطن' التزام طاعت' عہد و فاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتا ہے ایمان کے وجودِ ذہنی کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسا صفت نفس بن جائے کہ پھر قلب اس کے سامنے سرتسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جائے' اسی کا نام ہم نے عمل قلب رکھا ہے - بعض ضعیف الاسناد روایات میں ایمان کی تعریف میں ''عقد بالقلب'' کا لفظ وارد ہے - اسی طرح عباراتِ سلف میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے' ہمارے نزدیک اس کی مراد بھی یہی عمل قلب ہے -

خلاصہ یہ کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ انقیادِ قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا جزءاہم ہے اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد و فاداری نہیں کرتا وہ مؤمن نہیں کہلا سکتا اور اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں تو بھی وہ مؤمن نہیں ہے ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو - گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے -

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں -[1] کہ قرآن و حدیث کے جو الفاظ خود شارع علیہ السلام کے بیان اور موارد استعمالات سے کسی معنی کے لیے متعین ہو چکے ہیں بس وہی اس کے صحیح معنی ہوں گے لغت میں عموم یا خصوص اس کے معنی پر کچھ اثر انداز نہ ہوگا - ایک متکلم جب اپنے بار بار کے استعمال سے ایک لفظ کے معنی خود متعین کر دیتا ہے تو پھر کسی کو حق نہیں رہتا کہ لغت کی استعانت یا دیگر شواہد سے اس کے کلام میں کوئی دوسرے معنی مراد لے - مثلاً یہی ایمان کا لفظ لے لیجئے لغت میں گو یہ لفظ تصدیق کے لیے موضوع ہے مگر شارع علیہ السلام نے اس لفظ کو جب استعمال کیا ہے تو ایک خاص نوع کی تصدیق کے لیے ہی استعمال کیا ہے اس لیے اب احادیث میں اس لفظ سے وہی تصدیق مراد لی جائے گی جو اس کے مکرر سہ کرر بیانات سے متعین ہو چکی ہے - فرض کرو ایک شخص دربارِ نبوت میں حاضر ہوتا ہے اور تصدیق کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں نہ آپؐ کے احکام بجالاؤں گا نہ جس چیز سے آپ منع فرمائیں گے باز رہوں گا نہ فرائض خمسہ ادا کروں گا ہاں شراب

لہ..... کتب احادیث کے مطالعہ کرنے والوں سے حیرت ہے کہ بعینہ یہ سوال جب حضرت رسالتؐ سے بہت پہلے کیا جا چکا ہے اور اس کا جواب بھی خود زبان فیض ترجمان سے صادر ہو چکا ہے تو پھر اس کے بعد بھی قیاس آرائی کا کیا کوئی موقعہ باقی رہ جاتا ہے؟

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے اپنے چچا کو کیا نفع پہنچایا وہ آپ کے لیے ہمیشہ سربکف رہا کرتے تھے؟ آپ نے جواب دیا کہ میری وجہ سے ہی ان کے عذاب میں اتنی تخفیف کر دی گئی ہے کہ صرف آگ کے دو جوتے ان کو پہنا دیئے گئے ہیں جن کی تیزی سے ان کا دماغ کھول رہا ہے اگر میں نہ ہوتا تو جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں ہوتے -

یہ بحث ابھی نہیں ہے کہ یہ جاں نثاری رسول خداؐ کے لیے تھی یا ایک عم کی اپنے ابن عم کے لیے - انصار کی محبت اس لیے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی ایمان کی علامت ہے اور اسی حیثیت سے ان سے بغض نفاق کی نشانی ہے مگر یہ حیثیت اگر ملحوظ نہ رہے تو نہ وہ ایمان کی علامت ہے اور نہ یہ نفاق کی -

[1] کتاب الایمان ص ۱۱۴ و ۱۱۴ -

پیوں گا' چوری' زنا' نکاح محارم کروں گا- غرض جو ناکردنی ہے وہ سب کچھ کروں گا کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ محض لغوی تصدیق کے بعد رسول خدا اس کے لیے ایمان کا پروانہ تحریر فرما دیں گے' اس کی شفاعت کا وعدہ فرما لیں گے' جہنم سے نجات ابدی کی بشارت سنا دیں گے یا یہی جواب دیں گے کہ تو صرف کافر نہیں بلکہ بدترین کافر ہے- تیرا یہ ایمان' ایمان نہیں استہزاء ہے' یہ تصدیق نہیں بلکہ تکذیب کا بدترین مظاہرہ ہے اور اگر یہ بھی ایمان ہے تو پھر ابلیس کے ایمان میں کیا کسر تھی جس نے صرف ایک ہی سجدہ کا تو انکار کیا تھا پھر قرآن نے کیوں اس کو کافروں میں شمار کرلیا- ﴿استکبر و کان من الکافرین﴾ (ص:۷۴)

حضرت استاذ فرماتے تھے کہ ایمان کا ترجمہ جاننا یا یقین کرنا' یا تصدیق کرنا اچھا نہیں ہے- ان تراجم سے ایمان کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوتی بلکہ صحیح ترجمہ ''ماننا'' ہے جس سے التزام طاعت کا مفہوم بھی ادا ہو جاتا ہے- شاعر کہتا ہے-

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں کہنا نہیں مانتے کسی کا

اُردو داں حضرات کو حضرت استاد کا ایک یہ ترجمہ ہماری اس ساری تفصیل سے بے نیاز کر سکتا ہے- یہ ہے ایمان کا وجود ذہنی' یہی ایمان کا جزء اشرف ہے' نجات ابدی اسی پر دائر ہے اور آخرت کی ساری خوشیاں اسی کی ثمرات و برکات ہیں-

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ تصدیق و معرفت حاصل ہونے کے بعد انکار وجحود کیسے ممکن ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک انسان تکمیل انسانیت سے پہلے انسان نہیں بنتا وہ ہمیشہ خصائل بہیمیہ کا محکوم بنا رہتا ہے اس کے علوم و معارف میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے فطری و خلقی جذبات کو شکست دے سکے- وہ جانتا ہے کہ اس کی راحت ابدی صرف ایک انبیاء کی اطاعت میں منحصر ہے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایمان لانا بہت سے لذائذ و مرغوبات کا ترک کر دینا اور بہت سے مکروہات میں اپنی جان کو مبتلا کر دینا ہے اس لیے قید ایمان کی لذت سے یہ نا آشنا اپنے ہاتھوں سے اپنے بازوئے آزادی کترتے ہوئے کبھی اتراتا اور کبھی کتراتا ہے- ابلیس کے علم و تصدیق کا حال تو مشہور ہی ہے- فرعون کی تصدیق کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی سن لو-

لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا رب السموات و الارض بصائر. (بنی اسرائیل:۱۰۲) آپ جان چکے ہیں کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان و زمین کے مالک نے سمجھانے کے واسطے-

معلوم ہوا کہ فرعون جیسا شقی بھی نزول آیات کے منشاء کا صحیح علم رکھتا تھا مگر اس کے بعد بھی جو کفر اس نے کیا ہے کیا دنیا میں ضرب المثل نہیں؟ کیا اس کی وجہ بے علمی تھی یا سارے جہان پر اس کا علو و برتری کا جنون-

ان فرعون علا فی الارض و جعل اھلھا شیعا. (قصص:۴) فرعون ملک میں بڑائی کر رہا تھا اور وہاں کے لوگوں کو پارٹیاں بنا رکھا تھا-

اذھب الی فرعون انہ طغی. (النازعات:۱۷) فرعون کی طرف جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے-

اکثر کفار اسی طغیان کے شکار تھے اور یہی وجہ ہے کہ جو کچھ اس انہوں نے نبی وقت کے بالمقابل کبھی کی ہے اس میں ایک حرف بھی ایسا پیش نہیں کیا جس کو ایک صحیح الدماغ انسان ایک منٹ کے لیے نبوت میں قادح سمجھ سکتا ہو- صرف اپنے حسد و بغض کا مظاہرہ کیا ہے اور بس معلوم ہوا کہ اپنی جگہ ان کی نبوتوں میں کفار کو بھی شبہ نہ تھا ورنہ کبھی ایک دلیل تو ایسی بیان کرتے جو ان کی کفر یا تردد کی کچھ تو پردہ پوشی کر لیتی- آیات ذیل کا بغور ملاحظہ کرو اور فیصلہ کرو- حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کہتی ہے-

انؤمن لک و اتبعک الارذلون. (الشعراء:۱۱۱) کیا ہم تیری فرمان برداری کریں حالانکہ تیری پیروی تو ذلیل لوگوں نے کی ہے-

کیا اتباعِ اراذلین بھی صدقِ نبی کے منافی ہے یا کذبِ نبی کی کوئی دلیل بن سکتی ہے ہرگز نہیں۔ بات یہ تھی کہ متکبر اور مغرور انسان کبھی یہ پسند نہیں کرسکتا کہ ایک کمزور اور ذلیل انسان کو اپنے برابر یا اپنے نفس کو اس کے پہلو بہ پہلو دیکھ سکے اور یہ وہ خوب جانتا ہے کہ اسلام اس کے اس فاسد جذبہ کو ہرگز پورا نہیں کرسکتا۔ وہ اس فرق کو اٹھا دینے کے لیے آیا ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ مشرکین عرب نے بھی سرورِ کائنات ؐ کے سامنے یہ درخواست پیش کی کہ سعد بن ابی وقاص' ابن مسعود' خباب بن الارت' عمار بن یاسر' بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان جیسے اور غرباء کو اپنے محفل سے نکال دیجئے تاکہ ہمارے آنے جانے کی جگہ ہو جائے۔ اس پر قرآن کریم نے جو جواب دیا وہ یہ تھا:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدَاوۃِ وَ الْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ مَا عَلَیْکَ مِنْ حِسَابِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ وَّ مَا مِنْ حِسَابِکَ عَلَیْھِمْ مِّنْ شَیْءٍ فَتَطْرُدَھُمْ فَتَکُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ وَ کَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْٓا اَھٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنْۢ بَیْنِنَا اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰکِرِیْنَ. (الانعام: ۵۲-۵۳)

اور مت دور کیجئے ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام' چاہتے ہیں اس کی رضا آپ پر' ان کے حساب میں کچھ نہیں ہے اور نہ آپ کے حساب میں سے ان پر کچھ ہے کہ آپ ان کو دور کرنے لگیں تو بے انصافوں میں ہو جائیں اور اسی طرح ہم نے آزمایا ہے بعضے لوگوں کو بعضوں سے' تاکہ کہیں' کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا ہم سب میں۔ کیا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو خوب جاننے والا نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا مغرورانہ جواب۔

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا وَ قَوْمُھُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ. (المومنون: ۴۷)

کیا ہم ایمان لائیں ایسے دو آدمیوں پر جو ہم جیسے ہیں' اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہے۔

اَلَمْ نُرَبِّکَ فِیْنَا وَلِیْدًا وَّ لَبِثْتَ فِیْنَا مِنْ عُمُرِکَ سِنِیْنَ. وَ فَعَلْتَ فَعْلَتَکَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ.

کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس......الخ۔ (شعراء: ۱۸-۱۹)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی متمردانہ تقریر۔

اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا. (ھود: ۸۷)

کیا تجھے تیری نماز اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان بتوں کی عبادت ترک کر دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادے کیا کرتے تھے یا اپنے مال میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

مشرکین عرب کا ایک لغو اعتراض۔

لَوْ لَا نُزِّلَ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ. (زخرف: ۳۱)

یہ قرآن ان دو بستیوں میں کے کسی بڑے شخص پر کیوں نہیں اتارا گیا۔

ان بیانات کو پڑھ کر کیا آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کفار کو سچ مچ ان انبیاء کے متعلق کوئی شبہ درپیش تھا کیا ان بیانات میں ان کے صدق وکذب پر کوئی بحث ہے یا محض اپنے حسد وبغض کی ترجمانی ہے۔

مشرکین عرب کا ایک بے معنی عذر۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْھُدٰی مَعَکَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا. (قصص: ۵۷)

اگر ہم راہ پر آجائیں تیرے ساتھ تو اُچک لیے جائیں اپنے ملک سے۔

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ

ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر پایا اور اب ہم انہی کے مقتدی

مُّقْتَدُوْنَ. (زخرف : ۲۳) رہیں گے۔

کیا یہ ہیں وہ دلائل جو کسی رسول کی صداقت میں قادح ہو سکتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ یہ سب کچھ لکھ کر فرماتے ہیں کہ جناب ابو طالب کی محرومی کا باعث ان باتوں میں سے کوئی بات نہ تھی وہ تو بدل و جان آپؐ کے لائے ہوئے دین کی برتری کے لیے ہمیشہ ساعی رہے مگر تقدیر یہاں دوسرے راستہ سے آئی یعنی آبائی دین کے ترک پر قریش کا طعنہ ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ تصدیق موجود ہے، معرفت تامہ حاصل ہے، قدم قدم پر جاں نثاری ہو رہی ہے[1] یہ سب کچھ ہے مگر التزام طاعت کا ابھی ارادہ نہیں ہے۔ کیوں؟ تقدیر عصبیت جاہلیت اور قومی غیرت اور مذہبی جمود کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور آغوش اسلام میں آنے نہیں دیتی۔[2]

ان سب امور کے سوا ذلیل طبع افراد کے سامنے کبھی معمولی سے نفع وضرر کا سوال بھی آ جاتا ہے اس لیے مقتضاء تصدیق پورا نہیں ہوتا۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَا اَسَرُّوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ. (مائدہ : ۵۴)

آپ دیکھئے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے ان میں دوڑ کر ملتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر زمانہ کی گردش نہ آ جائے، سو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی فتح ظاہر فرما دے یا کوئی حکم اپنے پاس سے بھیجے تو اپنے دل کی (ان) پوشیدہ باتوں پر پچتانے لگیں۔

ان تمام تفاصیل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ بسا اوقات تصدیق قلبی میسر آ جاتی ہے مگر انسان کی طبعی غیرت یا قومی عصبیت ونخوت یا عزت و مال کی تھوڑی سی طمع اور اسی قسم کے دوسرے موانع باطنی انقیاد اور التزام طاعت سے مانع رہتے ہیں نعوذ باللّٰہ من شر الشیطان و شرکہ۔

ایمان اور ضروریات دین ٭ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ اس تصدیق و انقیاد کا دائرہ صرف ذات وصفات کے مسائل یا رسالت کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ رسول کے ہر ہر قول اور ایک ایک اشارہ کو شامل ہے، ارشاد باری ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً. (البقرۃ:۲۰۸) اے ایمان والو! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے۔

حضرت مجاہدؒ اور قتادہؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت مسلمانوں کو شریعت کے ہر ہر جزء پر التزام طاعت کی دعوت دیتی ہے، خواہ وہ فرائض ہوں یا مستحبات، واجب علی الکفایہ ہوں یا علی الاعیان۔ اگر اسلام کے فرائض علی الاعیان ہیں تو اعتقاد فرضیت کے ساتھ ہر ہر شخص پر اس کا ادا کرنا بھی فرض ہو گا اور اگر واجب علی الکفایہ ہیں تو اس کے وجوب کا اعتقاد ضروری ہو گا اور اگر مستحبات ہیں تو اس کے استحباب کا اعتقاد لازم ہو گا۔ غرض کہ جس چیز کا دین محمدی میں داخل ہونا بداہۃً معلوم ہو چکا ہے وہ سب ایمانیات میں داخل ہیں اور کیوں نہ ہوں کیا ایمان رسولؐ خدا کی مطلقاً فرمان برداری کا نام نہیں؟ کیا التزام طاعت میں بھی کوئی تفصیل ہے؟ اگر رسول کا فرمان اس لیے واجب العمل ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کا پیغمبر ہے جو کہتا ہے وہ حق ہی کہتا ہے تو پھر انقیاد وتسلیم کا دائرہ اس کے سب اوامر ونواہی پر کیوں محیط نہ ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمانہ رسالت میں چونکہ وسائط نہ تھے، ہر بات براہ راست سنی جاتی اور دریافت کی جاتی تھی اور اگر وسائط تھے بھی تب بھی اس کی تحقیق بالا واسطہ ممکن تھی اس لیے التزام طاعت بالا استثناء لازم تھا لیکن بعد میں سند کا طویل سلسلہ حائل ہو گیا۔ جرح وتعدیل کے بے شمار مباحث نے احادیث میں ضعیف وقوی کی تقسیم پیدا کر دی اس لیے اب یہ بحث قائم ہوئی کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور کیا چیزیں ایمانیات میں داخل نہیں۔ جواب اب بھی وہی ہے، یعنی جو فرمان رسول ہے اس سب کا ماننا فرض ہے مگر اب اس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ بات درحقیقت

[1] کتاب الایمان ص ۷۷۔ [2] ایضاً ص ۱۰۶۔

رسول خدا کی فرمودہ بھی ہے؟ اس لیے علماء نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جس چیز کا دین محمدی میں ہونا اتنا روشن ہو جائے کہ محتاج دلیل نہ رہے ان سب کا ماننا ایمان کے لیے ضروری ہے۔ اسی کو ضروریات دین کہا جاتا ہے۔ مثلاً فرائض خمسہ' زکوۃ' حج' روزہ' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا۔ آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ ہونا' عذاب قبر' قیامت' قرآن کریم وغیرہ یہ سب وہ چیزیں ہیں جس کے ثبوت میں دلائل کی حاجت نہیں بلکہ کفار بھی ان چیزوں کا دین میں داخل ہونا جانتے پہچانتے ہیں اس لیے اس کا انکار اسی طرح کفر ہوگا جیسا کہ توحید یا رسالت کا۔

ایمان اور غائبات سے اس کی خصوصیت ٭ چونکہ علماء نے ایمان کی تعریف میں عموماً تصدیق کا ہی لفظ ذکر کیا ہے اس لیے عام طور پر ایک غلط فہمی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ ایمان گویا تصدیق کے مرادف ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن و سنت میں جہاں جہاں یہ لفظ مستعمل تھا اس کی تشریح کے لیے بس تصدیق کا لفظ کافی سمجھ لیا گیا ہے' حالانکہ ان ہر دو لفظوں میں بہت بڑا فرق ہے اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو ان احادیث و آیات کی اصل مراد ہی ہاتھ نہیں آ سکتی۔ حافظ ابن تیمیہ کا خدا بھلا کرے جنہوں نے اس ضروری فرق کو بیان فرما کر ان بے شمار آیات و احادیث کے معانی سے حجاب غفلت اُٹھا دیا ہے اور ان کی صحیح مرادیں ہمارے سامنے واضح کر دی ہیں۔ ضروری ہے کہ پورے اعتناء کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے اس لیے امانت و اعتماد کے معنی اس میں ہمیشہ ملحوظ رہتے ہیں۔ لفظ تصدیق کے مادہ میں چونکہ یہ خصوصیت نہیں ہے اس لیے ہر خبر میں خواہ وہاں مخبر کی امانت داری کی ضرورت ہو یا نہ ہو تصدیق کا لفظ یکساں مستعمل ہو سکتا ہے' ایمان کے معنی بھی گو تصدیق کے ہیں مگر اس کا استعمال صرف ان خبروں تک محدود رہے گا جو اپنی چشم دید نہ ہوں بلکہ عدم موجودگی کی ہوں کیونکہ یہاں اگر تصدیق کی جائے گی تو وہ صرف مخبر کی امانت و دیانت' اس کے اعتماد و وثوق کی بنا پر کی جائے گی۔ اسی لیے اگر ایک شخص طلوع آفتاب یا فوقیت آسمان کی خبر دیتا ہے تو اس کے جواب میں "آمنت" نہیں کہہ سکتے' یا دو شخص اگر ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو لغتاً ایک دوسرے کی تصدیق کے لیے "صدق احدھما صاحبہ" کہا جاتا ہے "امن لہ" نہیں کہا جا سکتا' اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں تصدیق کے لیے دوسرے پر اعتماد و وثوق کی کیا ضرورت ہے یہ خود اپنے مشاہدہ کی خبر ہے۔ اس لیے یہاں ایمان کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں۔

اسی لیے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے واپس آ کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں جب اپنے بھائی کے قتل کا غلط افسانہ عرض کیا تو "و ما انت بمومن لنا" کہا "و ما أنت بمصدق لنا" نہیں کہا۔ چونکہ یہ واقعہ بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کی عدم موجودگی میں تیار کیا گیا تھا' اس لیے اگر وہ اس کی تصدیق کر سکتے تو صرف ان کے اعتماد و وثوق کی بنا پر کر سکتے تھے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر چونکہ ان کو اعتماد نہیں تھا اس لیے اس بے اطمینانی و بے اعتمادی کے موقعہ پر "و ما انت بمومن لنا" سے زیادہ خوب صورت لفظ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو ہمارے بیان کی تصدیق ہوتو کیونکر خود آپ تشریف فرما نہ تھے اور ہم پر آپ کو اطمینان و اعتماد نہیں' لیکن بات یہ ہے کہ ہیں ہم سچے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں حضرت لوط علیہ السلام کی تصدیق کو قرآن کریم نے اسی لفظ ایمان سے ادا کیا ہے کیونکہ انہوں نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کی تصدیق صرف ان کے اعتماد پر کی تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "فامن لہ لوط" یہاں بھی "فصدق لہ لوط" نہیں فرمایا۔

غائبات اور ایمان کی اسی خصوصیت کو سورۂ بقرہ میں "یؤمنون بالغیب" کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے یہاں غیب کا لفظ صرف بطور بیان واقع نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ہے کہ ایمان کا تعلق صرف غائبات کے ساتھ ہے۔ مشاہدات کے ساتھ ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اگر یہ حقیقت پورے طور پر سمجھ لی جاتی تو اخبار غائبہ میں بحث وتمحیص کا ایک مرحلہ بڑی حد تک ختم ہو جاتا - ناواقف صاحبان ابھی تک یہ نہیں سمجھے کہ ایمان کا تعلق ہے تو کس چیز سے ہے - وہ چاہتے ہیں کہ دین کے جملہ غائبات پہلے اس طرح معقول بنائے جائیں کہ پھر ان کی تصدیق کے لیے اعتماد رسول کا واسطہ ہی نہ رہے اور یہ نہیں جانتے کہ دلائل کی بحث سے گذر کر صرف رسول کے اعتماد پر اس کے اقوال و افعال کے تسلیم کر لینے کا نام ہی تو ایمان ہے - اسی تسلیم و رضا میں انسانی عقول کی آزمائش ہے - پختہ کار جانتا ہے کہ ایک صادق القول پر اعتماد کرنے سے بڑھ کر کوئی اور دلیل اطمینان بخش نہیں ہو سکتی مگر ایک خام کار اپنی نارسائی اور بے شعوری کے باوجود دلائل کے بغیر شفاء حاصل نہیں کرتا -

حالانکہ دلائل کا راستہ سرتا سر تردد و شبہ کا راستہ ہے' عقل انسانی اگر غائبات پر ایک طرف کوئی دلیل قائم کر بھی لے تو دوسری عقل اس کے خلاف پر دلائل قائم کرنے سے عاجز نہیں رہ سکتی - یہی وجہ ہے کہ آج تک عقلاء میدان بحث میں کبھی کسی امر پر متفق نظر نہیں آتے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف دلائل کا دروازہ کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں - آئے دن ان کی تحقیقات کی دنیا بدلتی رہتی ہے - اس پر طرہ یہ کہ اس ایک عالم جہالت سے دوسرے عالم جہالت کی طرف منتقل ہونے کا نام (ریسرچ) اور تحقیق رکھ لیا جاتا ہے کاش کہ صاحب وحی کی ریسرچ پر اعتماد و وثوق کر لیتے تو یہ عمر عزیز ساحل کی تلاش میں یوں مفت برباد نہ ہوتی حقیقت کا راستہ شریعت نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے - اب جو کام ہمارا رہ جاتا ہے وہ اس پر چل کر منزل مقصود کو پہنچ جانا ہے اور بس -

ایمان بالغیب کا راستہ بس یہی ایک راستہ ہے جس میں روح کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے - اس کے ماسوا جس قدر راہیں ہیں وہ تذبذب کی راہیں ہیں' تردد کی راہیں ہیں نہ روح کے لیے ان میں کچھ تسلی ہے نہ نفس کو کچھ تشفی -

انّ ھذا صراطی مُسْتَقِیمًا فاتّبِعُوْہُ و لا تتّبِعُوا السُّبُل فتفرّق بکُمْ عَنْ سبِیْلہٖ. (الانعام : ۱۵۳) | یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس پر چلو' دوسرے اور منحرف راستوں پر مت چلو کہ وہ تمہیں اس بڑی شاہراہ سے جدا کر دیں گے -

مذکورہ بالا بیان کا مقصد غور و فکر کی راہ بند کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اس کا ایک دائرہ بتلانا ہے اس کا نام عقل کا تعطل نہیں بلکہ طریق استعمال کی صحیح تعلیم ہے' آیات آفاقی و انفسی کا دائرہ کیا کم ہے کہ اسے چھوڑ کر عالم غائبات پر انکل کے تیر چلائے جائیں جو دار العمل ہے اس میں خوب غور کرو اور جو دار الجزاء ہے اسے احکم الحاکمین کے حوالہ کر دو -

عالم غیب اور دلائل ٭ جب تک ایمان کا مقام انقیاد میسر نہیں آتا - آپ کو حجت بازی کا موقعہ رہتا ہے - لیکن جب رسالت کی تصدیق دلیل یا بے دلیل حاصل ہوگئی تو اب انقیاد باطن کا یہ نازک مقام زیادہ دل ترانیوں کا متحمل نہیں رہتا اور آپ کا صرف ایک یہی فرض رہ جاتا ہے کہ رسول کہے اور آپ خاموش سنیں' وہ حکم دے اور آپ مانیں اور کیوں نہ مانیں اگر قلب طوق غلامی پہن چکا ہے تو زبان کو سرتابی کا حق کیا ہے - بقول غالب ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو | نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

رسول کی تصدیق کا بھی دعوی ہے پھر بات بات پر شبہات اور حجت بازی کی خلش بھی جاری ہے کیا بیک وقت یہ دو متضاد باتیں نہیں؟ کیا وثوق اور اعتماد اسی کا نام ہے کہ رسول جو کہتا ہے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ دلائل و براہین سے وہ ہمارا منہ بند نہ کر دے -

و یقُولُوْن امنّا باللّٰہ و بالرَّسُوْلِ و اطعنا ثمّ یتولّی فرِیْقٌ مّنْھُمْ مّنْ بعْد ذٰلک و ما اُولٰئک بالْمُؤْمنِیْن○ و اذا دُعُوْآ الی اللّٰہ و رسُوْلہ لیحْکم | اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو اور رسول کو مانا اور ہم ان کے فرمان بردار بن گئے - اس کے بعد پھر ان میں سے ایک جماعت پھر جاتی ہے' اور وہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں - جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ

بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ○ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَ رَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (نور: ۴۷-۵۱)

اور رسول کی طرف تا کہ ان میں فیصلہ کرے تب ہی ایک فرقہ ان میں منہ موڑ لیتا ہے اگر ان کو کچھ ملتا ہو تو اس کی طرف (فوراً) چلے آئیں قبول کر کے کیا ان کے دلوں میں (کوئی) روگ ہے یا دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں یا ڈرتے ہیں کہ ان پر اللہ اور اس کا رسول بے انصافی کرے گا۔ کچھ نہیں وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب اللہ اور رسول کی طرف ان میں فیصلہ کے لیے بلائے جائیں تو کہیں ہم نے سنا اور حکم مان لیا اور کامیاب یہی لوگ ہیں۔

اشاعرہ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ تصریح فرماتے ہیں کہ ایمان اسی بے دلیل انقیاد و اطاعت کا نام ہے۔ (اتحاف ج ۲ ص ۲۴۰)

اب آپ یہ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ ایمان کا وجود ذہنی یا شرعی تصدیق کوئی معمولی تصور نہیں ہے جس کی حیثیت صرف ایک خواب و خیال کی سی ہو بلکہ قلب انسانی پر یہ وہ نقش ہے جو ایک لمحہ میں آبائی عقائد کے سب نقوش محو کر دیتا ہے۔ زمانہ جاہلیت کے مفاخر آنکھوں میں معائب نظر آنے لگتے ہیں حتیٰ کہ طعام و شراب، وضع و قطع، رفتار و گفتار سب میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو جاتی ہے بلکہ سمع و بصر، ذوق و شم یعنی حواس خمسہ کی دنیا کی دنیا منقلب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو نغمہ پہلے دلکش تھا جو صورت پہلے دل فریب تھی، جو کھانا لذیذ معلوم ہوتا تھا، جو خوشبو بھلی لگا کرتی تھی، اب اسی نغمہ میں وہ دلکشی، اسی صورت میں وہ دلبری، اسی کھانے میں وہ لذت، اسی خوشبو میں وہ کشش باقی نہیں رہتی مدتوں کی صحبت سے طبیعت اگر کبھی مچلتی بھی ہے تو دل اندر ہی اندر سمجھانے لگتا ہے اور آخر تصدیق قلبی کی مضبوط کڑیاں آئین اسلام سے ادھر ادھر جانے نہیں دیتیں۔ نفس چاہتا ہے کہ قدیم لذائذ کا پھر مزہ لوٹے مگر صفت انقیاد کا ذائقہ انہیں بے مزہ بنائے دیتا ہے۔ اسی لیے ہمارے فقہاء نے کفر کے بعد اسلام کو ایک حیوۃ نو سمجھا ہے اور کفر و اسلام پر بہت سے ایسے احکام متفرع کر دیئے ہیں جو حقیقی موت و حیات پر ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے کفر و اسلام کی معمولی تبدیلی انسان کے آخرت کی تبدیلی بن جاتی ہے اگر کسی کو تمنا ہے کہ وہ عالم نقمت کو عالم نعمت سے اور عالم عذاب کو عالم ثواب سے بدل دے تو اس کو چاہیے کہ آج عالم کفر کو عالم اسلام سے بدل لے۔ قدرت کے اس دست فیاض پر قربان جس نے عالم فانی کی اس ترمیم سے عالم جاودانی کی ترمیم کا وعدہ فرما لیا ہے بلکہ اس ابدی مقام کو اس عارضی ترمیم کا تابع بنا دیا ہے کیا اب بھی آپ سمجھ گئے کہ تصدیق قلبی کسے کہتے ہیں اور ایمان کا وجود ذہنی کیا ہے؟

ایمان کا وجود عینی ٭ ایمان کا لفظی اور ذہنی وجود آپ سن چکے یہ وجود جب اور رسوخ و پختگی اختیار کر لیتا ہے تو پھر یہی ایمان جو اس منزل تک صرف ایک معنی تھا اب رفتہ رفتہ شکل و صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔

ارباب حقائق کے نزدیک تو معانی کا تجسد ثابت شدہ حقیقت ہے اور موجودہ تحقیقات کے مطابق بھی آج وزن جو در حقیقت مادہ کی صفت تھی حرارت کے لیے ثابت ہو چکی ہے بلکہ اس کے وزن کے لیے ایک مقیاس الحرارت بھی تیار کر لیا گیا ہے اور اب با آسانی ہر شخص اپنی حرارت کا وزن کر سکتا ہے۔ اسی طرح آواز کو مدت تک محض ایک معنی تصور کیا گیا تھا جو ہوا میں آتی اور فنا ہو جاتی ہے مگر حال کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالم کی پیدائش سے لے کر آج تک جتنی اصوات اس (فضا) میں نکلیں ہیں وہ سب کی سب محفوظ و موجود ہیں اور ان سے استفادہ کی سعی ہنوز جاری ہے۔ ریڈیو کی محیر العقول ایجاد کی بنیاد یہی جدید اکتشاف ہے۔ یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ تحقیقات عصریہ باوجود اس تمام جد و جہد کے اب تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکیں جہاں ہمارے ارباب حقائق کی نظریں آج سے سینکڑوں سال پیشتر پہنچ چکی تھیں۔ شیخ محی الدین ابن عربیؒ فتوحات مکیہ میں اصوات کے صرف وجود کی تصریح نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ان کی صورتوں کے بھی قائل

28

ہیں اور یہ بھی کسی دلیل سے نہیں بلکہ اپنے چشم دید مشاہدہ سے- دیکھئے کہ سائنس اپنی اس برق رفتاری کے باوجود کب اس مقام تک پہنچتی ہے-

اسی طرح ایمان بھی ابتداءً گو تصدیق قلبی کا نام ہے مگر یہ تصدیق اعمالِ صالحہ کے آبیاری سے نشو ونما پا کر ایک نور کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہی نور ایمان کا وجود عینی کہلاتا ہے- حضرت لقمان کی وصیت میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا اے بیٹے جس طرح کھیتی بلا آبیاری کے سرسبز نہیں ہوسکتی اسی طرح ایمان بلا علم وعمل کے پختہ نہیں ہوسکتا-[1]

امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی اور امام ابُوعبید اور امام اصبہانی نے اپنی اپنی کتابوں میں حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ پہلے ایمان ایک سفید نقطہ کی شکل پر قلب میں نمودار ہوتا ہے اور جتنا ایمان بڑھتا جاتا ہے اسی قدر یہ نقطہ پھیلتا جاتا ہے- یہاں تک کہ جب ایمان مکمل ہو جاتا ہے تو سارا قلب سفید ہو جاتا ہے یہی حال نفاق کا ہے کہ پہلے سیاہ نقطہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور بالآخر تمام قلب سیاہ ہو جاتا ہے- خدا کی قسم اگر تم ایک مؤمن کا قلب نکال کر دیکھو تو بالکل سفید پاؤ گے اور ایک منافق کا قلب دیکھو تو بالکل سیاہ دیکھو گے[2] لیکن معانی کے اس تجسد کے مشاہدہ کے لیے وہی تیز آنکھیں درکار ہیں جن کا ذکر اس آیت میں موجود ہے- فبصرک الیوم حدید-

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جس وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک شق کیا گیا تھا تو ایک سنہری طشت ایمان وحکمت سے لبریز لایا گیا اور اسے آپؐ کے صدرِ مبارک میں لوٹ دیا گیا تھا- عجب نہیں کہ اس سے مراد ایمان کا یہی وجودِ عینی ہو- انبیا کے کمالات اکتساب کا ثمرہ نہیں ہوتے بلکہ قدرت اسی طرح ان کے منازل کمالات خود طے کرا دیتی ہے-

یہ نور تصدیق جس قدر رسوخ پیدا کرتا جاتا ہے اتنا ہی خواہشات نفسانیہ کے حجابات اٹھتے جاتے ہیں اور جیسے جیسے یہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں اسی قدر یہ نور اور منبسط ہوتا جاتا اور پھیلتا جاتا ہے شدہ شدہ یہاں تک پھیل جاتا ہے کہ انسان کے تمام جوارح کا احاطہ کر لیتا ہے اور یہ مؤمن گویا خود ایمان مجسم بن جاتا ہے جسے دیکھ کر بے ساختہ خدا یاد آنے لگتا ہے-

حضرت عبدالرحمٰن بن غنم (بفتح غین وسکون نون) اور اسماء بنت یزید فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے بہتر بندے وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر نظر پڑے تو خدا یاد آجائے-[3]

اس نور کی وسعت کی بقدر اوامر الٰہیہ کے امتثال اور محظوراتِ شرعیہ سے اجتناب کا جذبہ عمل پیدا ہو جاتا ہے- اخلاقِ رذیل زائل ہو جاتے ہیں اور اخلاقِ فاضلہ اس کی جگہ لے لیتے ہیں اور قلب کو وہ وسعت میسر آجاتی ہے کہ سارا عالم اس کے پہلو میں مثل ایک نقطہ کے نظر آنے لگتا ہے- کیوں نہ ہو کہ مؤمن کا یہ وہ قلب ہے جو اس کے پروردگار کی تجلّی گاہ ہے- ارشادِ باری تعالیٰ ملاحظہ فرمایئے-

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ. (الزمر: ۲۲)

بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کے لیے کھول دیا سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے-

پھر دوسری جگہ ارشاد ہے-

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ. (الانعام: ۱۲۵)

جس کسی کی ہدایت کا اللہ ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے-

یہ شرحِ صدر بھی گو ایک معنی ہیں جس کا مطلب صرف اسلام کا فراخدلی سے بلا پس وپیش قبول کر لینا سمجھا جا سکتا ہے مگر اس معنی کا

---

[1] اتحاف ج ۲ ص ۲۳۸- [2] اتحاف ج ۲ ص ۲۵۹- [3] مسند احمد وشعب الایمان مشکوٰۃ شریف باب حفظ اللسان والذیۃ-

بھی ایک وجودِ عینی ہے وہ صرف یہ معنوی فراخی نہیں بلکہ وہ وسعت ہے جو مؤمن کامل اپنے قلب میں حسّاً بھی مشاہدہ کرتا ہے[1] اب حضرت رسالت کے حق میں شرح صدر کا جو مصداق ہوسکتا ہے اس کا خود اندازہ کرلو-قرآن امتنان کے لہجہ میں فرماتا ہے-

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ. (الشرح:۱) کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھول دیا-

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ جب نورِ یقین قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس میں ایک فراخی اور کشادگی نمودار ہو جاتی ہے-صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! اس کی کچھ علامت بیان فرمایئے-ارشاد ہوا اس کی تین علامتیں ہیں:

(۱) آخرت کی طرف میلان- (۲) دنیا سے نفرت اور یکسوئی- (۳) موت سے پیشتر اس کی تیاری-[2]

یہ ہے ایمان کا وجودِ عینی- یہی دعوت انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہے اور اسی پر نجات مطلقہ (یعنی بلا عذاب) اور فلاح ابدی کا مدار ہے-اس ایمان کے بعد مؤمن کے کان ''رضی اللّٰہ عنھم و رضوا عنہ'' کی پرکیف صدا سننے لگتے ہیں-اس مؤمن کو اگر جلا کر خاک بھی کردیا جائے' اس کے جسم و جان کو ریزہ ریزہ کردیا جائے تو بھی اس کے ذرہ ذرہ سے اسی ایمان کی صدا بلند ہوگی- یہ ایمان صرف ذہنی اور عقلی نہیں رہتا بلکہ دیگر محسوسات کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے اس کا نور آنکھیں دیکھتی ہیں-

سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ. (الفتح:۱۱۹) سجدہ کے اثر سے ان کے چہروں پر ان کی علامت (ظاہر) ہے-

قلب اس کی حلاوت اور شیرینی اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے جیسا کہ زبان مٹھائی کی- یہ ایمان فطرتِ انسانی کا ایک مقتضا بن جاتا ہے اور جس طرح فطری خصائل زوال پذیر نہیں ہوتے اسی طرح یہ ایمان بھی زوال کے خطرہ سے بڑی حد تک مامون رہتا ہے-

ہرقل جو بہت بڑا عالم کتاب تھا اسی وجودِ عینی کی طرف اشارہ کرتا ہے اس نے اپنے دورانِ مکالمہ میں ایک سوال ابوسفیان سے یہ بھی کیا تھا کہ اس پر ایمان لاکر کیا کوئی شخص مرتد ہوتا ہے' اس پر ہزار عداوت کے باوجود جو جواب ابوسفیان کی زبان سے نکلا وہ صرف نفی محض میں تھا- یہ سن کر ہرقل نے جو کلمات کہے اس کی علمی گہرائی کا خوب پتہ دیتے ہیں-

و کذٰلک الایمان اذا خالطت بشاشة القلوب. یعنی ایمان ایسی ہی چیز ہے کہ جب اس کی بشاشت اور تراوٹ دلوں میں رچ جاتی ہے تو پھر نکالا نہیں کرتا-

یہ ایمان کے وجودِ عینی ہی کی طرف اشارہ ہے اسی کا نام ایمان کامل ہے اسی کو معرفت بھی کہا جاتا ہے علوم ابتداء میں صرف علوم رہتے ہیں مگر کچھ رسوخ کے بعد قلب میں اپنا ایک رنگ پیدا کردیتے ہیں جس کے بعد قلب میں لطف اندوزی یا انقباض کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اس وقت ان کا نام حال ہوجاتا ہے پھر اگر ترقی کرکے یہ لون اور رسوخ اور پختگی اختیار کرلیتا ہے تو اسی کا نام معرفت بن جاتا ہے اور اسی کو مرتبہ احسان سے تعبیر کرسکتے ہیں یہ علوم کی انتہائی معراج ہے- پھر اس معرفت میں بے نہایت مراتب و مدارج ہیں اور ان ہی مراتب کے لحاظ سے مؤمنین کا تفاضل ہے-

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ. (الحجرات:۱۳) عزت اللہ کے یہاں اسی کو ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہو-

عمل و ایمان کا توازن ❋ ایک ظاہر بیں صرف عمل پر نظر رکھتا ہے اور اسی پر افضلیت و مفضولیت کا فیصلہ کرڈالتا ہے' مگر حقیقت شناس جانتا ہے کہ اصلی روح انقیاد باطن ہے اور عمل اس کا صرف ایک قالب اور ڈھانچا ہے اس لیے اس کی نظر قوت ایمانیہ پر ہوتی ہے اور

---

[1] علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے اس شرح صدر کی تفصیل میں سفر السعادۃ میں مستقل ایک فصل لکھی ہے مراجعت کی جائے-

[2] شعب الایمان للبیہقی-مشکوٰۃ شریف-

یہی اس کا معیار فضیلت رہتا ہے صحیح احادیث میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خواب مذکور ہے کہ گویا کنویں پر ایک ڈول پڑا ہے۔ پہلے میں نے (جب تک خدا نے چاہا) اسے کھینچا میرے بعد پھر اسے ابوبکرؓ نے لے لیا اور ایک دو ڈول نکالے مگر کچھ ضعف کے ساتھ پھر ان سے عمر فاروقؓ نے لیا تو اس قوت سے ڈول کھینچے کہ اونٹ والوں نے اپنے اونٹوں کے پانی پی کر بیٹھنے کی جگہ وہاں تیار کر لی۔ بعض علماء نے یہاں ضعف سے ابوبکرؓ کی مدت خلافت مراد لی ہے اور بلاشبہ یہ مدت بہ نسبت خلافت عمرؓ کے نہایت قلیل تھی مگر کسی نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ جو عملی شدت و شوکت عہد فاروقی میں نظر آئی وہ عہد صدیقی میں ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ شاید اسی خصوصیت کے پیش نظر حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ کے اسلام کے بعد ہم ہمیشہ معزز رہے اور کبھی ذلت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اب اگر تسلیم کر لو کہ عملی قوت کے لحاظ سے عمر فاروقؓ حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ تھے تو یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ قوت ایمانی کے اعتبار سے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ سے کہیں فائق تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثہ انتقال پر عمر فاروقؓ کی بے صبری و اضطراب اور حضرت ابوبکرؓ کا صبر و استقلال تاریخی واقعہ ہے۔ جب قوائے عملیہ جواب دے دیتے ہیں تو ایسے ہی وقت قوت ایمانیہ کا امتحان ہوتا ہے اگر کہیں حضرت صدیق اکبرؓ کی قوت ایمانیہ نے فاروق اعظمؓ کو نہ سنبھالا ہوتا تو معلوم نہیں کہ اس جاں گداز واقعہ نے ان کو کتنا اور مدہوش بنا دیا ہوتا۔ خدا ہی جانے کہ اس ہنگامہ بے صبری میں ابوبکرؓ کی زبانی وہ چند کلمات کیا تھے جن کے بعد جلتے ہوئے سینوں کی آگ بجھ گئی۔ مدہوش عقول کو ہوش آ گیا اور (جو موت کا لفظ سننے پر قادر نہ تھے تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے' اگر ابوبکرؓ کی قوت ایمانیہ اس طرح قلوب کی کایا نہ پلٹ دیتی تو نہیں معلوم واقعات کہاں تک نزاکت اختیار کر لیتے' ایسے نازک دور میں صحابہؓ کی جماعت کی جماعت میں بجلی کی طرح یہ انقلاب پیدا کر دینا صدیق اکبرؓ کی فضیلت کی وہ بروقت دلیل تھی جس کے بعد بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دینا ہر مسلمان کا ایک اضطراری فرض ہو گیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب عمل و ایمان کا توازن عالم میں آشکارا ہو رہا تھا۔

صحیح احادیث میں وارد ہے کہ ساری دنیا گویا ایک دن ہے جس میں امت محمدیہ کا وقت صرف عصر سے غروب تک ہے اور دوسری امتوں کا فجر سے ظہر تک' مگر قدرت کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ مزدوری امت محمدیہ کو دوسری امتوں سے دوگنی ملتی ہے۔ بات وہی ہے کہ مدار قوت عمل پر نہیں بلکہ قوت ایمان پر ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (آل عمران: ۱۱۰)

تم سب امتوں میں اس لیے افضل ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہارا شیوہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم اپنے خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

آیت مذکورہ نے اس بحث کا فیصلہ کر دیا کہ کچھ افراد کا نہیں بلکہ جماعات و امم میں بھی فضیلت کا قانون وہی ایک ہے اس کے بعد اگر انبیاء کی سوانح پر غور کرو تو جو مدت عمل خاتم النبیین کو مرحمت ہوئی وہ صرف چند سال ہیں اور جو زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کو ملا وہ بنص قرآن ہزار سال تھے پھر کون نہیں جانتا کہ فضیلت کا تاج کس کے سر پر ہے۔ الغرض افراد و امم اور انبیاء علیہم السلام میں افضلیت کا ایک ہی قانون ہے یعنی ایمانی روح اور الٰہی معرفت بلکہ جہاں یہ روح نہیں وہاں عمل کی کوئی قیمت نہیں۔

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا. (الکھف: ۱۰۵)

قیامت میں ہم کفار کے اعمال کے لیے کوئی ترازو قائم نہیں کریں گے۔

کیونکہ ترازو وزن کے لیے ہوتی ہے اور کافر کا عمل بے وزن ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوسرے خواب میں دیکھتے ہیں کہ مجھے ساری امت کے بالمقابل تولا گیا تو میرا پلا بھاری رہا پھر اس میں ابوبکرؓ کو رکھا گیا تو اسی طرح ساری امت سے وہ بھاری رہے۔ اس کے بعد پھر عمرؓ کو تولا گیا تو وہ سب سے وزنی رہے۔ یہ وزن نبی

کی اسی قوت ایمانی کا تھا جس کے مقابل ساری امت ہیچ نظر آئی - پھر اسی مناسبت سے ابوبکر و عمر کو قیاس کر لو-
بہر حال احادیث کا بے شمار ذخیرہ اسی طرف رہبری کرتا ہے کہ اصل قیمت انقیاد باطن کی ہے اور پھر اسی کے بقدر عمل کا وزن اور انسان کا فضل ہے-[1]

ایمان اور معرفت ✻ جہم بن صفوان امام اعظم کا ہمعصر صفاتِ باری تعالیٰ کا منکر تھا اور کہتا تھا کہ ایمان صرف معرفت قلبیہ کا نام ہے زبان سے اقرار کرنا کچھ ضروری نہیں بلکہ اس کے نزدیک اگر ایک شخص زبان سے انکار بھی کر گذرے مگر اس کو معرفت قلبی حاصل ہو تو مؤمن کامل رہ سکتا ہے- حافظ ابن تیمیہؒ تصریح فرماتے ہیں-[2] کہ اس مسئلہ میں امام اعظمؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے اور یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ اور مسائل میں بھی اس کے ساتھ آپ کے مناظرے تصانیف میں کھلے طور پر موجود ہیں-[3] مگر اس پر بھی بعض نا منصف قلم حنفیہ کے سر جہمیہ کی تہمت تھوپنے سے باز نہ آئے-

تاریخ میں حنفیہ پر یہ پہلا ظلم نہیں بلکہ وہ اس قسم کے مظالم کے ہمیشہ تختۂ مشق بنے رہے ہیں- اگر ان بے محل انتسابات کے وجوہ و اسباب پر بالتفصیل روشنی ڈالی جائے تو ایک مستقل تصنیف بن سکتی ہے ہمارا مقصد اس وقت صرف یہ ہے کہ اگر تاریخ حنفیہ پر یہ جور و ستم روا رکھتی ہے تو رکھے مگر ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اس کی یہ ناانصافی برابر دہراتے رہیں کان اگر دلچسپی سے نہیں سن سکتے تو نہ سنیں-

کتب کلام کی ورق گردانی کرو گے تو تم کو معلوم ہوگا کہ جہمیہ کے ساتھ حنفیہ کو مرجئہ بھی کہا گیا ہے لیکن اگر ذرا تحقیق سے کام لو گے تو روشن ہو جائے گا کہ حنفیہ کا دامن اس تہمت سے بھی قطعاً پاک و صاف تھا- فروعی اور اجتہادی مسائل میں اگر اختلاف ہو تو ہونا چاہیے مگر غم اس کا ہے کہ دین کے وہ اصولی مسائل جن میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہیے اور نہ درحقیقت کوئی اختلاف تھا پھر عجلت پسند طبائع نے کیوں ان کا ایک غلط افسانہ تیار کر دیا- خدا بھلا کرے حافظ ابن تیمیہؒ کا کہ اپنی کتاب الایمان میں وہ ایک سطر یہ لکھ گئے ہیں-

و مما ینبغی ان یعرف ان اکثر التنازع بین اھل السنة فی ھذہ المسئلة ھو نزاع لفظی. (ص ۱۱۹ و ۸۸)	یعنی یہ بات ضروری طور پر پیش نظر رہنی چاہیے کہ اہل سنت والجماعت میں ایمان کے مسئلہ کے متعلق جتنے بھی اختلافات نظر آتے ہیں درحقیقت وہ صرف نزاع لفظی ہیں-

ایک غریب عالم کی محنت اور جانفشانی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اپنی پرسکون راتوں کو دن بنا بنا کر ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر لیتا ہے اور جب کسی نتیجہ کے لیے اس کا قلب مضطر ہونے لگتا ہے تو کسی مصنف کی ایک سطر اس کے سارے منصوبے یہ کہہ کر خاک میں ملا دیتی ہے. ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اب ملاحظہ فرمائیے کہ حافظ ابن تیمیہؒ ۱۱۹ صفحات میں تحقیقات کے دریا بہا دیتے ہیں اختلافات اور جانبین کے پرزور رد و قدح سے عقل متحیر رہ جاتی ہے وہ چاہتی ہے کہ کوئی راستہ تلاش کرے مگر اختلافات کے اس برق و رعد میں اس کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، اور جب آخر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اکثر حصہ صرف نزاع لفظی تھا تو تھک کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنی اس دردسری کی فریاد کا موقعہ بھی نہیں دیکھتی - خوب کہا ہے کہ علم کیا ہے؟ کوہ کندن و کاہ برآوردن-

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جنگ کچھ نہ تھی تو پھر بیکار یہ قلعے کیوں بنائے گئے - غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ محدثین کو سارا

---

[1] دیکھو کتاب الایمان ص ۱۳۷ و ۱۳۸- [2] ایضاً ص ۱۶۴- [3] دیکھو اتحاف ج ۲ ص ۲۴۲-

غصہ اس پر ہے کہ جو لفظ سلف سے منقول ہوتے چلے آرہے تھے فقہاء نے ان کو کیوں ترک کیا' بالخصوص جب کہ ان کے ترک سے فرق باطل کو کچھ اعانت بھی مل گئی - حافظ ابن تیمیہؒ تصریح فرماتے ہیں[۱] کہ جس کسی نے فقہاء کو مرجئہ میں شامل کیا ہے اس نے عقائد کے لحاظ سے نہیں کیا بلکہ صرف ان الفاظ کی وجہ سے کیا ہے جن سے مرجئہ کی موافقت کی بو آتی ہے -

مرجئہ ایک فرقہ ہے جس کا یہ خیال تھا کہ ایمان کے لیے صرف زبانی اقرار کافی ہے اور عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے - جہمیہ نے ان سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہہ دیا کہ اقرار کی بھی کوئی ضرورت نہیں' صرف معرفت قلبیہ کافی ہے - ان فرقِ باطلہ کے مقابلہ میں محدثین کو ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی عنوان ایسا اختیار کر لیا جائے کہ وہ عنوان ہی خود ان کی تردید کا ایک اعلان بن جائے اس لیے ایمان کی تفسیر میں ہی اقرار و عمل دونوں شامل کر لیے گئے اور الایمان قول و عمل مشہور ہو گیا یعنی ایمان اقرار و عمل کے مجموعہ کا نام ہے - حتیٰ کہ شدہ شدہ جو عبارت اس مصلحت سے اختیار کی گئی تھی کچھ زمانہ کے بعد اہل سنت کے شعائر میں شمار ہونے لگی - اب جو شخص ایمان کی تعریف میں قول و عمل کہتا اہل سنت تھا اور جو شخص اس تعبیر کو ترک کرتا وہ صرف اس جرم میں ارجاء و جہمیہ کے القاب سے متہم ہوتا -[۲]

آج بھی اگر جماعتوں کے اختلافات پر نظر کرو گے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی بناء یہی چند الفاظ تھے جن کو نااہلوں نے اصولی اختلاف بنا ڈالا ہے - ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

ہماری بعض کتب میں امام اعظمؒ سے بھی ایمان کی تعریف میں معرفت کا لفظ منقول ہے - بس اتنی بات حنفیہ کی طرف جہمیت کے انتساب کے لیے بہانہ بن گئی -

الایمان هوا لا قرار و المعرفة بالله عزوجل و التسليم و الهيبة منه و ترک الاستخفاف بحقه.[۳]

یعنی ایمان کیا ہے؟ (۱) توحید و رسالت کا اقرار (۲) خدائے تعالیٰ کی معرفت (۳) اس کے سامنے سر تا سر نیاز ہو جانا - (۴) اس کا خوف - (۵) اس کے کسی حق کو معمولی نہ سمجھنا -

پہلے تو ہمیں امام صاحب کی طرف اس تعریف کے انتساب میں ہی کلام ہے اور اگر تسلیم کر لیا جائے تو صرف اس بات سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ معرفت سے امام صاحب کی وہی مراد ہے جو جہم بن صفوان کے نزدیک ہے - جہم کے نزدیک ایمان کے لیے نہ عمل کی ضرورت ہے نہ اقرار کی بلکہ انکار کے بعد بھی ایمان کامل رہ سکتا ہے اور یہاں اقرار کی رکنیت و شرطیت کی بحث ہو رہی ہے - رہ گیا انکار تو بلا اختلاف ایک بدترین کفر ہے - پھر جہم اور امام صاحب کے مذہب میں کیا اشتراک رہ سکتا ہے - بعض مصنفین نے یہاں معرفت کی تفسیر تصدیق کر دی ہے تاکہ یہ تعریف بھی مشہور کے موافق ہو جائے مگر ہمارے نزدیک اس جگہ معرفت سے وہ عام تصدیق مراد نہیں بلکہ تصدیق کا وجود عینی مراد ہے جسے ایمان کامل کہا جاتا ہے اور بلا شبہ ایمان کامل بلا معرفت تامہ حاصل نہیں ہوتا -

حافظ ابن تیمیہؒ نے ایمان میں بھی تقسیم پیدا کر دی ہے[۴] (۱) ایمان واجب (۲) ایمان مستحب - ایمان واجب ہر شخص پر فرض ہے اور اس مؤمن کا شمار زمرۂ ابرار اور اصحاب الیمین میں ہے - ایمان کی دوسری قسم مقربین و سابقین کا حصہ ہے - مذکورہ بالا تعریف اسی قسم ثانی کی ہے - جیسا کہ تعریف مذکور کے بقیہ الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں - دوم یہ کہ عبدالقادر بغدادی نے جمہور ائمہ و محدثین کا مذہب نقل کر کے اس کی تصریح کی ہے کہ ان کے نزدیک بھی ایمان کے مراتب ہیں اور اعلیٰ مرتبہ یہی معرفت ہے -

---

[۱] کتاب الایمان ص ۱۶۰ - [۲] دیکھو کتاب الایمان ص ۱۲۳ و ۷۷ - [۳] اتحاف ج ۲ ص ۲۴۲ - [۴] کتاب الایمان ص ۷۶ و ۷۹ -

اعلی الایمان معرفة بالقلب و اقرار باللسان و عمل بالارکان یزید بالطاعة و ینقص بالمعصیة[1]

یعنی ایمان کا اعلیٰ مرتبہ-معرفت قلبیہ- زبان سے اقرار اور اعضاء کا عمل پیرا ہونا- یہ ایمان طاعات سے ترقی پذیر ہوتا ہے اور معاصی سے ناقص بھی ہوتا ہے-

اس کے سوا حافظ ابن تیمیہؒ نے خود محدثین سے ایمان کی تعریف میں معرفت کا لفظ نقل کیا ہے بلکہ جمہور ائمہ کے یہی لفظ پیش کیے ہیں-[2]
اب ذرا انصاف کرو کہ اگر ایمان کی تعریف میں ایک لفظ معرفت استعمال کر لینا ہی کوئی جرم تھا تو کیا امام صاحب ہی اکیلے اس جرم کے مرتکب تھے- پھر ایک حنفیہ ہی کو کیوں ہدف ملامت بنا لیا گیا-

اسی طرح اگر حنفیہ نے ایمان میں عمل کو داخل نہیں کہا تو اس کے لیے بھی ان کے پاس دلائل ہیں مگر کیا اتنی سی بات سے ان کو مرجئہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے؟ حالانکہ مرجئہ کے نزدیک ایمان کے لیے معاصی کچھ مضرت رساں نہیں اور حنفیہ کے نزدیک اعمال مکمل ایمان ہیں اور اگر صرف لفظی گرفت ہی کوئی چیز ہے تو کیا عمل کو جزء ایمان بنانے سے معتزلہ و خوارج کو تقویت نہیں ہوتی (معتزلہ و خوارج محدثین سے بھی ایک قدم آگے ہیں اور عمل کو ایسا جزء کہتے ہیں کہ ایک عاصی ان کے نزدیک مؤمن کی فہرست سے خارج ہو جاتا ہے) اب اگر ایمان میں عمل داخل نہ کرنے سے مرجئہ اور جہمیہ کو تقویت ہوتی ہے تو عمل کو جزء بنانے سے معتزلہ و خوارج کو شہ ہوتی ہے پھر محدثین کے غیظ و غضب کا نزلہ حنفیہ ہی پر کیوں گرتا ہے- فصبر جمیل و اللہ المستعان علی ما تصفون.

اعمال کی حیثیت ایمان میں ✻ یہ بحث نہایت دلچسپ ہے کہ عمل کی ایمان میں کیا حیثیت رہنی چاہیے- محدثین وفقہاء کا یہاں بھی خوب نزاع ہے فریقین کے دلائل ذکر کرنے کا یہ محل نہیں- ہمارے نزدیک یہاں حقیقت حال امام غزالیؒ کی ایک تحقیق ہے اور بس وہی فیصلہ کن ہے اس کے بعد الفاظ خواہ وہ رہیں جو محدثین استعمال کرتے ہیں یا وہ جو فقہاء نے استعمال کیے ہیں (یعنی اعمال کو جزء کہو جو کہ محدثین کا مذہب ہے یا ایمان سے خارج قرار دو جیسا کہ فقہاء کا مسلک ہے) ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

کہ باطن و ظاہر بالکل دو جداگانہ عالم نہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ ہر دو کا باہمی ایسا گہرا تعلق ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے اگر اعتقادِ باطن' اعمالِ ظاہرہ کا مقتضی ہوتا ہے تو اعمالِ ظاہرہ اعتقادِ باطن کے مدد و معاون رہتے ہیں- دیکھو اگر ایک شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یتیم پر رحم کرنا انسانیت کا اوّلین فرض ہے تو اس کے اس عقیدہ کا یہ اقتضاء ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لیے مجسم رحمت و دل سوزی بن جائے- پھر جب اس کے اعضاء و جوارح اس دل سوزی کے لیے حرکت کرنے لگتے ہیں تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اعتقاد میں ایک نئی روح داخل ہو رہی ہے اور جتنا جتنا اس کا یہ عمل تلطف و ترحم ترقی کرتا ہے اسی قدر اس کے باطن میں شفقت و رحمت کا جوش اور پیدا ہوتا ہے یا اگر ایک شخص تواضع کو نیک خصلت سمجھتا ہے تو اس کا مخلوق سے تواضع کا معاملہ یقیناً اس کے اس اعتقاد میں اور پختگی کا باعث بنتا ہے- غرض صفات قلبیہ جس قدر بھی ہیں سب کا حال یہی ہے پہلے وہ اعضاء انسانیہ کو جنبش عمل کے لیے مضطر کرتی ہیں اور جب جوارح مصروف عمل ہو جاتے ہیں تو ان کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور روشن کرتے رہتے ہیں- ایمان و اعمال کا حال بھی اسی پر قیاس کر لو- ایمان ایک عقیدہ ہے اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ جوارح توحید خالص اور تصدیق رسالت کی اپنے عمل سے گواہی دیں اور جب اعضاء اس اقتضاء کو پورا کرنا شروع کرتے ہیں تو یہ عقیدہ اور راسخ اور تر و تازہ و سرسبز ہونے لگتا ہے-

---

[1] اتحاف ج ۲ ص ۲۵۴- [2] دیکھو کتاب الایمان ص ۱۶۰ و ۱۴۷ و ۵۹ و ۵۸-

حافظ ابن تیمیہؒ حسن بصریؒ سے نقل کرتے ہیں۔

لیس الایمان بالتحلی و لا بالتمنی و لکنه ما و قر بالقلب و صدقته الا عمال. (کتاب الایمان ص ۱۱۷)

یعنی ایمان صرف ظاہر داری کا نام نہیں بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں جو دل میں سرایت کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق بھی کریں۔

اس کلام سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اعمال انسان کی کیفیاتِ قلبیہ کا آئینہ ہیں۔ اب اگر وہ نیک عمل کرتا ہے تو یہ اس کے قلبی تصدیق کی دلیل ہوگی ورنہ اس کی بدعملی خود اس کے بے ایمانی کی شاہد بن جائے گی۔

محمد بن نصر مروزی نقل فرماتے ہیں کہ عبدالملک نے سعید بن جبیرؒ سے چند سوالات کئے منجملہ ان کے ایمان اور تصدیق کے متعلق بھی ایک سوال تھا انہوں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ ایمان اللہ تعالیٰ اور ملائکہ اور رسولوں اور قیامت کی تصدیق کا نام ہے مگر تصدیق کا یہ مطلب ہے کہ قرآن کے حرف حرف پر عمل ہو اور جتنی کوتاہی رہ جائے وہ گناہ نظر آئے اس پر استغفار کرے اور آئندہ اصرار نہ ہو۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ اسلام اقرار کا نام ہے اور ایمان عمل کا۔ یہ ہر دو آپس میں قرین ہیں۔ ہر شخص کا قول و عمل تولا جائے گا اگر اس کا عمل وزنی ہے تو مقبول ہوگا اور آسمان کی طرف صعود کرے گا اور اگر قول وزنی ہے تو اس کا عمل نامقبول رہے گا۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ ایمان بلا اقرار صحیح نہیں ہوتا اور ایمان و اقرار بلا عمل درست نہیں ہوتے اور ان تینوں کا اعتبار بلا نیت حسنہ کے نہیں ہوتا۔

ان سب ائمہ کے اقوال سے ظاہر ہے کہ اعمالِ جوارح تصدیق قلبی کے لیے بڑی حد تک ضروری ہیں گویا اس کے لوازم ہیں۔ حضرت مجاہد روایت کرتے ہیں کہ ابوذر غفاریؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان زبان سے اقرار کرنا اور اپنے عمل سے اس کی تصدیق کرنے کا نام ہے اس کے بعد آپ نے اس بیان کی شہادت میں قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ...الخ (البقرۃ:۷۷)

پوری نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کو منہ کرلو (یعنی نماز میں) بلکہ اصل مدار ایمان پر ہے۔

ایمان و عمل کے اس نازک ارتباط کو صرف ایک اہل سنت نے سمجھا ہے۔ مرجئہ وجہمیہ نے ان ہر دو کو ایسا علیحدہ کر دیا کہ تصدیق قلبی کے لیے عمل کی کوئی ضرورت نہ سمجھی اور معتزلہ وخوارج نے ان کو ایسا مدغم بنا دیا کہ عملی کوتاہی کو تصدیق قلبی کا ضعف قرار دے دیا۔ اسی اختلاف پر یہ بحث قائم ہوگئی کہ مرتکب کبیرہ کا کیا حکم ہونا چاہیے۔

تصدیق قلبی پر معصیت کا اثر ✵ قدرت جو فطرتِ انسانی کی سب سے بڑی رازداں ہے خوب جانتی ہے کہ یہ مجموعہ عناصر اتنا پابند عہد نہیں رہ سکتا کہ عالم امکان کی نقاشی اس کی نظریں کبھی خیرہ نہ کرسکیں خواہشاتِ نفسانی کی بادِ صرصر اس کی شمع تصدیق کو کبھی حرکت نہ دے سکے' وہ کمزور ہے اور بہت کمزور ہے اس لیے معمولی خلاف ورزی پر اس کا نام وفاداروں کی فہرست سے نہیں کاٹتی اور اس حد تک اسے معذور سمجھے جاتی ہے کہ وہ خود ہی نقض عہد کا اعلان کر گذرے۔ اربابِ ارجاء و اعتزال اگر تصدیق کے شرعی مفہوم اور ضعف انسانی کے دونوں پہلوؤں کی رعایت کر لیتے تو نہ اربابِ ارجاء کو صرف تصدیق عمل کے بغیر کافی نظر آتی اور نہ رؤساء اعتزال صرف ایک عاصی کے لیے وہ سزا تجویز کرتے جو ایک باغی کے مناسب تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔

و لیس من الحکمة ان یفعل بصاحب الکبیرة مثل ما یفعل بالکافر. (حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۷۹)

یہ حکمت سے بعید ہے کہ مرتکب کبیرہ کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو کافر سے ہونا چاہیے۔

یہ سعادت صرف اہل سنت والجماعت کا حصہ تھا کہ ہر پہلو کی رعایت کی توفیق ان کو میسر آ گئی اور ایمان و عمل کے پورے ارتباط کو انہوں نے ملحوظ رکھا - نہ اتنی سخت گیری کی کہ عمل کی کوتاہی کفر کے برابر ہو جائے اور نہ اتنا تساہل کیا کہ اتنا بڑا قصور تصدیق قلبی پر ذرا داغ بھی نہ لگائے اور یہ اعلان کر دیا کہ انسان کی بدعملی اس کے دامن پر فسق کا ایک بدنما دھبہ ہے -

بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ[1] (الحجرات: ۱۱) برا نام ہے گنہگاری ایمان کے بعد -

حافظ ابن تیمیہؒ آیت مذکورہ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال نقل فرما کر لکھتے ہیں کہ اس آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ ایمان کے بعد پھر تمہارا فاسق ہو جانا بہت بری بات ہے - (کتاب الایمان ص ۹۸) قرآن کریم جگہ جگہ مرتکب کبیرہ کو فاسق کہتا ہے -

اِنْ جَآءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا . (الحجرات: ٦) اگر ایک فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو -

وَ لَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ . (النور: ٤) یعنی جو لوگ زنا کی تہمت لگاتے ہیں آئندہ ان کی شہادت قبول نہ کی جائے کیونکہ اس جرم کے بعد وہ شریعت کی نظر میں فاسق ٹھہر چکے ہیں۔

یہ وہ بدترین لقب ہے جسے قرآن نے ایمان کے بعد بہت ہی ناپسند کیا ہے - اس علو و برتری کے بعد یہ خفیف الحرکاتی نہایت نازیبا ہے - حدیث میں ارشاد ہے -

سباب المسلم فسوق . یعنی کسی مسلمان کو برا کہنا فسق کی بات ہے -

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ یہ قبیح حرکت اس کو اس کا مستحق بنا دیتی ہے کہ اس کو فاسق کہہ دیا جائے -

اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا . (السجدۃ: ۱۸) نہیں ہو سکتا کہ مؤمن اور ایک فاسق برابر ہو جائیں -

ان آیات و احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ معصیت کا ارتکاب مسلمان کو نہ تو کافر بنا دیتا ہے اور نہ اس کے دعویٰ اتقیا کو بے داغ رہنے دیتا ہے - وہ مؤمن ہے مگر فسق سے اس کا دامن ملوث ہو چکا ہے - اس مجسم طہارت و پاکیزگی کے لیے لازم ہے کہ نجاست فسق سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھے اور جو لقب اس کے مولیٰ نے اس کے لیے پسند نہیں فرمایا خود بھی اس سے متنفر رہے - بئس الاسم الفسوق بعد الایمان - (کتاب الایمان ص ۱۰۵)

اسلام و ایمان میں کیا فرق ہے ٭ حافظ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلہ پر بہت طویل بحث کی ہے مگر اس قدر منتشر ہے کہ اس کا خلاصہ نکالنا مشکل ہے - جہاں تک ہم نے ان کے کلام کا ملخص سمجھا ہے یہ ہے کہ لغت میں اسلام کے معنی اپنے نفس کو کسی کے سامنے جھکا دینا اور ذلیل بنا دینا ہے - اس لحاظ سے اسلام یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اس طرح جھک جائے کہ پھر اس کے سوا کسی کی عبادت کا رخ نہ کر سکے - یہ جھکنا اور ذلیل ہونا ایک عمل ہے - اس لیے اسلام دراصل ایک عمل ہی کا نام ہے اور ایمان تصدیق قلبی کو کہتے ہیں - یہ تصدیق قلب کا اسی طرح ایک کلام ہے جیسا کہ اقرار زبان کا - یہ ضرور ہے کہ جب دل اپنی گہرائیوں سے کسی کے لیے بول اٹھے گا تو اس کے سامنے جھکنا اور ذلیل بن جانا بھی اس کا اقتضاء طبعی ہو گا مگر فرق یہ ہے کہ اسلام دراصل عمل ہی عمل ہے[2] اور ایمان ایک علم ہے - عمل یہاں تابع ہے - اس کے بعد اب اگر احادیث پر ایک اجمالی نظر ڈالو تو تم کو معلوم ہو گا کہ یہاں بھی اس فرق کی رعایت کی گئی ہے یعنی اسلام کا تعلق ظاہر عمل اور تصدیق کا باطن سے قرار دیا گیا ہے -

(۱) حضرت انسؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اسلام ظاہر ہے اور ایمان دل میں ہے - (مسند احمد) حدیث

---

[1] کتاب الایمان ص ۱۰۵ [2] ایضاً ص ۱۴۹

مذکورہ میں اسلام کو علانیہ اسی بنا پر فرمایا ہے کہ اعمالِ ظاہرہ کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے۔لیکن معرفت الٰہیہ اس کی محبت، اس کا خوف، یہ سب اوصاف قلبیہ ہیں یہ باطنی چیزیں ہیں اس لیے ایمان کو علانیہ نہیں فرمایا بلکہ قلب میں کہا گیا ہے۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان تو وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی مسلمان کو ایذاء نہ پہنچے اور مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ اپنے جان و مال کی طرف سے خطرہ میں نہ رہیں۔

یہاں بھی اسلام کی علامت ایک ظاہری چیز قرار دی گئی ہے یعنی لوگوں کو ایذاء نہ دینا اور ایمان کی علامت ایک باطنی چیز یعنی دلوں میں اس کی طرف سے خطرہ باقی نہ رہنا یہ دوسری صفت پہلی صفت سے اعلیٰ ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص ایسا مجسم پیغام امن بن جائے کہ قلوب میں اس کی طرف سے کوئی برا خطرہ تک باقی نہ رہے وہ کب کسی کو ایذاء دے سکتا ہے مگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی کمزوری کی بناء پر یا کسی لالچ سے ایذاء دہی ترک کردے اس لیے حدیث مذکور میں جو صفت ایمان کی بیان ہوئی ہے وہ اسلام کی صفت سے بالاتر ہے۔

(۳) عمرو بن عبسہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کسے کہتے ہیں آپ نے فرمایا لوگوں کو کھانا کھلانا اور نرم گفتگو کرنا، اس نے کہا کہ اچھا ایمان کیا چیز ہے فرمایا سخاوت اور صبر۔[1]

پہلی دو باتیں ظاہری عمل ہیں اور آخری دونوں باتیں نفس انسانی کی ایک صفت ہیں اس لیے ان کو اسلام سے اور ان کو ایمان سے زیادہ تعلق ہے۔اسی طرح اکثر احادیث میں اسلام کی تفسیر میں اعمال ظاہرہ کا تذکرہ برابر ہوتا چلا جاتا ہے اور ایمان کا بیشتر تعلق باطن سے معلوم ہوتا ہے۔حدیث جبریل جو اس باب کی نہایت اہم حدیث ہے اسی فرق پر مبنی ہے اس کی تفصیل عنقریب آپ کے سامنے آنے والی ہے۔

مذکورۂ بالا بیان سے اسلام و ایمان کا باہمی ربط بھی حل ہو گیا یعنی کیا اسلام بلا ایمان کے یا ایمان بلا اسلام کے پایا جا سکتا ہے۔ اختلافات کی کثرت نے یہاں بھی حیرت میں مبتلا کر دیا ہے مگر ہمارے نزدیک امام سبکی کی رائے بہت وزنی ہے۔[2] وہ فرماتے ہیں کہ اسلام گو انقیادِ ظاہری کا نام ہے مگر ایمانِ باطن اس کے لیے شرط ہے۔اسی طرح ایمان گو انقیادِ باطن کو کہتے ہیں مگر انقیادِ ظاہری بھی اس کے لیے ضروری ہے۔اس سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام بلا ایمان کے اور ایمان بغیر اسلام کے شرعاً معتبر نہیں ہوتا۔ علامہ[3] زبیدیؒ نے اس تلازم پر اشاعرہ اور حنفیہ کا اتفاق نقل کیا ہے۔غرض یہ ہے کہ حدیث کے عام نظریہ میں ایمان و اسلام یا تو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں صرف خصوصیات کا کچھ فرق ہے ورنہ کم از کم متلازم ضرور ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے یہاں[4] قرآن کریم سے ایک لطیف استنباط فرمایا ہے۔باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ.[5] (بقرہ: ۱۱۲)

کیوں نہیں؟ جس نے تابع کر دیا اپنی ذات کو اللہ کے اور وہ نیک کام کرنے والا ہے تو اسی کے لیے ہے اس کا ثواب اس کے رب کے پاس اور نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

---

[1] سماحت و صبر فطرت انسانی کی ضد ہیں قرآن کریم کہتا ہے ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ○ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ○ وَ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا﴾ (المعارج: ۱۹-۲۱) یعنی ہلوع وہ ہے جسے نعمت میں سماحت نصیب نہ ہو اور مصیبت میں صبر کی توفیق میسر نہ آئے ان ہی دو خامیوں کی اصلاح کے لیے ارشاد ہوتا ہے۔ ﴿وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ (البلد: ۱۷)

[2] اتحاف ج۲ ص ۲۳۵۔ [3] اتحاف ج۲ ص ۲۴۸۔ [4] کتاب الایمان ص ۱۰۴۔

[5] لاخوف علیهم میں جملہ اسمیہ اور و لا هم یحزنون میں جملہ فعلیہ استعمال کرنے کا نکتہ حافظ ابن تیمیہؒ نے نہایت لطیف لکھا ہے دیکھو کتاب الایمان ص ۱۰۴۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صٰلِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ. (بقرہ:٦٤)

بے شک جولوگ مسلمان ہوئے اور جولوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین۔ جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روزِ قیامت پر اور نیک کام کیے تو ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ان کا ثواب ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت میں اسلام اور عمل صالح پر جو وعدہ فرمایا گیا ہے دوسری آیت میں وہی وعدہ ایمان اور عمل صالح پر مذکور ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام دونوں متلازم چیزیں ہیں۔

ابو طالب مکی نے اس مضمون پر ایک مستقل فصل قائم کی ہے اور اس کی خوب ایضاح کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی مثال ایسی ہے جیسی شہادتین کی کہنے کو تو شہادۃ وحدانیت اور شہادۃ رسالت دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر پھر ان میں ایسا ارتباط ہے کہ بلحاظ حکم گویا ایک ہی ہیں۔ رسالت کے بغیر شہادت وحدانیت کار آمد نہیں ہوتی اور شہادت وحدانیت بلا شہادت رسالت کے بیکار رہتی ہے۔ ایک انسان کے لیے جس طرح قلب کی ضرورت ہے اسی طرح جسم کی ضرورت بھی ہے نہ کوئی قالب بلا قلب کے زندہ رہ سکتا ہے نہ قلب بلا قالب کے بسر کر سکتا ہے۔ خیمے کے دو حصے ہوتے ہیں ایک اوپر کا کپڑا دوسرا اندرونی چوب' نہ یہ کپڑا بلا چوب کے تنا رہ سکتا ہے اور نہ صرف چوب بلا کپڑے کے خیمہ کہلائی جاسکتی ہے کلام کی حقیقت دو ہونٹ اور ایک زبان سے قائم ہے دونوں ہونٹ حروف جمع کر دیتے ہیں اور زبان ان کو بشکل کلام ادا کر دیتی ہے اگر ایک ہونٹ نہ رہے تو کلام کی حقیقت باطل ہو جاتی ہے ٹھیک اسی طرح اعمالِ ظاہرہ اور اعتقادِ باطن یعنی اسلام و ایمان کا ارتباط ہے۔ صرف اعمالِ ظاہرہ بلا اعتقادِ باطن کھلا ہوا نفاق ہیں اور محض اعتقادِ باطن بدون اعمالِ ظاہرہ کے کفر کی ایک صورت ہے۔ اسلام یا ایمان کو اسی وقت معتبر کہا جا سکتا ہے جب کہ اعمالِ ظاہرہ کے ساتھ تصدیقِ باطن ہو اور تصدیق باطن کے ساتھ اعمالِ ظاہرہ بھی ہوں۔ قرآن کریم نے کفر کو ایمان و اسلام ہر دو کا مقابل قرار دے کر اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

کَیْفَ یَھْدِی اللّٰہُ قَوْمًا کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِھِمْ. (آل عمران:٨٦)

خدائے تعالیٰ بھلا اس قوم کو کیسے ہدایت دے جنہوں نے ایمان جیسی نعمت کے بعد پھر کفر اختیار کیا ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

اَیَاْمُرُکُمْ بِالْکُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. (آل عمران:٨٠) یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مسلمان ہو پھر رسول تم کو کفر کا حکم کرے۔

پہلی آیت میں کفر کو ایمان کے بالمقابل اور دوسری آیت میں اسلام کے بالمقابل رکھا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام و ایمان ایک دوسرے سے جدا چیزیں نہیں ہیں' اسلام کا ترک کرنا' ایمان کا ترک کرنا ہے اور ایمان کا ترک کرنا اسلام کا ترک کر دینا ہے اور نتیجہ ہر دو کا وہی ایک کفر ہے۔ (قوت القلوب ج ۲ ص ۱۲۹)

غرض اعمالِ ظاہرہ بلا انقیادِ باطن صحیح نہیں ہو سکتے اور نہ انقیادِ باطن بلا اعمال ظاہرہ کی شہادت کے ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہر مسلم کے لیے ایمان اور ہر مومن کے لیے اسلام ضروری اور ناگزیر ہے۔

حضرت استاد قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ تصدیقِ قلبی جب پھوٹ کر جوارح پر نمودار ہو جائے تو اس کا نام اسلام ہو جاتا ہے اور اسلام جب دل میں اتر جائے تو ایمان کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ ایک ہی حقیقت ہے اختلافِ مواطن سے اس کے نام مختلف ہو گئے ہیں۔

ہمارے نزدیک استاد مرحوم کا یہ بیان اسلام کامل اور ایمان کامل سے متعلق ہے اور غالباً اس کا منشاء امام غزالیؒ کی وہ تحقیق ہے جس کا بیان آپ گذشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہمارے فقہاء کے اختلافات بھی اپنی جگہ صحیح وجوہ واسباب پر مبنی ہیں مگر ہمیں تو یہاں وہ لکھنا تھا جو امت کے حق میں زیادہ نافع ہو تفصیل کے لیے علم کلام ہے۔

ایمان میں زیادت ونقصان کی بحث ✻ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ایمان قلب میں مختلف راستوں سے داخل ہو جاتا ہے کبھی اپنی جان و مال کا تحفظ التزام طاعت کا داعی ہوتا ہے جیسا کہ طلقاء مکہ کا اسلام کبھی چند دراہم مغشوشہ کی طمع التزام طاعت پر مجبور کر دیتی ہے جیسا کہ مؤلفہ قلوب کا اسلام کبھی محض قومی تقلید اور جمہور کا اتباع اس کا محرک بن جاتا ہے جیسا کہ اکثر اعراب کا اسلام ان سب صورتوں میں اگر سینہ رسولؐ کی عداوتوں سے خالی ہو چکا ہے اور نفس نے دین الٰہی میں داخل ہو جانے کی تیاری کر لی ہے تو وہ یقیناً مسلمان ہے مگر یہ ایسا اسلام ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ شبہات اس کے یقین کو متزلزل کر سکتے ہیں' ذرا ذرا سی تکلیفیں اس کو اپنے مذہب سے پھیر سکتی ہیں۔ مذہب کے لیے قربانی کا اس میں کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ جہاد کی دعوت اس کے لیے پیام موت ہوتی ہے۔ آیاتِ ربانیہ کا پیہم نزول اس کے ایمان میں کچھ افزونی نہیں بخشتا اور اسی امن و عافیت کی زندگی میں وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک اسلام ہے اور آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ. (الحجرات:۱۴)	یعنی اعراب کہتے ہیں کہ ایمان ہمارے دلوں میں سرایت کر گیا ہے آپ کہہ دیجئے کہ ایسا دعویٰ ابھی مت کرو ابھی اسلام صرف تمہارے ظاہر تک ہے۔ ہاں امید ہے کہ آئندہ دلوں تک اتر جائے۔

یہ اسلام کے وجود لفظی کے ابتدائی حالات ہیں لیکن جب یہ ایمان اور ترقی کرتا ہے تو اس کی صورت کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ اہل ایمان کی صحبت اسے اپنا ہم رنگ بنا لیتی ہے کبھی آیاتِ قرآنی پر غور و تفکر ایمان کی تر و تازگی کا باعث بن جاتا ہے کبھی محض موہبت الٰہیہ کشاں کشاں ایمانِ حقیقی تک لے آتی ہے۔ اچانک وہ دیکھتا ہے کہ پہلے جو قلب ظلمت کدہ تھا اب نور ایمانی سے وادیٔ ایمن بن گیا ہے حقائق ایمانیہ آناً فاناً منکشف ہوتی چلی جاتی ہیں۔ راہ اسلام میں ہر ضرب ایک نئی تازگی بخشتی ہے۔ طبل جنگ کی آواز صدائے سرود سے زیادہ سہانی اور مستانی معلوم ہوتی ہے۔ آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت وہ کام کرتی ہے جو ابر رحمت کے قطرے کھیتوں میں۔ قدرت اس کو طرح طرح آزماتی ہے مگر ہر امتحان اس کے لیے ایک نیا یقین بخشتا ہے۔ عبادت میں دلچسپی کا سوال درمیان سے ہٹ جاتا ہے۔ فتح وظفر اور شکست وانہزام سب برابر نظر آتے ہیں اور اس طرح انقیاد باطن کی ایک ایک منزل تمام طے ہو جاتی ہے۔ آپس کے تعلقات نظر سے گر جاتے ہیں اور صرف ایک تعلق رہ جاتا ہے اور وہ خدا کا تعلق ہے اب جس سے محبت ہے اسی کی خاطر ہے اور جس سے جنگ ہے اسی کے نام پر ہے ایک وہ مؤمن تھا اور اب یہ ایک مؤمن ہے اسی کا نام ایمان کی زیادتی ہے۔ اب آیاتِ ذیل کو بغور پڑھ لو۔

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَ جِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا الخ... اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا. (الانفال:۲-۴)	مؤمن صرف وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا نام آئے تو خوف زدہ ہو جائیں اور جب اس کی آیات ان پر تلاوت کی جائیں تو ان کے ایمان اور روشن ہوں۔ نمازیں نہایت خوبی کے ساتھ پڑھیں اور ہمارے بخشے ہوئے مال میں سے کچھ مصارف خیر میں بھی صرف کرتے رہیں۔ پس ٹھیک مؤمن تو یہ ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس زیادتی سے مراد صرف تصدیق ہے ہرگز نہیں بلکہ جب کبھی ایک مؤمن گوشِ انقیاد واطاعت سے کلام پاک

کوسنتا ہے تو ہر بار معانی پر غور و تفکر اس کے قلب میں جنت کی نئی رغبت اور آخرت کا نیا خوف خدائے تعالیٰ کی ایک نئی محبت اس کی طاعت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور اسی کا نام قرآن کریم نے ایمان کی زیادتی رکھا ہے۔

عمر بن حبیبؓ صحابی فرماتے ہیں کہ جب ہم خدا کی تسبیح وحمد میں مشغول ہوں تو یہی ایمان کی زیادتی ہے اور جب غفلت ونسیان میں مبتلا ہو جائیں تو اسی کا نام ایمان کا نقصان ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لیے سمجھ کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی نگرانی کرتا رہے کہ کچھ بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے۔

صحابہ کرامؓ کا چونکہ دن رات کا یہی ایک مشغلہ تھا کہ وہ اپنے ایمان کا جائزہ لیا کرتے جب کوئی آیت اترتی تو اپنی روح میں ایک نئی ایمانی تازگی محسوس کرتے۔ ادھر کفار کا یہ مشغلہ تھا کہ وہ اس جذبہ کا تمسخر اڑاتے اور مذاق بنایا کرتے۔

(۱) وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ. (التوبة: ۱۲۴-۱۲۵)

جب کوئی سورت اترتی تو ان میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو یہ پوچھتی بھلا تم میں سے کس کا ایمان بڑھا۔ جی ہاں جو ایمان لا چکے ہیں ان کے ایمان میں تو ترقی ہوئی اور انہوں نے بڑی بشارت حاصل کی لیکن جن کے دلوں میں روگ تھا ان کی نجاست میں اور اضافہ ہو گیا۔

آیات قرآنی کا ادب ویقین سے سننا یقیناً ایمان میں ترقی بخشتا ہے۔ یہ زیادتی کبھی جدید جدید علوم حاصل ہونے سے پیدا ہوتی ہے کبھی سکینت وفرحت کی صورت میں میسر آتی ہے، کبھی ہدایت کے نام سے موسوم ہوتی ہے پہلی آیت میں اسی کا نام استبشار ہے۔

(۲) وَ يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ. (الروم: ۴)

اس روز مؤمنین خدا کی نصرت پر مسرور ہوں گے۔

یہاں اس زیادتی کو فرح وسرور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ. (الفتح: ۴)

خدا ہی کی وہ ذات تھی جس نے مؤمنین کے دلوں پر سکینت واطمینان کی کیفیت نازل فرمائی تا کہ ان کے پہلے ایمان میں اور ترقی ہو۔

(۴) فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا. (التوبة: ۲۶)

اللہ تعالیٰ نے اپنا سکینہ اپنے رسول اور مؤمنین پر نازل فرمایا اور ایسا لشکر بھیج دیا جس کو تمہاری آنکھوں نے نہ دیکھا۔ (یعنی فرشتے)

(۵) اِذْ هُمَا فِى الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ اَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا. (التوبة: ۴۰)

جب کہ وہ دونوں غار میں پوشیدہ تھے اور خدا کا رسول اپنے رفیق کو سمجھا رہا تھا کہ غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے، تو اللہ نے اس پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور ایسے لشکر کے ذریعہ سے قوت پہنچائی جس کو تم نے نہیں دیکھا۔

(۶) وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى. (محمد: ۱۷)

جو لوگ ہدایت یافتہ تھے خدا نے ان کو اور ہدایت میسر فرمائی۔

آیات بالا میں یہ سکینہ ویقین وہدی سب صفات قلبیہ ہیں مصائب میں یہ یقین کر لینا کہ یہ سب مقدرات ہیں جو ضرور پیش آمدنی ہیں، تقدیر پر ایمان کا ثمرہ ہے اور اس کا نتیجہ سکینہ واطمینان وتسلیم ہے۔

یہ ایمان جب اور عروج کرتا ہے تو اب ایک ذات وحدہ لا شریک لہ پر وہ توکل واعتماد میسر آ جاتا ہے کہ دشمن کی دھمکی اور دلیری کا باعث بن جاتی ہے۔

(۷) اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ. (آل عمران: ۱۷۳)

یہ وہ جماعت ہے جن کو کفار نے دھمکی دی کہ تمہارے لیے بڑی فوج تیار کی گئی ہے تو ذرا ڈرنا اس پر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور بولے کہ ہمیں خدا کافی ہے اور وہی ہمارا بہترین کارساز ہے۔

اس قسم کا ایک امتحان نہیں بلکہ سخت سے سخت مصائب میں مبتلا کر کے ان کا بار بار امتحان لیا جاتا ہے۔ ھنالک ابتلی المومنون و زلزلوا زلزالا شدیدا ۔مگر شک وتردد کا ایک کانٹا بھی ان کے دامن یقین میں نہیں چبھتا۔ وہ کوہِ استقامت اور یقین کی ایک چٹان بن جاتے ہیں کہ مصائب کے لشکر اگر ان سے ٹکراتے ہیں تو خود پاش پاش ہو جاتے ہیں اور ان کو اپنی جگہ سے ذرا حرکت نہیں دے سکتے، جان و مال کی قربانی ان کے نزدیک ایک معمولی بات ہوتی ہے۔ ان امتحان کے بعد اب ایک مؤمن اپنے دعویٰ میں سچا مان لیا جاتا ہے۔

(۸) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ. (الحجرات: ۱۵)

مؤمن صرف وہ لوگ ہیں جو ایک مرتبہ جب خدا و رسول پر ایمان لا چکے تو پھر شک وتردد کے پاس نہ پھٹکے بلکہ جان سے مال سے اللہ کے راستہ میں قربان ہو گئے بس یہی لوگ سچے کہے جانے کے مستحق ہیں۔

اگر بناء بر بشریت کبھی ان سے ذرا کمزوری ظاہر بھی ہو جاتی تو قرآن فوراً تنبیہ کر دیتا ہے اور تفہیم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا کہ ایمان جو صرف عشق کی راہ ہے کمزوری اور بزدلی سے طے ہونے والی نہیں ہے ؎

ایں شربت عاشقیست خسرو بے خون جگر چشید نتواں

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا مِنْکُمْ. (آل عمران: ۱۴۲)

تم نے کیا یہ خیال کر لیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تو اللہ نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جان و مال کی قربانی کے لیے تم میں کون کون تیار ہے۔

خدا کی راہ میں ایک بڑی قربانی یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے باپ، بیٹا، بھائی، قبیلہ سب کو ایک طرف رکھ دیا جائے بس ساری محبتوں اور عداوتوں کا محور ایک خدا کی ذات رہ جائے۔

(۹) لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِیْرَتَهُمْ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ. (المجادلہ: ۲۲)

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کو آپ خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت کا برتاؤ کرتا دیکھیں خواہ وہ ان کے والد یا اولاد یا بھائی یا قبیلہ ہی کیوں نہ ہوں بس یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان نہایت مضبوط قائم ہو چکا ہے۔

اسی لیے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَ لَوْ کَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ النَّبِیِّ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِیَآءَ وَ لٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ. (مائدہ: ۸۱)

بھلا اگر کہیں یہ لوگ اللہ نبی اور اس پر نازل شدہ وحی کا یقین رکھتے تو ان کو دوست بناتے مگر بات یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ حکم عدولی کرنے والے ہیں۔

تیسری جگہ ارشاد ہے۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَ اَبْنَآؤُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَ عَشِیْرَتُکُمْ وَ اَمْوَالُ

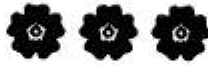
اے پیغمبر مسلمانوں سے کہہ دیجئے اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا کنبہ، تمہارا مال جو تم نے کمایا

اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ. (توبہ:۲۴)

ہے۔تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو' تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے' اس کے رسول سے' اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ تمہارے سامنے لے آئے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جو ایمان کے زیادت ونقصان پر برہانِ قاطع ہیں مگر آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس کا تعلق ایمان کے وجودِ عینی سے ہے وجودِ ذہنی یعنی نفس تصدیق سے نہیں۔[1]

اسلام وایمان کے یہ چند مباحث ہیں ان کی روشنی میں اب آپ بسم اللہ کر کے کتاب الایمان کی احادیث پڑھنا شروع کیجئے۔ جو مباحث یہاں رہ گئے ہیں وہ تشریحی نوٹوں میں موقع بہ موقع آپ کے ملاحظہ سے گذر جائیں گے لیکن ہر بحث کو پڑھتے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ان بحثوں اور تفصیلوں کے صحیح مخاطب وہی افراد واشخاص ہیں جو اسلام وایمان کی روشنی خود اپنے قلب میں رکھتے ہیں۔ اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے اس کو اور روشن کرنا چاہتے ہیں۔لیکن جن افراد کے قلوب میں سرے سے مذہب کے نقوش ہی نہیں یا ہیں تو مٹے ہوئے اور اُجٹے ہوئے ایسے اصحاب کو اس سلسلہ کے لیے پہلے کسی اور کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے' ان کے نقطہ نظر سے جو مباحث ضروری ہیں وہ اس کتاب میں غیر ضروری سمجھ کر چھوڑ دیئے گئے ہیں کیونکہ ان کی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔ یہاں صرف احادیث نبویہ کی تشریح منظور ہے اور اس ضمن میں جو تفصیل طلب امور ہیں یا جو شبہات پیدا ہو سکتے ہیں ان کی تامقدور توضیح وتفصیل کی گئی ہے۔ توحید و رسالت کے عقلی اثبات کا محل علم کلام ہے جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ واللہ الموفق۔



---

[1] حافظ ابن تیمیہؒ نفس تصدیق میں بھی تشکیک کے قائل ہیں دیکھو کتاب الایمان ص ۹۲، ۱۶۵ و ۱۶۶۔

کِتَابُ الایمان و الاسلام

کتاب الایمان والاسلام

فضل الایمان و الاسلام

ایمان اور اسلام کی فضیلت

اٰية محبة اللّٰه عزوجل التوفيق للايمان

(۱۹۲) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَخلاقَكُمْ كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَرْزَاقَكُمْ وَ اِنَّ اللّٰهَ يُعْطِى الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَ مَنْ لَّا يُحِبُّ وَ لَا يُعْطِى الْاِيْمَانَ اِلَّا مَنْ يُحِبُّ. (رواه الحاكم فی المستدرك (ص ۳۳) و قال الذهبی صحيح الاسناد)

خدا کے یہاں مقبولیت کی پہچان ایمان ہے سرمایہ و دولت نہیں

(۱۹۲) عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس طرح تم میں روزی کی تقسیم کی ہے اسی طرح تمہارے اخلاق کی بھی تقسیم کر دی ہے (جیسے رزق تنگ و فراخ رکھا ہے ایسے ہی اخلاق بھی کسی کے تنگ اور کسی کے وسیع رکھے ہیں) وہ دنیا تو (سب ہی کو دیتا ہے) اس کو بھی جس سے محبت کرتا ہے اور اس کو بھی جس سے محبت نہیں کرتا لیکن دولت ایمان صرف اسی کو دیتا ہے جس کو محبوب رکھتا ہے۔

لایدخل الجنة الا المؤمنون

(۱۹۳) عَنْ عُمَرَ قَالَ لَمَّا كَانَ يَوْمَ خَيْبَرَ قُتِلَ

جنت میں صرف مؤمن جائیں گے

(۱۹۳) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب خیبر کی جنگ

---

(۱۹۲) * انسان کی تمام شرافت و کمال اس کی قوتِ نظریہ اور قوتِ عملیہ کے کمال پر موقوف ہے ان ہی کے سنور جانے کا دوسرا نام ایمان اور عمل صالح ہے کفر و ایمان کی تقسیم ان ہی کے بگڑنے اور سنورنے پر دائر ہے جس کی یہ دونوں قوتیں سنور گئیں وہ سنور گیا اور جس کی بگڑ گئیں وہ بگڑ گیا۔ اسی لیے سورہ والتین اور سورۂ والعصر میں انسانی شرافت کو بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرما کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے لیے اسفل السافلین اور ابدی خسارہ سے نجات کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ حریت انسان کی سب سے بڑی شرافت ہے اور عبدیت اس کے لیے بدترین داغ۔ لیکن اگر حریت کے ساتھ ایمان اور عمل صالح نہ ہو اور عبدیت کے ساتھ ایمان میسر آ جائے تو حریت کی شرافت، شرافت نہیں رہتی اور عبدیت کا عیب، عیب نہیں رہتا۔ **ولعبد مؤمن خير من مشرك** ۔ ایک مؤمن غلام ایک آزاد مشرک سے بدرجہا افضل ہے۔ پس اسلام میں خدا کے دوست و دشمن کی تقسیم کا مدار سرمایہ و دولت پر نہیں بلکہ ایمان و کفر پر ہے۔ دنیا کی دولت دوست و دشمن سب میں مشترک رکھی گئی ہے لیکن ایمان کی دولت صرف دوستوں کے حصہ میں لگا دی گئی ہے۔

سر مد غم عشق بو الہوس را نہ دہند — سوزِ دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار — ایں دولت سر مدیہ ہمہ کس را نہ دہند

(۱۹۳) * یہ حدیث جہاں ایک طرف یہ بتاتی ہے کہ جنت صرف مؤمنوں کا حصہ ہے اسی کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ "المؤمن" کا خطاب حاصل کرنے میں ایک بے قیمت چادر اور ایک معمولی سے عباء کی چوری بھی حائل ہو سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جنت کوئی معمولی متاع نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں "المؤمن" کا خطاب بھی معمولی خطاب نہیں۔ دنیا اپنے اندازۂ خیال پر ایک شخص کو شہید کہہ دیتی ہے لیکن اسلام کی .....

بَعْضُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَهِيْدٌ حَتّٰى مَرُّوْا عَلٰى رَجُلٍ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَهِيْدٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَلَّا فَاِنِّیْ رَاَيْتُهٗ فِی النَّارِ فِیْ بُرْدَةٍ اَوْ عَبَاءَةٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْهَبْ فَنَادِ فِی النَّاسِ اَنَّهٗ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ. فَنَادَيْتُ اَلَا اِنَّهٗ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ. (اخرجه ابن ابی شیبة و احمد و مسلم و الترمذی و الدارمی و ابن حبان)

ہوئی تو اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین شہید ہو گئے - لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ فلاں فلاں شہید ہو گئے یہاں تک کہ وہ ایک اور مقتول پر گذرے، تو اس کے متعلق بھی یہی کہا کہ فلاں صحابی شہید ہو گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں - میں نے اس کو ایک چادر یا عباء (چرانے کی) سزا میں دوزخ میں دیکھا ہے - اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جاؤ اور لوگوں میں یہ اعلان کر دو کہ جنت میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو ''المومن'' یعنی پورے پورے ایمان دار ہیں، میں گیا اور میں نے یہ اعلان کر دیا -

(۱۹۴) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰى تُؤْمِنُوْا وَ لَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰى تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّكُمْ

(۱۹۴) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے جنت میں نہیں جاؤ گے اور جب تک باہمی محبت نہ کرو گے پورے مؤمن نہیں ہو گے تو کیا میں تم کو وہ بات نہ بتا دوں کہ

؎ .... اب بھی اس کو ''المومن'' کا خطاب نہیں دیتا کوئی شخص صرف ایک بار کلمہ طیبہ پڑھ لینے سے خواہ وہ عذاب الٰہی کی دائمی گرفت سے نجات پانے کا مستحق ہو جائے لیکن ''المومن'' کے معزز خطاب کا اس وقت تک مستحق نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی نظری اور عملی دونوں قوتیں کامل نہ ہو جائیں یعنی وہ اسلام کے عقائد اور اعمال کا پورے طور پر پابند نہ ہو جائے اور اس پابندی میں وہی کیف آزادی محسوس کرنے نہ لگ جائے اس کے بعد پہلے جنت کا مشتاق وہ تھا اور اب جنت اس کی مشتاق ہو جائے گی -

(۱۹۴) ✽ اس حدیث میں ایمان کو محبت پر اور محبت کو سلام پر معلق کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض اعمال بادی النظر میں گو معمولی نظر آتے ہیں مگر دوسرے اہم مقصد کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں - سلام بظاہر ایک معمولی درجہ کا خلق ہے لیکن اس کا نتیجہ باہمی اُلفت و محبت ہے محبت صرف ایک جاذبیت وتاثر ہی کا نام ہے مگر اس کے باوجود وہ ایمان کا ایک مستقل سبب بن جاتی ہے - دراصل بات یہ ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت ہی کا دوسرا نام ہے - خدا کی محبت کی یہ راہ رسول کی محبت میں پھر رسول سے صحابہ کی محبت میں اور اسی طرح درجہ بدرجہ عامہ مؤمنین کی محبت میں سے ہو کر گذرتی ہے اس لئے خدا کی محبت تک رسائی کے لئے ان محبتوں کو بھی عبور کرنا ناگزیر ہے اور اس طرح مسلمانوں کی محبت کا نتیجہ ایمان باللہ اور ایمان باللہ کا نتیجہ مؤمنین کی محبت ہو کر رہتا ہے - اسی لیے مؤمنین سے بغض و کینہ کی زد براہ راست آدمی کے اسلام پر پڑتی ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم میں یہ دعا تعلیم کی گئی ہے - وَ لَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا - (اور ہمارے دلوں میں اس جماعت سے کینہ نہ رکھ جو ایمان لا چکی ہے) اس کینہ کو دور کرنے کا سب سے سہل اور فطری نسخہ یہی سلام ہے اسی لیے ذراسی شکر رنجی میں مراسم محبت میں جو چیز پہلے ختم ہوتی ہے وہ یہی سلام ہے - اس بیان کا اقتضاء تو یہ تھا کہ اسلام میں باہمی سلام کی حیثیت ایک رکن کی حیثیت ہوتی لیکن جن امور کو پورے ضبط میں لایا نہیں جا سکتا ان کی اہمیت کے باوجود شریعت ان کو رکن کا درجہ نہیں دیتی بلکہ ایمان کا ایک شعبہ قرار دے دیتی ہے - اسی لیے حیاء بھی ایمان کا صرف ایک شعبہ قرار دی گئی ہے یہاں بھی پورا پورا انضباط مشکل ہے - پس اس حقیقت سے کسی موقعہ پر بےخبر نہ رہنا چاہیے کہ جن امور کو شریعت شعبہ قرار دیتی ہے وہ ہمیشہ معمولی اور غیر اہم ؎ ....

2 عَلٰى شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ. (رواہ مسلم)

جب اس کے خوگر ہو جاؤ تو باہمی محبت کرنے لگو (وہ یہ ہے) کہ آپس میں ہر شخص کو سلام کیا کرو خواہ وہ تمہارا آشنا ہو یا نا آشنا۔

بشارة كمال الدين لم يعط احد من الامم

کمالِ دین کی بشارت اس امت کے سوا کسی کو نہیں دی گئی

(۱۹۵) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْيَهُوْدِ قَالَ لَهٗ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اٰيَةٌ فِيْ كِتَابِكُمْ تَقْرَؤُنَهَا لَوْ عَلَيْنَا مَعْشَرَ الْيَهُوْدِ نَزَلَتْ لَا تَخَذْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ عِيْدًا قَالَ اَيُّ اٰيَةٍ قَالَ ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ :۳) قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَ الْمَكَانَ الَّذِيْ نَزَلَتْ فِيْهِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ هُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ. (رواہ البخاری و مسلم و الترمذی عن ابن عباسؓ)

(۱۹۵) عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے کہا اے امیر المؤمنین آپ کے قرآن میں ایک آیت ہے جسے آپ لوگ پڑھتے ہیں اگر کہیں وہ ہم یہودیوں کے لیے نازل ہوتی تو ہم اس دن عید منایا کرتے۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا وہ کون سی آیت ہے' اس نے کہا یہ آیت (آج ہم تمہارا دین کامل کر چکے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے حق میں دین صرف اسلام کو پسند کر لیا) عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہم وہ دن بھی جانتے ہیں اور وہ جگہ بھی جانتے ہیں جہاں یہ آیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری تھی' جمعہ کا دن تھا اور عرفات کا میدان تھا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رکن وقوف ادا فرمارہے تھے (یعنی اس دن ہماری دو عیدیں تھیں)

.... نہیں ہوتے کبھی کبھی ارکان کے درجہ کی چیزیں ان کے غیر منضبط ہونے یا قانون یسر کے تقاضہ سے شعبہ قرار دے دی جاتی ہیں۔

(۱۹۵) * یہود و نصاریٰ اسلام کے ساتھ ہمیشہ رقابت کا تعلق رکھتے تھے اور ہر موقعہ پر اس گھات میں رہا کرتے تھے کہ اپنے دین کی برتری یا اسلام کی کمتری ثابت کر دیں لیکن جب عین حج کے موسم میں آیت مذکورہ نازل ہوگئی تو ان کی حسرت کی حد باقی نہ رہی کہ ان کے پاس شریعت تورات جیسی بسیط شریعت موجود ہونے کے باوجود اکمالِ دین کی بشارت ان کے حصہ میں نہ آئی اور آئی تو کن کے حصہ میں جو ہمیشہ ان کے رقیب اور مدمقابل رہا کرتے تھے اس لیے جب ان سے کچھ اور بن نہ پڑا تو کھسیا کر ایک یہی اعتراض جڑ دیا کہ اگر یہ آیت ہمارے حق میں اترتی تو ہم اتنے خوش ہوتے کہ اس دن عید منایا کرتے ان کے علی الرغم حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ نادانو تمہیں یہ خبر نہیں کہ اس دن تو قدرتی طور پر ہماری دو عیدیں جمع تھیں۔قرآن کریم کی یہ ایک ہی بشارت درحقیقت تین بشارتوں پر مشتمل ہے۔اگر ان کی جدا جدا تفصیل کی جائے تو بات بہت طویل ہو جائے گی اس لیے ہم یہاں ابن عباسؓ کے صرف وہی کلمات نقل کرنے پر کفایت کرتے ہیں جو انہوں نے اس بشارت کی تشریح میں بہت مختصر مگر بہت جامع ارشاد فرمائے تھے۔

آج ہم تمہارا دین کامل کر چکے تو اب اس میں کبھی کسی زیادتی کی ضرورت نہ پڑے گی اور اپنی نعمت پوری کر چکے تو اب یہ دین کبھی ناقص نہ ہوگا اور تمہارے حق میں ہمیشہ کے لیے یہی دین پسند کر چکے تو اب کبھی اس سے ناراض نہ ہوں گے (ابن کثیر ج ۳ ص ۲۷۹) شریعت موسویہ اپنے زمانہ میں گو کامل ہی شریعت تھی مگر کچھ زمانہ بعد اس میں پھر زیادتی کی ضرورت پیش آگئی۔مزید برآں یہ کہ وہ اس طرح مسخ ہوگئی کہ پھر اسی کی اتباع مغضوب علیہم اور ضالین کی شان بن گئی۔اس آیت میں اہل اسلام کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ انقلابات کی آندھیاں یہاں بھی آئیں گی مگر ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اس دین میں زیادتی ونقصان کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔یا یہ دین بھی ایسا محرف ہو جائے کہ اس کی اتباع کرنا اللہ تعالیٰ کی رضاء کی بجائے اس کی ناراضگی کا موجب بن جائے۔بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ دین آخری دین ہے اس لیے تحریف اور نسخ دونوں سے محفوظ رہے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا دین مقبول نہ ہوگا۔

بشارة المغفرة للمؤمن العاصي

(۱۹۶) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ الغفاریّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَانِیْ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَبَشَّرَنِیْ اَنَّہٗ مَنْ مَاتَ مِنْ اُمَّتِکَ لَا یُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْئًا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قُلْتُ وَ اِنْ زَنٰی وَ اِنْ سَرَقَ قَالَ وَ اِنْ زَنٰی وَ اِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَ اِنْ زَنٰی وَ اِنْ سَرَقَ ثُمَّ قَالَ فِی الرَّابِعَۃِ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ. (رواہ الشیخان و الترمذی و عند البخاری فی باب الثیاب البیض و کان ابو ذر اذا حدث بھذا قال و ان رغم انف ابی ذر)

(۱۹۷) عَنْ سَالِمِ بْنِ اَبِی الْجَعْدِ عَنْ سَلَمَۃَ بْنِ نُعَیْمٍ قَالَ وَ کَانَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ لَقِیَ اللّٰہَ لَا یُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَ اِنْ زَنٰی وَ اِنْ سَرَقَ. (رواہ احمد و الطبرانی)

مؤمن عاصی کے حق میں مغفرت کی بشارت

(۱۹۶) ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور یہ خوش خبری لائے کہ آپ کی امت میں جو شخص اس حال پر مر جائے کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ ٹھیرایا ہوتو وہ جنت میں جائے گا میں نے عرض کیا اگر چہ اس نے چوری اور زناء (جیسے کبائر کا) ارتکاب کیا ہو آپ نے فرمایا اگر چہ چوری و زناء کا ارتکاب کیا ہو' میں نے پھر عرض کیا اگر چہ اس نے چوری اور زناء کا ارتکاب کیا ہو- آپ نے پھر وہی فرمایا چوتھی مرتبہ میرے اصرار پر فرمایا ہاں اگر چہ ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کتنا ہی ناگوار گذرے- ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عادت تھی کہ جب وہ اس حدیث کو نقل کرتے تو آپ کے اس فقرہ کو بھی نقل کر دیتے تھے-

(۱۹۷) سالم بن ابی الجعد سلمہ بن نعیم سے روایت کرتے ہیں (یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو مر جائے کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ عز وجل کا شریک نہ ٹھیرایا ہو وہ جنت میں جائے گا اگر چہ چوری اور زناء کا مرتکب ہوا ہو-

(اس حدیث کو احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے)

---

(۱۹۶) * آدمی بے چارے کی پرواز ہی کیا' یہ غریب رحمت کی وسعت کا اندازہ لگائے بھی تو کیا لگائے ایک کلمہ سے عمر بھر کے جرم بغاوت کی معافی کا اعلان سنتا ہے تو حیرت میں پڑ جاتا ہے- ادھر دیکھتا ہے کہ جو زبان اس کا اعلان کر رہی ہے وہ مبالغہ آمیزی کی عادی نہیں اس لیے مسرت وحیرت کے مابین وہ اس سوال کو بار بار دہرانے کے لیے مضطر ہو جاتا ہے جو حضرت ابوذرؓ کی زبانی ابھی آپ نے پڑھا- وہ چاہتا ہے کہ اپنے کانوں کے نارسائی اور قصور فہم کے جتنے موانع بھی ہو سکتے ہیں سب کو صاف کرے اور یقین کرے کہ ان کے کانوں نے سننے میں غلطی نہیں کی' عقل نے سمجھنے میں ٹھوکر نہیں کھائی اور بات درحقیقت یونہی تھی جو اس نے پہلی مرتبہ سنی- ابوذرؓ کے اس عالم حیرت کو ختم کرنے کے لیے یہی ایک تدبیر کارگر ہو سکتی تھی کہ ان سے ایسا محبت بھرا کلمہ سرزنش کہہ دیا جائے جو ان کی اس حیرت کو ختم کر دے اور اپنی لذت کو ان کے سینہ میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ جائے- اسی لیے حضرت ابوذرؓ جب اس روایت کو بیان فرماتے تو ساتھ ہی اس عتاب آمیز تلطف کو بھی ذکر کر دیتے خود محظوظ ہوتے اور ذوق محبت رکھنے والوں کو بھی محبت کی ان تلخیوں کی یاد دلا دلا کر محظوظ کرتے

داد دشنامے مرا محبوب جانی یک شبے عمر بگذشت و ہنوزم لذت آں در دل است

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ زناء و سرقہ کے بعد اگر زندگی کے آخری لمحات میں بھی اسلام نصیب ہو جائے یا ان گناہوں سے توبہ کر لے تو اس کے یہ گناہ معاف ہو جائیں گے اور وہ اس بشارت کا مستحق ہو جائے گا- (ص ۸۶۷)

(۱۹۸) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ خَرَجْتُ لَيْلَةً مِنَ اللَّيَالِیْ فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْشِیْ وَحْدَهٗ لَيْسَ مَعَهٗ اِنْسَانٌ قَالَ فَظَنَنْتُ اَنَّهٗ يَكْرَهُ اَنْ يَّمْشِیَ مَعَهٗ اَحَدٌ فَجَعَلْتُ اَمْشِیْ فِیْ ظِلِّ الْقَمَرِ فَالْتَفَتَ فَرَاٰنِیْ فَقَالَ مَنْ هٰذَا قُلْتُ اَبُوْ ذَرٍّ جَعَلَنِیَ اللّٰهُ فِدَاکَ قَالَ يَا اَبَا ذَرٍّ تَعَالَهْ فَمَشَيْتُ مَعَهٗ سَاعَةً فَقَالَ اِنَّ الْمُكْثِرِيْنَ هُمُ الْمُقِلُّوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا مَنْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ خَيْرًا وَ نَفَخَ فِيْهِ يَمِيْنَهٗ وَ شِمَالَهٗ وَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ وَرَاءَهٗ وَ عَمِلَ فِيْهِ خَيْرًا قَالَ فَمَشَيْتُ مَعَهٗ سَاعَةً فَقَالَ لِیْ اجْلِسْ هٰهُنَا قَالَ فَاَجْلَسَنِیْ فِیْ قَاعٍ حَوْلَهٗ حِجَارَةٌ فَقَالَ لِیْ اِجْلِسْ هٰهُنَا حَتّٰى اَرْجِعَ اِلَيْکَ قَالَ فَانْطَلَقَ فِی الْحَرَّةِ حَتّٰى لَا اَرَاهُ فَلَبِثَ عَنِّیْ فَاَطَالَ اللُّبْثَ (و فی باب من اجاب بلبیک و سعدیک فسمعت فتخوفت ان یکون عرض لرسول الله صلی الله علیه وسلم فاردت ان اذهب ثم ذکرت قول رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تبرح فمکثت قلت یا رسول الله سمعت صوتاً خشیت ان یکون عرض لک الخ) ثُمَّ اِنِّیْ سَمِعْتُهٗ وَ هُوَ مُقْبِلٌ وَ هُوَ يَقُوْلُ وَ اِنْ سَرَقَ وَ اِنْ زَنٰى قَالَ فَلَمَّا جَاءَ لَمْ اَصْبِرْ حَتّٰى قُلْتُ يَا نَبِیَّ اللّٰهِ جَعَلَنِیَ اللّٰهُ فِدَاءَکَ مَنْ تُكَلِّمُ فِیْ جَانِبِ الْحَرَّةِ مَا سَمِعْتُ اَحَدًا يَرْجِعُ اِلَيْکَ شَيْئًا قَالَ ذَاکَ جِبْرَئِيْلُ عَرَضَ لِیْ فِیْ جَانِبِ الْحَرَّةِ قَالَ بَشِّرْ اُمَّتَکَ اَنَّهٗ مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِکُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ يَا جِبْرَئِيْلُ وَ اِنْ سَرَقَ وَ اِنْ زَنٰى قَالَ نَعَمْ قُلْتُ وَ اِنْ سَرَقَ وَ اِنْ زَنٰى قَالَ نَعَمْ قُلْتُ وَ اِنْ سَرَقَ وَ اِنْ

(۱۹۸) ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں رات کو باہر نکلا کیا دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تنِ تنہا جا رہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کوئی اور شخص نہیں ہے میں نے سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھ کسی کو لینا مناسب نہ سمجھا ہوگا لہٰذا میں چاندنی سے ہٹ کر اندھیرے اندھیرے میں چلتا رہا آپ نے رخ پھیرا تو مجھے دیکھا فرمایا کون؟ میں بولا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان میں ہوں ابو ذر- فرمایا اے ابو ذر یہاں آؤ' میں کچھ دیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگ یہاں بہت مال دار ہیں قیامت میں وہی سب سے زیادہ نادار ہوں گے مگر صرف وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا تو اس نے دائیں بائیں آگے پیچھے چاروں طرف (فقیروں کو خوب) دیا اور خوب اچھے اچھے کام کیے- پھر میں تھوڑی دیر ساتھ چلا تو مجھ سے فرمایا یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے ایک صاف میدان میں بٹھا دیا جس کے اردگرد پتھر ہی پتھر تھے اور فرمایا کہ جب تک میں واپس نہ آؤں یہیں بیٹھے رہنا اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سنگستان کی طرف تشریف لے گئے- یہاں تک کہ میری نظروں سے غائب ہو گئے' آپ کو گئے ہوئے بہت دیر ہوگئی (واپس آئے) تو میں نے سنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے آرہے تھے اگرچہ چوری کی ہو اگرچہ زنا کیا ہو جب میرے پاس تشریف لے آئے تو مجھ سے نہ رہا گیا آخر میں نے پوچھ ہی لیا یا نبی اللہ آپ پر قربان ہوں اس سنگستان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس سے بات چیت کرتے آرہے تھے میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیتے ہوئے کسی کی آواز نہیں سنی فرمایا یہ جبریل علیہ السلام تھے- اس سنگستان میں میرے پاس آئے تھے یہ کہہ رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جو شرک سے پاک وصاف مر گیا وہ ضرور جنتی ہے- میں نے کہا اے جبریل علیہ السلام اگرچہ اس نے چوری اور زناء کیا ہو انہوں نے کہا جی ہاں- میں نے پھر کہا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کیا ہو- انہوں نے کہا جی ہاں- میں نے پھر کہا اگرچہ اس نے چوری

زَنٰى قَالَ نَعَمْ وَ اِنْ شَرِبَ الْخَمْرَ.
(رواه البخاری فی الرقاق)

اور زناء کیا ہو' انہوں نے فرمایا جی ہاں اگرچہ شراب بھی کیوں نہ پی ہو۔ (بخاری شریف)

الاسلام یهدم ما کان قبله من الذنوب

اسلام زمانہ کفر کے سب گناہوں کا کفارہ ہوجاتا ہے

(۱۹۹) عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ لَمَّا اَلْقَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فِىْ قَلْبِى الْاِسْلَامَ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَايِعَنِىْ فَبَسَطَ يَدَهٗ اِلَىَّ فَقُلْتُ لَا اُبَايِعُكَ حَتّٰى يُغْفَرَلِىْ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِىْ قَالَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَمْرو

(۱۹۹) عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈال دی تو میں آپ کے پاس حاضر ہوا تاکہ آپ مجھے بیعت فرمالیں آپ نے بیعت کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا میں نے کہا میں اس وقت تک آپ سے بیعت نہیں کروں گا جب تک کہ میرے سب پچھلے گناہ معاف نہ ہوں'

---

(۱۹۹) * قرآن کریم نے رحمت کے اس عفو وکرم کے قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (الانفال: ۳۸) ''آپ! کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ (اپنی حرکتوں سے) اب بھی باز آجائیں تو ان کے پچھلے قصور سب معاف کردیئے جائیں گے'' جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور سب ملتوں کو ایک ملت بنانے آیا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام اہل ملل کی سب سے زیادہ مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے یہ ظاہر ہے کہ مذہب کی تلاش صرف اس لیے ہے کہ بندہ کو اپنے خالق کے قہر سے نجات حاصل ہوجائے اور فطرۃً یہی ایک گنہگار کی سب سے بڑی خواہش ہونا بھی چاہیے اس لیے اسلام اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہر ملک و ملت ہر نسل و رنگ کا جو گنہگار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجاتِ ابدی کے لیے ضامن ہوگا۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ مغفرت کا تعلق ذنوب اور گناہوں کے ساتھ ہے ان حقوق کے ساتھ نہیں جو قرض' عاریت' امانت اور خرید و فروخت کے سلسلہ میں اس کے ذمہ ابھی موجود ہیں۔ اسلام ان سب حقوق کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں کرتا بلکہ اس کی ذمہ داری اور بڑھا دیتا ہے۔ قرض خواہ کا قرض ادا کرنا ہوگا۔ صاحب عاریت کی عاریت ضرور واپس کرنا ہوگی اور امانت دار کو اس کی امانت یقیناً سپرد کرنا پڑے گی۔ آیت مذکورہ اور عمرو بن العاص کی حدیث کا تعلق زناء و سرقہ' قتل و غارت جیسے جرائم اور صرف ان حقوق العباد کے ساتھ ہے جو کفر کے زمانہ میں ناحق تلف کردیئے گئے تھے۔ اسلام کے بعد اب وہ سب محو ہوجائیں گے اور کیسے محو نہ ہوں جب کہ اسلام اس کے کفر و شرک کی اصل تاریکی ہی محو کرچکا ہے۔ کفر ایک موت ہے اور اسلام اس کے بعد ایک حیاتِ نو۔

لیکن جس طرح ایک تندرست آدمی بیمار پڑسکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہوسکتے ہیں اس لیے اس کو ایسے اعمال کی ضرورت پھر باقی رہتی ہے جو اس کے اس جدید زندگی کے فروگذاشتوں کا کفارہ بن جائیں۔ حدیث مذکور نے اس کے لیے یہاں دو عمل بتائے ہیں ہجرت اور حج۔ یہ دونوں افعال اگر اپنے پورے شرائط کے ساتھ ادا کیے جائیں تو یہ حقوق اللہ کے لیے کفارہ بن جاتے ہیں اور خاص حج کے متعلق یہ بھی امید ہے کہ وہ حقوق العباد کا کفارہ بھی بن جائے۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ صاحب حقوق کو اپنے خزانہ غیب سے ان کے حقوق کا عوض دے کر ان سے دست برداری دلادے اور اسے معاف کردے۔ مشہور ہجرت تو ختم ہوچکی' حج روزادا نہیں ہوتا اس لیے ایک کمزور انسان کو جو سرتاپا قصور ہی قصور ہے قدم قدم پر ایسے اعمال کی ضرورت ہے جو اس کی کوتاہیوں کا کفارہ بنتے رہیں اس لیے اسلام میں اور بھی بہت سے اعمال ہیں جو اس کی اس درمیانی فروگذاشتوں کا کفارہ بن رہے ہیں۔ لیکن وہ سب اعمال کفارہ کے باب میں ملیں گے....

اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْهِجْرَةَ تَجُبُّ مَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوْبِ يَا عَمْرُو اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْاِسْلَامَ يَجُبُّ مَا قَبْلَهٗ مِنَ الذُّنُوْبِ.

(رواہ احمد و سعید بن منصور فی سننه)

آپؐ نے فرمایا: اے عمرو! کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہجرت پہلے سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اے عمرو! کیا تم یہ نہیں جانتے کہ اسلام پہلے گناہوں کا تمام قصہ پاک کر دیتا ہے۔

(سنن احمد)

(۲۰۰) عَنِ ابْنِ شُمَاسَةَ الْمَهْرِیْ قَالَ حَضَرْنَا عَمْرَو بْنَ الْعَاصِ وَ هُوَ فِیْ سِیَاقَةِ الْمَوْتِ یَبْكِیْ طَوِیْلًا حَوَّلَ وَجْهَهٗ اِلَی الْجِدَارِ فَجَعَلَ ابْنُهٗ یَقُوْلُ یَا اَبَتَاهُ اَمَا بَشَّرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ هٰكَذَا اَمَا بَشَّرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِكَذَا قَالَ فَاَقْبَلَ بِوَجْهِهٖ اِلَی الْجِدَارِ وَ قَالَ اِنَّ اَفْضَلَ مَا نُعِدُّ شَهَادَةُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اِنِّیْ قَدْ كُنْتُ عَلٰی اَطْبَاقٍ ثَلَاثٍ لَقَدْ رَاَیْتُنِیْ وَ مَا اَحَدٌ اَشَدُّ بُغْضًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنِّیْ وَ لَا اَحَبُّ اِلَیَّ اَنْ اَكُوْنَ قَدِ اسْتَمْكَنْتُ مِنْهُ فَقَتَلْتُهٗ فَلَوْ مُتُّ عَلٰی تِلْكَ الْحَالِ لَكُنْتُ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَلَمَّا جَعَلَ اللّٰهُ الْاِسْلَامَ فِیْ قَلْبِیْ اَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اُبْسُطْ یَمِیْنَكَ فَلَاُ بَایِعُكَ فَبَسَطَ یَمِیْنَهٗ قَالَ فَقَبَضْتُ یَدِیْ قَالَ مَا لَكَ یَا عَمْرُو قَالَ قُلْتُ اَرَدْتُ اَنْ اَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ بِمَا ذَا قُلْتُ اَنْ یُغْفَرَلِیْ قَالَ اَمَا

(۲۰۰) ابن شماسہ مہری سے روایت ہے کہ ہم عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ان کے دم واپسیں کے وقت حاضر تھے وہ زار و قطار رو رہے تھے اور دیوار کی طرف اپنا رخ کیے ہوئے تھے' ان کے صاحبزادہ ان کو سمجھانے لگے۔ اے والد ماجد! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو تو بڑی بڑی بشارتیں دی ہیں یہ سن کر انہوں نے دیوار کی طرف سے اپنا رخ بدلا اور فرمایا بھئی سب سے افضل چیز جو ہم نے آخرت کے لیے تیار کی ہے وہ توحید و رسالت کی شہادت ہے۔ میری زندگی کے تین دور گذرے ہیں ایک دور تو وہ تھا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض رکھنے والا مجھ سے زیادہ کوئی اور شخص نہ تھا اور جب کہ میری سب سے بڑی تمناء یہ تھی کہ کسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر میرا قابو چل جائے تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مار ڈالوں یہ تو میری زندگی کا سب سے بدتر دور تھا۔ اگر (خدانخواستہ) میں اسی حال پر مر جاتا تو یقیناً دوزخی ہوتا اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈالی تو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں نے کہا لائیے ہاتھ بڑھائیے میں آپ سے بیعت کرتا ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمرو (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! یہ کیا: میں نے عرض کیا میں کچھ شرط لگانا چاہتا ہوں۔ فرمایا کیا شرط لگانا چاہتے ہو' میں نے کہا یہ کہ میرے سب گناہوں کی مغفرت ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے عمرو (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)! کیا تمہیں خبر نہیں کہ اسلام تو کفر کی زندگی کے گناہوں کا تمام قصہ ہی پاک کر دیتا ہے اور ہجرت بھی پہلے تمام گناہ ساقط کر

ﷲ ....فروعی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہجرت اسلامی زندگی کا ایک تاریخی عمل ہے اور حج جملہ ادیان میں اہمیت رکھتا چلا آیا ہے اس لیے ان دونوں کی حیثیت اصل کی ہے اور ان سب کے لیے اسلام کی حیثیت اصل الاصل کی۔

عَلِمْتَ یَا عَمْرُو اَنَّ الْاِسْلَامَ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ وَ اَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهَا وَ اَنَّ الْحَجَّ یَهْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَهٗ وَ مَا کَانَ اَحَدٌ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ لَا اَجَلَّ فِیْ عَیْنَیَّ مِنْهُ وَ مَا کُنْتُ اُطِیْقُ اَنْ اَمْلَأَ عَیْنَیَّ مِنْهُ اِجْلَالًا لَهٗ وَ لَوْ سُئِلْتُ اَنْ اَصِفَهٗ مَا اَطَقْتُ لِاَنِّیْ لَمْ اَکُنْ اَمْلَأُ عَیْنَیَّ مِنْهُ وَ لَوْ مُتُّ عَلٰی تِلْکَ الْحَالِ لَرَجَوْتُ اَنْ اَکُوْنَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ وَ لِیْنَا اَشْیَاءَ مَا اَدْرِیْ مَا حَالِیْ فِیْهَا فَاِذَا اَنَامُتُّ فَلَا تَصْحَبْنِیْ نَائِحَةٌ وَ لَا نَارٌ فَاِذَا دَفَنْتُمُوْنِیْ فَشُنُّوْا عَلَیَّ التُّرَابَ شَنًّا ثُمَّ اَقِیْمُوْا حَوْلَ قَبْرِیْ قَدْرَمَا تُنْحَرُ جَزُوْرٌ وَ یُقْسَمُ لَحْمُهَا حَتّٰی اَسْتَاْنِسَ بِکُمْ وَ اَنْظُرَ مَا ذَا اُرَاجِعُ بِهٖ رُسُلَ رَبِّیْ)). (رواہ مسلم)

دیتی ہے اور حج بھی پہلے سب گناہ ختم کر دیتا ہے- یہ دور وہ تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ پیارا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ بزرگ و برتر میری نظروں میں کوئی اور باقی نہ رہا تھا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی وجہ سے میری یہ تاب نہ تھی کہ کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نظر بھر کر دیکھ سکتا اگر مجھ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت پوچھی جائے تو میں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ میں نے کبھی پوری طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہی نہیں- کاش! اگر میں اس حال پر مر جاتا تو اُمید ہے کہ جنتی ہوتا- اس کے بعد ہم کچھ چیزوں کے متولی بنے اور نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا حال ان میں کیا رہا (یہ تیسرا دور زندگی تھا) اچھا دیکھو جب میری وفات ہو جائے تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت نہ جانے پائے اور نہ زمانہ جاہلیت کی طرح آگ میرے جنازہ کے ساتھ ہو اور جب مجھے دفن کر چکو تو میری قبر میں اچھی طرح مٹی ڈالنا اور (جب فارغ ہو جاؤ) تو میری قبر کے پاس اتنی دیر ٹھہرنا جتنی دیر کہ اونٹ نحر کر کے اس کا گوشت تقسیم ہو سکتا ہے تاکہ تمہاری وجہ سے میرا دل لگا رہے اور میں یہ معلوم کر لوں کہ اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے فرشتوں کے سوالات کے جوابات کیا دیتا ہوں-

(۲۰۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ اَنَّ نَاسًا مِنْ اَهْلِ الشِّرْکِ قَتَلُوْا فَاَکْثَرُوْا وَ زَنَوْا فَاَکْثَرُوْا ثُمَّ اَتَوْا مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا اِنَّ الَّذِیْ تَقُوْلُ وَ تَدْعُوْ لَحَسَنٌ وَ لَوْ تُخْبِرُنَا اَنَّ لِمَا عَمِلْنَا کَفَّارَةٌ فَنَزَلَ ﴿وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَ لَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ لَا یَزْنُوْنَ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا﴾ (الفرقان:۶۸) وَ نَزَلَ ﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (الزمر:۵۳)

(۲۰۱) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ کچھ مشرکوں نے خوب قتل اور خوب زناء کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور بولے جو باتیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اور جن کی دعوت دیتے ہیں وہ تو سب ٹھیک- کاش آپ ہمیں اس کا بھی اطمینان دلا دیتے کہ جو بدکاریاں ہم پہلے کر چکے ہیں ان کے بخشش کی بھی کوئی صورت ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا نہیں مانتے اور جس کا خون اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر ضابطہ میں اور زنا نہیں کرتے اور جو یہ باتیں کریں وہ بڑے گناہ میں جا پڑے) اور یہ آیت بھی اتری (اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)-

(۲۰۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ ؓ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْخٌ كَبِيْرٌ يُدَعِّمُ عَلٰى عَصَالَهُ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) اِنَّ لِيْ غَدَرَاتٍ وَ فَجَرَاتٍ فَهَلْ يُغْفَرُلِيْ قَالَ اَلَسْتَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ بَلٰى وَ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ قَدْ غُفِرَلَكَ غَدَرَاتُكَ وَ فَجَرَاتُكَ. (رواه احمد و الطبرانی و سنده جید)

(۲۰۲) عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک بوڑھا اپنی لکڑی کا سہارا لیے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے کفر کے زمانہ میں بہت سی خیانتیں اور قسم قسم کی بیہودگیاں کر چکا ہوں کیا (اسلام کے بعد) وہ سب معاف کر دی جائیں گی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو یہ گواہی نہیں دیتا کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ؟ اس نے کہا کیوں نہیں میں تو یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو جا تیری سب خیانتیں اور بیہودگیاں معاف ہوگئیں۔

(۲۰۳) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَامُهُ يُكَفِّرُ اللّٰهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَّفَهَا وَ كَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمِاْئَةِ ضِعْفٍ وَ السَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ يَتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا. (رواه البخاری فی الایمان)

(۲۰۳) ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب آدمی مسلمان ہو جاتا ہے اور اس کا اسلام خوبصورت اسلام بن جاتا ہے تو جتنی برائیاں وہ پہلے کر گذرا تھا اللہ تعالیٰ سب معاف کر دیتا ہے اور اس کے بعد حساب یہ رہتا ہے کہ ایک نیکی کے عوض میں دس نیکیوں سے سات سوگنا تک نیکیاں مل سکتی ہیں اور برائی کے بدلہ میں صرف ایک برائی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرمائے (تو اب برائی کے بدلہ ایک برائی بھی نہیں لکھی جاتی)۔

---

(۲۰۲) * ہر عاصی فطرۃً اس کا متلاشی ہوتا ہے کہ اس کے گناہوں کی بخشش ہو جائے۔ اگر تبدیلی مذہب کے بعد بھی گناہوں کا بوجھ سر سے ہلکا نہیں ہوتا۔ تو پھر تبدیلی مذہب کا فائدہ؟ اس لیے اسلام یہ اطمینان دلاتا ہے کہ گنہگاروں کو مایوسی کا موقع نہیں ہے اگر دوسرے مذاہب یہ گارنٹی نہیں کرتے تو اسلام خوشی سے اس گارنٹی کے لیے تیار ہے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم ہائے سیاہ کو تیرے عفو بندہ نواز میں

(۲۰۳) * حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اسلام کی خوبصورتی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں۔ ظاہر و باطن سے اسلام قبول کر لیا جائے اور ہر عمل کے وقت یہ تصور قائم رکھنے کی کوشش رہے کہ قادر مطلق کی نظر اس کو برابر دیکھ رہی ہے وہ اس سے دور نہیں بہت قریب ہے اور اتنا قریب ہے کہ رگ جان بھی اتنی قریب نہیں۔ جو نقل و حرکت وہ کرتا ہے اس کو خوب جانتا ہے۔ اس طرح اسلام قبول کرنے کا خاصہ یہ ہے کہ جو بدکاریاں وہ کفر کی زندگی میں کر چکا ہے وہ یک قلم معاف ہو جاتی ہیں اور اس کو ایک ایسی نئی اور پاک زندگی میسر آ جاتی ہے جیسا آج وہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ شیخ محی الدین نووی فرماتے ہیں۔ کہ اسلام کی خوبصورتی یہ ہے کہ دل سے اسلام لائے محض نمائشی اسلام نہ ہو کہ یہ نفاق ہے۔ پس جو دل سے مسلمان ہو گیا اس کے زمانہ کفر کے سب گناہ معاف ہو گئے اور جس کے دل میں نفاق رہا وہ اس بشارت کا مستحق نہیں۔

الاعمال بغير الايمان اجساد لا ارواح لها

(۲۰۴) عَنْ فُضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الشُّهَدَاءُ اَرْبَعَةٌ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْاِيْمَانِ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَّقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِمْ اَعْيُنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ هٰكَذَا وَ رَفَعَ رَأْسَهٗ حَتّٰى سَقَطَتْ قَلَنْسُوَتُهٗ فَمَا اَدْرِيْ اَقَلَنْسُوَةَ عُمَرَ اَرَادَ اَمْ قَلَنْسُوَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْاِيْمَانِ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَكَاَنَّمَا ضُرِبَ جِلْدُهٗ بِشَوْكِ طَلْحٍ مِنَ الْجُبْنِ اَتَاهُ سَهْمٌ غَرْبٌ فَقَتَلَهٗ فَهُوَ فِي الدَّرَجَةِ الثَّانِيَةِ وَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ خَلَطَ عَمَلًا صَالِحًا وَ اٰخَرَ سَيِّئًا لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَّقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَاكَ فِي الدَّرَجَةِ الثَّالِثَةِ وَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ اَسْرَفَ عَلٰى نَفْسِهٖ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَّقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَاكَ فِي الدَّرَجَةِ الرَّابِعَةِ.

(رواه الترمذی و قال حديث حسن غريب)

ایمان کے بغیر اعمال صرف خوشنما قالب ہیں جن میں روح نہیں

(۲۰۴) فضالہ بن عبید روایت فرماتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطابؓ سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ شہید چار قسم کے ہیں ایک وہ کھرے ایمان والا جو دشمن کے مقابل ہوا اور اس بہادری سے لڑا کہ ثابت قدمی کی جو شان اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کی بیان فرمائی تھی وہ اس نے اپنے عمل سے سچی کر دکھائی (اور نہایت دلیری سے لڑتا رہا) یہاں تک کہ شہید ہو گیا یہ تو وہ مؤمن ہے جس کے مرتبے اتنے بلند ہوں گے کہ قیامت کے دن لوگ اس کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا کر اس طرح دیکھیں گے یہ کہہ کر انہوں نے اپنا سر اٹھایا یہاں تک کہ ان کی ٹوپی سر سے گر گئی۔ راوی کہتا ہے یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے استاد کی مراد کس کی ٹوپی تھی حضرت عمرؓ کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے بعد فرمایا دوسرا وہ شخص ہے جس کا ایمان تو کھرا تھا لیکن وہ (بہادر نہ تھا) جب دشمن کے آمنے سامنے ہوا تو مارے بزدلی کے اس کا حال یہ ہو گیا کہ گویا اس کے جسم میں طلح درخت کے کانٹے چبھو دیئے گئے۔ پھر کسی نامعلوم سمت سے ایک تیر آ کر اس کے لگا اور اس کو ختم کر دیا۔ یہ دوسرے درجہ کا شہید ہے۔ تیسرا وہ معمولی درجہ کا مؤمن ہے جس نے پہلے عمل کے ساتھ کچھ برے عمل بھی کیے تھے جب دشمن سے لڑا تو ایسی جانبازی سے لڑا کہ اللہ تعالیٰ نے مؤمن کی جو شان بیان فرمائی تھی اس کو سچا کر دکھایا یہاں تک کہ شہید ہو گیا یہ تیسرے نمبر کا شہید ہے۔ چوتھا وہ شخص ہے جس نے گناہ کرنے کی حد باقی نہ رکھی تھی (مگر بہادر تھا) جب لڑا تو اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کو سچا ثابت کر دیا اور خوب بہادری سے لڑا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ یہ چوتھے نمبر کا شہید ہے۔

(۲۰۵) عَنْ اَبِيْ اِسْحَاقَ قَالَ سَمِعْتُ الْبَرَاءَ

(۲۰۵) ابو اسحاق سے مروی ہے کہ میں نے براء کو یہ کہتے سنا ہے کہ

---

(۲۰۴) ✽ اس تقسیم کا خلاصہ یہ ہے کہ مجاہد کبھی تو بہادر ہونے کے ساتھ متقی بھی ہوتا ہے کبھی صرف متقی ہوتا ہے بہادر نہیں ہوتا اس کے برخلاف کبھی ایک شخص بہادر تو ہوتا ہے مگر متقی نہیں ہوتا۔ پھر یہ غیر متقی یا تو معمولی طور پر گنہگار رہتا ہے اور کبھی کھلا ہوا فاسق ہوتا ہے۔ طیبی فرماتے ہیں اس تقسیم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اعمال کی تمام قیمت ایمان ہی کے بعد ہے اسی لیے چوتھا شخص اگرچہ بہادر تھا اور دوسرا اگرچہ بزدل مگر ایمان ہی کے ضعف و قوت کے تفاوت سے یہ بہادر چوتھے نمبر میں اور وہ بزدل دوسرے نمبر میں پہنچ گیا ہاں اگر خوش قسمتی سے ایمان کے ساتھ بہادری بھی جمع ہو جائے تو اس کے کیا کہنے۔

(۲۰۵) ✽ یعنی زمانہ کفر کا بڑا عمل بھی بے وزن ہے اور ایمان کا تھوڑا سا عمل بھی بہت بھاری ہے۔ جاں نثاری کی تمام ←....

يَقُوْلُ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مُقَنَّعٌ بِالْحَدِيْدِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اُقَاتِلُ اَوْ اُسْلِمُ قَالَ اَسْلِمْ ثُمَّ قَاتِلْ فَاَسْلَمَ ثُمَّ قَاتَلَ فَقُتِلَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَمِلَ قَلِيْلًا وَ اُجِرَ كَثِيْرًا. (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص (زرہ پہنے) سرتاپا لوہے میں ڈھکا ہوا آیا اس نے کہا یا رسول اللہؐ میں پہلے جہاد میں شریک ہو جاؤں یا پہلے اسلام لے آؤں پھر جہاد کروں آپ نے فرمایا پہلے اسلام قبول کر اس کے بعد جہاد کرنا - چنانچہ وہ پہلے مسلمان ہوا اس کے بعد جہاد کیا اور شہید ہو گیا آپ نے فرمایا اس نے کام تو کم کیا مگر ثواب بہت پائے گا -

مثل الذی یقرأ القران و لا یؤمن کالریحانة ریحها طیب و طعمها مر

اس کی مثال جو ایمان نہیں رکھتا اور قرآن پڑھتا ہے نازبو کی طرح ہے جس کی خوشبو اچھی مگر ذائقہ تلخ ہوتا ہے

(۲۰۶) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَ یَعْمَلُ بِهٖ كَالْاُتْرُجَّةِ طَعْمُهَا طَیِّبٌ وَرِیْحُهَا طَیِّبٌ وَالْمُؤْمِنُ الَّذِیْ لَایَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَ یَعْمَلُ بِهٖ كَالتَّمْرَةِ طَعْمُهَا طَیِّبٌ وَلَارِیْحَ لَهَا وَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَالرَّیْحَانَةِ رِیْحُهَا طَیِّبٌ وَ طَعْمُهَا مُرٌّ وَ مَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ لَایَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَالْحَنْظَلَةِ طَعْمُهَا مُرٌّ اَوْخَبِیْثٌ وَ رِیْحُهَا مُرٌّ. (بخاری)

(۲۰۶) ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مؤمن قرآن پڑھتا اور اس پر عمل بھی کرتا ہے وہ سنگترے کی طرح ہے جس کا ذائقہ بھی اچھا اور خوشبو بھی اچھی اور جو قرآن نہیں پڑھتا مگر اس کے احکام پر عمل کرتا ہے وہ کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ تو اچھا مگر خوشبو کچھ نہیں اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ریحان (نازبو) کی سی ہے جس کی خوشبو تو بہت اچھی مگر ذائقہ تلخ اور جو قرآن بھی نہیں پڑھتا اس کی مثال درخت حنظل کی سی ہے جس کا ذائقہ بھی تلخ اور بو بھی ناگوار-

(بخاری شریف)

ﷺ .... قیمت اس وقت ہے جب کہ وفاداری کا طوق گلے میں پڑا ہو ورنہ صرف وہ ایک غدار کی موت ہے جس صورت سے بھی آ جائے، خس کم جہاں پاک - اس لیے آپ نے اس شخص کو پہلے اسلام لانے کا مشورہ دیا - اس خوش نصیب کے گذشتہ گناہ تو اسلام سے معاف ہو گئے تھے پھر اس معصومی کی حالت میں جو پہلا عمل اس نے کیا وہ شہادت تھا اس لیے اس کے عمل کی مدت گو بہت قلیل رہی مگر ثواب کی بہت بڑی بازی جیت لے گیا - امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس حدیث سے ایک اور لطیف استنباط کیا ہے یعنی جہاد سے پہلے کوئی اچھا عمل کرنا مطلوب ہے تا کہ عمل خیر کی برکت ثبات قدمی میں معین ہو-

(۲۰۶) * یعنی جس طرح پھل کی صرف خوشبو سے اس کے ذائقہ کا حال معلوم نہیں ہوتا اسی طرح صرف قرآن پڑھنے سے کسی کے ایمان کا حال نہیں کھلتا اور جس طرح کہ پھل کی اصل خوبی اس کا خوش ذائقہ ہونا ہے صرف اس کی خوشبو نہیں وہ ایک سامان تفریح ہے اسی طرح انسان کی اصل خوبی ایمان ہے صرف تلاوت قرآن نہیں یہ مؤمن کے ایمان کی زینت ہے نہ کہ منافق کے نفاق کی مگر مشک جس کے پاس ہو گا خوشبو ہی دے گا اسی طرح قرآن جو تلاوت کرے گا اس کی خوشبو ضرور مہکے گی مگر صرف اتنی بات پر دھوکا نہ کھانا چاہیے عمل کی اصل روح ایمان ہے-

بشارة التضعيف بعشر امثالها لمن اسلم

(۲۰۷) حَدَّثَنَا اَبُوْهُرَيْرَةَ عَنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِذَا تَحَدَّثَ عَبْدِىْ بِاَنْ يَعْمَلَ حَسَنَةً فَاَنَا اَكْتُبُهَا لَهُ حَسَنَةً مَالَمْ يَعْمَلْ فَاِذَا عَمِلَهَا فَاَنَا اَكْتُبُهَا بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا وَ اِذَا تَحَدَّثَ بِاَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً فَاَنَا اَغْفِرُهَا لَهُ مَا لَمْ يَعْمَلْهَا فَاِذَا عَمِلَهَا فَاَنَا

جو اسلام لے آئے اس کے لیے ایک نیکی پر دس نیکیوں کی بشارت

(۲۰۷) ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث قدسی میں روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میرا بندہ جب اپنے دل میں کوئی نیک کام کرنے کا خیال کرتا ہے تو صرف اس خیال پر میں ایک نیکی لکھ دیتا ہوں' یہ تو اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ اسے کرتا نہیں اور اگر یہ نیکی کر لیتا ہے تو اب اس کا دس گنا لکھتا ہوں اور جب دل میں کسی برائی کا خیال کرتا ہے تو اسے معاف کر دیتا ہوں اگر کر لیتا ہے تو اسے صرف ایک برائی لکھتا ہوں - آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

---

(۲۰۷) * اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عزم معصیت کے بعد اس پر عمل نہ کرنے پر نیکی صرف اس صورت میں لکھی جاتی ہے جب کہ اس معصیت کا نہ کرنا خدا کے خوف پر مبنی ہو' اگر ناسازگاری حالات کی وجہ سے یہ معصیت وجود میں نہ آ سکی یا کسی سہو و نسیان کی بناء پر ذہن سے نکل گئی تو اس قسم کی صورتوں میں صرف ترکِ معصیت سے وہ نیکی کا حق دار نہیں ہوتا - صحیح مسلم میں اسراء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی پر دس گنا ملنے کا ضابطہ ان خصوصی انعامات میں داخل ہے جو معراج کی پر اسرار شب میں آپ پر کئے گئے تھے - بہر حال جس امت کو قلیل مدت میں تمام امتوں پر فائق بنانا منظور تھا اس کی صورت یہی ہوسکتی تھی کہ اس کے قلیل عمل کے لیے تضعیف کا ضابطہ وضع کر دیا جائے تا کہ اس جدید قانون کے ماتحت اس کے تھوڑے عمل بھی دوسری امتوں کے طویل مدتوں کے عمل سے بڑھ جائیں اور اس پیرایہ سے عمل کی بازی جس امت کو جتانی منظور تھی وہ جیت بھی جائے اور قانون عدل و فضل دونوں کا اقتضاء بھی پورا ہو جائے - اس حدیث میں کسی نیک یا بد کام کے عملی جامہ پہنانے یا ارادہ کرنے کی چار صورتیں مذکور ہیں -

(۱) نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کر لینا - (۲) نیکی کا صرف ارادہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا - عمل دارادہ کے اعتبار سے بدی کی بھی یہی دو صورتیں ہیں - اس طرح یہ چار صورتیں بن جاتی ہیں - پہلی صورت میں ایک نیکی دس گنا' سات سو گنا اور کبھی مراتب اخلاص کے اعتبار سے شمار کی حد بندی سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے - دوسری صورت میں صرف ارادہ پر پوری ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے لیکن بدی کا حکم یہ نہیں ہے - یہاں عمل کی صورت میں صرف ایک بدی لکھی جاتی ہے اور ارادہ کے بعد نہ کرنے پر بدی کے بجائے ایک نیکی لکھی جاتی ہے -

صحیح مسلم میں اسی روایت میں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے حدیث النفس کی بجائے ھَمّ کا لفظ مروی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف خطرہ کا درجہ مراد نہیں بلکہ ارادہ کا وہ مرتبہ مراد ہے جس کے بعد عمل کے لیے دل میں فکر پیدا ہو جائے - اسی کا نام ھَمّ ہے - حزیم بن فاتک کے الفاظ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عزم مراد ہے صرف وسوسہ و خیال مراد نہیں -

من هم بحسنة فلم يعملها فيعلم الله منه انه قد اشعر قلبه و حرص عليها كتبت له حسنة.

''جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ پر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ اس کا برابر احساس کر رہا ہے اور اس کو عمل میں لانے کے لیے حریص ہے پھر ان مراحل کے بعد بھی اگر اس کو نہ کیا تو بے شک اب اس کے لیے ایک نیکی لکھ دی جائے گی -''

صرف حسنہ کے ارادہ پر ایک نیکی لکھے جانے میں تو کوئی تفصیل نہیں ہے لیکن سیئہ کے ارادہ کر لینے کے بعد نہ کرنے پر ایک بقیہ ....

اَكْتُبُهَا لَهٗ بِمِثْلِهَا وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ رَبِّ ذَاكَ عَبْدُكَ يُرِيْدُ اَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً وَ هُوَ اَبْصَرُ بِهٖ

فرشتے عرض کرتے ہیں اے پروردگار یہ تیرا بندہ برائی کرنے کا قصد کر رہا ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ان سے زیادہ ہوتا ہے) ارشاد ہوتا ہے ابھی اسے دیکھتے رہو اگر کرلے تو اس کی صرف ایک برائی لکھ لو اور اگر چھوڑ

ﷺ..... حسنہ ملنے پر قدرے تفصیل کی حاجت ہے۔

عزم علی المعصیۃ کی وہ صورت جس سے مقصود شریعت کا استخفاف و استہزاء ہو یہاں زیر بحث ہی نہیں یہ تو کھلا ہوا کفر ہے۔ اسی طرح وہ صورت بھی زیر بحث نہیں ہے جہاں ایک شخص صرف اپنی خواہش نفس کی بنا پر کسی معصیت کا عزم کر لیتا ہے لیکن اس کے بعد خدا کے خوف سے وہ اس معصیت کا ارتکاب نہیں کرتا۔ یہاں بھی بلا شبہ اس کے خوف وخشیت کی وجہ سے ایک حسنہ کا ثواب ملنا چاہیے جیسا کہ صورت مذکورہ میں اگر ترک معصیت کا داعیہ مخلوق کا خوف یا محض ریا کاری ہو تو اس سے مواخذہ ہونا چاہیے غور طلب صورت صرف یہ ہے کہ ایک شخص عزم کر لینے کے بعد خود بخود اپنے ارادہ میں سست پڑ جاتا ہے اور اس لیے عمل کرنے کی اسے نوبت ہی نہیں آتی۔ کیا اس کا صرف یہ عزم بھی معصیت شمار ہوگا یا جب کہ عمل کی حد تک پہنچا ہی نہیں تو معاف ہو جائے گا۔ فقہاء و متکلمین و محدثین کا مختار تو یہ ہے کہ چونکہ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا اس لیے اس سے مواخذہ ہوگا گو یہ مواخذہ خود اس معصیت کے مواخذہ سے ہلکا رہے۔

ابن المبارکؒ نے سفیان ثوریؒ سے دریافت کیا کیا آدمی کے ارادہ پر بھی مواخذہ ہوتا ہے؟ فرمایا ہاں جب پختہ ہو جائے امام شافعیؒ اور ابن حامد اس طرف ہیں کہ صرف عزم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے جب تک کہ اس کو منہ سے نہ نکالے یا اس پر عمل نہ کرے۔ یہ تمام تفصیل ان معاصی کے ارادہ میں ہے جن کا تعلق جوارح کے ساتھ ہو مثلاً چوری، زنا، شراب خوری وغیرہ۔ رہ گئے وہ اعمال جن کو اعمال قلبیہ کہا جاتا ہے جیسے کفر، حسد، جذبہ ایذاء رسانی وغیرہ جہاں عمل جوارح کا سوال ہی نہیں تو یہاں بلا تردد صرف عزم بلکہ ہم پر بھی مواخذہ ہوگا۔

فقہاء و متکلمین اور امام شافعیؒ کے درمیان زیر اختلاف شق اب بھی تشنہ ہے۔ ہمارے نزدیک حافظ ابن رجب کی تفصیل یہاں بہت دل پذیر ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی معصیت کا پہلی ہی مرتبہ ارادہ کرتا ہے یعنی ابھی اس نافرمانی کی اپنی عمر بھر میں اسے نوبت ہی نہیں آئی تھی تو پہلی مرتبہ عزم پر اس سے مؤاخذہ نہ ہوگا لیکن اگر وہ اس معصیت کا ذائقہ بھی پہلے چکھ چکا ہے اور اب پھر اس کا عزم کر رہا ہے تو اس کے اس عزم پر بھی مواخذہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اب اسے صرف عزم نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ اصرار کی تعریف میں آ جاتا ہے یہ قابل اغماض نہیں جیسا کہ وہ شخص جو عزم کے بعد اپنی جانب سے تو اس عمل کے تمام مقدمات پورے کر چکا ہو پھر کچھ آسمانی اسباب ایسے رونما ہو جائیں جو اس کو عملی جامہ پہنانے میں حائل ہو جائیں وہ بھی اس قدرتی معذوری کی بناء پر معذور نہیں کہا جا سکتا اب وہ بھی قابل درگذر نہیں ہے۔ اسی لیے جب آپ نے قاتل و مقتول کے متعلق جہنم کی وعید بیان فرمائی تو سامعین نے پوچھا کہ بے چارا مقتول دوزخ میں کیوں گیا۔ آپ نے فرمایا کہ انہ کان حریصا علی قتل صاحبہ۔ وہ بھی تو اپنے بھائی کے قتل کرنے کی فکر میں لگ رہا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی سبب سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاتل و مقتول گناہ میں دونوں برابر ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ قاتل کا جرم شدید ہے اس کو سزا بھی شدید ملے گی بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو پورے عزم کے بعد عمل کے لیے قدم بھی اٹھا چکا ہے اگرچہ کسی سبب سے کامیاب نہ ہو سکا لیکن وہ اپنی اس غیر اختیاری ناکامی سے اپنے اس اختیاری عزم اور اس کو پورا کرنے کے اختیاری سعی کے جرم سے بری نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح عزم کے بعد عمل کے لیے سعی کرنا قابل مواخذہ ہو سکتا ہے اسی طرح کسی معصیت کے ارتکاب کے بعد اس کا پھر ارادہ کرنا بھی قابل مواخذہ ہونا چاہیے کیونکہ اب یہ محض عزم باقی نہیں رہا بلکہ عمل کی ابتدائی کڑی سمجھا جائے گا اگرچہ وہ کتنی ہی ﷺ.....

فَقَالَ ارْقُبُوْهُ فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ بِمِثْلِهَا وَ اِنْ تَرَكَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ حَسَنَةً اِنَّمَا تَرَكَهَا مِنْ جَرَّائِيْ. (رواہ مسلم و البخاری نحوہ)

دے تو اب اس کے حق میں اسے بھی ایک نیکی لکھ لو- کہ اس نے میرے ہی خوف سے اس برائی کو چھوڑا ہے-

(متفق علیہ)

بشارة التضاعيف لمن حسن اسلامه

جو اپنے اسلام میں خوبی پیدا کرے اس کے لیے ایک نیکی پر سات سو گنا نیکیوں کی بشارت

(۲۰۸) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ بِاِسْلَامِهٖ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمِاَةِ ضِعْفٍ وَ كُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِمِثْلِهَا وَ فِیْ رِوَايَةٍ اِلَّا اَنْ يَتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا. (رواہ الشیخان)

(۲۰۸) ابو ہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب تم میں کوئی سچا اور پکا مسلمان بن جاتا ہے تو پھر جو نیکی کرتا ہے وہ اس کے نامہ اعمال میں دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جاتی ہیں اور جو برائی کرتا ہے وہ صرف اتنی ہی لکھی جاتی ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ احتمال یہ بھی رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرمائے (تو اب ایک بھی نہیں لکھی جاتی) (بخاری و مسلم)

.... بعید ہو صرف عزم پر مواخذہ گونا مناسب معلوم ہوتا ہے مگر یہ واضح رہنا چاہیے کہ عمل کی تمام روح انسان کی قوت ارادی ہے- اگر انسان کی اس قوت کو پورے طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کے عزم پر کسی قسم کا کنٹرول قائم نہ رکھا جائے تو اس کے بعد معاصی و فواحش سے اس کو روکنا بہت مشکل بلکہ بے نتیجہ ہوگا لہٰذا اگر آپ صرف عزم پر مواخذہ کی مشکل پر غور کر رہے ہیں تو اس مشکل پر بھی ذرا غور کیجئے کہ اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ کسی بدتر سے بدتر گناہ جیسے قتل، چوری، زناء، شراب خواری کا پورا پورا عزم کرنے کے بعد بھی انسان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوتا تو کیا بالفاظ دیگر یہ ان افعال کی اجازت دینے کے مرادف نہ ہوگا- ارادہ کا یہ درجہ عمل سے بہت ہی قریب ہے- کیا اس مرتبہ سے اغماض اور دوسرے بالکل متصل نقطہ پر مواخذہ کرنا انسانی ضعف کے مناسب ہوگا- واللہ تعالیٰ اعلم-

(۲۰۸) * حسنات کی اس تضعیف کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب ایمان و اسلام سے گذر کر صفت احسان میں قدم رکھا جائے- حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ ایک نیکی پر اس کا دس گنا ملنا تو اس امت کے حق میں عام ضابطہ ہے لیکن خدا کی رحمت اپنا دروازہ اس حد پر پہنچ کر بند نہیں کرتی بلکہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ دینے کے لیے کھلا رکھتی ہے جیسے جیسے یہ صفت احسان کامل ہوتی جائے گی یعنی عبادت میں جتنا خلوص اور اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا جتنا تصور غالب ہوتا جائے گا اتنا ہی ایک نیکی کا ثواب بڑھتا جائے گا- اسی طرح بعض وقت خود عمل کی برتری و فضیلت اور کبھی ضرورت کا بروقت احساس کرنا بھی ایک نیکی کو بے شمار نیکیاں بنا دیتا ہے- ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ حسب ذیل آیت تو عام مسلمانوں کے بارے میں ہے-

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا﴾ (الانعام: ۱۶۰) جو ایک نیکی کرے گا اس کو اس کا دس گنا ملے گا-

کہئے مہاجرین کے لیے کیا ضابطہ ہے- انہوں نے جواب دیا کہ اس سے اور زیادہ ثواب اور یہ آیت تلاوت فرمائی - ﴿وَ اِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَ يُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (النساء: ۴۰) اگر نیکی ہو تو اس کو بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے اور بڑا ثواب دیتا ہے- ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیاں بھی لکھ دیتا ہے جیسا کہ آیت بالا میں ہے کہ وہ اپنے پاس سے بڑا ....

اذا حسن اسلامه یکتب له فی الاسلام کل حسنة عملها فی الشرک

اچھے اسلام کے بعد زمانہ کفر کی نیکیاں بھی نامہ اعمال میں لکھ دی جاتی ہیں

(۲۰۹) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیْ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْکَافِرَ اِذَا اَحْسَنَ اِسْلَامُہٗ یُکْتَبُ لَہٗ فِی الْاِسْلَامِ کُلُّ حَسَنَةٍ عَمِلَھَا فِی الشِّرْکِ. (ذکر الدارقطنی تلك الزيادة فی حديث ابی سعيد كما حكاه النووی فی شرح مسلم)

(۲۰۹) ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب آدمی کے اسلام میں خوب صورتی پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی تمام وہ نیکیاں جو اس نے شرک کے زمانہ میں کی تھیں اسلام کے بعد سب لکھ دی جاتی ہیں۔

(دار قطنی)

ﷺ.... ثواب اور بھی دیتا ہے۔ تو اب سوچو کہ اس ثواب کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ (جامع العلوم والحکم ص ۲۵۵)

بہر حال نیکیوں کی تضعیف اور زیادتی کا ضابطہ سات سوگنا پر جا کر ہی ختم نہیں ہوتا اس سے بھی کہیں اوپر پہنچتا ہے بے شک جس کی رحمت غیر متناہی ہو اس کے انعامات کی انتہا بھی نہ ہونا چاہیے لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ علی الحساب داد و دہش اسلام کے اس اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوتی ہے جس کا نام احسان رکھا گیا ہے۔ اسلام وایمان اور احسان کے ہرسہ ارتقائی مراتب کی تفصیل چند عنوانات کے بعد عنقریب آپ کے سامنے آنے والی ہے۔

(۲۰۹) * اس حدیث میں ایک بڑی اہم بحث یہ ہے کہ کیا زمانہ شرک وکفر کی نیکیاں بھی معتبر ہوسکتی ہیں۔ حافظ ابن حجر کا رجحان بظاہر نفی کی طرف معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ کفر انسان کی اتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کے بعد اس کا کوئی نیک کام بھی نیک نہیں رہتا اور ابن منیر سے حدیث کی یہ توجیہ نقل کرتے ہیں کہ بحالتِ کفر کافر کے حسنات کا معتبر نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اسلام کے بعد بھی ان کو لکھا نہ جائے۔ اگر خدا تعالیٰ انسانی عجز ومرض کے زمانہ میں اس کی صحت وقدرت کے زمانہ کے اعمال کا ثواب دے سکتا ہے تو اسلام کے بعد زمانہ کفر کی نیکیوں کا ثواب کیوں نہیں دے سکتا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام لائے بغیر بھی کافر کی حسنات قابل ثواب شمار ہوں یہ اسلام ہی کی برکت ہے کہ وہ اس کے ضائع شدہ اعمال کو بھی بیش قیمت بنا دیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام جہاں ایک طرف اس کے خرمن معاصی کو خاک کر دیتا ہے دوسری طرف اس کی خاک شدہ نیکیوں میں پھر سرنو جان بھی ڈال دیتا ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۲۸)

شیخ محی الدین نووی کا رجحان اس طرف ہے کہ زمانہ کفر کے اچھے کام بلکہ عبادتیں بھی معتبر ہوسکتی ہیں۔ وہ یہاں حدیث کی بجائے فقہاء کے قول کی تاویل کی طرف جارہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جن فقہاء نے یہ کہا ہے کہ کافر کی کوئی عبادت صحیح نہیں ہوتی اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دنیا میں ان پر صحت کا حکم نہیں لگایا جائے گا' رہ گیا ثواب کا معاملہ تو فقہاء نے اس کی نفی نہیں کی' یہ تو خدا کی دین کی بات ہے وہ چاہے تو عمل کے بغیر بھی نامہ اعمال میں نیکیاں درج کردے تو اگر کافر کی کرائی عبادت پر ثواب بخش دے تو اس سے کیا بعید ہے۔ (نووی مصری ج ۱ ص ۱۴۲) یہاں ابن بطال شارح بخاری ابراہیم حربی اور قرطبی جیسے متقدمین علماء ومحدثین بھی امام نووی کے ہمنواء ہیں۔ اس مسئلہ کی تحقیق ہم آئندہ ذکر کریں گے۔ اتنی بات یہاں بھی سن لیجئے کہ جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ کافر کی نیکیوں پر ثواب ملنے نہ ملنے کا ہے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نجات اسلام کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

من اساء فی اسلامه یؤاخذ بما عمل فی الجاهلیة

جس نے اپنے اسلام کو بدنما بنا دیا اس سے دورِ جاہلیت کے اعمال پر بھی مواخذہ ہوگا

(۲۱۰) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ قَالَ اُنَاسٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَنُؤَاخَذُ بِمَا عَمِلْنَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ قَالَ اَمَّا مَنْ اَحْسَنَ مِنْكُمْ فِي الْاِسْلَامِ فَلَا يُؤَاخَذُ بِهَا وَ مَنْ اَسَاءَ اُخِذَ بِعَمَلِهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَ الْاِسْلَامِ. (رواہ الشیخان)

(۲۱۰) عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہؐ کیا ہم سے ان افعال کی بھی باز پرس ہوگی جو ہم نے اپنے کفر کے زمانہ میں کئے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا جس نے اسلام میں اچھے کام کیے اس سے تو کچھ باز پرس نہ ہوگی لیکن جس نے اپنے اسلام میں بدنمائی پیدا کی اور برے کام کیے اس سے کفر و اسلام دونوں زمانوں کے افعال کی باز پرس کی جائے گی۔ (متفق علیہ)

---

(۲۱۰) * حضرت ابن مسعودؓ کی یہ حدیث بظاہر عمرو بن العاص کی گذشتہ حدیث کے مخالف معلوم ہوتا ہے اس سے ثابت ہو رہا تھا کہ اسلام کسی تفصیل کے بغیر دورِ جاہلیت کی بداعمالیوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اور اس حدیث سے کچھ تفصیل بھی ثابت ہو رہی ہے۔ شیخ محی الدین نووی وغیرہ کے مختار پر تو جواب ظاہر ہے' ان کے نزدیک اسلام کی خوبی یہ ہے کہ دل سے اسلام قبول کرے اور اس کی بدنمائی یہ ہے کہ محض زبان پر کلمہ اسلام ہو' دل ایمان و یقین سے یکسر خالی ہو' درحقیقت یہ اسلام ہی نہیں اس بنا پر اس حدیث کا خلاصہ یہ ہوگا کہ مذکورہ بالا بشارت اس اسلام پر ہے جس میں نفاق نہ ہو' منافقانہ اسلام سے صرف جان و مال کی عصمت تو حاصل ہو جاتی ہے مگر گناہوں کی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ ان کا بوجھ اور بڑھتا چلا جاتا ہے' حضرت استاد قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ اسلام جو اس کا مدعی ہے کہ وہ دنیا میں تہذیب اخلاق کے لیے برائیاں مٹانے اور بھلائیاں پھیلانے کے لیے آیا ہے وہ روزِ اول ہی سے اپنے حلقہ بگوشوں سے یہ تقاضہ کرنے لگتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے اس کے دعوے کا ثبوت پیش کریں جو لوگ اس کے اس تقاضہ کو پورا کرتے ہیں ان کا اسلام سچا اور خوب صورت اسلام شمار ہوتا ہے۔ پس اسلام کی خوبی یہ ہے کہ جب اسلام لائے تو دنیا کے سامنے عملاً اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب کا نمونہ پیش کرے' اپنے دل میں دورِ کفر کی بدکرداریوں اور بداخلاقیوں کی برائی محسوس کرے ان پر شرمندہ بھی ہو اور آئندہ اس کا عزم کر لے کہ اب اسلام کی حلقہ بگوشی کے بعد ان کا اعادہ پھر کبھی نہیں کرے گا' یہ ہے وہ مسلمان جو اپنے تمام گناہوں سے ایسا پاک و صاف ہو جاتا ہے جیسا اپنی ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے لیکن ایک وہ ہے جو مسلمان تو ہو جاتا ہے مگر لاابالی طور پر مسلمان ہوتا ہے اور اب بھی شتر بے مہار کی طرح آزاد ہی پھرتا ہے اس کی بداخلاقی بدستور قائم ہے۔ طبیعت کی درشتی' نفس کی خست' مزاج میں خود غرضی و طمع کا وہی حال باقی ہے' غرض کہ اس کی عملی زندگی میں کوئی نمایاں انقلاب پیدا نہیں ہوتا' یہ بھی ایک مسلمان ہے لیکن اس کا اسلام خوب صورت اسلام نہیں اس میں معاصی کی بدنمائی بدستور موجود ہے اس نے اسلام کی صداقت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا' وہ اس عظیم الشان بشارت کا حق دار نہیں۔ جو کل تک خدا کی نافرمانی سے شرمندہ نہیں تھا اور آج بھی اس پر نادم نہیں ہوا۔ اس کی نافرمانیوں کا بہی کھاتہ کیونکر پاک و صاف ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تفصیل نہایت منصفانہ اور معقول ہے۔ ملا علی قاری نے فقہ اکبر کی شرح میں اس کو شارح عقیدہ طحاوی سے توبہ کی بحث میں نقل کیا ہے۔ وہ محققین کا قول یہی نقل کرتے ہیں کہ اگر اسلام کے ساتھ گذشتہ گناہوں پر توبہ بھی کی جائے تو ایسا اسلام تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور اگر ان معاصی سے توبہ نہ کرے اور اسلام کے بعد اسی طرح گناہ کرتا رہے تو اس سے تمام گناہوں کا مواخذہ ہوگا۔ (دیکھو شرح فقہ اکبر ص ۱۴۳)

من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه

آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیکار اور لایعنی باتوں سے کنارہ کش ہوجائے

(۲۱۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ

(۲۱۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بیکار

---

(۲۱۱) * امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا آپ کو یہ رتبہ عالی کیسے ملا؟ آپ نے فرمایا تین باتوں سے (۱) راست گوئی۔ (۲) اداءِ امانت (۳) اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی کی عادت سے۔ (مؤطا)

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ بیکار باتوں سے مراد مباحات کا غیر ضروری سلسلہ ہے۔

یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ مستحبات اور محرمات کے درمیان شریعت نے ایک درجہ مباحات کا بھی رکھا ہے اسے خدا کے محرمات کی سرحد کہنا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر محرمات کی ظاہری دل فریبی کا نظارہ ہونے لگتا ہے اس لیے آپ مباحات کو اپنی نظر میں ہلکا نہ سمجھیں، عمل کے مسافر کے لیے یہ منزل بہت نازک منزل ہے جو اس منزل پر جا پہنچا اس کے لیے ہر وقت خطرہ ہے کہ اس کا دوسرا قدم اب محرمات ہی میں جائے گا۔ ان کی مشروعیت کا مقصد یہ ہے کہ آپ مباحات کو خدا کی طاعات و عبادات کے لیے ذریعہ و وسیلہ بنائیں۔ اس کے احکام کی بجا آوری میں ان سے کام لیں۔ اب یہ مباحات بھی آپ کے لیے مستحبات کا حکم اختیار کرلیں گے لیکن اگر خدانہ کردہ آپ نے ان کو خدا کی معصیت کا ذریعہ بنالیا تو اب یہ مباح نہیں رہے ممنوعات و محظورات کی فہرست میں شمار ہوں گے۔ اگر آپ نے یہ نکتہ سمجھ لیا ہے تو ان تمام احادیث کی مرادیں آپ پر روشن ہوجائیں گی جن میں مباحات پر بھی ثواب اور عقاب کا ذکر آجاتا ہے۔ مثلاً کھانا کھانا۔ پانی پینا' شب میں سو رہنا حتیٰ کہ باہمی خوش طبعی کرنا بہت سے بہت مباح ہی کا درجہ رکھتے ہیں لیکن اگر یہ تمام کام آپ اس لیے کرتے ہیں کہ ان مباحات سے آپ کو خدا کی عبادت میں تقویت حاصل ہو۔ آپ کھائیں گے نہیں تو خدا کے فرائض بھی ادا نہیں کرسکیں گے۔ رات کو آرام نہیں کرسکے تو صبح کی نماز میں شریک بھی نہیں ہوسکیں گے' اگر اپنے بھائی سے خوش طبعی کریں گے تو باہمی محبت و الفت پیدا ہوگی۔ اس کا دل خوش ہوگا آپ کا کچھ بگڑے گا نہیں۔ تو اب یہی سب مباحات موجب اجر بن جائیں گے۔ اسی طرح انگور کا عرق نکالنا مباح ہی ہے کچھ حرام نہیں لیکن اگر یہ فعل آپ نے اس لیے کیا ہے کہ اس کی شراب تیار کریں گے تو اب یہی فعل حرام کہلائے گا اسی لیے حدیث میں ''عاصر'' یعنی انگور کا عرق نکالنے والے پر لعنت آئی ہے۔ مباحات صرف اسی وقت تک مباحات ہیں جب تک ان میں نہ وہ نیت ہو نہ یہ' اگر آپ اسی عالم غفلت میں مباحات میں قدم رکھتے ہیں تو رکھ لیجئے مگر حدیث یہ کہتی ہے کہ یہ بھی فعل عبث ہے اور آپ کے حسن اسلامی پر ایک بدنما داغ ہے۔ شادی کی بہت سی رسمیں اباحت کا درجہ رکھتی ہیں اگر اعتدال کے ساتھ ادا کی جائیں اور شریعت کے حدود سے باہر نہ ہوں اور خوشی میں خوشی منانا مقصود ہے تو ان پر ثواب مل سکتا ہے لیکن ایسے انسان بہت کم ہیں جو مسرت اور غم میں اعتدال کی حالت قائم رکھ سکیں اس لیے وہ خدا کی اس وسعت سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور مباحات کو محرمات بنا کر چھوڑتے ہیں اس پر طرہ یہ کہ وہ اسی خیال میں سرشار رہتے ہیں کہ ہم نے مباحات کے حدود سے قدم باہر نہیں نکالا حالانکہ ان کو یہ خبر نہیں ہے کہ حدود شرعیہ سے ذرا تجاوز کرنے سے وہی مباحات محرمات کا حکم اختیار کرلیتے ہیں۔ (دیکھو کتاب الایمان ص ۱۹ و ۳۰ و حجۃ اللہ ج ۳ ص ۱۰۱)

حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ عنایت لغت میں کسی چیز کے خاص طور پر اہتمام کرنے کا نام ہے اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مؤمن کی شان یہ ہونا چاہیے کہ جو قول و فعل بھی اسلام کی نظر میں قابل اعتنا اور لائق اہتمام نہ ہو اس سے یک لخت کنارہ کش ہوجائے۔ پس جب تک ایک مسلمان محرمات و مشتبہات تو درکنار بے حاجت مباحات میں بھی قدم رکھنا ترک نہیں کرتا' اسلام کی صفت احسان تک ....

تَـرْكُـهُ مَـا لَا يَـعْنِيْهِ.(رواہ الترمذی وغیرہ وحسنہ الحافظ ابن رجب الحنبلی فی جامع العلوم و الحکم)
باتوں کا مشغلہ چھوڑ دے۔
(اس حدیث کو ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے)

ﷺ ..... سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا۔ لیکن اگر کسی خوش نصیب کو یہ مقام نصیب ہو جائے' خدا کا تصور اس پر اس درجہ غالب آ جائے کہ ہر حال میں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ذاتِ پاک گویا حاضر و ناظر ہوتو پھر بیکار باتوں کی طرف اس کا قدم خود بخود نہیں اٹھ سکتا اور اگر غفلت یا سہو و نسیان کی بنا پر کبھی اس سے کوئی لغزش واقع بھی ہوگی تو اس کو ایسی ہی ندامت وشرمساری لاحق ہوگی جیسی کہ حقیقۃً خدا کے حضور میں یہ غلطی کر کے ہوتی اسی کو حدیث میں **استحیاء من اللّٰہ** کہا گیا ہے یہ **استحیاء** اسی صفت احسان کا نتیجہ ہے۔ (جامع العلوم والحکم ص ۸۰و۸۴)

اس حدیث کی اہمیت کے پیش نظر مـــا لایعنی کے لفظ کی کچھ اور توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ حافظ ابن رجبؒ فرماتے ہیں کہ لفظی وسعت کے لحاظ سے تو ''لایعنی'' کا لفظ اقوال وافعال سب کو شامل ہے لیکن محاورہ واستعمال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا زیادہ تر اطلاق لغو باتوں پر ہوتا ہے اسی کی طرف حسب ذیل آیت واحادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ.(ق:۱۸) ''کوئی بات اپنے منہ سے نہیں نکالتا مگر ایک نگران اس کے پاس لکھنے کو تیار رہتا ہے۔''

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ. (النساء:۱۱۴)

''ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بہتری اور خیر کا نام نہیں مگر ہاں جو خیرات یا کسی اور نیک کام یا لوگوں میں میل ملاپ کی صلاح دے۔''

(۱) آدمی کے اسلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیکار باتیں نہ کرے۔ (مسند امام احمد)

(۲) جو آدمی اپنے عمل اور باتوں کا موازنہ کرتا رہے گا وہ خود بخود صرف حاجت کی بات کرنے کا عادی بن جائیں گا۔ (ابن حبان)

(۳) اسی حقیقت کے مخفی رہنے کی وجہ سے حضرت معاذؓ نے یہ سوال فرمایا تھا یا رسول اللہؐ جو باتیں ہم کرتے ہیں کیا ان پر بھی ہم سے گرفت کی جائے گی آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ زیادہ تر تو لوگ اسی جا و بیجا زبان چلانے کی بدولت ہی دوزخ میں منہ کے بل گرائے جائیں گے۔

(۴) حضرت ام حبیبہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ ابن آدم کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اس کے نقصان ہی نقصان کی ہوتی ہے نفع کی نہیں ہوتی بجز ان صورتوں کے بھلی بات کا حکم دینا' بری بات سے روکنا اور اللہ کی یاد کرنا۔ (ترمذی)

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں ایک صحابی کا انتقال ہو گیا تو کسی نے کہا تجھے جنت کی بشارت ہو آپ نے فرمایا تمہیں کیا خبر ہے شاید کبھی اس نے بیکار بات منہ سے نکالی ہو یا اپنی حاجت سے زیادہ چیز پر بخل کیا ہو۔ (ترمذی)

(۶) ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی قوم کا سردار ہوں جو کہتا ہوں میری مانتے ہیں ان سے کیا کہوں آپ نے فرمایا کہ ہر کس و ناکس کو سلام کیا کریں اور غیر ضروری باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ (ابن ابی الدنیا)

(۷) ایک صحابی کی بیماری میں (عیادت کے لیے) کچھ لوگ گئے دیکھا تو وہ بہت ہشاش بشاش تھے۔ سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا دو عمل میرے پاس ایسے ہیں کہ ان سے زیادہ بخشش کی امید مجھے کسی عمل پر نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ میں غیر ضروری باتیں نہ کرتا تھا۔ دوم یہ کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے میرا سینہ صاف اور ٹھنڈا رہا کرتا تھا۔ (ابن ابی الدنیا)

(۸) حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ کسی آدمی سے اللہ تعالیٰ کے اعراض کرنے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اس کو بیکار باتوں کے مشغلہ میں الجھادے۔

(۹) سہل تستریؒ فرماتے ہیں جو بے ضرورت باتیں کرے گا وہ راست گوئی سے محروم ہو جائے گا۔

(۱۰) معروف کرخیؒ فرماتے ہیں آدمی کی بیکار باتوں کا مشغلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رسوا کرنے کی ایک علامت ہے۔ ﷺ .....

3(بشارة التجاوز عن حديث النفس و الخطأ و النسيان

دل کے خطرات اور بشری بھول چوک پر درگذر کی بشارت

(۲۱۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِاُمَّتِیْ مَا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسَهَا مَا لَمْ یَتَکَلَّمُوْا اَوْ یَعْمَلُوْا بِهٖ. (رواہ مسلم)

(۲۱۲) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' اللہ تعالیٰ نے خاص میری امت کے حق میں وہ وساوس جو صرف ان کے دلوں میں گذریں معاف کر دیئے ہیں جب تک کہ وہ اپنی زبان سے ان کو ادا نہ کریں یا عملی جامہ نہ پہنائیں۔ (مسلم)

(۲۱۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قِیْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ اَیُّ

(۲۱۳) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ

ﷺ.... اس قسم کی احادیث اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا زیادہ تر تعلق اقوال ہی کے ساتھ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان بیکار اور بے حاجت قول و فعل چھوڑنے اور ضرورت کے مطابق بات اور اسی کے موافق کام کرنے کا عادی بن جائے تو اسے بشارت ہو کہ اب اس نے صفت احسان میں قدم رکھ دیا ہے اور اب اس کی ایک نیکی صرف دس یا سات سو نیکیوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے لیے رحمت کا وہ وسیع دروازہ کھل گیا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نازک حسن بیکار باتوں کی ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کرتا پھر آپ یہ کیا سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کی غفلت اور من مانی آزادی کے بعد بھی اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔

(۲۱۲) * جو وساوس کہ اپنے اختیار کے بغیر پیدا ہوں اور بلا توقف دل سے نکل جائیں یا کچھ ٹھہریں مگر اس کو عملی جامہ پہنانے کی دل میں کوئی فکر نہ ہو یا کچھ فکر تو پیدا ہو مگر کسی ایک جانب میلانِ خاطر نہ ہو' یہ سب اقسام اس امت کے حق میں معاف کر دیئے گئے ہیں۔ ہاں اگر کسی جانب رجحان پیدا ہو گیا ہے تو اگر یہ رجحان خیر اور نیک عمل کی طرف ہے تو اس پر اجر ہے اور اگر برائی کی جانب ہے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے اور اگر یہ خیال پختہ ہو کر عزم کی صورت اختیار کر گیا ہے تو پھر نیکی میں اجر یقینی ہے اور بدی کی صورت میں مواخذہ کا امکان ہے۔ حدیث مذکور میں جس مرتبہ کی معافی کا اعلان کیا گیا ہے وہ حدیث النفس ہے عزم نہیں۔ عزم کی تفصیل ابھی آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں وساوس و خطرات کی وہی قسم مراد ہے جو کسی قول یا عمل کے ابتدائی مراحل میں پیش آتی ہے۔ عقائد فاسدہ یا اخلاقِ رذیلہ جن کا تعلق صرف قلب سے ہے جوارح سے نہیں وہ یہاں مراد نہیں ہیں پس اگر خدا کی وحدانیت یا رسولؐ کی رسالت میں وساوس داخل ہو کر تردد کی حد تک پہنچ گئے ہیں تو قابل مواخذہ ہیں عقائد کے باب میں عزم ہی عزم درکار ہے۔ اسی طرح حسد' کینہ' کبر' فریب' مسلمان پر ناحق بدگمانی' یہ سب کے سب اعمالِ قلبیہ ہیں۔ حدیث مذکور سے ان کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس حدیث میں صرف ان وساوس کا ذکر ہے جو زناء و سرقہ جیسے افعال یا غیبت وغیرہ جیسے اقوال سے پہلے انسان کے دل میں گذرتے ہیں۔ پس اگر غیبت' زناء و سرقہ وغیرہ کرنے کی نوبت نہیں آتی اور یہ خیالات صرف دل میں گذر کر رہ جاتے ہیں تو شانِ رحمت ان کی معافی کا اعلان کرتی ہے۔

(۲۱۳) * حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ''الحنیفیة'' وہ دین ہے جو ملت ابراہیمی کی طرح شعائر اللہ کے استحکام اور شعائر شرک کے استیصال اور رسوم فاسدہ و عقائد باطلہ کے ابطال پر مبنی ہے اور ''السمحة'' وہ ہے جس کی تعلیم میں رہبانیت اور نا قابل برداشت مجاہدات نہ ہوں اور اس میں ایسی رخصتیں بھی موجود ہوں جو بوقت ضرورت بشری ضعف کو نبھالیں اور ''البیضا'' کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی علتیں اور حکمتیں ایسی ﷺ....

30 اَلْاَدْیَانِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَنِیْفِیَّۃُ السَّمْحَۃُ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا سب دینوں میں اللہ تعالیٰ کو کون سا دین پیارا ہے؟

(رواہ احمد و الطبرانی فی الکبیر و الاوسط و البزار و البخاری فی الادب المفرد و فی الصحیح تعلیقا) فرمایا ابراہیم علیہ السلام کا جو نہایت سہل اور آسان تھا۔

(مسند احمد' بزار' ادب المفرد' طبرانی)

ﷺ....واضح اور صاف ہوں کہ ہر ذی فہم کی سمجھ میں بآسانی آسکیں (دیکھو حجۃ اللہ ص ۱۲۸ مصری) حنیف دراصل وہ ہے جو ہر باطل سے بیزار ہو کر ایک مولیٰ حقیقی کا رخ کر چکا ہو۔ حضرت خلیلؑ کی زندگی طفولیت سے لے کر آخر تک اس خصوصیت کا مرقع تھی اس لیے انبیاء علیہم السلام میں یہ لقب ان ہی کا مشہور ہو گیا ہے ورنہ انبیاء علیہم السلام کا سب گروہ حنفاء تھا اب اصطلاح میں صرف ملت ابراہیمی ملت حنیفیہ کہلاتی ہے۔ دین محمدی چونکہ جملہ ادیان کی خوبیوں کا مجموعہ ہے اور ملت ابراہیمی کی بڑی خصوصیت یعنی یسر و سہولت تو اس کا سب سے نمایاں عنصر ہے اس لیے اور ملتوں کی نسبت ملت محمدیہ اس کے قریب تر ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تو اپنی تفسیر میں چالیس احکام شمار کر کے ایسے تحریر فرمائے ہیں جو ان ہر دو ملتوں میں تقریباً مشترک ہیں گویا دین محمدی کی زمین ملت ابراہیمی ہے اس لیے اس لقب پانے کی سب سے زیادہ مستحق یہی ملت ہے۔ ناظرین کے سامنے ان احکام کی مختصر فہرست پیش کرنا خالی از بصیرت نہ ہوگا۔

(۱) دشمنانِ خدا سے جہاد کرنا۔
(۲) بت شکنی۔
(۳) غیر اللہ کی منت نہ ماننا۔
(۴) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح نہ کرنا۔
(۵) رزق' شفا اور موت کو صرف مسبب الاسباب کے قبضہ قدرت میں تصور کرنا۔
(۶) اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنا۔
(۷) کہانت باطل سمجھنا۔
(۸) بدفالی کا قائل نہ ہونا۔
(۹) کسی ساعت کو منحوس نہ سمجھنا۔
(۱۰) کواکب پرستی کا انکار کرنا۔
(۱۱) نجومیوں سے مستقبل کے واقعات دریافت نہ کرنا۔
(۱۲) آدابِ قربانی۔
(۱۳) خصالِ فطرت۔
(۱۴) جملہ افعال حج۔
(۱۵) کعبہ کا قبلہ ہونا۔
(۱۶) مصیبت پر صبر کرنا۔
(۱۷) نوحہ وغیرہ نہ کرنا۔
(۱۸) تصویر کی حفاظت اور مصوری سے اجتناب کرنا۔
(۱۹) ترکِ نکاح' ترکِ لذائذ' ترکِ لباس و نفائس اور گوشہ نشینی جیسے افعال اختیار نہ کرنا۔
(۲۰) عبادت میں اتنی افراط سے اجتناب کرنا جس سے حقوق العباد تلف ہوں۔
(۲۱) کسبِ معاش۔
(۲۲) بلاضرورت سوال نہ کرنا۔
(۲۳) لباس صاف' ستھرا رکھنا۔
(۲۴) لہو و لعب سے احتراز کرنا۔
(۲۵) والد کو اولاد اور اولاد کو والد کے جرم میں گرفتار نہ کرنا۔
(۲۶) حرمت زناء وغیرہ۔
(۲۷) سترعورت۔
(۲۸) ختنہ کرنا۔
(۲۹) عقیقہ کرنا۔
(۳۰) آدابِ ضیافت۔
(۳۱) پوشش و لباس کے احکام۔
(۳۲) عبادت کے وقت اچھی ہیئت کا خیال رکھنا۔ ﷺ....

(۲۱۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَا

(۲۱۴) ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت کی بھول' چوک اور وہ تمام

☚..... (۳۳) اشہرحرام کا احترام کرنا۔ (۳۴) محرماتِ نکاح۔
(۳۵) نکاح میں شاہدوں کا ہونا۔ (۳۶) زکوٰۃ۔
(۳۷) چاشت کی چار رکعتیں۔ (۳۸) تحریمہ میں رفع یدین کرنا۔
(۳۹) رکوع کا سجدہ پر مقدم ہونا۔ (۴۰) نماز کی ہر نقل وحرکت میں تکبیر کہنا۔

(فتح العزیز ص ۴۹۶ و ۴۹۷)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام ہیں جو دونوں ملتوں میں مشترک ہیں یہاں سب کے استقصاء کا ارادہ نہیں کیا گیا۔

(۲۱۴) ✽ خطاء ونسیان کی دو کمزوریاں انسان کے خمیر میں داخل ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہے۔ بنی ادم فنسیت ذریته خطاء ادم فخطاء ت ذریته۔ حضرت آدم علیہ السلام بھولے تو بھولنے کی سرشت ان کی اولاد میں بھی نمایاں ہوگئی' وہ چوکے تو اس قصور کا اثر ان میں بھی ظاہر ہو کر رہا اس لیے رحمت بھی ان پر مواخذہ نہیں کرتی اور ان کے عفو کا اعلان کرتی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں بندہ کے ارادہ واختیار کو دخل نہیں ہوتا اور جبر واکراہ کی حالت میں گو شعور' ارادہ اور اختیار موجود ہوتا ہے مگر جبر کی وجہ سے معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی ان تینوں حالتوں کا ذکر کیا ہے خطاء ونسیان کا حسب ذیل آیت میں:

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا. (البقرة: ۲۸۶) ''اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ فرما۔''

خطاء ونسیان گو انسان کے ایک فطری ضعف کا اثر ہے لیکن پھر ان میں کچھ نہ کچھ اس کے تساہل اور لاپرواہی کا دخل ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسیان اسی جگہ پیش آتا ہے جہاں آدمی کو زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح خطاء بھی ضرور کسی نہ کسی بے احتیاطی ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پس دعاء کے ان الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ کی شانِ عبدیت کے یہ نامناسب ہے کہ وہ اپنے تساہل کو کوئی جرم ہی تصور نہ کرے۔ اس تصور سے اس میں تساہل اور بے احتیاطی کی سرشت اور پختہ ہوگی۔ اس کو یہ احساس کرنا چاہیے کہ معصیت گو نسیان وخطاء کی بنا پر سرزد ہو اور گو شانِ رحمت اسے عفو بھی کردے مگر ہے قابل گرفت ومواخذہ۔ اس لیے پہلے اسے اپنے اس تساہل اور لاپرواہی کے جرم کا اعتراف کر لینا چاہیے پھر بارگاہِ رحمت کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس کے عفو کے لیے دعا کرنا چاہیے۔ لفظ اِنْ جو شرط کے لیے آتا ہے یہاں اسی لیے استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری سعی وکوشش تو یہی تھی اور یہی آئندہ بھی رہے گی کہ ہم سے بھول چوک سے بھی تیری معصیت نہ ہو۔ لیکن اگر ضعف بشری کی بنا پر ہو جائے تو پھر تو اپنی شانِ ربوبیت کے صدقہ میں اس پر مواخذہ نہ کرنا۔

اکراہ کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ﴾ (النحل: ۱۰۶)
''جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو (اس سے مواخذہ نہیں)۔''

بندہ کی شانِ عبدیت تو یہ ہے کہ ان تینوں صورتوں میں اس کی نظر اپنی کوتاہی کی طرف لگی رہے اور رب العزت کی شانِ رحمت یہ ہے کہ وہ ان مجرموں سے عفو ودرگذر کا اعلان کرتی رہے۔

وہ بازی خطا کی جتاتے رہیں
میں ان کے بھروسہ پہ ہارا کروں ☚....

وَ النِّسيانُ وَ مَا استُكرِهُوا عَلَيهِ.
باتیں معاف کردی ہیں جو ان سے بہ جبر کرائی جائیں-

(رواه ابن ماجة و البيهقي و ابن حبان في صحيحه و الدارقطني و قد خرجه الحاكم و قال صحيح على شرطهما قال الحافظ ابن رجب و لكن له علة و قد انكره الامام احمد جدًا و قد خرجه النسائي و لم يذكرا لاكراه و الحديث فخرج من رواية ابي قتادة في الصحيحين و السنن و المسانيد بدونها و حسنه الحافظ ابن رجب و راجع جامع العلوم و الحكم ص ٢٧١)

بشارة كون الدين يسرا كله

دین محمدی کے سرتاسر سہل اور آسان ہونے کی بشارت

(۲۱۵) عَن ابنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ الدِّينُ يُسرٌ. (اخرجه احمد و البخاري في الادب المفرد وفي الصحيح في ترجمة الباب وعند احمد خَيرُ دِينِكُم اَيسَرُهُ. قال الحافظ اسناده حسن)

(۲۱۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے- دین بہت آسان ہے اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے تمہارے سب دینوں میں بہتر وہ ہے جو سب میں آسان ہو-

(۲۱۶) عَن اَبِي هُرَيرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الدِّينَ يُسرٌ وَلَن يُشَاءَ الدِّينَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا وَ قَارِبُوا وَ اَبشِرُوا وَ استَعِينُوا بِالغَدوَةِ وَ الرَّوحَةِ وَ شَيءٍ مِنَ الدُّلجَةِ. (رواه البخاري في الايمان)

(۲۱۶) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے دین بہت آسان ہے جو شخص دین میں سختی کرے گا وہ اس پر غالب آجائے گا لہٰذا سیدھے رہو اور زیادہ بلند پروازیاں مت کرو اور خوش ہو جاؤ (کہ تمہیں ایسا آسان دین ملا ہے) صبح اور دوپہر کے بعد اور کچھ رات میں عبادت کر کے (دین پر مداومت کے ساتھ عمل کرنے کی) قوت حاصل کرو-

(۲۱۷) عَن عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ

(۲۱۷) حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی

لله..... اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ اس حدیث کا تعلق صرف اس بے نیاز کے حق سے ہے جس کا معصیت سے کچھ بگڑتا نہیں اور عفو سے کچھ نقصان نہیں ہوتا- بندوں کے حقوق کے ساتھ نہیں جو بہت بخیل اور کمزور ہیں اس لیے اگر ان صورتوں میں ان کے حقوق تلف ہوں گے تو ان کا تاوان ادا کرنا ہوگا- ہاں ان کے تساہل کا جو گناہ تھا وہ معاف ہو جائے گا-

(۲۱۶) * حافظ ابن حجرؒ نے اسی کے ہم معنی ایک اور روایت محجن بن اورع سے نقل کی ہے "انكم لن تنالوا هذا الامر بالمغالبة و خير دينكم اليسرة." (تم دین کو زور آزمائی کر کے ہرگز نہیں پا سکتے تمہارا سب سے بہتر دین وہ ہے جو آسان ہو) ابن منیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں عبادت میں جد و جہد کرنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اس افراط کی ممانعت ہے جس کا نتیجہ فرائض و واجبات کا ترک بن جائے- عزیمت پر عمل کرنا بے شک افضل ہے مگر خدا کی رخصتوں کو دائمی طور پر ترک کر بیٹھنا بھی سمجھ کی بات نہیں جو شخص تیمم کے موقعہ پر ہمیشہ وضو کرنا ضروری تصور کرے گا اسے آخر ایک دن جھک مار کر خدا کی رخصتوں کے دامن میں پناہ لینا پڑے گی- بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے زمانہ شباب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز کردہ رخصتوں پر عمل نہ کیا آخر ضعف کے زمانہ میں انہیں پچھتانا پڑا اور یہ حسرت ہوئی کہ کاش انہوں نے آپؐ کی رخصت کو قبول کر لیا ہوتا-

(۲۱۷) * یہ نرمی اور سہولت ملت ابراہیمیہ کی بنیاد اور اساس ہے اور اس کی اسی بنیاد پر شریعت محمدیہ کی تعمیر اٹھائی گئی ہے- اگر اس پر تفصیلی بحث کی جائے تو ہمیں تمام شریعت پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ہوگی- اور اس اجمال میں پھر اتنی تفصیل پیدا ہو جائے گی جس کی ہمارے لله.....

وَسَلَّمَ اِنَّ هٰذَا الدِّیْنَ مَتِیْنٌ فَاَوْغِلُوْا فِیْهِ بِرِفْقٍ وَ لَا تُبَغِّضُوْا اِلٰی اَنْفُسِکُمْ عِبَادَةَ اللّٰهِ فَاِنَّ الْمُنْبَتَّ لَا اَرْضًا قَطَعَ وَ لَا ظَهْرًا اَبْقٰی (قَالَ

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' یہ دین نہایت موزوں اور مضبوط ہے اس کو نرمی کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرو (اور زیادہ سختیاں اٹھا اٹھا کر) خدا کی عبادت سے اپنے دل میں نفرت نہ پیدا کرو کیونکہ زیادہ تیز رو مسافر اپنی

ﷺ ....ان مختصر نوٹوں میں جگہ نہیں ہے اس لیے ہم یہاں صرف وہ اصول تیسیر پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں- جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تحریر فرمائے ہیں ان کی روشنی میں آپ تمام شریعت کا جائزہ لے کر بآسانی یہ فیصلہ کرسکیں گے کہ اس شریعت میں دوسرے ادیان کی نسبت سے کتنی سہولت کی رعایت رکھی گئی ہے- شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ یسر وسہولت کے لیے حسب ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے-

(۱) کسی عبادت کے لیے ایسی چیز کو رکن وشرط کی حیثیت نہ دی جائے جس کی ادائیگی میں دشواری ہو- شریعت محمدیہ میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا اسی لیے لازم قرار نہیں دیا گیا- لولا ان اشق علی امتی لا مرتهم بالسواک عند کل صلوٰة کا مفہوم یہی ہے- یعنی اگر اپنی امت کے مشقت میں مبتلا ہو جانے کا مجھے خطرہ نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ انہیں مسواک کرنے کا حکم دے دیتا-

(۲) اگر کسی دشوار چیز کا حکم دیا جائے تو اس میں تدریج کا خیال رکھا جائے تا کہ اس دشواری میں پھر ایک سہولت پیدا ہو جائے شراب کی حرمت کا مسئلہ بالخصوص عرب کے لیے جتنی دشواری کا موجب ہوسکتا تھا ظاہر ہے لیکن اسی اصل کے پیش نظر اس کی صاف وصریح حرمت پہلے پہل نازل نہیں کی گئی بلکہ رفتہ رفتہ اس کی مذمت اور برائیاں اس انداز سے بیان کی گئیں کہ ان سے آئندہ صریح حرمت کے لیے قلب میں جگہ پیدا ہوتی چلی گئی- آخر کار تیسری بار صاف ممانعت نازل ہوگئی' اس طرح وہ حکم جو پہلے نا قابل عمل تھا اب خوشی خوشی قابل عمل بن گیا-

(۳) طبعی میلان اور طبعی تنفر کا لحاظ بھی رکھا جائے اسی بناء پر اسلام میں غلام' نابینا' مجہول النسب شخص کی امامت کو پسند نہیں کیا گیا کہ بہت سے حالات میں ان کی امامت تنفر کا موجب بن سکتی ہے اسی طرح امام یا کسی مقتدیٰ و بزرگ کی موجودگی میں ان کی امامت کی طرف طبعی میلان ہوتا ہے اسی لیے ان کی موجودگی میں دوسروں کی امامت ناپسندیدہ قرار دی گئی-

(۴) انسان کی فطرت میں مسرت وغم کے موقعہ پر کچھ رسوم منانا بھی داخل ہے جن کی ادائیگی وہ اپنی زندگی کا ایک ثبوت سمجھتا ہے اس کے اس اقتضاء کی بھی رعایت کی جائے- عیدین اور جمعہ کی مشروعیت اسی اقتضاء کے پورا کرنے کے لیے ہے-

(۵) اس دین کا ایک حصہ ایسا بھی ہونا چاہیے جس کی طرف رغبت کرنے میں طبیعت کے ساتھ عقل بھی شریک ہوتا کہ طبیعت وعقل ہر دو کی اجتماعی رغبت سے دین میں سہولت در سہولت پیدا ہو جائے- مسجد کی صفائی' جمعہ وعیدین کا غسل' خوش الحان مؤذن وامام وغیرہ کا حکم اسی نظریہ کے ماتحت ہے-

(۶) عوام کے جذبات کی تا امکان رعایت کی جائے- خانہ کعبہ میں آمد ورفت کے لیے دو دروازہ قائم کرنے کا ارادہ آپ نے اسی لیے فسخ فرما دیا تھا کہ اس میں قریش کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا مبادا وہ یہ خیال کرگذریں کہ آپ نے ان کے بزرگوں کی یادگار کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور ان کی قدیم بنا کو توڑ کر نئی تعمیر کر ڈالی- یہاں اسی مفسدہ کی خاطر اس مصلحت کو ترک کر دیا گیا مگر اس کے حدود کہاں تک ہوں گے یہ بہت طویل الذیل مسئلہ ہے-

(۷) ارکان وشرائط کی تحدید وتعیین کی جائے مگر نہ اتنی کہ بجائے سہولت کے اور مصیبت بن جائے' ایک حد تک ان کو متعین بھی کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کی عقلوں کے سپرد کر دیا جائے مثلاً قراءۃ فاتحہ نماز کے لیے ضروری قرار دی گئی ہے مگر مخارج' حروف کی ادائیگی اور طرز قراءت کو معروف طریقہ پر چھوڑ دیا گیا ہے نماز کے لیے استقبالِ قبلہ ضرور شرط کیا گیا ہے مگر تعیین سمت قبلہ کے لیے براہین ہندسیہ' طول وعرض بلدہ کا علم شرط نہیں کیا ﷺ ....

سواری ہلاک کر دیتا ہے اور منزل مقصود طے کرنے سے بھی رہ جاتا ہے (یہی مثال عبادت میں حد سے زیادہ جدوجہد کرنے والے کی ہے)۔ (رواہ احمد من حدیث انس و البیھقی من حدیث جابر) **العراقی فی تخریج الاحیاء۔**

ؒ..... گیا۔ رمضان کے روزوں کے لیے ماہ رمضان شرط کیا گیا ہے مگر یہاں بھی زائچہ وجنتری کا مکلّف نہیں بنایا گیا بلکہ صرف چاند کے طلوع پر مدار رکھ دیا گیا ہے اور ابر وغبار کی صورت میں تیس دن پورے کر لینا کافی سمجھ لیا گیا ہے۔

(۸) جو شخص دوسروں کے حقوق تلف کر دے اس کے حقوق بھی تلف کر دیئے جائیں۔ اسی قاعدہ کے ماتحت قاتل کو وراثت سے محروم کیا گیا ہے۔

(۹) علم کی اہمیت، وعظ ونصیحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اتنا اہتمام کیا جائے کہ قانون الٰہی پر عمل کرنے کی تازہ روح پیدا ہو جائے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعائیں کرنا چاہیے کہ وہ اس قوم کو مہذب اور کامل بنا دے اور سکینہ واطمینان ان کے قلوب میں نازل فرمائے۔ اسلام میں کتاب الاذکار اور کتاب الدعوات اسی مقصد کے پیش نظر ہے۔

اگر مذاہب عالم کو ان دس اصول پر پرکھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان اصول کی جتنی رعایت مذہب اسلام نے کی ہے اتنی اور ادیان نے نہیں کی اسی لیے مجموعی لحاظ سے جتنی سہولت اسلام میں ملتی ہے اور ادیان میں نہیں ملتی لیکن یہ بحث کہ سہولت کا مفہوم اور اس کا معیار کیا ہے۔ دوسری طویل بحث ہے۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس پر عمدہ کلام کیا ہے۔

﴿وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ﴾ (آل عمران:۸۵)

جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا خواہش مند ہوگا وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا

سوال یہ ہے ایسا کیوں ہوگا؟ جواب معلوم کرنے سے پیشتر عالم کے تمام مذاہب پر ایک نظر ڈال جائیے بہت سے مذاہب تو وہ ہیں جو الٰہی قانون ہونے کا اپنے پاس کوئی ثبوت نہیں رکھتے ان کے لیے تو معتبر مذہبوں کی صف میں کوئی جگہ ہی نہیں ہے اور اس لیے ان کے ساتھ دین حق کے تقابل وتوازن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ وہ مذاہب جو اپنے آسمانی دین ہونے کا ثبوت رکھتے ہیں ان کو اس سوال کا حق ہے اور ان ہی کے غور وفکر کے لیے یہ اعلان کیا گیا ہے۔ اپنے اپنے زمانے میں تمام مذاہب حق اور کامل ہی تھے لیکن ان کی صداقت اور کمال کی حیثیت ٹھیک وہی تھی جو اپنے اپنے دور میں سلسلہ ارتقاء کی ہر کڑی کی ہوا کرتی ہے کوئی کڑی اپنے دور کے لحاظ سے ناقص شمار نہیں ہوتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر بعد والی کڑی پہلی کڑی کے لحاظ سے کامل تر ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو ارتقاء کا مفہوم ہی بے معنی ہو کر رہ جائے اس لیے اگر کوئی پہلی کڑی بعد والی کڑی کی جگہ رکھ دی جائے تو اس ارتقائی دور کے لحاظ سے اس کو ناقص کہنا بھی غلط نہ ہوگا۔

پھر اگر ذرا اور غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں ناقص وکامل کا سوال کرنا ہی بے محل ہے۔ کیونکہ تقابل وتوازن کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دو چیزیں علیحدہ علیحدہ ہوں ایک ہی حقیقت کے مختلف مراتب ومدارج میں نقص وکمال کا سوال ہی بے حقیقت ہے جیسا کہ ایک شخص کے مختلف ادوار طفولیت وشباب میں۔ جب ایک چیز اپنے غیر ضروری اجزاء چھوڑتی اور اس سے کامل تر اجزاء اختیار کرتی

چلی جاتی ہے تو اسی کو ارتقاء کہا جاتا ہے اس لحاظ سے ہر پہلی کڑی دوسری کے لیے بنیاد ہوتی ہے اور ہر دوسری کڑی پہلی کڑی کی نسبت سے کامل ہوتی ہے- اس کمال کے باوجود اس کی حقیقت پہلی کڑی کی حقیقت سے مختلف نہیں ہوتی - بلکہ اس کے تمام ضروری اجزاء اس کی حقیقت میں لپیٹے ہوئے ہوتے ہیں- اسی طرح جو صداقت حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے شروع ہوئی اس کی حقیقت کبھی نہیں بدلی اس کے ضروری اجزاء ہر دور اور ہر زمانہ میں محفوظ ہی رہے پھر کچھ دور آئے جن میں دین حق کی شریعتوں کی گرفت قدرے سخت ہوگئی لیکن دور ارتقائی کی طبعی رفتار کے پیش نظر تھوڑے سے وقفے کے بعد گرفت کی وہ سختی ڈھیلی کر دی گئی اور اوامر و نواہی کے بوجھ ہلکے کر دیئے گئے اور جو پھندے کس دیئے گئے تھے ان کو کاٹ دیا گیا - یہاں تک کہ سچائی کی ایسی آسان راہ دکھا دی گئی جس میں نہ تو عمل کے لیے کوئی سختی تھی نہ عقل کے لیے کوئی بوجھ - اسی کا نام اسلام ہے اور اب یہ پیغام محمدی کا لقب مخصوص ہو گیا ہے ارتقاء کے ان ہی منازل کی جانب ذیل کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے-

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (المائدۃ:۱۳)

آج کے دن ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا - الخ

یعنی یہ کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ وہی دین ارتقاء کی منزلیں طے کرتے کرتے آج اپنے اوج کمال تک پہنچ گیا ہے- لفظ کمال میں دین کی اسی ارتقائی حرکت کی طرف اشارہ ہے- قرآن کریم کی سب سے بڑی خصوصیت "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ" کا حاصل بھی یہی ہے اور "لا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" کا عقیدہ بھی اس لیے سکھایا گیا ہے یعنی یہ سب ایک ہی صداقت کی کڑیاں تھیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی رہیں اور اپنے اپنے دور میں سب ہی کامل تھیں' صورتیں بے شک مختلف رہیں مگر حقیقت ایک ہی تھی اس لیے یہاں تسلیم و انکار کی تفریق برداشت نہیں کی جاسکتی - ایک کا ماننے والا اس کا مکلف ہے کہ وہ دوسرے کو بھی مانے اسی طرح ایک کا انکار کرنے والا اس جرم کا مرتکب ہے کہ اس نے دوسرے کا بھی انکار کر دیا ہے "لا تخیروا بین الانبیاء" کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی انبیاء علیہم السلام میں افضل و مفضول ہونے کے باوجود تخییر کی بحث اس لیے ناموزوں ہے کہ یہ سب ایک ہی پیغام اور ایک ہی صداقت کے حامل تھے "لو کان موسی حیا لما وسعه الا اتباعی" میں بھی یہی اشارہ ہے کہ دورِ کمال میں غیر کامل دور کی کسی کڑی کو لا کر رکھنے کے کوئی معنی نہیں وہ اپنے دور میں ہزار کامل سہی مگر اس دور میں ہرگز قابل عمل نہیں ہوسکتی' طلوع آفتاب کے بعد بجلی کے قمقموں سے روشنی حاصل کرنا دانائی نہیں کہا جاسکتا - اس لیے ارشاد ہوا کہ آج اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بقید حیات ہوتے تو ان کے لیے بھی خدا کا یہی مذہب (اسلام) جو اب اپنی مکمل اور آخری صورت میں جلوہ گر ہو چکا ہے قابل اتباع ہوتا - پس اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ان کی تمام عظمتوں کے باوجود سوائے دین کامل کے اتباع کے کوئی راہ نہیں تو اب دنیا میں کس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسری راہ پر عمل پیرا ہونے کا مجاز ہو - اب نہ دو ہزار پہلے کا انسان موجودہ ترقی یافتہ انسان کے ساتھ ساتھ چل سکتا ہے اور نہ ہزاروں سال پہلا آئین موجودہ ضروریات کا حل کر سکتا ہے- فوز و فلاح' نجات اور کامیابی کی اب صرف یہی ایک راہ ہے اور اگر اس فطری ارتقاء کے بعد بھی کوئی شخص قدرت کی بخشائش سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا اور ان ہی راہوں پر چلنا چاہتا ہے جن کے صحیح نقوش اب مٹ چکے ہیں تو اس کو اختیار ہے لیکن اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اب اس کا یہ اتباع اسلام اور اس کی صداقتوں کا اتباع نہیں ہوگا بلکہ خواہشات کا اتباع ہوگا' جسے فلاح و نجاح کی راہ سے دور کا بھی تعلق نہیں-

اسلام کیا ہے؟ خدا کی رضامندی کی ایک زبردست دستاویز' اعتقادیات و عملیات کا مکمل نقشہ' انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لیے غیر فانی دستور العمل' زمانہ کفر کی ہر گمراہی کے عفو کا ضامن اور آئندہ اس کے ہر ضعف و نسیان پر تسامح کرنے کا روادار' اپنے حلقہ بگوشوں کی معمولی جدوجہد کا بڑا قدردان اور انتہائی شکر گذار - غور فرمایئے اس کے بعد آپ چاہتے کیا ہیں کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی زمین پر

آپ کی عقل کا بنایا ہوا یا آپ کی پسند کے موافق قانون نافذ ہو تو کیا آپ کے نزدیک ایک انسانی دماغ تمام عالم کی مختلف ضروریات کا احاطہ کر بھی سکتا ہے یا پورے طور پر ان کا ادراک بھی کر سکتا ہے اور اگر اس ناممکن مرحلہ سے گذر بھی جائے تو کیا ان کی ضروریات کے احساس کے بعد ان کے لیے مناسب آئین وضع بھی کر سکتا ہے اور اگر یہ مشکل بھی آسان ہو جائے تو اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ تمام عالم اس پر متفق بھی ہو سکتا ہے اور اگر فردِ واحد کے ساتھ اس آئین سازی میں کچھ اور افراد بھی شامل کر لیے جائیں تو یقیناً وہ بھی انسانوں کی غیر محدود کثرت کے مقابلہ میں ایک ہی فرد کا حکم رکھیں گے تو اگر درحقیقت ان سب مشکلات کا حل مشکل ہی مشکل ہے تو مذہب سازی کی دردسری اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ اسی مذہب کو کیوں قبول نہیں کر لیتے جسے قدرت کے رمز شناس ہاتھ نے تمام مزاجوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر بنایا ہے۔ جس میں گذشتہ مذاہب کے محاسن خود چن چن کر اٹھا لیے گئے ہیں پھر اس مجموعہ میں اور بہت سے محاسن شامل کر کے اس کو بہت مکمل اور انتہائی دلپذیر صورت میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے دنیا اس پر عمل کر کے زمین کی مالک اور آخرت کی وارث بن چکی جنہوں نے اس کو چھوڑا انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اب اگر اس کے بعد بھی آپ کے تلاشِ مذہب کی تشنگی نہیں بجھتی تو یقین کیجئے کہ آئندہ تا قیامت بجھے گی بھی نہیں۔ **فبأی حدیث بعده یومنون۔**

اس مرحلہ پر آپ کے دل میں یہ شبہ گذر سکتا ہے کہ جس طرح دیگر مذاہب کے ارتقاء کے بعد اسلام وجود میں آیا اسی طرح تیرہ سو سال گذرنے کے بعد اب کوئی اور نیا دین آنا چاہیے' لیکن اکمالِ دین کی بشارت کے ساتھ اگر دنیا کے خاتمہ کا اعلان بھی نہ کر دیا جاتا تو عالم پر ایک غیر معلوم مدت گذرنے کے بعد حرکت ارتقائی شاید کوئی اور قانون منصۂ شہود پر لے آتی یا اس آخری قانون ہی کو کچھ مدت کے لیے ابھی اور موخر کر دیا جاتا مگر محفل عالم کی برخاستگی کے نوٹس نے یہ اُمید منقطع کر دی ہے اور یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اب آخری قانون یہی ہے اور اس کے بعد کسی دوسرے قانون کا انتظار عبث ہے۔

دنیا انصاف کے ساتھ غور کرے گی تو آسمانی ادیان میں آج روئے زمین پر اسے اسلام کے سوا کوئی دین قابل قبول نظر نہیں آئے گا۔ اسلام کا پہلا اعلان یہ ہے کہ ادیان ساویہ کی بنیاد فرقہ بندی اور تعصب پر نہیں ہے' ہر دین پہلے دین کا مصدق اور آئندہ کا مبشر بن کر آیا ہے۔ یہاں تک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت یہ پیغام حق دنیا میں آیا تو اس نے خدا کے سب دینوں کی عظمت سرنو زندہ کر دی۔ سب رسولوں کا احترام کرنا فرض و لازم قرار دے دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر کو اسی طرح کافر ٹھہرایا جیسا خدا کے سب سے بڑے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر کو۔ پہلے نبیوں کے سر جو تہمتیں لگا دی گئی تھیں تحقیق وتنقید کی روشنی میں ان کو غلط ثابت کیا۔ خدا کی مقدس کتابوں میں خفیہ سازشوں کا انکشاف کیا اور اس طرح ان کی عظمت رفتہ کو پھر قائم کیا اس نے پہلے رسولوں سے کٹ کر' اور پہلے دینوں کو جھوٹا کہہ کر' کسی نئے دین کی دعوت نہیں دی بلکہ اسی حقیقت کی طرف بلایا جس کی ان کے پیغمبر انہیں وصیت کر گئے تھے۔ تورات یہ نہیں کہتی کہ انجیل کو مت مانو اور انجیل یہ نہیں بتاتی کہ تورات غلط ہے اسی طرح قرآن یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ تورات وانجیل خدا کی نازل کی ہوئی کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے ماننے والوں پر یہ بھی حق لازم قرار دیتا ہے کہ تم ان کتابوں کو بھی خدا ہی کی کتابیں تصور کرو رسول عربیؐ یہ نہیں فرماتے کہ میرے سوا کسی پر ایمان نہ لاؤ بلکہ سب سے پہلے وہ خدا کے مقدس رسولوں کی عظمت کا سکہ دلوں میں قائم کرتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان کی زبان سے جذبات محبت میں کوئی کلمہ ایسا نکل بھی جاتا ہے جس میں خدا کے دوسرے رسولوں کے ساتھ رقابت کی بو بھی پائی جاتی ہو تو آپ نہایت سختی کے ساتھ اسی حد پر اسے روک دیتے ہیں اور اس کے بعد اپنے متعلق عاجزی وانکساری سے ایسے بھرے ہوئے کلمات ارشاد فرمادیتے ہیں جن کے بعد جذبات رقابت یک لخت سرد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ جو دین اپنے عالمگیر ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے اسے ایسی ہی تعلیمات کا مجموعہ بن کر آنا چاہیے جن میں تمام عالم کے لیے یکساں جاذبیت موجود ہو وہ زمانہ ماضی میں کسی صداقت پر عمل کرنے والے کی تغلیط نہ کرتا ہو اور آج جب اپنی طرف دعوت دے تو یہ کہہ کر دعوت دے کہ تم میری دعوت کی اپنی کتاب سے تصدیق کرلو خدا چاہتا ہے کہ اب بکھرے ہوئے ادیان و ملل کو ایک دین اور ملت بنا دیا جائے۔ دنیا کی ابتداء میں ایک ہی دین تھا اس کے خاتمہ پر پھر ایک ہی دین' ایک ہی ملت رہ جائے صراطِ مستقیم میں عقلی طور پر بھی تعدد کی گنجائش نہیں اس لیے فرقے اور پارٹیاں جو کچھ بنائیں پیروانِ مذہب نے بنائیں' باہمی رقابت اور عصبیت کے جراثیم جو کچھ پھیلائے انہوں نے ہی پھیلائے۔ فروعی اختلاف کو دین کی اساس سمجھ لیا اور اساسی مسائل کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا۔ اگر یہود و نصاریٰ غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اسلام ان سے ایسی کسی ایک بات کا بھی مطالبہ نہیں کرتا جو ان کی کتابوں کے خلاف ہو وہ مطالبہ کرتا ہے تو یہ کہ تم نے صحیح طور پر عیسیٰ علیہ السلام کا مقام نہیں پہچانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو ٹھیک نہیں سمجھا۔ تورات و انجیل کی صحیح تعلیمات تم نے حاصل نہیں کیں' تم ایک فرضی عیسیٰ (علیہ السلام) ایک موہوم موسیٰ (علیہ السلام) ایک خود تراشیدہ تورات و انجیل پر ایمان رکھتے ہو اس لیے تم کو حقیقت کا سراغ نہیں لگتا۔ بس تم اتنا ہی کرلو کہ اپنے نبیوں کو صحیح طور پر پہچان لو اور ان کی تعلیمات پر صحیح طور سے عمل پیرا ہو جاؤ تو جو رسول تمہارے سامنے آیا ہے وہی تمہیں اپنا رسول نظر آنے لگے گا۔ خدا کی کتاب جو تمہارے لیے بھیجی جا رہی ہے وہی اپنی کتاب معلوم ہونے لگے گی۔ وہی شعلہ طور' وہی ید بیضاء' وہی دم عیسیٰ دیکھنا ہو تو اب یہاں آ کر دیکھو۔ تورات کے وہی پرشوکت احکام۔ انجیل کی وہی سادہ اور رقت انگیز تعلیمات' زبور کی حمد وثنا کے وہی ترانے' پھر سننے ہوں تو یہاں آ کر سنو' یہ اس لیے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے تمام برگزیدہ انبیاء علیہم السلام کی شانوں کا مجموعہ بن کر آ گئے ہیں۔

حسن یوسفؑ دم عیسیٰؑ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

قرآن کریم خدا کی تمام متفرق صداقتوں کو اپنے دامن میں جمع کیے ہوئے نازل ہوا ہے' کیا وہی صداقت' وہی سچائی اگر تورات میں ہو' انجیل میں ہو تو قابل تسلیم ہو' اور اگر وہی قرآن میں ہو تو قابل انکار ہو سکتی ہے کیا وہی رسول اگر اس کی بشارت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام دیں تو قابل انتظار ہو اور جب وہی تمہاری آنکھوں کے سامنے آ جائے تو لائق انکار ہو سکتا ہے۔ پھر صرف ان چند مسائل کی بنا پر جو تمہارے ہی لیے تخفیف' تمہارے ہی لیے سہولت کا موجب تھے یہ عداوت یہ ضد کیوں ہے ایسی عالمگیر تعلیم' جذبات سے اتنی خالی' فرقہ پرستی اور تعصب سے اتنی دور' گذشتہ اور موجودہ ادیانِ سماویہ کا اتنا احترام سکھانے والی' پھر ضروریاتِ زمانہ کے لیے اتنی مناسب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ایک ایک شوشے کے ساتھ اتنی محفوظ۔ اگر دین اسلام کے سوا کسی اور دین میں موجود ہو تو بے شک اس کو اسلام کے مقابلہ میں آنے کا حق ہو سکتا ہے لیکن ان تمام صفات کے ساتھ موصوف تو کیا اگر کسی ایک صفت میں بھی اس کے ہم پلہ نہیں ہے تو یقیناً آج بھی اس کی پیروی نامنظور اور کل بھی خسارہ و نقصان کا موجب ہونا چاہیے۔

﴿وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ﴾ (آل عمران : ۸۵)

نوٹ : یہ یاد رہنا چاہیے کہ مؤلف کے نزدیک یہاں ارتقاء سے ڈارون کا وہ تمام فلسفہ مراد نہیں ہے جو انہوں نے سلسلہ تخلیق انسانی میں بیان کیا ہے بلکہ کسی جنس کے انواع میں وہ حسی ارتقاء مراد ہے جو ڈارون سے پہلے بھی مسلم تھا اور ان کے بعد بھی مسلم ہے۔ اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر بحث کرنا یہاں ہمارا موضوع نہیں ہے۔

(۲۱۸) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی يَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا

(۲۱۸) ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں اس بات پر مامور ہوں کہ اس وقت تک برابر جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اس کے پیغمبر ہیں' نمازیں اچھی طرح پڑھیں اور زکوۃ ادا کریں جب ان

---

(۲۱۸) * یعنی جب مشرکین کے ساتھ کسی سبب سے جنگ چھڑ جائے تو اب اس کے ختم کرنے کی قطعی صورت صرف ایک ہے کہ وہ خدا کی توحید اور تمام پیغمبروں کی تصدیق کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرلیں۔ نماز اور زکوۃ ادا کرنے کا اقرار کریں اس کا نام اسلام ہے۔ اسلام کے سوا کسی بھی مذہب کی تبدیلی سے جنگ ختم نہیں کی جاسکتی بلکہ اگر اسلام کے کسی ایک رکن کے انکار پر بھی اصرار باقی ہے جب بھی اسلام کی تلوار برابر چمکتی رہے گی۔ ہاں دائرہ اسلام میں آجانے کے بعد یہ تحقیق بھی نہیں کی جائے گی کہ یہ اسلام حقیقی تھا یا محض نمائشی اور وقتی۔ اس آئین کے ماتحت جب عہد نبوت کا نقشہ جنگ دیکھا جاتا ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ٹھیک اس وقت جب کہ جنگ نہایت گرماگری سے ہو رہی تھی اگر دشمن نے "صبانا صبانا" (ہم اپنے دین سے نکل گئے) کے نامانوس الفاظ کے ساتھ بھی اپنے اسلام کا اظہار کر دیا ہے اور خالد بن ولید جیسے جرنیل نے اپنی تلوار نیام میں نہیں کی تو اس کی خبر پہنچنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط تأثر سے فوراً آسمان کی طرف یہ کہتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیئے ہیں "پروردگار! یہ جو کچھ کیا خالد نے کیا میں اس سے بری ہوں" یا اگر کسی مشرک نے کسی مسلمان کا بازو کاٹ ڈالا ہے اور جب دست بریدہ مسلمان کا قابو چلتا دیکھا تو فوراً کلمہ اسلام پڑھ کر پناہ لینے کا ارادہ کیا ہے تو اس وقت بھی آپ نے اس مسلمان کی کوئی حجت نہیں سنی اور یہی حکم دیا کہ وہ اس کے بازو تک پہنچی ہوئی تلوار کھینچ لے۔

اس حدیث میں قتل کی بجائے قتال کا لفظ چاہتا ہے کہ یہاں اس جنگ کا تذکرہ ہے جس کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں پر نہیں ہے بلکہ اس میں مشرکین کا بھی بڑا ہاتھ ہے اس لیے اس کو اسلام پر جبر و اکراہ کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے ورنہ عبارت یوں ہونا چاہیے تھی "امرت ان اقتل الناس" مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں مشرکین کو قتل کرتا رہوں' تاوقتیکہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت میں ایک واقعہ بھی ایسا ثابت نہیں ہوتا جہاں محض اسلام پر مجبور کرنے کے لیے آپ نے کسی پر چڑھائی کی ہو۔ اگر اسلام جبر و اکراہ اور زبردستی کے تبدیل عقیدے کو جائز قرار دیتا تو دائرہ اسلام میں آجانے والوں کے لیے اتنا اغماض کیوں کرتا کہ امام یہ تحقیق بھی نہ کرے کہ ان کا یہ اسلام کہیں نمائشی تو نہیں ہے بلکہ حکم یہ ہوتا کہ جب تک ان کے اسلام کی طرف سے مکمل اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے۔

صلح اور جزیہ بھی اگرچہ جنگ ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں مگر یہ دونوں صورتیں طرفین کی رضامندی پر موقوف ہیں۔ فریق محارب صلح کی درخواست کرے گا یا جزیہ دینا قبول کرے گا تو اس کی درخواست قبول کی جاسکتی ہے لیکن جنگ ختم کرنے کا وہ حتمی اور یقینی سبب جو صرف دشمن کے ہاتھ میں ہے اسلام ہے۔ اس مرحلے پر قبول اسلام کے لیے جبر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس یہاں اس سبب کا بیان ہے جس کو اختیار کر کے مشرکین مسلمانوں کو جنگ ختم کرنے کے لیے مجبور کر سکتے ہیں۔

صحیح مسلم کے ایک طریقہ میں اتنا اور ہے کہ آپ نے حدیث مذکور بیان فرما کہ یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ﴿فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ﴾ (الغاشیہ: ۲۱-۲۲) آپ انہیں سمجھائے جائیے کیونکہ آپ کا کام سمجھانا ہی ہے آپ ان پر داروغہ مقرر نہیں کیے گئے ہیں۔

اب غور کیجیے اگر حدیث کے پہلے حصہ میں جبر و اکراہ کا کوئی ہلکا سا مفہوم بھی موجود ہوتا تو پھر اس کے ساتھ اس آیت کو تلاوت کرنے کا کیا مطلب ہے' یہ تو کھلا ہوا اختلاف ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو دلوں میں ڈال دینا رسول کا منصب ہی نہیں یہ کام خدائے لطیف....

ذَالِکَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَائَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ.

(رواه الخمسة)

احکام کو مان لیں تو اب مجھ سے اپنی جان اور مال کو بچالیں گے ہاں بجز اس صورت کے جو اسلامی ضابطہ کے ماتحت ہو اس کے بعد ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے (وہ جانے کہ ان کا اسلام محض نمائشی تھا یا دل سے)

(۲۱۹) عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُعْطِیْتُ خَمْسًا لَمْ یُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِیْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِیْرَةَ شَهْرٍ وَ جُعِلَتْ لِیَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَ طَهُوْرًا فَاَیُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِیْ اَدْرَکَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْیُصَلِّ وَ اُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ وَ لَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ

(۲۱۹) جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے پانچ باتیں مجھے خاص طور پر عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پیشتر کسی نبی کو نہیں دی گئیں' ایک ماہ کی مسافت سے دشمن پر رعب و خوف ڈال کر میری مدد کی گئی ہے' تمام روئے زمین میرے لیے مسجد اور (پانی نہ ہونے کی حالت میں پاک کرنے کا آلہ بنادی گئی ہے تو میری امت میں جس کو جہاں نماز کا وقت آجائے وہیں پڑھ لے- میرے لیے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا ہے' مجھ سے

ﷺ.... قدوس کا ہے اس کا کام صرف وعظ و تذکیر کے ذریعہ اسلام کی خوبیاں بیان کر دینا ہے' تلوار کے ذریعہ سے کسی چیز کی خوبی نہ تو دلوں میں بٹھائی جا سکتی ہے اور نہ اس کا منصب نبوت سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے- جبر و اکراہ کے مضمون کے ساتھ صحیح مسلم کے اس ٹکڑے کا کوئی جوڑ نہیں ملتا- جبر کے ہوتے ہوئے آپ مصیطر تو ہو سکتے ہیں مذکو نہیں ہو سکتے اس لیے یہ بدیہی ہے کہ یہاں قبول اسلام پر مجبور کرنے کے لیے جنگ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ مشرکین کی جو جنگ اسلام کے ساتھ جاری تھی اس کے ختم کر دینے کی یہ ایک قطعی شکل بیان کی گئی ہے اور شکل بھی ایسی جو ان کی مرضی پر موقوف ہو- جنگ انہوں نے شروع کی اس لیے اب ختم بھی انہیں ہی کو کرنی ہوگی-

(۲۱۹) * آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کا ان پانچ ہی میں انحصار نہیں ہے ان کے علاوہ بھی آپ کی بہت سی خصوصیات ہیں جن کو شیخ جلال الدین سیوطی نے خصائص الکبری میں جمع کیا ہے اس سلسلہ میں سب سے بڑی خصوصیت آپ کی بعثت عامہ ہے- یعنی یہ کہ آپؐ کائنات ارضی کی تمام آبادیوں کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں- اسی بعثت عامہ کا یہ قدرتی تقاضا ہے کہ اب روئے زمین پر شریعت محمدی کے علاوہ کسی شریعت کی پیروی کرنا نجات کے لیے کافی نہیں- حتیٰ کہ دین کامل کے اس دور میں اگر موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر بھی تشریف لائیں تو ان کے لیے بھی اسی دین کی پیروی کرنا ناگزیر ہے کیونکہ اب یہی دین اور یہی شریعت ہے جس میں تمام آسمانی صداقتوں کی روح اپنے تمام کمالات کے ساتھ سمودی گئی ہے- حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے متعلق بھی عام ہونے کا شبہ کیا گیا ہے مگر وہ اس لیے صحیح نہیں کہ اوّل تو ان کے زمانہ تک معمورۂ عالم شاید اتنی وسعت کے ساتھ آباد بھی نہ ہوا ہوگا گمانِ غالب یہ ہے کہ اس نو آباد کرۂ زمین پر صرف ان ہی کی قوم ہوگی اس لیے عموم بعثت کا مفہوم قدرۃً ان ہی میں منحصر ہونا چاہیے اور اگر اس سے آگے بھی عموم تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے بہت اس کا احاطہ صرف حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ حیات تک ہو سکتا ہے- شیخ تقی الدینؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ توحید اور اصول دین کے لحاظ سے اگرچہ تمام انبیاء کی بعثت عام تھی' مشترکہ صداقتوں کی دعوت ہر نبی جسے چاہے دے سکتا تھا لیکن منہاجوں اور شریعتوں کی دعوت اپنی اپنی قوم کے ساتھ مخصوص تھی مگر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس میں نہ تو قوموں کی تخصیص ہے' نہ شریعت میں کسی قوم کی' نہ زمان و مکان کی بلکہ حیات و وفات کی قید بھی نہیں- یہاں تک کہ جن و انس کی بھی کوئی تخصیص نہیں اور اگر غیر مکلف یا جمادات بھی انوارِ نبوت سے غیر شعوری طور پر مستفیض ہو سکتے ہوں تو وہ بھی بلاشبہ اس کے احاطہ میں داخل ہیں- ﷺ....

قَبۡلِیۡ وَ اُعۡطِیۡتُ الشَّفَاعَةَ وَ کَانَ النَّبِیُّ یُبۡعَثُ اِلٰی قَوۡمِہٖ خَاصَّةً وَ بُعِثۡتُ اِلَی النَّاسِ عَامَّةً۔

(رواہ الخمسة الاابادا ؤد)

پیشتر کسی کے لیے حلال نہیں کیا گیا - شفاعت کبریٰ کا حق صرف مجھے بخشا گیا ہے- مجھ سے پہلے جو نبی تھے وہ خاص اپنی ہی قوم کے لیے ہوتے تھے میں تا قیامت تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں-

من اٰمن من اهل الكتاب يوتى له الاجر مرتين

اہل کتاب میں جو شخص ایمان لائے گا اس کو دو اجر ملیں گے

(۲۲۰) حَدَّثَنِیۡ اَبُوۡ بُرۡدَةَ عَنۡ اَبِیۡهِ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَّهُمۡ

(۲۲۰) ابو بردہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین شخصوں کو دو اجر ملیں گے ایک وہ اہل

ﷺ .... غرض یہ عموم واطلاق یا خالق کی خالقیت و ربوبیت کے لیے ہے اور یا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے لیے- وہ رب العالمین ہے تو یہ رحمۃ للعالمین- اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَ سَلِّمۡ وَ بَارِکۡ عَلَیۡهِ کَمَا تُحِبُّ وَ تَرۡضٰی ؎

یا رب تو کریمی و رسول تو کریم صد شکر کہ ہستیم میان دو کریم

(۲) ساز و سامان کے ساتھ دشمن کا مرعوب ہونا عام بات ہے لیکن بے سرو سامانی میں اس کا لرزہ براندام ہو جانا آپ کی خصوصیات میں ہے- ایک ماہ کی مسافت کی تخصیص صرف اس بنا پر ہے کہ اس وقت آپ کی عداوت کا دائرہ زیادہ تر اسی مسافت کے اندر اندر تھا- (دیکھو عمدۃ القاری)

(۳) پہلی امتوں پر نماز کے لیے گرجا و کنیسہ کی پابندی تھی اس امت کے لیے وقت کی پابندی زیادہ ضروری ہے مسجد کے بغیر بھی نماز ادا ہو سکتی ہے اس لیے مسجد کی تلاش میں وقت نہ جانا چاہیے- یہی وجہ ہے کہ ابتداء اسلام میں مساجد کی تعمیر سے قبل مرابض غنم یعنی بکریوں کے بندھنے کی جگہ بھی نماز ادا کر لی گئی ہے- مسئلہ کی فقہی حیثیت اپنے محل پر ذکر کی جائے گی-

(۴) اس امت سے پیشتر بھی مالِ غنیمت خدا کی ملک سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اسی کی ملک سمجھا جاتا ہے- فرق اتنا ہے کہ پہلے آگ آسمان سے آکر اسے جلا دیتی تھی اور یہی بنی اسرائیل جیسی حریص قوم کے لیے مناسب بھی تھا- اب اس ناتوان و نادار امت کے مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس مال کو خدا کی مقرر کردہ تقسیم کے مطابق پھیلا دیا جائے- یہاں نادان تو ہر لوٹ کے مال کو مالِ غنیمت کہہ دیتا ہے اور دانا دشمن اسے لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ سمجھتا ہے اصل بات نہ یہ ہے نہ وہ- تفصیل کتاب الجہاد میں آئے گی-

(۵) محشر میں جب شانِ کبریائی کسی سے خطاب نہ کرے گی تو اس عقدہ کشائی کے لیے اہل محشر کسی شفیع کی تلاش کریں گے رب العزت نے اس کام کے لیے اپنے قہر و غضب کے سب سے بڑے مظاہرے کے دن اپنی سب سے بڑی رحمت کو منتخب کیا ہے تاکہ جب عین غیظ و غضب کے حال میں رحمۃ للعالمین سامنے آجائیں تو ''سبقت رحمتی غضبی'' کے قاعدہ کے مطابق اقتضاء رحمت غضب کے اقتضاء پر غالب آجائے اور بے یار و مددگار مخلوق سے حساب و کتاب شروع ہو جائے اسی کا نام شفاعت کبریٰ ہے اور یہ صرف آپؐ ہی کا حصہ ہے اس کے بعد بہت سی اور سفارشیں ہوں گی انہیں شفاعت صغریٰ کہتے ہیں' اس میں شفاعت اکبر کے بہت سے امتیوں کا بھی حصہ ہے-

(۲۲۰) * ہر شخص کی فطرت ہے کہ اس کو اپنے دین سے ایک والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت کا تعلق ہوتا ہے اس لیے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا فطرۃً شاق گذرتا ہے- اسلام یہ کہتا ہے کہ ادیانِ سماویہ میں کوئی رقابت نہیں ہے' پارٹیاں نہیں ہیں اس لیے ﷺ ....

اَجْـرَانِ رَجُـلٌ مِـنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَ اٰمَنَ بِـمُـحَـمَّدٍ وَ الْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ اِذَا اَدّٰى حَـقَّ اللّٰهِ وَ حَقَّ مَوَالِيْهِ وَ رَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ يَـطَـأُهَـا فَـاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَاْدِيْبَهَا وَ عَلَّمَهَا فَـاَحْسَـنَ تَـعْـلِـيْـمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْـرَانِ ثُـمَّ قَالَ عَامِرٌ اَعْطَيْنَا كَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ وَ قَدْ كَانَ يَرْكَبُ فِيْمَا دُوْنَهَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ.

(رواه البخاری وغیرہ)

کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لایا پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔ دوسرا وہ غلام جو خدا کا حق ادا کرے اور اپنے آقاؤں کا بھی' تیسرا وہ شخص جس کی باندی تھی وہ اس سے صحبت کرتا تھا پہلے اس کو خوب سلیقہ شعار بنایا' خوب تعلیم دی پھر آزاد کیا اور اس سے نکاح کرلیا اس کو بھی دو اجر ملیں گے عامر (راویٔ حدیث اپنے شاگرد سے کہتا ہے) ہم نے تو ایسی بیش بہا حدیث تمہیں کسی رنج و تعب کے بغیر سنا دی پہلے اس سے معمولی حدیث کے لیے مدینہ تک سفر کیا جاتا تھا۔

(متفق علیہ)

المبايعة على الاسلام هو الحلف على الوفاء بذمة الله

اسلام پر بیعت کرنا خدا کی اسٹیٹ میں حلف وفاداری کے ہم معنی ہے

(۲۲۱) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ (وَ كَانَ شهد بـدرا و هـو احـد الـنـقـبـاء لـيـلـة العقبة) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ وَ

(۲۲۱) عبادہ بن صامت سے روایت ہے (یہ بدر میں شریک تھے اور لیلۃ العقبہ میں بیعت کرنے والوں میں شامل تھے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صحابہ کی ایک مختصر جماعت بیٹھی ہوئی تھی آپ نے ان سے مخاطب ہو کر

ﷺ.... ان مذاہب کے پیرووں کو بھی یہی جذبہ رکھنا چاہیے یہ ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہیں' ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے اس لیے اگر کوئی اہل کتاب اسلام قبول کرے تو اس کو یہ وسوسہ نہ گذرنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائیگاں چلا گیا۔ بلکہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے تو دو اجر کا مستحق ہوگا ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر آپ پر ایمان نہ لایا تو پہلے ایمان کا اجر بھی حبط ہو جائے گا۔ کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے بارے میں تفریق نہیں کی جاسکتی جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر شمار ہوگا۔ اس بشارت میں دراصل اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ آپؐ کی ذاتِ ستودہ صفات پر بھی ایمان لے آئیں اور کیوں ایمان نہ لائیں جب کہ ان سب نبیوں پر ایمان لانا آپؐ کی دعوت کا جزء ہے۔ پس آپؐ پر ایمان لانا ان سب پر ایمان لانا اور آپؐ کا انکار' ان سب کا انکار ہے اس لیے اگر وہ خدا کے دین یا خدا کے رسولوں کے متعلق فرقہ پرستی کی اسپرٹ رکھیں گے تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام اس کو برداشت نہیں کرے گا اور الٹا ان کا حاصل کردہ اجر بھی برباد ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایمان لانا سب انبیاء علیہم السلام پر ضروری لیکن منہاج اطاعت صرف اسلام میں منحصر ہے۔

(۲۲۱) * یہ ایک عام دستور ہے کہ ہر اسٹیٹ کی ابتداء اس کے ساتھ حلف وفاداری اٹھانے سے ہوتی ہے کیونکہ جب تک کسی اسٹیٹ اور کسی نظام حکومت کے ساتھ پوری وفاداری کا عہد نہ کیا جائے اس نظام کا چلنا ہی ممکن نہیں۔ اس عہد کو کرنے کے بعد نہ صرف یہی کہ اس نظام حکومت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے بلکہ سرمو اس کی مخالفت کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اس کے ساتھ عملاً پوری ہمدردی کرنا بھی فرائض میں شمار ہوتا ہے اسی طرح اسلامی نظام حکومت بھی اپنے ہمنواؤں سے سب سے اوّل اپنے ساتھ حلف وفاداری اٹھانے کا مطالبہ کرتا ہے اس کی صورت یہاں کلمہ توحید اور رسالت کی شہادت مقرر کی گئی ہے اسی کا نام ایمان و اسلام ہے اور اسی عہد کو اور زیادہ ﷺ....

حَوْلَہٗ عِصَابَۃٌ مِنْ اَصْحَابِہٖ بَایِعُوْنِیْ عَلٰی اَنْ لَا تُشْرِکُوْا بِاللّٰہِ شَیْئًا وَ لَا تَسْرِقُوْا وَ لَا تَزْنُوْا وَ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَ کُمْ وَ لَا تَاْتُوْا بِبُھْتَانٍ تَفْتَرُوْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْکُمْ وَ اَرْجُلِکُمْ وَ لَا تَعْصُوْا فِیْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَ فٰی مِنْکُمْ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ وَ مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِکَ شَیْئًا فَعُوْقِبَ فِی الدُّنْیَا فَھُوَ کَفَّارَۃٌ لَہٗ وَ مَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِکَ شَیْئًا ثُمَّ سَتَرَہُ اللّٰہُ فَھُوَ اِلَی اللّٰہِ اِنْ شَاءَ عَفَاعَنْہُ وَ اِنْ شَاءَ عَاقَبَہٗ فَبَا یَعْنَاہُ عَلٰی ذٰلِکَ. (رواہ البخاری)

فرمایا مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو- خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے' چوری نہیں کرو گے' زنا نہیں کرو گے' اپنے بچوں کو قتل نہیں کرو گے' دیدہ و دانستہ کسی پر افتراء پردازی نہیں کرو گے اور ان احکام میں جو شریعت کے مطابق ہوں میری نافرمانی نہیں کرو گے' جو شخص تم میں اس عہد کو پورا کرے گا اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے اور جو (حسب الاتفاق) ان باتوں میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے گا پھر دنیا میں اس کی سزا مل جائے گی تو یہ سزا اس کا کفارہ ہو جائے گی اور اگر اس کو (سزا نہ ملی اور) اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کی پردہ پوشی فرمائی تو اب یہ اس کی مرضی پر منحصر ہو گا اگر چاہے تو آخرت میں بھی درگذر فرمائے اور اگر چاہے تو اسے عذاب دے- ہم نے ان سب شرطوں پر آپ سے بیعت کر لی- (بخاری شریف)

کیف یبایع الامام النّاس؟

امام کو لوگوں سے کن باتوں پر بیعت لینا چاہیے؟

(۲۲۲) عَنْ قَیْسٍ سَمِعْتُ جَرِیْرًا یَقُوْلُ بَایَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلٰی شَھَادَۃِ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَ السَّمْعِ وَ الطَّاعَۃِ وَالنُّصْحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ. (بخاری)

(۲۲۲) قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے جریر سے خود سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے (امام) کی بات سننے اور اس کے احکام ماننے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت کی تھی- (بخاری)

ﷺ.... مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے بیعت لی جاتی ہے- پس ایمان اگرچہ بظاہر صرف رسالت اور توحید کے اقرار کا نام ہے مگر درحقیقت وہ پوری اسلامی اسٹیٹ کے ساتھ وفاداری کا ایک مؤکد اور مضبوط اقرار ہے اس لیے صرف ایمان لانے سے اسلام کے تمام احکام کا تسلیم کرنا بلکہ اس کی مشنری کا خود ایک پرزہ بن جانا ضروری ہو جاتا ہے- رسول خدا کی احتیاط کی یہ حد ہے کہ جب کسی کو بیعت فرماتے تو الفاظ بیعت میں یہ قید لگا دیتے کہ آپ کی اطاعت کی حدود بھی صرف معروف کے اندر اندر محدود رہیں گی حالانکہ آپ کے متعلق معروف کے سوا منکر کے حکم دینے کا خطرہ بھی نہیں کیا جا سکتا- اصل مقصود یہ بتانا تھا کہ جب خدا کی نافرمانی کی سرحد آ جائے تو اب خدا کی مخلوق میں کسی بڑے سے بڑے کی اطاعت بھی نہیں کی جائے گی بلکہ اب اس کی اطاعت اسلامی اسٹیٹ کے ساتھ غداری تصور کی جائے گی-

یہاں بیعت کے مذکورہ بالا الفاظ میں قتل اولاد وغیرہ کا ذکر بھی آ گیا ہے یہ صرف اس زمانہ کے ماحول کی رعایت تھی اب امام کے لیے اپنے زمانہ کے تقاضوں کی رعایت کر لینا مناسب ہے اور اس قسم کے جرائم پر بیعت لینا مناسب ہے جو اس کے زمانہ میں زیادہ پھیل چکے ہوں-

(۲۲۳) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ وَ الْمَنْشَطِ وَ الْمَکْرَہِ وَ اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَ اَنْ نَقُوْمَ اَوْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ حَیْثُ مَا کُنَّا لَاتَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ (بخاری)

(۲۲۳) عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے حکم سننے اور ماننے پر بیعت کی تھی' خوشی اور ناخوشی دونوں حالوں میں اور اس پر کہ خلافت کے معاملہ میں ہم کسی حق دار شخص سے کوئی جھگڑا نہیں کریں گے' حق کو قائم رکھیں گے (راوی کو یہاں شک ہے کہ یا یہ لفظ تھے کہ حق کہتے رہیں گے) جہاں بھی ہم ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کھائیں گے۔ (بخاری)

(۲۲۴) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ کُنَّا اِذَا بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ یَقُوْلُ لَنَا فِیْمَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (بخاری)

(۲۲۴) عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپؐ کے احکام سننے اور ماننے پر بیعت کرتے تو آپؐ ہم سے کہتے کہ (یہ قید لگالو کہ) جتنی تم میں طاقت ہو گی۔

لایبایع رجلا للدنیا

دنیا کے لیے کسی سے بیعت کرنا نہیں چاہیے

(۲۲۵) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لَا یُزَکِّیْھِمْ وَ لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ رَجُلٌ عَلٰی فَضْلِ

(۲۲۵) ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین شخص ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت میں بات بھی نہ کرے گا' نہ انہیں گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ایک وہ شخص جو لبِ راہ اپنی حاجت سے زائد پانی رکھتا ہے اور مسافروں کو اس میں

---

(۲۲۳) * اسلام میں مرکزی طاقت امیر و خلیفہ کو سمجھا گیا ہے۔ طاقت کو محفوظ رکھنے اور اس کی وحدت کو انتشار سے بچانے کے لیے مسلمانوں پر پہلا فرض یہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ امیر کا حکم خوشی اور ناخوشی کی بحث سے علیحدہ ہو کر ہر حال مانیں بشرطیکہ اس میں خدا کی نافرمانی کا کوئی پہلو نہ ہو اور دوسرا یہ کہ جب اس منصب کی کوئی اہل ہستی سامنے آجائے تو اس کی راہ میں ہرگز آڑے نہ آئیں۔ تیسرا فرض جو اس مرکزی وحدت کا سب سے بڑا مقصد ہے وہ دنیا میں حق کا قیام ہے اس لیے اس کو بھی بیعت کا ایک اہم ترین عنصر قرار دیا گیا ہے۔ اس تیسرے جزء سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اس بیعت کے پہلو جملوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ مرکزی طاقت کے خلاف کسی نفسانیت یا نافہمی کی بنا پر ہنگامہ آرائی نہ کی جائے اسی لیے جہاں ایک طرف اس خاموشی کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اس صاف گوئی کا عہد بھی لیا گیا ہے جس میں امیر و غریب' مالک و آقا اور بادشاہ و رعایا کا کوئی فرق نہیں ہے۔ عہدِ سلف کی تاریخ آج بھی مسلمانوں کی اس صاف گوئی کی شاہد ہے۔ اگر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے منصف اور بارعب امیر پر بھی کوئی ادنیٰ شبہ ہو گیا ہے تو بر سر منبر ان کو ٹوک دینے میں ذرا تامل نہیں کیا گیا۔

(۲۲۵) * اسلامی بیعت کا تعلق چونکہ امیر وقت اور مرکز سے وابستہ ہے اس لیے یہاں انسانی نیت میں بہت سی کمزوریاں داخل ہو سکتی ہیں' اس کی سب سے بڑی کمزوری دنیا طلبی ہے اس لیے یہاں اس پر متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اتنے اہم عمل کا مقصد اتنا ادنیٰ نہ بنانا چاہیے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اس کے مذہبی نظام سے جدا نہیں بلکہ ان ہی تمام ہدایتوں کے نیچے ہے جس کے تحت مذہبی نظام ہے.....

مَاءٍ بِالطَّرِيْقِ يَمْنَعُ مِنْهُ ابْنَ السَّبِيْلِ وَ رَجُلٌ بَايَعَ اِمَامًا لَايُبَايِعُهُ اِلَّا لِلدُّنْيَا فَاِنْ اَعْطَاهُ مَايُرِيْدُ وَ فٰى لَهُ وَ اِلَّا لَمْ يَفِ لَهُ وَ رَجُلٌ يُبَايِعُ رَجُلًا بِسِلْعَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ فَحَلَفَ بِاللّٰهِ لَقَدْ اُعْطِیَ بِهَا كَذَا وَ كَذَا فَصَدَّقَهُ وَ لَمْ يُعْطَ بِهَا. (رواہ البخاری)

سے استعمال کرنے نہیں دیتا- دوسرے وہ شخص ہے جو امام وقت سے صرف دنیا کے لیے بیعت کرتا ہے اگر اس نے اس کے خیال کے مطابق کچھ دے دیا تب تو اس نے اس کے ساتھ وفا کی ورنہ نہ کی- تیسرے وہ شخص جس نے عصر کے بعد کسی کے ہاتھ مال بیچا اور (جھوٹی) قسم کھائی کہ اس چیز کی اس کو اتنی قیمت دی جاتی تھی حالانکہ اس کو وہ قیمت نہیں دی جاتی تھی اس بیچارہ نے اس کی بات کو سچ سمجھا (اور اس قیمت کو لے لیا) (بخاری شریف)

بيعة النساء

عورتوں کی بیعت

(۲۲۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُبَايِعُ النِّسَآءَ بِالْكَلَامِ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ لَاتُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا قَالَتْ وَ مَا مَسَّتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَامْرَءَةٍ اِلَّا امْرَءَةً يَمْلِكُهَا. (بخاری)

(۲۲۶) عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو یہ آیت پڑھ کر صرف زبانی بیعت فرمالیا کرتے تھے ''کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گی'' خدا کی قسم کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک سوائے آپ کی مملوکہ عورتوں کے کسی اجنبی عورت کو نہیں لگا- (بخاری شریف)

بيعة الصغير

بچے کی بیعت

(۲۲۷) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ هِشَامٍ وَ كَانَ قَدْ اَدْرَكَ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ ذَهَبَتْ بِهٖ اُمُّهٗ زَيْنَبُ بِنْتُ حُمَيْدٍ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ

(۲۲۷) عبداللہ بن ہشام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے (انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا اور ان کی والدہ زینب ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئی تھیں) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لڑکے کو بیعت فرمالیجئے آپ صلی

بقیہ ..... ہے- یہی وجہ ہے کہ اسلام کی سیاست میں بھی ہمیشہ وہی اسپرٹ کارفرما رہی ہے جو مذہب میں ہوا کرتی ہے اور اسی بنا پر کسی کو یہ دھوکا لگ گیا ہے کہ آسمانی مذاہب بھی درپردہ انسانوں کی سیاست کا ایک صرف ایک نقاب تھے-

(۲۲۶) ٭ معلوم نہیں کہ جب دنیا کی اس سب سے مقدس ہستی نے بھی عورتوں کو بیعت کرنے کے وقت ہاتھ نہیں لگایا تو پھر کسی اور شخص کو یہ حق کیسے پہنچ سکتا ہے- واضح رہے کہ یہاں اچھی اور بری نیت کا سوال نہیں ہے بلکہ بیعت کے وقت عورت کو ہاتھ لگانا خواہ کسی نیت سے ہو آئین بیعت ہی نہیں رکھا گیا- درحقیقت شریعت کی یہ بڑی پرحکمت نظر ہے کہ جن مقامات پر انسان کوئی ادنیٰ خیانت بھی کرسکتا تھا اس نے مدار کار صرف ظاہر عمل پر رکھ دیا ہے اور نیت سے کوئی بحث نہیں کی-

(۲۲۷) بیعت کا مقصد شریعت پر عمل کرنے کا عہد لینا ہے جس پر ابھی خود اللہ تعالیٰ نے عمل کرنے کا بوجھ نہیں ڈالا اس پر عمل کا بوجھ آپ کیسے ڈال سکتے تھے ہاں رحمۃ للعالمین نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ اس کو دعاء برکت دیئے بغیر یونہی رخصت کردیا جائے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دونوں شانیں حکمت وشفقت سے لبریز نظر آتی ہیں-

31 اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَایِعْہُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھُوَ صَغِیْرٌ فَمَسَحَ رَأْسَہُ وَ دَعَالَہُ. (رواہ البخاری)

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بچہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لیے دعا فرمائی -

(بخاری شریف)

بیعة الرقیق

(۲۲۸) عَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ عَبْدٌ فَبَایَعَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْھِجْرَۃِ وَ لَا یَشْعُرُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہُ عَبْدٌ فَجَاءَ سَیِّدُہُ یُرِیْدُہُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِعْنِیْہِ فَاشْتَرَاہُ بِعَبْدَیْنِ اَسْوَدَیْنِ ثُمَّ لَمْ یُبَایِعْ اَحَدًا بَعْدُ حَتّٰی یَسْاَلَہُ اَعَبْدٌ ھُوَ.

(رواہ الترمذی و قال حدیث حسن صحیح)

غلام کی بیعت

(۲۲۸) جابر رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک غلام آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت پر بیعت کی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ غلام ہے اس کے بعد اس کا مالک اس کو لینے کے لیے آیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اس کو میرے ہاتھ فروخت کردو اور سیاہ رنگ کے دو غلام دے کر اس کو خرید لیا اور آئندہ کبھی کسی کو اس وقت تک بیعت نہ کیا جب تک کہ یہ تحقیق نہ کر لی کہ کہیں وہ غلام تو نہیں ہے-

(ترمذی)

بیعة الاعراب

(۲۲۹) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰہِ اَنَّ اَعْرَابِیًّا بَایَعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی الْاِسْلَامِ فَاَصَابَہُ وَعْکٌ فَقَالَ اَقِلْنِیْ بَیْعَتِیْ

بادیہ نشینوں کی بیعت

(۲۲۹) جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک گنوار آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام پر بیعت کی' اتفاق یہ کہ اس کو بخار ہو گیا' اس نے کہا آپ میری بیعت واپس فرما دیجئے آپ نے انکار کیا وہ پھر آپ کے

---

(۲۲۸) * یہاں ایک مشکل تو یہ درپیش تھی کہ اس غلام کو تحقیق سے قبل بیعت کر لینا یہ تقاضہ کر رہا تھا کہ اس کو فوراً اس کے مالک کے حوالہ کر دیا جاتا - دوسری مشکل اپنی بیعت کے احساس ذمہ داری کی تھی - جس کو بیعت کر کے ایک مرتبہ اپنی پناہ میں لے لیا گیا تھا اس کو دشمن کے حوالہ کر دینا خوشی سے کیونکر گوارا کر لیا جائے - اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں پہلوؤں کو نبھایا اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا - مالک کو یوں خوش کر دیا کہ ایک غلام کے بدلہ دو غلام دے دیئے اور غلام کے بیعت کی یوں لاج رکھ لی کہ اس کی حمایت میں جائز طور پر جو قدم بھی اٹھایا جا سکتا تھا اٹھا دیا - لیکن آئندہ کے لیے اپنا یہ دستور العمل ٹھیرا لیا کہ جب کسی کے متعلق ذرا شبہ پڑتا تو بیعت کرنے سے پہلے یہ تحقیق فرما لیتے کہ کہیں وہ کسی کا غلام تو نہیں - اس قسم کے روزمرہ کے واقعات سے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم عام معاملات میں بھی جبر واکراہ سے کتنی دور رہتے تھے اور حقوق کی ادائیگی کے بارے میں اپنے اور پرائے' مسلمان اور کافر کا کوئی امیاز نہ کرتے تھے-

(۲۲۹) * ایک گنوار وہ بھی عرب کا باشندہ جس کی فطرت میں بد فالی و نیک فالی کا عقیدہ رچا ہوا تھا بیعت اسلام کے بعد اتفاقاً بیمار پڑتا ہے تو العیاذ باللہ اس کو اپنے اسلام کی نحوست تصور کر لیتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس کا علاج اب اس بیعت کو فسخ کر ڈالنے کے سوا کچھ نہیں - ایسے کم علم اور نافہم کو آپ سمجھاتے بھی تو کیا سمجھاتے اور اسلام کی بیعت واپس کرنے کا اقرار بھی کرتے تو کیسے - یہ بیعت کوئی لہ ....

81 فَـاَبٰـى ثُـمَّ جَاءَ هٗ فَاَبٰى ثُمَّ جَاءَ هٗ فَاَبٰى فَخَرَجَ فَـقَـالَ رَسُـوْلُ الـلّـٰـهِ صَـلَّـى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْـمَـدِيْـنَـةُ كَـالْـكِـيْـرِ تَـنْـفِـىْ خَبَثَهَـا وَ تُـنَـصِّـعُ طَيِّبَهَا. (رواه البخاری)

پاس آیا آپ نے پھر انکار کیا وہ پھر آیا آپ نے پھر انکار کیا آخر وہ مدینہ سے نکل گیا- آپ نے فرمایا مدینہ مثل ایک بھٹی کے ہے اپنے میل کچیل کو دفع کر دیتا ہے اور عمدہ کو اور خالص کر دیتا ہے- (بخاری شریف)

.... خرید و فروخت کی معمولی بیعت تو نہ تھی کہ جب چاہی کر لی اور جب چاہی فسخ کر ڈالی' یہ تو متاع حیوٰۃ گنوانے یا ٹھکانے لگانے کا سودا تھا- خدا سے محبت' اس کے احکام کی بجا آوری پر عہد لینے اور عہد کرنے کی اہم بیعت تھی- اگر یہ احمق اس کو واپس کرتا ہے تو کر دے لیکن داعی اسلام سے فسخ بیعت پر دستخط کر دینے کی تمنا کیوں کرتا ہے- آپؐ کی دعوت وارشاد کا یہ پہلو بھی عجب پر حکمت ہے کہ اس قسم کے احمقوں سے نہ تو ان کے ناسزا کلمات کی کبھی آپؐ تحقیق فرماتے اور نہ ان پر کچھ مواخذہ ہی کرتے بلکہ کوئی ایسا حقیقت اور نصیحت سے بھرا ہوا کلمہ ارشاد فرما دیتے جو اس کی نصیحت آموزی اور دوسروں کی عبرت پذیری کے لیے کافی ہو جاتا- یہاں بھی آپؐ صرف یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ مدینہ چھوڑ کر باہر چلا جانا اور اس کے سرد و گرم کی برداشت نہ کرنا اچھی علامت نہیں- یہاں کی تنگی و ترشی پر جو صبر کر گیا وہ گناہوں کی آلائشوں سے پاک وصاف ہو گیا اور جو ان پر صبر نہ کر سکا اور گھبرا کر باہر نکل گیا وہ جیسا نجاست آلودہ داخل ہوا تھا ویسا ہی نجاست آلودہ چلا گیا- سوچو اور انصاف کرو کہ پورے اقتدار کے باوجود نہ تو اس کے اس طرزِ عمل پر آپؐ کوئی ادنیٰ سرزنش فرماتے ہیں اور نہ اس کو اسلامی بیعت قائم رکھنے پر مجبور ہی کرتے ہیں اور نہ اس تحقیق میں پڑنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ اس فقرہ سے اس کا اصل مقصد کیا تھا' کیا اتنی آزادی کے بعد بھی اسلام میں جبر واکراہ کا کوئی تخیل لایا جا سکتا ہے-

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مدح و ذم کے ان مقامات پر بھی جہاں انسان کا قلم اور زبان دونوں بے قابو ہو جاتے ہیں انبیاء علیہم السلام کا قدم ذرا نہیں ڈگمگاتا- وہ یہاں بھی اتنے اعتدال کے ساتھ چلتے ہیں کہ ان کے اور کمالات کو چھوڑ کر اگر اسی ایک کمال پر غور کیا جائے تو ان کی حقانیت اور نبوت کے ثبوت کے لیے یہی ایک بات کافی ہے- کیا ممکن ہے کہ بڑے سے بڑے اشتعال آمیز اور زیادہ سے زیادہ مسرت بخش حالات میں بھی ان کے منہ سے ایک لفظ بھی ایسا نکل جائے جس میں مبالغہ آمیزی کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی پیدا ہو سکے اس وقت بھی ان کی زبان سے وہی الفاظ نکلتے ہیں جو حقیقت کی ترجمانی کے لیے سب سے قریب تر ہو سکتے ہیں- پہلے ایک واقعہ آپ پڑھ چکے ہیں جس میں ایک شخص اسلام لاتا ہے اور اس کے بعد فوراً شہید ہو جاتا ہے ایسے پاک وصاف انسان اور ایسے جان باز کی مدح سرائی کے لیے اگر کوئی شاعر مزاج زبان کھولتا تو نہ معلوم آسمان و زمین کے کتنے قلابے ملا دیتا یا اس گنوار جیسے بدبخت اور گستاخ کے ہجو کرنے پر آتا تو خدا جانے کیا کچھ کہتا مگر رسول خدا کی زبان سے اس شہید کے حق میں جو کلمات مدحیہ نکلے وہ صرف یہ تھے ''عـمـل قليل و اجر كثير'' اس نے عمل گو تھوڑا کیا تھا مگر ثواب بہت پایا اور اس گستاخ کے حق میں جو کلمات ارشاد ہوئے وہ بھی صرف یہ ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں- ان دونوں مقامات پر لسانِ نبوت کے کانٹے پر تلے ہوئے کلمات دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ استقامت وتمکین سے لبریز کلمات ایسے سمندر کے موتی ہیں جس میں ہواؤں کے طوفان خیز تموج سے بھی کوئی ادنیٰ جنبش نہیں ہوتی- ہم اس حقیقت کو جابجا واضح کریں گے اور آپ ہر جگہ اس کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کیجئے گا کہ روزمرہ کی گفتگو' دن رات کی ان معمولی واقعات میں جن کو انسان کوئی اہمیت نہیں دیتا انبیاء علیہم السلام کا انداز بیان کیا رہتا ہے اس کے بعد آپ مجبور ہو جائیں گے کہ ان نفوسِ قدسیہ کی صداقت و امانت' علو ہمت وفکر اور ان کی بنی نوعِ انسانی کے ساتھ یکساں ہمدردی پر پورا یقین کر لیں-

الذین وفد و اعلی النبی ﷺ من العرب للسوال عن الاسلام و الایمان

(۱) وفادۃ ضمام بن ثعلبہ

(۲۳۰) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍؓ قَالَ کُنَّا قَدْ نُهِیْنَا اَنْ نَسْأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَیْءٍ فَکَانَ یُعْجِبُنَا اَنْ یَجِیْءَ الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِ الْبَادِیَةِ الْعَاقِلُ فَیَسْأَلُهُ وَ نَحْنُ نَسْمَعُ فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْبَادِیَةِ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اَتَانَا رَسُوْلُکَ فَزَعَمَ لَنَا اَنَّکَ تَزْعُمُ اَنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَکَ قَالَ صَدَقَ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ السَّمَاءَ قَالَ اللّٰهُ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ الْاَرْضَ قَالَ اللّٰهُ قَالَ فَمَنْ نَصَبَ هٰذِهِ الْجِبَالَ وَ جَعَلَ فِیْهَا مَا جَعَلَ قَالَ اللّٰهُ قَالَ فَبِالَّذِیْ خَلَقَ السَّمَاءَ وَ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ نَصَبَ هٰذِهِ الْجِبَالَ اللّٰهُ اَرْسَلَکَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَزَعَمَ رَسُوْلُکَ اَنَّ عَلَیْنَا خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِیْ یَوْمِنَا وَ لَیْلَتِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِیْ اَرْسَلَکَ اَللّٰهُ اَمَرَکَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَزَعَمَ رَسُوْلُکَ اَنَّ عَلَیْنَا زَکَاةً فِیْ اَمْوَالِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِیْ اَرْسَلَکَ

ان وفود کا ذکر جو اسلام و ایمان کی تحقیق کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے

(۱) ضمام بن ثعلبہ کی آمد

(۲۳۰) انس بن مالکؓ روایت فرماتے ہیں کہ ہمیں (قرآن میں) اس بات سے روکا گیا تھا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے ضرورت سوال کیا کریں اس لیے (ہم خود نہ پوچھتے اور) یہ پسند کیا کرتے تھے کہ کہیں کوئی جنگل کا رہنے والا سمجھدار آدمی آنکلے اور وہ آپؐ سے پوچھے اور ہم سنیں، اتفاقاً ایک گنوار شخص آیا اور بولا اے محمدؐ آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا تھا اس نے ہم سے کہا کہ آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، آپؐ نے فرمایا اس نے سچ کہا- پھر اس نے پوچھا آسمان کس نے بنایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے- اس نے کہا زمین کو؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے- اس نے کہا اچھا تو ان پہاڑوں کو کس نے قائم کیا اور ان میں قسم قسم کی چیزیں کس نے بنائیں؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے- (یہ سن کر) وہ بولا اُسی کی قسم ہے جس نے آسمان وزمین بنایا اور ان پہاڑوں کو قائم کیا سچ بتایئے کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنایا ہے آپؐ نے فرمایا ہاں پھر اس نے کہا آپؐ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ شب وروز میں ہمارے ذمہ پانچ نمازیں فرض ہیں- آپؐ نے فرمایا سچ کہا (یہ سن کر) وہ کہنے لگا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے سچ بتایئے کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے آپؐ نے فرمایا ہاں پھر اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے ٹھیک بتایئے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا ہاں- پھر اس نے کہا آپؐ

---

(۲۳۰) * مؤرخین کو ضمام بن ثعلبہ کی آمد کے سال میں اختلاف ہے- ابن اسحٰق اور ابوعبیدہ وغیرہ کی رائے ہے کہ یہ ۹ھ میں آئے ہیں- واقدی ۵ھ میں فرماتے ہیں مگر محققین نے اس کو تسلیم نہیں کیا- دوسرا اختلاف ان کے اسلام کے بارے میں ہے امام بخاریؒ وغیرہ کا میلانِ خاطر اس طرف ہے کہ جس وقت آپؐ کا قاصد پہنچا تھا یہ اسی وقت مسلمان ہو چکے تھے اور اب ان کا مقصد صرف اس کی تصدیق کرنا تھا- قرطبی کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ یہاں آکر مسلمان ہوئے ہیں- ہماری رائے ناقص میں ان کے دل میں صداقت اسلام کا سکہ تو پہلے ہی قائم ہو چکا تھا لیکن باضابطہ مسلمان آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہی ہوئے ہیں "امنت بما جئت بہ" کا ترجمہ ہم نے امام بخاریؒ کی رائے کے مطابق کیا ہے- ہماری گذارش کے مطابق یہ الفاظ اپنے ظاہر پر رہیں گے- ← ....

اَللّٰہُ اَمَرَکَ بِھٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَ زَعَمَ رَسُوْلُکَ اَنَّ عَلَیْنَا صَوْمَ شَھْرِ رَمَضَانَ فِیْ سَنَتِنَا قَالَ نَعَمْ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِیْ اَرْسَلَکَ اَللّٰہُ اَمَرَکَ بِھٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَ زَعَمَ رَسُوْلُکَ اَنَّ عَلَیْنَا حَجَّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا قَالَ صَدَقَ قَالَ ثُمَّ وَلّٰی فَقَالَ وَ الَّذِیْ بَعَثَکَ بِالْحَقِّ نَبِیًّا لَا اَزِیْدُ عَلَیْھِنَّ شَیْئًا وَ لَا اَنْقُصُ مِنْھُنَّ شَیْئًا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَئِنْ صَدَقَ لَیَدْخُلَنَّ الْجَنَّۃَ

(رواہ احمد و الشیخان و ابوداؤد)

کے قاصد نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ذمہ ایک سال میں ماہ رمضان کے روزے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اس نے سچ کہا- پھر اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیغمبر بنایا ہے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں- پھر اس نے کہا آپؐ کے قاصد کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم میں جس کے پاس سواری اور توشہ سفر مہیا ہو اس پر بیت اللہ کا حج کرنا بھی فرض ہے آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا- راوی کہتا ہے کہ یہ سوالات کر کے اس شخص نے پشت پھیری اور کہا' تو اس ذات کی قسم ہے جس نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سچا نبی بنایا ہے میں ان باتوں پر کچھ کم و بیشی نہ کروں گا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یہ سچ کہتا ہے تو یقیناً جنت میں جائے گا-

(احمد' بخاری شریف و مسلم شریف' ابوداؤد)

وعنه فی روایة اخری بنحو ھذا و زاد قَالَ الرَّجُلُ اٰمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِہٖ وَ اَنَا رَسُوْلُ مَنْ وَّرَائِیْ مِنْ قَوْمِیْ قَالَ وَ اَنَا ضِمَامُ بْنُ ثَعْلَبَۃَ اَخُوْبَنِیْ سَعْدِ بْنِ بَکْرٍ

حضرت انسؓ سے یہی مضمون ایک اور طریقہ سے بھی مروی ہے اس میں یوں ہے- اس شخص نے کہا جو دین آپ لائے ہیں' میں اس کو قبول کر چکا ہوں اور میں اپنی قوم کا قاصد ہوں جو میرے پیچھے ہے- میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور میں بنو سعد بن بکر کا بھائی ہوں-

---

☜ ....حافظ ابن رجب حنبلیؒ نے روایت مذکورہ میں ''و شرائع الاسلام کلھا'' کے الفاظ بھی پیش کئے ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز روزے کے سوا کل احکام اسلام ان کے سامنے بیان کر دیئے تھے اس پر مسند امام احمد سے ان کا یہ جواب نقل کیا ہے- وساؤدی ھذہ الفرائض و اجتنب ما نھیتنی عنه لا ازید و لا انقص- (میں ان تمام فرائض کو ضرور ادا کروں گا اور جن جن باتوں سے آپ نے روکا ہے ان سے احتراز رکھوں گا اور اس پر زیادتی' کمی کچھ نہیں کروں گا) ان الفاظ کے بعد کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ ضمام نے پورے دین پر عمل کرنے کا عہد کیا تھا- حافظ ابن حجرؒ نے ابو ہریرہؓ کی روایت میں اتنی بات اور نقل کی ہے فاماھذہ الھناة فو الله انا کنا نتنزہ عنھا فی الجاھلیة یعنی الفواحش- (یعنی رہ گئیں یہ بے حیائی کی حرکتیں تو ان سے تو ہم کفر کے زمانہ میں بھی بچا کرتے تھے) کس قدر تعجب خیز ہے کہ ضمام کی اس سلامت فطرت اور ان کے اس تفصیلی جواب کے بعد بھی صرف لاازیـــد (میں اور اعمال نہیں کروں گا) کے ایک لفظ سے یہ خیال قائم کر لیا جائے کہ انہوں نے ان چند احکام نہ کرنے کے سوا بقیہ احکام نہ کرنے کا قصد کر لیا تھا اول تو یہ ایک نو مسلم شخص تھے ان کے نزدیک کل دین اتنا ہی تھا جتنا اس وقت ان کے سامنے آ گیا تھا- جس حصہ کا اب تک انہیں علم ہی نہ تھا- اس کے کرنے نہ کرنے کا وہ کیسے قصد کر سکتے تھے- دوم ہمارے نزدیک جو الفاظ انہوں نے یہاں استعمال کیے تھے وہ امتثالِ امر کے لیے زیادہ سے زیادہ یہاں ☜ ....

(۲۳۱) عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِيٌّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِيْ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ قَالَ لَا وَ سَاَلَهُ عَنِ الصَّوْمِ قَالَ صِيَامُ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ قَالَ لَا قَالَ وَ ذَكَرَ الزَّكَاةَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا قَالَ وَ اللّٰهِ لَا اَزِيْدُ عَلَيْهِنَّ وَ لَا اَنْقُصُ مِنْهُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ اَفْلَحَ اِنْ صَدَقَ.

(رواه احمد و الشيخان و ابوداؤد و غيرهم. وفي كتاب الحيل من البخاري الا ان تطوع و فيه بعد ذكر الصلوة و الزكوة فاخبره بشرائع الاسلام قال و الذي اكرمك لا اتطوع شيئا و لا انقص مما فرض الله علي شيئا)

(۲۳۱) طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک گنوار آدمی آپؐ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا یا رسول اللہ اسلام کی تفصیل بتایئے- آپؐ نے فرمایا شب و روز میں پانچ نمازیں' اس نے عرض کیا اس کے سوا میرے ذمہ کچھ اور نمازیں بھی ہیں آپؐ نے فرمایا کچھ نہیں- راوی کہتا ہے پھر اس نے روزہ کے متعلق دریافت کیا آپؐ نے فرمایا رمضان کے روزے- اس نے کہا ان کے سوا میرے ذمہ کچھ اور روزے بھی ہیں؟ فرمایا کچھ نہیں- راوی کہتا ہے اس نے زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا اور دریافت کیا کہ میرے ذمہ زکوٰۃ کے سوا بھی کچھ اور دینا ضروری ہے؟ فرمایا کچھ نہیں- اس نے کہا خدا کی قسم ہے کہ میں ان باتوں پر کچھ کم و بیشی نہ کروں گا- آپؐ نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا ہے تو کامیاب ہوگیا (مسند احمد شیخین وغیرہم امام بخاریؒ نے کتاب الحیل میں آپ کے جواب میں اتنا اور روایت فرمایا ہے کہ تجھ پر اور کچھ فرض نہیں مگر ہاں اگر تو اپنی طرف سے خود کرنا چاہے- نماز اور زکوٰۃ کے بعد راوی یہ بھی نقل کرتا ہے کہ آپؐ نے اس کو اسلام کے اور احکام بھی سکھائے اور آخر میں یہ بھی ہے کہ خدا کی قسم جس نے آپ کو بزرگ بنایا ہے نہ تو میں اپنی طرف سے کچھ اور اضافہ کروں گا اور نہ ان باتوں میں جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرض کی ہیں کوئی کمی کروں گا-

---

؎.... تاکیدی الفاظ تھے- بے کم و کاست پورا کرنا اردو میں بھی ایک عام محاورہ ہے جو کسی کام کو پورا پورا ادا کرنے کے موقعہ پر مستعمل ہے- پس ان کے اس لفظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہوں نے ان چند احکام کے سوا اور احکام پر عمل نہ کرنے کا عہد کیا تھا- الفاظ پر بے جا جمود ہے پھر اس کے جواب کے درپے ہونا اور بے جا در دسری ہے-

(۲۳۱) * اس روایت میں ''لا ازید'' کے بجائے ''لا اتطوع'' کا لفظ شارحین کے لیے ایک اور مشکل کا موجب بن گیا ہے اس لفظ سے ان کو یہ شبہ ہوگا ہے کہ اس اعرابی نے شاید عبادات نافلہ نہ کرنے کا عہد بھی کیا تھا- ہمارے نزدیک یہ صرف لفظی تفنن ہے اور ''لا انقص'' کے تقابل کی وجہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی اصل مراد اس لفظ سے بھی وہی ''لا ازید'' کا مفہوم تھا لہٰذا محض لفظی تفنن سے نئے نئے نتائج پیدا نہ کیے جائیں اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی ایک نومسلم پر صرف اس کی تعبیر کی وجہ سے مواخذہ نہیں کیا جا سکتا-

(۲) و فادة معاویه بن حیدة

(۲۳۲) عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَؓ قَالَ اَتَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) وَ اللّٰهِ مَا اَتَيْتُكَ حَتّٰى حَلَفْتُ اَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ اُوْلَاءِ اَنْ لَا اٰتِيَكَ وَ لَا اٰتِيَ دِيْنَكَ وَ جَمَعَ بَهْزٌ بَيْنَ كَفَّيْهِ (و فی روایة حَتّٰى حَلَفْتُ عَدَدَ اَصَابِعِيْ هٰذِهِ اَنْ لَّا اٰتِيَكَ وَ لَا اٰتِيَ دِيْنَكَ) وَ اِنِّيْ قَدْ جِئْتُ اِمْرَءً لَا اَعْقِلُ شَيْئًا اِلَّا مَا عَلَّمَنِيَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَ رَسُوْلُهٗ وَ اِنِّيْ اَسْأَلُكَ بِوَجْهِ اللّٰهِ بِمَ بَعَثَكَ رَبُّنَا اِلَيْنَا قَالَ بِالْاِسْلَامِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ مَا اٰيَةُ الْاِسْلَامِ (و فی روایة ما الاسلام) قَالَ اَنْ تَقُوْلَ اَسْلَمْتُ وَ جْهِيْ وَ تَخَلَّيْتُ وَ تُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَ تُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَ كُلُّ مُسْلِمٍ عَلٰى مُسْلِمٍ مُحَرَّمٌ اَخَوَانِ نَصِيْرَ انِ لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مِنْ مُشْرِكٍ يُشْرِكُ بَعْدَ مَا اَسْلَمَ عَمَلًا اَوْ يُفَارِقُ الْمُشْرِكِيْنَ اِلَى الْمُسْلِمِيْنَ مَالِيْ

(۲) معاویہ بن حیدہ کی آمد

(۲۳۲) بہز بن حکیم اپنے دادا معاویہ بن حیدہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم میں آپؐ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا مگر جب کہ ان انگلیوں کی گنتی سے زیادہ مرتبہ یہ قسم کھا چکا تھا کہ نہ تو میں آپؐ کے پاس آ کر پھٹکوں گا اور نہ آپؐ کا دین اختیار کروں گا ''بہز'' نے اپنی دونوں مٹھیاں جمع کر کے (دس کے عدد کی طرف اشارہ کیا اور ایک روایت میں لفظ اولاء کی بجائے ''اصابعی هذه'' (ان انگلیوں کے) کا لفظ ہے اور میں آپ کی خدمت میں ایک ایسا شخص آیا ہوں جو قطعاً بے علم اور یکسر نا سمجھ ہے بس وہی جانتا ہے جو خدا اور خدا کا رسول اس کو بتا دے- میں خدا کا واسطہ دے کر آپؐ سے پوچھتا ہوں کہ ہمارے پروردگار نے آپؐ کو ہمارے پاس کیا کیا احکام دے کر بھیجا ہے؟ آپؐ نے فرمایا (سب سے پہلے) اسلام کا حکم دیا ہے- اس نے عرض کیا اسلام کی نشانی کیا ہے (ایک روایت میں ہے اسلام کیا چیز ہے) آپؐ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو یہ اقرار کرے کہ میں اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر چکا اور شرک و کفر سب چھوڑ چکا' نماز پڑھے' زکوٰۃ دے' ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے قابل احترام ہے' مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں ایک دوسرے کا مددگار رہنا چاہیے جو مشرک اسلام لانے کے بعد پھر شرک کرے اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ان کو چھوڑ کر

---

(۲۳۲) * بہز بن حکیم کی اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے چند ایسے احکام کا بھی ذکر فرمایا ہے جن کا عام روایات میں ذکر نہیں ہے- اصل بات یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام پر عمل کرنا اسلام کے مفہوم میں داخل ہے- اکثر احادیث میں آپؐ نے صرف ارکانِ اسلام پر کفایت کی ہے اور حسب موقعہ ومحل کہیں کہیں اسلام کے کچھ اور اہم احکام بھی بیان فرما دیئے ہیں- اس حدیث میں اسلام کی جو تشریح کی گئی ہے وہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ سے ملتی جلتی ہے انہوں نے بھی خدا کی پوری پوری حکم برداری کے بعد ''و ما انا من المشركين'' فرمایا تھا اور یہاں بھی ''تخلیت'' کا لفظ آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جس شدت کے ساتھ شریعت پر عمل کا عہد کرنا ضروری ہے اسی شدت کے ساتھ کفر و شرک سے دور رہنے کا عہد بھی ضروری ہے- شریعت کے فرائض و واجبات میں سستی کرنا فسق ہے اور خلافِ شریعت میں شدت اختیار نہ کرنا مداہنت ہے ایمان یہ ہے کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھے اور ساتھ ہی معبودانِ باطل کے متعلق یہ یقین بھی کرے کہ ان میں معبودیت کی ایک شمہ برابر بھی اہلیت نہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے دربار ﷲ ....

اُمسِکُ بِحُجَزِکُم عَنِ النَّارِ اَلا اِنَّ رَبِّیْ دَاعِیَّ وَ اِنَّهٗ سَائِلٌ هَلْ بَلَّغتَ عِبَادِیْ وَ اَنَا قَائِلٌ لَهٗ رَبِّ قَدْ بَلَّغْتُهُمْ اَلا فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ مِنْکُمُ الْغَائِبَ. ثُمَّ اِنَّکُم مَدْعُوُّوْنَ وَ مُفَدَّمَةٌ اَفْوَاهُکُمْ بِالْفِدَامِ وَ اِنَّ اَوَّلَ مَا یُبِیْنُ (و فی روایة یُتَرجِمُ) قَالَ وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِیَدِهٖ عَلٰی فَخِذِهٖ (و فی روایة ثم اِنَّ اَوَّلَ مَا یُبِیْنُ عَنْ اَحَدِکُمْ لَفَخِذُهٗ وَ کَفُّهٗ) قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) هٰذَا دِیْنُنَا قَالَ هٰذَا دِیْنُکُمْ وَ اَیْنَمَا تُحْسِنْ یَکْفِکَ.

(رواه احمد و الحاکم و قال صحیح الاسناد و اقره الذهبی. و اخرجه النسائی مختصرا)

پھر مسلمانوں کے گروہ میں شامل نہ ہو جائے۔ یہ کیا بات ہے کہ میں تو تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں دوزخ کی آگ سے بچا رہا ہوں (اور تم ایک نہیں مانتے) سن لو میرا پروردگار (قیامت کے دن) مجھے بلائے گا اور مجھ سے یقیناً یہ سوال کرے گا کہ آپ نے میرے بندوں کو تبلیغ کر دی؟ میں عرض کروں گا پروردگار! کر دی۔ سن لو تم میں جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میرا پیغام ان کو بھی پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں پھر تم کو بھی بلایا جائے گا اور تمہارے منہ پر کپڑا لگا دیا جائے گا۔ (تا کہ غلط بات نہ بول سکو) پھر سب سے پہلے انسان، کا جو حصہ بیان کرنا شروع کرے گا (اور ایک روایت میں ترجمانی کا لفظ ہے) راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اپنی ران کی طرف اشارہ کر کے بتایا (کہ وہ حصہ یہ ہو گا) دوسری روایت میں ہے کہ سب سے پہلے تمہاری طرف سے جسم کا جو حصہ بولے گا وہ تمہاری ران اور تمہارے ہاتھ ہوں گے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ بس ہمارا دین یہ ہے آپؐ نے فرمایا ہاں یہ تو تمہارا دین ہے پھر بھلائی جہاں بھی کرو گے کافی ہو گی۔

؎ ....میں ہمہ وقت مقہور و ذلیل ہیں چنانچہ ضمام جب آپؐ کی خدمت سے رخصت ہو کر اپنی قوم کے پاس پہنچے تو سب سے پہلے جو الفاظ ان کے منہ سے نکلے وہ یہ تھے ''بئست اللات و العزٰی'' لات وعزیٰ دونوں ذلیل وخوار ہیں دیکھو شرح مواہب ؎

از یکے گو وز ہمہ یکسوئے باش　　یک دل و یک قبلہ و یک روئے باش

پس اگر حریم معبودیت میں ایک اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا کسی غیر کے لیے کوئی ادنیٰ گنجائش باقی ہے تو یہ ایمان نہیں ہے ایمان و اسلام یہ ہے کہ باطن میں ایک اللہ کے سوا کسی غیر کی معبودیت اور قانونِ شریعت کے سوا کسی اور قانون پر راضی ہونے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ رضینا بالله ربا و بالاسلام دینا کا مفہوم یہی ہے۔ با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک قلب میں کفر کی طرف میلان باقی ہے اسلام مسلمان کے ظاہر و باطن کے ساتھ کفر کا کوئی تسمہ لگا رکھنا نہیں چاہتا۔ اسلام اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ''و ما انا من المشرکین'' کا نعرہ نہ لگا دیا جائے۔ الوہیت کے مقام میں ایک اللہ کے سوا بقیہ تمام معبودوں کو ذلیل سمجھنا دوسروں کی تذلیل نہیں بلکہ مقام الوہیت کی تعظیم ہے' قانونِ شریعت کے سوا باطل قوانین کو دستور العمل بننے کے ناقابل سمجھنا۔ دوسرے قوانین کی توہین نہیں بلکہ شریعت کا ایک حق ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام آپ کو دوسرے معبودوں کی تذلیل یا دوسرے مذاہب کی توہین کرنے کی دعوت دیتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی سچائی کی سچائی ہونے پر آپ کو پورا پورا یقین اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ باطل کے باطل ہونے کا بھی آپ کو پورا پورا یقین ہو جائے اگر آپ کے قلب میں باطل پر بھی صداقت کا شبہ پڑ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حق و باطل کو ابھی تک ٹھیک طور پر پہچانتے ہی نہیں۔ اسلام عقیدہ کے باب میں کوئی لچک نہیں رکھتا۔ ہاں جب دنیا کے ساتھ معاملات کا نمبر آتا ہے تو وہ اس میں بڑی سے بڑی رواداری کی بھی تعلیم دیتا ہے اور یہی و جادلهم بالتی هی احسن کا مفہوم ہے۔ منہ پر کپڑا لگانا حقیقتاً نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے ﴿اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُکَلِّمُنَا اَیْدِیْهِمْ. الآیه.﴾ (یٰس: ۶۵) آج ہم ان کے منہ پر مہر کر دیں گے اور ہم سے ان کے ہاتھ اور پیر تمام واقعات جو انہوں نے کیے تھے وہ خود بتائیں گے۔

(۳) و فادة ابی رزین العقیلی

(۲۳۳) عَنْ اَبِیْ رَزِیْنِ الْعُقَیْلِیِّ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ (صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ) مَاالْاِیْمَانُ قَالَ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ وَ اَنْ یَکُوْنَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَیْکَ مِمَّا سِوَاهُمَا وَ اَنْ تُحْرَقَ بِالنَّارِ اَحَبَّ اِلَیْکَ مِنْ اَنْ تُشْرِکَ بِاللّٰهِ وَ اَنْ تُحِبَّ غَیْرَ ذِیْ نَسَبٍ لَاتُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَاِذَا کُنْتَ کَذٰلِکَ فَقَدْ دَخَلَ حُبُّ الْاِیْمَانِ فِیْ قَلْبِکَ کَمَا دَخَلَ حُبُّ الْمَاءِ لِلظَّمْاٰنِ فِی الْیَوْمِ الْقَائِظِ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ کَیْفَ لِیْ بِاَنْ اَعْلَمَ اَنِّیْ مُؤْمِنٌ قَالَ مَا مِنْ اُمَّتِیْ اَوْ هٰذِهِ

(۳) ابورزین عقیلی کی آمد

(۲۳۳) ابورزین عقیلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بات کی گواہی دے کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں' اللہ اور اس کا رسول تجھ کو تمام ماسویٰ سے زیادہ محبوب ہو جائیں اور آگ میں جل کر خاک ہو جانا اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھہرانے سے زیادہ پسند ہو جائے اور جن شخصوں سے رشتہ ونسب کا کوئی تعلق بھی نہ ہو ان سے اللہ ہی کے نام پر محبت ہو جائے- جب یہ علامات پائی جائیں تو (سمجھ لینا کہ) اب تمہارے دل میں ایمان کی محبت ایسی سما گئی ہے جیسے سخت گرمی میں پیاسے کے دل میں پانی کی محبت- میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ بات کیسے سمجھوں کہ اب میں مؤمن کامل ہو گیا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے یا یہ فرمایا کہ اس

---

(۲۳۳) ٭ حدیث مذکور میں پیاسے اور پانی کی تشبیہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا باطن جب ایمان کے رنگ سے رنگین ہو جاتا ہے تو اب اس کی محبت صرف عقلی نہیں رہتی بلکہ تقاضاءِ طبیعت بن جاتی ہے-نفس کو جو راحت وسرور اپنی طبعی مرغوبات میں اور جو کراہت ونفرت طبعی مکروہات میں محسوس ہوا کرتی ہے وہی راحت وسرور ایک مؤمن کامل کو شریعت کی اتباع میں اور وہی نفرت وکراہت اس کی مخالفت میں محسوس ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ احکام شریعت کی محبت اور اس کے خلاف سے نفرت اختیاری نہیں رہتی- اسی کی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے-

﴿وَ لٰکِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَ زَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ وَ کَرَّهَ اِلَیْکُمُ الْکُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ﴾ (الحجرات: ۷)

''یعنی خدا کا یہ بڑا انعام ہے کہ اس نے ایمان کی محبت تمہارے دلوں میں ڈال دی ہے اور اس کو تمہارے دلوں کی زینت بنا دیا ہے اور کفر فسق اور نافرمانی کی نفرت بٹھا دی ہے-''

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ مؤمن کے لیے صرف کفر سے نفرت کرنا کافی نہیں بلکہ فسق اور خدا کی نافرمانی سے نفرت کرنا بھی ضروری ہے- گناہ کی چند قسمیں ہیں جن میں کفر تو سب سے بڑا گناہ ہے- دوسری قسم فسق ہے یہ کفر سے ہلکا ہے- معصیت درمیانی چیز ہے- نہ ہمیشہ فسق ہوتی ہے نہ کفر زیادہ ترقی کر جائے تو کفر تک جا سکتی ہے اور اس سے کچھ کم رہے تو فسق بھی ہو سکتی ہے- اسی لیے معصیت ☜ .....

اَلْاُمَّۃِ عَبْدٌ یَعْمَلُ حَسَنَۃَ فَیَعْلَمُ اَنَّھَا حَسَنَۃٌ وَ اَنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ جَازِیْہِ بِھَا خَیْرًا وَ لَا یَعْمَلُ سَیِّئَۃً فَیَعْلَمُ اَنَّھَا سَیِّئَۃٌ وَ اسْتَغْفَرَ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ مِنْھَا وَ یَعْلَمُ اَنَّہٗ لَا یَغْفِرُ اِلَّا ھُوَ اِلَّا وَ ھُوَ مُؤْمِنٌ. (انفرد بہ احمد و فی اسنادہ سلیمان بن موسٰی و ثقہ قوم و ضعفہ اٰخرون)

امت میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ہے (راوی کا شک ہے) کہ جب نیکی کرے تو اس کو محسوس ہو کہ یہ نیکی ہے اور اس پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بدلہ دے گا اور جب کوئی برائی کرے تو اسے محسوس ہو کہ یہ برائی ہے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور یہ یقین رکھے کہ بخشنے والا بجز اس کے کوئی نہیں تو یقیناً وہ شخص کامل مؤمن ہے۔

(اس حدیث کو احمد نے روایت کیا ہے)

(۴) وفادۃ عبدالقیس

وفد عبدالقیس کی آمد

(۲۳۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ وَفْدَ عَبْدِالْقَیْسِ لَمَّا قَدِمُوا الْمَدِیْنَۃَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مِمَّنِ الْوَفْدُ اَوْ قَالَ الْقَوْمُ قَالُوْا رَبِیْعَۃَ قَالَ مَرْحَبًا بِالْوَفْدِ اَوْقَالَ الْقَوْمِ غَیْرَ خَزَایَا وَ لَا نَدَامٰی قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

(۲۳۴) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب وفد عبدالقیس آپ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا یہ وفد کس قبیلہ کا ہے یا قوم کا لفظ فرمایا (راوی کا شک ہے) انہوں نے جواب دیا قبیلہ ربیعہ کا۔ آپؐ نے فرمایا خوش آمدید (تم لوگ خوشی سے مسلمان ہو کر آئے ہو) اس لیے نہ دنیا میں رسوائی کی نوبت آئی نہ آخرت میں شرمندہ ہو گے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم بڑی دور و دراز مسافت طے کر کے آ رہے ہیں، ہمارے اور آپ کے درمیان کفارِ مضر کا یہ مشہور جنگ جو قبیلہ پڑتا ہے اس

ﷺ .... میں کبیرہ وصغیرہ کی تفصیل ہے۔ پس ایمان کی اتنی محبت کہ وہ قلوب کی زینت بن جائے اور کفر کی اتنی نفرت کہ وہ اپنے تمام انواع و اقسام کے ساتھ قابل نفرت ہو جائے اس کی علامت ہے کہ اب ایمان انسانی فطرت و مزاج کا جزء بن گیا ہے۔ آیت بالا میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ نعمت کسبی نہیں، خدا کی دین کی بات ہے جسے چاہے دے دے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے محدثین کے مذاق پر یہ بھی تحریر کیا ہے کہ آیت میں کفر وفسق اور معصیت کی تفصیل کرنا اور ایمان میں فرائض و مستحبات وغیرہ کی تفصیل اختیار نہ کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان دراصل ان تمام کے مجموعہ ہی کا نام ہے صرف تصدیق قلبی کا نام نہیں۔ پس ایمان کی محبت کے معنی تمام شریعت کی محبت ہیں۔ محدثین اعمال کو ایمان سے جدا کرنا نہیں چاہتے اور عملی دنیا کے لیے یہی نظریہ مفید بھی ہے۔ حقیقت ایمانیہ کا تجزیہ اور تحلیل کر کے اس کے اجزاء کی حیثیات اور مراتب میں بحث کرنا فقہ کے لحاظ سے گو اہم سہی لیکن عمل کے دائرہ میں یقیناً مفید نہیں ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے کتاب الایمان ص ۱۷)

(۲۳۴) ٭ یہ وفد آپؐ کی خدمت میں دو مرتبہ حاضر ہوا ہے ایک مرتبہ فتح مکہ سے پہلے ۵ ھ میں یا اس سے بھی قبل اس مرتبہ یہ کل تیرہ یا چودہ آدمی تھے جن کے نام فتح الباری میں مذکور ہیں پھر دوسری مرتبہ ۸ ھ یا ۹ ھ میں اس وقت یہ چالیس اشخاص مل کر آئے تھے۔ یہ لوگ بحرین کے باشندہ تھے۔ اسلام میں مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ ان ہی کی مسجد میں قائم ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے اول جمعۃ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد عبدالقیس بجواثی من البحرین. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے بعد سب سے پہلا جمعہ بحرین کے مقام جواثی میں عبدالقیس کی مسجد میں قائم ہوا ہے۔ ﷺ ....

اَتَیْنَاکَ مِنْ شُقَّةٍ بَعِیْدَةٍ وَ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکَ هٰذَا الْحَیُّ مِنْ کُفَّارِ مُضَرَ وَ لَسْنَا نَسْتَطِیْعُ اَنْ تَاْتِیَکَ اِلَّا فِیْ شَهْرٍ حَرَامٍ فَاَخْبِرْنَا بِاَمْرٍ نَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ وَ نُخْبِرُبِهٖ مَنْ وَ رَائَنَا وَ سَاَلُوْا عَنِ الْاَشْرِبَةِ فَاَمَرَهُمْ بِاَرْبَعٍ وَ نَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ اَمَرَهُمْ بِالْاِیْمَانِ بِاللّٰهِ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِیْمَانُ بِاللّٰهِ قَالُوْا اَللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَاءُ الزَّکٰوةِ وَ صَوْمُ رَمَضَانَ وَ اَنْ تُعْطُوا الْخُمُسَ مِنَ الْمَغْنَمِ وَ نَهَاهُمْ عَنِ

لیے ہم آپ کی خدمت میں صرف ان مہینوں میں حاضر ہو سکتے ہیں جن میں کفار کے نزدیک جنگ کرنا حرام ہے اس لیے ہمیں تو آپ کوئی ایسی مختصر بات بتا دیجئے جس پر عمل کر کے ہم جنت میں چلے جائیں اور جو لوگ ہم سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کو بھی اس کی اطلاع کر دیں اور اسی کے ساتھ انہوں نے ان برتنوں کی بابت بھی پوچھا جن میں نبیذ بنائی جاتی تھی (کون سے استعمال میں لائے جا سکتے ہیں اور کون سے نہیں لائے جا سکتے) آپ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے روکا (۱) صرف اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا' یہ کہہ کر فرمایا جانتے بھی ہو اللہ پر ایمان لانا کس طرح ہوتا ہے انہوں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی زیادہ واقف ہیں' فرمایا اس بات کی گواہی دینا کہ قابلِ عبادت کوئی نہیں مگر ایک اللہ تعالیٰ کی ذات اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر ہیں' باقاعدہ نماز پڑھنا' زکوٰۃ'

☜ ....زرقانی نے شرح مواہب میں بیہقی سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے پاس ابھی ایک قافلہ آنے والا ہے جو اہل مشرق میں سب سے بہتر ہے حضرت عمرؓ ان کے دیکھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو انہیں ۱۳ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا انہوں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت سنائی پھر ان کے ساتھ ساتھ آپؐ کی خدمت میں آئے جب ان لوگوں نے دور سے آپؐ کو دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور فرطِ اشتیاق سے اپنا سامان اسی طرح چھوڑ کر دیوانہ وار آپؐ کی خدمت میں دوڑ پڑے حاضر ہو کر آپ کا دست مبارک چومنے لگے- شیخ عبدالقیس جوان کے سردار تھے اگرچہ نوعمر تھے سب سے پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے پہلے تو سب کے اونٹ باندھے پھر اپنا بکس کھول کر سفر کے کپڑے اتارے اور دوسرا سفید لباس پہنا پھر باطمینان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کے دست مبارک کو بوسہ دیا- آدمی بدشکل تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آدمی کی قیمت صرف اس کے ڈھانچے سے نہیں ہوتی اس کی قیمت صرف اس کے دو چھوٹے سے چھوٹے اعضا سے ہوتی ہے زبان اور دل- آپؐ نے فرمایا تم میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ و رسول پسند کرتے ہیں دانائی اور بردباری انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ خصلتیں مجھ میں پیدائشی ہیں یا میں نے اپنے کسب سے حاصل کی ہیں؟ فرمایا پیدائشی -

ان کی روایت میں عام طور پر حج کا ذکر نہیں ہے صرف بیہقی نے سنن کبریٰ کی کتاب الصیام میں "و تحجوا البیت الحرام" کا لفظ روایت کیا ہے ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کو شاذ قرار دیا ہے مسند امام احمد میں بھی ایک طریقے میں حج کا ذکر موجود ہے-

یہ بات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اسلام کامل اور ایمان کامل بلحاظ مصداق جدا جدا دو چیزیں نہیں ان میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف بلحاظ مفہوم ہے- وفد مذکور آپؐ کی خدمت میں ایمان و اسلام کا فرق دریافت کرنے کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ صرف ایسا نظام عمل معلوم کرنے کے لیے آیا تھا جس پر وہ کاربند ہو کر نجات پا جائے اس لیے آپؐ نے ان کے سامنے ان کے سوال کے مطابق ایک مختصر نظام العمل بیان فرما دیا تھا لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام (جن کی حدیث آئندہ آ رہی ہے) اسلام و ایمان اور احسان کی جدا جدا حقیقتیں دریافت کرنے کے ☜ ....

الـدُّبَـاءِ وَ الْحنتم و النقيرو وَ الْمُزَفَّتِ قَالَ وَ رُبَّـمَـا قَـالَ الْـمُقَيَّرِ قَالَ احْفَظُوْ هُنَّ وَ اَخبِرُ وْ هُنَّ مَنْ وَّ رَاءَ كُمْ.

(رواه احمد و الشيخان وغيرهم)

دینا' ماہ رمضان کے روزے رکھنا اور مالِ غنیمت میں پانچواں حصہ بھی دیا کرو اور چار برتنوں کے استعمال سے منع کیا' دباء سے' حنتم سے' نقیر سے اور مزفت سے (ابن عباسؓ مزفت کے بجائے کبھی مقیر کہا کرتے تھے) اور فرمایا کہ ان باتوں کو یاد کرلو اور جو تم سے اس طرف مسلمان رہتے ہیں ان کو بھی ان باتوں کی خبر کردو۔

(۵) وفادة ابن المنفتق

(۲۳۵) عَـنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ عَبْدِاللهِ الْيَشْكُرِىْ عَـنْ اَبِيْـهِ قَـالَ اِنْطَلَقْتُ اِلَى الْكُوْفَةِ لَاَجْلِبَ بِـغَالًا قَالَ فَاَتَيْتُ السُّوْقَ وَ لَمْ تَقُمْ قَالَ قُلْتُ لِـصَـاحِـبٍ لِىْ لَوْ دَخَلْنَا الْمَسْجِدَ وَ مَوْضِعُهُ يَـوْمَـئِذٍ فِىْ اَصْحَابِ التَّمرِ فَاِذَافِيْهِ رَجُلٌ مِنْ قَيْسٍ يُقَالُ لَهُ اِبْنُ الْمُنفَتِقِ وَ هُوَ يَقُوْلُ وَصَفَ لِـىْ رَسُوْلَ الـلّٰـهِ صَـلَّـى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَـطَـلَـبْتُـهُ بِـمِنًى فَقِيْلَ لِىْ هُوَ بِعَرَفَاتٍ فَانْتَهَيْتُ اِلَيْـهِ فَـزَاحَـمْـتُ عَـلَيْهِ فَقِيْلَ لِىْ اِلَيْكَ عَنْ

(۵) ابن المنفتق کی آمد

(۲۳۵) مغیرہ بن عبداللہ یشکری اپنے والد عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں خچر خریدنے کے لیے کوفہ گیا' بازار پہنچا تو اس وقت تک بازار ٹھیک نہ لگا تھا' میں نے اپنے رفیق سے کہا اتنی دیر مسجد ہی میں چلیں اس وقت اس کی جگہ کھجور والوں کے محلّہ میں تھی' کیا دیکھتا ہوں کہ قبیلہ قیس کا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جس کو ابن المنفتق کہتے تھے' وہ یہ کہہ رہا تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک بیان کیا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو منیٰ میں تلاش کیا تو کسی نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ عرفات میں ہیں' میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو (بھیڑ بہت تھی اس لیے) زبردستی گھسنے لگا' مجھ سے کسی نے کہا آنحضرت صلی اللہ

☜ .... لیے آئے تھے ان کے سامنے کوئی مختصر اور مجمل نقشہ عمل بتانا ان کے سوال کا جواب نہیں ہوسکتا تھا اس لیے ان سے ہر ایک کی حقیقت جدا جدا بیان فرمانا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان دو حدیثوں میں آپؐ نے دو منصبوں کے فرائض انجام دیئے ہیں یہاں ایک واعظ و مذکر کے اور حضرت جبرئیلؑ کی حدیث میں ایک مدرس و معلم کے' ایک مذکر و واعظ کا فرض علمی چھان بین نہیں وہ صرف عمل کی ترغیب دیتا ہے اور معلم کا فرض علمی مشکلات کو واضح اور صاف کرنا ہے۔ ان دو منصبوں کے لحاظ سے طریقہ تعبیر بدلنا بھی ضروری ہے اس لیے یہ شبہ نہ کرنا چاہیے کہ ایمان کی جو تشریح یہاں کی گئی ہے جبرئیل علیہ السلام کی حدیث میں وہی تشریح اسلام کی کیسے قرار دے دی گئی۔ بات یہ ہے کہ ایمان و اسلام کا پورا پورا مفہوم تو بلاشبہ حدیث جبرئیل ہی میں ادا کیا گیا ہے لیکن عملی دائرہ میں چونکہ ایمان و اسلام جدا چیزیں نہ تھیں اس لیے ضمام کی حدیث میں ان کی حقیقتوں پر جدا جدا روشنی ڈالنا غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔

(۲۳۵) ✻ امام بخاریؒ نے باب فضل صلۃ الرحم میں اس روایت کو بیان کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں فقال القوم ما له ما له فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم ارب ما له۔ یعنی جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ شخص بھیڑ میں زبردستی گھسا آرہا ہے تو کہا ارے اسے کیا ہو گیا ہے آپؐ نے فرمایا ہو کیا گیا ہے کوئی ضرورت مند شخص ہے۔ جو ترجمہ یہاں ہم نے کیا ہے وہ صحیح بخاری کی اسی روایت کی مدد سے کیا ہے۔ شارحین کو اس لفظ کے ترجمہ میں اختلاف ہے۔ بخاریؒ کی روایت میں محشی نے کانه کان علی راحلة کی شرح ہمارے نزدیک صحیح نہیں کی جو احتمالات انہوں نے لکھے ہیں وہ سب یہاں چسپاں نہیں ہوتے۔ ☜ ....

طَرِيْقِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دَعُوا الرَّجُلَ أَرِبَ مَالَهُ قَالَ فَزَاحَمْتُ عَلَيْهِ حَتّٰى خَلَصْتُ اِلَيْهِ قَالَ فَاَخَذْتُ بِخِطَامِ رَاحِلَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ قَالَ زِمَامِهَا هٰكَذَا حَدَّثَ مُحَمَّدُ بْنُ جُحَادَةَ قَالَ قُلْتُ ثِنْتَانِ اَسْاَلُكَ عَنْهُمَا مَا يُنَجِّيْنِىْ مِنَ النَّارِ وَ مَا يُدْخِلُنِىْ الْجَنَّةَ قَالَ فَنَظَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ نَكَسَ رَاْسَهٗ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَىَّ بِوَجْهِهٖ قَالَ لَئِنْ كُنْتَ اَوْجَزْتَ فِى الْمَسْاَلَةِ لَقَدْ اَعْظَمْتَ وَ اَطْوَلْتَ فَاعْقِلْ عَنِّىْ اِذًا اُعْبُدِاللّٰهَ لَا تُشْرِكْ بِهٖ شَيْئًا وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ الْمَكْتُوْبَةَ وَ اَدِّ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوْضَةَ وَ صُمْ رَمَضَانَ وَ مَا تُحِبُّ اَنْ يَفْعَلَهٗ بِكَ النَّاسُ فَافْعَلْ بِهِمْ وَ مَا تَكْرَهُ اَنْ يَّاْتِىَ اِلَيْكَ النَّاسُ فَذَرِ النَّاسَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ خَلِّ سَبِيْلَ الرَّاحِلَةِ.

وَعَنْهُ مِنْ طَرِيْقٍ اٰخَرَ بِنَحْوِهٖ وَ فِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِىْ عَلٰى عَمَلٍ يُدْخِلُنِى الْجَنَّةَ وَ يُنَجِّيْنِىْ مِنَ النَّارِ قَالَ بَخٍ بَخٍ لَئِنْ كُنْتَ قَصَّرْتَ فِى الْخُطْبَةِ لَقَدْ اَبْلَغْتَ فِى الْمَسْئَلَةِ اِتَّقِ اللّٰهَ لَا تُشْرِكُ بِاللّٰهِ وَ تُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَ تُؤَدِّى الزَّكٰوةَ

علیہ وسلم کے راستہ سے ایک طرف ہٹ جا' آپؐ نے فرمایا اس آدمی کو آنے دو ضرورت مند ہے (دیکھو) اسے کیا ضرورت ہے' وہ فرماتے ہیں میں گھس گھسا کر آپؐ کی خدمت میں جا ہی پہنچا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سانڈنی کی مہار پکڑ لی ایک راوی نے خطام کے بجائے زمام کا لفظ کہا ہے- محمد بن جحادۃ نے (مغیرہ کا شاگرد) ہم سے اسی طرح روایت کیا ہے- میں نے عرض کیا دو باتیں ہیں جنہیں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہتا ہوں' آتش دوزخ سے مجھے کون سا عمل نجات دے سکتا ہے اور جنت کے لیے کیا عمل درکار ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا پھر سر مبارک نیچے جھکا لیا اس کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا اگرچہ تو نے سوال تو بہت مختصر کیا مگر بات بڑی لمبی دریافت کی ہے اچھا تو اب اس کو مجھ سے خوب سمجھ لے- صرف خدا تعالیٰ کی عبادت کر اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کر' فرض نماز اچھی طرح پڑھا کر' فرض زکوٰۃ دیا کر' رمضان کے روزے رکھا کر اور جو بات تو چاہتا ہے کہ لوگ تیرے ساتھ کریں وہی تو ان کے ساتھ کیا کر اور جو بات تو نہیں چاہتا کہ لوگ تیرے ساتھ کریں دوسروں کو بھی اس سے معاف رکھا کر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا لے اب سانڈنی کا راستہ چھوڑ-

اس روایت کے دوسرے طریقہ میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے لیکن اس کے لفظ یہ ہیں' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو جنت میں پہنچا دے اور دوزخ کی آگ سے بچا دے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت خوب بہت خوب تم نے درخواست تو مختصر کی مگر سوال بہت گہرا کیا ہے اللہ سے ڈر اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کر' باقاعدہ نماز

☜..... صحیح مسلم میں ابو ہریرہؓ کی روایت کے آخر میں وہی لفظ مذکور ہیں جو ضمام نے کہے تھے ''و الذی نفسی بیده لا ازید علی هذا شیئا ابدا و لا انقص منه'' یعنی میں آپؐ کے ارشاد پر کوئی کمی بیشی نہیں کروں گا- ہمارے نزدیک امتثال امر کے لیے اس سے زیادہ ادب کے الفاظ اور نہیں ہو سکتے اس لیے جو صحیح الفطرت شخص بھی آپؐ کی خدمت میں آیا ہے اس نے ان ہی الفاظ کو دہرایا- الفاظ کی روح نظر انداز کر کے محض ان کی سطح سے سوال و جواب پیدا کرنا نامناسب ہے-

وَ تَحُجُّ الْبَيْتَ وَ تَصُوْمُ رَمَضَانَ خَلِّ عَنْ طَرِيْقِ الرِّكَابِ. (رواہ احمد و فی البخاری و تصل الرحم وليس فيه ذكر الحج و الاسلام)

پڑھا کر' زکوٰۃ دیا کر' حج کر' رمضان کے روزہ رکھا کر' اس کے بعد فرمایا اچھا اب میری سواری کے سامنے سے ہٹ جا۔

(اس حدیث کو بخاری اور احمد نے روایت کیا ہے)

(۶) وفد الازد

(۶) سوید ازدی کی آمد

(۲۳۶) عَنْ سُوَيْدِ الْاَزْدِيِّ قَالَ وَ فَدْتُ سَابِعَ سَبْعَةٍ مِنْ قَوْمِيْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا دَخَلْنَا عَلَيْهِ وَ كَلَّمْنَاهُ اَعْجَبَهُ مَا رَاٰى مِنْ سَمْتِنَا وَ زِيِّنَا فَقَالَ مَا اَنْتُمْ قُلْنَا مُؤْمِنُوْنَ فَتَبَسَّمَ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَ السَّلَامُ وَ قَالَ اِنَّ لِكُلِّ قَوْلٍ حَقِيْقَةً فَمَا حَقِيْقَةُ قَوْلِكُمْ وَ اِيْمَانِكُمْ قُلْنَا خَمْسَ عَشَرَةَ خَصْلَةً خَمْسٌ مِنْهَا اَمَرَتْنَا رُسُلُكَ اَنْ نُّؤْمِنَ بِهَا وَ خَمْسٌ اَمَرَتْنَا اَنْ نَعْمَلَ بِهَا وَ خَمْسٌ تَخَلَّقْنَا بِهَا فِى الْجَاهِلِيَّةِ فَنَحْنُ عَلَيْهَا اِلَّا اَنْ تَكْرَهَ مِنْهَا شَيْئًا فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الْخَمْسُ الَّتِيْ اَمَرَتْكُمْ بِهَا رُسُلِيْ قُلْنَا اَمَرَتْنَا اَنْ نُّؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ قَالَ وَ مَا الْخَمْسُ الَّتِيْ اَمَرَتْكُمْ اَنْ تَعْمَلُوْا بِهَا قُلْنَا اَمَرَتْنَا اَنْ نَقُوْلَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ نُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَ نُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَ نَصُوْمَ رَمَضَانَ وَ نَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْنَا اِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ وَ مَا

(۲۳۶) سوید ازدی روایت فرماتے ہیں کہ ہماری قوم کے سات آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جن میں ساتواں شخص میں تھا جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آپ سے گفتگو کی تو جو طرز و انداز آپؐ نے ہمارا دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند آیا آپ نے فرمایا تم کون لوگ ہو؟ ہم نے عرض کیا مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا ہر بات کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے بتاؤ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا پندرہ چیزیں ہیں جن میں پانچ تو ایسی ہیں جن کے متعلق آپ کے قاصدوں نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم ان پر یقین رکھیں اور پانچ ایسی ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ ان پر عمل کیا کریں اور پانچ وہ ہیں جن کی عادت ہمیں زمانہ جاہلیت سے پڑی ہوئی ہے اور اب تک ہم ان پر قائم ہیں ہاں اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں پسند نہ کریں تو البتہ ہم انہیں چھوڑ سکتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بتاؤ وہ پانچ باتیں کیا ہیں جن پر میرے قاصدوں نے تم کو یقین رکھنے کے لیے کہا ہے' ہم نے عرض کیا یہ ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اس کے فرشتے' اس کی کتابیں اس کے سب رسولوں کو مانیں اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کا یقین کریں فرمایا وہ پانچ باتیں کیا ہیں جن پر عمل کرنے کے لیے کہا ہے ہم نے عرض کیا یہ کہ ہم اقرار کریں کہ ایک اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں' نماز باضابطہ پڑھیں' زکوٰۃ

(۲۳۶) * چونکہ یہ لوگ عام اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور نظر آ رہے تھے اس لیے آپؐ نے ان کو اسلام کے ایک بلند مقام کی تعلیم دی یعنی توکل کی۔ جن پانچ چیزوں کا آپؐ نے ذکر فرمایا ہے ان کا زیادہ تعلق اسی صفت توکل کے ساتھ ہے توکل ترک اسباب کا نام نہیں بلکہ اسباب پر ترک اعتماد کا نام ہے۔ ترکِ اسباب آسان ہے اور اسباب کر کے ان پر ترک اعتماد مشکل ہے۔ بقدر ضرورت غذا کی تلاش' رہائش کا انتظام توکل کے منافی نہیں البتہ حاجت سے زیادہ غذاء' ضرورت سے زیادہ تعمیر یہ توکل کے منافی ہے اسی لیے یہاں آپ نے ⟵ ....

الْخَمْسُ الَّتِیْ تَخَلَّقْتُمْ بِهَا فِی الْجَاهِلِیَّةِ قُلْنَا الشُّكْرُ عِنْدَ الرَّخَاءِ وَ الصَّبْرُ عِنْدَ الْبَلَاءِ وَ الرِّضَا بِمُرِّ الْقَضَاءِ وَ الصِّدْقُ فِیْ مَوَاطِنِ اللِّقَاءِ وَ تَرْكُ الشَّمَاتَةِ بِالْاَعْدَاءِ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُكَمَاءُ عُلَمَاءُ كَادُوْا مِنْ فِقْهِهِمْ اَنْ يَكُوْنُوْا اَنْبِيَاءَ ثُمَّ قَالَ وَ اَنَا اَزِيْدُكُمْ خَمْسًا فَتِتِمُّ لَكُمْ عِشْرُوْنَ خَصْلَةً اِنْ كُنْتُمْ كَمَا تَقُوْلُوْنَ فَلَا تَجْمَعُوْا مَا لَا تَاْكُلُوْنَ وَ لَا تَبْنُوْا مَالَا تَسْكُنُوْنَ وَ لَا تَنَافَسُوْا فِیْ شَیْءٍ اَنْتُمْ عَنْهُ غَدًا زَائِلُوْنَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ وَ عَلَيْهِ تُعْرَضُوْنَ وَ ارْغَبُوْا فِيْمَا تُقْدِمُوْنَ وَ فِيْهِ تَخْلُدُوْنَ فَانْصَرَفُوْا وَ قَدْ حَفِظُوْا مِنْ وَصِيَّةِ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَعَمِلُوْا بِهَا. (رواه ابو نعيم فی كتاب معرفة الصحابة كما فی شرح المواهب)

دیں، رمضان کے روزے رکھیں اور اگر زادِ راہ موجود ہو تو بیت اللہ کا حج بھی کریں فرمایا اچھا اب وہ پانچ باتیں بتاؤ جن کی کفر کے زمانہ سے تمہیں عادت ہے ہم نے عرض کیا، فراخی میں شکر کرنا، مصیبت میں صبر کرنا، مقدرات جب سامنے آجائیں تو ان پر خوش رہنا، جنگ میں ثابت قدمی اور دشمنوں کی مصیبت پر ہنسی نہ اڑانا آپ نے فرمایا تم تو سب کے سب بڑے حکیم اور عالم نکلے قریب تھا کہ اپنے اس علم وفہم کی بدولت نبی بن جاتے (اگر نبوت جاری ہوتی) اچھا تو اب پانچ باتیں میں تمہیں بتاتا ہوں تاکہ کل مجموعہ بیس باتیں ہو جائیں۔ اگر بات اسی طرح سے ہے جیسا تم کہتے ہو تو حاجت سے زیادہ کھانا جمع نہ کرو اور ضرورت سے زیادہ مکانات نہ بناؤ اور جس چیز کو چھوڑ کر کل تمہیں چلا جانا ہے اس میں ایک دوسرے کی حرص نہ کرو اور ایک اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس کی طرف پھر لوٹ کر تمہیں جانا ہے اور جس کے سامنے حساب دینے کے لیے پیش ہونا ہے اور اس گھر کی فکر رکھنا جس میں تمہیں آئندہ جانا اور ہمیشہ رہنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ وصیت سن کر وہ اپنے وطن کو واپس ہو گئے اور ان پر عمل کیا۔

وفادة رجال من العرب لم يُسموا

اُن وفود کی آمد جن کا نام روایات میں مذکور نہیں

(۲۳۷) عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ اَنْ يُسْلِمَ

(۲۳۷) عمرو بن عبسہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ﷺ.... بقدر حاجت غذاء یا مکان کی ممانعت نہیں کی۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ دین اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اس لیے اس میں ہر ذوق اور ہر مزاج کے مناسب تعلیمات رکھی گئی ہیں اگر کوئی ورع وتقویٰ کی باریکیوں سے گذرتے ہوئے گھبراتا ہے تو اس کے لیے رخصتوں کے صاف اور کھلے ہوئے راستے موجود ہیں اور اگر کوئی بلند فطرت رخصتوں کی بجائے ان دشوار گذار وادیوں میں گذرنے کی تلاش رکھتا ہے جن سے گذرنے کی تمنا ہر عاشق مزاج کو ہوا کرتی ہے تو ایسی قربان گاہوں کی بھی یہاں کمی نہیں ہے، ان دونوں کے درمیان اعتدال کا راستہ ہے جن میں نہ وہ سہولتیں ہیں نہ یہ دشواریاں، یہاں اپنی حاجت سے زیادہ جمع کرنے اور ضرورت سے زیادہ مکان تعمیر کرنے کی اجازت بھی مل جاتی ہے مگر پھر ان کے لیے کچھ حقوق بھی رکھے گئے ہیں جن کے ادا نہ کرنے میں مواخذہ کا کھٹکا لگا رہتا ہے اب یہ آپ کے پسند کی بات ہے چاہے تو وہ زندگی گذاریئے جو بے کھٹکے ہو اور چاہے وہ بسر کیجئے جس میں خطرات ہیں۔

(۲۳۷) ✱ عمل کون سا بہتر ہے؟ اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب نہیں ہو سکتا۔ فی نفسہ اس عمل کے وزن، مخاطب کے حالات اور ﷺ....

قَلْبُکَ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ اَنْ یَسْلَمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِکَ وَ یَدِکَ قَالَ فَاَیُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ الْاِیْمَانُ (وفی روایة قال خُلُقٌ حَسَنٌ) قَالَ وَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ (وفی روایة قَالَ وَ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ الصَّبْرُ وَ السَّمَاحَةُ) قَالَ فَاَیُّ الْاِیْمَانِ اَفْضَلُ قَالَ الْهِجْرَةُ قَالَ فَمَا الْهِجْرَةُ قَالَ تَهْجُرُ السُّوْءَ قَالَ فَاَیُّ الْهِجْرَةِ اَفْضَلُ قَالَ الْجِهَادُ قَالَ اَنْ تُقَاتِلَ الْکُفَّارَ اِذَا لَقِیْتَهُمْ قَالَ فَاَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ عُقِرَ جَوَادُهٗ وَ اُهْرِیْقَ دَمُهٗ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ عَمَلَانِ هُمَا اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اِلَّا مَنْ عَمِلَ بِمِثْلِهِمَا حَجَّةٌ مَبْرُوْرَةٌ اَوْ عُمْرَةٌ.

(رواہ احمد و الطبرانی و رجالہ موثوقون)

یہ کہ تیرا قلب اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائے اور تیری زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانی سے تمام مسلمان محفوظ رہیں پھر اس نے پوچھا اچھا اسلام کا سب سے بہتر جزء کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایمان! (ایک روایت میں فرمایا اچھے اخلاق) اس نے پوچھا ایمان کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کہ تو اللہ تعالیٰ' اس کے فرشتے' اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو دل سے مانے اور مرنے کے بعد پھر جینے پر یقین رکھے (ایک روایت میں ہے اس نے پوچھا ایمان کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا صبر اور سخاوت) اس نے عرض کیا اچھا ایمان میں بہتر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہجرت' اس نے عرض کیا ہجرت سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تو برائیاں چھوڑ دے' اس نے عرض کیا اچھا تو ہجرت سب سے بہتر کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا جہاد کرنا اور کافروں سے لڑائی کے وقت خوب لڑنا' اس نے عرض کیا اچھا تو جہاد کون سا بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا اس شخص کا جہاد جس کا گھوڑا زخمی ہو جائے اور اس کا خون بھی بہا دیا جائے آپؐ نے فرمایا اس کے بعد دو کام اور ہیں جو سب سے عمدہ ہیں مگر ہاں وہ شخص جو یہی کام کرے ایک حج جس میں جنایت نہ ہو دوم عمرہ کرنا۔

(۲۳۸) عَنْ رِبْعِیِّ بْنِ حِرَاشٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِیْ عَامِرٍؓ اَنَّهٗ اسْتَاْذَنَ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَاَلِجُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِخَادِمِهٖ اُخْرُجِیْ اِلَیْهِ فَاِنَّهٗ لَا یُحْسِنُ الْاِسْتِیْذَانَ فَقُوْلِیْ لَهٗ فَلْیَقُلِ السَّلَامُ

(۲۳۸) ربعی بن حراش بنی عامر قبیلہ کے کسی آدمی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے آپ کی خدمت میں حاضری کے لیے اجازت طلب کی (مگر جو لفظ اس کے لیے اسلام نے مقرر فرمائے تھے وہ استعمال نہ کیے اور کہا) کیا میں اندر گھس آؤں' آپؐ نے اپنی ایک باندی سے کہا اس شخص کو اجازت حاصل کرنے کا سلیقہ نہیں آتا' جا اور اسے بتا کہ پہلے اسے السلام علیکم کہنا

ﷺ.... زمانوں کے مختلف تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہمیشہ مختلف ہوتا جائے گا اسی لیے حدیثوں میں بھی اس سوال کے جوابات مختلف ہی دیئے گئے ہیں اس حدیث میں افضل ہجرت کی تفسیر جہاد کی گئی ہے۔ چونکہ جہاد میں بھی وطن' اہل وعیال کو ترک کرنا پڑتا ہے اس لیے اصل مفہوم کے لحاظ سے اس تفسیر میں کوئی حرج نہیں اگرچہ اب اصطلاحی لحاظ سے ہجرت کا لفظ مسلمانوں کی ایک مشہور قربانی کے لیے مخصوص ہو گیا ہے' اس تعبیر کا حسن ہم ان شاءاللہ تعالیٰ کسی مناسب مقام پر آئندہ ذکر کریں گے۔

(۲۳۸) * اسلام ایک مکمل آئین ہے اس نے معمولی غیر معمولی تمام ضروریات کے لیے قانون مقرر کیے ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ ﷺ....

عَلَيْكُمْ ا اَدْخُلُ فَقَالَ فَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ ذَالِكَ فَقُلْتُ السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ااَدْخُلُ قَالَ فَاُذِنَ لِيْ اَوْ قَالَ قَدْ حَلَّتْ فَقُلْتُ بِمَ اَتَيْنَا بِهٖ قَالَ لَمْ اٰتِكُمْ اِلَّا بِخَيْرٍ اَتَيْتُكُمْ بِاَنْ تَعْبُدُو اللّٰهَ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ قَالَ شعبة و احسبه قَالَ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَنْ تَدَعُو اللَّاتَ وَ الْعُزّٰى وَ اَنْ تُصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَ النَّهَارِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا مِنَ السَّنَةِ شَهْرًا وَ اَنْ تَحُجُّوا الْبَيْتَ وَ اَنْ تَأْخُذُوْا مِنْ مَالِ اَغْنِيَاءِ كُمْ فَتَرُدُّوْهَا عَلٰى فُقَرَاءِ كُمْ قَالَ فَقَالَ هَلْ بَقِيَ مِنَ الْعِلْمِ شَيْءٌ لَا تَعْلَمُهٗ قَالَ قَدْ عَلَّمَنِي اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ خَيْرًا وَ اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَا يَعْلَمُهٗ اِلَّا اللّٰهُ (اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ. (قال الهيثمي اخرج ابو داؤد طرفاً منه و قد رواه احمد و رجاله كلهم ثقات ائمة)

چاہیے اس کے بعد یوں کہنا چاہیے کیا میں حاضر ہوسکتا ہوں' وہ شخص کہتا ہے کہ آپؐ کی یہ بات میں نے بھی سن لی تو اسی کے مطابق میں نے عرض کیا السلام علیکم' کیا میں حاضر ہوسکتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ ان کو اجازت مل گئی یا یہ کہ میں اندر چلا آیا (راوی کو شک ہے) اور پوچھا آپ ہمارے پاس کیا دین لے کر آئے ہیں آپؐ نے فرمایا جو لایا ہوں سب بہتر ہی بہتر ہے' یہ لے کر آیا ہوں کہ ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو' جس کا کوئی شریک نہیں۔ شعبہ (راویٔ حدیث) کہتا ہے کہ مجھے خیال ہے کہ وحدہ لا شریک له کا لفظ آپؐ نے فرمایا تھا اور یہ کہ لات وعزیٰ بتوں کو یکلخت ترک کردو اور شب و روز میں پانچ نمازیں ادا کرو' سال بھر میں ایک مہینہ کے روزے رکھو' بیت اللہ کا حج کرو اور اپنے مال داروں سے روپیہ لے کر اپنے غریبوں پر تقسیم کرو اس نے پوچھا اچھا کوئی علم ایسا باقی ہے جو آپؐ نہ جانتے ہوں؟ آپ نے فرمایا ابھی تو بہت سی عمدہ عمدہ باتیں باقی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے بتائی ہیں ہاں علم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا (اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی) ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ...الخ﴾ (لقمان:۳۴) قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے وہی بارش بھیجتا ہے وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے رحم میں کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا کہ کل اسے کیا کرنا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ وہ کس ملک اور کس بستی میں مرے گا اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا اخبردار ہے۔

(۲۳۹) عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

(۲۳۹) جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے جب مدینہ طیبہ سے باہر نکل لیے'

ﷺ.... دور میں اجازت کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اجازت نامہ (Visiting Card) بھیجا جائے اسلام نے اجازت کو ضروری اور کارڈ کو غیر ضروری سمجھا ہے اور اس کے لیے مختصر دعا کے ساتھ مناسب کلمات مقرر کر دیئے ہیں آپؐ کے زمانہ میں ان آداب کی عملی طور پر بھی کافی نگرانی رکھی جاتی تھی جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے' اب اگر اس زمانہ میں کوئی شخص اجازت کے بغیر داخل ہو جاتا ہے تو یہ قصور اس کا ہے نہ کہ ادبِ اسلامی کا۔

(۲۳۹) * عالم فانی سے گذرنے کے بعد ہی عالم آخرت کی نعمتوں سے کچھ نہ کچھ تمتع حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے' یہی حال عذاب ﷺ....

32 وَسَلَّمَ فَلَمَّا بَرَزْنَا مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِذَا رَاكِبٌ يُوْضِعُ
نَحْوَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
كَاَنَّ هٰذَا الرَّاكِبَ اِيَّاكُمْ يُرِيْدُ قَالَ فَانْتَهَى
الرَّجُلُ اِلَيْنَا فَسَلَّمَ فَرَدَدْنَا عَلَيْهِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَيْنَ اَقْبَلْتَ قَالَ مِنْ
اَهْلِيْ وَ وَلَدِيْ وَ عَشِيْرَتِيْ قَالَ فَاَيْنَ تُرِيْدُ
قَالَ اُرِيْدُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قَالَ فَقَدْ اَصَبْتَهُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِيْ مَا
الْاِيْمَانُ قَالَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ
مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ تُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَ تُؤْتِي
الزَّكٰوةَ وَ تَصُوْمُ رَمَضَانَ وَ تَحُجُّ الْبَيْتَ قَالَ قَدْ
اَقْرَرْتُ قَالَ ثُمَّ اِنَّ بَعِيْرَهُ دَخَلَتْ يَدُهُ فِيْ شَبَكَةِ
جُرْذَانٍ فَهَوٰى بَعِيْرُهُ وَ هَوَى الرَّجُلُ فَوَقَعَ عَلٰى
هَامَتِهٖ فَمَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ عَلَيَّ بِالرَّجُلِ فَقَالَ فَوَثَبَ اِلَيْهِ عَمَّارُ بْنُ
يَاسِرٍ وَ حُذَيْفَةُ فَاَقْعَدَاهُ فَقَالَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُبِضَ
الرَّجُلُ قَالَ فَاَعْرَضَ عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ لَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا رَاَيْتُمَا اِعْرَاضِيْ عَنِ الرَّجُلِ فَاِنِّيْ
رَاَيْتُ مَلَكَيْنِ يَدُسَّانِ فِيْ فِيْهِ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ
فَعَلِمْتُ اَنَّهُ مَاتَ جَائِعًا ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰذَا وَ اللّٰهِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالَ اللّٰهُ
فِيْهِمْ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ

کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سوار ہماری طرف اپنی سواری بھگاتا ہوا آ رہا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہارے ہی پاس آ رہا ہے اتنے میں وہ آ ہی پہنچا اور سلام کیا ہم نے اس کے سلام کا جواب دیا- آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کدھر سے آ رہے ہو- اس نے عرض کیا بیوی' بچوں اور اپنے خاندان کے پاس سے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کدھر کا قصد ہے؟ اس نے عرض کیا اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو ٹھیک مقصد پر پہنچ گئے' اس نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے سکھایئے ایمان کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس بات کی گواہی دو کہ معبود کوئی نہیں مگر ایک اللہ' محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں' نماز اچھی طرح ادا کرو' زکوٰۃ دو' رمضان کے روزے رکھو' بیت اللہ کا حج کرو- اس نے عرض کیا میں نے ان سب باتوں کا اقرار کیا راوی کہتا ہے اس کے بعد اس کے اونٹ کا پیر کسی جنگلی چوہے کے سوراخ میں جا پڑا وہ اونٹ گرا اور کھوپڑی کے بل یہ خود بھی جا گرا اور مر گیا- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس شخص کو ذرا بلا کر لانا فوراً عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو بلانے کے لیے لپکے اس کو بٹھایا (تو وہ مر چکا تھا) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کا تو انتقال ہو گیا- راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کی بجائے کسی اور سمت دیکھنے لگے پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے دیکھا کہ میں اس شخص کی بجائے دوسری طرف متوجہ ہو گیا تھا میں نے دیکھا تھا کہ دو فرشتے اس کے منہ میں جنت کے میوے ڈال رہے ہیں' یہ دیکھ کر میں سمجھا کہ ضرور یہ شخص بھوکا مرا ہوگا- اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی قسم یہ ان لوگوں میں ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (جو لوگ ایمان لا چکے پھر انہوں نے اپنے ایمان میں معصیت کا ذرا بھی

﴾ ....کا بھی ہے پورے طور پر ثواب و عذاب قیامت کے بعد ہوگا- شہداء کے لیے رزق ملنا شریعت میں ثابت ہے- یہ شخص بھی کتنا خوش قسمت تھا کہ تعلیماتِ اسلامی حاصل کرنے کے بعد اس کو خدا کی نافرمانی کی مہلت ہی نہ مل سکی- ادھر اسلام لایا اُدھر شہادت کی ﴿....

اُولٰئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَ ھُمْ مُّھْتَدُوْنَ﴾ (الانعام:۸۲) ثُمَّ قَالَ دُوْنَکُمْ اَخَاکُمْ قَالَ فَاحْتَمَلْنَاہُ اِلَی الْمَاءِ فَغَسَّلْنَاہُ وَ حَنَّطْنَاہُ وَ کَفَّنَّاہُ وَ حَمَلْنَاہُ اِلَی الْقَبْرِ قَالَ فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی جَلَسَ عَلٰی شَفِیْرِ الْقَبْرِ قَالَ فَقَالَ اَلْحِدُوْا وَ لَا تَشُقُّوْا فَاِنَّ اللَّحْدَ لَنَا وَ الشَّقَّ لِغَیْرِنَا.

داغ لگنے نہیں دیا یہی لوگ ہیں جن کے لیے امن ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں پھر فرمایا اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرو' ہم اسے اٹھا کر پانی کے پاس لائے' غسل دیا' خوشبو لگائی' کفن پہنایا' اور قبر میں دفن کے لیے اٹھا کر لے چلے' راوی کہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور قبر کے ایک کنارہ پر بیٹھ گئے اور فرمایا بغلی بنانا صندوق نہ بنانا کیونکہ ہمارے لیے بغلی ہی مناسب ہے صندوق دوسروں کے لیے ہے- 2

(وَ عَنْہُ اَیْضًا مِنْ طَرِیْقٍ ثَانٍ) قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَیْنَا نَحْنُ نَسِیْرُ اِذْرُفِعَ لَنَا شَخْصٌ فَذَکَرَ نَحْوَہٗ اِلَّا اَنَّہٗ قَالَ وَقَعَتْ یَدُبَکْرِہٖ فِیْ بَعْضِ تِلْکَ الَّتِیْ تَحْفُرُ الْجُرْذَانُ وَ قَالَ فِیْہِ ھٰذَا مِمَّنْ عَمِلَ قَلِیْلًا وَ اُجِرَ کَثِیْرًا.

(اسی روایت کے دوسرے طریقے میں ہے) ہم کسی سفر کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے ابھی جا رہے تھے کہ دفعۃً ایک شخص نظر آیا اس کے بعد وہی مضمون مذکور ہے' اس طریقے میں یہ لفظ ہیں کہ اس کے اونٹ کا ہاتھ ان سوراخوں میں سے کسی سوارخ میں جا پڑا جو جنگلی چوہے کھود لیا کرتے ہیں اور یہ مضمون اور ہے کہ یہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے عمل تو تھوڑا کیا لیکن ثواب بہت پایا-

(و عنہ ایضا من طریق ثالث) اَنَّ رَجُلًا جَاءَ فَدَخَلَ فِی الْاِسْلَامِ فَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُعَلِّمُہُ الْاِسْلَامَ وَھُوَ فِیْ مَسِیْرِہٖ فَدَخَلَ خُفُّ بَعِیْرِہٖ فِیْ جُحْرِیَرْ بُوْعٍ فَوَقَصَہٗ بَعِیْرُہٗ فَمَاتَ فَاَتٰی عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عَمِلَ قَلِیْلًا وَ اُجِرَ کَثِیْرًا قَالَھَا حَمَّادٌ ثَلَاثًا اَللَّحْدُلَنَا وَ الشَّقُّ لِغَیْرِنَا.

(تیسرے طریقے میں ہے) کہ ایک شخص آیا اور مسلمان ہو گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر ہی میں اس کو اسلام کی تعلیم دیتے جاتے تھے اس کے اونٹ کا ایک پیر کسی جنگلی چوہے کے سوراخ میں جا پڑا وہ اونٹ گرا اور یہ بھی گرا گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اس شخص نے عمل تو تھوڑا ہی کیا مگر ثواب بہت پایا- حماد نے تین بار فرمایا- بغلی قبر ہمارے لیے ہے اور صندوق دوسروں کے لیے ہے-

(رواہ الطبرانی و ابن ابی حاتم فی تفسیرہ و الحکیم الترمذی مثلہ و الخطیب و حدیث الباب فی اسنادہ زاذان ابی عمر الکندی قال ابن معین ثقۃ و قال الحافظ فی التقریب صدوق یرسل و فیہ شیعیۃ و قال یحی بن معین و النسائی و الدار قطنی انہ ضعیف و قال الحافظ ضعفوہ لکثرۃ تدلیسہ)

لـہ ..... موت مر گیا- فرشتوں نے فوراً اکرام مومن کے فرائض انجام دیئے اور اس کے لیے اس عالم کے مناسب نعمتوں کا دروازہ کشادہ ہو گیا- رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ماجرا دیکھ کر بے ساختہ فرمایا کہ اس خوش نصیب نے عمل تو بہت تھوڑا کیا تھا مگر ثواب کتنا عظیم الشان پایا-

حقيقة الايمان و الاسلام و الاحسان

(۲۴۰) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا يُرٰى عَلَيْهِ اَثَرُ السَّفَرِ وَ لَا يَعْرِفُهُ مِنَّا اَحَدٌ حَتّٰى جَلَسَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ وَ وَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ وَ قَالَ يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِىْ عَنِ الْاِسْلَامِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ تُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَ تُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَ تَصُوْمَ رَمَضَانَ وَ تَحُجَّ الْبَيْتَ

ایمان، اسلام اور احسان کی حقیقت

(۲۴۰) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے دفعۃً ایک شخص آیا اس کے کپڑے نہایت سفید، بال نہایت سیاہ[۱] تھے، نہ اس پر کوئی سفر کی علامت تھی، (کہ ہم اسے مسافر کہتے) نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا (کہ شہری سمجھتے) یہاں تک کہ وہ آپ کے اتنا قریب آ بیٹھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دیئے اور اپنے دونوں ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زانوئے مبارک پر رکھ دیئے[۲] اور بولا - اے محمدؐ! مجھے[۳] بتایئے اسلام کیا چیز ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کا اقرار کرے کہ سوائے ایک خدا کے اور کوئی معبود نہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ اس کے پیغمبر ہیں - نماز پورے طور پر ادا کرے، زکوٰۃ دے - رمضان شریف کے روزے رکھے اور اگر طاقت ہو تو خدا کے گھر کا حج بھی کرے وہ بولا کہ تو نے ٹھیک کہا - راوی کہتا ہے ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ یہ (پہلے تو) آپ سے دریافت کرتا ہے پھر (خود ہی) آپ کی تصدیق بھی کر دیتا ہے (گویا واقف کار

---

(۲۴۰) * [۱] ابن حبان نے شعر کی بجائے لحیة کا لفظ روایت کیا ہے یعنی اس کی ڈاڑھی کے بال سیاہ تھے - (عمدة القاری ج ۱ ص ۳۲۹) کپڑوں کی صفائی اور بالوں کی سیاہی میں اس طرف اشارہ تھا کہ طالب علم کے لیے اپنا ظاہری لباس صاف رکھنا اور نو عمری میں طلب علم کے لیے نکلنا مناسب ہے -

[۲] نسائی شریف میں اس کی تصریح ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانوئے مبارک ہی مراد ہیں -

[۳] بخاری شریف کتاب التفسیر میں "یا محمدؐ" کی بجائے "یا رسول اللہؐ" کا لفظ آتا ہے - شیخ بدرالدین نے ایک روایت میں السلام علیک کا لفظ بھی نقل کیا ہے - چونکہ اس آمد میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کا مقصد از اوّل تا آخر اخفاء حال تھا اس لیے ایسے متناقض حالات میں ان کی تشریف آوری ہوئی کہ یہ راز کھلنے ہی نہ پایا کہ یہ شخص کوئی گنوار آدمی تھا، یا متمدن باہر سے آیا تھا، یا اندرون شہر سے، معلم بن کر آیا تھا یا متعلم، حتیٰ کے حافظ عینیؒ نے ایک روایت میں خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ لفظ نقل کیے ہیں کہ بخدا بجز اس مرتبہ کے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے ہوں اور میں نے انہیں نہ پہچانا ہو، اس لیے اگر ان کی زبان سے یا رسول اللہؐ کی بجائے یا محمدؐ کا لفظ ہی نکلا ہو تو بھی کوئی اعتراض کا موقعہ نہیں ہے اس وقت ان کے مناسب حال یہی تھا کہ اپنے نفس کو ایسے ہی متردد حالات کے ماتحت رہنے دیں کہ مخاطب ان کے متعلق کوئی رائے قائم ہی نہ کر سکے - بہر حال اس روایت سے یہ اور فائدہ معلوم ہو گیا کہ کسی محفل میں آنے کا ادب یہ ہے کہ پہلے سلام کرنا چاہیے -

اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَعَجِبْنَا لَهٗ يَسْأَلُهٗ وَ يُصَدِّقُهٗ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنْ اَمَارَاتِهَا قَالَ اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا وَ اَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّآءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ

ہے) پھر بولا اچھا اب ایمان کے متعلق بتایئے؟ آپ نے فرمایا خدا' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور قیامت کو دل سے مانو اور اس بات پر یقین کرو کہ برا بھلا جو کچھ ہے وہ سب نوشتہ تقدیر کے موافق ہے اس نے کہا تو نے صحیح کہا اب یہ بتایئے احسان کیا چیز ہے؟ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا اللہ کی اس توجہ سے عبادت کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو' کیونکہ تم اگر چہ اس کو حقیقتاً نہیں دیکھتے مگر وہ تو تمہیں حقیقۃً دیکھتا ہے (پھر اتنی ہی خشوع سے عبادت کرنا چاہیے جتنا کہ اس علم صحیح کا اقتضاء ہے) اس کے بعد اس نے قیامت کے متعلق سوال کیا (کب آئے گی؟) آپ نے فرمایا جس سے دریافت کرتے ہو' اس کا تو وہ خود بھی سائل سے زیادہ عالم نہیں ہے[۲] اس نے پوچھا اس کی کچھ علامات ہی بتلا؟ آپ نے فرمایا کہ (۱) باندی[۳] اپنی آقا جنے اور پیادہ پا' ننگے محتاج' بکریوں کے چرانے والے عمارتوں میں اکڑتے نظر آنے لگیں- راوی کہتا ہے اس کے بعد وہ شخص چلا گیا- میں نے کچھ عرصہ[۴] توقف کیا اس کے بعد آپ ؐ نے (خود) ارشاد فرمایا اے

---

۱ یہ ترجمہ شیخ محی الدین نوویؒ کے مختار پر کیا گیا ہے- ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی فطرت حضور اور غیبت کا بڑا فرق کرتی ہے- ایک غلام اپنے آقا کی خدمت جب اس کے سامنے انجام دیتا ہے تو خشوع وخضوع اور حسن ادب کے جتنے مراتب ہو سکتے ہیں سب ہی صرف کر ڈالتا ہے لیکن جب اس کے سامنے سے ذرا علیحدہ ہو جاتا ہے تو اس کی یہ تمام مستعدی طبعی طور پر سرتاسر قصور اور کوتاہی بن جاتی ہے- غیبت اور حضور کا یہ فرق درحقیقت ایک قسم کا نفاق ہے شریعت چاہتی ہے کہ اس عیب سے اسے پاک کر کے اخلاصِ حقیقی کے بلند مقام تک پہنچا دے اس لیے ارشاد ہوتا ہے کہ بندہ پر یہ حق ہے کہ وہ ہر حال میں ایسی ہی عبادت کا عادی ہو جائے جیسا کہ حالت حضور میں ہوتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ جد و جہد کی جتنی طاقتیں ہیں ان کا مصروفِ عمل ہو جانا اس تصور پر موقوف نہیں ہے کہ ہم اسے دیکھتے ہیں بلکہ حالتِ حضوری میں بھی تحسین عمل اور حسن ادب کا باعث یہی تصور ہوتا ہے کہ وہ ہمیں دیکھتا ہے اس لیے اگر ہم اس تصور سے عبادت نہیں کر سکتے کہ گویا ہم اسے دیکھ رہے ہیں تو یہ علم تو بہر کیف ہمیں حاصل ہے کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے- خشوع وخضوع کا سبب اصلی جب یہ ٹھیرا اور یہ علم ہر وقت حاصل ہے پھر حضور وغیبت کا فرق کیوں ہو- الم یعلم بان اللہ یری.

۲ انسان کو اگر اپنی ہی موت کا ٹھیک وقت معلوم ہو جائے تو اس کا کارخانہ حیات درہم و برہم ہو جائے- اگر کہیں تمام دنیا کے فناء کا صحیح وقت اس کو بتا دیا جائے تو نظام عالم کیونکر قائم رہے اس لیے مصلحت یہ ٹھہری کہ یہ وقت بصیغہ راز ہی رکھا جائے-

۳ ہمارے نزدیک یہاں علامہ طیبی کی شرح سب سے زیادہ دلچسپ ولطیف ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں جملے انقلاب حالات سے کنایہ ہیں یعنی جب اتنا انقلاب رونما ہو جائے کہ اپنی اولاد اپنی آقا اور حاکم بن جائے شرفاء کی جگہ ذلیل لے لیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب تمام عالم پر ایک عظیم انقلاب کا وقت نزدیک آ گیا ہے-

۴ نسائی' ابوداؤد' ترمذی' میں اس عرصہ کی مدت تین شب بیان کی گئی ہے-

قَالَ لِیْ یَا عُمَرُ اَتَدْرِیْ مَنِ السَّآئِلُ قُلْتُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهٗ جِبْرِیْلُ اَتَاكُمْ یُعَلِّمُكُمْ دِیْنَكُمْ. رَوَاهُ الْخَمْسَةُ وَ زِیدَ فِی رِوَایَةٍ فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ) الایة ثُمَّ اَدْبَرَ فَقَالَ رُدُّوْهُ فَلَمْ یَرَوْا شَیْئًا فَقَالَ هٰذَا جِبْرِیْلُ جَآءَ یُعَلِّمُ النَّاسَ دِیْنَهُمْ.

عمرؓ جانتے ہو یہ سائل کون تھا؟ میں نے عرض کیا خدا اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں- آپ نے فرمایا یہ جبرئیلؑ تھے تمہارا دین (اس پیرایہ سے) تمہیں سکھانے آئے تھے- اس حدیث کو پانچ کتابوں میں روایت کیا ہے اور ایک روایت میں اتنی بات اور ہے (کہ قیامت کا علم ان[1] پانچ میں داخل ہے جنہیں سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا- پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی- اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ الخ (لقمان:۳۴) یعنی قیامت کا علم صرف خدا کو ہے- آخر آیت تک- جب وہ شخص پشت پھیر کر چلا گیا تو آپ نے حکم دیا جاؤ اسے واپس بلاؤ' وہ گئے تو انہیں کوئی نظر نہ آیا- اس پر آپؐ نے فرمایا یہ جبرئیل تھے لوگوں کو دین سکھانے تشریف لائے تھے-

(۲۴۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَجْلِسًا لَهٗ فَجَاءَ جِبْرَئِیْلُ عَلَیْهِ السَّلَامُ فَجَلَسَ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاضِعًا كَفَّیْهِ عَلٰی رُكْبَتَیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَدِّثْنِیْ بِالْاِسْلَامِ قَالَ

(۲۴۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ بے وہم و گمان جبرئیل علیہ السلام آگئے اور اپنے دونوں ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زانو مبارک پر رکھ کر سامنے بیٹھ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھ سے اسلام کی حقیقت بیان کیجئے آپؐ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اللہ تعالی کا ہمہ تن تابعدار ہو جائے اور اپنے

---

[1] حافظ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ یہاں سائل نے ان پانچ ہی چیزوں کے متعلق دریافت کیا تھا اس لیے آیت میں ان پانچ ہی کا جواب دیا گیا ہے- یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے سواء اور اشیاء کا علم مخلوق کو حاصل ہو جاتا ہے- ہمارے نزدیک انسانی حیوٰۃ کے یہ پانچ گوشے وہ ہیں جس کے متعلق اس کا ضمیر ہمیشہ اس سے سوال کرسکتا ہے ممکن ہے کہ ان پانچ کی تخصیص کا یہ بھی ایک سبب ہو- حافظ ابن حجرؒ نے چودھویں جلد کے آخر میں اس پر اچھی بحث نقل کی ہے-

یہ ''حدیث جبرئیل'' کے عنوان سے مشہور ہے- اس میں ایک سوال اسلام و ایمان کے متعلق بھی ہے- جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا تعلق زیادہ تر ظاہر سے ہے اور ایمان کا باطن سے اس بنا پر ایمان کا رتبہ اسلام سے بڑھا ہوا ہوگا اور کوئی اسلام بغیر ایمان کے قابل اعتبار نہیں ہوگا-

(۲۴۱) * (الف) چونکہ اس واقعہ کے آخر میں معلوم ہو گیا تھا کہ یہ سائل حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے اس لیے یہاں راوی نے روایت کے شروع ہی میں ان کا نام ذکر کر دیا ہے ورنہ اکثر روایات سے یہ ثابت ہے کہ سائل کی پوری تشخیص اس کی آمد کے وقت کوئی شخص نہ کرسکا تھا حتیٰ کہ خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی- اس کے سوا بعض بعض الفاظ میں یہاں راویوں کا کچھ اور اختلاف بھی ہے جو صرف لفظی اختلاف کہا جاسکتا ہے اصل واقعہ پر اس کا کوئی اثر نہیں- اس روایت میں اسلام کی تعریف میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اسلام صرف انقیاد ظاہری کا نام نہیں بلکہ اپنے آپ کو خالق کے پورے طور پر سپرد کر دینے کا نام ہے ایسی سپردگی جس کے بعد اپنی جان و مال پر اختیار باقی نہ رہے یہ وہی اسلام ہے جس کا مطالبہ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ سے کیا گیا تھا اور جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا ''اسلمت للّٰہ....

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِسْلَامُ اَنْ تُسْلِمَ وَجْهَکَ لِلّٰهِ وَ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْکَ لَهٗ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ قَالَ اِذَا فَعَلْتُ ذٰلِکَ فَاَنَا مُسْلِمٌ قَالَ اِذَا فَعَلْتَ ذَالِکَ فَقَدْ اَسْلَمْتَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِىْ مَا الْاِيْمَانُ قَالَ الْاِيْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلَائِکَةِ وَ الْکِتَابِ وَ النَّبِيِّيْنَ وَ تُؤْمِنَ بِالْمَوْتِ وَ بِالْحَيَاتِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَ تُؤْمِنَ بِالْجَنَّةِ وَ النَّارِ وَ الْحِسَابِ وَ الْمِيْزَانِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ کُلِّهٖ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ قَالَ فَاِذَا فَعَلْتُ ذَالِکَ فَقَدْ اٰمَنْتُ قَالَ اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِکَ فَقَدْ اٰمَنْتَ. قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِحْسَانُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنَّکَ اِنْ لَّمْ تَرَهُ فَاِنَّهٗ يَرَاکَ قَالَ يَا رَسُوْلَ

آپ کو اس کے سپرد کر دے اور یہ گواہی دے کہ معبود کوئی نہیں مگر صرف وہی ایک اللہ جس کا کوئی شریک نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے بندہ اور رسول ہیں‘ اس نے عرض کیا اچھا جب میں یہ گواہی دے دوں گا تو کیا میں مسلمان ہو جاؤں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک جب تو یہ عہد کر لے گا تو یقیناً مسلمان ہو جائے گا- اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اچھا اب ایمان کی حقیقت بتایئے؟ آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ‘ قیامت‘ فرشتے‘ اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور اس کے سب نبیوں کو مانے اور موت پھر موت کے بعد جی اٹھنے‘ جنت اور دوزخ‘ حساب و کتاب اور اعمال کی ترازو کا یقین کرے کہ ہر بری بھلی بات تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اس نے کہا جب میں ان سب باتوں کو مان لوں گا تو کیا میں مؤمن بن جاؤں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تو یہ باتیں مان لے گا تو مؤمن بن جائے گا- اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب یہ فرمایئے کہ احسان کسے کہتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا اس طرح خوگر ہو جائے گویا تو اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے- کیونکہ تو اگر اسے نہیں

☜ .... لله رب العالمين" میں اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے سپرد کر چکا اور اُس کے سامنے سر تسلیم جھکا چکا -ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی لله رب العالمین لا شریک له ‘میری نماز‘ میرے افعال حج حتیٰ کہ میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں- ایمان کی تعریف میں بھی یہاں میزان اور حساب کا ذکر پہلی روایت سے زیادہ ہے ایسے اسلام اور ایسے ایمان والا شخص کامل مسلمان اور کامل مومن کہلاتا ہے- جو شخص صرف شہادتین ادا کرتا ہے اگر چہ وہ بھی ایک مسلمان ہے لیکن ابھی اسے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا باقی ہے-

(ب) نااہلوں میں سرداری اور مال داری علاماتِ قیامت میں اس لیے شمار کی گئی ہے کہ قیامت عالم پر سب سے بڑے انقلاب کا نام ہے اور نظامِ عالم کی بربادی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اس کی زمامِ اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے جو اس کے اہل نہ ہوں یہ ظاہر ہے کہ ادنیٰ ہمت‘ پست فطرت‘ درشت خصلت اور جاہل لوگوں کے دلوں میں سوائے ایک جذبہ جلب مال کے کوئی دوسرا جذبہ نہیں ہوتا وہ ہر موقعہ پر اپنے ہی اغراض کو مقدم رکھتے ہیں دنیا و دین کے نظام میں صرف کرنے کے لیے ان کے ہاتھ کبھی نہیں کھلتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے حقوق تلف ہونے لگتے ہیں قلوب میں ان سے نفرت و عداوت پیدا ہونے لگتی ہے- تعلیم دین کا نظم قائم نہ ہونے کے باعث دین سے عام جہالت روز بروز ترقی کرتی ہے اور عالم پر خدا کی معرفت کے لحاظ سے ایک عام تاریکی چھا جاتی ہے- ادھر علم وفکر کے فقدان کی وجہ سے ☜ ....

اللّٰهِ فَحَدِّثْنِیْ مَتَی السَّاعَةُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ فِیْ خَمْسٍ مِنَ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهُنَّ اِلَّا هُوَ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾(لقمان:۳۴) وَ لٰكِنْ اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ بِمَعَالِمَ لَهَا دُوْنَ ذٰلِكَ قَالَ اَجَلْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِیْ. قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا رَأَیْتَ الْاَمَةَ وَلَدَتْ رَبَّتَهَا اَوْ رَبَّهَا وَ رَأَیْتَ اَصْحَابَ

دیکھتا تو وہ تو تجھے یقیناً دیکھتا ہے- اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے یہ بتایئے قیامت کب آئے گی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ اس کا علم تو غیب کی ان پانچ باتوں میں داخل ہے جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا (قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' بارش کو وہی بھیجتا ہے' رحم مادر میں کیا ہے اس کا علم اسی کو ہے' اور کل کیا کرنا ہے اسے بھی کوئی نہیں جانتا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ اس کا انتقال کہاں ہوگا بلاشبہ اللہ ہی ہر چیز کا جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے) ہاں اگر تو چاہے تو اس سے پہلے جو اس کی علامتیں ہیں وہ بتا سکتا ہوں اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اچھا تو وہی بتایئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تو یہ دیکھے کہ باندیوں کی اولاد مالکوں کی طرح ان کی

☜.... انہیں اس کا کوئی احساس بھی انہیں ہوتا اس لیے دین و دنیا ہر دو کا نظام تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے- جب اس طرح عالم کی بربادی سامنے آ جائے تو یقین کر لینا چاہیے کہ اب خود عالم کی بربادی جس کا دوسرا نام قیامت ہے بہت نزدیک آ گئی ہے- اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عالم اسباب میں ہر چیز اسباب کے ساتھ وابستہ ہے حتیٰ کہ قیامت بھی اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک اس کے اسباب نہ آ جائیں-

(ج) حافظ فضل اللہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ مکالمہ حجۃ الوداع سے ذرا قبل واقع ہوا ہے جب کہ انقطاع وحی اور اکمال دین کا زمانہ قریب آ چکا تھا- حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ احتمال یہ بھی ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد واقع ہوا ہو' ان حضرات کی نظر حافظ ابن مندہ کی ایک روایت پر ہے جس کے لفظ یہ ہیں کہ "ان رجلاً فی اخر عمر النبی صلی الله علیه وسلم جاء الخ" (عمدۃ القاری ص ۳۴۰) یعنی ایک شخص آپ کی آخری عمر میں حاضر ہوا' ' آخری عمر میں دونوں احتمال ہو سکتے ہیں- بہر حال اس لفظ سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہ آمد آپ کے آخری زمانہ میں ہوئی تھی- چونکہ وحی ہمیشہ کے لیے بند ہو جانے والی تھی اس لیے عرب کی امی قوم کے لیے ضرورت تھی کہ جو دین تیس سال میں تدریجاً اترتا رہا ہے آخر میں اس کی ایک مختصر مگر مکمل فہرست ان کو دے دی جائے- اس کام کے لیے قدرت نے سب سے زیادہ سلیقہ شعار فرشتہ منتخب کیا اور جو اصولی سوالات تھے وہ اس کی زبان سے پیش کرا دیئے اور بارگاہِ رسالت سے اس کا جو آخری جواب ہو سکتا تھا وہ بھی دلوا دیا گیا اور اس طور پر صحابہ کرام نے اپنی خاموشی میں دین کی ایک تسلی بخش فہرست پھر سن لی- اس حدیث نے دین کے تین درجے بتائے ہیں ادنیٰ' اوسط' اعلیٰ پہلا درجہ یہ ہے کہ شہادتین کے ساتھ صرف ظاہری اعضاء و جوارح ارکانِ خمسہ سے مزین ہو جائیں اگر چہ حقائق ایمانیہ سے قلب ہنوز منور نہ ہو- اس ناتمام انقیاد کا نتیجہ یہ ضرور ہونا چاہیے کہ حجابِ غفلت میں کبھی کبھی معصیت بھی سرزد ہو جائے اسی کو قرآن کریم نے اپنے حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے- ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ.... الخ﴾(الحجرات:۱۴) اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے' آپ فرما دیجئے کہ یہ دعویٰ ابھی مت کرو ابھی تو صرف ظاہری انقیاد حاصل ہوا ہے ہاں اس کی توقع ہے کہ آئندہ دین تمہارے دلوں میں اتر جائے- پھر تمہارا باطن بھی ظاہر کی ☜....

الشَّاءِ تَطَاوَلُوْا بِالْبُنْيَانِ وَ رَأَيْتَ الْحُفَاةَ الْجِيَاعَ الْعَالَةَ كَانُوْا رَءُوْسَ النَّاسِ فَذٰلِكَ مِنْ مَعَالِمِ السَّاعَةِ وَ اَشْرَاطِهَا قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

حکمراں بن گئی ہے' بھیڑ بکری چرانے والے یہ فخر کرنے لگیں کہ اونچی اور شاندار کوٹھی کس کی ہے- برہنہ پا' بھوکے اور محتاج لوگوں کے افسر بن جائیں تو بس یہی قیامت کی نشانیاں اور اس کے نزدیک آنے کی علامات

﴿..... طرح پیکر تسلیم بن جائے گا- اسی کا نام ایمان ہے اور یہی دین کی اوسط منزل ہے- یہاں پہنچ کر واجبات کا تحفظ اور محرمات سے اجتناب ضروری ہو جاتا ہے اب اگر قسمت نے کسی صاحب نصیب کی دستگیری فرمائی اور اس سے بھی آگے عروج میسر آ گیا تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ قلب میں حاضر و غائب کا فرق نہ رہے اور دنیا میں عین حجاب غیب میں عبادت کا وہ سلیقہ ہاتھ آ جائے جو عالم بے حجابی میں ہوتا- ان ہر سہ منازل کی طرف قرآن نے آیت ذیل میں اشارہ فرمایا ہے- ﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ (فاطر :۳۲) پھر ہم نے اپنی کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں چھانٹ لیا تھا اس میں کوئی تو اپنی جان پر ظلم کرتا رہا اور کوئی میانہ چلتا رہا اور خدا کے حکم سے کوئی ہر نیکی میں آگے آگے رہا یہی اللہ کا بڑا فضل ہے- اس کے بعد گو اسے انبیاء کی سی عصمت تو حاصل نہیں ہوتی مگر ان کی وراثت میں اس کا کوئی نمونہ ضرور میسر آ جاتا ہے- اس تیسرے درجہ کا نام احسان ہے- (دیکھو کتاب الایمان ص۱۴۴)

(د) قیامت کا وعدہ آفرینش عالم کی ابتداء سے ہوتا چلا آیا ہے مگر وہ آنے کا نام نہیں لیتی- انسان کی بے صبر طبیعت اتنا انتظار نہیں کر سکتی' اس لیے وہ اندر ہی اندر اس سوال کے لیے مضطر رہا کرتی ہے "ويقولون متى هو" وہ کہتے ہیں کہ آخر وہ کب آئے گی- قد عسٰى ان يكون قريبا- آپ فرما دیجئے کہ اب آئی- قیامت کو جب آنا ہے وہ اپنے وقت پر آ جائے گی اس بارے میں طبیعت کا انتظار یا سوال وجواب کا بے معنی سلسلہ قائم کرنا عملی زندگی کے لیے مضر ہے- اس لیے آئندہ اس دروازہ کو یہ بتا کر بند کر دیا گیا ہے کہ دین کا علم رسول سے ہی حاصل ہو سکتا ہے مگر جب وہی اپنی آخری حیٰوۃ پر اس مسئلہ کو طے کرنا نہیں چاہتا تو اس کے بعد دوسرا کون ہوگا جو اسے طے کر سکے- صاحب موافقات فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قیامت کا علم دین کے ان مسائل میں سے نہیں ہے جن کا جاننا ضروری ہو-

(ہ) یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ دنیا جس کو غیب دانی کے نام سے موسوم کرتی ہے عرب میں پہلے یہ ایک مستقل فن تھا اور اس کا نام کہانت تھا- ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس پر مفصل بحث کی ہے- حضرت استاد قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ قرآن کریم کے محاورہ میں علم وہ ہے جو واقعہ سے مستفاد ہو اور جو اپنی جانب سے تیار کیا جائے اس کو ظن کہا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اتباعِ ظن کی جابجا مذمت کی گئی ہے- مالهم به من علم الا اتباع الظن. یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام کے قتل وصلب میں اختلاف کرنے والوں کو واقعہ کا کچھ علم نہیں ہے صرف اپنی جانب سے اٹکل لگاتے ہیں ان يتبعون الا الظن و ان هم الا يخرصون یہ لوگ صرف ظن کے متبع ہیں اور تخمینے لگاتے ہیں- مدعیین غیب کو واقعہ کا علم نہیں ہوتا- دھواں اٹھتا ہے معلوم ہو جاتا ہے کہ آگ لگی ہے- ہوا چلتی ہے مٹی کی خوشبو سے پتہ لگتا ہے کہ بارش ہوگئی ہے- مون سون اٹھتا ہے معلوم ہو جاتا ہے کہ برسات قریب ہے- ہوا کا تموج بتا دیتا ہے کہ سمندر میں طوفان کس سمت سے آنے والا ہے یہ سب استدلالات ہیں جن سے درجہ بدرجہ گو یقین حاصل ہو جاتا ہے مگر واقعہ کا علم کسی کو نہیں ہوتا- خدا تعالیٰ کو بلاواسطہ واقعہ کا علم ہے اور اتنا قطعی ہے کہ اس کا تخلف محال ہے- یہاں تک کہ اشیاء اپنے وجود میں اس کے تابع ہیں وہ اشیاء کا تابع نہیں ہے- مخلوق کے دائرہ میں کمال یہ ہے کہ اس کا علم ﴾.....

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ مَنْ اَصْحَابُ الشَّاءِ وَ الْحُفَاةُ الْجِيَاعُ الْعَالَةُ قَالَ الْعَرَبُ. (رواه احمد و قال الحافظ اسناده حسن و رواه البزار ايضـ)

ہیں اس نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چرواہوں، پیادہ پا، فاقہ مست اور محتاجوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کون لوگ ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی عرب کے عوام۔

(۲۴۲) عَنْ يَحْيَ بْنِ يَعْمُرَ فِيْمَا حَدَّثَهُ ابْنُ عُمَرَؓ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ رَجُلٌ فَذَكَرَ مِنْ هَيْئَتِهٖ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُدْنُهْ فَدَنَا فَقَالَ اُدْنُهْ فَدَنَا حَتّٰى كَادَ رُكْبَتَاهُ تَمَسَّانِ رُكْبَتَيْهِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِىْ مَا الْاِيْمَانُ اَوْ عَنِ الْاِيْمَانِ قَالَ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ تُؤْمِنُ بِالْقَدْرِ قَالَ سُفْيَانُ اُرَاهُ قَالَ خَيْرِهٖ وَ شَرِّهٖ قَالَ فَمَا الْاِسْلَامُ قَالَ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَ حَجُّ الْبَيْتِ وَ صِيَامُ شَهْرِ رَمْضَانَ وَ غُسْلٌ مِنَ الْجَنَابَةِ كُلُّ ذٰلِكَ قَالَ صَدَقْتَ صَدَقْتَ قَالَ الْقَوْمُ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا

(۲۴۲) یحیٰی بن یعمر نے ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث میں یہ مضمون اس طرح روایت کیا ہے ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص آیا، راوی نے پھر اس کی صورت کا مفصل ذکر کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا ذرا قریب آ جاؤ وہ قریب آ گیا۔ آپؐ نے فرمایا اور قریب آ جاؤ وہ اور قریب آ گیا یہاں تک کہ اس کے زانو آپؐ کے زانو سے آ لگے، اس نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ فرمائیے ایمان کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور قیامت کو مانو اور تقدیر پر یقین رکھو۔ سفیان کہتے ہیں کہ میرے خیال میں شاید آپؐ نے تقدیر کے ساتھ بری بھلی کا لفظ بھی ارشاد فرمایا تھا اس نے عرض کیا اچھا تو اسلام کے متعلق فرمائیے، آپؐ نے فرمایا نماز اپنے شرائط و آداب کے ساتھ پڑھنا، زکوٰۃ دینا، بیت اللہ کا حج کرنا اور ماہ رمضان شریف کے روزے رکھنا اور جنابت سے غسل کرنا۔ ہر بات پر وہ بجا اور درست کہتا جاتا تھا۔ حاضرین نے کہا اس سے بڑھ کر آپؐ کی توقیر و تعظیم کرنے والا شخص ہم نے

☜ ....واقع کے مطابق ہو جائے اور علم الٰہی کا کمال یہ ہے کہ خود اشیاء اپنے لباس وجود میں علم الٰہی کے تابع رہیں۔ ہاں کبھی خزانہ غیب سے خواص کو کوئی حصہ بخش دیا جاتا ہے تو وہ اس کے تعلق و خصوصیت کی ایک برہان بن جاتا ہے مگر یہ علم بھی اتنا ہی ملتا ہے جتنا کہ ایک ضعیف انسان کا ظرف متحمل ہو سکتا ہے۔ مخلوق کسی ایک چیز کے علم میں بھی خالق کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ قدیم کا علم حادث میں کب سما سکتا ہے، ذرّہ میں آفتاب چمکتا ہے مگر نہ ذرّہ آفتاب بنتا ہے نہ آفتاب ذرّہ بن سکتا ہے وللہ مثل الاعلیٰ۔ غرض خالق کی نوعیت علم ہی مخلوق کے علم کی نوعیت سے جداگانہ ہے ایک کو دوسرے پر قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا ہمسری تو کجا۔

(۲۴۲) * یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سوالات کی ترتیب میں یہاں کچھ اختلاف ہے۔ بعض روایات میں ایمان کا سوال مقدم ہے اور بعض میں اسلام کا لیکن سائل کے اصل سوال اور آپؐ کے اصل جواب میں کہیں کوئی فرق نہیں ہے سب کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کا تعلق اعمالِ جوارح سے ہے اور ایمان کا اعتقادیات سے۔ اکثر روایات میں اعمال جوارح کی تفصیل شہادتین اور ارکانِ خمسہ ذکر کی گئی ہے۔ عمرہ، غسل جنابت اور وضو کی تکمیل صرف ابن حبان کی روایت میں مذکور ہے لیکن چونکہ عمرہ حج کے تابع ہے اور غسل جنابت اور اسباغ وضو نماز کے اس لیے یہ اختلاف کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایمان کی تشریح میں جن امورِ خمسہ کا احادیث میں ذکر ہے قرآن کریم نے بھی کئی جگہ اس ☜

اَشَدَّ تَوْقِيرًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا كَاَنَّهٗ يَعْلَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِىْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِلَّا تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ كُلُّ ذٰلِكَ نَقُوْلُ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا اَشَدَّ تَوْقِيرًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا فَيَقُوْلُ صَدَقْتَ صَدَقْتَ قَالَ اَخْبِرْنِىْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ بِهَا مِنَ السَّآئِلِ قَالَ فَقَالَ صَدَقْتَ قَالَ ذَاكَ مِرَارًا مَارَأَيْنَا رَجُلًا اَشَدَّ تَوْقِيرًالِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا ثُمَّ وَلّٰى قَالَ سُفْيَانُ فَبَلَغَنِىْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْتَمِسُوْهُ فَلَمْ يَجِدُوْهُ قَالَ هٰذَا جِبْرَئِيْلُ جَاءَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ مَا اَتَانِىْ فِىْ صُوْرَةٍ اِلَّا عَرَفْتُهٗ غَيْرَ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ. و فى رواية ابن حبان زيادات منها فى الاسلام قال و تحج و تعتمر و تغتسل من الجنابة و ان تتم الوضوء الى اخره خذواعنه و الذى

کوئی نہیں دیکھا - ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ پہلے سے آپؐ کو جانتا تھا - پھر اس نے کہا یارسول اللہ احسان کے متعلق ارشاد ہو - آپؐ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں بلاشبہ دیکھتا ہی ہے - ہر مرتبہ ہم یہی کہتے کہ اس جیسا آپؐ کی تعظیم اور توقیر کرنے والا شخص ہم نے کوئی نہیں دیکھا' بات بات پر بجا و درست ہی کہہ رہا ہے اس کے بعد اس نے عرض کیا اچھا اب قیامت کے متعلق فرمائیے کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا اس بارے میں تو سائل اور جس سے پوچھا جا رہا ہے دونوں کا علم برابر ہے (نہ اسے معلوم نہ اسے معلوم) راوی کہتا ہے اس پر پھر اس نے وہی بجا و درست کہا - بار بار وہ یہی کہتا رہا - ہم نے کہا اس جیسا شخص ہم نے آپؐ کی توقیر کرنے والا نہیں دیکھا پھر وہ پشت پھیر کر چلا گیا - سفیان کہتے ہیں - ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اس شخص کو تلاش کرو لوگ تلاش کرنے کے لیے گئے مگر وہ نہ ملا آپؐ نے فرمایا یہ جبریل تھے اس پیرایہ سے تمہارا دین تمہیں سکھانے آئے تھے اس سے قبل وہ جس صورت میں بھی میرے پاس آئے میں نے انہیں ہمیشہ پہچان لیا ہے لیکن اس صورت میں میں ان کو پہچان نہیں سکا - ابن حبان نے بھی اس واقعہ کو روایت کیا ہے اس میں کچھ زیادتیاں اور بھی ہیں مثلاً اس میں اسلام کی تشریح میں حج، عمرہ، غسل جنابت اور پورے طور پر وضوء کرنے کا ذکر بھی ہے اور آخر میں ہے مجھ سے اپنا دین سیکھ لو - اس کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب سے کہ میرے پاس یہ تشریف لاتے ہیں کبھی مجھ پر مشتبہ نہیں ہوئے بجز

ﷺ .... کی طرف اشارہ کیا ہے -

(۱) ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ﴾ (البقرة:۲۸۵) ہمارے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کتاب کو مان لیا جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی اور (پیغمبر کے ساتھ) دوسرے مسلمانوں نے بھی - یہ سب کے سب اللہ اور اس کے فرشتے اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے -

(۲) ﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ﴾ (البقرة:۷۷) بلکہ اصل بھلائی اور نیکی یہ ہے کہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے -

چونکہ رسولوں پر ایمان یہ ہے کہ ان کی بیان کردہ سب باتوں کو تسلیم کیا جائے اس لیے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات' قیامت ﷺ ....

نفسی بیده ما اشتبه علی منذا تانی قبل مرتی هذه و ما عرفته حتی ولّی (جامع العلوم و الحکم ص ۱۶) (وعنه من طریق ثان) جاءَ جِبْرَئِیْلُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ مَا الْاِسْلَامُ فَقَالَ تَعْبُدُاللّٰهَ لَا تُشْرِکُ بِهٖ شَیْئًا وَ تُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَ تُؤْتِی الزَّکٰوۃَ وَ تَصُوْمُ رَمَضَانَ وَ تَحُجُّ الْبَیْتَ قَالَ فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِکَ فَاَنَا مُسْلِمٌ قَالَ نَعَمْ صَدَقْتَ قَالَ فَمَا الْاِحْسَانُ قَالَ تَخْشَی اللّٰهَ تَعَالٰی کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَاتَکُ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ قَالَ فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِکَ فَاَنَا مُحْسِنٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَمَا الْاِیْمَانُ قَالَ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِکَتِهٖ وَ کُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْبَعْثِ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ وَ الْجَنَّةِ وَ النَّارِ وَ الْقَدْرِ کُلِّهٖ قَالَ فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِکَ فَاَنَا مُؤْمِنٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ صَدَقْتَ (زاد فی روایة و کان جبرئیل یاتی النبی صلی الله علیه وسلم فی صورۃ دحیة و عنه من طریق ثالث اَنَّ جِبْرَئِیْلَ قَالَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا

اس مرتبہ کے کہ میں ان کو شناخت نہیں کر سکا یہاں تک کہ وہ پشت پھیر کر چلے گئے) ابن عمرؓ کی روایت کے دوسرے طریقہ میں اس روایت کا مضمون یوں ہے جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا اے محمدؐ اسلام کی حقیقت کیا ہے' آپؐ نے فرمایا اللہ کی عبادت کر اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرا' نماز ادا کر' زکوۃ دے' رمضان شریف کے روزے رکھ' بیت اللہ کا حج کر' اس نے عرض کیا یا رسول اللہ جب یہ باتیں میں کرلوں تو کیا میں مسلمان ہو جاؤں گا ؟ آپؐ نے فرمایا ضرور' اس نے کہا آپؐ نے درست فرمایا- پھر پوچھا احسان کسے کہتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرتا رہ گویا اسے تو آنکھوں سے دیکھتا ہے اگر تو اسے آنکھوں سے نہیں دیکھتا تو وہ تو یقیناً تجھے دیکھتا ہے- اس نے کہا اگر میں یہ صفت حاصل کرلوں تو کیا میں محسن ہو جاؤں گا آپ نے فرمایا بے شک- اس نے کہا آپؐ نے بجا فرمایا- پھر بولا کہیے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں اور اس کے تمام رسولوں کو اور موت کے بعد جی اٹھنے کو' جنت و دوزخ اور ہر قسم کی تقدیر کو دل سے مان لے- اس نے کہا جب میں یہ تمام باتیں مان لوں تو کیا میں مومن ہو جاؤں گا؟ آپؐ نے فرمایا یقیناً- اس نے کہا ٹھیک فرمایا (ایک روایت میں یہ اور ہے کہ عام طور پر جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں دحیہ کلبی کی صورت میں آیا کرتے تھے) ابن عمرؓ کی روایت کے تیسرے طریقے میں یہ مضمون اس طرح ہے جبرئیلؑ نے آنحضرتؐ سے پوچھا ایمان کسے کہتے ہیں آپؐ نے فرمایا اللہ تعالیٰ' اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور تمام رسولوں کو اور آخرت کے دن اور

اور جنت و دوزخ کی تمام تفصیلات' جیسے صراط و میزان وغیرہ سب کا تسلیم کرنا ایمان بالرسول میں داخل ہے- یہاں ایک بات غور طلب یہ ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان کے مفہوم میں فرق ہے اور وفد عبدالقیس کی حدیث میں آپ نے اسلام کی ٹھیک وہی تفسیر بیان فرمائی ہے جو یہاں ایمان کی مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان میں کوئی فرق نہیں- علماء نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں حضرت استاد قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ ایمان و اسلام مصداق کے لحاظ سے ایک ہی چیز ہیں یعنی اسلام کامل اور ایمان کامل جدا نہیں ہوتے اس لیے ایمان و اسلام کے اجزاء ایک دوسرے کی تعریف میں ذکر کئے جا سکتے ہیں-

حدیث جبرئیلؑ میں سائل کے سوالات کی نوعیت پھر بار بار اس کی تصدیق کرنے سے یہ اندازہ کرنا بہت ہی قرین قیاس تھا ....

الْاِیْمَانُ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَ مَلَائِکَتِہٖ وَ کُتُبِہٖ وَ رُسُلِہٖ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَ شَرِّہٖ فَقَالَ لَہٗ جِبْرَئِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ صَدَقْتَ قَالَ فَتَعَجَّبْنَا مِنْہُ یَسْأَلُہٗ وَ یُصَدِّقُہٗ قَالَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاکَ جِبْرِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ مَعَالِمَ دِیْنِکُمْ. و عنہ عن طریق رابع قَالَ اَخْبَرَنِیْ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِؓ اَنَّھُمْ بَیْنَا ھُمْ جُلُوْسٌ اَوْ قُعُوْدٌ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَاءَ رَجُلٌ یَمْشِیْ حَسَنَ الْوَجْہِ حَسَنَ الشَّعْرِ عَلَیْہِ ثِیَابٌ بِیْضٌ فَنَظَرَ الْقَوْمُ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ مَا نَعْرِفُ ھٰذَا اَوْ مَا ھٰذَا بِصَاحِبِ سَفَرٍ ثُمَّ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰتِیْکَ؟ قَالَ نَعَمْ فَجَاءَ فَوَضَعَ رُکْبَتَیْہِ عِنْدَ رُکْبَتَیْہِ وَ یَدَیْہِ عَلٰی فَخِذَیْہِ (وساق الحدیث بنحو ما تقدم و فیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بعد ان ذھب السائل) عَلَیَّ بِالرَّجُلِ

ہر بری بھلی چیز کو نوشتہ تقدیر مان لو- جبریل علیہ السلام نے کہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک فرمایا- راوی کہتا ہے کہ ہم نے اس پر تعجب کیا کہ یہ شخص خود ہی پوچھتا ہے اور پھر خود ہی اس کی تصدیق بھی کرتا جاتا ہے- راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جبریل علیہ السلام تھے تمہارے پاس تمہارے دین کے اصول سکھانے آئے تھے روایت مذکورہ کے چوتھے طریقے میں ہے- ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں مجھ سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھے کہ ایک شخص نہایت حسین، خوب صورت بالوں والا، سفید لباس پہنے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ٹہلتا ہوا آیا- لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا (اور کہا) ہم اس شخص کو پہچانتے تو نہیں یا یہ کہا کہ یہ شخص مسافر تو معلوم نہیں ہوتا- اس کے بعد وہ بولا یارسول اللہ میں حاضر ہوسکتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شوق سے وہ آیا اور اپنے دونوں زانو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانو کے برابر اور اپنے ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رانوں پر رکھ دیئے (اس کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کا وہی مضمون بیان کیا اس میں یہ اور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے چلے جانے کے بعد فرمایا) اس کو میرے پاس لاؤ، لوگوں نے اسے ڈھونڈھا تو انہیں کوئی نظر نہ آیا- دو تین دن کے بعد آپ صلی

☜ .....کہ یہ مخاطب کوئی ذی علم اور ذی فہم شخص ہے اس لیے اس کے سامنے ہر ایک کی جداگانہ ماہیت اور علیحدہ علیحدہ حقیقت بیان کرنا اور ان باریک علمی گوشوں پر بھی متنبہ کر دینا جن سے ایمان و اسلام کی حقیقتیں ممتاز ہوتی ہیں نہایت مناسب تھا، وفد عبدالقیس میں آپ کے مخاطب چند نومسلم تھے ان کے سامنے علمی تحقیقات بیان کرنا غیر ضروری تھا- نیز وہ صرف ایک ایسا نظام عمل دریافت کرنے آئے تھے جو ان کی نجات کے لیے کافی ہو جائے اس لیے ان کے سامنے آپ نے ایسا ہی نظام عمل رکھ دینا مناسب سمجھا- یہاں اسلام و ایمان کا فرق بیان کرنا بالکل غیر ضروری تھا- خلاصہ یہ ہے کہ یہ تعبیری فرق صرف مخاطبین کے حالات کی رعایت سے کیا گیا ہے مسئلہ کا فرق نہیں ہے-

ابن عمرؓ کی روایت کے دوسرے طریقہ کے آخری الفاظ سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ حضرت جبرئیلؑ کو شناخت نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس مرتبہ وہ اپنی عام عادت کے مطابق دحیہ کلبی کی شکل میں تشریف نہ لائے تھے- تعجب ہے کہ نسائی شریف میں اس کے بالکل برعکس یہاں راوی یہ بیان کرتا ہے "انہ جبریل نزل فی صورۃ دحیۃ الکلبی" (یہ جبرئیلؑ تھے دحیہ کلبی کی صورت میں آئے تھے) ☜ .....

فَطَلَبُوْهُ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا فَمَكَثَ يَوْمَيْنِ اَوْ ثَلَاثَةً ثُمَّ قَالَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ أَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ عَنْ كَذَا وَ كَذَا قَالَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ ذَاكَ جِبْرِيْلُ جَاءَ كُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ.

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابن الخطاب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جانتے ہو یہ سوالات کرنے والا شخص کون تھا؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی واقف ہے- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے تمہارا دین سکھانے کے لیے تمہارے پاس آئے تھے-

(۲۴۳) عَنْ اَبِیْ عَامِرِ الْاَشْعَرِیِّ ؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنَحْوِهٖ وَ فِيْهِ ثُمَّ وَ لّٰی (ای السائل) فَلَمَّا لَمْ نَرَ طَرِيْقَهٗ بَعْدُ قَالَ (ای النبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) سُبْحَانَ اللّٰهِ ثَلَاثًا هٰذَا جِبْرِيْلُ جَاءَ لِيُعَلِّمَ النَّاسَ دِيْنَهُمْ وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ مَاجَاءَ نِیْ قَطُّ اِلَّا وَ اَنَا اَعْرِفُهٗ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ هٰذِهِ الْمَرَّةَ. (انفردبه الامام احمد و حسنه الحافظ)

(۲۴۳) ابو عامر اشجعی نے بھی جبریل علیہ السلام کی آمد کا واقعہ اسی طرح نقل کیا ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں- پھر وہ شخص چلا گیا جب ہمیں اس کا کہیں پتہ نہ چلا تو آپؐ نے تین بار سبحان اللہ سبحان اللہ فرما کر کہا یہ جبریل علیہ السلام تھے اس لیے آئے تھے کہ لوگوں کو اس پیرایہ سے دین کی تعلیم دیں- اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس مرتبہ کے سوا کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ وہ میرے پاس آئے ہوں اور میں نے انہیں پہچان نہ لیا ہو-

---

؎ .... حافظ ابن حجرؒ نے اس کو راوی کا وہم قرار دیا ہے اور بجا قرار دیا ہے-

چوتھے طریقہ میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ سے آپؐ کا سائل کی تشخیص کے متعلق سوال کرنا اس واقعہ کے دو تین دن بعد ہوا ہے- ابوداؤد' نسائی اور ترمذی میں راوی نے بلاتردد تین دن کا لفظ کہا ہے- لہٰذا اس کے خلاف جو روایت بھی ہو اس کی تاویل کی جائے گی-

(۲۴۳) * حافظ ابن رجبؒ نے یہاں صحابی کی کنیت میں اختلاف نقل کیا ہے کہ ابن عامر ہے یا ابوعمر یا ابو مالک اور ان کی روایت کے الفاظ میں یہ بھی نقل کیا ہے' ''کہ ہمیں بات کرنے والا وہاں کوئی شخص نظر نہ آتا تھا ہم صرف آپ کا جواب سن رہے تھے' مسند احمد کے یہ الفاظ اس باب کی تمام صحیح روایات کے خلاف ہیں' راوی عام طور پر سائل کو بچشم خود دیکھنا بیان کرتے ہیں اس لیے اگر کسی ایک روایت میں اس کے خلاف مذکور ہے تو یقیناً یہ بھی راوی کا وہم ہی سمجھا جائے گا- صحیحین کی روایات سے ثابت ہے کہ جبریل علیہ السلام کو ایک نوجوان شخص کی صورت میں سب نے دیکھا تھا- ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عالم روحانیت موجود ہے' اس کو اپنی شکل بدلنے پر قدرت دی گئی ہے' وہ انسانی شکل اختیار کر سکتا ہے اور اپنی شکل پر واپس بھی ہو سکتا ہے- نقل و حرکت اور سمع و بصر وغیرہ کی تمام صفات اس میں موجود ہیں- فرشتوں کی بحث میں اس پر مزید کلام کیا جائے گا-

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کے مزاج میں تحقیق و تنقیح کی قوت نہیں ہوتی جب وہ کہیں راویوں کا اختلاف دیکھتے ہیں تو اس کی تنقیح کرنے کی بجائے اصل واقعہ ہی کا انکار کر بیٹھتے ہیں- یہ ٹھیک ایسی ہی بات ہے جیسے کسی واعظ و مقرر کی تقریر سننے والے اگر آپ کے سامنے اس کی تقریر میں کچھ اختلاف نقل کریں تو آپ سرے سے اس کی تقریر ہی سے انکار کر بیٹھیں پس اگر اس جگہ ناقلین کے اختلاف کی وجہ سے اس تقریر سے انکار کرنا غلط ہے تو پھر راویوں کے اختلاف سے جبرئیل علیہ السلام کی آمد اصل واقعہ ہی سے انکار کرنا کیونکر صحیح کہا جا سکتا ہے اس کا حاصل تو یہ ہے کہ جب تک ایک واقعہ کے نقل پر اس کے تمام ناقل کسی ادنیٰ اختلاف کے بغیر متفق نہ ہو جائیں اس واقعہ کا وجود ہی قابل تسلیم نہ ہو-

(۲۴۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِنَحْوِهٖ وَ فِیْهِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سَلُوْنِیْ فَهَابُوْهُ اَنْ یَسْأَلُوْهُ وَ فِیْهِ فَاِذَا

(۲۴۴) یہ مضمون ابوہریرہؓ سے بھی اسی کے قریب مروی ہے (صرف اتنا فرق ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کی آمد کا سبب اس میں یہ مذکور ہے کہ آپ ؐ نے صحابہؓ سے فرمایا مجھ سے جو دریافت کرنا ہے وہ دریافت کرلو صحابہ (قرآن میں سوال کی ممانعت کی وجہ سے) سوال کرتے ہوئے ڈرے اس پر جبرئیل علیہ السلام آئے اور

---

(۲۴۴) * اس روایت سے یہ معلوم ہوگیا کہ یہاں جبرئیل علیہ السلام کو سائل بن کر تشریف لانے کی ضرورت کیا تھی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ قرآن میں سوال کرنے کی ممانعت کا منشا تحقیق سے روکنا نہیں تھا بلکہ بیکار سوالات یا ایسے سوالات سے روکنا مدنظر تھا۔ جن سے دین میں تشدد پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ حدیث جبریل میں سب سے بڑی بحث احسان کی ہے۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر احسان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہیں تقویٰ کے ساتھ، کہیں ایمان اور کہیں عمل صالح کے ساتھ۔

(۱) ﴿بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ (بقرہ: ۱۱۲) بلکہ واقعی بات تو یہ ہے کہ جس نے خدا کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ نیکوکار بھی ہے تو اس کے لئے اس کا اجر اس کے پروردگار کے یہاں موجود ہے۔

(۲) ﴿وَ مَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَی اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ (لقمان: ۲۲) اور جو خدا کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرے اور وہ نیکوکار بھی ہو (تو بس اس نے مضبوط رسی تھام لی)۔

(۳) ﴿لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ اَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ﴾ (المائدہ: ۹۳) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل بھی کئے تو جو کچھ ممانعت سے پہلے کھا پی چکے اس میں ان پر کسی طرح کا گناہ نہیں جبکہ انھوں نے حرام چیزوں سے پرہیز کیا اور ایمان لائے اور نیک کام کئے پھر حرام چیزوں سے پرہیز کیا اور ایمان لائے پھر حرام چیزوں سے پرہیز کیا اور اچھا پرہیز کیا جیسا کرنے کا حق ہے اور اللہ خلوص دل سے نیک کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۴) ﴿لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَةٌ﴾ (یونس: ۲۶)
جن لوگوں نے دنیا میں بھلائی کی ان کے لئے آخرت میں بھی ویسی ہی بھلائی ہے اور کچھ بڑھ کر بھی۔

صحیح مسلم میں زیادہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے روئے انور کا دیدار کی گئی ہے۔ صفت احسان کے لئے یہ جزاء نہایت ہی موزوں ہے۔ جب احسان یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اس تصور کے ساتھ ادا کی جائے گویا اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے تو آخرت میں اس کے مناسب یہی جزاء ہوسکتی ہے کہ اس کو دیدار الٰہی سے حقیقتاً مشرف فرمایا جائے اس کے بالمقابل کافروں کا حال یہ ہے کہ دنیا میں بھی ان کے اور ان کے پروردگار کے درمیان غفلت کے حجابات پڑے ہوئے ہیں اس لئے ان حجابہائے غفلت کی جزاء آخرت میں دیدار الٰہی سے محرومی ہونا چاہئے اسی لئے فرمایا۔ ﴿اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ﴾ (المطففین: ۱۵)

حافظ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ احسان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس تصور کے ساتھ ہو کہ وہ تم سے اتنا قریب ہے گویا تمہارے سامنے ہے اور تم اسے دیکھ رہے ہو اگر یہ تصور دشوار ہو تو پھر اس کے پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اس ایمان کا تصور جماؤ کہ وہ تمہاری تمام حرکات وسکنات دیکھتا ہے۔ یہ ایمان تو ہر شخص کو حاصل ہے جب اس حقیقت پر بار بار غور کرو گے تو یہ ......

كَـانَـتِ الْـعُـرَاةُ الْحُفَاةُ الْجُفَاةُ وَ فِيهِ وَ اِذَا تَـطَاوَلَ رُعَاةُ الْبُهْـمِ فِـى الْـبُـنْيَانِ وَفِيهِ بَعْد ذِكْـرِ الاية زِيَـادَةُ ثُـمَّ اَدْبَـرَ الـرَّجُـلُ فَقَالَ

انہوں نے یہ سوالات خود شروع کیے اور علاماتِ قیامت میں ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ کی بجائے) یہاں یہ لفظ ہیں جب برہنہ جسم' پیادہ پا' گنوار' درشت خصلت (لوگ قوم کے سردار ہو جائیں) اور ''ورأیت اصحاب الشاء'' کی بجائے یہ لفظ ہیں

ﷺ..... اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی قرب ومعیت کا تصور تم پر اتنا غالب آ جائے گا کہ پھر وہ ہر وقت گویا تمہیں اپنے سامنے نظر آئے گا-اس بنا' پر حدیث میں ایک ہی حال مذکور ہے اور دوسرا جملہ پہلے حال کی تحصیل کا صرف ایک ذریعہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو دو جداگانہ حال قرار دیئے جائیں اور مطلب یہ ہو کہ اگر تمہیں پہلا حال میسر نہ آ سکے تو دوسرے حال ہی پر کفایت کر لو اور کم از کم اس تصور سے تو خالی نہ رہو کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے' خشوع وخضوع عبادت کی روح ہے اور اس کے لئے یہ تصور بھی کافی ہے' بعض عارفین نے ان دو مقاموں کو مقام اخلاص اور مقام مشاہدہ سے تعبیر کیا ہے- پہلا مقام' مقام مشاہدہ ہے اور دوسرا مقام اخلاص- اگر یہ تصور میسر آ جائے کہ خدا تعالیٰ تمہیں ہمہ وقت دیکھتا ہے-تمہاری ہر ہر حرکت پر اس کی نظر پڑ رہی ہے تو اس حالت میں غیر اللہ کی طرف التفات یا عبادت میں غیر اللہ کی شرکت کا شائبہ بھی آنا ناممکن ہوگا- اس کا نام مقام اخلاص ہے لیکن اگر کسی بلند فطرت کا قلب نورِ عرفان ویقین سے اتنا لبریز ہو چکا ہے کہ حجاب اغیار اٹھا کر غیب الغیب کو دیکھنے لگا ہے تو یہ مقام مشاہدہ ہے اور دراصل احسان اسی یقین کا نام ہے یہ مشاہدہ اسی یقین کا ایک اثر ہوتا ہے جو کمال استحضار اور انتہائی رسوخ کے بعد یہ شکل اختیار کر لیتا ہے ورنہ ؎

عنقاء شکار کس نشود دام باز چین کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس صفت احسان کی طرف اشارات کئے گئے ہیں-

(۱) ﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ﴾ (بقرہ: ۱۸۶)

ہمارے بندے جب ہمارے بارے میں دریافت کریں تو ان کو (سمجھا دو) کہ ہم ان کے بہت قریب ہیں-

(۲) ﴿مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلاَثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذَالِکَ وَلَا اَکْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَمَا کَانُوْا﴾ (مجادلہ: ۷)

جب تین آدمیوں کا مشورہ ہوتا ہے تو ضرور ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور پانچ کا مشورہ ہوتا ہے تو ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے اور اس سے کم ہوں یا زیادہ اور کہیں بھی ہوں وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے-

(۳) ﴿وَمَا تَکُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا کُنَّا عَلَیْکُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ﴾ (یونس: ۶۱)

اور اے پیغمبر تم کسی حال میں ہو اور قرآن کی کوئی سی آیت بھی لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہو اور (اے لوگو) کوئی سا عمل بھی تم کرتے ہو ہم (ہمہ وقت) جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو تم کو دیکھتے رہتے ہیں-

(۴) ﴿وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾ (ق: ۱۶)

اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں- ﷺ.....

رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُدُّوْا عَلَيَّ الرَّجُلَ فَاَخَذُوْا لِيَرُدُّوْهُ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا فَقَالَ هٰذَا جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ جَاءَ لِيُعَلِّمَ

اور جب جاہل بھیڑوں کے چرواہے عمارتوں پر فخر کرنے لگیں اور آیت ''ان اللہ عندہ علم الساعۃ'' کے بعد تک پڑھی اس کے بعد وہ شخص پشت پھیر کر چلا گیا آپؐ نے فرمایا اس شخص کو میرے پاس واپس لاؤ' لوگ چلے کہ اسے واپس لائیں مگر

☜ ....(۵) ﴿يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَالَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ﴾ (نساء : ۱۰۸)

لوگوں سے شرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے - حالانکہ جب راتوں کو (بیٹھ بیٹھ کر) ان باتوں کے مشورے کرتے ہیں جن سے خدا راضی نہیں تو خدا ان کے ساتھ (موجود) ہوتا ہے-

(۶) ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾ (الحدید: ۶)

''اور تم کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے-''

ان تمام آیات میں حق تعالیٰ کی یہ قرب و معیت اسی صفت احسان کا اثر ہے جس کو حدیث جبرئیل علیہ السلام میں بتایا گیا ہے- احادیث ذیل میں بھی اسی کے اثرات ہیں-

ان احدکم اذا قام یصلی فانما یناجی ربه اور به بینه و بین القبلة و قوله ان الله قبل وجهه اذ اصلی. وقوله ان الله ینصب وجهه لوجه عبده فی صلا ته مالم یلتفت و قوله للذین رفعوا اصواتهم بالذکر انکم لا تدعون اصم ولا غائبا انکم تدعون سمیعا قریبا. و فی روایة وهو اقرب الی احدکم من عنق راحلته و فی روایته وهو اقرب الیکم من حبل الورید و قوله یقول الله عزوجل انا مع عبدی اذا ذکرنی و قوله یقول الله عزوجل انا مع ظن عبدی بی و انا معه حیث یذکرنی.

(۱) جب تم میں کوئی شخص نماز ادا کرنے لئے کھڑا ہوتا ہے اس وقت وہ اپنے پروردگار سے سرگوشی کرتا ہے یا آپؐ نے یہ فرمایا کہ اس کا پروردگار گویا اس کے اور اس کے قبلہ کے درمیان جلوہ گر ہوتا ہے- (۲) جب مصلی نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اس کے منہ کی جانب جلوہ گر ہوتی ہے- (۳) جب تک بندہ نماز میں ادھر اُدھر نہیں دیکھتا اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ رہتا ہے- (۴) کچھ لوگوں نے ایک سفر میں چیخ چیخ کر ذکر اللہ شروع کیا- آپ نے فرمایا اتنا چلاؤ مت تم کسی بہرے یا غیر حاضر ذات کو یاد نہیں کر رہے ہو' تم ایسی ذات کو یاد کر رہے ہو جو سننے والی ہے اور تمہارے بہت ہی قریب ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ تمہارے اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے اور ایک روایت میں ہے کہ تمہاری رگ جان سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے- (۵) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اپنے بندہ کے اعتقاد کے مطابق اس کے ... معاملہ کرتا ہوں اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہوتا ہوں-

قرب و معیت کی یہ تمام داستانیں بندہ کے اسی یقین وحضور کے کرشمے ہیں جس کے پیدا کرنے کا وہ بہر حال مامور ہے صوفیاء محققین نے اس قرب و معیت کو اپنے فن اور اپنے ذوق کے انداز میں دوسری طرح پیش کیا ہے مگر درحقیقت وہ سب کیفیات و وجدانیات ہیں جو الفاظ کی محدود تعبیرات میں مقید ہو کر فضول دماغی الجھاؤ کا باعث بن گئی ہیں-

حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تعبیر بہت صاف ہے اور علماء وصوفیاء دونوں کے مذاق کے قریب ہے- شریعت کا ☜ ....

33 النَّاسَ دِیْنَهُمْ. وفی طریق اراد اَنْ تَعَلَّمُوْا اِذْلَمْ تَسْأَلُوْا. (رواہ احمد و الشیخان وغیرھما)

نہیں کوئی نظر نہ آیا آپ نے فرمایا یہ جبریلؑ تھے-اس لیے آئے تھے کہ لوگوں کو اس پیرایہ سے ان کا دین سکھلائیں- دوسرے طریقے میں یہ لفظ ہیں کہ چونکہ تم نے سوال نہ کیا اس لیے جبریلؑ نے (خود یہ سوالات کیے) تا کہ تم اپنا دین سیکھ لو-

---

ﷺ.....اصل مقصد توحید و رسالت کا صرف علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ان علوم کو حالات اور حالات سے مقامات کی حد تک پہنچانا ہے علوم جب تک حالات و وجدانیات کی شکل اختیار نہیں کرتے اس وقت تک طبیعت میں نہ تو جذبہ عمل پیدا ہو سکتا ہے اور نہ عمل میں کوئی ذوق نصیب ہو سکتا ہے- انسانی دماغ ان کو صرف ایک علمی تحقیق کی نظر سے دیکھا کرتا ہے اور یہ باور نہیں کر سکتا کہ یہ تمام علوم درحقیقت عالم غائبات کے وہ عظیم الشان حقائق ہیں جو خارج میں عالم مشاہدہ سے زیادہ مستحکم طور پر موجود ہیں- اسے حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے مسائل' تقدیر و برزخ' جنت و دوزخ کے تمام غیبی حقائق صرف خیالی نظر آتے رہتے ہیں لیکن منازلِ یقین طے کرتے کرتے جب وہ منزلِ احسان تک پہنچ جاتا ہے تو پھر جن کو پہلے وہ اوہام سمجھا کرتا تھا اب وہی حقائق ثابتہ نظر آنے لگتے ہیں اور جنھیں حقائق سمجھا کرتا تھا وہ اوہام سے زیادہ ناپائیدار اور بے حقیقت ہوتے چلے جاتے ہیں- انسان کے باطن میں جب یہ انقلاب رونما ہو جاتا ہے تو شریعت اس کو احسان سے تعبیر کرتی ہے- اس کی مثال یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک سائنس کا ماہر مسلسل تجربات کرتے کرتے جب کسی ایک نقطہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کو اپنی اس تحقیق پر وہ یقین میسر آجاتا ہے جو اپنی آنکھوں کے مشاہدات سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتا ہے- ہر انسان مشاہدہ میں انسان ہے اور دوسرے انسان ہی سے پیدا ہوا ہے- تاریخ نے کبھی شہادت نہیں دی کہ کوئی انسان کسی جانور سے پیدا ہوا تھا لیکن جب محض دماغی فلسفہ نے اس کو ہڈیوں کے جوڑ و بند ملانے پر مجبور کر دیا تو اس نے اپنے تمام مشاہدات اور دنیا کی تمام موجودہ تاریخ کی صرف دلائل و براہین اور محض اپنے تجربات کی بنا پر تکذیب کر دی اور بڑی خوشی سے یہ کہنے لگا کہ انسان حیوان ہی کی ایک ارتقائی شکل ہے یہ کوئی علمی تحقیق نہیں بلکہ جب دماغ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ کسی ایک جانب مشغول ہو جاتا ہے تو اس کو حقائق کے قلب کرنے میں ایک ملکہ حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اوہام کو حقائق اور حقائق کو اوہام کا رنگ دینے لگتا ہے- اس کے یقین کی یہ ساری دنیا صرف اس کے دماغ کی تراشیدہ ہوتی ہے- آج بھی اوہام کے پرستار کھلے ہوئے امراض کو جنات کا خلل قرار دیتے ہیں- قدیم ہندو ذہنیت سے متاثر بعض جاہل مسلمان بھی چیچک کو دیوی کا تصرف خیال کرتے ہیں اور اس زمانہ میں گھر کے اندر گوشت پکانا چیچک بگڑنے کا سبب حقیقی تصور کرتے ہیں- اس کے برعکس روحانیات کے منکر روحانی تصرفات کے لئے بھی انجکشن تجویز کراتے پھرتے ہیں- اس پر تماشہ یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے دائرہ یقین کے موافق معالجہ کرتا ہے اور اس پر آثار مرتب ہونے کا دعویٰ بھی رکھتا ہے یہ سب حقائق نہیں بلکہ اپنے ہی یقین کے اثرات ہیں جو بصورت حقائق نظر آنے لگتے ہیں اس کا مقصد دلائل و براہین کو یکسر معطل کرنا اور دنیا کے اس سارے نظام کو جو ان دلائل پر ہر قائم ہے درہم و برہم کر دینا بھی نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہاں صفتِ احسان کا دخل ہے وہ دنیا دلائل و براہین کی دنیا نہیں ہے وہ عالم مشاہدہ کا عالم ہے اس لئے وہاں تحصیل یقین کا راستہ صرف مشاہدہ ہے جس کی پہلی کڑی عمل ہے- عمل سے عقائد راسخ ہوتے ہیں اور جب عقائد راسخ ہو جاتے ہیں تو اسی پر صفتِ احسان کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اسی راستے سے انسان کے عنصر مادیت کو عروج میسر آتا ہے- حقیقی ارتقاء یہی ہے- انسان جب تک مادیت میں ڈوبا ہوا ہے وہ صفتِ احسان سے آشنا نہیں ہو سکتا اور جونہی اس کے عنصر مادیت کو عروج میسر آیا اسی وقت سے اس کی ماہیت کا دوسرا پاک عنصر یعنی روحانیت چمکنے لگتا ہے اور صفت احسان کی ابتدا ہونے لگتی ہے اور جتنا اس کا یہ عنصر شریعت کے تطہیر و تزکیہ کے اثرات سے عنصر مادیت کو مسخر کرتا جاتا ہے اتنا ہی یہ عنصر ﷺ.....

ارکان الاسلام و دعائمه العظام

(۲۴۵) عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ اِقَامِ

ارکانِ اسلام

(۲۴۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کا قصر پانچ ستونوں پر (قائم کیا گیا) ہے- شہادتین' یعنی اس بات کا دل سے اقرار کرنا کہ سوائے ایک اللہ تعالیٰ کے کوئی اور معبود نہیں ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ

ﷺ ....بھی عنصر روحانیت کے ہمرنگ ہوتا چلا جاتا ہے- یہاں تک کہ اس کے ظاہر و باطن' مادیت و روحانیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا- اس انقلاب کے بعد اب اس کے لئے فرشتے' جنت اور دوزخ پر یقین کرنا اسی طرح بدیہی ہو جاتا ہے جیسا اپنی آنکھوں کے مشاہدات پر' انبیاء علیہم السلام کے اکثر غیبی علوم کا تعلق اسی صفتِ احسان سے ہے- جو شخص صفتِ احسان سے جتنا بے بہرہ ہے اتنا ہی وہ ان علوم سے بھی بے بہرہ ہے یہ اس کی خوش فہمی ہے کہ وہ اس کا انکار اپنے روشن خیالی کا ثمرہ تصور کرتا ہے- حقیقت یہ نہیں بلکہ دراصل اس کا یہ تردد یا تمرد اس صفتِ احسان سے دوری اور محرومی کا ثمرہ ہے- اس کے برعکس جو لوگ دین اسلام کے منکر ہیں ان کا عنصر روحانیت رفتہ رفتہ ان کی مادیت کے ہمرنگ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت وہ آ جاتا ہے جبکہ ان کی روحانیت قطعاً مردہ ہو جاتی ہے اور اب ان کے لئے صرف عالم مادیت میں ڈوبنے اور ڈوب کر مر جانے ہی کی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے اور ان کے لئے صفت احسان تک رسائی کی کوئی امید باقی نہیں رہتی- شاید اس کو قرآن کے الفاظ میں طبع اور قلبی مہر سے تعبیر کیا گیا ہے- حافظ ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام کی اس صورت میں تمام علوم اسلامیہ کا خلاصہ موجود ہے فقہاء کا موضوع عبادات و معاملات ہیں' یہ تمام مسائل مفہوم اسلام میں درج ہیں اللہ تعالیٰ اور رسول پر ایمان لانا' جنت' دوزخ' تقدیر' اور قیامت پر یقین رکھنا متکلمین کا موضوع ہے' یہ تمام مباحث لفظ ایمان میں داخل ہیں' توکل' رضا' صبر اور بقیہ مقامات عشرہ وغیرہ عرفاء کا موضوع ہے یہ سب مقامات احسان کے ابواب ہیں- اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ حدیث کتنی عظیم الشان ہے-

(۲۴۵) * (الف) مصنف عبدالرزاق میں یہاں **خمس دعائم** کا لفظ صراحۃً مذکور ہے- (دیکھو عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۴۱)

(ب) حدیثِ مذکور کا مطلب سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ تعلیم اور قرآن کریم کا اسلوب بیان ہر دو فطری ہوتے ہیں یہاں روزمرہ کے معمولی مشاہدات سے آخرت کے بڑے بڑے علوم باتوں ہی باتوں میں حل کر دیئے جاتے ہیں- اب ذرا غور کرو کہ ایک امی قوم کو اسلام اور اعمال کا ربط' پھر اعمال میں باہمی مراتب کا تفاوت سمجھانا ہے- مسئلہ کس قدر مشکل ہے اور اس کے لئے تعبیر کتنی سادہ- ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح اپنے ماحول میں تم روزمرہ اپنا مکان دیکھتے ہو اس میں چھت ہوتی ہے' ستون ہوتے ہیں' در و دیوار ہوتے ہیں اور یہ مجموعہ مل کر ہی تمہارا مکان کہلاتا ہے پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ضرور ہوتی ہے جس پر یہ مکان قائم ہوتا ہے- پھر عجیب بات ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان مکان تو آنکھوں سے نظر بھی آتا ہے مگر وہ بنیاد جس پر اتنی بڑی عمارت قائم ہوتی ہے کہیں نظر نہیں آتی' وہ زمین کے نیچے ہوتی ہے- اسی طرح اسلام کو سمجھ لو وہ بھی ایک مجموعہ کا نام ہے اس کے بھی اجزاء ہیں اس کی بھی ایک بنیاد ہے- پھر اس کے اجزاء میں ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ تمہارے مکان کے اجزاء میں' ہر جزء مکان کے لئے یکساں ضروری نہیں ہوتا- ظاہر ہے کہ مکان کی بقاء کے لئے جس قدر ستونوں کی حاجت ہے اتنی طاق' روشندان اور نقش و نگار کی نہیں اسی طرح یہاں ارکان خمسہ' اسلام کے بنیادی اصول ہیں جن کے بغیر اسلام کا کارخانہ قائم نہیں رہ سکتا پھر ان ارکان میں بھی باہمی فرق ہے- آئندہ حدیث میں ابھی آپ ملاحظہ ﷺ ....

الصَّلاۃِ وَ اِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ وَ الْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ. (رَوَاهُ الْبُخَارِیُ وَ مُسْلِمُ وَ التِّرْمِذِیُّ وَ النَّسَائِیُّ)

(۲۴۶) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلًا اَتٰی ابْنَ عُمَرَ فَقَالَ یَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مَا حَمَلَکَ عَلٰی اَنْ تَحُجَّ عَامًا وَ تَعْتَمِرَ عَامًا وَ تَتْرُکَ الْجِهَادَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ عَلِمْتَ مَا رَغَّبَ اللّٰهُ فِیْهِ قَالَ یَا ابْنَ اَخِیْ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ اِیْمَانٍ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الصَّلٰوۃِ الْخَمْسِ وَ صِیَامِ رَمَضَانَ وَ اَدَاءِ الزَّکٰوۃِ وَ حَجِّ الْبَیْتِ قَالَ یَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ اَلَا تَسْمَعُ مَا ذَکَرَ اللّٰهُ فِیْ کِتَابِهٖ ﴿وَ اِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا. اِلٰی اَمْرِ اللّٰهِ﴾(الحجرات:۹) ﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا

اس کے رسول ہیں پورے آداب وحقوق کی رعایت کر کے نماز ادا کرنا- زکوٰۃ دینا- حج کرنا- رمضان شریف کے روزے رکھنا-

(اس حدیث کو بخاری ومسلم وترمذی ونسائی نے روایت کیا ہے)

(۲۴۶) نافع سے یوں روایت ہے کہ ایک شخص ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس آیا اور کہا اے ابوعبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ (ان کی کنیت ہے) کیا وجہ کہ آپ حج اور عمرہ تو ہر سال کرتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ نہیں کرتے حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کی کیسی ترغیب دلائی ہے- ابن عمرؓ نے جواب دیا اے بھائی اسلام تو پانچ چیزوں کا نام ہے (۱) اللہ کی توحید اور رسول کی تصدیق (۲) پنج وقتہ نماز (۳) رمضان کے روزے (۴) زکوٰۃ (۵) بیت اللہ کا حج (اور آج کل جولڑائی ہے اس میں شریک ہونا کچھ اسلام کا جزء نہیں جو نہ کرنے سے کچھ نقصان ہو) اس نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہیں مانتے ﴿وَ اِنْ طَائِفَتَانِ... الخ﴾ یعنی اگر مسلمانوں کے دوفرقے آپس میں لڑ پڑیں تو

ﷺ... فرمائیں گے کہ ان ارکانِ خمسہ کے ساتھ ساتھ تصدیق قلبی بھی اہم ترین جزء ہے اسے مکان کی بنیاد کی مثال سمجھئے جس طرح وہ زمین میں مدفون ہوتی ہے اسی طرح یہ دل میں پوشیدہ رہتی ہے ارکانِ خمسہ کی یہ محکم تعمیر اسی پوشیدہ تصدیق پر قائم رہ سکتی ہے- ایک موٹی سی مثال سے کتنی بڑی حقیقت ذہن نشین کر دی اور لطف یہ کہ سامعین کو خبر تک نہ ہوئی کہ مشکل کیا تھی اور کیونکر حل ہوگئی - دورِ نبوت گذرا اور جب علوم رسمیہ کی نوبت پہنچی تو اسی صاف بات کو جب ضوابط کے شکنجوں میں کھینچا گیا تو اب وہی ایک لاینحل معمہ بن کر رہ گئی کہ اعمال ایمان کے اجزاء ہیں یا صرف اس کی تکمیل کا سامان اسی پر یہ بحث قائم ہوگئی کہ ایمان اب بسیط رہا یا مرکب پھر اعمال کی ضرورت اگر رہی تو کس درجہ' ان مباحث نے یہاں تک طول پکڑا کہ مستقل مذاہب بن گئے اور ہزاروں اوراق صرف ہو جانے کے بعد بھی روشنی پھر اس سے زیادہ پیدا نہ ہو سکی جو اس مثال میں موجود ہے-

(۲۴۶) * حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کے سامنے عبادت کے لئے سرنگوں ہو جانا- اب اگر دین اسلام کا تجزیہ کرو تو اس میں چند قسم کے احکام پاؤ گے- (۱) وہ احکام جو سب پر یکساں واجب ہیں- (۲) وہ احکام جو خاص خاص افراد سے متعلق ہیں پہلی قسم میں ایک بڑا حصہ صرف فرض علی الکفایہ ہے- ہر شخص پر واجب نہیں جیسا کہ جہاد' امر بالمعروف نہی عن المنکر' امارت' حاکم' قاضی' مفتی' شہادۃ' وغیرہ ان سب کا تعلق خاص مصالح اور عارضی اسباب سے وابستہ ہے- فرض کرلو اگر یہ مصالح ہماری نقل وحرکت کے بغیر حاصل ہو جائیں تو یہ احکام واجب نہیں رہتے اسی طرح حدود وغیرہ کے ابواب ہیں ان کا تعلق بھی چند جرائم کے ساتھ ہے- اگر اس کا انسداد ہو جائے تو ان ابواب کی حاجت بھی نہیں رہتی دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جیسا ﷺ...

تَكُوْنَ فِتْنَةٌ﴾(البقرة:۱۹۳) قَالَ فَعَلْنَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ كَانَ الْاِسْلَامُ قَلِيْلًا فَكَانَ الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِيْ دِيْنِهٖ اِمَّا قَتَلُوْهُ وَ اِمَّا يُعَذِّبُوْهُ حَتّٰى كَثُرَ الْاِسْلَامُ فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ. الحديث(رواه البخاری فی التفسیر ص ۶۴۸)

تم ان میں صلح کرا دو (آخر آیت تک) دوسری جگہ ارشاد ہے کفار سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے- ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا ہم نے حضرت کے زمانہ میں جب اسلام کم تھا ایسا ہی کیا (جو شخص فتنہ اٹھاتا اس کو مار دیا جاتا یا تکلیف دی جاتی) یہاں تک کہ اسلام بکثرت پھیل گیا اور کوئی فتنہ باقی نہ رہا-

(۲۴۷) عَنْ اَبِیْ سُوَيْدِ الْعَبْدِیِّ قَالَ اَتَيْنَا ابْنَ عُمَرَ فَجَلَسْنَا بِبَابِهٖ لِيُؤْذَنَ لَنَا قَالَ فَاَبْطَاَ عَلَيْنَا الْاِذْنُ قَالَ فَقُمْتُ اِلٰى جُحْرٍ فِی الْبَابِ فَجَعَلْتُ اَطَّلِعُ فِيْهِ فَفَطِنَ بِیْ فَلَمَّا اُذِنَ لَنَا جَلَسْنَا فَقَالَ اَيُّكُمْ طَلَعَ اٰنِفًا فِیْ دَارِیْ قَالَ قُلْتُ اَبْطَاَ عَلَيْنَا الْاِذْنُ فَنَظَرْتُ فَلَمْ اَتَعَمَّدْ ذَالِكَ قَالَ ثُمَّ سَاَلُوْهُ

(۲۴۷) ابو سوید عبدی بیان کرتے ہیں کہ ہم ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دروازے پر بیٹھ گئے تاکہ اجازت ہو جائے (تو اندر داخل ہوں) اجازت میں کچھ دیر ہوئی تو میں دروازے میں ایک سوراخ کے اندر سے جھانکنے لگا وہ میری اس حرکت کو تاڑ گئے جب ہمیں اجازت مل گئی اور ہم بیٹھ گئے تو انہوں نے فرمایا ابھی میرے گھر میں تم میں کس نے جھانکا تھا میں نے عرض کیا کہ اجازت ملنے میں دیر ہوگئی

ﷺ ....کہ قرض کی ادائیگی -غصب و عاریت‘ ودیعت وامانت وغیرہ یہ تمام ابواب انسانوں کے حقوق کے تحفظ اور مظلوم کی دادرسی کے لئے ہیں اگر صاحبِ حق معاف کر دے تو یہ ابواب بھی معطل ہوتے ہیں- صلہ رحمی‘ حقوق زوجیت‘ حقوقِ اولاد‘ پڑوسی‘ شریک‘ فقیر وغیرہ ان احکام کا تعلق بھی سب کے ساتھ نہیں بلکہ خاص خاص افراد سے ہے وہ بھی خاص خاص اوقات میں اسی طرح شریعت کے بقیہ ابواب پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال جائیے اور غور کیجئے کہ اب وہ کون سے احکام ہیں جو ہر ہر فرد پر واجب ہیں اور کسی وقتی مصلحت پر بھی مبنی نہیں اور انسان کے انقیاد ظاہری و باطنی کا ایک مکمل ثبوت بھی ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ یہی مبانی خمسہ ہیں- اسی لئے حدیث مذکور میں صرف ان پانچ ہی کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے- (کتاب الایمان -ص ۱۲۶ و ۱۴۶)

اس حدیث میں ابن عمر رضی اللہ عنہما کو جس جنگ کی شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے وہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر جنگ کا واقعہ ہے- حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جواب یہاں کتنا عبرت آموز اور کتنا قیمتی ہے کہ کفار سے جنگ فتنہ فرد کرنے کے لئے ہوتی ہے اور مسلمانوں سے جنگ فتنہ پیدا کرنے کے لئے -تم جس آیت کو میری تردید کے لئے پڑھ رہے ہو درحقیقت وہی میری تائید کے لئے ہے اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ابن عمرؓ کا اس حدیث سنانے سے مقصد یہ نہیں تھا کہ جہاد فرض عین نہیں جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے (دیکھو عمدۃ القاری ج ا ص ۱۴۳) بلکہ وہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرما رہے تھے جس کو حافظ ابن تیمیہؒ نے مذکورہ بالا بیان میں مفصل طور پر ذکر کیا ہے-

(۲۴۷) * اسلام میں کسی غیر شخص کے گھر میں جھانکنے کی ممانعت کی گئی تھی اس لئے ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی پہلے اس خلافِ شرع حرکت پر ان کو ٹوکا‘ آخر انھیں معذرت کرنی پڑی - اس سے زیادہ پیچھے پڑنا طریق دعوت وحکمت کے خلاف تھا اس لئے یہ سوال نہیں ہوسکتا کہ ان کا یہ عذر بھی شرعی طور پر کافی نہیں تھا- اس پر ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کیسے سکوت کرلیا- الفاظ بالا سے یہ اور صاف ہو گیا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا منشاء صرف اتنا تھا کہ ان کے زمانہ کا جہاد ارکانِ خمسہ کے ہم پلہ نہیں ہے- ایسے فتنوں کے موقعوں پر اس ﷺ ....

عَنْ اَشْيَاءَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَ حَجِّ الْبَيْتِ وَ صِيَامِ رَمَضَانَ قُلْتُ يَا اَبَا عَبْدِالرَّحْمٰنِ مَاتَقُوْلُ فِي الْجِهَادِ قَالَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (و من طريق اخر) قَالَ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ وَ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ الْجِهَادُ حَسَنٌ هٰكَذَا حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ. (الاولیٰ اخرجها احمد و عبدالرزاق و الثانية الشيخان و النسائی و الترمذی و الطبرانی)

تھی اس لیے میں نے جھانکا تھا (تاکہ تاخیر کا سبب معلوم ہو) جھانکنا مقصود نہ تھا اس کے بعد پھر ان سے بعض اور باتیں دریافت کیں انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت پر، نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے، بیت اللہ کا حج اور رمضان کے روزے رکھنے پر، ہم نے عرض کیا اے ابوعبدالرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جہاد کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں، فرمایا جو کوئی جہاد کرے گا وہ اپنے ہی نفع کے لیے کرے گا- دوسرے طریقے میں ہے ایک شخص نے ان سے پوچھا اور جہاد فی سبیل اللہ کیسا ہے فرمایا اچھا ہے (مگر) ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بیان کیا تھا-

(احمد، عبدالرزاق)

(۲۴۸) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ بِالنَّاسِ قَبْلَ غَزْوَةِ تَبُوْكَ فَلَمَّا اَنْ اَصْبَحَ صَلّٰى بِالنَّاسِ صَلٰوةَ الصُّبْحِ ثُمَّ اِنَّ النَّاسَ رَكِبُوْا فَلَمَّا اَنْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ نَعَسَ النَّاسُ فِيْ اَثَرِ الدُّلْجَةِ وَ لَزِمَ مُعَاذٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْلُوْ اَثَرَهٗ وَ النَّاسُ تَفَرَّقَتْ

(۲۴۸) معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو غزوہ تبوک کے لیے لے کر نکلے- جب صبح ہو گئی تو آپ نے ان کو صبح کی نماز پڑھائی، لوگ نماز پڑھ کر پھر سوار ہو گئے- جب آفتاب نکلا تو سب لوگ شب کی بیداری کی وجہ سے اونگھ رہے تھے- ایک معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو برابر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے لگے چلے آ رہے تھے بقیہ لوگوں کی سواریاں چرتی رہیں اور چلتی رہیں

لله ..... سے زیادہ صفائی سے بات کہنا بھی فتنہ کا موجب تھا- اس لئے ابن عمر رضی اللہ عنہما صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے، مانا کہ جہاد بہت اچھا عمل ہے مگر جو حدیث میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے وہ اتنی ہی ہے اس میں جہاد کا ذکر نہیں ہے اس لئے تم مجھے اس جہاد کی شرکت پر مجبور نہیں کر سکتے اور میں اس سے علیحدہ رہ کر معذور رہ سکتا ہوں-

(۲۴۸) * اس حدیث میں کلمہ شہادت کے لئے ''راس'' اور نماز کے لئے ''قوام'' اور جہاد کے لئے ''ذروہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے- ترمذی کی روایت میں یہاں کچھ اور اعمال کا بھی ذکر ہے- ان الفاظ سے بڑھ کر ان عبادتوں کی حقیقتوں کی ترجمانی کے لئے دوسرے الفاظ میسر نہیں آ سکتے- الفاظ بالا میں توحید و رسالت کو سر کہا گیا ہے، شہادتین کی حقیقت سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور لفظ نہیں ہو سکتا- مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کا سر کٹ جائے تو اس کی روح نکل جاتی ہے اور وہ صرف ڈھانچہ ہی ڈھانچہ رہ جاتا ہے اسی طرح کلمہ شہادت کو سمجھنا چاہیے اگر یہ نہ ہو تو بڑے سے بڑا عمل بھی صرف ایک ڈھانچہ ہے جس میں کوئی روح نہیں- نماز کو قوام اس لئے کہا گیا ہے کہ نماز دیکھنے میں گو ایک ہی عبادت ہے مگر جملہ عبادات کی روح اس میں موجود ہے- اس میں زکوٰۃ کا مفہوم بھی ہے اور صوم کا لله ....

بِهِمْ رِكَابُهُمْ عَلٰى جَوَادِّ الطَّرِيْقِ تَاْكُلُ وَ تَسِيْرُ فَبَيْنَمَا مُعَاذٌ عَلٰى اَثَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ نَاقَتُهُ تَاْكُلُ مَرَّةً وَ تَسِيْرُ اُخْرٰى عَثَرَتْ نَاقَةُ مُعَاذٍ فَكَبَحَهَا بِالزِّمَامِ فَهَبَّتْ حَتّٰى نَفَرَتْ مِنْهَا نَاقَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَشَفَ عَنْهُ قِنَاعَهُ فَالْتَفَتَ فَاِذَا لَيْسَ مِنَ الْجَيْشِ رَجُلٌ اَدْنٰى اِلَيْهِ مِنْ مُعَاذٍ فَنَادَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ قَالَ اُدْنُ دُوْنَكَ فَدَنَا مِنْهُ حَتّٰى لَصِقَتْ رَاحِلَتُهُمَا اِحْدَاهُمَا بِالْاُخْرٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كُنْتُ اَحْسَبُ النَّاسَ مِنَّا كَمَكَانِهِمْ مِنَ الْبُعْدِ فَقَالَ مُعَاذٌ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ نَعَسَ النَّاسُ فَتَفَرَّقَتْ بِهِمْ رِكَابُهُمْ تَرْتَعُ وَ تَسِيْرُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَنَا كُنْتُ نَاعِسًا فَلَمَّا رَاٰى مُعَاذٌ بُشْرٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَيْهِ وَ خَلْوَتَهُ لَهُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِئْذَنْ لِيْ اَسْاَلُكَ عَنْ كَلِمَةٍ قَدْ اَمْرَضَتْنِيْ وَ اَسْقَمَتْنِيْ وَ اَحْزَنَتْنِيْ فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ سَلْنِيْ عَمَّ شِئْتَ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ حَدِّثْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِيْ الْجَنَّةَ لَا

اور بڑی شاہراہوں پر انہیں لے کر تتر بتر ہوگئیں تھیں- اسی دوران میں کہ معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اونٹنی نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے کبھی چرتی اور کبھی چلتی جا رہی تھی دفعۃً ٹھوکر کھائی' معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو لگام کھینچ کر سنبھالا تو وہ اور تیز ہوگئی یہاں تک کہ اس کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی بھی بدک گئی- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا نقاب اٹھایا دیکھا تو لشکر بھر میں معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ کوئی اور شخص آپ کے قریب نہ تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آواز دی اے معاذ! انہوں نے جواب دیا یا نبی اللہ میں حاضر ہوں فرمایا اور قریب آ جاؤ' وہ قریب آ گئے اور اتنے قریب آ گئے کہ دونوں کی سواریاں ایک دوسرے سے بالکل مل گئیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا یہ خیال نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اتنی دور ہوں گے- معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگ کچھ اونگھ رہے تھے (اس لیے) ان کی سواریاں چرتی رہیں اور چلتی رہیں اور ادھر ادھر انہیں لے کر متفرق ہو گئیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں بھی اونگھ رہا تھا- معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خوش ہیں اور موقعہ بھی تنہائی کا ہے تو عرض کیا یا رسول اللہ اجازت دیجئے تو ایک بات پوچھوں جس نے مجھے بیمار ڈال دیا ہے اور غمزدہ بنا رکھا ہے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا جو چاہتے ہو پوچھو' عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ایسا کام بتا دیجئے جو مجھے جنت میں لے جائے اس کے سوا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کچھ نہیں پوچھوں گا' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہت خوب' بہت خوب تم نے بڑی بات پوچھی' تین بار فرمایا ہاں جس کے لیے خدا

ﷺ .... صبر بھی نفس اور حج کی طرح حریم مقصود کے گرد طواف بھی جس نے اس عبادت کو چھوڑا اس نے گویا سب عبادتوں کو چھوڑ دیا- قرآن کہتا ہے- ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ﴾ (العنکبوت: ۴۵) ''نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے-'' اور اسی لئے دوسری جگہ یہ اعلان ہے- ﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ﴾ (مریم: ۵۹) ''پھر ان کے بعد ان کے جانشین نااہل پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے-'' یہاں اضاعت صلوۃ کو اتباع شہوات ﷺ ....

اَسْأَلُکَ عَنْ شَیْءٍ غَیْرِهَا قَالَ نَبِیُّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ لَقَدْ سَأَلْتَ بِعَظِیْمٍ لَقَدْ سَأَلْتَ بِعَظِیْمٍ ثَلَاثًا وَ اَنَّهُ لَیَسِیْرٌ عَلٰی مَنْ اَرَادَ اللّٰهُ بِهِ الْخَیْرَ فَلَمْ یُحَدِّثْهُ بِشَیْءٍ اِلَّا قَالَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ یَعْنِیْ اَعَادَهُ عَلَیْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ حِرْصًا لِکَیْمَا یُتْقِنَهُ عَنْهُ فَقَالَ نَبِیُّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ تُقِیْمُ الصَّلٰوةَ وَ تَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا تُشْرِکُ بِهٖ شَیْئًا حَتّٰی تَمُوْتَ وَ اَنْتَ عَلٰی ذَالِکَ فَقَالَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ اَعِدْلِیْ فَاَعَادَهَا لَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ نَبِیُّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُکَ یَا مُعَاذُ بِرَاْسِ هٰذَا الْاَمْرِ وَ ذِرْوَةِ السَّنَامِ فَقَالَ بِاَبِیْ وَ اُمِّیْ اَنْتَ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِیْ فَقَالَ نَبِیُّ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَاْسَ هٰذَا الْاَمْرِ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْکَ لَهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ وَ اَنَّ قِوَامَ هٰذَا الْاَمْرِ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَاءُ الزَّکٰوةِ وَ اَنَّ ذِرْوَةَ السَّنَامِ مِنْهُ الْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوا الزَّکٰوةَ وَ یَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِیْکَ لَهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَ عَصَمُوْا دِمَاءَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَ حِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ الَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ مَا شَحَبَ وَجْهٌ وَ لَا

بھلائی کا ارادہ کرے اس کے لیے کچھ اتنی دشوار بھی نہیں - کوئی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نہیں فرمائی جو تین بار نہ دہرائی ہو' اس شوق میں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات خوب پختہ یاد کرلیں' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھو' نماز پڑھا کرو - اللہ کی عبادت کیا کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ' یہاں تک کہ اسی حال پر تمہاری موت آ جائے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر ارشاد فرمایئے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خاطر تین بار فرمایا اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر چاہو تو اس دین کے اونچے عملوں میں جو چوٹی کا عمل ہے اور جو اس کی جڑ ہے وہ تمہیں بتا دوں انہوں نے عرض کیا میرے ماں' باپ آپ پر قربان بتایئے آپ نے فرمایا سب میں جڑ کا عمل تو یہ ہے کہ تو اس کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں جو تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندہ اور رسول ہیں اور جس عمل سے دین کی بندش مضبوط رہتی ہے وہ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا ہے اور اس کے اونچے اونچے عملوں میں سب سے چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں جنگ اس وقت تک برابر جاری رکھوں جب تک کہ لوگ نماز نہ پڑھیں' زکوٰۃ نہ دیں اور اس بات کی شہادت نہ دیں کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں جب یہ باتیں کرلیں تو وہ خود بھی بچ گئے اور اپنی جان و مال کو بھی بچا لیا مگر ہاں جو ضابطہ میں ہو اور اس کے بعد ان کا حساب خدا کے سپرد ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود

ؔ ....کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے - اسی لئے عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی قلمرو میں یہ حکم لکھ بھیجا تھا کہ نمازوں کی نگرانی رکھو جو شخص نمازوں کو ضائع کرے گا' اس کے بقیہ دین کا بھی خدا حافظ ہے - جہاد کو ذروۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ اونٹ میں کوہان پھر کوہان میں چوٹی ؔ ....

اغْيـرَّتْ قَدَمٌ فِيْ عَمَلٍ تُبْتَغٰى فِيْهِ دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ بَعْدَ الـصَّلٰوةِ الْمَفْرُوْضَةِ كَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا ثَقَلَ مِيْـزَانَ عَبْـدٍ كَـدَابَّةٍ تُنْفَقُ لَهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ يُحْمَلُ عَلَيْهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.

نہیں ہوا - کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجات جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنا کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مرگیا یا وہ جو اس نے راہ خدا میں کسی کو دے ڈالا -

(رواہ احمد و البزار و النسائی و ابن ماجة و الترمذی و قال حدیث حسن صحیح و حدیث الباب اسناد جید و شهر بن حد شب و ثقه ابن معین و الا مام احمد وغیرهما)

الارتباط بین ارکان الاسلام — ارکانِ اسلام کا باہمی ربط

(۲۴۹) عَنْ زِيَادِ بْنِ نُعَيْمِ الْحَضْرَمِيِّ قَالَ قَالَ

(۲۴۹) زیاد بن نعیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ

لله ....سب سے نمایاں اور اونچی چیز ہوتی ہے اسی طرح اسلام میں وہ سب سے اونچا عمل جو خود بھی سب سے زیادہ نمایاں اور اسلام کی بلندی بھی سب سے زیادہ نمایاں کرنے والا صرف جہاد ہے اس لئے ان الفاظ کو صرف شاعرانہ استعارات نہ سمجھئے بلکہ یہ ان عبادات کی حقیقتیں ہیں -

(۲۴۹) * ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث مذکور سے یہ تو سب ہی نے سمجھا کہ ارکان خمسہ اور مجموعہ دین کا وہ رشتہ ہے جو ایک قصر اور اس کے ستونوں کا ہوتا ہے اگر ارکان اسلام نہ ہوں تو دین کا قصر ہی گر جائے مگر خود ان ارکان کے درمیان رشتہ کیا ہے' ادھر کسی کا ذہن نہ گیا - اس نکتہ کی طرف حافظ ابن رجب کی نظر پہنچی ہے وہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ارکانِ اسلام میں باہم بھی گہرا ربط ہے اگر ان میں ایک نہ ہو تو بقیہ میں بھی ضعف نمایاں ہونے لگتا ہے کیونکہ یہ ارکان جس طرح پورے قصر کو سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی سہارا دیتے ہیں اگر سب موجود ہوں تو پورے قصر کا وزن اپنے درمیان تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایک نہیں ہوتا تو اس کا وزن صرف بقیہ ارکان پر آ پڑتا ہے اور لازمی طور پر اس قصر کے لئے اور خود ان ستونوں کے لئے بھی خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے' یہ تو ارکانِ ظاہری کا حال ہے' ارکان دین کا ربط اس سے کہیں بڑھ کر ہے - ان میں ایسا معنوی ربط ہے کہ ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ جزء بنا ہوا ہے ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی توفیق میسر ہوتی ہے اور ایک کے ترک کرنے سے دوسرے سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے - اس لئے صاحب نبوت کی اس پر اسرار تشبیہ میں ارکانِ خمسہ کا باہمی رشتہ بھی داخل سمجھنا چاہیے اور اب اس تشبیہ کا خلاصہ یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح ایک قصر کے لئے ستون ضروری ہے اسی طرح اسلام کے لئے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا ادا کرنا ضروری ہے اور جس طرح کسی محل کے بعض ستون گر جانے سے اس کے اور ستونوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اسی طرح کسی رکن اسلامی کے ترک سے اس کے بقیہ ارکان کو بھی نقصان ہوتا ہے -

خلاصہ یہ کہ قصر کے قائم رہنے کے لئے جتنے ستون درکار ہیں ان سب ہی کا ہونا ضروری ہے اگر ان میں ایک بھی نہ ہو تو بقیہ کا وجود چنداں مفید نہیں ہوتا - اب رہ گئی بات کہ کس تعمیر کے لئے کتنے ستون ہونے چاہئیں پھر ان ستونوں میں اہمیت اور غیر اہمیت کا تناسب کیا ہونا چاہیے' ان میں کس کو کس کی احتیاج زیادہ ہے - ان مراحل کو وہی انجینئر خوب سمجھ سکتا ہے جس نے یہ نقشہ تعمیر تیار کیا ہے ہر ایک کے ادراک کی بات نہیں ہے - اس کے بعد جب آپ قرآن و حدیث پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ اکثر آیات میں ایک ہی جگہ ملے گا - احادیث میں حیاء و ایمان کا تذکرہ ساتھ نظر آئے گا - اسی ربط کے پیش نظر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''من لم یزک فلا صلٰوة له '' (جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی قبول نہیں) ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس نے شراب پی اس کی چالیس دن کی لله ....

رَسُوْلُ اللّٰـهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْـهِ وَسَلَّمَ اَرْبَعٌ فَـرَضَهُنَّ اللّٰهُ فِي الْإِسْلَامِ فَمَنْ جَاءَ بِثَلَاثٍ لَمْ

علیہ وسلم نے فرمایا ہے' چار چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض قرار دیا ہے۔ نماز' زکوٰۃ' روزے اور بیت اللہ کا حج' جو شخص ان میں تین ادا

ﷺ..... نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔ دوسری حدیث میں ہے جو غلام اپنے آقاؤں سے بھاگ جائے اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی احادیث بالا سے شراب نوشی اور اپنے مالک سے بیوفائی کا نماز سے بڑا گہرا ربط ثابت ہوتا ہے۔ اس ربط کا پورا پورا ادراک تو خدا تعالیٰ ہی کو ہے جس نے دین کا یہ قصر تیار کیا ہے اور وہی دراصل اس کے اصول تعمیری کا رازداں ہے۔ تاہم حضرت مولانا قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرف توجہ فرمائی ہے اور انسانی دماغ کے رسائی کی حد تک اسے خوب ہی سمجھا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عبادات درحقیقت عبدیت اور بندگی کی ایک علمی ٹریننگ ہے۔ عبدیت درحقیقت وہ صحیح رشتہ ہے جو بندہ اور اس کے معبود کے درمیان قائم ہے جتنے آسمانی دین آئے وہ اسی رشتہ کو سمجھانے اور اس کے حقوق بتانے آئے۔ باپ بیٹے' دوست دوست' ہمسایہ ہمسایہ کے رشتے حتیٰ کہ امتی اور رسول کا رشتہ بھی ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ قائم ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ان رشتوں میں تعدد کی گنجایش بھی ہے لیکن عبدیت اور معبودیت کا وہ تعلق ہے جو نہ باہمی مخلوق میں ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہوسکتا ہے اور نہ اس میں اثنینیۃ کی گنجایش ہے وہ صرف مخلوق اور اس کے خالق کے درمیان قائم ہے۔ اس رشتہ کو صرف سمجھانا نہیں ہے بلکہ اس کے ایک ایک طرز ادا سے ہم کو رنگین بنانا بھی ہے اگر اس رشتہ کا تجزیہ کرو تو جو اس کے بڑے عنصر نظر آئیں گے وہ صرف دو ہیں اطاعت و محبت۔ ہر غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کے سامنے ہمہ تن اطاعت ہو مگر وہ اطاعت نہیں جو ذوق محبت سے خالی ہو' اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولیٰ سے محبت کرے۔ مگر وہ محبت نہیں جس میں سرمو خلاف کی گنجائش باقی ہو' یہ دونوں فرائض بڑی حد تک بندوں کے ساتھ بھی مشترک ہیں۔ شریعت چاہتی ہے کہ ان مشترک فرائض کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دے۔ جس کے بعد دونوں کی حدود میں کوئی اشتراک باقی نہ رہے اسی کا نام عبادت ہے۔ دشواری یہ ہے کہ انسان فطرۃً داغ عبدیت برداشت نہیں کرتا اس لئے اس کے سامنے ایک ایسا آئین رکھا گیا ہے جسے وہ سمجھے پھر اس پر عمل پیرا ہو کر اس منزل تک پہنچ جائے۔ جہاں یہ داغ عبدیت تاج خلافت کا سب سے آبدار موتی نظر آنے لگتا ہے اس لئے اسے صرف سمجھایا نہیں گیا بلکہ عملی طور پر بھی ایسی ٹریننگ دی گئی جس کے اثر سے تدریجاً اس کی فطرت اطاعت و محبت کی خوگر ہوتی چلی جائے۔ سب سے پہلے مولیٰ حقیقی نے اپنے ایسے ایسے خوبصورت نام بتائے جن میں حسن و خوبی کا جلوہ بھی ہے اور حکومت و سلطنت کا دبدبہ بھی اور ہمیں حکم دیا کہ ہم ان ناموں سے اسے پکارا کریں۔ اس کا نتیجہ نفسیاتی طور پر یہ ہونا چاہیے کہ اس کے حسن و جمال کا بے کیف و بے مثال نقش ہمارے دل پر جمتا چلا جائے اسی کے ساتھ اس کی بے پناہ قدرت و طاقت کا تسلط بھی قلب پر چھاتا چلا جائے اور ان اسماء کے لحاظ سے عبادات میں یہ تقسیم کر دی کہ کچھ عبادتیں تو وہ رکھیں جو اس کی حکومت کا سکہ دل پر قائم کریں اور کچھ وہ جو اس کا جذبہ محبت بھڑکائیں۔ اب اگر تم ذرا غور کرو گے تو اسلام کی عبادت میں نماز اور زکوٰۃ تمہیں پہلی قسم میں نظر آئیں گی اور روزہ و حج دوسری قسم میں۔ نماز و زکوٰۃ میں تمامتر بارگاہ سلطنت و حکومت کا ظہور ہے اور روزہ و حج میں سرتاسر محبوبیت و جمال کا جلوہ۔ نماز کیا ہے حاضری کے ایک عام نوٹس کے بعد لباس و جسم کی صفائی' اس کے بعد کورٹ کی حاضری کے لئے تیاری' وکیل کا انتخاب' پھر کورٹ میں پہنچ کر دست بستہ باادب قیام' دائیں بائیں دیکھنے' بات چیت کرنے' کھانے پینے' حتیٰ کہ بلاوجہ کھانسنے اور نظریں اٹھانے تک کی ممانعت' آخر میں بذریعہ وکیل درخواست پیش کرنا پھر باادب سلام کر کے رخصت ہو جانا۔ زکوٰۃ پر غور کیجئے تو اس میں بھی غلام کی طرح اپنی کمائی دوسرے کے حوالہ کر دینا' سرکاری ٹیکس وصول کرنے والے آئیں تو ان کو راضی کر کے واپس کرنا' اور جو وہ لینا چاہیں بے چون و چرا ان کے سپرد کر دینا۔ ﷺ.....

يُغْنِيْنَ عَنْهُ شَيْئًا حَتّٰى يَأْتِيَ بِهِنَّ جَمِيْعًا الصَّلٰوةُ وَ الزَّكٰوةُ وَ صِيَامُ رَمَضَانَ وَ حَجُّ الْبَيْتِ.

کرے وہ اس کے لیے کچھ مفید نہیں ہوسکتیں تاوقتیکہ سب نہ کرے- (مسند احمد)

(رواہ احمد و الحدیث مرسل و رواہ الطبرانی فی الکبیر عن عمارۃ بن حزم و فی اسنادہ ابن لھیعۃ ایضا و قد ضعفوہ)

لله .... اب سوچو کہ اگر پانچ وقت اس طرح حاضری اور اتنی عاجزانہ جبہہ سائی کی تابعمر ٹریننگ حاصل کی جائے پھر سال بھر میں اپنا کمایا ہوا مال ایسی خاموشی اور بیچارگی سے سپرد کیا جائے تو کیا اس ذات کے ملکوت و جبروت کا نقش دل پر قائم نہیں ہوگا- جس کے پرشوکت اسماء پکارتے پکارتے اور یہ عاجزانہ عبادتیں کرتے کرتے عمر بسر ہوگئی ہے دوسری طرف اگر غور کرو تو محبت کا پہلا اثر کم خفتن' کم گفتن' کم خوردن ہی ہوتا ہے اس لئے اگر پہلے ہی قدم میں یہاں کوئی عاشق نہیں ہے تو یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس جمیل مطلق کی محبت کی عاشقانہ ادائیں ہی اختیار کرے' کھانا' پینا ترک کرے' راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی نیند خراب کرے اور ایک جگہ جمع ہو کر اس کلام کی ایک معقول مقدار سنا کرے جسے سن کر مردہ روحیں بھی تڑپنے لگتی ہیں- اگر ایک ماہ کی اس ٹریننگ سے اس کے رنگ ڈھنگ' طور وطریق میں کچھ عاشقانہ انداز پیدا ہوگیا ہے تو اب اس کو دوسرا قدم اٹھانا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جب کھانے' پینے' سونے' جاگنے اور دنیا کے دوسرے لذائذ میں اس کے لئے کوئی لذت نہیں رہی تو اس کو اب کوئے یار کی ہوا کھانا چاہیے- یہاں زیب و زینت' تزک و احتشام درکار نہیں بلکہ سرتاسر ذل و افتقار' ہمہ تن عجز وانکسار' شکستہ حال و اشکبار' برہنہ پا و جاں نثار' غرضیکہ سرتاپا دیوانہ وار بن کر چلنا مقصود ہے' یہی احرام کا خلاصہ ہے- پھر لق و دق میدانوں کی صحرانوردی اور لیلائے حقیقت کے سامنے چیخ و پکار یہی تلبیہ اور میدان عرفات کا قیام ہے- اس کے بعد ایک ایسے گھر کے سامنے حاضری ہوتی ہے جس کا مکین کوئی نہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے حسن و جمال کی کرنیں اس کے ہر ہر پتھر سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں اور دلہائے عشاق کو پاش پاش کئے دیتی ہیں- ایسے دل کش نظارہ کے موقعہ پر بے ساختہ وہی فرض ادا کرنا پڑتا ہے جو مجنوں نے دیارِ لیلیٰ کو دیکھ کر ادا کیا تھا اسی کا نام طواف ہے- شاید صوم و حج کے اسی ربط کی وجہ سے ماہ رمضان کے بعد ہی حج کے ایام شروع ہو جاتے ہیں- اگر جذبہ محبت اس سے بھی آگے ترقی کر جائے تو آخری منزل جہاد ہے- یہ عشق و محبت کی وہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر محب صادق اور مدعی کاذب نکھر جاتے ہیں-

قرآن کریم میں جہاد کی ایک حکمت یہ بھی بتائی گئی ہے' اس میدان سے جو بھاگا وہ اس لائق نہیں سمجھا جاتا کہ پھر خدا اور رسول کی محبت کا دم بھر سکے اور جس نے ذرا کوئی کمزوری دکھائی اس پر پھر بیوفائی کا دھبہ لگے بغیر نہیں رہتا- اس میدان کا مرد صرف وہ ہے جو اپنی موت کو اپنی زیست پر ترجیح دیتا نظر آئے- دشمن کی تلوار کی چمک اس کو اتنی محبوب ہو جائے کہ سو جان سے اسے گلے لگانے کی آرزو ہو اور وہ بڑے جذبہ کے ساتھ یہ کہتا ہوا خدا کی راہ میں قربان ہو جائے ؎

عمر یست کہ آوازہ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

یہ وہ عاشق صادق ہے کہ جب اس طرح پروانہ وار اپنی جان دے دیتا ہے تو قرآن کو اسے مردہ کہنے پر غیرت آتی ہے' وہ اعلان کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے اگرچہ تمہیں اس کی زندگی اور اس زندگی کے مقام بلند کا شعور نہیں-

مولانا مرحوم کے اس نقشہ کے مطابق نماز اور زکوٰۃ' روزہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ ربط واضح ہو جاتا ہے- اگر یہ چاروں عبادتیں اس تصور سے ادا ہوتی رہیں تو ممکن نہیں کہ اطاعت و محبت کی دونوں شانیں جو ایک عبد کے لئے مطلوب ہیں پیدا نہ ہو جائیں' ہمارے لله ....

اوثق عری الایمان

(۲۵۰) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ تَدْرُوْنَ اَیُّ عُرَی الْاِیْمَانِ اَوْثَقُ قُلْنَا الصَّلٰوۃُ قَالَ الصَّلٰوۃُ حَسَنَۃٌ وَ لَیْسَتْ بِذَاکَ قُلْنَا الصِّیَامُ فَقَالَ مِثْلَ ذَالِکَ حَتّٰی ذَکَرْنَا الْجِهَادَ فَقَالَ مِثْلَ

اسلام میں سب سے مضبوط عمل

(۲۵۰) براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانتے ہو ایمان میں سب سے مضبوط عمل کون سا ہے؟ ہم نے عرض کیا نماز- آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک نماز کا تو کیا کہنا ہے لیکن اس کا دائرہ دوسرا ہے ہم نے عرض کیا تو پھر روزے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بھی یہی فرمایا یہاں تک کہ ہم نے جہاد کا نام لیا تو اس پر بھی

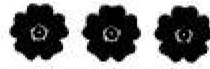
لہ .... فقہاء نے بھی بڑی حد تک اس کو سمجھا ہے اور شاید اسی لئے قضا نمازوں کی ترتیب ساقط ہونے کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ پوری پانچ نمازیں قضا ہو جائیں بظاہر ایک دن کی پانچ نمازوں میں کوئی ایسا ربط پنہاں ہے کہ یہ پانچ گویا ایک ہی نماز ہے اور اسی لئے اگر کسی شخص کی چار نمازیں فوت ہو جائیں تو اسے ان کو بالترتیب قضاء کرنا چاہئے شافعیہ نے حالتِ سفر میں دو دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کی اجازت دی ہے مگر یہ اجازت نہیں دی کہ پانچ میں سے جن دو کو چاہے جمع کر لے بلکہ صرف ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشاء کے ساتھ جمع کرنا تجویز کیا ہے- شاید یہ بھی ان نمازوں کے کسی معنوی تناسب پر مبنی ہے- قاضی ابوالولید الباجی جملۂ حدیث "وانتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ" کی شرح میں لکھتے ہیں کہ سلف ظہر کے بعد عصر اور مغرب کے بعد عشاء کا انتظار کیا کرتے تھے وہ بھی شاید اسی ربط پر مبنی تھا- روزے کے باب میں جنون کے پورے ماہ یا اس کے کسی ایک حصہ میں ہونے کی بحث بھی شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے- پورے ایک ماہ کے روزوں کو بظاہر کوئی معنوی ربط حاصل ہے- ماہ رمضان کی تین عشروں پر تقسیم بھی ہر عشرہ کے کسی معنوی ربط کا پتہ دیتی ہے اور آخر عشرہ کی اکائیوں میں بھی شاید کوئی ایسی خصوصیت پنہاں ہے کہ لیلۃ القدر ان ہی میں رکھی گئی ہے- بہر حال جب حوادث عالم کی بکھری ہوئی کڑیاں بھی کسی اندرونی نظام کے ماتحت رونما ہوتی ہیں تو پھر احکام شریعت کو اتنا بے ربط کیوں سمجھا جائے اس موضوع پر غور کرنے کے لئے طبعی دلچسپی کی ضرورت ہے- فرصت نکالئے اور ان موتیوں کے حاصل کرنے کے لئے حدیث و قرآن کے سمندر میں غوطہ لگایئے گوہر مقصود مل جائے گا- دریا کے کنارے کھڑے ہو کر صرف تمسخر اور استہزاء کرنا علم کا راستہ نہیں-

(۲۵۰) * حدیث و قرآن میں فرائض و ارکان کو زیر بحث لایا ہی نہیں گیا- ان کی اہمیت تو اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے- ہاں وہ اعمال جو کسی سبب سے ارکان قرار نہیں دیئے گئے- لیکن بہ حقیقت رکنیت کا مقام رکھتے ہیں ان کو اس لیے ابھارا جاتا ہے کہ عام نظریں ان کا شمار ارکان اسلام میں نہ دیکھ کر کہیں ان اعمال کو نظر انداز نہ کر دیں ہمارے خیال میں یہ اعمال اکثر وہ ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ہے- بعض اجتماعی عمل اتنے اہم ہوتے ہیں کہ بہت سے انفرادی فرضوں کی ادائیگی ان اعمال پر موقوف ہوتی ہے- اس لحاظ سے ان کا اپنا مقام دیکھا جائے تو اگر چہ اس کی حیثیت فرض و رکن کی نہیں ہوتی- لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ارکان اسلام کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان کا مرتبہ وہ ہوتا ہے جو قالب کے لیے قلب کا اور جسم کے لیے روح کا- از انجملہ خدا کے لیے محبت و عداوت کا عمل ہے- احادیث میں اسلام کے اس شعبہ کو کمالِ ایمانی کی علامت قرار دیا گیا ہے- فضیلت اسلام کی حدیثوں میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ جنت میں جانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک باہمی محبت پیدا نہ ہو جائے- اس محبت سے مراد یہی پر خلوص محبت ہے- مسلمانوں لہ ....

ذٰلِکَ ثُمَّ قَالَ اَوْثَقُ عُرَی الْاِیْمَانِ الْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَ الْمُعَادَاۃُ فِی اللّٰہِ وَ الْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَ الْبُغْضُ فِی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ. (اخرجه الطبرانی فی الکبیر عن ابن عباس و الطیالسی عن البراء)

آپ نے وہی ارشاد فرمایا اس کے بعد کہا سب سے مضبوط عمل یہ ہے کہ خدا ہی کے لیے دوستی اور خدا ہی کے لیے دشمنی‘ اسی کے نام پر محبت اور اسی کے نام پر بغض رکھنا۔

(طبرانی‘ مسند ابوداوٗد طیالسی)



ﷺ.... کا تنہا یہ عمل ان کے تمام دین کے ارکان کی ادائیگی میں جتنا مدومعاون ہوسکتا ہے ظاہر ہے نماز سے لے کر جہاد تک معاملات سے مسائل امامت وسیاست تک کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ اسلام کی ایک عظیم الشان عبادت یعنی جہاد تو درحقیقت اسی کے مجموعہ کا نام ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہی وہ عروہ وثقٰی ہے جو بہت سے اجتماعی امراض کا علاج اور بہت سے امراض سے تحفظ کا واحد سبب بھی ہے۔ حدیثوں میں مختصر مختصر ایسے اعمال بتا دیئے گئے ہیں جو امت امیہ کو اجتماعی اور انفرادی زندگی کی پیچیدگیوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور جب یہ پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں تو بڑے سکون واطمینان کے ساتھ عبادت رب العالمین ادا کرنے کی فرصت میسر آ جاتی ہے لیکن جب ان اعمال کو ترک کر دیا جاتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ ایسا پر پیچ بن جاتا ہے کہ انسان عبادتِ خداوندی کی بجائے صرف ان کے سلجھانے کے مشغلہ میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ اَصْحَابِ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ